نقوش

اس شمارے میں

پرچے کی اشاعت میں تاخیر ہوگئی —— ضرورت تھی کہ تھوڑا سا میں بھی آرام کر لیتا - یہی سوچ کر خوبصورت وادیوں کی طرف نکل گیا تھا -

اس مرتبہ اُن تمام عنوانوں کے ماتحت مضامین پیش کئے جا رہے ہیں - جن کا وعدہ سابقہ شمارے میں کیا گیا تھا - نئے عنوان تھے گمشدہ مضامین —— حالات حاضر —— اور تصویریں —— ممکن ہے آپ اب کے بھی تصویریں نامی مضمونچے کو ڈھونڈیں اور وہ نہ ملے - کیونکہ اس کی جگہ ایک اسکیچ (اختر اورینوی) پیش کیا جا رہا ہے - ہرچند کہ دونوں مضمونوں کی حدود قدرے مختلف ہیں - مگر ہیں یہ دونوں ایک ہی خاندان کے —— البتہ اس مرتبہ ایک اور نئے عنوان کے ماتحت ''کھلے خط'' چھاپے جا رہے ہیں - کبھی کبھی مدیر کے نام بھی کام کے خط آ جاتے ہیں - مگر وہ ذاتی چیز سمجھ کے ایک طرف ڈال دیئے جاتے ہیں - اب کے راز یزدانی مرحوم کا ایک پرانا مگر تحقیقی نوعیت کا خط سامنے آ گیا تو میں نے اسے ایک اور خط کے ساتھ پیش کر دینا مناسب جانا - آئندہ بھی ہم اس سلسلے کو قائم رکھیں گے -

جن ادیبوں نے ہمیں نیا انداز فکر دیا - اُن میں ٹی - ایس - ایلیٹ بھی ہے - آپ کو علم ہی ہوگا کہ میں بڑے ادیبوں کے مرنے پر یقین نہیں رکھتا - اگر کسی ادیب کی تحریریں زندہ ہیں تو وہ خود زندہ ہے - اگر یوں نہ ہوتا تو آج ہم ایلیٹ کے انتقال کے بعد' ان کی تحریروں کو نہ ڈھونڈھتے —— اس شمارہ میں ان کے ایک مضمون اور ایک نظم کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں -

نصیرالدین ہاشمی کا بھی ایک غیر مطبوعہ مضمون ''اھل نوایط کی ادبی خدمات'' پیش کیا جا رہا ہے - یہ مضمون وہ ہے - جسے ہاشمی صاحب نے مرحمت فرماتے وقت وعدہ کیا تھا کہ اس کی دوسری قسط جلد ہی حیدرآباد جا کر بھجوادوں گا - یہی وجہ ہے کہ مضمون کے آخر میں لکھا ہے - ''باقی آئندہ'' —— میں مرحوم نصیرالدین ہاشمی سے عرض کرتا ہوں کہ وہ اپنا وعدہ پورا کریں -

ممتاز مفتی نے اب کے اپنے ایک نمائندہ افسانے ''آپا'' کا تجزیہ خود کیا ہے - یہ سلسلہ بھی بڑا اہم ثابت ہو سکتا ہے - ہم کوشش کریں گے کہ بڑے ادیبوں سے' ان کی نمائندہ تخلیق کے محرکات پر بھی لکھوائیں -

شوکت تھانوی کی ایک اہم تخلیق ''نسیم منزل'' کو بھی قسط وار پیش کرنے کا ارادہ ہے - پہلی قسط حاضر ہے - آئندہ بھی ہم اس سلسلے کو قائم رکھیں گے تاکہ ادارہ نقوش آپ کو یاد دلاتا رہے کہ شوکت تھانوی اُردو کے صاحب طرز ادیب تھے - یوں اس لئے کر رہے ہیں کہ ہم اپنے محسنوں کو جلد ہی بھول جانے کے مرض میں مبتلا ہو چکے ہیں -

بعض تخلیقات بر وقت نہ ملنے کی وجہ سے' صحیح جگہ پر نہیں آسکیں - یہ مجبوری تھی —— ہر چند کہ کوئی بھی کسی کی مجبوری کو معاف نہیں کرتا - مگر میں آپ سے درگزر کی درخواست تو کر سکتا ہوں -

''مدیر نقوش''

• بابائے اُردو مولوی عبدالحق مجسم [illegible] نقوش کہا کرتے تھے - سوچتا ہوں ان کی یاد میں [illegible] کبھی اس نام

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۱۲

ٹیلیفون ۳۵۲۵
رہائشی ۶۴۸۹۸

نقوش

۱۰۲
مئی ۱۹۶۵ء

طبع سوم ربانی ۰۰۰ آں

قیمت موجودہ پرچہ
۵/۵۰ روپے

سالانہ چندہ ۲۰ روپے
بیرون ملک ۲۵ روپے

مدیر
محمد طفیل

ادارۂ فروغِ اردو ◎ لاہور

ترتیب



افسانے، طنزیے، خاکے

حالاتِ حاضر

کھلے خط

[illegible] پرنٹر [illegible] پریس [illegible] سے چھپوا کر
[illegible] سے شائع کیا

طلوع

جب سے میں نے یہ پڑھا ہے کہ تاریکیوں کے خلاف واویلا مچانے کی بجائے بہتر یہ ہے کہ
ایک ننھا سا دیا جلا دیا جائے۔ اُس وقت سے میرا سوچنے کا انداز بدل گیا ہے۔ میں اب یہ نہیں کہتا کہ
زمانے نے کچھ نہیں دیا۔ خود ادب نے کچھ نہیں دیا۔ خود رسالے نے کچھ نہیں کیا۔ بلکہ اپنے طور پر یہ چاہ
ہوں کہ ... ادب کی راہوں میں چھوٹے چھوٹے دیے جلا دوں۔

میرے ایک دوست نے کہا: زندگی کسی کو مہلت نہیں دیتی۔ اس لیے جلد سے جلد
سب کچھ کر ڈالیے!

مثلاً؟

... ہوں ... ہو تو ... جلد پورا کر لیجیے۔ اچھے کاموں کی خواہش ہو تو
انہیں جلد سے جلد پورا کریں

تب میں نے اپنے سارے ... پر نظر ڈالی۔ جو ابھی ناآسودہ تھے۔
چند ... جن میں ذہن کی تسکین کے سامان نظر آتے۔ چند ارمان
تھے ... چند ارمان ایسے بھی تھے۔ جو محض خواب و خیال کی د
... تھے۔

اپنے ... ترازو میں تولا تو کبھی کوئی پلڑا جھکتا ہوا نظ
کبھی کوئی

میرے ذہن کے نہاں خانوں میں تو ایک دنیا بسی ہوئی تھی۔ جس سے میں کسی حد تک
بے خبر تھا۔ ... یادوں نے ایک ساتھ ... تو نشے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس ... میں
... دوسری ... مشکل ہو گیا۔

میں نے سوچا زندگی مہلت دے یا نہ دے۔ کوئی مجھ سے میری آرزوؤں کو تو
نہیں ... میری ساتھی ہیں۔ دونوں جہان کی ساتھی!

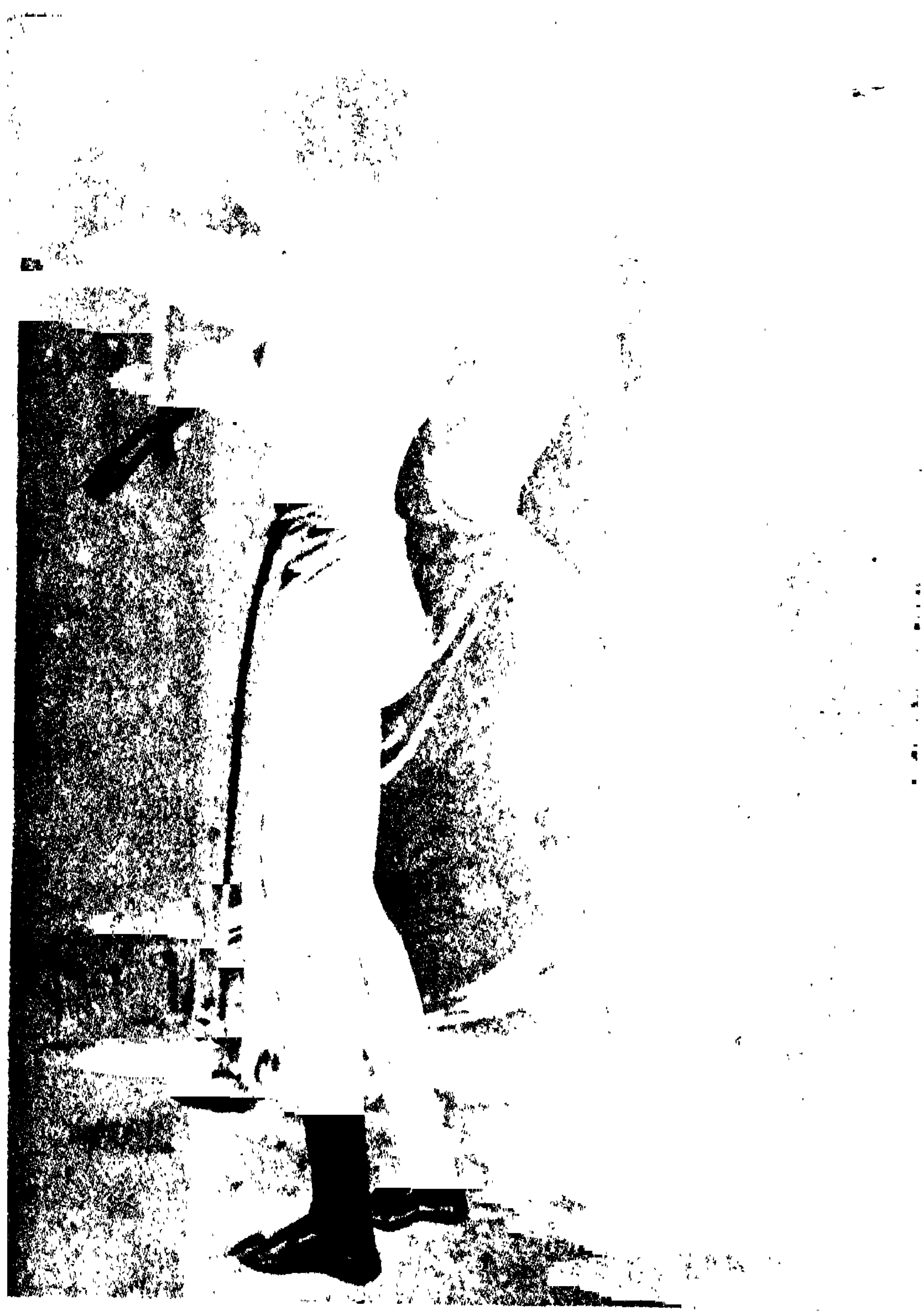
میری سوچیں ابھی مجھے ... ہی دے رہی تھیں کہ ... ایک ایک کر دیے ج

... سینہ تن گیا!

اور ادھر ... کو ایک ناآسودہ سی آرزو نے شکست دے دی!

محمد طفیل





سنتهالى

عمل : زين العابدين

طلوع

جب سے میں نے یہ پڑھا ہے کہ تاریکیوں کے خلاف واویلا مچانے کی بجائے بہتر یہ ہے کہ
ایک چھوٹا سا دیا جلا دیا جائے۔ اُس وقت سے میرا سوچنے کا انداز بدل گیا ہے۔ میں اب یہ نہیں کہتا کہ فلاں
نے کچھ نہیں کیا۔ فلاں ادیب نے کچھ نہیں کیا۔ فلاں سیاسی نے کچھ نہیں کیا۔ بلکہ اپنے طور پر یہ چاہنے
لگا ہوں کہ جہاں تک ہو سکے۔ ادب کی راہوں میں چھوٹے چھوٹے دیے جلا دوں۔

میرے ایک دوست نے کہا۔ زندگی کسی کو مہلت نہیں دیتی۔ اِس لیے جلد سے جلد
سب کچھ کر ڈالیے!

شاید!

میں کہتا ہوں کہ ارمان ہو تو اسے بھی جلد پورا کر لیجیے۔ اچھے کاموں کی خواہش ہو تو انہیں
بھی جلد سے جلد پورا کریں۔

پھر میں نے اپنے سارے ارمانوں پر نظر ڈالی۔ جو ابھی ناآسودہ تھے۔
چند ارمان ایسے تھے۔ جن میں ذہن کی تسکین کے سامان نظر آئے۔ چند ارمان ایسے
تھے۔ جن میں دل کی آسودگی کے پہلو دیکھے۔ چند ارمان ایسے بھی تھے۔ جو محض خواب وخیال کی دنیا سے
تعلق رکھتے تھے۔

اپنے ارمانوں کو جب دل و دماغ کے ترازو میں تولا تو کبھی کوئی پلڑا جھکتا ہوا نظر آیا
کبھی کوئی۔

میرے ذہن کے نہاں خانوں میں تو ایک دنیا بسی ہوئی تھی۔ جس سے میں کسی حد تک
بے خبر تھا۔ یادوں نے ایک ساتھ یلغار کی تو نشے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اِس ہنگامہ زار میں ایک
خواہش کو دوسری خواہش پر فوقیت دینا مشکل ہو گیا۔

میں نے سوچا زندگی مہلت دے یا نہ دے۔ کوئی مجھ سے میری آرزوؤں کو تو چھین کر
نہیں لے جا سکتا۔ وہ میری ساتھی ہیں۔ دونوں جہان کی ساتھی!

یہی سوچ کر ابھی مجھے تسلی ہی ہوئی تھی۔ کہ میں نے انہیں گن کر قلم تک ایک ایک کر دیے جن سے
اور میرا سینہ تن گیا!

اور ادھر حسرت کو ایک ناآسودہ آرزو نے شکست دے دی!

محمد طفیل



سنتهالی

عمل ، زین العابدین



پیدائش [illegible] نومبر [illegible]

نیشنل کالج آف آرٹس سے فائن آرٹس کی سند حاصل کی۔ سپین، میکسیکو، جاپان اور ریاستہائے متحدہ میں کام کر چکے ہیں۔ کالج آف آرٹس اینڈ کرافٹس ڈھاکہ کے پرنسپل رہے ہیں اور اس وقت پشاور یونیورسٹی کے فائن آرٹس ڈیپارٹمنٹ کے قائم مقام چیئرمین ہیں۔

یونیسکو اور دوسرے بین الاقوامی اداروں کے زیر اہتمام نمائشوں میں ان کی تصاویر نے خراج تحسین پایا۔ برطانیہ، فرانس، ترکی، جاپان، میکسیکو، ریاستہائے متحدہ اور روس میں ان کی یک شخصی نمائشیں منعقد ہو چکی ہیں۔

ہلال امتیاز اور صدر کے انعام یافتہ ہیں۔

مقالے

شہر آشوب

سیّد مسعود حسن رضوی ادیب

میرا ایک مضمون 'شہر آشوب' کے عنوان سے لکھنؤ یونیورسٹی جرنل کے ۱۹۳۳ء کے سالنامے میں شایع ہوا۔ میں اُس مضمون میں وقتاً فوقتاً نئی معلومات کا اضافہ کرتا رہا۔ اِس اثنا میں مکرمی ڈاکٹر سید عبداللہ نے ایک مبسوط تحقیقی مقالہ 'شہر آشوب کی تاریخ' کے عنوان سے لکھا جو اُن کے مجموعۂ مقالات بحث و نظر میں شامل ہے۔ بہر حال میں اپنے مضمون میں اضافے کرتا رہا اور اب وہ مضمون تمام اضافوں کے ساتھ موجودہ صورت میں شایع کیا جا رہا ہے۔ موضوع کی یکسانی کے باعث میرے اور ڈاکٹر صاحب موصوف کے مقالوں میں بعض مضامین کا اشتراک ناگزیر ہے۔ لیکن بہت سی باتیں ایسی بھی ہیں جو ایک مقالے میں ہیں اور دُوسرے میں نہیں ہیں۔ اس لیے ان دونوں مقالوں کے مطالعے سے شہر آشوب کے بارے میں سب کچھ نہ سہی، بہت کچھ مزید معلوم ہو سکتا ہے۔

ادیب

ہر آشوب کا ابتدائی مفہوم اور اس کی وجہ تسمیہ

'شہر آشوب' ایک صنفِ نظم کا نام ہے، جو ابتدا میں ایسے قطعوں یا رباعیوں کا مجموعہ ہوتی تھی، جن میں مختلف طبقوں اور مختلف پیشوں سے تی رکھنے والے لڑکوں کے حسن و جمال اور اُن کی دل کش اداؤں کا بیان ہوتا تھا۔ صرفی اعتبار سے لفظ 'شہر آشوب' یا مرکبِ اضافی ہے اضافتِ مقلوب کے ساتھ یعنی آشوبِ شہر، یا اسم فاعل ترکیبی ہے یعنی آشوبندۂ شہر۔ اس سے لغوی حیثیت سے شہر آشوب ے ایک معنی ہوئے شہر کے لیے فتنہ اور ہنگامہ، دُوسرے معنی ہوئے شہر میں فتنے اور ہنگامے برپا کرنے والے۔ حاصل دونوں ایک ہے۔ حسین و جمیل لڑکوں کی ذات ہنگاموں کا باعث ہو سکتی تھی۔ یہی 'شہر آشوب' کی وجہ تسمیہ ہے۔ خواجہ حافظ اور ملا ی کے مندرجۂ ذیل شعروں سے لفظ 'شہر آشوب' کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے :-

فغان کین لولیان شوخ و شیرین کار و شہر آشوب
چنان بردند صبر از دل کہ ترکان خوان یغما را — حافظ

کہ نہ تنہا خواہم این خوبان شہر آشوب را
کیست در شہر آنکہ خواہان نیست رُوئے خوب را — جامی

اکبر اعظم کے عہد میں یوسف علی حسینی گرجانی نے سو رباعیوں کا ایک مجموعہ صفت الاصناف کے نام سے مرتب کیا۔ اس کے دیباچے کی ابتدائی رباعی در صحو خانے کی ہے جو حسبِ ذیل ہے :-

ای ماہ رُخ تو طالبان را مطلوب — یوسف بجمالِ گلرخان چون یعقوب
چون عاشق تو زود آ شہر بجست — از حسنِ جمالِ تست در شہر آشوب

اس رباعی کے آخری دو مصرعے بھی 'شہر آشوب' کی وجہ تسمیہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

شہر آشوب کا موضوع

حافظ محمود خاں شیرانی نے 'شہر آشوب' کی تعریف یوں کی ہے: "اس قسم کی نظمیں جن میں پیشہ وروں کا تعلقات کی شکل میں ذکر ہو 'شہر آشوب' کہلاتی ہیں۔" یہ تعریف ابتدائی شہر آشوبوں پر پورے طور پر صادق نہیں آتی۔ ان میں پیشہ وروں کا ذکر نہیں ہوتا بلکہ جیسا اوپر کہا جا چکا ہے، پیشہ ور لڑکوں کے حسن و جمال اور ان کی دل کش اداؤں کا ذکر ہوتا ہے۔ بعد کے بعض شہر آشوبوں کا موضوع بھی یہی ہے۔

شہر آشوب کی ہیئت اور موضوع میں تنوع

امتدادِ زمانہ کے ساتھ شہر آشوب کی ہیئت میں تنوع پیدا ہوتا گیا اور اس نے قطعوں اور رباعیوں کے علاوہ کبھی مختصر مثنویوں یا منفرد شعروں کے مجموعے کی شکل اختیار کر لی، کبھی قصیدے کی، کبھی مخمس کی اور کبھی مسدس کی۔ اس کے موضوع میں بھی تبدیلی ہوتی رہی۔ اس میں کبھی شہر کے مختلف طبقوں اور پیشہ وروں کا بیان کبھی ہمدردی کے رنگ میں کبھی تضحیک اور ہجو کے انداز میں ہونے لگا۔ اور آخر کار 'شہر آشوب' سے ایسی نظم مراد لی جانے لگی، جس میں کسی شہر کی تباہی اور اہلِ شہر کی بدحالی کا بیان ہو۔ اس طرح 'شہر آشوب' کی حسبِ ذیل تین قسمیں ہو گئیں:-

۱۔ ایسے قطعوں، رباعیوں، مختصر مثنویوں یا منفرد شعروں کا مجموعہ جس میں مختلف طبقوں اور پیشہ وروں کے لڑکوں کے حسن اور اُن کی دل کش اداؤں کا ذکر ہو۔

۲۔ ایسی نظم جس میں مختلف طبقوں اور پیشہ وروں کا ذکر ہمدردی کے رنگ میں یا تضحیک و ہجو کے انداز میں کیا گیا ہو، خواہ قصیدے کی شکل میں، خواہ مثنوی، مخمس یا مسدس کی شکل میں۔

۳۔ ایسی نظم جس میں کسی شہر کی تباہی اور اہلِ شہر کی بدحالی کا بیان کیا گیا ہو، خواہ کسی شکل میں ہو۔

'شہر آشوب' کی ہیئت اور موضوع کی توضیح کے بعد اب فارسی اور اُردو کے کچھ شہر آشوبوں کی کیفیت تاریخی ترتیب سے بیان کی جاتی ہے اور ان کے کچھ اشعار نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ اس طرح 'شہر آشوب' کے تدریجی ارتقا کا خاکہ سامنے آ جائے گا۔

شہر آشوب کا موجد

سب سے قدیم چیز جو 'شہر آشوب' کے نام سے ملتی ہے وہ مسعود سعد سلمان متوفی ۵۱۵ھ کے بانوے فارسی قطعوں کا مجموعہ ہے، جو ان کے کلیات میں شامل ہے۔ اس لیے ہم اسی قدیم شاعر کو 'شہر آشوب' کا موجد کہہ سکتے ہیں۔ ان قطعوں میں مختلف طبقوں اور پیشہ وروں کے لڑکوں کا ذکر ہے، جو یار اور دلبر کے لفظوں سے

کیے گئے ہیں۔ مثال کے لیے چند قطعے مع عنوانوں کے نقل کیے جاتے ہیں۔ ہر قطعے کا عنوان ایک مصرع ہے۔

صفت یار رنگریز گند

زحسنم زرد کرد آن رُخ رنگریز　　　　کہ بالاش سرو است و رُخ آفتاب
بشستش پس از رنگ آب دو چشم　　　　کہ شست آب ہجران آن ہر دو خواب
بلے ہر چہ رنگش کند رنگریز　　　　از آن پس بشوید مرا در آب

در حق دلبر خباز بگفت

آنکہ او بر دُکان ز بس خوبی　　　　ہمچو خورشید بر سپہر آمد
شد فتد از تنور چون دِل من　　　　بار دمہ رفت و باد و مہر آمد

صفت یار کبوتر باز است

اُنس تو با کبوتر است ہمہ　　　　ننگری از ہوس بجا کر خویش
ہم بساعت بر تو باز آید　　　　ہر کبوتر کہ رانی از بر خویش
رفتن و آمدن نبرد رہی　　　　چون بیاموزی از کبوتر خویش

صفت یار بربطی گفتہ

بتا زہرۂ آسمان جمالی　　　　چو زہرہ بمن بر تو فرخندہ فالی
کنار تو خالی نہ باشد ز بربط　　　　ز بربط نہ باشد بلے زہرہ خالی

اسی طرح بہت سے طبقوں اور پیشہ وروں کے لڑکوں کا ذکر ہے، جن میں سے چند یہ ہیں۔ عنبر فروش، چاہ کن، رقاص، آہن گر، بردہ فروش، کاتب، قصاب، طبیب، منجم، عطار، دیبا باف، شاعر، نجومی، چوگان باز، قلندر، لشکری، تیغ زن، کشتی گیر۔ بعض لڑکوں کا ذکر اُن کے اوصاف کے ساتھ کیا ہے، مثلاً نو خط، خوش آواز، زرین کمر، خوش رو، حاجی، فلسفی۔ بعض لڑکوں کا ذکر ان کے عیوب کے ساتھ کیا ہے، مثلاً نابینا، گنگ، احول، رگ زدہ، خط بر آوردہ، سیل چشم، گریاں۔ یہ قطعے مختلف بحروں میں ہیں اور ان میں بیتوں کی تعداد دو سے تین تک ہے۔

اِن قطعوں میں جن یاروں اور دلبروں کا ذکر کیا گیا ہے، عالم خیال کے سوا خارجی دُنیا میں اُن کا وجود نہیں، اور تفنن طبع کے سوا اِن قطعوں کی تصنیف کا کوئی مقصد نہیں۔ اِس قسم کے تمام شہر آشوبوں کا یہی حال ہے۔

اسی طرح کا ایک شہر آشوب امیر خسرو متوفی ۷۲۵ھ کی طرف منسوب کیا گیا، مگر غالباً کسی بہت بعد کے شاعر کی تصنیف

ہے۔ یہ شہر آشوب مثنوی کی مختصر چھوٹی چھوٹی تصنیفوں کے ساتھ کتاب جواہر خسروی میں شامل کر کے شایع کر دیا گیا ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ علی گڑھ یونیورسٹی کے کتب خانے میں بھی ہے۔ یہ شہر آشوب ستر شعر رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ ہر رباعی میں کسی لڑکے کے حسن و ادا، اس کی اداؤں کا بیان کیا گیا ہے۔ یہ لڑکے زیادہ تر پیشہ وروں کے ہیں، مثلاً بزاز پسر، حجام پسر، نجار پسر، زرگر پسر، بقال پسر، قصاب پسر، صراف پسر، حلاج پسر۔ لیکن بعض ایسے بھی ہیں جو کسی پیشے سے نہیں، بلکہ کسی قوم یا فرقے سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً ہندو پسر، ترسا بچہ، ترک زادہ، پسر زاہد، افغان پسر۔

شہر آشوب کی ادبی حیثیت

شہر آشوب رباعیوں کی صورت میں ہو یا قطعوں کی مختصر مثنویوں کی صورت میں ہو یا مثنوی و شہروں کی شاعری میں لفظی رعایتیں، ذومعنی لفظ اور فقرے اور اسی طرح کے دوسرے تکلفات کا استعمال اتنا زیادہ کرتا ہے کہ اپنے بیان کی بنیاد انہی چیزوں پر رکھتا ہے۔ اس لیے اُن کی حیثیت ادبی تصنیفوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔ ابتدا میں شہر آشوب کی تصنیف کا مقصد بھی تفنن طبع کے سوا کچھ معلوم نہیں ہوتا۔

رباعیات شہر آشوب منسوب بہ امیر خسرو

جو شہر آشوب امیر خسرو کی طرف منسوب ہے، اس کی چند رباعیاں ملاحظہ ہوں۔

درصفت بزاز پسر

بزاز پسر ز خاصہ اش جور و جفاست　　با زلف سیاہ تافتہ طرفہ بلاست
منشور رخ بدین او ست ظلم و بیداد　　کز آب نیاز راہ او دیدۂ ماست

درصفت حجام پسر

حجام پسر بخوبی و رعنائی　　وی آئینہ بنمود بدان زیبائی
گفتم صنما در بت آیم نایم؟　　فریاد برآورد کہ نائی نائی

درصفت رنگریز پسر

رنگریز بچہ کہ دلم بیقرار اوست　　کش رو بہ عشوہ رنگ نمودن شعار اوست
شوخانہ اشک چشم مرا آل کردہ است　　در شہر ہر کجا رخ زردیست کار اوست

درصفت بقال پسر

بقال پسر کہ راحت جان آمد　　یک گل ز رخش ہزار بستان آمد

رویش پس پچہ ترازو می تاخت گوئی کہ مگر ماہ بمیزان آمد

در صفتِ ترسا بچہ

اے بُت بسر مسیح گر ترسائی بایدکہ ببوسے بندہ بے ترس آئی
گر چشم ترم بہ آستین پاک کنی گہ برلب خشک من لب ترسائی

[ش]ہر آشوب کی غلط مثالیں امیر خسرو نے اپنے فارسی اشعار میں جو ہندی لفظ اور فقرے جا بجا داخل کر دیے ہیں، ان کی مثال میں حافظ محمود خاں شیرانی نے اپنی کتاب پنجاب میں اُردو میں یہ رُباعی [پی]ش کی ہے:

تیلی پسرے کہ می فروشد تیلے از دست و زبانِ چرب او واویلے
خانے بہ بہش دیدم و گفتم کز ٹل است گفتار کہ رو نیست درین تل تیلے

[او]ر اس رُباعی کو "از قسم شہر آشوب" قرار دیا ہے لیکن صرف ایک رُباعی پر شہر آشوب کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ آگے چل کر فرماتے [ہی]ں: اشعار ذیل بھی صنف شہر آشوب سے تعلق رکھتے ہیں:

رفتم بہ تماشا بہ کنارِ جوئے دیدم بہ لب آب زن ہندوئے
گفتم صنما چیست بہائے مویت فریاد برآورد کہ دُر دُر موئے

[اس] رُباعی کو صنفِ شہر آشوب سے کوئی تعلق نہیں۔ اس میں کسی پیشہ ور لڑکے کا ذکر نہیں ہے۔ صرف ایک فقرہ 'دُر دُر موئے' [آ]جا گیا ہے جو ذو لسانین بھی ہے اور ذو معنیین بھی۔ اس فقرے کو اگر فارسی سمجھیے تو ایک معنی نکلتے ہیں اور اگر ہندی سمجھیے تو دوسرے [مع]نی نکلتے ہیں۔[1]

---

[1] محمد عبدالباسط باسط امیٹھوی (متوفی ۱۱۹۶ھ) نے اپنی کتاب منارۃ الضوابط میں امیر خسرو کا اسی طرح کا ایک شعر لکھا ہے جو حسب [ذ]یل ہے:

گفتم کہ درین خانۂ ماموں تو مانم گفتا کہ درین خانہ بلا نیست ممانی

اس شعر میں دو لفظ ماموں اور ممانی ذو لسانین اور ذو معنیین ہیں۔ باسط نے اسی مقام پر امیر خسرو کی ایک رُباعی بھی لکھی ہے جو ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

داریم آرزو کہ حکایت کنیم بات لالہ غلام روئے تو صد برگ زیر پات
ہر برہمن کہ دید رُخ خوبت اے صنم زنّار را گسست و لکہ زد بروئے لات

[اس] رُباعی میں نشان زدہ الفاظ پر ہندی ہونے کا دھوکا ہوتا ہے مگر وہ فارسی ہیں۔ بات یعنی با تو، 'لالہ' ایک مشہور و معروف پھول، پات [یع]نی پائے تو، لات ایک بُت کا نام۔ منارۃ الضوابط کا ایک قدیم اور خوش خط لیکن ناقص نسخہ میرے کتب خانے میں موجود ہے۔
ادیب

اکبر بادشاہ اور شہر آشوب

اکبر کے عہد کی تصنیف صنعت الاصناف کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اس کتاب کے دیباچے میں مصنف لکھتا ہے کہ ایک وقت بادشاہ نے کارخانۂ دولت کی طرف توجہ فرمائی۔ صنعت گروں کی صنعت ملاحظہ کی اور جس کسی کی صنعت دیکھی اس کے بارے میں ایک شعر کہہ دیا۔ چنانچہ چھیپی گر کی تعریف میں یہ مطلع کہا:

دلبر چھیپی گر او در حسن بے ہمتا بود   حرف ہائے چاپۂ او سرنوشت ما بود

اسی حال میں حکم ہوا کہ شعرا صنعت گروں اور پیشہ وروں کے حسن کی تعریف میں اشعار کہہ کر بادشاہ کے حضور میں پیش کریں۔ شاعروں نے اس حکم کی تعمیل کی اور شاہی عنایتوں سے سرفراز ہوئے۔ میں نے بھی چند شعر وضع کیے اور الطافِ خسروانہ سے مستفیض ہوا۔ چونکہ بادشاہ نے مجھ پر سب سے زیادہ توجہ اور عنایت فرمائی، مندرجہ ذیل قطعہ نظم ہوگیا:

خسرو عادل سخن پرور ثانی   شاہ اکبر شہ فلک مقدار
شد ز راہ لطف خود شبے   گل فشاں شد گہر اشعار
ہمہ ز نقد و پیش کشش کردند   از دو بخشش ولے شہوار
بہر لطف خود او ...   بر ہمہ اندک و بر من بسیار
گرچہ من عاجز بودم و ہمہ گل   من شدم گل بہ پیش من ہمہ خار

درباہت داعیں آثر ... سے یہ رسالہ ترتیب دیا اور صنعت الاصناف اس کا نام رکھا، کہ خسرو ملک سخن کی نظر میں شرف قبول حاصل کرے۔

یوسف جرجانی کا شہر آشوب مسمّی بہ صنعت الاصناف

صنعت الاصناف میں کل ستر رباعیاں ہیں۔ ذیل کی رباعی سے شہر آشوب کی ابتدا کی گئی ہے۔

خدمتگر در بے عیش و دلخواہ است   بادشاہ دلّا نفع رساں چوں ماہ است
در عالم معنی شرفش بر زد ہمہ   از نام جہاں پناہ اکبر شاہ است

اس کے بعد اٹھاون رباعیوں میں مختلف طبقوں اور پیشہ وروں کے لڑکوں کی تعریف کی گئی ہے۔ آخری رباعی در تعریف یوسف (نام خود) جس پر شہر آشوب ختم ہوتا ہے یہ ہے:

یوسف سخن از بتاں بازار مگو   تا گم شدہ حکایت عشار مگو
در زاویہ بنشیں کہ خاموش شانند   خاموش نشیں بیہدہ و بسیار مگو

یوسف جرجانی کی چند رباعیاں صنعت الاصناف سے نقل کی جاتی ہیں:

ك صنعت الاصناف کا ایک قدیم قلمی نسخہ راقم کے کتب خانے میں موجود ہے۔

در تعریف شاعر پسر

شاعر پسرے کہ چون سخن شیرین است — در ملک سخن خسرو معنی بین است
ہم سرو قدش چو طبع او موزون است — ہم لعل لبش چو شعر او رنگین است

در تعریف آتشباز پسر

آتش بازے کہ آتش عشق افروخت — آتش بازی ز طرۂ خویش آموخت
در معرکہ کہ آتش افشانی کرد — یک چشم زدن تمام عالم را سوخت

در تعریف زرگر پسر

زرگر کہ دل از وفاش نازد مارا — در بوتۂ ہجر می گدازد مارا
از لطف بدست ما دہد خاتم لعل — تا حلقہ بگوشِ خویش سازد مارا

رسی میں شہر آشوب کا وجود

گِب ( ) نے اپنی کتاب 'ترکی شاعری کی تاریخ' میں مسیحی متوفی ۹۱۸ھ کی ایک نظم 'شہر انگیز' کا ذکر کیا ہے' جو اُس نے شہر ایدریا نوپل کے متعلق لکھی تھی اور عوئی کیا ہے کہ فارسی میں اس طرح کی کوئی نظم موجود نہیں ہے۔ پروفیسر براؤن نے اپنی تاریخ ادبیات ایران میں اس دعوے کو رتے ہوئے تحفۂ سامی کے حوالے سے لکھا ہے کہ فارسی میں کم سے کم ایسی دو نظمیں ضرور موجود ہیں' ایک وحیدی قمی کی نظم یٔے پر اور دوسری حرفی اصفہانی کی نظم گیلان پر۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تحفۂ سامی میں ایسی دو نہیں' چار نظموں کا ذکر کیا گیا ہے ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

لہی خراسانی کا شہر آشوب

سُلطان حسین میرزا کے زمانے میں آگہی خراسانی (متوفی ۹۳۲ھ) ایک فاضل انشا پرداز اور قصیدہ گو شاعر تھا' مگر اس کے مزاج میں خباثت اور حرصِ دُنیا بہت تھی۔ اُس نے ر خسرو کے قصیدے 'دریائے ابرار' کے جواب میں اہل ہرات کی ہجو میں ایک شہر آشوب لکھا' جس کے ابتدائی شعر یہ ہیں:-

عرصۂ شہر ہری رشک بہشت از زاست — در گہش را چشمۂ خورشید گل میخ زر است
جرم طین یک مشت خاک از خاک نیز خند قش — نرگس باغ جہان آرائے او ہفت اختر است
پائے تخت صد ہزاران خسرو گیتی کشاست — کہنہ تاریخ بسے شاہان انجم لشکر است
چرخ کج رو بین کہ از تاثیر او شہر چنین — مسکن جمع پریشان روزگار ابتر است

قصیدے میں رکیک الفاظ بہت آئے ہیں' جو ذکر کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ لیکن دو شعر جو خواجہ معین کیال کے لیے کہے گئے ہیں ہیں اُس کی تصویر کھینچ دی گئی ہے۔

اکبر بادشاہ اور شہر آشوب

اکبری عہد کی تصنیف صفت الاصناف کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اس کتاب کے دیباچے میں مصنف لکھتا ہے کہ ایک وقت بادشاہ نے کارخانۂ دولت کی طرف توجہ فرمائی۔ صنعت گروں کی صنعت ملاحظہ کی۔ جس کسی کی صنعت دیکھی، اُس کے بارے میں ایک شعر کہہ دیا۔ چنانچہ چھیپی گر کی تعریف میں یہ مطلع کہا:

دلبر چھیپی گر از درحسن بے ہمتا بود حرف ہائے چاپ او سرنوشت ما بود

اسی حال میں حکم ہوا کہ شعرا صنعت گروں اور پیشہ وروں کے حسن کی تعریف میں اشعار کہہ کر بادشاہ کے حضور میں پیش کریں۔ شاعروں نے اس حکم کی تعمیل کی اور شاہی عنایتوں سے سرفراز ہوئے۔ میں نے بھی چند شعر عرض کیے اور الطاف خسروانہ سے مستفیض ہوا۔ چونکہ بادشاہ نے مجھ پر سب سے زیادہ توجہ اور عنایت فرمائی، مندرجہ قطعہ نظم ہو گیا:

خسرو عالم سپہر رائی شاہ اکبر شہ فلک مقدار
شعرا را طلب نمود شبے کہ فشانند گوہر اشعار
ہمہ گفتند و پیش کش کردند از دُرِ نظم و روے شہوار
بہ ہمہ لطف نمود و بے بہ ہمہ اندک و بہ من بسیار
گرچہ من خار بودم و ہمہ گل من شدم گل بہ پیش من ہمہ خار

دربار سے واپس آکر میں نے یہ رسالہ ترتیب دیا اور صفت الاصناف اس کا نام رکھا، کہ خسروِ ملکِ سخن کی نظر میں شرفِ قبول حاصل کرے۔

یوسف بوجانی کا شہر آشوب مسمّیٰ بہ صفت الاصناف

صفت الاصناف میں کُل سو رباعیاں ہیں۔ ذیل کی رباعی سے شہر آشوب کی ابتدا کی گئی ہے۔

نقد سخنم زر بے غش و دلخواہ است بادشاہ و گدا نفع رساں چون ماہ است
در عالم معنی شہ فلش بر زرِ مہر از نام جہان پناہ اکبر شاہ است

اس کے بعد اشعار سے رباعیوں میں مختلف صنعتوں اور پیشہ وروں کے لڑکوں کی تعریف کی گئی ہے۔ آخری رباعی در تعریف یوسف نام خود، جس پر شہر آشوب ختم ہوا ہے، یہ ہے:

یوسف سخن از بتان بازار مگو تا کی باشد حکایت خار مگو
در زاویۂ فکر کہ خاموشانند خاموش نشین بیہدہ بسیار مگو

یوسف بوجانی کی چند رباعیاں صفت الاصناف سے نقل کی جاتی ہیں:

ملہ صفت الاصناف کا ایک قدیم قلمی نسخہ راقم کے کتب خانے میں موجود ہے۔

در تعریف شاعر پسر

شاعر پسرے کہ چوں سخن شیریں است   در ملک سخن خسرو معنی بیں است
ہم سرو قدش چو طبع او موزو نست   ہم لعل لبش چو شعر او رنگین است

در تعریف آتشباز پسر

آتش بازے کہ آتش عشق افروخت   آتش بازی ز طرۂ خویش آموخت
در معرکہ کہ آتش افشانی کرد   یک چشم زدن تمام عالم را سوخت

در تعریف زرگر پسر

زرگر کہ دل از وفاش نازد مارا   در بوتۂ ہجر می گدازد مارا
از لطف بدست ما دہد خاتم لعل   تا حلقہ بگوش خویش سازد مارا

فارسی میں شہر آشوب کا وجود

گب ([illegible]) نے اپنی کتاب "ترکی شاعری کی تاریخ" میں مسیحی متوفی ۹۱۸ھ کی ایک نظم "شہر انگیز" کا ذکر کیا ہے، جو اس نے شہر ایدریانوپل کے متعلق لکھی تھی اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ فارسی میں اس طرح کی کوئی نظم موجود نہیں ہے۔ پروفیسر براؤن نے اپنی تاریخ ادبیات ایران میں اس دعوے کو رد کرتے ہوئے تحفۂ سامی کے حوالے سے لکھا ہے کہ فارسی میں کم سے کم ایسی دو نظمیں ضرور موجود ہیں، ایک وحیدی قمی کی نظم تبریز پر اور دوسری حرفی اصفہانی کی نظم گیلان پر۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تحفۂ سامی میں ایسی دو نہیں، چار نظموں کا ذکر کیا گیا ہے جو ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

آگہی خراسانی کا شہر آشوب

سلطان حسین میرزا کے زمانے میں آگہی خراسانی (متوفی ۹۳۲ھ) ایک فاضل انشا پرداز اور قصیدہ گو شاعر تھا، مگر اس کے مزاج میں خباثت اور حرص دنیا بہت تھی۔ اس نے امیر خسرو کے قصیدے "دریائے ابرار" کے جواب میں اہل ہرات کی ہجو میں ایک شہر آشوب لکھا، جس کے ابتدائی شعر یہ ہیں:

عرصۂ شہر ہری رشک بہشت افزاست   در گلش را چشمۂ خورشید گل بیخ زر است
جرم طین یک مشت خاک از خاک او برخند فش   نرگس باغ جہان آرائے او ہفت اختر است
پائے تخت صد ہزاران خسرو گیتی گشاست   کہنہ تاریخ پسے شاہان انجم لشکر است
چرخ کج رو بیں کہ از تاثیر او شہر چنیں   مسکن جمع پریشان روزگار ابتر است

اس قصیدے میں رکیک الفاظ بہت آئے ہیں جو ذکر کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ لیکن دو شعر جو خواجہ معین کیال کے لیے کہے گئے ہیں ان میں اس کی تصویر کھینچ دی گئی ہے۔

از بس نشان پاے نجاست مدحت ار — اختر بہ زآبلہ بر روے آن بد اختر است

ششش از کثافت مبلغ نسر ودرا — گنبد کلیسیت لیکن لائق خاکستر است

مولانا احمد لبی جو احمد آتون کہلاتے تھے اور شاہ اسمٰعیل کے مقربوں میں تھے، اُن کے بیے یہ شعر کہا:

احمد آتون کے شیعی گئے سنتی بود — چون خیرابے کرشش رسادہ وکشش مرزا است

اس شہر آشوب سے ناراض ہو کر امیر خان حاکم ہرات نے آتون کا ہاتھ اور زبان کاٹ ڈالی۔

وحیدی قمی کا شہر انگیز

وحیدی قمی متوفی ۹۴۲ھ فرمالی وذہن جلی رکھتا تھا۔ اُس میں اور مولانا حیرتی مروی میں عمر بھر چشمک رہی اور دونوں نے ایک دوسرے کی نہایت رکیک ہجویں کہیں جو نقل کرنے کے قابل نہیں۔ وحیدی نے تبریز کے لیے ایک شہر انگیز بھی کہا، جس کے چند شعر یہ ہیں:

شہر ھذا کہ بہر شہر انگیز — از ھری آمدم سوے تبریز

تا وصف بتان تبریزی — ہم چو طوطی کنم شکر ریزی

وہ چہ تبریز رشک بہشت بہشت — مردمش خوب رو و پاک سرشت

نازنینان بہ ناز و محبوبی — در کمال لطافت و خوبی

اس شہر انگیز میں پسر شیشہ گر کی تعریف میں یہ دو شعر کہے ہیں:

دلبر شیشہ گر بہ رعنائی — مردم دیدہ راست بینائی

بسکہ شد شیشہ اش پسندیدہ — ہمچو عینک نہند بر دیدہ

ان شعروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وحیدی کا 'شہر انگیز' قدیم مفہوم میں شہر آشوب ہے۔

عشقی کا شہر انگیز

عشقی مکتب داری کرتا تھا۔ اُس نے تبریز کے لیے ایک 'شہر انگیز' کہا، جس کا ایک مصرعہ یہ ہے:

ہر کہ او عاشق نمد مال است — بر سر کوے عشق پامال است

حرفی اصفہانی کا شہر آشوب

حرفی اصفہانی گیلان گیا اور اُس شہر اور اہل شہر کی ہجو میں ایک 'شہر آشوب' لکھا۔ اُس پر مرتد ہونے کی تہمت لگا کر اُس کی زبان کاٹ ڈالی گئی۔

ذاتی لاری کا ایک مطلع

ذاتی لاری تبریز میں صحافی کا پیشہ کرتا تھا۔ شہر تبریز کی تعریف میں اُس کا یہ مطلع تحفۂ سامی میں نقل کیا گیا ہے:

ہر طرف شعلۂ و ہر گوشہ بلا انگیزیست — بہ تماشا قدمے نہ کہ عجب تبریزیست

اگر یہ کسی مسلسل نظم کا مطلع ہے تو وہ بھی شہر آشوب ہی کی قسم کی نظم ہوگی۔

تحفۂ سامی اور مذکورۂ بالا شہر آشوبوں کی نوعیت

تحفۂ سامی کا مصنف سام میرزا شاہ اسمٰعیل بانی سلطنت صفویہ کا فرزند تھا۔ اُس نے یہ کتاب ۹۵۷ھ میں لکھی۔ کتاب میں سات صحیفے ہیں۔ پانچویں صحیفے میں فارسی کے شاعروں کا ذکر ہے، صرف ان شاعروں کا جو مصنف کے ہم عصر تھے۔ سام میرزا کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آگہی اور حرفی کے شہر آشوب میں ہرات اور گیلان کے لوگوں کی سخت ہجو کی گئی تھی اور وحیدی قمی کے شہرانگیز میں وصف بتانِ تبریزی، یعنی تبریز کے مختلف پیشہ وروں کے لڑکوں کے حسن و جمال کا ذکر کیا گیا ہے۔ عشقی کے شہرانگیز کا صرف ایک ہی شعر سامنے ہے اور اس سے گمان ہوتا ہے کہ اس نظم کا موضوع بھی 'وصفِ بتانِ تبریزی' ہے۔ یہ چاروں شاعر سام میرزا کے ہم عصر تھے۔ ان کی زیرِ نظر نظموں میں دو ایسی ہیں، جن میں کسی شہر کے لوگوں کی ہجو کی گئی ہے اور دو ایسی ہیں جن میں مختلف طبقوں اور مختلف پیشہ وروں کے لڑکوں کے حسن کا ذکر کیا گیا ہے۔ شکل کے اعتبار سے ایک قصیدہ ہے، ایک مثنوی ہے اور دو کی کیا شکل تھی معلوم نہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں :-

> "تبریز اور ہرات کے علاوہ بعض اور شہر آشوبوں کا ذکر بھی تحفۂ سامی میں آیا ہے، مثلاً فغفور لاہجی کا شہر آشوب گرجستان، عشقی کا شہر آشوب تبریز۔ اسی طرح وجیہ الدین عبداللہ لسانی شیرازی کا شہر آشوب خطۂ تبریز۔"

میرے مطالعے میں تحفۂ سامی کا وہ ایڈیشن رہا ہے جو پٹنہ یونیورسٹی نے ۱۹۳۴ء میں شایع کیا تھا۔ اس میں نہ فغفور لاہجی کا ذکر ملتا ہے نہ لسانی شیرازی کے شہر آشوب کا۔ ڈاکٹر عبداللہ نے لسانی کا نام 'وجیہ الدین عبداللہ' لکھا ہے۔ یہ نام بھی تحفۂ سامی کے اس ایڈیشن میں موجود نہیں ہے۔

طاہر وحید کے 'ابیات در تعریف ہر فرقہ'

شاہ عباس ثانی صفوی (۱۶۴۲ء تا ۱۶۶۶ء) کے وقایع نگار طاہر وحید (متوفی ۱۱۲۰ھ و ۱۷۰۸ء عیسوی) نے اپنی ایک نظم میں ہر طبقے کے لڑکوں کا ذکر ایک دو شعروں میں اور بعضوں کا تین چار شعروں میں کیا ہے۔ یہ اشعار قدیم بیاض میں، جو میرے کتب خانے میں موجود ہے، 'ابیات در تعریف ہر فرقہ' کے عنوان سے درج ہیں۔ ان میں سے چند شعر نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں :

زرگر پسر

زرگر پسران نازک اندام | بستند ہمہ چو نقرۂ خام
خواہد دل خستہ پریشان | انگشتر زینہار ایشان

حداد پسر

حداد خبر ندارد از درد | بیہودہ چہ کوبم آہن سرد

نمار پسر

نمار پسر زند ہمیشہ   بر پائے دل از جور تیشہ
گاہے کہ نہادہ بسر کشیدہ   چون اژدہ امید من بریدہ

کمال

کمال کہ دلبری فن اوست   چشم روشن ز دیدن اوست

نعمت خان عالی کا قصیدۂ شہر آشوب

مدعا نگاری میں نعمت خان عالی کی مشہور کتاب وقایع محاصرۂ گولکنڈہ میں ایک قصیدۂ شہر آشوب ملتا ہے، جس میں اہلِ دکن کی پریشاں حالی بیان کی گئی ہے۔ یہ قصیدہ شہر آشوب کے عام مفہوم کے مطابق شہر آشوب ہے۔ لیکن اس میں شہر آشوب کے پرانے مفہوم کی صفت بھی موجود ہے، یعنی اس میں مختلف پیشوں اور پیشہ وروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس قصیدے کے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں:

دریں قحط خراب آمد ز روز آن ... ساختے   چو گنج افتادہ اند اہل ہنر در کنج ویرانے
بحدے شد رسیدہ خلق را افلاس و ناداری   کہ معنی ہم ندارد این زبان حرف سخندانے
سپاہی کہ بہ میدان قیامت می کند جولان   ز شمشیر و سپر دارد ہم آبے لب نانے
عجب از مطرب و رقاص دارد ... معنی   نباشد خوب تر از شربت دیدار دربانے
منجم را ... شد غیر از آنکہ از فلک حاصل   ز شمعت جوع چند قرص مہ را گردہ نانے
محاسب سال را ہم ہشت ماہ روزہ در دفتر   برائے آن کہ معلومش نہ شد شوال و شعبانے
نماندہ پیشۂ مشاطگی بہر زن رشتہ شد   مگر از عشق بازان دام گیرد رشتۂ جانے
رسد تا جان سپاری کار ... ز بہر ...   برائے سر فروشی چون ندارد بیعۂ پانے
دگر درازہ را از خانۂ خود راندہ از خست   مگر بر ریزۂ خوانش نمودہ تیز دندانے
نہ چندہ روے زر حجام اگر آئینہ ... شد   کہ یک مو در بساطش نیست غیر از چشم حیرانے
... روزی بہ علاج آتش است و پنبہ می گرید   برای نسبت برد بردار رفتن کار آسانے
ز گہ والی یکے پرسیدہ از روزت چہ ماند آیا   بگفت احوال اگر این است بہرے ساعتے تانے
... از خانۂ برخاست پرسیدم   چہ شد گفتند در این خانہ دارد گشت مہمانے
ز جانے غلغل شادی شنیدم گفت ہمسایہ   کہ شخصے دید شب در واقعہ پر آرد انبانے
یکے گفتہ خدا داد ... فتح پیغمبر   برائے قلعۂ گولکنڈہ کن ایجاد طوفانے

یکے می گفت اے رحمان بحق موسیٰ عمران — بیار از آسمان ترانگبین یا مرغ بریانے
یکے گفت اے خداوندکریم از حرمت موسیٰ — براے ما فرست امروز ہم چون مائدہ خوانے
یکے می گفت بہر قرض وادن خلق کن یارب — یہودے، ہندوے، نصرانیے، گبرے، مسلمانے

یکتاخوشابی کا جہان آشوب

احمد یار خان یکتا خوشابی خلد مکان (شہنشاہ اورنگ زیب) کے اواخر عہد میں ملک سندھ کا صوبہ دار تھا۔ مثنوی خوب کہتا تھا۔ ایک مثنوی عالم گیر کے مرثیے میں کہی جس کا نام 'جہان آشوب' رکھا۔ اس کے دو شعر یہ ہیں:۔

امیران کہن بے قدر و قیمت — چو مال مردہ پامال غنیمت
ہمہ در خاک بے قدری فسردہ — چو شمشیر اصیل زنگ خوردہ

(تذکرہ بے نظیر)

فارسی کے کل شہر آشوبوں کا پتا لگانا مقصود نہیں ہے۔ اوپر جن شہر آشوبوں کا ذکر کیا جا چکا ہے وہ شہر آشوب کے لغوی اور اصطلاحی معنی اور اس کے بنیادی یا ابتدائی اور ثانوی یا توسیعی مضمونوں اور ہیئتوں کی توضیح کے لیے کافی ہیں۔

اُردو شہر آشوب کی ایک مشکوک مثال

اُردو میں متعدد شہر آشوب کہے گئے ہیں۔ فرہنگ آصفیہ میں ذیل کا قطعہ شہر آشوب کی مثال میں پیش کیا گیا ہے اور امیر خسرو کی طرف منسوب کیا گیا ہے:۔

ہندو بچہ بین کہ عجب حسن دھرے چھے — بر وقت سخن گفتن مکھ پھول جھرے چھے
گفتم ز لب لعل تو یک بوسہ بگیرم — گفتا کہ ارے رام ترک کاہیں کرے چھے

یہ قطعہ امیر خسرو کی تصنیف ہو یا نہ ہو، اس میں شک نہیں کہ کسی قدیم شاعر نے اُس ابتدائی دور میں کہا ہے، جب فارسی اور ہندی کی آمیزش سے اُردو کا پیکر تیار ہو رہا تھا۔ اس ایک قطعے کو انفرادی حیثیت میں شہر آشوب نہیں کہہ سکتے۔ مگر ممکن ہے کہ یہ کسی مجموعۂ قطعات میں شامل ہو، جس کو مجموعی حیثیت سے شہر آشوب کہہ سکتے ہوں۔

شمالی ہند میں اُردو شاعری کا عام رواج محمد شاہ کے عہد میں ہوا۔ اس عہد کے کئی شاعروں نے شہر آشوب کہے ہیں، جن میں زمانی ترتیب قائم کرنا مشکل ہے۔ اس لیے ان ہم عصر شاعروں کے شہر آشوب بلا لحاظ ترتیب پیش کیے جاتے ہیں۔

ناجی کا شہر آشوب

محمد شاکر ناجی محمد شاہی عہد کے نامی شاعر تھے۔ ان کے بارے میں آزاد آبحیات میں لکھتے ہیں:۔

"نادری چڑھائی اور محمد شاہی لشکر کی تباہی میں خود شامل تھے۔ اس وقت دربار کا رنگ، شرفا کی خواری، پاجیوں کی گرم بازاری اور اس پر ہندوستانیوں کی آرام طلبی اور

... چوری کی ایک مردوئی مخمس میں موجود ہے۔
... سے اس مخمس کو شہر آشوب کہہ سکتے ہیں۔ ... نے اس مخمس کے حسب ذیل دو بند نقل کیے ہیں:

لے ہوئے تو برس بیٹی ان کو بیچتے تھے　　دغا کے زور سے دال دوا کی بیچتے تھے
شہر میں گھر کی شال منہ سے بیچتے تھے　　جو نقش میں نہ بر آیا کر بیچتے تھے
گلے میں جھنیاں باندھ کر پھرتے کنگال

قضا سے بچ گیا مرنا نہیں تو ٹھانا تھا　　زمیں تسان کے ہاتھ اوپر تانا تھا
نہ پانی پینے کو پایا، نہ دانہ کھانا تھا　　بہے تھے دھان جو لشکر تمام چھانا تھا
نہ ذوق صبح و دوران نہ فکر و قتال

انہی کے یہ دونوں بند چند مصرعوں کی تبدیلی کے ساتھ مجموعہ نغز میں بھی نقل کیے گئے ہیں۔

کمترین کا شہر آشوب

... خان کمترین ... ان کے برجستہ اور پر درد ... [illegible] ... عبارت لکھتے تھے۔ ... تذکرہ گلزار ابراہیم میں لکھتے ہیں: ... شہر آشوب ... نکات کے وقت ... ہفت صد شعر ... شہر آشوب ... [illegible] ... اگر ... یہ بیان صحیح ہے تو شاید اس سے زیادہ طویل شہر آشوب نہ فارسی میں کہا گیا اور نہ اردو میں ... سو شعر ... صرف پانچ شعر میر نے نکات الشعرا میں اور پانچ ... میر حسن نے اپنے تذکرہ شعرا میں نقل کیے ہیں ... خوف تہذیب ہیں کہ تذکرہ میر حسن کے پچھلے مطبوعہ ایڈیشنوں میں حذف کر دیے گئے۔ ان شعروں میں ... [illegible] ... وغیرہ دو ... اور ... کی ہجو کی گئی ہے۔

ان شعروں پر نظر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ کمترین کے شہر آشوب میں مختلف پیشوں کے آدمیوں کی ہجو ایک ایک ... میں کی گئی ہے اور ان شعروں میں ایک ... کی پابندی نہیں کی گئی ہے۔

حاتم کی بارہ صدی

شاہ حاتم کی دو نظمیں بارہ صدی ... [illegible] ... قدیم بیاض میں شامل ہیں۔ دونوں شکل میں مخمس اور موضوع کے اعتبار سے شہر آشوب ہیں۔ ان میں سے ایک نظم شہر آشوب حاتم دہلوی کے عنوان سے ... نقوش ... کے ... کے شمارے میں شائع کر دی گئی ہے جس میں اکیس بند ہیں ... مگر ... بند ایسے موجود ہیں جو نقوش میں نہیں ہیں۔ ان میں ایک اس نظم کا پہلا بند ہے اور ایک ... کا۔

... [illegible] ... شائع کردہ ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد، [illegible]

اس مخمس کا پہلا بند، جس سے واضح ہوتا ہے کہ لفظ 'بارہ صدی' سے حاتم کی مراد ہے بارھویں صدی ہجری جس میں اُن کی زندگی گزر رہی تھی، حسب ذیل ہے :-

تو کھول چشم دل اور دیکھ قدرت کرتار کہ جن نے ارض و سما اور کیا ہے لیل و نہار
زمانے سیں نگار اسما تو دھر کے دوار کہ دور بارہ صدی کا ہے سخت ناہنجار
جہاں کے باغ میں یکساں ہے اب خزاں و بہار

اس آخری بند یہ ہے :-

کرے ہے چرخ اگر تجھ اُپر جفا حاتم تو سفلے پاس نہ کر جا کے التجا حاتم
ترے ہے رزق کا ضامن سدا خدا حاتم تو انقلاب زمانے کا غم نہ کھا حاتم

تیسرا بند جو نقوش میں نہیں ہے حسب ذیل ہے :-

ذکر تو جا بجا کر نقارچی کی نوبت ہے مصاحبت کی اگر جد اس کو خدمت ہے
کمینہ قوم کو ہر اک مکان پہ عزت ہے تو کیا ہوا کہ رذالے کی زر پہ نیت ہے
ہے افتخار نجیبوں کا فخر و عزت و عار

حاتم کے اس شہر آشوب کا بنیادی موضوع وہ سماجی انقلاب ہے، جو نادر شاہ کے حملے سے وجود میں آیا تھا اور جس کے نتیجے میں معاشی نشیب و فراز میں کچھ ہمواری پیدا ہو رہی تھی۔ یعنی اونچے طبقے کچھ نیچے اتر رہے تھے اور نیچے طبقے اوپر اٹھ رہے تھے۔ حاتم اونچے طبقے کے آدمی تھے۔ وہ اس انقلاب کو ایک مصیبت عظیم سمجھ رہے تھے۔ اسی کے ساتھ ان کو حاکموں، امیروں، منصب داروں اور اہلکاروں کی بداخلاقی اور بداعمالی کی شکایت بھی تھی۔ اس شہر آشوب کے کچھ ٹکڑے نقل کیے جاتے ہیں :-

شہروں کے بیچ صداقت کی کچھ نشانی نہیں ۔ امیروں بیچ سپاہی کی قدردانی نہیں
بزرگوں بیچ کہیں بات مہربانی نہیں تواضع کھانے کی جا ہو کہیں ریا نی نہیں
گیا جہان سے بازار سخاوت و پیار

یہاں کے قاضی و مفتی بنے ہیں شحنہ یہاں کے دیکھو سب اہلکار ہیں گے چور
یہاں کرم ہے نہیں دیکھتے ہیں اور کی اور یہاں سبھوں نے عبادت کی ہے دل تو ترک و گور
یہاں نہیں ہے مدار منصب و داد و مدار

امیرزادے ہیں جب اوا اپنے حال کے بیچ گئے آفتاب پہ اب آگئے زوال کے بیچ

رذالے آج نئے بیچ زر کے ماتے ہیں پہن لباس زری سب کو کر دکھانے ہیں

نظر میں آتے ہیں پر جیسے آدھ آنے کے   کھلتے پھرتے ہیں پو پو کے دھیلے کے

شگفتہ سب ہے جو ک آن بھولا دے کا   بھلا دیکھیے نصیبوں سے نرخ گالے کا

پھریں ہیں پکھے جہاں ڈی آج تیلی کے   ملیں ہیں تیل سدا بیچے اور چنبیلی کے
جو نفے ہیں صاحب مال و زر دو حویلی کے   رکھیں ہیں شوق سدا دل کے بچا بیلی کے
گئے ہیں بھول غضب قدیم باش و جوار
حرام خور جو تھے اب حلال خور ہوئے   جو چور تھے وہ ہوئے شاہ شاہ چور ہوئے
جو زیر دست تھے سرا دہ دوزی اپنی دو ہوئے   جنوں کو زور تھا سو اب مثال مور ہوئے
جو خاک چھانتے تھے سو بنے زردار
پھرا ہے میوہ فروشوں کے پستہ و بادام   نظر میں وقا نہیں اپنے صاحبوں کو غلام

جہاں میں صاحب عزنی خانہ گماشتے ہیں   محل جنوں کے تھے ان کو گھنڈ ملے ہیں

جنگل کو چھوڑ کے جو آ بسے ہیں بستی میں   نصیب چھوڑ کے شہروں کو ہیں جنگل میں خوار

عجیب خانہ بدوش ایک ہیں اور دو گردش   ہے باغبان کے گھر میں بہار جوں گلزار

جہاں میں صاحب شمشیر ہوئے ہیں مبتذل گھر   ہے پتلہ سینوں کا مشغو سدا دکان اور گھر
ہمیشہ نازاں ہیں بھر بھرے اپنے بستروں پر   امیر زادہ دہ طاقی دیکھے ہیں گھر گھر
بانہ تماشہ رشک نقش و نگار
ڈوروں کے بیچ صنائی نہیں ہے یاد وہیں   کہیں جو جھکے بھی شاید تو اب ہزاروں ہیں
صندوق سانپ کے زر ہے بھرا انباروں میں   جو تھے بیش سو فکر ہیں اب سوالوں میں
گدائیوں کے جو ہے ہیں سردار

...کی دوسری بارہ صدی

حاتم کی دوسری بارہ صدی میں بھی کچھ اسی طرح کی باتیں کہی گئی ہیں۔ چند ...
ملاحظہ ہوں۔

وقت جو امرا قلعے میں آتے ہیں — بنی ہے جوڑ کی وضع کیا کیا ہمیں دکھاتے ہیں

میں ہیں ٹھسے پیچ و تاب کھاتے ہیں — کتے خراب ہیں اور کتنے زک اٹھاتے ہیں

غرض خدا بھی یہی اشد رنجیں دکھاتے ہیں

دور ہے شرفا کا کچھ نہیں روزگار — بہت عجیب قسم زندگی سے ہیں بیزار

مے پیسے پیسے ہیں حد ادائی خوار — کہو تو کس طرح ہمیشہ سپہ گری کا وقار

بہادر ہائے غضب ہیجڑے کماتے ہیں

نقدی کی بالکل طلب رو بیٹھے — بہت امیر جنیدوں سے ہاتھ دھو بیٹھے

دوں طرف صوبہ دار ہو بیٹھے — جہاں پناہ بھی ملک کو ڈبو بیٹھے

دلیک ڈورے تو بھی دھکے کھاتے ہیں

دیکھتے ہی کچھ زمانہ اور آیا — دوں سے ہو گئی اب جفا و جور آیا

کیا کریں دنیا کا اور طور آیا — لیے پھیل گئے پاجیوں کا دور آیا

گلی و کوچوں میں بن کے ہمیں دکھاتے ہیں

میں اس بند کے آخری مصرعے کی شرح کی گئی ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ نیچے طبقے کے لوگوں کی مالی حالت
خود آرائی اور خودنمائی کا شوق تو پیدا ہو گیا ہے لیکن سلیقہ ابھی نہیں آیا ہے۔ مختلف پیشے والوں کی
مف انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً

ے کی کمر بندھے کے چلے بن ٹھن — پھرا سرے ٹاٹ کو سیر و کی سمن

نقد کی چوگان لینے کو جیسے من — پھرے ہیں کھیلتے میدان کر کے گھر آنگن

پھر ان کے باپ بھی اس کو دیکھنے جاتے ہیں

نی پیچے بھی کہ بھت کو طلب کندی — منڈے ڈاڑھیاں کو پچھوں لگے پیوندی

سیٹی ہوتے ہیں جو کہ کی غنڈی — پھریں ہیں لیتے ہیں باٹ گھاٹ میں رندی

ہمیشہ یہی رسا ہی لٹا ڈھلاتے ہیں

ر چھوڑ کرے ادب تہ تشتے کا — کسی کو زور دکھاتا پھرے ہے نیکے کا

سل پہ دم اٹھاتا ہے کھنچے کا — پھرے ہے سی کو نباتا رہ زور سے کا

دو چار یا پچھوں گھنگروٹ آتے ہیں

گنڈیاں پہرے خرکے مرسی کے — لا بر نی بوٹ بجے پائجامے سوسی کے

ہیں گنڈیاں و سرخ تبرکی کے — پھریں ہیں اڑتے ہوئے اوٹی ٹکٹی

مقصد دروازہ کا جھنڈیوں سے سجاتے ہیں

اس مخمس کے اشعار بند کے ہیں اور یہ نا تمام ہے۔ مقطع موجود نہیں ہے۔ اس کی زبان میں اتنی خامیاں ہیں کہ یہ قائم کا کلام نہیں معلوم ہوتا۔

شفیق کا قصیدہ 'حسب حال زمانہ'

لچھمی نرائن صاحب شفیق اورنگ آبادی نے 'حسب حال زمانہ' کے عنوان سے ایک قصیدے کی شکل کا شہر آشوب لکھا، جس کے ابتدائی شعر یہ ہیں:

ایک دن دل نے کہا مجھ سے کہ صاحب سنو ادھر — کیوں ریاست دکن ہوئی ایسی ذلیل اور بے جگر

اس دکن کے بیچ پچھلے وقتوں کے تھے بادشاہ — عادل اور فیاض، صاحب عزم اور صاحب ہنر

ان کی دولت میں مرفہ الحال سبھی خوش حال تھے — کیا رعیت کیا سپاہی کیا امیر نامور

آسماں وہی ہے اور وہی زمیں خلقت ہے وہ — پھر ہوئی کس واسطے یہ زندگانی مختصر

شامت نیت سے یا تدبیر میں ہے کچھ قصور — تب تو دشواری پڑی ہے ہر کسی کو اس قدر

یہ پورا قصیدہ سامنے نہیں ہے۔ اس لیے اس کی نوعیت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

میر حسن کی رباعیات در تعریف اہل حرفہ

میر حسن کے کلیات میں 'رباعیات در تعریف اہل حرفہ' کے عنوان سے تیرہ رباعیاں ہیں جن میں نقاش، صباغ، خیاط، کندلہ کش، زرگر، سقا، باغبان، تیلی، جلاد، نمدوں، بقال اور عطار کے پیشوں کا ذکر اس انداز سے کیا گیا ہے:

سقے کا پسر سب کو وہ بھلا لگتا ہے — اس خوبی سے دو گھڑی آتا ہے

وہ چاہ سے کھینچتا ہے ڈول کو جب — ہاتھ سے اس کے دل بھر آتا ہے

عیار شرارت ہے یہ تنبولی — کرتا ہے اور گرہ نہ اپنی کھولی

ہوشیار و غنودہ آپ و آوارہ دل کی ہے — جو کچھ کر شناسا حق سب اصول

ان رباعیوں کا مجموعہ شہر آشوب جیسا پیشہ ابتدائی مفہوم میں۔

سودا کا قصیدہ شہر آشوب

سودا کے دو شہر آشوب ہیں، ایک قصیدے کی شکل میں اور ایک مخمس کی شکل میں۔ قصیدہ شہر آشوب میں چھپا ہوا ہے شہر کی تباہ حالی کا نقشہ ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے:

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے — دعویٰ نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زباں ہے

---

۱۵ مقدمہ چمنستان شعراء صفحہ ۲۳

اس قصیدے میں اہلِ دہلی کی مفلسی اور اہلِ کمال کی بے قدری اس انداز سے بیان کی گئی ہے کہ قصیدے میں ہجو کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ چند شعر نمونے کے طور پر نقل کیے جاتے ہیں:

گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی ۔۔۔ تنخواہ کا پھر عالمِ بالا پہ نشاں ہے
گزرے ہے سدا یوں علف و دانہ کی خاطر ۔۔۔ شمشیر جو گھر میں تو سپر بنئے کے ہاں ہے
سوداگری کیجے تو ہے اس میں یہ مشقت ۔۔۔ دکھن میں بکے وہ جو خرید صفاہاں ہے
قیمت جو چکاتے ہیں سو اس طرح کہ [illegible] ۔۔۔ بیچے ہے فروشندہ پہ دزدی کا گماں ہے
ملا کی اگر کیجیے تو [illegible] ۔۔۔ [illegible]
اور شاعری [illegible] اب کیا میں بتاؤں ۔۔۔ [illegible]
دن کو [illegible] وہ پڑھایا کرے لڑکے ۔۔۔ شب [illegible]
وہ بیت [illegible] ۔۔۔ [illegible]
وہ [illegible] ۔۔۔ [illegible]
چاہے جو کوئی شیخ بنے [illegible] ۔۔۔ [illegible]
دنیا [illegible] ۔۔۔ [illegible]
دنیا میں تو آسودہ کوئی ہے [illegible] ۔۔۔ [illegible]
[illegible] ۔۔۔ [illegible]
یاں [illegible] ۔۔۔ [illegible]

مندرجہ بالا اشعار مختلف مقامات سے چنے گئے ہیں۔ شاعر نے اپنے زمانے کے طبیبوں اور شاعروں کی جو حالت بیان کی ہے وہ درج ذیل ہے [illegible] نقل کرتے ہیں:

طبیب

[illegible] ۔۔۔ [illegible]
[illegible] ۔۔۔ [illegible]
دیتے ہیں [illegible] ۔۔۔ [illegible]
[illegible] ۔۔۔ [illegible]
[illegible] ۔۔۔ [illegible]
[illegible] ۔۔۔ [illegible]
اس میں جو کہیں [illegible] ۔۔۔ [illegible]

رکھتے ہیں فرض مرگ سے ڈرنے کو سب یہاں　　گر ذکر کچھ یہ صحبت کی کان ہے

شاعر

شاعر جو تھے سب آتے ہیں مستغنی الاحوال　　دیکھے جو کوئی فکر و تردد کو تو یاں ہے
مشتاق نکات مضموں کا کس و ناکس　　مل جائیں اُس سے جو فلاں ابن فلاں ہے
گر عید کا مسجد میں پڑھیں جا کے دوگانہ　　نیت کو عوض تہنیت خان زماں ہے
تاریخ تولد کی رجب آٹھ پہر فکر　　گر رحم میں بیگم کے سنیں نطفہ خاں ہے
استاد حسین جو ترکیبیں مرثیہ لیا　　پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے

سودا کا مخمس شہر آشوب سودا کا دوسرا شہر آشوب چھتیس بند کا مخمس ہے۔ اس میں بھی دہلی کی تباہی، وہاں کے نوکروں کی بے روزگاری، امیروں کی پریشان حالی اور شریفوں کی کس مپرسی کا بیان ہے۔

اس شہر آشوب میں بھی کہیں کہیں ہزل کا رنگ بہت گہرا ہو گیا ہے۔ چند بند نقل کیے جاتے ہیں:

کہا میں آج یہ سودا سے کیوں تو ڈانواں ڈول　　پھرے ہے جا کہیں نوکر ہو لے کے گھوڑا مول
لگا وہ کہنے یہ اس کے جواب میں دو بول　　جو میں کہوں گا تو کہوے گا بات ہے یہ ٹھٹھول
بتا کہ نوکری بکتی ہے ڈھیریوں یا تول

سپاہی رکھتے تھے نوکر امیر دولت مند　　سو آمد اُن کی تو جاگیر سے ہوئی ہے بند
کیا ہے ملک کو مدت سے سرکشوں نے پسند　　جو ایک شخص ہے بائیس صوبے کا خاوند
رہی نہ اس کے تصرف میں فوجداری کول

بسی اُن کا ملک میں ارلسی جو یوں ہو تباہ　　زرہ و زرہ جو زراعت میں تو نہ دیں پرکاہ
بنے وہ راہ بھی نوکر رکھیں یہ جس پہ سپاہ　　کہاں سے آویں پیادے کریں جو پیش نگاہ
کہو سوار جو بیچیں وہ بادہ کے مول

رہی تھی دولت کی بات پر اُنھوں کی شان　　جو جا ہوا اس کرنے بکرائیں تو یہ کیسا احسان
بڑاں کا گھر ہے تضیحت خرچ پر حسرت آن　　رہے کا حال اگر ملک کا یہی تو ندان
بجے ہیں تاشہ کہ مردوں کے پائنتی میں ڈھول

تجمل ہو یہ مسماسے زمیں بہت پھائی　　کئی وہ مشوری تھیلیں ہیں ہو سوا یافتی
تمام گھر ہے تبسیر ملک میں کائی　　خدا ان کو اُٹھے جل کر گھر اینٹ کا مانی
پڑے ہے زخم ہی ہراک جانے قوت بہلول

ؔ کلیات سودا کے دو مطبوعہ نسخوں کی مدد سے بھی یہ مصرعہ ٹھیک نہیں پڑھا جا سکا۔ (ادیب)

پڑے جو کام انھیں تو نکل کے کھائی سے — رکیں وہ فوج جو مرتی پھرے لڑائی سے
پیادے ہیں سو ڈریں سر منڈاتے نائی سے — سوار گر پڑیں سوتے ہیں چارپائی سے
کرے جو خواب میں گھوڑا کسی کے نیچے اول

نہ صرف خاص میں آمد نہ خالصہ جاری — سپاہی تا منصدی سبھوں کو ہے بے کاری
اب آگے دفتریوں کی کہوں میں کیا خواری — سوال دستخطی کر پھاڑ کر کے پنساری
کسی کو آنور دے باندھ اور کسی کو گڑل

یہ جتنے نقدی و جاگیر کے تھے منصب دار — تلاش کر کے ڈھیلے انھوں نے ہو ناچار
تمام شہر میں بنیوں کے دی سپر تلوار — گھروں سے اب جو نکلتے ہیں لے کے وہ ہتھیار
بغل کے بیچ تو سونٹا ہے ہاتھ میں کچکول

امیر اب جو ہیں دانا انھوں کی ہے یہ چال — بولے ہیں خانہ نشیں دیکھ کر زمانے کا حال
بچھا ہے سوزنی خوجہ کھڑا جھلے ہے رُمال — حضور بیٹھے ہیں اک دو ندیم اہل کمال
دھری ہے سامنے ایک پیکدان اک تنبول

سوز بڑے زندہ دل تھے۔ جن باتوں پر دوسرے روتے اُن پر وہ ہنستے تھے۔ لیکن اپنے شہر کی تباہی سے وہ بھی آخرکار بہت متاثر ہوتے۔ آخر ہنستے ہنستے رو دیے اور شہر آشوب کا آخری حصہ دلّی مرحوم کا مرثیہ بن گیا۔ چند بند ملاحظہ ہوں:

خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ پاس — کہ جن کے دیکھے سے جاتی رہی تھی بھوک اور پیاس
اور اب جو دیکھو تو دل ہوئے زندگی سے اداس — بجائے گل چمنوں میں کمر کمر ہے گھاس
کہیں ستون پڑا ہے کہیں پڑے ہیں مزول

یہ باغ تھا کہ کسی کو نظر نہیں معلوم — نہ جانے کس نے بٹھایا یہاں قدم وہ کہاں تھا شوم
جہاں تھے سرو و صنوبر اب اس جگہ ہے زقوم — پھلی ہے زاغ و زغن سے اب اس چمن میں دھوم
گلوں کے ساتھ جہاں بلبلیں کریں تھی کلول

عجیب زادیوں کا ان دنوں ہے یہ معمول — وہ برقع سر پہ ہے جس کا قدم تلک ہے طول
ہے ایک گود میں لڑکا گلاب کا سا پھول — اور اُن کے حسن حسب کا جواب ہے یہ اصول
کہ خاک پاک کی تسبیح ہے جو بیچے گول

جہان آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا — مگر کبھو کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا
کہ یوں مٹا دیا گویا کہ نقش باطل تھا — عجب طرح کا یہ بحر جہاں میں ساحل تھا

رکھتے ہیں غرض مرگ سے لڑنے کو سپاہی　　گر ذکر کا مجموعہ طبابت کی کماں ہے

شاعر

شاعر جو نئے جاتے ہیں مستغنی الاحوال　　دیکھے جو کوئی فکر و تردد کو تو یاں ہے
مشتاق ملاقات انھوں کا کس و ناکس　　ملنا انھیں اس سے جو فلاں ابن فلاں ہے
گر عید کا مسجد میں پڑھیں جا کے دوگانہ　　نیت قطعۂ تہنیت خان زماں ہے
تاریخ تولد کی رجب آٹھ پہر فکر　　گر رحم میں بیگم کے ستیں نطفۂ خاں ہے
استغاثہ کسو مر تو کہیں مرثیہ ایسا　　پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے

(۱) **سودا کا مخمس شہر آشوب** سودا کا دوسرا شہر آشوب چھتیس بند کا مخمس ہے۔ اس میں بھی دہلی کی تباہی، وہاں کے نوکروں کی بے روزگاری، امیروں کی پریشان حالی اور شریفوں کی کس مپرسی کا بیان ہے۔ اس شہر آشوب میں بھی کہیں کہیں ہجو کا رنگ بہت گہرا ہو گیا ہے۔ چند بند نقل کیے جاتے ہیں:

ملا ہے آج جو سودا سے یوں تو ڈانواں ڈول　　پھرے ہے جا کہیں نوکر ہوئے کے گھوڑا مول
اُلادو کہتے جو اس کے جواب میں دو بول　　جو میں کہوں گا تو سمجھے گا تو کر ہے یہ ٹھٹھول
بتا کہ نوکری ملتی ہے ڈھیریوں یا تول

سپاہی رکھتے تھے نوکر امیر دولت مند　　سو آمد ان کی تو جاگیر سے ہوئی ہے بند
کیا ہے ملک کو قدرت نے سرکشوں نے پسند　　جو ایک شخص ہے بائیس صوبے کا خاوند
رہی نہ اس کے تصرف میں فوجداری کول

بس ان کا ملک میں کار نسق جو یوں ہو تباہ　　کہ کرو زر ہو زراعت میں تو نہ دیں پرکاہ
بلد وہ ان سی نوکر رکھیں یہ جس پہ سپاہ　　کہاں سے آویں پیادے کریں جو پیش نگاہ
کدھر سوار جو پیچھے چلیں وہ باندھ کے غول

رہی نقدہ عربی باجے پر انھوں کی شان　　جو چاہو اس کو نہ بجوائیں تو یہ کیا امکان
پر ان کا فکر ہے تخفیف خرچ پر ہر آن　　رہے گا عامل اگر ملک کا یہی تو ندان
گلے میں تاشہ کہاروں کے پالکی میں ڈھول

محل ہو یہ نہ سمائے زمیں بہت پھاٹی　　کئی وہ شہر [illegible] سودا پاٹی
تمام عمر ہے تدبیر ملک میں کاٹی　　ندان [illegible] کرائے گا ماٹی
پر اپنے زعم میں ہر اک بجائے خود [illegible]

[illegible]

پڑے جو کام اُنھیں تو نکل کے کھائی سے | رکھیں وہ فوج جو موتی پھرے لڑائی سے
پیادے ہیں سو ڈریں سر منڈاتے نائی سے | سوار گر پڑیں سوتے میں چارپائی سے
کرے جو خواب میں گھوڑا کسی کے نیچے اول

نہ صرف خاص میں آمد نہ خالصہ جاری | سپاہی تا منصدی سبھوں کو بے کاری
اب آگے دفتر تن کی کہوں میں کیا خواری | سوال دستخطی کو پھاڑ کر کے پنساری
کسی کو آ نولہ دے باندھ اور کسی کو کنڈل

یہ جتنے نقدی و جاگیر کے تھے منصب دار | تلاش کر کے ڈھیلتے اُنھوں نے ہو ناچار
نمازِ فقر من میں بنیوں کے دی سپر تلوار | گھروں سے اب جو نکلتے ہیں لے کے وہ ہتھیار
بغل کے بیچ تو سونٹا ہے ہاتھ میں کشکول

امیر اب جو ہیں دانا اُنھوں کی ہے یہ چال | ہوئے ہیں خانہ نشیں دیکھ کر زمانے کا حال
بچھا ہے سوزنی خوجہ کھڑا جھلے ہے رُمال | حضور بیٹھے ہیں اک دو ندیم اہلِ کمال
دھری ہے سامنے ایک پیکدان اک تنبول

۔ا بڑے زندہ دل تھے۔ جن باتوں پر دُوسرے روتے اُن پر وہ ہنستے تھے۔ لیکن اپنے شہر کی تباہی سے وہ بھی آخر کہاں متاثر نہ ہوتے۔ آخر ہنستے ہنستے رو دیے اور شہر آشوب کا آخری حصہ دہلی مرحوم کا مرثیہ بن گیا۔ چند بند ملاحظہ ہوں:

خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ پاس | کہ جن کے دیکھے سے جاتی رہی تھی بھوک اور پیاس
اور اب جو دیکھو تو دل ہووے زندگی سے اُداس | بجائے گل چمنوں میں کمر کمر ہے گھاس
کہیں ستون پڑا ہے کہیں پڑے مرغول

یہ باغ کھا گئی کس کی نظر نہیں معلوم | نہ جانے کس نے رکھا یہاں قدم وہ کون تھا شوم
جہاں تھے سرو و صنوبر اب اس جگہ ہے زقوم | مچی ہے زاغ و زغن سے اب اس چمن میں دھوم
گلوں کے ساتھ جہاں بلبلیں کریں تھی کلول

عجیب زادیوں کا ان دنوں ہے یہ معمول | وہ برقع سر پہ ہے جس کا قدم تلک ہے طول
ہے ایک گود میں لڑکا گلاب کا سا پھول | اور اُن کے حسنِ طلب کا ہر ایک سے یہ اصول
کہ خاکِ پاک کی تسبیح ہے جو لیجے مول

جہان آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا | مگر کبھو کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا
کہ یوں مٹا دیا گویا کہ نقش باطل تھا | عجب طرح کا یہ بحر جہاں میں ساحل تھا

گردشوں کی خاک سے بستی تھی خلق مرتی رہی

سودا کے ان شہر آشوبوں کے متعلق ڈاکٹر ... لکھتے ہیں:

"یہ دو دو ظاہر میں لکھتے ہیں کہ بادشاہ اور دربار بادشاہ کی ہجو کہی ہے۔ غور سے دیکھو تو ... سودا نے اپنے وطن کا مرثیہ کہا ہے"

میر کے چند مخمسوں میں شہر آشوب کی جھلک

میر نے کوئی باقاعدہ شہر آشوب نہیں کہا، لیکن ان کے چند مخمس ایسے ہیں جن میں بعض مقامات پر شہر آشوب کی جھلک نظر آجاتی ہے۔ دو مخمس میر کے ... ہیں جن میں سپاہیوں کی تنگدستی و بیکاری اور بے سروسامانی کا بیان کیا ہے۔ ایک مخمس کے چار بند اور دوسرے کے تین بند درج کیے جاتے ہیں:

جس کسی کو ... اور ... آرزو ... ہیں رکھو امید رفاہ
یاں نہ کوئی وزیر ہے نے شاہ ... جس کو دیکھو سو ہے بحال تباہ
حافظ مردم ہوے اکھٹے آہ

... جس کو دیکھو سو ہے اداس ... بھوک سے عقل کم نہیں ہیں حواس
... کھایا ہے سب نے ساز و یاس ... چیز دو ہا نہیں کسو کے پاس
یہی حاضر ہیں اتنی بیچلے سپاہ

جان آئی ہے بھوک سے تا شام ... شام سے صبح تک ہے فکر طعام
... جاتا ہے حال ... نام ... اب وہ جوں نوکری کسو کا نام
... سے ... ہیں آہ

... ہیں ... ہیں ... خورش و خواب بیچلے خواب و خیال
... ہیں ... ہے ... زندگی اپنے طور پر ہے محال
... فاطمہ قوہ

... ہوئی ... آ نے لشکر میں ہم پرانے تلاش
... ہے ... ہے سب ماں پہ سر بکہ پہ حساش
... آب ہے ... آتش

... ہے سب ... لڑتے جھگڑتے ہیں روتے ہیں بتقل
... کا ... اب ... ہے ایک ڈھال

بادشاہ و وزیر سب قلاّش
بجتے واسطے جوتے ہوئے ہیں فقیر   تن سے ظاہر رگیں ہیں جیسے لکیر
ہیں معذب عزیز صغیر و کبیر   مکھیاں سی گریں ہزاروں فقیر
دیکھیں ٹکڑا اگر برابر آش

ایک مخمس میں ایک "شیخ جی" کی ہجو کی ہے، جن کے پاس دستخطی فرد اجرا کے لیے لے گئے ہیں اور انھوں نے جھوٹے وعدے کرکے میر کو خوب دوڑایا ہے۔ ذیل کے دو بند انھیں شیخ جی کی زبان سے ہیں:

گھر سے جو ہیں دونوں کو بھرتے ہیں   سو بھی اسباب گروی دھرتے ہیں
ہیں سپاہی سو بھوکے مرتے ہیں   وے بڑی پی کے زیست کرتے ہیں
ایک تلوار بیچے ہے اک ڈھال

دینے کا ہو کہیں ٹھکانا بھی   جو دکر چاہیے زمانہ بھی
یاں نہیں شہر کے گھر میں دانا بھی   کبھو ہوتا ہے پینا کھانا بھی
ورنہ بھوکے رہے ہیں بیٹھے نڈھال

ایک مخمس میں شہر سے میں خود اپنی پریشان حالی بیان ہے۔ اس مخمس کا آخری بند مشہور ہے، جو حسب ذیل ہے:—

حالت تو یہ کہ مجھ کو غموں سے نہیں فراغ   دل سوزشِ درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ   ہے نام مجلسوں میں مرا میر بے دماغ
از بسکہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار

ان نظموں کے متعلق آزاد نے سچ لکھا ہے:

"چند مخمس شکایت زمانہ میں بطور شہر آشوب کے کہے ہیں.... مگر ایسے کمزور کہے ہیں کہ گویا کچھ نہیں ہے۔" (آبحیات ص۲۹)

متفرق ابیات در تعریف ہر فرقہ

ان مخمسوں کے علاوہ میر کی غزلوں میں جا بجا ایسے شعر ملتے ہیں، جن کو میر کی رباعیات در تعریف اہل حرفہ کے قبیل کی چیز کہہ سکتے ہیں یا ظاہر دیہ کے منثورہ یا ان اشعار — کی طرح "ابیات در تعریف ہر فرقہ" کہہ سکتے ہیں۔ ان اشعار میں جن فرقوں کے نام آئے ہیں وہ یہ ہیں: نائی، دھوبی، معمار، عطار، بزاز، صراف، زرگر، گل فروش، اتوکش، آتش باز، باغبان، افسانہ خوان، مطرب، مغنی، سپاہی، کشتی گیر، قاضی، مفتی، طبیب، سید، برہمن، ترک، مغل، ہندو، اہل دول، امیر۔ اگر میر کے یہ منتشر اشعار یک جا کر دیے جائیں تو ایک شہر آشوب اپنے ابتدائی مفہوم میں تیار ہو سکتا ہے۔ ذیل میں ایسے چند شعر مثال کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں:

ہمیشہ تند بہت ہے وہ زور پیر　　　پڑے ہیں کھائی میں مدت سے ہم

پُر شور ہے بے مشق مغنی پسراں کے　　　یہ کاسۂ سر کاسۂ طنبور ہوا ہے

میر کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب　　　اسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

نظر آئی سپاہی پسر سے لڑائی　　　قریب اس کے تکرار کر کر گئے

افسانہ خواں کا لڑکا کیا کہیے دیدنی ہے　　　قصہ ہمارا اس کا یارو شنیدنی ہے

وہ باغباں پسر کچھ گل گل شگفتہ ہے جب　　　یہ اور گل کھلا ہے اک پھولوں کی دکاں کا

وہ آتش کا بھی پرکالہ ہے سرگرم جفا　　　مارے تلواروں کے ان نے بھنوں کو قتل کیا

گئی نعل سے جو وہ گرم عمل آتش باز　　　ہم اپنے چہرے پہ اڑتے ہوائیاں دیکھیں

دل لشکر میں ایک سپاہی زادے نے ہم سے چھین لیا　　　ہم درویش طلب میں اس کی ڈیرے ڈیرے پھرتے ہیں

وہ دھوبی کا کام قیامت ہے یہاں دن اور دھوپ بہت　　　کوئی کہے اس سے منے میں تجھ کو کیا ہم دھوتے ہیں

اس طرح کے اشعار بالعموم حقیقت پر مبنی نہیں ہیں، بلکہ ابتدائی شہر آشوبوں کے زیرِ اثر تقلیدی اور روایتی انداز میں کہے گئے ہیں۔

قائم کا شہر آشوب

قائم چاند پوری نے بھی چھتیس بند[۳۵] کا ایک مخمس شہر آشوب کہا ہے، جس میں شہروں کی ویرانی اور شہریوں کی پریشانی کا بیان ہے۔ ابتدا بادشاہِ وقت کی سخت ہجو سے کی گئی ہے کہ وہی ملک کی تباہی اور رعایا کی بدحالی کا ذمہ دار ہے۔ شروع کے دو بند دیکھیے:

کیسا یہ شہ کہ لشکر پر اس کی نگاہ ہے　　　ہاتھوں سے اس کے ایک جہاں داد خواہ ہے
گویا کہ آپ ساقۂ لشکر کا سپاہ ہے　　　ناموس خلق سایے میں اس کے تباہ ہے

شیطان کا یہ فسق ہے، نہ خلقِ اللہ ہے

رہتی تھی ایک خلق کے جی میں یہ آرزو ۔۔۔ ہووے گا بادشاہ بھی پھر ہند میں کبھو
تا زمرے وہی ہوں اسیرِ نو وہی غلو ۔۔۔ سو آسماں نے لا کے مسلط کیا تو تو
جس کے ستم سے چار طرف آہ آہ ہے

آگے چل کر بادشاہ کے باپ دادا تک کی خبر لی گئی ہے اور اس کی حماقتوں کو اُس کے بزرگوں کا ورثہ قرار دیا گیا ہے۔

تُو تو خدا کے فضل سے اُس باپ کا پسر ۔۔۔ جس کا خطاب شاہِ حماقت پناہ ہے
دادا ترا جو لال کنور کا تھا مبتلا ۔۔۔ کہتا تھا کشتیوں کے ڈبونے کو برملا
اس خاندان میں حمق کا جاری ہے سلسلہ ۔۔۔ وہ روش کس طرح سے ہیں تیرے نہیں بھلا
آخر گدھا پن اُس کا ترا عذر خواہ ہے

اس بادشاہ کے عہد میں شہر ویران اور ضروریاتِ زندگی نایاب ہیں:۔

جو شہر میں تھے عطر سے ہر چیز میں خراج ۔۔۔ تھیلے دوا کے گنج میں رہتے تھے جوں اناج
وان درد سے شکم کے کوئی مر نہ جاؤ آج ۔۔۔ کس چیز سے حکیم کرے بیٹھ کر علاج
نے زیرہ ہے نہ سونف ہے نے نانخواہ ہے

اجڑے پڑے ہیں شہر میں وے وے مکان خوب ۔۔۔ جن کی صفا سے جائیں تھے موتی عرق میں ڈوب
اک ریزہ خس پہ جان جہاں دیں تھے خاک روب ۔۔۔ تو دوں اب اُس زمین میں حاضر سفید دوب
پوچھوں اب اُس جگہ پہ دھتورا سیاہ ہے

غریب ہوں یا امیر سبھی سب افلاس کا شکار اور فقر و فاقے میں گرفتار ہیں۔

اک نانِ خشک شب جو میسر کسی کو آئے ۔۔۔ ممکن ہے کیا کہ بیٹھ کے آسودگی سے کھائے
نیچے چھپے زمیں کے یا آسماں پہ جائے ۔۔۔ یوں گرد و پیش گھیرے ہے اک خلقت خدائے
جیسی طرح حصار میں ہالے کے ماہ ہے

تن زیب پہنتے جنھیں آتی تھی جی میں عار ۔۔۔ خاصہ ہمیشہ جسم میں اُن کے تھا بٹے تار
سو ظلم سے ترسے ہیں وہ یاں تک ذلیل و خوار ۔۔۔ دستار موسے سر سے ہے ان کے سروں پہ بار
جامہ اگر ہے تن پہ تو وہ گرد راہ ہے

کیا جانے آسمان کی بگڑی کیا گئی ہے کل ۔۔۔ محتاج ماہ داہے سے لے تا بہ کر بغل
کوئی روز آگے گھر میں تھی جن کے چہل پہل ۔۔۔ مطبخ میں اُن کے آج نہیں گر پکا تھا کل

پروں سے اصطبل میں نہ دانہ نہ کاہ ہے

مُفلسی نے سبکے اخلاق خراب کر دیے ہیں۔

اس سبب سے بے عاشق و معشوق نہ ہیں ڈھنگ　　دیکھے جو زر و شمع پہ تو جل مرے پتنگ
عالم سے اُٹھ گیا غم ناموس و پاس ننگ　　جس سے کہو زر لاکے بیٹی کے ماں بنے ننگ
دیکھو جدھر تو باپ کو بیٹے کا داہ ہے

ملازمت کا نے کا دروازہ بند اور سرکاری ملازمت نایاب ہے۔

حاکم جو اس ضلع کا ہے ماجد گلاب رائے　　روزی ہزار بار کی نفی وان بلکہ کچھ سوائے
سو اب جو نوکری کو کوئی اس کے پاس جائے　　کہتا ہے کہ تو روں میں یہ چھا کہاں سے آئے
شغل ہے نہ مال نہ دولت نہ جاہ ہے

یہ زبوں حالی اور بداخلاقی شہروں سے گزر کر قصبوں میں بھی پہنچ گئی ہے۔

قصبات اک جگہ تھی شریفوں کی بود و باش　　فاسق نظر پڑے ہے جو کوئی وہاں بعد تلاش
عصمت زنوں کی عصمت مردے سے زیادہ فاش　　تقوے کی رو سے مرد فرشتوں کی سی معاش
سو مجھ کو کہتے ہیں سب ام پہ اُن کی نگاہ ہے

اس شہر آشوب میں مختلف فرقوں، طبقوں اور پیشہ وروں کا ذکر کم ہے، مگر ہے ضرور۔

آیا ہے کایتھوں پہ جو گردش دنوں کا پھیر　　سررشتہ دار دفتر الٰہی ہیں یہ کھیر (؟)
ڈاہیں ہیں لاکے پیشہ میں یہ کافروں کے ڈھیر　　لیکن وہ کون ہے جو ہیں ہے چھدام سیر
... کو نہ مزدور نہ ...... کو چاہ ہے

مفتی پھیریں ہیں مجو کہتے کرتے نو کلمہ　　قاضی کے سے تھی تھی مری بی عصمت ملو
ہے چودھری کے گھر میں ہمیشہ شر پڑے　　عاشق کے یہاں بھی ہیں تو ....
اللہ جس طرح سے رکھے دادوا ہ ہے

یہ چند بند جو اوپر نقل کیے گئے ہیں، قائم کے شہر آشوب کی نوعیت ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں۔

حسرت کا مخمس در احوال دہلی ۔ حسرت نے بھی ایک شہر آشوب لکھا ہے جو مخمس در احوال دہلی کے عنوان سے اُن کے کلیات میں شامل ہے۔ اس مخمس میں چالیس بند ہیں۔ ڈاکٹر محمد ... نے رسالہ نقوش لاہور کے اکتوبر ۱۹۶۲ء کے شمارے میں ... کر اس مخمس کے انتالیس بند دیوان حسرت کے اس قلمی نسخے سے نقل کر کے شائع کیے ہیں، جو بقول اُن کے رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے اور مصنف دیوان کے بارے میں لکھا ہے۔

"اگرچہ اس دیوان کا اندراج فہرست کتب خانہ میں ذوقی رام حسرت کے نام سے ہے، لیکن حقیقت میں یہ میر محمد حیات المخاطب بہ ہیبت قلی خاں حسرت عظیم آبادی المتوفی سنہ ۱۲۱۱ھ [۹۶-۱۷۹۵ء] کا دیوان ہے۔"

میرے استفسار پر مولانا عرشی ناظم رضا لائبریری نے تحریر فرمایا کہ "حسرت کے دیوان میں یہ مخمس نہیں ہے۔ اس کو شائع کرنے والے نے انتساب میں سخت غلطی کی ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ مخمس جعفر علی حسرت کا ہے، جو مشہور معاملہ بند شاعر جرأت کے اُستاد تھے۔ وہ دہلی کے رہنے والے تھے، مگر اُن کی عمر کا زیادہ حصہ فیض آباد اور لکھنؤ میں گزرا۔ جعفر علی حسرت کے کلیات کا ایک قلمی نسخہ جلسۂ تہذیب لائبریری، لکھنؤ میں محفوظ ہے، اور اس میں مخمس در احوالِ دہلی، بھی شامل ہے۔"

حسرت نے اپنے شہر آشوب میں پہلے افغانوں کے حملے سے دہلی کی تباہی کا حال تیرہ بندوں میں بیان کیا ہے۔ ابتدائی چار بند دیکھیے :-

نہیں ہے مرثیے سے کم جہان آباد کا حال — اگر لکھوں تو قلم نالہ زن ہونے کی مثال
وگر پڑھوں تو کہاں غم سے ہے سخن کی مجال — اگرچہ چرخ ستمگر نے اس پہ لایا زوال
پر آپ روئے ہے رکھ منہ پہ ابرِ وبال

کیا غنیم کے لشکر نے یوں اسے ویران — کہ جیسے باد خزاں سے ہو حالتِ بستان
نہ سیل حادثہ لاوے کسی پہ یوں طوفان — گزر گیا ستم افغاں کے ظلم سے جو وہاں
فغاں کہ ہو گیا یہ کشتِ سبز سب پامال

وہ باغ جس میں کہ گل رو تھے سب جبیں گل سے — اور اُن کی زلفیں فزوں تر تھیں جعدِ سنبل سے
چمن کے رشک تھے رخسار دختِ وکاکل سے — دراز اُس پہ ہو دستِ ستم تطاول سے
دریغ مٹ گیا نقشہ رہا نہ وہ خط و خال

سواد اُس کے سے تھی زلف مہوشاں زنجیر — بہار اُس کی سے عرقابِ شرم تھا کشمیر
ہر ایک اُس کے مکاں میں بہشت کی تعمیر — جدھر نظر کرو سوجھے تھا عالمِ تصویر
نہ سرکے واں سے جدھر جا پڑے نگاہِ خیال

اس کے بعد یہ دکھایا ہے کہ بادشاہ، شاہی خاندان کے افراد، امیر، جاگیردار، ملازمت پیشہ، سپاہی، نجیب، نجومی، طبیب، شاعر، مصور، سوداگر، پیرزادے، مرثیہ خواں سب کے سب مفلسی اور بے روزگاری کا شکار ہیں۔ چند بند نقل کیے جاتے ہیں :-

جو بادشاہ وہاں کا رکھے تھا تخت و تاج — وہ اپنے تُرت کو اطفال کے ہوا محتاج
خدائی ہے جسے دیتا تھا سدا بند خراج — غنیم آن کے لے اُس سے اس کے شہر باج

وہ شکل ہے کہ کرے شیر کو شکار شغال

جو حشم اور خزانہ تو سب لُٹا بیٹھے،   رہیں سو کس پہ یہ فرقے کے لوگ اور چاکر
رہا نہ مال بجز سنگ کوٹھوں کے اندر   جو چھت تھی چاندی کی دیوانِ خاص کے اندر
سو وہ وزیر نے کی خرچ بیچ کر ٹکسال

نجیب تو ہوئے فاقوں سے اب سبھی رنجور   رہی نہ منہ پہ بے رونق نہ اس کی چشم میں نور
جو اہلِ حرفہ ہیں اُن کا تو کیجے کیا مذکور   جنھوں کا کسب تھا ملکوں اُن کا یہ دستور
کہ جا کے چوک میں دیکھیں ہیں اک دفتری پہ فال

وہ جو کہ فنِ طبابت میں تھے ارسطو سے   اُنھوں نے دیکھا خفا ہو کے تب دوا کوئی کھائے
مرض ہے جوع بقراط سو کس طرح سے جائے   وہ چھوڑ طب کو کہیں ہو کچھ اب خدا دکھلائے
سلائی سر پہ بازار میں بنے کتال

جنھوں کا پیری مریدی تھا سلسلہ جاری   اُنھوں کو رہنے لگی گھر میں تاں بدشواری
مرید فاقوں سے رہتے ہیں خود یہ ناچاری   سنی جہاں کہیں مجلس ہے واں کی تیاری
وہ روٹی تلیے پہ جا کر لگے وہ کہنے حال

مصور اُن میں جو تھے کھینچتے ہیں حیرانی   لگے کہ کھینچ دے تصویر گرچہ ہو مانی
جو خط کے لکھنے میں مرحلے کے تھے ثانی   قلم کر اُن کے ہے واں اب خون افشانی
گلیوں میں پھرتے کہ خط شکستہ کی شال

آخری بند میں شاعر کہتا ہے کہ شہر کی تباہی اہلِ شہر کی بد اعمالی کا نتیجہ ہے۔

جہاں آباد نہ ہوتا کسی طرح سے تباہ   جو حسرت ایسے عمل کرتے ہم نہ نامہ سیاہ
پلٹے مال پہ ناموس پر رکھیں جو نگاہ   تو اُن پہ کیونکہ نہ بھیجے بھلا غضب اللہ
ہمارے آگے ہی آئے ہمارے یہ اعمال

جرأت کا مخمس: حسرت کے شاگرد جرأت کا ایک ترجیع بند مخمس ایک قدیم بیاض میں ملا، جس کا مصرعِ ترجیع "حضور بلبل بستاں کرے نوا سنجی" ہے۔ لازمی قرار دیا ہے کہ ہر بند کسی ایسی بات پر ختم کیا جائے جو اس مصرعے سے مناسبت رکھتی ہو۔ یہ پابندی اس مخمس کا خاص عیب ہے لیکن اس میں شہر آشوب کی شان پوری طرح موجود ہے۔ متعدد دوسرے شہر آشوبوں کی طرح اس میں بھی شاعر کو زمانے سے یہ شکایت ہے کہ اس نے امیروں کو مفلس اور فقیر کو تونگر کر دیا ہے، اور شریفوں کو زوال سے دوچار کر کے کمینوں کو عروج عطا کیا ہے۔ اس مخمس میں بائیس (۲۲) بند ہیں۔ چند بند اور کچھ مصرعے نقل کیے جاتے ہیں جن سے اس کی شہر آشوبی نوعیت واضح ہو جائے گی۔

اب ان کو دے شفق چرخ شال نارنجی　　بُنا جو کرتے تھے لیل و نہار شطرنجی
یہ دیکھ کیونکہ نہ آ جائے بخانۂ تن جی　　ظہور حشر نہ کیوں ہو جو کھوپڑی گنجی
حضور بلبل بستاں کرے نوا سنجی

جو گل فروش تھے اب ہیں وہ مالک صد باغ　　جو مفلس ازلی تھے رکھیں ہیں عیش و فراغ
جو خاک روب تھے اب ان کا عرش پر ہے دماغ　　یہ کاگُوں کاگُوں خوش آوے کسے جو مادہ زاغ
حضور بلبل بستاں کرے نوا سنجی

سمجھتے خاک نہیں سانڈے کے جو تیل سوا　　حکیم جیو کہا دیں سب ان سے پوچھیں دوا
چلے جب ایسی طاقت کی اس چمن میں ہوا　　تو کیوں نہ پھر سر و گردن ہلا ہلا کے لوا
حضور بلبل بستاں کرے نوا سنجی

دیا سلائی جو بیچے تھا پا کر سرکنڈا　　ہوا ہے صاحب لشکر بنا کے اک جھنڈا
ہوائے باغ جہاں سے ہو کیوں نہ دل ٹھنڈا　　جو ٹینی مرغ کا بچہ کھسکتے ہی انڈا
حضور بلبل بستاں کرے نوا سنجی

ملا کہ ادن کو دے چرخ منصب شاہی　　جو گھس کھدے تھے وہ اورنگ و شاہ کلاہی
لگا کے بیٹھے تھے جو خوانچہ کھانے بیچے خان　　بڑا گھر اس کا ہے بیت الخلا تھا جس کا مکان
جو بیچ کھاتے تھے گنجشک دام میں لا کے　　کریں ہیں عرش پہ پرواز اب وہ چڑیا کے
جنھوں کے گھر تھی امارت گھر ان کا ہے سونا　　بنی گھر اس کے عمارت جو بیچے تھا چونا
معاملات میں اب اعتبار اُن کا ہے　　کرجی کو لکھتے تھے پیسے کی ضامنی کیا ہے

آخری بند:-

جغد و کرگس کو ہے جرأت کی ہمسری کا خیال　　وہ بھولے اپنی بھی کوا چلے جو ہنس کی چال
کھرا دلے انہیں لا، حسد کر جی سے نکال　　ہنسیں گل اس پہ جو ٹڈ کی پھلا پھلا پر و بال
حضور بلبل بستاں کرے نوا سنجی

راسخ عظیم آبادی کی مثنوی در بیان انقلاب زمانہ

غلام علی راسخ عظیم آبادی متوفی ۱۲۳۸ھ نے مثنوی کی شکل میں ایک شہر آشوب کہا ہے، جو مثنویات راسخ مرتبہ ممتاز ... میں حسب ذیل عنوان کے ساتھ شامل ہے:-

"مثنوی در بیان انقلاب زمانہ و شکایت فلک و مجملہ احوال متوطنان بلدہ عظیم آباد۔"

اس مثنوی میں راسخ نے عظیم آباد (پٹنہ) کی گزشتہ خوش حالی و فارغ البالی اور موجودہ مفلسی و ناداری کا ذکر کرنے

سے جن [illegible] پیشہ وروں کا حال لکھا ہے وہ یہ ہیں: مشایخ، خطاط، معلم، شاعر، وکالت، زراعت، تجارت، طبابت، مصاحب [illegible]۔ مثنوی میں کل ایک سو بیس شعر ہیں۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے:-

گزرتی تھی آرام سے بے تعب — کہ تھے جمع اسباب عیش و طرب
کہیں مجلس عیش و بزم نشاط — کہیں دوستوں میں بہم اختلاط
جہاں اک عجب باغ تھا دل کشا — ہر اک گل میں تھی اس کے بوئے وفا
یہ گلزار اب ہو گیا خار زار — خزاں ہو گئی ہائے اس کی بہار
کوئی اس چمن میں تو گل تر نہیں — کوئی غنچہ ساں صاحب زر نہیں
ہے اب خاک وہ پائے اور ان کا فرق — جو تھے سر سے پا تک جواہر میں غرق
جنھیں مسند تھی قاقم پہ تھی دار و گیر — ہوئے ہیں وہ محتاج فرش حصیر
معطل ہے ہر کوئی بے کار ہے — فقط مفلسی بر سر کار ہے
گدائی کا کاسہ لیے در بدر — ہیں آوارہ ارباب فضل و ہنر
ہنرمند ہے جگر ریش ریش — نہیں جاتا ہے کوئی پیشہ بھی پیش

مشایخ جو ذی عز و تعظیم ہیں — دل ان کے بھی صد ترکش بیم ہیں
غم فوت ہے یاں تلک ہر زماں — کہ ہیں رشتۂ سبحہ ساں ناتواں

لکھوں خوشنویسوں کا میں حال کیا — نوشتے پہ اپنے ہیں گریاں سدا
بہت فکر روزی سے ہیں دردناک — قلم غم سے ان کے ہوا سینہ چاک

وکالت کا بازار بھی سرد ہے — وکیل اب جو ہے وہ بڑا مرد ہے
کہاں اب وکالت ہو رونق پذیر — موکل ہی سب ہو گئے ہیں فقیر

زراعت کا پیشہ بھی بے آب ہے — زر مایہ یاں تو نایاب ہے
کرے کب یہ پیشہ کسو کو نہال — کہ سرسبز ہونا بہت ہے محال

طبابت میں بھی کچھ نہیں اب حصول — اطبا ہیں اس عہد میں سب ملول

ہر اک کو مرض مفلسی کا ہے آج　　　طبیب اب بچارے کریں کیا علاج

سپاہی کی مٹی بھی ہے اب خراب　　　کہ بیٹھا ہوا نوکری کا تو باب
جو اشجع ہیں اب اُن کا یہ رنگ ہے　　　کہ قسمت سے اپنی انھیں جنگ ہے
ہیں افلاس سے ایسے اندوہگیں　　　کہ مٹی کا گھوڑا میسر نہیں
نہ ترکش ہے نے تیر ہے نے کماں　　　خدنگ الم کے نشانہ ہیں جواں
کماں کی کماں ہو رہے ہیں تباہ　　　اگر تیر ہے تو فقط تیر آہ

مختلف پیشوں اور پیشہ وروں کی کس مپرسی اور مفلسی کا بیان کرنے کے بعد شاعر شہر کی خوش حالی اور بدحالی کو اہلِ شہر کی اخلاقی حالت کا نتیجہ قرار دیتا ہے :-

یہ پٹنہ عجب دل کشا شہر تھا　　　طلسمات تھا واہ کیا شہر تھا
تھے صدق و صفا پیشہ اس کے مقیم　　　طریقِ وفا پر بہت مستقیم
بہت نیتیں نیک رکھتے تھے سب　　　زباں اور دل ایک رکھتے تھے سب
اب اس شہر کا طور ہی اور ہے　　　مقیموں کا اس کے بڑا طور ہے
کوئی ان میں غماز و نمام ہے　　　کسو کا سخن چینی ہی کام ہے
بہت جانتے ہیں فریب اور زور　　　بہت بڑھ گیا حد سے فسق و فجور
نہیں نیک نیت کوئی یاں ولیک　　　اگر ہے تو ہے وہ ہزاروں میں ایک

نظیر کا شہر آشوب نظیر اکبرآبادی نے پینتالیس مخمس بند کا ایک شہر آشوب کہا ہے، جس میں آگرے کے پیشہ وروں، سپاہیوں اور امیرزادوں کی پریشاں حالی بیان کی ہے۔ اس کے چند بند نقل کیے جاتے ہیں :-

ہے اب تو کچھ سخن کا مرے کاروبار بند　　　رہتی ہے طبع سوچ میں لیل و نہار بند
دریا سخن کی فکر کا ہے موج دار بند　　　ہو کس طرح نہ منہ میں زباں بار بار بند
جب آگرے کی خلق کا ہو روزگار بند

اب آگرے میں جتنے ہیں سب لوگ ہیں تباہ　　　آتا نظر کسی کا نہیں ایک دم نباہ
مانگو عزیزو ایسے برے وقت سے پناہ　　　وہ لوگ ایک کوڑی کے محتاج ہیں اب آہ
کسب و ہنر کے یاد ہیں جن کو ہزار بند

صراف بنیے جوہری اور سیٹھ ساہوکار　　　دیتے تھے سب کو نقد سو کھاتے ہیں اب ادھار

بازار میں اُڑے ہے پڑی خاک بے شمار　　بیٹھے ہیں یوں مکانوں میں اپنی دکان دار
جیسے کہ چور بیٹھے ہوں قیدی قطار بند

ماریں ہیں ہاتھ ہاتھ پہ سب یاں کے دستکار　　اور جتنے پیشہ دار ہیں روتے ہیں زار زار
کوٹے ہے تن لہار تو پیٹے ہے سر سنار　　کچھ ایک دو کے کام کا رونا نہیں ہے یار
چھتیس پیشے والوں کا ہے کاروبار بند

بیٹھے بساطی راہ میں تنکے سے چنتے ہیں　　جلتے ہیں نانبائی تو بھڑبھونجے بھنتے ہیں
دُھنیے بھی ہاتھ ملتے ہیں اور سر کو دھنتے ہیں　　روتے ہیں وہ جو مشرع و دارائی بنتے ہیں
اور وہ تو مر گئے جو بنے تھے ازار بند

ہر دم کمان گروں کے اوپر پیچ و تاب ہیں　　صحاف اپنے حال میں غم کی کتاب ہیں
مرتے ہیں جلد ساز مصور کباب ہیں　　نقاش ان سبھوں سے زیادہ خراب ہیں
رنگ و قلم کے ہو گئے نقش و نگار بند

حجام پر بھی یاں تئیں ہے مفلسی کا زور　　پیسہ کہاں جو سان پہ ہو اُستروں کا شور
کانپے ہے سر پکڑتے ہوئے اس کی پور پور　　کیا بات ایک بال کٹے یا تراشے کور
یاں تک ہے استرے کی دھار بند

کیا چھوٹے کام والے وہ کیا پیشہ ور نجیب　　روزی کے آج ہاتھ سے عاجز ہیں سب غریب
ہوتی ہے بیٹھے بیٹھے جب آ شام کی قریب　　اُٹھتے ہیں سب دکان سے کہہ کر کہ یا نصیب
قسمت ہماری ہو گئی بے اختیار بند

جتنے ہیں آج آگرے میں کارخانہ جات　　سب پر پڑی ہیں آن کے روزی کی مشکلات
کس کس کے دکھ کو روئیے اور کس کی کہیے بات　　روزی کے اب درخت کا ہلتا نہیں ہے پات
ایسی ہوا کچھ آ کے ہوئی ایک بار بند

دیکھے کوئی چمن تو پڑا ہے اُجاڑ سا　　غنچہ نہ پھل نہ پھول نہ سبزہ ہرا بھرا
آواز قمریوں کی نہ بلبل کی ہے صدا　　نہ حوض میں ہے آب نہ پانی ہے نہر کا
چادر پڑی ہے خشک تو ہے آبشار بند

عاشق کہو اسیر کہو آگرے کا ہے　　ملا کہو دبیر کہو آگرے کا ہے
مفلس کہو فقیہہ کہو آگرے کا ہے　　شاہ کہو فقیر کہو آگرے کا ہے

اس واسطے یہ اُس نے لکھے پانچ چار بند[1]

اب تک جن شہر آشوبوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے ابتدائی مفہوم کے شہر آشوبوں کو چھوڑ کے باقی سب شہر آشوب نادر شاہ اور شاہ دُرّانی کے حملوں سے دہلی کی تباہی اور اہل دہلی کی بد حالی کے اثر سے وجود میں آئے ہیں۔ ان میں شہر آشوب کے ی مفہوم کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ یعنی ان میں مختلف طبقوں اور پیشہ وروں کا حال بیان کیا گیا ہے، طبقاتی درجہ بندی میں ب جو فرق آ گیا تھا اور اس سے امرا اور شرفا کے اقتدار اور سربلندی میں جو خلل پڑ گیا تھا، اس پر غم و غصے کا اظہار کیا گیا ہے۔ ء کے قیامت خیز ہنگامے نے دہلی کے زمین و آسمان کو بدل کر کچھ کا کچھ کر دیا۔ آس پاس کے دیہاتیوں نے شہر میں گھس کر قتل و ت کا بازار گرم کر کے شریف، معزز اور خوش حال باشندوں کو بڑی مصیبتوں میں مبتلا کر دیا اور انگریزوں نے دہلی کے بڑے بڑے رامی لوگوں کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ ان الم ناک اور وحشت خیز واقعات کے بیان میں بہت سی نظمیں لکھی گئیں۔ یہ نظمیں حقیقت میں مرحوم کے مرثیے ہیں۔ ان کو شہر آشوب کہنا کچھ بہت مناسب نہ تھا۔ لیکن اب شہر آشوب کے مفہوم میں اور وسعت پیدا ہو ا اور وہ نظمیں بھی شہر آشوب کے دائرے میں آ گئیں، جن میں پیشہ وروں اور طبقوں کا تخصیص کے ساتھ ذکر نہیں ہے، بلکہ لی تباہی کا عمومی انداز میں بیان ہے۔

اس طرح کی نظموں کا ایک مجموعہ منشی محمد تفضل حسین خاں کوکب نے مرتب کر کے فغانِ دہلی[2] کے نام سے شائع کیا، جن کچھ نظموں کا اضافہ کر کے نظامی بدایونی نے فریادِ دہلی اور انقلابِ دہلی کے دُہرے نام سے ۱۹۳۱ء میں شائع کیا۔ ان نظموں زیادہ تر غزل کی شکل میں ہیں، مگر چند مخمس اور مسدس بھی ہیں۔ داغ دہلوی کا مسدس اپنی نوعیت میں اس مجموعے کی دوسری وں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے، لیکن شاعرانہ محاسن کے اعتبار سے سب سے بہتر اور سب سے زیادہ مشہور رہے۔ خود مصنف نے اپنی اس نظم کو 'شہر آشوب' قرار دیا ہے اور کچھ عجب نہیں کہ شہر آشوب کے نئے مفہوم کی بنیاد اسی نظم سے ی ہو۔ اس مجموعے کی نظموں کی تفصیلی کیفیت ڈاکٹر سید عبد اللہ کے اُس مقالے میں دیکھی جا سکتی ہے، جو شہر آشوب کی یخ' کے عنوان سے ان کے مجموعۂ مقالات بحث و نظر میں شامل ہے۔ یہاں صرف داغ کے شہر آشوب کے چند بند پیش ے جاتے ہیں:-

فلک زمین و ملائک جناب تھی دلی   بہشت و خلد سے بھی انتخاب تھی دلی

---

۱ پانچ چار کے عدد اگر اسی طرح جوڑ کر ہندسوں میں لکھے جائیں یعنی ۴۵ تو اس مخمس کے بندوں کی تعداد ظاہر ہوگی جو پینتالیس ہے۔

۲ ڈاکٹر سید عبد اللہ نے فغانِ دہلی مطبوعہ احسن المطابع، دہلی ۱۲۸۰ھ کے حوالے سے لکھا ہے کہ "یہ مجموعہ تین شماروں میں منقسم ہے شمارہ اوّل کلام حضرت محمد سراج الدین ظفر و مرزا رفیع سودا، شمارہ دوم در مسدسات شہر آشوب شمارۂ سوم در غزلیات وغیرہ۔" میرے کتب خانے میں فغانِ دہلی کا وہ نسخہ ہے جو مطبع اکمل المطابع، دہلی میں ۱۲۸۰ھ میں چھپا تھا۔ اس میں صرف دو شمارے ہیں۔ مؤلف کتاب نے دیباچے میں لکھا ہے "نامش فغانِ دہلی گذاشتہ بہ دو شمارہ بہ انجام رسانیدہ ... نخستین شمارہ در مسدسات شہر آشوب، دوم در غزلیات و قطعات وغیرہ۔"

بازار میں اُڑے ہے پڑی خاک بے شمار ‏ ‏ بیٹھے ہیں یوں دکانوں میں اپنی دکاں دار
جیسے کہ چور بیٹھے ہوں قیدی قطار بند

ماریں ہیں ہاتھ ہاتھ پہ سب یاں کے دستکار ‏ ‏ اور جتنے پیشہ دار ہیں روتے ہیں زار زار
کوٹے ہے تن لہار تو پیٹے ہے سر سنار ‏ ‏ کچھ ایک دو کے کام کا رونا نہیں ہے یار
چھتیس پیشے داروں کا ہے کاروبار بند

بیٹھے بساطی راہ میں تنکے سے چنتے ہیں ‏ ‏ جتنے ہیں نانبائی زبس بھوبھڑ بھنتے ہیں
دھنیے بھی ہاتھ ملتے ہیں اور سر کو دھنتے ہیں ‏ ‏ روتے ہیں وہ جو مشروع و دارائی بنتے ہیں
اور وہ تو مر گئے جو بنیں تھے ازار بند

ہر دم کماں گروں کے اوپر پیچ و تاب ہیں ‏ ‏ صحاف اپنے حال میں غم کی کتاب ہیں
مرتے ہیں جلد ساز مصور کباب ہیں ‏ ‏ نقاش ان سبھوں سے زیادہ خراب ہیں
رنگ و قلم کے ہو گئے نقش و نگار بند

حجام پر بھی یاں نہیں ہے مفلسی کا زور ‏ ‏ پیسہ کہاں جو سان پہ ہو استروں کا شور
کانپے ہے [illegible] ہونے اس کی پور پور ‏ ‏ کیا بات ایک بال کٹے یا ترا شے کور
یاں تک ہے استرے و نہرنی کی دھار بند

کیا چھوٹے کام والے و کیا پیشہ ور نجیب ‏ ‏ روزی کے آج ہاتھ سے عاجز ہیں سب غریب
ہوتی ہے بیٹھے بیٹھے جب شام عن قریب ‏ ‏ اٹھتے ہیں سب دکان سے کہہ کر کہ یا نصیب
قسمت ہماری ہو گئی بے اختیار بند

جتنے ہیں آج آگرے میں کارخانہ جات ‏ ‏ سب پر پڑی ہیں آن کے روزی کی مشکلات
کس کس کے دکھ کو روئیے کس کس کی کہیے بات ‏ ‏ روزی کے اب درخت کا پتا نہیں ہے پات
ایسی ہوا کچھ آکے ہوئی ایک بار بند

دیکھے کوئی چمن تو پڑا ہے اجاڑ سا ‏ ‏ غنچہ نہ پھل نہ پھول نہ سبزہ ہرا بھرا
آواز قمریوں کی نہ بلبل کی ہے صدا ‏ ‏ نہ حوض میں ہے آب نہ پانی ہے نہر کا
چادر پڑی ہے خشک تو ہے آبشار بند

عاشق کہو اسیر کہو آگرے کا ہے ‏ ‏ ملا کہو دبیر کہو آگرے کا ہے
مفلس کہو فقیر کہو آگرے کا ہے ‏ ‏ شاعر کہو نظیر کہو آگرے کا ہے

اس واسطے یہ اُس نے لکھے پانچ چار بند[1]

اب تک جن شہر آشوبوں کا ذکر کیا گیا ہے' ان میں سے ابتدائی مفہوم کے شہر آشوبوں کو چھوڑ کے باقی سب شہر آشوب نادر شاہ اور احمد شاہ دُرّانی کے حملوں سے دہلی کی تباہی اور اہلِ دہلی کی بد حالی کے اثر سے وجود میں آئے ہیں۔ ان میں شہر آشوب کے ابتدائی مفہوم کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ یعنی ان میں مختلف طبقوں اور پیشہ وروں کا حال بیان کیا گیا ہے' طبقاتی درجہ بندی میں یکایک جو فرق آگیا تھا اور اس سے امرا اور شرفا کے اقتدار اور سربلندی میں جو خلل پڑ گیا تھا' اس پر غم و غصّے کا اظہار کیا گیا ہے۔

۱۸۵۷ء کے قیامت خیز ہنگامے نے دہلی کے زمین و آسمان کو بدل کر کچھ کا کچھ کر دیا۔ آس پاس کے دیہاتیوں نے شہر میں گھس کر قتل و غارت کا بازار گرم کر کے شریف' معزز اور خوش حال باشندوں کو بڑی مصیبتوں میں مبتلا کر دیا اور انگریزوں نے دہلی کے بڑے بڑے نامی گرامی لوگوں کو پھانسی پر لٹکوا دیا۔ ان الم ناک اور دہشت خیز واقعات کے بیان میں بہت سی نظمیں کہی گئیں۔ یہ نظمیں حقیقت میں دہلی مرحوم کے مرثیے ہیں۔ ان کو شہر آشوب کہنا کچھ بہت مناسب نہ تھا۔ لیکن اب شہر آشوب کے مفہوم میں اور وسعت پیدا ہو گئی اور وہ نظمیں بھی شہر آشوب کے دائرے میں آگئیں' جن میں پیشہ وروں اور طبقوں کا تخصیص کے ساتھ ذکر نہیں ہے' بلکہ شہر کی تباہی کا عمومی انداز میں بیان ہے۔

اس طرح کی نظموں کا ایک مجموعہ منشی محمد تفضل حسین خاں کوکب نے مرتب کر کے فغانِ دہلی[2] کے نام سے شایع کیا' جن میں کچھ نظموں کا اضافہ کر کے نظامی بدایونی نے فریادِ دہلی اور انقلابِ دہلی کے دُہرے نام سے ۱۹۳۱ء میں شایع کیا۔ ان نظموں میں زیادہ تر غزل کی شکل میں ہیں' مگر چند مخمس اور مسدس بھی ہیں۔ داغ دہلوی کا مسدس اپنی نوعیت میں اس مجموعے کی دوسری نظموں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے' لیکن شاعرانہ محاسن کے اعتبار سے سب سے بہتر اور سب سے زیادہ مشہور ہے۔ خود مصنف نے اپنی اس نظم کو "شہر آشوب" قرار دیا ہے اور کچھ عجب نہیں کہ شہر آشوب کے نئے مفہوم کی بنیاد اسی نظم سے پڑی ہو۔ اس مجموعے کی نظموں کی تفصیلی کیفیت ڈاکٹر سید عبداللہ کے اُس مقالے میں دیکھی جا سکتی ہے' جو "شہر آشوب کی تاریخ" کے عنوان سے ان کے مجموعۂ مقالات بحث و نظر میں شامل ہے۔ یہاں صرف داغ کے شہر آشوب کے چند بند پیش کیے جاتے ہیں:-

فلک زمین و ملائک جناب تھی دلّی — بہشت و خلد سے بھی انتخاب تھی دلّی

---

[1] پانچ چار کے عدد اگر اسی طرح بلا فاصلہ ہندسوں میں لکھے جائیں یعنی ۵۴ تو اس مخمس کے بندوں کی تعداد ظاہر ہوگی جو چوّن ہے۔

[2] ڈاکٹر سید عبداللہ نے فغانِ دہلی مطبوعہ احسن المطابع' دہلی ۱۲۸۰ھ کے حوالے سے لکھا ہے کہ "یہ مجموعہ تین شماروں میں منقسم ہے۔ شمارہ اوّل کلام حضرت محمد سراج الدین ظفر و مرزا رفیع سودا' شمارہ دوم مسدسات شہر آشوب' شمارہ سوم غزلیات وغیرہ۔" میرے کتب خانے میں فغانِ دہلی کا وہ نسخہ ہے جو مطبع محمدی' دہلی میں ۱۲۸۰ھ میں چھپا تھا۔ اس میں صرف دو شمارے ہیں۔ مؤلف کتاب نے دیباچے میں لکھا ہے: "نالش فغانِ دہلی گذاشتہ بدو شمارہ بہ انجام رسانیدہ ... نخستین شمارہ در مسدسات شہر آشوب۔ دوم در غزلیات و قطعات وغیرہ۔"

...ہے کہ تھا وہ جواب تھی دلی — مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھا دلی

پڑی ہیں آنکھیں وہاں جو جگہ تھی نرگس کی
خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی

یہ شہر وہ ہے کہ انسان و جان کا دل تھا — یہ شہر وہ ہے کہ ہر قدرداں کا دل تھا
یہ شہر وہ ہے کہ ہندوستان کا دل تھا — یہ شہر وہ ہے کہ سارے جہان کا دل تھا
رہی نہ آدمی یہاں سنگ و خشت کی صورت
بنی ہوئی تھی جو ساری بہشت کی صورت

عجب شکل گل و گلستاں نظر آئی — پڑی جدھر کو نگاہیں خزاں نظر آئی
جب اُٹھ کے تماشۂ خوبیاں نظر آئی — تو کوئی عیش کی صورت نہ یاں نظر آئی
وہ گلعذار سمن بر کے قہقہے نہ رہے
وہ بلبلان خوش الحان کے چہچہے نہ رہے

ہر ایک بر سر قتل اہل چمن سے چلے — غریب چھوڑ کے اپنا وطن وطن سے چلے
نہ پوچھو زندوں کو بیچارے کس چلن سے چلے — قیامت آئی کہ مُردے نکل کفن سے چلے
مقام امن جو ڈھونڈا تو راہ بھی نہ ملی
یہ قہر تھا کہ خدا کی پناہ بھی نہ ملی

پیادہ پا ہوں رواں شہسوار صد افسوس — لہو کے گھونٹ پئیں بادہ خوار صد افسوس
ذلیل و خوار ہوں اہل وقار صد افسوس — ہزار حیف ! دل بیقرار صد افسوس
جھکے ہیں بار الم سے تنے ہوئے کیسے
بگڑ گئے ہیں یکایک بنے ہوئے کیسے

برق لکھنوی کا شہر آشوب

۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے لکھنؤ اور اہل لکھنؤ پر جو مصیبتیں ڈھائیں، اُن سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اُن کے بیان میں شاعروں کی زبان خاموش اور قلم بے حرکت نہ رہے ہوں گے۔ لیکن ان نظموں کا مجموعہ مرتب کرنے کا کسی کو خیال نہ آیا۔ اور اب اتنی مدت گزر جانے کے بعد اُن کی تلاش میں کامیابی مشکل ہے۔ اس وقت صرف ایک مسدس میرے سامنے ہے جو اپریل [illegible] کے الہ آباد یونیورسٹی اُردو میگزین میں ایک قلمی بیاض سے نقل کر کے شائع کیا گیا ہے۔ اس کے مصنف برق لکھنوی نے خود اس کو 'شہر آشوب' کہا ہے۔

---

۱ یہ مسدس برق کے مطبوعہ دیوان میں نہیں ہے۔ لیکن ان کے ایک قلمی دیوان میں شامل ہے۔ اس کے چھبیس بند جو صفیر بلگرامی

لیکن یہ مسدس بھی ۱۸۵۷ء کے غدر سے متاثر ہو کر نہیں کہا گیا ہے۔ اس کے مضامین، شاعر کا لب و لہجہ، اُس کے غم کی نوعیت، اِن سب چیزوں سے صاف ظاہر ہے کہ غدر سے متاثر ہو کر واجد علی شاہ کی معزولی اور کلکتہ کو روانگی کے بعد لکھنؤ کی بے رونقی اور اُداسی کا اس میں بیان کیا گیا ہے۔ اُس وقت تک شہر اُن تباہیوں سے اور اہلِ شہر اُن مصیبتوں سے محفوظ تھے، جو کچھ دن بعد غدر کے نتیجے میں پیش آنے والی تھیں۔ اس مسدس کا آخری بند، جس میں اس کو شہر آشوب قرار دیا گیا ہے، حسب ذیل ہے:-

ہم پہ اے برق جو گزرا ہے سنایا ہم نے　　　نقشہ سب کھینچ کے شعروں میں دکھایا ہم نے
شہر آشوب کہا رو کے رُلایا ہم نے　　　وقت پر دوستوں کو دوست نہ پایا ہم نے
خلق میں نیرِ اقبال ہمارے وہ تھے
سب کو ثابت ہے کہ سیارستارے وہ تھے

اس بند کی بیت کے دونوں مصرعوں میں وہ کا اشارہ واجد علی شاہ کی طرف ہے۔ دو اور بندوں میں بھی اسی طرح اشاروں سے کام لیا گیا ہے۔ اس نظم میں واجد علی شاہ سے محبت اور ہمدردی اور اودھ کے تختِ سلطنت پر اُن کی واپسی کی تمنا کا اظہار ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے انگریزوں کے خوف سے بادشاہ کا نام لینا مناسب نہیں سمجھا۔ اس مسدس میں انتالیس بند ہیں۔ اس کے چند بند نقل کیے جاتے ہیں:-

کل کے مذکور یہ ہیں اپنے بھی افسانے تھے　　　رشکِ فردوس پریں شہر کے میخانے تھے
تھا بیاں ہیروں کی تھیں لعلوں کے پیمانے تھے　　　ماہ و خورشید رخِ شمع کے پروانے تھے
سب ہوا خواہ سلیمان کہا کرتے تھے
رات دن پریوں کے جمگھٹ میں رہا کرتے تھے

قہقہے اُڑتے تھے جمگھٹ تھے پری زادوں کے　　　میلے ہر روز ہوا کرتے تھے آزادوں کے
نالے سُنتے تھے نہ ہرگز کبھی فریادوں کے　　　کبھی آگاہ نہ تھے نام سے بیدادوں کے
کیا کہیں کس سے کہیں ہائے وہ صحبت کیا تھی
راجہ اندر کے اکھاڑے کی حقیقت کیا تھی

جانتے تھے کہ اسی طرح گزر جائے گی　　　چمنِ عیش میں ہرگز نہ خزاں آئے گی
آرزو نخلِ محبت سے ثمر پائے گی　　　یہ نہ سمجھے تھے قضا رنگ نیا لائے گی

تیرہ ـــــ نے تذکرہ جلوۂ خضر میں درج کیے ہیں، وہ تذکرہ ابن طوفان کے حاشیہ نمبر ۹۲ میں نقل کر دیے گئے ہیں۔
(تذکرہ الشعرا مصنفہ ابن امین اللہ طوفان ص ۳۹-۴۰)

بیت
در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

ایک بھی پیش نظر ان میں کی تصویر نہیں — قدر دنیا میں نہیں خلق میں توقیر نہیں
جز اجل اور کچھ اس خواب کی تعبیر نہیں — تیر ہے دل کے لیے ناز شمشیر نہیں
ہم نے داغوں سے بنایا جسم مرقع اپنا
بن گیا سامنے آنکھوں کے مرقع اپنا

اب بھی آجائیں جو وہ پھر وہی صورت ہو جائے — وہی چھنیاں وہی چہلیں وہی عشرت ہو جائے
ملک سب جانے رہیں دور کو راحت ہو جائے — پھر وہی شان ہو اپنی وہی شوکت ہو جائے
پھر وہی سیر کریں پھر وہی آبادی ہو
پھر وہی ناچ وہی رنگ وہی شادی ہو

ایک بس اس کے نہ ہونے سے یہ سب کچھ ہوا — شربت زندگی بھی زہر ہوا
دل کو حسرت ہے وہ دم آب سب زہر ہوا — ہم کو دوزخ سے زیادہ چمن دہر ہوا
نازدل سے دل عرش ہلادے یارب
موت آنے ہمیں یا ان سے ملادے یارب

موت جینے سے کہیں اپنے لیے بہتر ہے — بال نشتر ہیں تو ہر ایک نفس خنجر ہے
تکیہ ہے خشت لحد فرش زمیں بستر ہے — در ہیں آغوش اجل گور سے بدتر گھر ہے
چارہ اس میں نہیں بر عکس جو قسمت ہو جائے
زہر کھانے کے لیے کھائیں تو امرت ہو جائے

جان صاحب کا شہر آشوب

لکھنؤ کے مشہور ریختی گو شاعر جان صاحب نے بھی ایک شہر آشوب اپنے زمانے کی مذمت میں کہا ہے۔ یہ بیالیس بند کا مخمس ہے۔ چند بند اس کے بھی سن لیجیے

کم ہیں قاروں سے ہر اک کی خست آجکل — دفن مردے کی طرح گھر گھر ہے دولت آجکل
مردوں کی ہو گئی نام و ہمت آج کل — لکھنؤ میں شاد ہے شوموں کی خست آجکل
گور پر حاتم کے روتی ہے سخاوت آجکل
اینٹ سے یہ اینٹ بجوادیں پہ ہرگز خرچ کھائیں — پیسے دولے اکٹھے کے واسطے سہہ کر کڑھائیں
ماں کی اپنے والی کھنگر کے بھی چونا لگائیں — پہلے جلنے کے گھر کو دیں محل جھوٹے بنائیں
خیر کی جا ہے ہر اک دل میں کدورت آج کل

رنگ یہ بدلا زمانے نے ہر اک حیران ہے — مفلسی کے ہاتھ سے انسان بھی حیوان ہے
جو کہ حیوان تھا پیسے سے وہ انسان ہے — اے دوگانہ جان دیکھو کیا خدا کی شان ہے
ہوش میں پاجی ہیں اور ہم کو ہے وحشت آجکل

مفلسی میں کام آتا ہے نہ کوئی رشتہ دار — باپ ہے ماں ہے جو کچھ ہے بڑا پروردگار
غیر کیسے حال اپنوں کا یہ ہے اب آشکار — ایک بھائی کو ہے فاقہ ایک ہے کرتا نہ ہر بار
اُٹھ گئی دُنیا کے پردے سے محبت آج کل

ہو گئی راحت ہے دشمن رنج ہے غم حبیب — دُور دولت ہو گئی کس طور ہو عشرت قریب
پاؤں جو پھیلا کے سوتے پھر نہیں جاگے نصیب — جو کئی تھے پیسے والے اب وہ ہیں مفلس غریب
اُن کے گھر مہمان رہتی ہے قناعت آجکل

نائی دھوبی کنجڑے بھٹیارے قصائی نابکار — ایک گاڑی کے لیے ہوتے ہیں گردن پر سوار
ڈٹ کر ہم کو رہتے تھے جو مفلسی تنبولی مالدار — ہم فقیر ان سے ہیں بدتر دیکھ لو ہے آشکار
پاجیوں کے گھر میں ہو جیوں کرنہ دولت آجکل

کیفی دہلوی کا 'عالم آشوب'

بعد کے بعض شاعروں نے شہر آشوب کے طرز پر 'عالم آشوب' اور 'دہر آشوب' لکھے ہیں۔ اردو کے ذی علم اور ممتاز ادیب اور شاعر پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی نے ۱۹۲۳ء میں ایک نظم 'عالم آشوب' کے نام سے کہی۔ انھوں نے میری طلب پر حسن خط کے ساتھ یہ نظم مجھے بھیجی تھی اس میں اس کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے:

"یہ نظم شہر آشوبوں سے مختلف ہے۔ ان میں اکثر تضحیک یا ایک قسم کی ہجو کا پہلو ہوا کرتا تھا۔ یہ متین مرثی حال ہے۔"

اور اس نظم کی وجہ تصنیف یہ بتائی ہے:

"یکم مارچ ۱۹۲۳ء کو دہلی میں کونسل آف اسٹیٹ اور لیجسلیٹو اسمبلی میں حکومت ہند کا بجٹ (موازنہ) پیش ہوا۔ تیس کروڑ سے زیادہ گھاٹا دکھایا گیا۔ نئے ٹیکسوں کی تجویزیں پیش ہوئیں۔ سارے صوبوں میں گھاٹے کے بجٹ پیش ہونے۔ وطن کا افلاس مدت سے دل کو دُکھ دے رہا تھا۔ یہ نئی صورتیں اس نظم کی محرک ہوئیں۔"

یہ عالم آشوب قصیدے کی شکل کی بہت طولانی نظم ہے اور اس میں ہندوستان کے افلاس کا مرقع کھینچا گیا ہے۔ مصنف نے پہلے عام اہل ملک کی مفلسی کا بیان کیا ہے، پھر ملازمت پیشہ، تجارت پیشہ، تعلیم یافتہ، مزدوری پیشہ، اہل حرفہ اور زراعت پیشہ طبقوں کی پریشانی و مذلّت دکھائی ہے۔ یہ مختلف طبقوں کے لوگوں کا ذکر کرنا 'شہر آشوب' کے قدیم مفہوم کا پرتو ہے

مگر اس نظم کے اور حصے ایسے بھی ہیں جو شہر آشوب سے مختلف ہیں اور جن کو بقول مصنف حقیقی مرثیہ حال کہنا چاہیے۔ ان میں سے بعض کے عنوان یہ ہیں۔ "وطن پرستی اور کفایت شعاری" "حکومت اور رعیت کے فرائض" "عالمگیر افلاس کے اسباب" اس عالم آشوب کے چند اقتباس ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:-

تمہید

چھائے ہیں ملک پہ افلاس کے منحوس آثار
تنگ دستی کا ہے جس سر پہ خلائق کے سوار

شہر آشوب لکھا کرتے تھے پہلے شعرا اب
عالم آشوب کے لکھنے کا ہے مضمون تیار

زراعت پیشہ

زر ہو پیشہ جو ہیں ان کا نہ پوچھو احوال
ان پہ رہتی ہے مصائب کی ہمیشہ بھرمار

پیٹ کو کاٹتے ہیں گو وہ اس سے کہ لیں بس آپ
ہونے لگتا ہے پہ دوچند سے بھی کا شمار

سادہ خوراک کی ہے مانگ یہ نہایت ادوار
پہلے سال اُٹھا پہ وہاں سے چھوٹا ہے کنبار

[illegible] باقی [illegible]
پان بیوی سے تو چھوٹا ہے میاں سے بھی سگار

[illegible]
[illegible] کا ہے نہ کوئی غم خوار

[illegible]
خود مصیبت میں ہوں تو ایک ہیں یار و اغیار

تجارت پیشہ

[illegible] کو تجارت کا سمجھا نہ ابھی
[illegible] دیتے ہیں دکھائی جو یہ بڑھیا تجار

ان کے ہاتھوں میں [illegible] ہے وطن کی دولت
زر کے سر پہ چلاتے ہیں یہی تو تلوار

[illegible] آتے ہیں [illegible] سے جو سامان نفیس
[illegible] میں ان کی درآمد کے یہ ہیں ذمہ دار

ہیں یہ دلال اگر حیثیت اصلی دیکھو
غیر ملکوں کی یہ آڑھت کے ہیں فرمانبردار

تعلیم یافتہ

[illegible] نہ وہ کچھ اور ہی سیکھے ہاتھ کا کام
وہ تو اک نوکری پہ بیٹھے ہیں بس کھائے ادھار

بھول بیٹھے ہیں بزرگوں کے ہنر اور فن کو
ایسے [illegible] کے تو رہ گیا ان کا بیکار

اک اسامی کہیں خالی ہوئی پھر دیکھیں آپ
بابوؤں کی دو رویہ رہ دفتر میں قطار

عرضیاں [illegible] پر ہیں کہ [illegible] آتی ہیں
[illegible] سے سفارش کے خطوں کے انبار

[illegible] ایسے
عقل انسانی ہے سمجھانے میں جن کے بیکار

[illegible] اس کا نتیجہ جو ہے وہ ظاہر ہے
[illegible] جاتے ہیں سب ان بیزار

ہے حکومت جو تہی دست ملیت کنگال — کون امداد کرے کس کی سبھی ہیں ناچار

صفی لکھنوی کا 'دھر آشوب'

لسان القوم سید علی نقی صفی لکھنوی نے اپنی مثنوی تنظیم الہیات مطبوعہ ۱۹۲۶ء کے دیباچے میں اکتیس شعر کا ایک 'دھر آشوب' لکھا ہے۔ اس کے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں:

پُرشور و شر آج کل ہے آفاق — ایسے بگڑے ہوئے ہیں اخلاق
اگلوں نے لکھے تھے 'شہر آشوب' — مجھ کو لکھنا ہے 'دھر آشوب'
افریقہ و ایشیا و یورپ — ہر خطہ سواد کفر سے گھپ
چھائی ہوئی مادہ پرستی — فرضی فقط خدا کی ہستی
کمتر اُن میں خدا کے بندے — اکثر حرص و ہوا کے بندے
فرماں بر نفس ہر کہ و مہ — باشندۂ شہر و ساکن دہ
جنباں رگ مادہ پرستی — ہر نفس میں انتہا کی پستی
کھانا پینا مزے اڑانا — جو اس پہ عمل کرے وہ دانا
افراد کو زعم کبریائی — افکار کو دعویٰ خدائی
مخصوص اقوام ابیض اللون — ایک ایک دماغ تخت فرعون
خونخوار آئین زندگی ہے — تہذیب بشر درندگی ہے
جب عقل فساد حکمراں ہو — درہم برہم نہ کیوں جہاں ہو

(تنظیم الہیات ص۱۳-۱۵)

عمر انصاری کا 'دھر آشوب'

اخبار ترقی لکھنؤ کے یکم جولائی ۱۹۳۵ء کے پرچے میں عمر انصاری لکھنوی کا ایک مسدس 'دھر آشوب' کے عنوان سے شائع ہوا جس میں پچیس بند ہیں۔ ابتدا کے چند بندوں میں اپنے زمانے کی برائیاں بیان کرنے کے بعد اس مسدس کے بند 'قاضی' واعظ، مولوی، المتقی، جوگی، سادھو، لیڈر، ماسٹر، طالب علم، شاعر ہدف ملامت بنائے گئے ہیں۔ چند بند اور کچھ مصرعے نقل کیے جاتے ہیں:

آج اک قصۂ دیرینہ سناتا ہوں میں — خواب غفلت سے زمانے کو جگاتا ہوں میں
عہد پارینہ اُسے یاد دلاتا ہوں میں — خود بھی روتا ہوں جہاں کو بھی رلاتا ہوں میں
دُور جا پہنچی ہیں اس وقت نگاہیں میری
اب کسے روکے سے رُکتی نہیں آہیں میری

نہ وہ ہم ہیں نہ وہ مستی ہے نہ وہ کیف و خمار — نہ وہ ساقی نہ وہ مطرب نہ وہ ہنگام بہار

نہ وہ دنیا نہ وہ عالم نہ وہ دشمن نہ وہ یار   نہ وہ صیاد نہ گلچیں نہ وہ گلشن نہ بہار

وہ محبت نہیں وہ مجمع احباب نہیں
وہ خریدار نہیں وہ درِ خوش آب نہیں

ساز کے ٹوٹے ہوئے تار ہیں محفل برہم   نغمہ مفقود ہے موجود ہے شور ماتم
گرد سے تیرہ و تاریک فضائے عالم   بلبل زار کا بستر ہے سراب شبنم

پھول مرجھائے گلستاں میں گرد چکی ہے
پتی پتی کف افسوس پڑی ملتی ہے

ان نظم میں مختلف ہیئتوں کا جو انداز ہے:

زاہد وہ ہے کہ جس کا کوئی مشرب ہی نہیں   قاضی وہ ہے کہ جسے علم سے مطلب ہی نہیں

مولوی وہ ہے کہ تا ناف رکھے ریش دراز   مفتی وہ ہے کہ جسے کل ہو خرافات پہ ناز
جوگی وہ ہے کہ ہو عریانی پہ اپنی جسے ناز   صوفی وہ ہے کہ جو اللہ کا ٹھہرے ہمراز

سادھو وہ ہے جو گراں رہے کا پیٹے
سب سے بہتر وہی پیشہ ہے جو کٹ رہتے

طالب علم وہ بہتر ہے کہ جب ہاتھ جانے   عمر سب کھیل کے جس طرح سے خوب بتائے
پھر ہوا ہے جو وہ از روئے زمانہ پر ہائے   جتنا لے لے کے بچے سدا نہ وہ گردن کو جھکائے

ماہر وہ ہیں کہ تعلیم کو کہتے ہیں بُرا آئیں   خوب بوڑھوں کو زمانے کے کچھ شعر سنائیں
پہلے جس طرح سے ممکن ہو کہیں خوب اڑائیں   مفت بک جائے تو لکھے سے وہ رخصت ہو جائیں

شعرا کیسے کہ ہو دل ہی میں معانی کا باب   متبع کسی مطلب سے نہ ہو رائے صواب

نثر وہ نثر میں کچھ فرق نہ سمجھا جائے   بادہ لے شاہ نہ جو جاں سے پائے

نظم میں جا کے جو اچھا کوئی گا لیتا ہے   سننے والوں کو وہ البتہ رجھا لیتا ہے

اے قمر اب ہیں زمانے کے یہی لیل و نہار　　یعنی ہر مذہب و ملت کے یہی ہیں اطوار
مجھ کو اچھے نہیں آتے ہیں نظر کچھ آثار　　صاف کہتا ہوں کہ ہے صاف دلی میرا شعار
دہر آمادہ ہے کچھ رنگ بدلنے کے لیے
جانب غرب سے سورج ہے نکلنے کے لیے

یہی عشرت ہے تو پیدا کوئی زحمت ہوگی　　یہی راحت ہے تو ظاہر کوئی کلفت ہوگی
یہی دن ہے تو یہاں شام مصیبت ہوگی　　یہی شب ہے تو عیاں صبح قیامت ہوگی
پھر زمانے کے سب اطوار بدل جائیں گے
وہی دنیا وہی اوضاع کہن آئیں گے

شریر بن باسی کا 'شہر آشوب'

شریر بن باسی کا چوالیس بند کا مخمس 'شہر آشوب' کے عنوان سے اخبار ہمدم' لکھنؤ میں ۱۲ دسمبر ۱۹۲۳ء کو شایع ہوا۔ ایڈیٹر نے جو نوٹ اس پر لکھا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریر اس وقت زندہ تھے اور اُن کا کلام ہمدم میں شایع ہوتا رہتا تھا۔ اس شہر آشوب میں شاعر پہلے خطۂ لکھنؤ کے پُر فضا باغ، پُر شکوہ عمارتیں، آباد محلے، اہل فن، اہل علم اور لکھنؤ والوں کی شیریں زبانی، خوش پوشاکی، شائستگی اور تہذیب یاد کرکے افسوس کرتا ہے۔ پھر دوسرے شہر آشوبوں کے خلاف مختلف پیشہ وروں کی جگہ مختلف اداروں کا حال زار بیان کرتا ہے اور منشی، پیر، فقیر، صوفی، عالم دین، مفتی، ڈاکٹر، سرجن، نرس، عطار، انجنیئر، معمار، چنگی کے ممبر، میلی فون والیاں، لیکچرر، پروفیسر، ڈین، ڈیڈیٹر اور شاعر کی ہجو کرتا ہے۔ چند بند نمونے کے طور پر نقل کیے جاتے ہیں:

کیا لکھنؤ کے شہر کی حالت کروں بیاں　　باغوں کا شہر کہتے تھے جس کو کبھی میاں
جس کی صفت میں تھا کبھی رطب اللسان جہاں　　ہوتا تھا جس پہ خلد بریں کا کبھی گماں
افسوس اس کو میٹ گیا دور آسماں

وہ باغ کیا ہوئے وہ گلستاں کدھر گئے　　وہ بوستاں بہشت بہ داماں کدھر گئے
ہر شاخ سے طیور غزل خواں کدھر گئے　　فوارے کیا ہوئے وہ خیاباں کدھر گئے
ہم نے کبھی تو ایسی نہ دیکھی کوئی خزاں

منشی نہیں دبیر نہیں منطقی نہیں　　مُلّا نہیں فقیہ نہیں مولوی نہیں
مُرشد نہیں مُرید نہیں مُتّقی نہیں　　عارف نہیں فقیر نہیں باطنی نہیں
واعظ کا کہیں ملتا نہیں نشاں

ء یعنی لکھنؤ کی زبان نہیں ہے۔

جو پیر ہے فقیر ہے مرشد ہے شاہ ہے   چالاک ہے حریص ہے نامہ سیاہ ہے
اور صوفیوں کی جو بھی یہاں خانقاہ ہے   سب تو تماش بینوں کی آماجگاہ ہے
کیونکر نہ دل کی آگ سے اٹھنے لگے دھواں

کالج یہاں پہ جتنے ہیں سب لاجواب ہیں   اسکول بھی ہمارے یہاں بے حساب ہیں
بیکار کچھ ہیں بعض حماقت مآب ہیں   بیکار مدرسے ہیں مکاتب خراب ہیں
پڑھ کر ہے جاہل تر از اندیشہ و گماں

گو ممبر ہیں ڈپٹی ہیں اور ہیں پروفسر   کچھ ان میں بے وقوف ہیں کچھ ان میں بے خبر
کچھ بحث کم نگاہ قیامت کے بے ہنر   تقریر کی ہے فکر نہ تدریس پر نظر
پیشہ فریب لوگوں کا کرتے ہیں رائیگاں

آتا نہیں ہے کوئی ہنر اور ہیں شریر   نالائقی میں جو کہ نہ ہوئے کہیں نظیر
بے شرم بے حجاب سیہ بخت اور حقیر   اب ایسے لوگ ہو گئے اخبار کے مدیر
جن کو لگانی بھی نہیں آتی ہیں سرخیاں

مطلب مروں سے نہ روانی پہ ہے نگاہ   کیا ہو فصاحت اور بلاغت میں دستگاہ
ان شاعروں کے غول سے اللہ کی پناہ   اک شعر پر بھی ہو گئی گر ان کے واہ واہ
اپنے کو آپ سمجھتے ہیں بس قاآنیِ زماں

سب ہو چکا بیان تباہی کا ماجرا   جو کچھ ہوا ہمارے گناہوں کی ہے سزا
ہر ایک دل سے اب تو نکلتی ہے یہ دعا   اُجڑا ہوا یہ دیس بسے پھر سے اے خدا
تو ہے کریم فضل کی اپنے دکھا دے شاں

اس مخمس کا آخری بند نظیر اکبر آبادی کے "شہر آشوب" کے آخری بند کی نقل ہے۔ دونوں بند ملاحظہ ہوں

عاشق کہو اسیر کہو آگرے کا ہے   مُلّا کہو دبیر کہو آگرے کا ہے
مفلس کہو فقیر کہو آگرے کا ہے   شاعر کہو نظیر کہو آگرے کا ہے
اس واسطے یہ اس نے لکھے پانچ چار بند

قیدی کہو اسیر کہو لکھنؤ کا ہے   قاصد کہو سفیر کہو لکھنؤ کا ہے

شاعر کوئی فقیر کوئی لکھنؤ کا ہے　　　احمق کوئی شریر کوئی لکھنؤ کا ہے

جو کسی طرح نہ اُس کی تباہی پہ نوحہ خواں

خاتمۂ کلام مسعود سعد سلمان سے شہر یہ بن باسی تک تقریباً نو صدیاں گزری ہیں۔ اس طویل مدت میں فارسی اور اُردو میں بہت سے شہر آشوب کہے گئے ہوں گے۔ ان میں سے چند جو راقم کے علم میں آئے اُن کا ذکر اور اُن کے نمونے اس مقالے میں تاریخی ترتیب سے پیش کر دیے گئے ہیں۔ اس طرح جو شہر آشوب کے مفہوم میں جو تبدیلیاں ہوتی رہیں اور اس کی ہیئت اور موضوع میں جو تنوع پیدا ہوتا رہا، اُس کا ایک خاکہ قاریوں کے سامنے آگیا ہوگا اور یہی اس مقالے کا مقصد ہے۔

مولانا ابوالکلام کی شخصیت

مولانا عبدالماجد دریابادی

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم

رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

گویا وہ مومن اسی آن، اسی شان، اسی ادا، اسی نوک ٹوک کا ہو یا نہ ہو، ان آنکھوں نے ایک تصویر تو اقبال کے نظم حقیقت بن کر کہیں ہو لی پھرتی بھی دیکھ لی۔ اور تصویر بھی کیسی! ایک سماں، نک سک سے درست، رنگ پک سے راستہ، بزم کی محفلیں ہوں یا یاراں شفقت کا ہجوم، تو آپ دیکھیے کہ مولانا کے منہ سے کس طرح پھول جھڑ رہے ہیں۔ لطیفوں پر لطیفے۔ دینی، ادبی، سیاسی، علمی، شخصی، ہر قسم کے تذکرے اور زمزمہ، ظرافت و شگفتگی، ایک سے بڑھ کر ایک، کہیں شعر گنگنا رہے ہیں، کہیں بول چال کی نثر کرشمے ہوئے ہیں اور صحبت کی گرما گرمی چمن بنا رہی ہے ۔

ہے زباں میری ابرِ گوہر بار

گلشن نہیں بہاروں جیسے اور دل نہ گھبرائے، نہ کملائے نہ پچھتائے۔

اور جو کہیں موقع اس کا آ گیا کہ چوٹ مولانا کے غیرت اخلاقی یا حسّ دینی پر پڑ گئی تو وہ خلوت ہو یا جلوت، تخلیہ ہو یا مجلس، تحریر ہو یا تقریر، اب سماں ہی دوسرا ہے۔ ایک شعلہ ہے کہ لپک رہا ہے، اشارے ہیں، کنائے ہیں، کہ دلائل کی خطابت کی آگ برسا رہا ہے، اور زبان ہے کہ آگ پھر سے اگلتی جاتی ہے کہ

ہے قلم میرا تیغِ جوہر دار

لیکن جوش و خروش کے عالم میں بھی شروع جوانی کے دور کو چھوڑ کر تقریباً زبان قابو سے باہر نہیں۔ قابو کے اندر منطق پر اور نفس پر جیسے پہرہ لگا ہوا۔ اشتعال کے سمندر سے جیسے لہریں اٹھ رہی ہیں اور علم و متانت کی چٹان سے ٹکرا کر واپس چلی جا رہی ہیں۔

ایک دن کی بات سنیے، لیکن مختصر تعارف کے سلسلے زمانہ آج سے تینتالیس ۴۳ سال قبل ۱۹۲۰ء کا لے آئیے۔ وقت تحریک خلافت و تحریک ترک موالات کی بھرپور جوانی کا۔ بچہ بچہ کی زبان پر خلافت کے پرجوش نعرے اور "جان بیٹا خلافت پہ دے دو" کے ترانے۔ لیکن یو۔ پی ہی کا ایک مشہور و معروف دینی مرکز انسداد خلافت مرکز بھی۔ اس کے مفتی کا حکم کہ تحریک خلافت حدود کفر میں داخل اور اس کے علمبردار دائرۂ اسلام سے خارج۔ ادھر خلافت والوں کو یہ سوجھی کہ اپنا ایک کانفرنس بھی اسی شہر میں کیجیے ——— اچھا صاحب، جلسہ ہوا اور گویا مخالفین کے طبل جنگ پر چوٹ پڑ گئی۔

مخالفین بڑا ٹھاٹھ کر چلے کہ آج عام جلسہ کو جی بھر کر درہم برہم کیجیے اور بڑے سے بڑا فرق ہی کر کے واپس آ جائیے اور جلسۂ خلافت

ہ دامن کو اپنی معترضانہ تحکیز سے تار تار کر کے رکھ دیجیے ! ——— ادھر خلافت والے بھی فکر مند کہ آج تو

ہے سانپ کے مُنہ میں اُنگلی اپنی

جام دیکھیے کیا ہو' مناظرہ' ٹکراؤ' تصادم تو رکھا ہی ہوا ہے۔ بہیجیے جلسہ شروع ہو گیا۔ مخالفین کی طرف سے میدانِ خطابت کا ایک پہلوان' منہ زور اور پیل تن اکھاڑے میں اُتارا گیا کُشتی پر کُشتی مارے ہوئے' داؤں پیچ کی اُستادی میں نام پائے ہوئے۔ اور اُس نے تقریر کیا' وہ مار لے کے انداز میں شروع کی۔ جلسہ پر ایک نشہ کی سی کیفیت طاری اور خلافت والوں کی زبان پر وظیفے یا حفیظ کے جاری ب یاد نہیں کہ صدرِ جلسہ خود مولانا ابوالکلام ہی تھے یا کوئی اور' بہرحال جوابی تقریر کے لیے کھڑے ہوئے لوگ سمجھے کہ لوہے کی کاٹ کے لیے ا نکلا اور بس کوئی دم میں اینٹ کے جواب میں پتھر چلا۔ ادھر پولیس ہر طرح لیس' ہنگامے فساد کی منتظر' گڑبڑ گھوٹالے کی متوقع ——— لیکن

——— لیکن . . . . . یہ کیا! تقریر تو شروع ہو کر ختم بھی ہو گئی اور کہیں نہ تحکیز نہ تفسیق' اور یہ تو بہت دُور کی چیزیں ہیں کفش' نہ تعریض' نہ تشنیع' نہ تضحیک' نہ تفضیح! شروع سے آخر تک بس تفہیم و تذکیر' تشریح و تبیین' نہ مناظرہ نہ مناخرہ' نہ مکابرہ' نہ مبادلہ! تقریر دلائل و حقائق کے رنگ میں رنگی ہوئی' معقولیت اور سلامت روی کے پیکروں میں گندھی ہوئی ——— حریف اب رتا بھی تو کیا کرتا۔ سارے ارمان ٹھٹھا کر رہ گئے' غالب کے پرزے اُڑنے کی جو خبر گرم تھی وہ مولانا کے علم و تدبر کے آگے سرد ہو کر دھری کی دھری رہ گئی اور تماشا ہو نہ پایا ! ؎

تیغِ حلم از تیغِ آہن تیز تر
بل ز صد لشکر ظفر انگیز تر

جو پڑھا مثنوی میں تھا' اُس کا سماں آنکھوں سے آج دیکھ لیا۔

قدرت نے گویا پیدا ہی لڑائی کے لیے کیا تھا۔ کم سنی ہی تھی کہ تحریر و تقریر دونوں کا شہرہ بلند ہو گیا اور دُور دور والے اسی دھوکے میں پڑے سب کہ یہ کوئی بوڑھا ہو گا۔ اور شاگرد تو علوم و فنون میں کہنا چاہیے کہ کسی کے بھی نہ ہوئے۔ فیض بس مبدءِ فیض سے پائے ہوئے۔ رسمًا کسی سے کچھ پڑھ پڑھا لیا تو اور بات ہے ورنہ حقیقتاً شاگردی کے نام سے ناآشنا اور مصداق ع

شاگردِ رشیدِ حق تعالیٰ

ے بنے ہوئے۔

خدنگِ نظر لکھنؤ کا ایک ادبی ماہنامہ تھا' اس کے صفحات پر جب نظر آئے تو خود ہی مرکزِ نظر بن گئے۔ لسان الصدق کلکتہ سے نکالا تو وقت کی صحافت میں چار چاند لگا دیے۔ الندوہ کے کرنج علم و فضل میں جب آ نکلے تو ڈپٹی بنے بغیر اڈیٹر بن گئے اور جب وکیل امرتسر ہاتھ میں لیا تو اس کا نام دور دور چمکایا اور یہ سب اُس سن کی باتیں ہیں جب لڑکے کالج کے درجوں میں پڑھتے ہوتے ہیں جب کل کے کاپی چل بنے کا وقت آیا اور اپنا ذاتی ہفتہ وار کلکتہ کے اُفق سے آب و تاب سے نکالا تو

چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

مولانا ابوالکلام کی شخصیت

مولانا عبدالماجد دریابادی

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم

رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

کوئی اور مومن اس آن، اس شان، اس سج دھج، اس کر و فر کا ہو یا نہ ہو، ان آنکھوں نے ایک تصویر تو اقبال کے قلم حقیقت رقم کی کھینچی ہوئی اپنے زمانہ میں دیکھ لی۔ اور تصویر بھی کیسی! ایک سچائی، نک سک سے درست، نوک پلک سے آراستہ، بزم کی محفلیں ہوں یا یاران بے تکلف کا مجمع، ذرا آپ دیکھیے کہ مولانا کے منہ سے کس طرح پھول جھڑ رہے ہیں، لطیفوں پر لطیفے، دینی، ادبی، سیاسی، علمی، ہر قسم کے تذکرے اور تبصرے، لطیف و شگفتہ، ایک سے بڑھ کر ایک، کہیں شعر گنا رہے ہیں، کہیں بول چال کی نثر کو شعر بنائے ہوئے ہیں اور طبیعت کی آمد ہے کہ رس برسا رہی ہے ؎

بے زبانی میری اب گوہر بار

گھنٹوں نہیں پہروں بیٹھئے اور دل نہ گھبرائے، نہ اکتائے نہ پچھتائے۔

اور جو کہیں مرتبہ اس کا آگیا کہ چوٹ مولانا کے ضمیر اخلاقی یا حس دینی پر پڑی، وہ خلوت ہو یا جلوت، تخلیہ ہو یا مجمع، تحریر ہو یا تقریر اب سماں ہی دوسرا ہے۔ ایک شیر ہے کہ گرج رہا ہے، اثبات ہے، وہ سود ہیں کہ دلائل کی خطابت کی آگ برسا رہا ہے، اور زبان ہے کہ آج پھر صدا لگائے ہے کہ

ہے قلم میرا تیغ جوہر دار

لیکن جوش و خروش کے عالم میں بھی شرعی حدود کی حد کو چھوڑ کر قلم یا زبان قابو سے باہر نہیں، قابو کے اندر مخلوق پر اور نفس پر جیسے پہرا لگا ہوا۔ اشتعال کے سمندر سے جیسے موجیں اٹھ رہی ہیں اور حلم و متانت کی چٹان سے ٹکرا کر واپس چلی جا رہی ہیں۔

ایک دن کی بات سنیے، لیکن چشم تصور کے سامنے زمانہ آج سے تینتالیس سال قبل سنہ ۲۱ کا لے آئیے۔ وقت تحریک خلافت و تحریک ترک موالات کی بھرپور جوانی کا۔ بچہ بچہ کی زبان پر خلافت کے پُرجوش نعرے اور "جان بیٹا خلافت پہ دے دو" کے ترانے۔ لکھنؤ یو۔ پی کا ایک معلوم و معروف دینی مرکز، یعنی خلافت مرکز بھی۔ اس کے مفتی کا حکم کہ تحریک خلافت حدود کفر میں داخل اور اس کے کارکن دائرہ اسلام سے خارج۔ اور خلافت والوں کو یہ سوجھی کہ اپنی ایک کانفرنس عین اسی شہر میں کیجیے ——— اچھا صاحب، جلسہ ہوا اور گویا مخالفین کے طبل جنگ پر چوٹ پڑ گئی۔

مخالفین بھرا کر چلے کہ تم عام جلسہ کو بھی بھر کر درہم برہم کیجیے اور جلسے کو خرقہ کی کسکے واپس آ ئیے اور جلسۂ خلافت

کے دامن کو اپنی معترضانہ تحریر سے تار تار کر کے رکھ دیجیے! ـــــ ادھر خلافت والے بھی فکر مند کہ آج تو

ہے سانپ کے منہ میں انگلی اپنی

انجام دیکھیے کیا ہو، مناظرہ، ٹکراؤ، تصادم تو رکھا ہی ہوا ہے۔ لیجیے جلسہ شروع ہو گیا۔ مخالفین کی طرف سے میدانِ خطابت کا ایک پہلوان، شہ زور اور پیل تن اکھاڑے میں اُتارا گیا، کشتی پر کشتی مارے ہوئے، داؤں پیچ کی اُستادی میں نام پائے ہوئے۔ اور اُس نے تقریر یہ مارا وہ مارا کے انداز میں شروع کی۔ جلسہ پر ایک نشہ کی سی کیفیت طاری اور خلافت والوں کی زبان پر وظیفے یا حفیظ کے جاری۔ اب یاد نہیں کہ صدرِ جلسہ خود مولانا ابوالکلام ہی تھے یا کوئی اور، بہرحال جوابی تقریر کے لیے کھڑے ہوئے لوگ سمجھے کہ لوہے کی کاٹ کے لیے وہ نکلا اور بس کوئی دم میں اینٹ کے جواب میں پتھر چلا۔ ادھر پولیس ہر طرح لیس، ہنگامے فساد کی منتظر، ہلڑ گلڑ کی متوقع ـــــ لیکن ـــــ لیکن...... یہ کیا! تقریر تو شروع ہو کر ختم بھی ہو گئی اور کہیں نہ تحقیر نہ تفسیق، اور یہ تو بہت دُور کی چیزیں ہیں، نہ توہین نہ تشنیع نہ تضحیک نہ تفضیح! شروع سے آخر تک بس تفہیم و تذکیر، تشریح و تبیین، نہ مناظرہ نہ مناخرہ، نہ مکابرہ، نہ مبادلہ! تقریر دلائل و حقائق کے رنگ میں رنگی ہوئی، معقولیت اور سلامت روی کے پھولوں میں گندھی ہوئی، ـــــ حریف اب زنا بھی تو کیا کرتا۔ سارے ارمان چپٹا کر رہ گئے، غالب کے پُرزے اُڑنے کی جو خبر گرم تھی وہ مولانا کے حلم و تدبر کے آگے سرد ہو کر دھری کی دھری رہ گئی اور تماشا ہو نہ پایا! ؎

تیغِ حلم از تیغِ آہن تیز تر
بل ز صد لشکر ظفر انگیز تر

شعر پڑھا مثنوی میں تھا، اُس کا سماں آنکھوں سے آج دیکھ لیا۔

قدرت نے گویا پیدا ہی بڑائی کے لیے کیا تھا۔ کم سن ہی تھے کہ تحریر و تقریر دونوں کا شہرہ بلند ہو گیا اور دُور دُور واے اسی دھوکے میں پڑے رہے کہ یہ لڑکا کوئی بوڑھا ہو گا۔ اور شاگرد تو علوم و فنون میں کہنا چاہیے کہ کسی کے بھی نہ ہوئے۔ فیض بس منبعِ فیض سے پائے ہوئے۔ رسمًا کسی سے کچھ پڑھ پڑھا لیا تو اور بات ہے ورنہ حقیقتہً شاگردی کے نام سے ناآشنا اور مصداق ع

شاگردِ رشید حق تعالیٰ

کے بنے ہوئے۔

خدنگِ نظر لکھنؤ کا ایک ادبی ماہنامہ تھا، اس کے صفحات پر جب نظر آئے تو خود ہی مرکزِ نظر بن گئے۔ لسان الصدق کلکتہ سے نکالا تو وقت کی صحافت میں چار چاند لگا دیے۔ الندوہ کے کرتا دھرتا علم و فضل میں جب آ نکلے تو اڈیٹر بنے بغیر اڈیٹر ہی بن گئے اور جب وکیل (امرتسر) ہاتھ میں لیا تو اس کا نام دُور دُور چمکا یا اور یہ سب اُس سن کی باتیں ہیں جب لڑکے کالج کے درجوں میں پڑھتے ہوتے ہیں جب کل کے کھیل بننے کا وقت آیا اور اپنا ذاتی ہفتہ وار کلکتہ کے اُفق سے آب و تاب سے نکالا تو

چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

مولانا ابوالکلام کی شخصیت

مولانا عبدالماجد دریابادی

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم

رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

نرمی و گرمی اس آن، اس شان، اس حد تک یکجا کہ اس کو ان آنکھوں نے ایک تصویر تو اقبال کے قلم حقیقت رقم کی کھینچی ہوئی، پچاس برس میں دیکھ لی۔ اور تصویر بھی کیسی! اپنی سجاوٹ، رنگ روپ سب سے درست، نوک پلک سے آراستہ، بیچ کی محفلیں ہوں یاراں کے حلقے ہوں، مجمع ہوں تو آپ دیکھیے کہ مولانا کے منہ سے کس طرح پھول جھڑ رہے ہیں، لطیفوں پر لطیفے، دینی، ادبی، سیاسی، علمی، ہر قسم کے تذکرے اور تبصرے، لطیف و شگفتہ، ایک سے بڑھ کر ایک، کہیں شعر سنا رہے ہیں، کہیں بول چال کی نثر کو شعر بنائے دے رہے ہیں اور طبیعت کی آمد ہے کہ سیل جاری رہتی ہے ؎

ہے زباں میری ابرِ گوہر بار

لفظوں نہیں ہیں موتی ہیں جھڑتے اور دل کو گرمائے، نہ اکتائے نہ تھکائے۔

اور جو کہیں موقع اس کا آگیا کہ چوٹ مولانا کے ضمیر اخلاقی یا حسِ دینی پر پڑی، وہ خلوت ہو یا جلوت، تخلیہ ہو یا مجمع، تحریر ہو یا تقریر، اب سماں ہی دوسرا ہے۔ ایک شعلہ ہے کہ لپک رہا ہے، ایک آتش ہے کہ برس رہی ہے، کہ مولانا کی خطابت کی آگ برسا رہا ہے، اور زبان ہے کہ آگ پر شعلہ اٹھائے ہے کہ

ہے قلم میرا تیغِ جوہر دار

لیکن جوش و خروش کے عالم میں بھی مجال ہے جو اعتدال کے دامن کو چھوڑ کر قلم یا زبان قابو سے باہر نہیں، قابو کے اندر کلیتہً، اور نفس پر جیسے پہرا لگا ہوا، انفعال کے سمندر سے جیسے لہریں اٹھ رہی ہیں اور حلم و متانت کی چٹان سے ٹکرا کر واپس چلی جا رہی ہیں۔

اب دن کی بات نہیں، لیکن چشمِ تصور کے سامنے زمانہ آج سے بیتالیس (۴۲) سال قبل سنہ ۲۱ء کا ہے آجاتا ہے۔ وقت تحریک خلافت و تحریک ترکِ موالات کی بھرپور جوانی کا۔ بچہ بچہ کی زبان پر خلافت کے پُرجوش نعرے اور "جان بیٹا خلافت پہ دے دو" کے ترانے۔ لکھنؤ یو۔ پی کا ایک معلوم و معروف دینی مرکز، اپنی خلافت مرکز بھی۔ اس کے مفتی کا حکم کہ تحریک خلافت حدودِ کفر میں داخل اور اس سے متعلق ہونا دائرۂ اسلام سے خارج۔ ادھر خلافت والوں کو یہ سوجھی کہ اپنی ایک کانفرنس عین اسی شہر میں کیجیے —— اچھا صاحب، جلسہ ہوا اور گویا مخالفین کے طبلِ جنگ پر چوٹ پڑ گئی۔

مخالفین بپھر اٹھا کر چلے کہ آج عام جلسہ کو جی بھر کر درہم برہم کیجیے اور بڑے کو غرق ہی کر کے واپس آئیے اور جلسۂ خلافت

کے دامن کو اپنی معتراضِ نگیز سے تار تار کر کے رکھ دیجیے! ـــــــ ادھر خلافت والے بھی فکر مند کہ آج تو

ہے سانپ کے مُنہ میں اُنگلی اپنی

انجام دیکھیے کیا ہو، مناظرہ "ٹکراؤ" تصادم تو رکھا ہی ہوا ہے۔ لیجیے جلسہ شروع ہو گیا۔ مُخالفین کی طرف سے میدانِ خطابت کا اکھاڑ پہلوان، شہ زور اور پیل تن اکھاڑے میں اُتارا گیا۔ کُشتی پر کُشتی مارے ہوئے، داؤں پیچ کی اُستادی میں نام پائے ہوئے۔ اور اُس نے تقریر یہ مارا، وہ مارکے انداز میں شروع کی۔ جلسہ پر ایک نشہ کی سی کیفیت طاری اور خلافت والوں کی زبان پر وظیفے یا حفیظ کے۔ اب یاد نہیں کہ صدرِ جلسہ خود مولانا ابوالکلام ہی تھے یا کوئی اور، بہر حال جو اپنی تقریر کے لیے کھڑے ہوئے لوگ سمجھے کہ لوہے کی کاٹ کے لوہا نکلا اور بس کوئی دم میں اینٹ کے جواب میں پتھر چلا۔ ادھر پولیس ہر طرح لیس، ہنگامے فساد کی منتظر، "ہلڑ گلڑ" کی متوقع ـــــ لیکن ـــــ لیکن...... یہ کیا! تقریر تو شروع ہو کر ختم بھی ہو گئی اور کہیں نہ تکفیر نہ تفسیق، اور یہ تو بہت دُور کی چیزیں ہیں، تعریض، نہ تشنیع نہ تضحیک نہ تفضیح! شروع سے آخر تک بس تفہیم و تذکیر، تشریح و تبئین، نہ مناظرہ نہ مناخرہ، نہ مکابرہ، نہ مبادلہ۔ تقریر دلائل و حقائق کے رنگ میں رنگی ہوئی، معقولیت اور سلامت روی کے پھولوں میں گندھی ہوئی ـــــ حریف اب کرتا بھی تو کیا کرتا۔ سارے ارمان پیچ و تاب کھا کر رہ گئے، غالب کے پُرزے اُڑنے کی جو خبر گرم تھی وہ مولانا کے حلم و تدبّر کے آگے سرد دھری کی دھری رہ گئی اور تماشا ہو نہ پایا! ؎

تیغِ حلم از تیغِ آہن تیز تر
بل ز صد لشکر ظفر انگیز تر

شعر پڑھا مثنوی میں تھا، اُس کا سماں آنکھوں سے آج دیکھ لیا۔

قدرت نے گویا پیدا ہی لڑائی کے لیے کیا تھا۔ کم سِن ہی تھے کہ تحریر و تقریر دونوں کا شہرہ بلند ہو گیا اور دُور دور والے اسی دھوکے میں پڑے رہے کہ یہ لڑکا کوئی بوڑھا ہو گا۔ اور شاگرد تو علوم و فنون میں کہنا چاہیے کہ کسی کے بھی نہ ہوئے۔ فیض بس مبدءِ فیض سے پائے ہوئے۔ رسماً کسی سے کچھ پڑھ پڑھا لیا تو اور بات ہے ورنہ حقیقتاً شاگردی کے نام سے نا آشنا اور مصداق ع

شاگردِ رشیدِ حق تعالیٰ

کے بنے ہوئے۔

خدنگِ نظر لکھنؤ کا ایک ادبی ماہنامہ تھا، اس کے صفحات پر جب نظر آئے تو خود ہی مرکزِ نظر بن گئے۔ لسان الصدق کو جب نکالا تو وقت کی صحافت میں چار چاند لگا دیے۔ الندوہ کے کوچۂ علم و فضل میں جب آنکلے تو اڈیٹر بنے بغیر اڈیٹر بن گئے اور وکیل (امرتسر) ہاتھ میں لیا تو اس کا نام دُور دُور چمکایا اور یہ سب اُس سِن کی باتیں ہیں جب لڑکے کالج کے درجوں میں پڑھتے ہیں، جب کلی کے پھول بننے کا وقت آیا اور اپنا ذاتی ہفتہ وار کلکتہ کے اُفق سے آب و تاب سے نکالا تو

چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

یہ نام کا الہلال چند ہی روز میں ماہ دو ہفتہ یا بدر کامل تھا۔ انگلیاں ہر طرف سے اٹھنے لگیں اور مرحبا اور تحسین کے پھول ہر شہر اور ہر قریہ سے برسنے لگے۔

تقریر و تحریر کی جامعیت جیسی اس بھرپور شخصیت کے حصہ میں آئی کم تر ہی کسی کے نصیب میں آئی۔ خطابت میں اپنی نظیر آپ تھے۔ اردو میں خطابت کا ریکارڈ قائم کردیا۔ عین زندگی سے لے کر شام حیات تک سینکڑوں نہیں ہزاروں تقریریں کر ڈالیں، ہر تقریر انتخاب تھی اپنی جگہ پر جواب۔ مخالفین کے مجمع میں یہ جوہر اور زیادہ چمکتا اور اُن کے ہوائی قلعوں کو دم کے دم میں ڈھا دیتا۔ جواب کے لیے پہلا ہو لفظ رہا ہے عوام یا خواص کی زبان پر بھی "دندان شکن" ہے لیکن ابوالکلام کی تقریر نے نہ کسی کا دانت توڑا نہ جبڑا، کانوں کی راہ سے سیدھی دل میں اُترتی اور وہیں اپنی جگہ بنا لیتی۔

تحریر و انشا میں اپنے اسلوب کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔ شروع میں اسلوب بیان ذرا ثقیل تھا اور کتاب تذکرہ میں تو ثقیل سے گزر کر ثقل و ثقالت لیکن جاذبیت نے لطافت اس حال میں بھی نہ چھوڑی۔ رفتہ رفتہ ثقل لطافت میں تبدیل ہوگیا۔ غبار خاطر و کاروان خیال شگفتہ بیانی کے اعلیٰ ترین نمونے ہیں۔ دین کی خدمت علمی رنگ میں اپنی تفسیر کے ذریعہ سے بھی کی اور متعدد فقہی رسالے جو اپنی یادگار چھوڑ گئے وہ اس کے علاوہ ———— ان کی ادبی شخصیت کی وسعت اور بلندی دونوں کا پوچھنا ہی کیا۔ ہزارہا صفحات پر چھاپ لگی ہوئی ان کی انفرادیت کی، ان کے قلم کے بانکپن کی، ان کی خدمت تخلیق کی۔ زبان کے باب میں کیا لکھ لے کر آئے تھے: لکھنؤ میں مستقل قیام کچھ زیادہ لمبا نہیں رہا تھا، چند ہی ہفتے تو شاید رہے تھے۔ لیکن زبان لکھنؤ کی نزاکتوں پر وہ عبور حاصل کر لیا کہ جیسے سدا کے لکھنؤ ہی ہوں۔

سیاسیات نے لوہا جب قدم رکھا تو دیکھتے ہی دیکھتے صف اول کے لیڈروں میں شمار ہونے لگے۔ نوبت یہ پہنچی کہ سردار پٹیل سے ایسا رہا منوا لیا اور گاندھی جی اور جواہر لال نہرو جیسے ان کا کلمہ ہی پڑھنے لگے، کلمہ اُن کی پُرجوش خطابت کا نہیں، کلمہ ان کی فہم و فراست کا، دانش و بینش کا، دوربینی اور تدبر کا ———— کسی دوسرے کی شخصیت سے مرعوب بلکہ متاثر ہونا تو شاید ابوالکلام نے عمر بھر جانا ہی نہیں، البتہ اپنی شخصیت سے دوسروں کو متاثر کرتے رہے۔ نظریاتی اختلاف کیا دینی، اور کیا سیاسی، اپنے معاصرین میں خدا معلوم کتنوں سے تھا اور وہ ہونا لازمی تھا، لیکن اپنے ذاتی تعلقات میں فرق نہ کسی دینی اختلاف سے آنے دیا نہ کسی سیاسی اختلاف سے اور نہ اپنی طرف سے کسی اختلاف کو مخاصمت میں تبدیل ہونے دیا ——— حیدرآباد میں پولیس ایکشن کے بعد جو انقلاب آیا اس کی لپیٹ میں قریب تھا کہ عربی زبان اور اسلامی علوم کا نامور ادارہ دائرۃ المعارف گردش روزگار کی نذر ہوجائے، عین وقت پر ابوالکلام کی شخصیت آڑے آئی اور اس نے اس بین الاقوامی ادارہ کو قائم و محفوظ رکھ کر بھارت کے سیکولرزم کا بھرم قائم رکھا اور اپنے ملک و وطن کی نیک نامی پر آنچ نہ آنے دی۔



بابائے اردو

ذکرِ عبد الحق

مولوی عبد الحق، ترتیب: معین الرحمٰن

"چند ہم عصر" مولوی عبد الحق کا معروف نثری مجموعہ ہے۔ مختلف اوقات میں لکھی گئی ان تحریروں کو سب سے پہلے مولوی عبد الحق کے ایک عزیز شاگرد شیخ چاند (مرحوم) ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔ (ریسرچ اسکالر، جامعۂ عثمانیہ) نے جمع کیا، لیکن وہ اسے اپنی زندگی میں طبع نہ کرا سکے۔ اُن کی موت کے بعد یہ مجموعہ سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اُردو (ہند) نمبر ۱۹۲ کے تحت اب سے کوئی پچیس برس پہلے شائع ہوا۔ پہلے ایڈیشن میں چودہ ۱۴ مضامین شامل تھے۔ اِن میں سے کچھ تو رسالوں میں پہلے چھپ چکے تھے، کچھ اس مجموعے کے لیے خاص طور پر لکھے گئے اور بعض شیخ چاند مرحوم نے کتابوں کے تبصروں یا مولوی عبد الحق کے خطوط سے اقتباس کر کے اس میں داخل کر دیے۔ شیخ چاند کا خیال تو یہ بھی تھا کہ ہر تصویر کے ساتھ صاحب مضمون کی تصویر بھی لگا دی جائے لیکن اس کی نوبت نہ آئی۔ دوسرا ایڈیشن اسی سلسلۂ مطبوعات کے تحت، منیجر انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی کی مختصر "التماس" کے ساتھ جمال پریس دہلی سے ۱۹۴۲ء میں طبع ہوا۔ اس میں راس مسعود اور میرن صاحب کے حالات کا اضافہ کیا گیا جو رسالہ "اُردو" میں شائع ہوئے تھے۔ نام دیو مالی کا تذکرہ خاص طور پر اسی ایڈیشن کے لیے لکھا گیا۔

یہ مجموعہ بہت مقبول ہوا۔ تقسیمِ ہند کے بعد، نظرِ ثانی و اضافہ کے ساتھ اس کا تیسرا ایڈیشن سلسلۂ مطبوعاتِ انجمن ترقی اُردو پاکستان نمبر ۱۹۲ کے تحت قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی (مرحوم) کے دیباچے کے ساتھ ۱۹۵۰ء میں چھپا۔ سرسید پر مولوی عبد الحق کا بسیر حاصل مضمون اسی ایڈیشن میں شامل کیا گیا۔ چوتھا ایڈیشن انجمن کے اسی سلسلۂ مطبوعات کے تحت تحسین سروری کے دیباچے کے ساتھ ۱۹۵۳ء میں چھپا، جس میں عبد الرحمٰن صدیقی، حسرت موہانی، پروفیسر اقبال، پروفیسر ری۔ ہٹ سک اور عبد الرحمٰن بجنوری پر مضامین کا اضافہ کیا گیا۔ "چند ہم عصر" کا پانچواں ایڈیشن بھی انجمن ہی کی جانب سے شائع ہوا۔ اس پر سالِ اشاعت کہیں درج نہیں لیکن انجمن کے کتب خانۂ خاص میں نسخے کے اندراج سے سالِ اشاعت ۱۹۵۹ء قیاس کیا جا سکتا ہے۔ نواب عماد الملک پر مضمون اسی ایڈیشن میں پہلی بار شامل ہوا۔

"چند ہم عصر" کا چھٹا ترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن مولوی عبد الحق کے اپنے مختصر دیباچے کے ساتھ

اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی کی طرف سے ۱۹۵۹ء میں شایع ہوا۔ اس ایڈیشن میں منشی امیر احمد مینائی پر مضمون، جو مولوی عبدالحق نے امیر مینائی کی وفات کے روز لکھ کر رسالہ "افسر" میں شایع کر دیا تھا، اس اعتذار کے ساتھ حذف کر دیا ہے کہ: "یہ بہت ہی سرسری مضمون ہے جس میں نہ پوری سیرت نگاری ہے اور نہ اُن کے کلام پر مکمل تبصرہ۔"

آخری ایڈیشن میں کل چوبیس[۲۴] شخصی خاکے شامل ہیں، جن میں سے مرزا حیرت پر مضمون مولوی عبدالحق کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ اس کی نشاندہی اُنھوں نے دیباچے میں کی ہے۔ بقیہ تئیس[۲۳] خاکوں میں سب سے پرانی تحریر پروفیسر ریورنڈ بٹ سک پر ہے، جو پہلی بار رسالہ "افسر" شمارہ جون ۱۹۰۱ء میں چھپی اور جسے "چند ہم عصر" کے چوتھے ایڈیشن میں شامل کیا گیا۔ آخری خاکہ خالدہ ادیب خانم کا ہے جو لکھا "چند ہم عصر" کے اس ایڈیشن ہی کے لیے گیا تھا لیکن پہلی بار یہ ہفت روزہ "لیل و نہار" کے سالنامہ، اپریل ۱۹۵۹ء (جلد: ۹، شمارہ نمبر ۱۵) میں شایع ہوا۔ اس طرح یہ تحریریں ۱۹۰۱ء سے ۱۹۵۹ء تک کوئی ساٹھ سال کی طویل مدت میں مختلف مواقع پر لکھی گئیں۔ اس صدی کا یہ عرصہ ہی قریب قریب مولوی عبدالحق کی زندگی کا فعّال دور بھی ہے۔ اُردو کے رشتے سے اپنی زندگی میں مولوی عبدالحق کا بے شمار افراد سے راست اور قریبی تعلق رہا۔ شناساؤں کی کثرت اور وقت کے اس پھیلاؤ کے باوصف صرف ان چند "ہم عصروں" کا انتخاب اپنی جگہ قابلِ غور اور توجہ طلب ہے۔

مولوی عبدالحق کو سمجھنے کے لیے ایک بات پیشِ نظر رہنی بہت ضروری ہے۔ "بیکاری اور بیگاری" اُن کی طبع ہمہ رسا کی ضد تھیں۔ وہ عمر بھر بیکار نہ رہے اور جو کام بھی کیا جی سے کیا، پیشہ وری کے داغ سے اپنے دامن کو کبھی آلودہ نہ ہونے دیا۔ یہ خاکے بھی نہ سیرت نگاری کی خانہ پُری کے لیے لکھے گئے اور نہ سیرت کشی کے لیے افراد کا یہ انتخاب ہی اضطراری تھا۔ در اصل وہ زندگی کے وسیع میدان میں ان افراد سے کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی طور متاثر ہوئے اور اسی داخلی ربط نے اُن سے یہ خاکے لکھوائے۔ شاید محض اتنا کہنا کافی نہیں کہ ان شخصیتوں کو اُنھوں نے اپنے تئیں آدمیت و انسانیت کی مثالی اقدار اور عظمت و بزرگی اور بڑائی کا معیار جانا، یقیناً اُنھوں نے ایسا جانا اور سمجھا اور شاید شعوری یا غیر شعوری طور پر اُن کی پیروی بھی کی ہو لیکن اس سے ہٹ کر اس انتخاب اور چناؤ کے پس پُشت بہت کچھ ان افراد سے خود مولوی عبدالحق کی اپنی ذہنی ہم آہنگی، طبعی رجحان و میلان اور قدرانِ حیات کے اصولوں اور ضابطوں میں یک گونہ اشتراک کو بھی دخل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ "چند ہم عصر" کے نگار خانے میں قدم قدم پر ہمیں

مولوی عبدالحق کی اپنی سیرت کی جھلکیاں اور پرچھائیاں ملتی ہیں ۔ انھوں نے اپنے بعض بزرگوں اور ہم نشینوں کی سیرت و کردار کے جو خاکے اور نقشے تیار کیے ہیں، اُن میں غیر شعوری طور پر انھوں نے اپنی ہی طبیعت کا رنگ کچھ یوں بھر دیا ہے کہ اُن کے آئینہ خانۂ فن کے عرض میں اُن کی شخصیت کا جو ہر تڑپتا نظر آتا ہے اس طرح ہم عصروں کے اس انتخاب کے سہارے ہمیں خود مولوی عبدالحق کی سیرت تک رسائی میں بڑی مدد ملتی ہے اور یہ اس دستاویز کا بہت ہی دلچسپ اور نادر پہلو ہے۔

مولوی عبدالحق کی مُرقع نگاری سے متعلق اپنے ایک مضمون (ادبی دُنیا : شمارہ نہم) میں ضمناً "چند ہم عصر" کے اسی پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے عرض کیا تھا کہ :

> شخصیتوں کی آڑ میں اُن کا 'شوقِ بے اختیار' دیدنی ہوتا ہے اور اُن پر 'عشق پیشہ' میر کے ایسے آفتِ زماں کا گماں ہونے لگتا ہے جو اپنے سارے مطلب پردے میں ادا کرے ہے۔

اپنے اس بیان کے حق میں بخوفِ طوالت میں نے مثالیں پیش کرنے سے معذوری کا اظہار کیا تھا ۔ ذیل کا یہ مضمون اس فرض کی ادائیگی کے لیے وقف ہے ۔ دیکھیے کہ در بیانِ حکایتِ دیگراں مولوی عبدالحق نے اپنی ذات و صفات سے کیسے نقاب اُٹھائے ہیں ۔ یہ مضمون تمام کا تمام مولوی عبدالحق کی اپنی زبان و عبارت میں ہے، جسے میں نے "چند ہم عصر" کے مضامین سے اقتباس کیا ہے ۔ عبارت کے اصل حوالہ جات صفحہ وار ذیلی حاشیے میں دے دیے گئے ہیں ۔ اس سلسلے میں "چند ہم عصر" کا ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۵۹ء کا نسخہ میرے پیشِ نظر رہا ہے ۔

مضمون میں ربط اور تسلسل قائم رکھنے کے لیے مجھے ضمیروں اور صیغوں میں خفیف رد و بدل کرنا پڑا ہے لیکن اسے جہاں تک ممکن ہو سکا قوسین کے ذریعے نمایاں کر دیا گیا ہے تاکہ تشابہ اور التباس کا امکان باقی نہ رہے ۔ اِس کے علاوہ مضمون کی واقعیت کے اتمام کے لیے ایک فنی رعایت کے ساتھ کچھ تعزیتی پیغامات اور تاریخی قطعات بھی شامل کیے گئے ہیں ۔ میں اس ضمن میں ابوالاثر حضرت حفیظ جالندھری، پروفیسر حامد حسن قادری اور حضرت رئیس امروہوی کا ممنون ہوں کہ ان بزرگوں نے اس مضمون کے لیے مجھے اپنے رشحات سے نوازا اور "رعایتِ خاص" کے استقرار میں میری مشکل کشائی فرمائی ۔ بیجا نہ ہوگا اگر میں یہاں اپنے بزرگ حکیم اسرار احمد کریوی کا شکریہ بھی ادا کر دوں، جن کی رہ نمائی مجھے حاصل رہی ۔

معین الرحمن

خطاب یا نام الگ سے رکھ دیئے جاتے ہیں۔ مسمّیٰ کی خصوصیات کا ان میں مطلق لحاظ نہیں ہوتا۔ نام رکھتے وقت تو ممکن ہی نہیں، مگر خطاب کے وقت بھی اس کا خیال نہیں کیا جاتا۔ لیکن (بابائے اردو) عبدالحق مرحوم کا نام اور خطاب (دونوں) اُن کے لیے بہت ہی موزوں نکلے ـــــ زیادہ موزوں شاید یہی ہے اور حق کو حق سے اتنا عشق نہ ہوگا جتنا انہیں (اردو) سے تھا۔ سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے یہی اُن کا وِرد تھا۔ وہ بلا مبالغہ فنا فی (الاردو) کے درجے کو پہنچ گئے تھے (اور) سچائی، بات کی اور معاملے کی، اُن کی سرشت میں تھی خواہ جان ہی پر کیوں نہ بن جائے۔ وہ سچ کہنے سے کبھی نہ چوکتے تھے اس میں انہیں نقصان بھی اٹھانے پڑے۔ مگر وہ سچائی کی خاطر سب کچھ گوارا کر لیتے تھے۔

(مولوی عبدالحق) مرحوم عجیب و غریب شخص ہوئے ہیں۔ وہ مختلف متضاد اور غیر معمولی اوصاف کا مجموعہ تھے۔ اگر انہیں ایک آتش فشاں پہاڑ یا گلیشیر سے تشبیہ دی جائے تو کچھ زیادہ مبالغہ نہ ہوگا۔ ان دونوں میں عظمت و شان ہے لیکن دونوں میں خطرہ اور تباہی بھی مرموز ہے۔

وہ بہت بڑے ادیب، زبردست انشا پرداز اور اعلیٰ درجے کے مقرر تھے۔ . . . . . . وہ آزادی کے دل دادہ اور جبر و استبداد کے پکے دشمن تھے لیکن اگر کبھی ان کے ہاتھ میں اقتدار آتا تو وہ بہت بڑے جابر اور مستبد ہوتے۔ وہ محبت و مروت کے پتلے تھے اور دوستوں پر جان نثار کرنے کے لیے تیار رہتے تھے لیکن بعض اوقات ذرا سی بات پر اس قدر آگ بگولا ہو جاتے تھے کہ دوستی اور محبت طاق پر دھری رہ جاتی تھی۔ دوست بھی اُن کے جاں نثار اور فدائی تھے، لیکن اس طرح بچتے تھے جیسے آتش پرست آگ سے بچتا ہے۔ وہ اپنے رفیقوں اور ہم کاروں کے ساتھ بڑی شفقت اور عنایت سے پیش آتے تھے اور طرح طرح کے سلوک کرتے تھے لیکن جب بگڑتے تو آپے سے باہر ہو جاتے تھے اس وقت انہیں نہ کسی کی عزت و آبرو کا خیال رہتا تھا نہ اپنے کام کا۔ اسی لیے وہ ہم کاروں سے نباہ نہ سکے اور وہ لوگ جنہیں وہ کچھ سمجھتے تھے آخر کار ایک ایک کر کے الگ ہو گئے۔ لیکن غصہ فرو ہو جانے کے بعد پچھتاتے تو بالکل صاف ہو جاتے اور دل پر مطلق میل نہیں رہتا تھا۔ یہ ان میں لاکھ خوبیوں کی ایک خوبی تھی۔

مرحوم (ہاپوڑ) کے ایک نہایت شریف و نجیب خاندان سے تھے۔ شادی آخر عمر تک نہ کی۔ وہ میانہ قد اور اکہرے (جسم کے) آدمی تھے۔ چہرے سے ان کے رعب و داب اور متانت ٹپکتی تھی۔ چہرہ بھاری بھرکم، سر بڑا اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور دیکھنے سے رعب اور اثر پڑتا تھا۔ سفید گول داڑھی رکھتے اور ہمیشہ شیروانی پہنتے۔ اُن کی ٹوپی اکثر ترکی ہوتی تھی۔ کھلا گندمی رنگ، خوبرو آدمی تھے۔ . . . . سفید داڑھی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ . . . . جامہ زیب تھے ہمیشہ ہندوستانی لباس پہنتے تھے۔ . . . . اُن کے قوا بہت اچھے تھے۔ صحت قابلِ

---

(۱) چند ہم عصر، صفحہ ۱۴۱ محسن الملک
(۲) صفحہ ۱۵۵، ۱۵۶ محمد علی جوہر
(۳) صفحہ ۲۰۰ [illegible]
(۴) صفحہ ۲۱۹ مولانا حسرت موہانی
(۵) صفحہ ۲۰۲ سرسید احمد خاں
(۶) صفحہ ۲۰۰ مولوی سید علی بلگرامی
(۷) صفحہ ۲۰۳ مولوی چراغ علی
(۸) صفحہ ۳۰۴ نواب عمادالملک
(۹) صفحہ ۳۱۲ گدڑی کا لال نور خاں
(۱۰) صفحہ ۷۹ مولوی سید علی بلگرامی
(۱۱) صفحہ ۴۵۴ خادمِ ادیب خاتم

نک تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں کبھی بیمار نہیں ہوا اور نہ کبھی میرا سر دُکھا۔ کبھی کبھار زکام البتہ ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہے کہ
ماغ صاف ہو جاتا ہے۔ اُن کا ...... پُر رعب چہرہ، اُن کی شان اور اُن کا وقار ایسا تھا کہ درحقیقت وہ زیارت کے قابل تھے۔
ن کے اکثر ہم عصر اور ہم رُتبہ لوگ اُن کا بہت احترام اور ادب کرتے تھے اس طرح ملتے تھے جیسے چھوٹے بڑوں سے ملتے ہیں بادُ
حقیقت یہ ہے کہ علاوہ شکل و صورت کے لوگوں پر اُن کے علم و فضل اور قابلیت کا بھی رعب پڑتا تھا۔

بچپن سے ذہین و ذکی مشہور تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں بھی وہ اپنے ہمسروں میں ممتاز رہے اور (اعزاز) کے
ساتھ بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ تمام طالب علم (سوائے بعض کھلنڈروں کے) اور پروفیسر اُنھیں وقعت کی نگاہ سے دیکھتے
تھے ...... خود سرسید مرحوم اُنھیں اُن کی قابلیت کی وجہ سے عزیز رکھتے تھے۔ مرحوم کی یہ خوش نصیبی تھی کہ اُنھوں نے بزمانۂ
قیام (علی گڑھ) ایسے ماہرینِ فن اور علمائے نامور سے تلمذ حاصل کیا جو اس وقت آسمانِ فضل و کمال کے آفتاب و ماہتاب تھے مثلاً
پروفیسر (آرنلڈ) پروفیسر (بیک) پروفیسر (مارین اور شبلی وغیرہ) جن میں سے ہر ایک اپنے فن میں یکتا تھا۔ علی گڑھ کالج میں
ان سے پہلے اور غالباً اُن کے بعد بھی کوئی ایسا طالب علم نہیں ہوا جس کا مطالعہ ایسا گہرا، معلومات ایسی وسیع اور جو کام کرنے میں
ایسا ان تھک ہو ...... وہ ہمیشہ علمی معاملات پر گفتگو کرتے ...... وہ درحقیقت علی گڑھ کالج کے سپوت تھے۔

یہ مولوی عبدالحق) کی خوش نصیبی تھی کہ اُن کی والدہ بڑی دانش مند اور نیک سرشت بی بی تھیں اور اُن میں انسانی اخلاق
کی بہت سی خوبیاں تھیں (مولوی عبدالحق) کی زندگی پر اُن کا بڑا اثر تھا۔ جس طرح اُنھیں طالب علمی میں مولانا (شبلی) جیسے بے مثل
ادیب اُستاد ملے اسی طرح اس کے بعد سرسید اور مولانا حالی جیسے عالی خیال پیشوا بھی نصیب ہوئے۔ ان بزرگوں نے اُن کے خیالات
اور ادب پر بہت بڑا اثر ڈالا مگر وہ عمر بھر طالب علم ہی رہے۔ مصلحتِ وقت اور زمانہ شناسی اُن کے نصیب میں نہ تھی اور جو کبھی
بدنصیبی سے اُنھوں نے اس کوچے میں قدم رکھا تو پہلے ہی قدم میں لغزش کھائی۔ اس چیز کے لیے کچھ تو فطری مناسبت ہونی چاہیے
اور کچھ صحبت اور تجربہ، ان میں سے اُن کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ ایامِ طالب علمی و ملازمت میں وہ جہاں کہیں رہے اُنھوں نے اپنے
فرضِ منصبی کو ایسی مُستعدی و جفاکشی اور دیانت کے ساتھ ادا کیا کہ لوگ قائل ہو گئے اور جب قومی خدمت پر کمر باندھی تو ایسے
ہی خوش اسلوبی، بے نفسی اور بے ریائی کے ساتھ انجام دیا اور ثابت کر دیا کہ حُبِّ وطن اور قومی درد کسی خاص طبقے یا
کسی خاص عمر پر موقوف نہیں ہے۔

اُن میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو ایک شریف انسان میں ہونی چاہییں۔ گھر میں اُن کی تربیت والدہ کی زیرِ نگرانی ہوئی اور یہ
ایسی تھی جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ اخلاق اور تہذیب کے جو نکتے اس فرزانہ اور نیک بیوی نے اپنے عمل اور قول سے
اُن کے دل میں بٹھا دیے تھے وہ عمر بھر نہ بھولے اور اُن پر عامل رہے۔ بڑے ہو کر جو صحبت ملی وہ اس زمانے کے بہترین افراد

ح۱ صفحہ ۳۷۲ درویش پروفیسر ری ہیٹ سک
ح۲ صفحہ ۵۹ مولوی محمد عزیز مرزا
ح۳ صفحہ ۱۰۹ خواجہ غلام الثقلین
ح۴ صفحہ ۹۶ مولوی محمد عزیز مرزا

ح۵ صفحہ ۱۰۵ سر راس مسعود
ح۶ صفحہ ۱۰۸ خواجہ غلام الثقلین
ح۷ صفحہ ۳۴۶ سرسید احمد خاں
ح۸ صفحہ ۳۳۱ سرسید احمد خاں

ح۹ صفحہ ۴۸ مولوی چراغ علی
ح۱۰ صفحہ ۱۰۱ مولوی سید علی بلگرامی
ح۱۱ صفحہ ۱۲۰ مولانا وحید الدین سلیم

تھے۔ اُن میں سے ہر ایک جوہر قابل تھا۔ اُن کے نام اب تک ہمارے ادب میں عزت سے لیے جاتے ہیں۔ تحریر ... بڑی چیز ہے۔ علم سے لگاؤ تھا۔ اہل علم اور ارباب سخن کی صحبت نے صحیح ذوق پیدا کیا۔ مطالعہ کا شوق پہلے سے تھا۔ ... محنت رسی کا ملکہ قدرت نے ودیعت کیا تھا اُن سب کے بل پر اُنھوں نے وہ کام کیے جو رہتی دُنیا تک یادگار رہیں گے۔

طالب علمی سے فارغ ہونے کے بعد وہ حیدرآباد آ گئے۔ اگرچہ ابتدا میں وہ معمولی خدمت پر مقرر ہوئے لیکن ... اور قابلیت کی وجہ سے اُنھوں نے یہاں غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔ اس میں شک نہیں کہ جامعہ عثمانیہ کو مولانا ... پروفیسر نہیں مل سکتا تھا۔ شاید قدرت کو یہ منظور تھا کہ جس یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اُردو ہے وہاں اُردو کا پروفیسر بھی ایسا ہی ہونا چاہیے جو اس کی شان اور ضرورت کے مناسب ہو۔ اُنھوں نے اس جامعہ کے طلبہ میں جو علمی اور ادبی ذوق پیدا کیا وہ اُنھیں کا کام تھا۔ اور یہ بہت بڑا احسان ہے۔ تعلیم کا اصل منشا ذوق پیدا کرنا ہے اور پھر وہ اپنا رستہ خود نکال لیتا ہے۔

حیدرآباد کی زندگی عجیب و غریب زندگی ہے۔ ممکن ہی نہیں کہ یہاں کے اطراف و حوالی کا اثر انسان پر نہ پڑے اور کچھ نہیں تو اہل تو مزاج ہو جاتا ہے لیکن مولوی ... کی جفاکشی اور مستعدی میں آخر دم تک فرق نہ آیا۔ وہ کبھی راست بازی اور دیانت کے راستے سے نہ ہٹے۔ اُن کی زندگی جیسی سادہ اور بے ریا تھی ویسے ہی آخر دم تک رہی۔ غالباً مولوی (عبدالحق) سے بڑھ کر کسی شخص نے سرکاری کام کسی بے تعلق اور بے غرض طور پر انجام نہ دیا ہوگا۔ وہ رعایت اور جانبداری جانتے ہی نہ تھے۔ معاملات میں وہ بالکل بھول جاتے تھے کہ اُن کا تعلق کسی انسان سے ہے۔ صرف واقعات اُن کے پیش نظر رہتے تھے اور انھیں پر سے وہ بلا رو رعایت فیصلہ کرتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ اہل حیدرآباد جو ان باتوں کے عادی نہیں اُن سے کبھی خوش نہیں رہے۔ لیکن ... میں حیدرآباد کی زندگی نے ایک خفیف سا نقص خوشامد پسندی کا پیدا کر دیا تھا مگر بے عیب ذات خدا کی ہے کون ہے جس میں کوئی عیب نہیں اور خاص کر یہ نقص تو نہ ہو۔ اُن کی زندگی نہایت سادہ اور بے ریا تھی۔ باوجود جاہ و منصب اور قیام حیدرآباد کے کبھی عہدے سے بھی راحت و عیش کی طرف مائل نہ ہوئے اور ہمیشہ طالب علمانہ زندگی بسر کرتے تھے۔

جب اہل علم میں سے کوئی شخص حیدرآباد میں وارد ہوتا خواہ وہ کہیں کا ہو تو اُن کی یہ بڑی خواہش ہوتی تھی کہ اُن کا مہمان ہو۔ چنانچہ (مختلف موقعوں پر مشہور قوم پرست ترک خاتون خالدہ ادیب خانم اور رؤف بیگ، سابق امیر البحر ترکی) جب حیدرآباد تشریف لائے تو مولوی (عبدالحق) مرحوم ہی کے مہمان ہوئے۔

کوئی پچاس ... سال ہوتے ہیں جب . . . . آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے چند صیغے الگ الگ قائم ہوئے (ترقی اُردو) کا صیغہ اُن کے سپرد ہوا۔ اُنھوں نے اپنے اس فرض کو جس مستعدی اور قابلیت سے انجام دیا وہ مخفی نہیں ہے۔ کانفرنس کے کئی صیغے تھے اور ان کے بعض سیکرٹری بھی اُن سے زیادہ نامور نامور لوگ تھے لیکن جیسا (ترقی اُردو) کا صیغہ

---

۱ صفحہ ۵۹ مولوی محمد عزیز مرزا
۲ صفحہ ۶۰، ۱۵۰ مولوی چراغ علی
۳ صفحہ ۹۰ مولوی سید علی بلگرامی
۴ صفحہ ۱۰۲ مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی
۵ صفحہ ۵۹-۶۰ مولوی محمد عزیز مرزا
۶ صفحہ ... مقدمہ ...
۷ صفحہ ۹۴ مولوی محمد عزیز مرزا
۸ صفحہ ۹۳ مولوی محمد عزیز مرزا

چمکا وہ بات کسی مدت کو نصیب نہیں ہوئی۔

(شیخ سر عبدالقادر[1]) کے انتقال کے بعد انجمن ترقی اردو کے صدر (عبدالحق) ہی منتخب ہوئے۔ انجمن سے انھیں بڑا شغف اور اس پر اُن کا بڑا احسان ہے۔ اس کے لیے اُنھوں نے جگہ جگہ سے چندے وصول کیے (اور) بلا مبالغہ سخنے، قدمے، درمے مدد دینے میں کبھی دریغ نہیں کیا بلکہ سب سے آگے رہتے تھے۔ انجمن پر جب کوئی کٹھن وقت آیا تو وہ اس کے لیے سینہ سپر ہو گئے وہ تو اپنی ذات[2] سے ایک انجمن تھے!

مرحوم[3] نے حیدر آباد سے ایک ادبی رسالہ "اُردو" نامی (۱۹۲۱ء) میں جاری کیا تھا جس کے چیف ایڈیٹر مرحوم ہی تھے سالہا سال[4] تک (یہ رسالہ) اُن کی ادارت میں نکلتا رہا۔ اس رسالے نے ادبی ذوق کے پھیلاؤ میں بڑا کام کیا۔ اس میں اچھے تنقیدی اور ادبی مضمون نکلتے رہے۔ رسالہ اُردو[5] سے اُنھیں خاص لگاؤ تھا۔ (خود) اُن کے بعض بہترین مضامین "اُردو" میں (ہی) شائع ہوئے (یہ رسالہ[6] جاری کر کے (اُنھوں نے) اپنے اندازِ تحریر، بے لاگ تنقید اور روشن خیالی سے (مضمون) نویسی کا پایہ بڑ(ھایا) (اس) کے ذریعہ اُردو ادب میں انقلاب پیدا کیا (اور) ٹائپ کو رواج دیا۔ لیکن افسوس[7] ہے کہ (یہ رسالہ اُن کے انتقال) کے بعد بند ہو گیا۔ ایسے رسالوں اور اخباروں کی اب بھی ضرورت ہے۔

(مرحوم[8]) بحیثیت ایک عام انسان کے ایک عجیب و غریب شخص تھے اور یہی وجہ ہے کہ اُن کی نسبت رائے قائم کرنے میں لوگوں کو مغالطہ ہوتا ہے۔ عموماً ہر شخص دوسرے سے اپنی طبیعت اور مزاج کے مطابق توقع رکھتا ہے اور چونکہ وہ تقریباً ہر شخص سے جُدا اور نرالی طبیعت رکھتے تھے اس لیے بہت کم لوگ ایسے تھے جو اُن کی صحیح طور سے قدر کر سکتے تھے۔ مثلاً مولوی صاحب مرحوم ایک تو طبعاً خاموش طبع تھے اور دوسرے اُنھیں اپنے وقت کی قدر بہت تھی۔ (وہ[9]) ایک کم سخن...... فلاسفر مزاج کوہ وقار اور عالی خیال شخص تھے (اور وقت[10]) ایسی بیش بہا شے کو فضول باتوں میں ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ہر وقت[11] مطالعہ یا غور و فکر یا لکھنے میں مصروف رہتے تھے اور ایسے وقت میں کسی کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ[12] اسی وجہ سے وہ عام طور پر لوگوں سے ملنے سے بہت گھبراتے تھے اور جو لوگ ملنے آتے تھے اُن سے صرف کام کی بات کے سوا دوسری بات نہیں کرتے تھے اور چاہتے تھے بہت جلد ملاقات ختم ہو جائے۔ یہی[13] نہیں کہ بات چیت کم کرتے ہوں بلکہ فضول اور زائد باتوں سے اُنھیں طبعی نفرت تھی اور جو کوئی خواہ مخواہ[14] دیر لگاتا تھا اور نہیں ٹلتا تھا تو وہ بہت جز بز ہوتے تھے...... اور سوائے بعض ہم مذاق احباب کے کسی سے زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے لیکن چھوٹے بچوں سے بے تکلف باتیں کرتے تھے اور ان سے مزے مزے کے سوالات کرتے اور ان کے سوالوں کے جواب نہایت شرح و بسط اور خوبی کے ساتھ دیتے...... لیکن جب لڑکا سیانا ہو جاتا اور اس میں ادب و تمیز پیدا ہو جاتی تو پھر اُس سے باتیں کرنا چھوڑ دیتے تھے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ چھوٹے بچوں میں جو بھولا پن

---

[1] صفحہ ۲۰۲ سر سید راس مسعود — [2] صفحہ ۳۶۶ ڈاکٹر عبدالرحمٰن صدیقی — [3] صفحہ ۱۷۱ حکیم امتیاز الدین
[4] صفحہ ۷۷ مولوی سید علی بلگرامی — [5] صفحہ ۳۶۲ مولانا حسرت موہانی — [6] صفحہ ۱۲۱ مرزا وحید الدین سلیم
[7] صفحہ ۲۸۶ سر سید احمد خاں — [8] صفحہ ۷۷ مولوی سید علی بلگرامی — [9] صفحہ ۴۰ مولوی چراغ علی
[10] صفحہ ۴۲ مولوی چراغ علی — [11] صفحہ ۴۰ مولوی چراغ علی — [12] صفحہ ۴۳ مولوی چراغ علی
[13] صفحہ ۴۱-۴۰ مولوی چراغ علی — [14] صفحہ ۴۴ مولوی چراغ علی — [15] صفحہ ۴۱ " "

خیال کے ظاہر کرنے میں بے تکلفی اور سادگی، گفتگو میں بے ساختہ پن اور سب سے بڑھ کر جو مساوات ہوتی ہے وہ بڑے سے بڑے کو نصیب نہیں۔
بڑے سے بڑا کر خیال کے ظاہر کرنے میں کچھ تصنع اور کچھ ادب اور لحاظ مانع ہوتا ہے۔ پھر وہ مساوات کا خیال بھی نہیں رہتا۔ طرح طرح
کی رنگ کے خیالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ باتیں کرتے ہوئے چھوٹے بچے پیارے ہوتے ہیں اور اگر کوئی بتانے والا
ہو تو اس وقت انہیں بہت کچھ سکھا سکتا ہے۔

اگرچہ بہت کم باتیں کرتے تھے مگر معاملات میں خوب گفتگو کرتے تھے لیکن اس میں بھی کوئی لفظ زائد اور فضول نہیں کہتے تھے
اور ان کا جملہ اکثر دو تین یا ایک دو لفظ سے زیادہ کا نہیں ہوتا تھا۔ صرف کام کے دو ایک لفظ کہہ دیتے تھے جس میں مافی الضمیر
ادا ہو جائے۔ جب کسی کتاب میں کچھ بنا دیتے تو گویا ساری تحریر میں جان ڈال دیتے تھے۔ اگرچہ وہ خاموش طبع تھے اور ان میں
علاوہ متانت پائی جاتی تھی لیکن اپنے بے تکلف دوستوں کی صحبت میں خوب باتیں کرتے تھے جس سے ان کی زندہ دلی کا
ثبوت ملتا تھا۔

زندہ دلی ان کی فطرت میں تھی۔ اگرچہ عمر کے ساتھ ساتھ کام کی کثرت روز بروز بڑھتی جاتی تھی اور نئے نئے حالات اور
واقعات ان پر ہجوم کر کے ٹوٹ پڑتے تھے لیکن ان کی زندہ دلی میں فرق نہ آیا۔ وہ اپنے بعض بے تکلف دوستوں سے بڑی
دل لگی اور شوخی کی باتیں کرتے تھے بلکہ پھبتیوں سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ یہ زندہ دلی ان کے کٹھن کام میں سہارے کا کام دیتی۔ ان
کے چہرے پر (بالعموم) مسکراہٹ رہتی تھی جسے دیکھ کر خوشی ہوتی تھی۔ وہ بچوں میں بچے، جوانوں میں جوان اور بوڑھوں میں
بوڑھے تھے۔ غم اور فکر کو پاس نہ آنے دیتے تھے اور ہمیشہ خوش رہتے تھے اور دوسروں کو بھی خوش رکھتے تھے۔ ان سے ملنے اور
باتیں کرنے میں غم غلط ہوتا تھا اور آخر دم تک ان کی زندہ دلی ویسی ہی رہی۔ ان کے دوستوں کو ان کی زندہ دلی، خوش طبعی، ان
کے لطیفے اور ان کے سفر کے عجیب و غریب واقعات ...... ہمیشہ یاد آئیں گے۔ ان کی ظرافت، خوش طبعی اور شوخی کے چٹکلے
اور لطیفے ایک دو نہیں سینکڑوں ہیں جو افسوس کسی نے جمع نہیں کیے اگر ان کے خطوط جو تعداد میں بے شمار تھے یکجا مرتب ہو جاتے
تو ان میں علاوہ اور بہت سے نکتوں کے ان کی ظرافت کے پُر لطف لطیفے بھی ملتے۔ ان کے خطوط کا جو مجموعہ شایع ہوا ہے وہ
اصل خطوں کا عشر عشیر بھی نہیں۔ ظرافت دلیل ذہانت ہے اور زندہ دلی سلامت طبع اور رجائیت کی نشانی ہے۔ یہ کام
کے بار گراں کو ہلکا کرنے میں سب سے بڑی معین اور ایک کثیر الاشغال شخص کے لیے بعض کٹھن منزلوں کے طے کرنے میں سب سے اچھا بدرقہ ہے۔
جن صاحبوں کو اس بے نظیر شخص سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ ہر فن میں خواہ ادب ہو یا فلسفہ یا تاریخ وہ ایسے
ایسی باریکیاں پیدا کرتے تھے کہ خود اس فن کے ماہرین بھی دنگ رہ جاتے تھے۔ قدرت نے (مولوی عبدالحق) مرحوم کو بہت
سی خوبیاں عطا کی تھیں۔ وجاہت، ذہانت، خوش بیانی اور فیاضی ان کی ایسی عام اور ممتاز صفات تھیں کہ ایک راہ چلتا بھی

ص۱ صفحہ ۱۰ مولوی چراغ علی
ص۲ صفحہ ۱۳۹ گزری ہوئی کا اولی تذکرہ
ص۳ صفحہ ۳۰۳ شیخ محمد
ص۴ صفحہ ۵۸ . . ۲۵۰ ڈاکٹر محمد اقبال
ص۵ صفحہ ۲۹۰ ۱۰ عبدالرحمن صدیقی
ص۶ صفحہ ۱۴۱ محسن الملک
ص۷ صفحہ ۲۳۷ سرسید احمد خاں
ص۸ صفحہ ۲۴۹ سرسید احمد خاں

منٹ کی بات چیت میں معلوم کر لیتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ان میں پارس پتھر کی خاصیت تھی۔ کوئی ہو، کہیں کا ہو، اُن سے چھوا نہیں اور کندن ہو نہیں! اُن کی[1] باتیں نہایت پُر لطف اور مزے کی ہوتی تھیں۔ ان میں ایک جادو ہوتا تھا جو سامعین کے دل پر بے اختیار اثر کرتا تھا اور لوگ گرویدہ ہو جاتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ عام و خاص ہر فرقے میں مقبول تھے۔ وُہ[2] بڑے پُر اثر اور پُر جوش مقرر تھے اور بلا تکلف تقریر کرتے تھے لیکن تقریر سے زیادہ اُن کی تحریر پُر زور اور شاندار ہوتی تھی۔ چنانچہ اُن کے بعض مضامین اُردو انشاپردازی کے بہت عمدہ نمونے ہیں۔ اُن کے قلم[3] اور آواز میں بڑا زور تھا۔ اُن کے چہرے سے اُن کی طباعی اور ذہانت معلوم ہوتی تھی۔ باتیں[4] مزے لے کر اور ٹھیر ٹھیر کر کرتے تھے۔ جلدی اُن کے مزاج میں نہ تھی۔ آواز میں شیرینی اور دل کشی تھی۔ اکثر لوگ جو اُن سے ملنے یا کسی مسئلے میں گفتگو کرنے آتے تو اُن کی ذہانت اور لیاقت کے قائل ہو جاتے۔

حافظہ[5] اُن کا بڑے غضب کا تھا۔ جو چیز ایک دفعہ پڑھ لی یا نظر سے گزر گئی وُہ پتھر کی لکیر تھی۔ (وُہ) صُبح[6] کے نو بجے سے شام کے ۵ بجے تک لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے تھے۔ اُن کا[7] علم اس قدر وسیع تھا کہ گویا زندہ انسائیکلوپیڈیا تھے۔ اور اس لیے اُن کی باتیں نہایت دلچسپ اور بصیرت افروز ہوتی تھیں۔ کسی قسم کا مسئلہ اور کسی فن کی بحث اُن کے سامنے پیش کیجیے وہ کوئی نہ کوئی بات ـــ مزہ دار سُنا دیتے۔

وہ بڑے ظریف بھی تھے۔ اُن کی ظرافت عجیب شان کی ظرافت تھی۔ ان کے ایک ایک ٹھٹول میں وُہ وُہ مضمون و نکات ہوتے تھے جو عُمر بھر کے مُطالعہ اور کتابوں کے کھنگالنے سے بھی حاصل نہیں ہو سکتے۔ وہ ایک چٹکلے میں بڑے بڑے مسائل کا فیصلہ کر دیتے تھے۔ اُن کے خاص لفظ اور جُملے جن میں جدت اور طباعی کی بُو پائی جاتی تھی اب تک دلوں میں چبھتے ہیں اُن کا لب و لہجہ (اور) اُن کی شیریں بیانی بعض اوقات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انسان کو پھڑکا دیتی تھی۔ اُن کی گفتگو میں جو سحر تھا وُہ میں نے آج تک کسی میں نہیں دیکھا۔ علاوہ اس کے اُن سے باتیں کرنے میں جو سبق حاصل ہوتا تھا وُہ یہ تھا کہ واقعات کے ہر پہلو پر نظر ڈالنی چاہیے۔ ورنہ صحیح نتیجے کا اخذ کرنا محال ہے۔ رسوم کی پابندی، عادت کی بندش ہمیشہ بلا ارادہ بھیڑ چال پر مجبور کرتی ہے اور تقلید اس قدر اندھا کر دیتی ہے کہ معمولی سے معمولی بات جو خلافِ عادت ہے نظر نہیں آتی۔ وہ ہر بات میں ایک نیا پہلو دکھاتے جو ہمیں نظر نہیں آتا تھا اور معمولی سے معمولی بات میں وُہ شان پیدا کر دیتے تھے جو دُوسروں کو نہیں سوجھتی تھی اور یہی عین مقصد ہے تعلیم و تربیت کا کہ انسان واقعات کے پہلو پر صحت کے ساتھ نظر ڈال سکے اور جو یہ نہیں تو کوئی تعلیم انسان کے مُفید نہیں ہو سکتی لیکن افسوس کہ اب ہم اُن کی صحبت سے مُستفید نہیں ہو سکتے۔ وُہ ہمیشہ کے لیے ہم سے جُدا ہو گئے گو وہ ہم میں سے تھے مگر اُن کی باتیں ہم سے نرالی تھیں ؎

یا وہ جوہر ہی الگ تھا جو ہر انسان سے ۔۔۔ یا نکلتے اب نہیں ایسے جواہر کان سے ۱

---

(۱) صفحہ ۴ سید محمود
(۲) صفحہ ۸۸ مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی
(۳) صفحہ ۷۰ مولانا سید علی بلگرامی
(۴) صفحہ ۳۶۶ آ ا : عبد الرحمن صدیقی
(۵) صفحہ ۲۲۱ میرن صاحب
(۶) صفحہ ۳۷۳ ڈروئیش پروفیسر ری بٹ سک
(۷) صفحہ ۹۱ مولوی محمد عزیز مرزا
(۸) صفحہ ۱۴۶ محسن الملک
(۹) صفحہ ۵/۲ سید محمود

وہ بڑے ذکی الحس (اور) کس قدر نازک طبع واقع ہوئے تھے۔ وہ بڑے خوددار (بھی) تھے اور کسی ایسی بات کو جو ... کے خلاف ہوتی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ جس کام کو لیتے تھے اس میں ہمہ تن منہمک ہو جاتے تھے اور چاہتے تھے کہ جو ... آگ اُن میں ہے وہی دُوسروں میں بھی ہو لیکن یہ کہاں ہوتا ہے خصوصاً ایسے زمانے میں جہاں ہمیں پتھروں سے سر پھوڑنا ہے۔ ... ناکامی ہوتی ہے اور یہ مایوسی اُنھیں پریشان کر دیتی تھی۔ چنانچہ انھیں ناکامیوں اور ناکامیابیوں نے اُنھیں ایک بار (صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں سے رجوع ..... ہونے پر) مجبور کیا۔

وہ مخالفت سے گھبراتے تھے، عیب و فریب مادہ تھا۔ کیسا ہی اختلاف ہو وہ صبر کے ساتھ سہتے رہتے تھے جواب دیتے تھے لیکن حجت نہیں کرتے تھے۔ بعض اوقات اعتراضات اور کٹ حجتی پر (ضرور) غصہ آتا تھا خاص کر جب کسی دوست کی طرف سے مخالفت ہوتی تو انھیں بڑا صدمہ ہوتا تھا۔ وہ دوست کا اختلاف گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ اس میں وہ بہت مبالغہ کرتے تھے اور اکثر عقل پر جذبات غالب آجاتے تھے۔ کارزارِ دُنیا میں بڑے بڑے کام نہیں چاہیاں ہو کے بھی سہنے پڑتے ہیں، زخم بھی کھانے پڑتے ہیں، سر بھی دینا پڑتا ہے جو اس کے لیے تیار نہیں اس کے لیے بہتر ہو گا کہ بند رہے بلکہ سرے سے اس میدان میں قدم ہی نہیں رکھنا چاہیے (لیکن) رائے کے اختلاف سے ذاتی تعلق اور ملاقات میں کبھی کوئی فرق نہ آتا۔ ان معاملات میں وہ خوب بحث کرتے اور بعض اوقات شدت کے ساتھ لیکن اُن کا دل صاف رہتا تھا۔ وہ عمر بھر مخالفتیں برداشت کرتے رہے اور (آخر آخر) یہ اُن کے لیے معمولی بات ہو گئی تھی۔

وہ نہایت تیز فہم، صائب الرائے، جفاکش، مستقل مزاج اور اپنے ارادے کے پکے تھے۔ کام سے سچا لگاؤ تھا اور اسی میں اُن کی جیت تھی۔ بڑے غور و خوض کے بعد رائے قائم کرتے اور رائے قائم کرنے کے بعد پھر اس سے کبھی نہ ٹلتے تھے گویا وہ رائے پتھر کی لکیر ہوتی تھی۔ آدمی مفکر بھی ہو اور عمل بھی ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے .... (وہ) جو کہتے اور سمجھتے تھے اس پر عامل بھی تھے۔ وہ ہمیشہ علمی مباحثوں میں بڑی دلچسپی کا اظہار کرتے تھے ..... اُن کی رایوں میں خاص بات ہوتی تھی اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ ایک ایسے شخص کے دماغ کا نتیجہ ہیں جو غور و فکر کا عادی ہے۔ (لیکن) مرحوم میں ایک بڑا نقص تھا کہ بعض اوقات خود غرض لوگوں کے بہکانے سے بہک جاتے تھے (اور) ایسی باتیں کر گزرتے تھے جو ان کی شان کے شایاں نہ ہوتی تھیں۔

وہ کام ہو رہا ہے — آرام طلبی ہم میں کچھ موروثی ہو گئی ہے (لیکن وہ) مستعد ایسے تھے کہ انسان فطرتاً کاہل اور کام چور ہوتا ہے — اچھے اچھے جوان اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ دن ہو یا رات ہو، ہر وقت کام کے لیے تیار۔ ہر ڈھنگ کے کام کرنے والے تھے۔ تصنیف و تالیف کا کام بھی کرتے تھے (نئی رباعی) اور (اردو) کے لیے مضامین بھی لکھتے تھے۔ معترضین کے جواب بھی دیتے تھے۔ (اُردو) کالج کے حساب

ملا صفحہ ۱۰۹ سرسید راس مسعود
ملا ۔ ۱۱۱ نوائے قوم و اشتغال
ملا ۔ ۲۴۰ سرسید احمد خاں
ملا ۔ ۲۲۰
ملا ۔ ۲۳۰ کام ورت ۔ دہلی
ملا ۔ ۲۲ خواجہ قوم فاطمی
ملا ۔ ۱۳۲-۳۵ گذری کا لال نور خاں

ملا صفحہ ۱۰۰ سرسید راس مسعود
ملا ۔ ۱۶۲ حالی
ملا ۔ ۱۰۰ سرسید راس مسعود
ملا ۔ ۲۹ مولوی چراغ علی
ملا ۔ ۲۸
ملا ۔ ۱۰۲ مولوی سید علی بلگرامی
ملا ۔ ۲۲۵-۲۶ سرسید احمد خاں

ملا صفحہ ۲۴۳ سرسید احمد خاں
ملا ۔ ۱۹۸ سرسید راس مسعود
ملا ۔ ۲۴ مولانا حسرت موہانی
ملا ۔ ۱۵ مولوی چراغ علی
ملا ۔ ۱۸۰ حالی
ملا ۔ ۲۲۸ نام دیو ۔ مالی

کتاب اور دُوسرے اہم کاموں کی نگرانی بھی کرتے تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خطوں کے جواب لکھتے یا لکھواتے، مُلاقاتیوں سے ملتے۔ ۔ ۔ ۔ کس کس کام کا ذکر کیا جائے کاموں کا ایک ہجوم تھا جسے وہ استقلال اور اطمینان سے صُبح سے لے کر شام تک برابر کرتے رہتے تھے۔ بڑھاپے کے زمانہ میں بھی اُن کے انہاک اور محنت کا یہی حال تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ کام اور محنت کرنے ہی سے انسان بنتا ہے اور اسی سے اس کی سیرت بنتی ہے اور اسی سے اس کے دماغی اور اخلاقی قوا کی جلا ہوتی ہے۔ اس سے مُراد وہ کام ہے جس کے کرنے میں انسان کو لذت ملے اور شوق اسے اور اُبھارے، ورنہ کام، کام نہیں رہتا بیگار ہو جاتی ہے۔ (عبدالحق) کا یہی حال تھا وُہ بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا کام ایسے شوق اور تندہی سے کرتے تھے گویا اُن کی دُنیا اور عاقبت کا انحصار اسی پر ہے۔

اُن کے بڑھاپے پر جوانوں کو رشک آتا تھا اور ان کی مستعدی کو دیکھ کر دل میں اُمنگ پیدا ہوتی تھی۔ ان کی زندگی بے لوث تھی اور اُن کی زندگی کا ہر لمحہ کسی نہ کسی کام میں صرف ہوتا تھا۔ مجھے وہ اکثر یاد آتے ہیں اور یہی حال ان کے دُوسرے جاننے والوں اور دوستوں کا ہے اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ کیسے اچھے آدمی تھے۔ قومیں ایسے ہی لوگوں سے بنتی ہیں۔ کاش ہم میں بہت سے (عبدالحق) ہوتے!!

وُہ بہت سادہ مزاج، بھولے بھالے اور مُنکسر المزاج تھے مگر بکارِ (اُردو) ہوشیار اور بکارِ دُنیا بے کار تھے۔ اُن کی کاردانی اور کارگزاری ریاست حیدر آباد میں ضرب المثل (تھی) وُہ کام کرنے میں بجلی اور محنت کرنے میں آندھی تھے۔ معاملات کی تہ کو اس قدر جلد پہنچتے تھے کہ جن لوگوں نے اِنھیں معاملات کو ہفتوں اور مہینوں مُطالعہ کیا تھا وُہ بھی دیکھتے رہ جاتے تھے۔ سرکاری خدمت کی کٹھن اور دُشوار منزلوں کو اُنھوں نے ہمیشہ اس آسانی سے طے کیا کہ کبھی ان کی طبیعت پر گراں نہ گزرا جو کام دُوسرے لوگ آٹھ آٹھ دس دس گھنٹوں میں طے نہیں کر سکتے تھے۔ وُہ مرحوم نے دو تین گھنٹوں میں بھگتا دیا اور پھر اس دقیق النظری کے ساتھ کہ کیا مجال کہ کوئی بات رہ جاتے اپنے فرائض نہایت دیانت داری اور دلچسپی کے ساتھ ادا کیے۔ اور نہ کبھی کام کرنے سے اُکتائے اور نہ آج کا کام کل پر چھوڑا ـــــ تعلیم یافتہ شخص کے یہی معنی ہیں کہ وہ جس کام پر ہاتھ ڈالے اُسے حُسن وخوبی کے ساتھ ادا کرے۔ خُدا نے اُنھیں ایسا جوہر عطا کیا تھا جس کے سامنے بڑی بڑی تصانیف کی کچھ حقیقت نہیں۔ وُہ جوہر ان کی غیر معمولی دماغی قوت تھی جو نہ امتحانات کے پاس کرنے سے حاصل ہوتی ہے نہ کتابوں کے پڑھنے اور فضیلت کی دستار باندھنے سے۔ مرحُوم کی ذہانت، قابلیت اور وُسعتِ معلومات پر ایک عالم گواہ ہے۔

اگرچہ بظاہر اکھڑ تھے مگر دل میں خلوص تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور دوستوں کے قدر دان تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تصنّع سے دُور نہایت بے تکلف اور آشنا پرست تھے۔ وُہ کم آمیز اور دیر آشنا تھے مگر نہایت باوضع، دوستی کے پکے اور صادق القول شخص تھے۔

---

۱ صفحہ ۲۳، گذری کا لال نور خان
۲ صفحہ ۹۰ مولوی محمد عزیز مرزا
۳ صفحہ ۹۱ مولوی محمد عزیز مرزا
۴ صفحہ ۲۱۱ میرن صاحب
۵ صفحہ ۲۳۰ نام دیو ـــ مالی
۶ صفحہ ۹۱ مولوی محمد عزیز مرزا
۷ صفحہ ۵۸/۱۵۷ الشیخ غلام قادر گرامی
۸ صفحہ ۱۵۸ الشیخ غلام قادر گرامی
۹ صفحہ ۲ سید محمود
۱۰ صفحہ ۳۳۸ سر سید احمد خان

اور) جس سے جو تعلق ہو گیا اسے آخر دم تک نبھایا...... وہ اُن کے سچے ہمدرد اور اُن کی بہبودی اور سلامتی کے خواہاں رہتے ...... وہ دوستی کے مقابلے میں رشتے ناتے کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کا قول تھا کہ "اگر ساری دُنیا قبضے میں ہو اور ایک دوست نہ ہو تو وہ ہیچ ہے اگر ساری دُنیا کے بدلے میں ایک دوست ہاتھ لگ جائے تو ارزاں ہے"۔ لیکن اُن کی دوستی آسان نہ تھی۔ وہ کہا کرتے تھے دوستوں میں جانے اور بہت سے دوست پیدا کرنے میں وقت ضائع ہوتا ہے اور بہت سی فضول اور بے مصرف باتیں کرنا پڑتی ہیں بجز دو تین خاندانوں کے اور کسی سے راہ و رسم نہ تھی مگر جن کے ساتھ محبت تھی خلوص دل سے تھی۔

وہ مصیبت کے وقت کام آتے اور ایسی حالت میں بے طلب مدد کے لیے پہنچتے اور جہاں تک امکان ہوتا وہ ہر قسم کی مدد کرتے۔ اُن کی دوستی پرانے لوگوں کی سی دوستی تھی جو دوست کے لیے ہر قسم کی تکلیف برداشت کرتے اور ہر قسم کی قربانی کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ وہ جس طرح دوستی میں پکے تھے اسی طرح نفرت میں بھی شدید تھے۔ یہ نفرت کسی ذاتی بنا پر نہ تھی بلکہ جو لوگ بے اصول ہوتے، ذاتی فائدے کے لیے ایمان بیچنے کے لیے تیار ہو جاتے یا قوم سے غداری کرتے اُن سے نفرت ہی نہیں انھیں سخت عداوت ہو جاتی تھی وہ ایسے لوگوں کو بھی پسند نہیں کرتے تھے جو بدتمیز یا گندے ہوتے چونکہ وہ خود صاف گو تھے اس لیے غیبت کو پسند نہیں کرتے تھے خصوصاً اپنے کسی دوست کے خلاف ایک لفظ بھی گوارا نہ کرتے تھے (وہ خود بھی) دوست کا اختلاف گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ یہ دوستی پرانے دنوں کی دوستی تھی۔ پُرانے بزرگ اسی پر عامل تھے کچھ بھی کہے یا کچھ بھی کرے وہ ابدا کے دوست کا ساتھ دیتے۔

قدامت اور جدت عجب طرح سے اُن کے مزاج میں ممزوج ہو گئی تھیں۔ قدامت ایسی کہ اچھے اچھے پُرانے بزرگ اُن کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے تھے اور جدت ایسی کہ نئی روشنی کے ستارے بھی اُن کے آگے ماند تھے۔ وہ کسی ملازم کو شکایتیں سُننے کے بعد برطرف نہ کرتے یہ بات اُن میں پُرانی تہذیب کی تھی۔ میں نے ایسے کئی بزرگوں کو دیکھا ہے کہ جب اُنھوں نے کسی پر اعتماد کر لیا تو پھر کوئی کچھ کہا کرے اور کیسی ہی شکایت کرے اُن پر کچھ اثر نہ ہوتا تھا بلکہ اُلٹا خفا ہوتے تھے اسی قسم کی مروت (مولوی عبدالحق) میں بھی تھی۔ کسی نے سچ کہا ہے "خانۂ مروت تباہ" چنانچہ اُن کے (ایک پروردہ نوجوان) کے معاملہ میں یہی ہوا۔ یہ شخص (لکھنؤ) کے (ایک) ممتاز خاندان کا تھا...... بارہا اُن تک شکایت پہنچی کہ یہ آدمی قابل اعتماد نہیں ہے (کسی ذریعۂ معاش کے باوجود) بڑی شان سے رہتا ہے۔ اُس کی دیانت مشتبہ ہے۔ میں نے بھی اس شخص کو دیکھا تھا۔ وہ فی الحقیقت رئیسوں کی طرح رہتا تھا۔ ان شکایتوں کے جواب میں وہ کہتے کہ شریف زادہ ہے گھر سے خوشحال ہے۔ وہ صاف ستھرا اور سلیقے سے رہتا ہے تو لوگ اُس سے جلتے ہیں۔

اُن میں قدیم وضع اور جدید تہذیب کی بعض خوبیاں اس خوش اسلوبی سے باہم مل ہوئی تھیں کہ اس امتزاج نے اُن

۱؎ صفحہ ۳۰۔ ۲۲۲ سرسید احمد خاں
۲؎ صفحہ ۲۰۲ سرسید احمد خاں
۳؎ صفحہ ۲۰۰ درویش پروفیسری کی بٹ سک
۴؎ صفحہ ۱۱۶ حکیم امتیاز احمد
۵؎ صفحہ ۲۴۳ نواب عماد الملک
۶؎ صفحہ ۹۰/۳۶۶ آہ! عبدالرحمن صدیقی
۷؎ صفحہ ۲۶۱ سرسید احمد خاں

ں روش زندگی میں ایک قسم کا حسن پیدا کر دیا تھا۔ وہ[1] کبھی کبھی مغربی مزاج کے آدمی معلوم ہوتے تھے لیکن اکثر وہ ٹھیٹ ہندی تھے۔ اُن[2] کی طرزِ معاشرت پرانے اور نئے دونوں طبقے کے لوگوں کے لیے قابلِ تقلید نمونہ تھی۔

وہ اگرچہ کبھی کبھی رنجیدہ ہو جاتے تھے لیکن یہ[3] عارضی صورت ہوتی تھی کچھ دنوں کے بعد یہ کدورت دل سے محو ہو جاتی اور ویسے ہی خلوص اور محبت سے ملتے جیسے پہلے ملا کرتے تھے۔ کبھی[4] دل میں کینہ یا بغض نہیں رکھتے تھے۔ اُن کا فیض عام تھا دوست و دشمن بلا امتیاز اس سے متمتع ہوتے تھے۔ انتقام کا کبھی خیال نہ کیا بلکہ جن لوگوں نے اُن سے بُرائی کی اُنھوں نے اس کا بدلہ ہمیشہ بھلائی سے دیا اور بیسیوں مثالیں ہمارے سامنے ایسی موجود ہیں کہ دوستوں سے بڑھ کر اُنھوں نے دشمنوں کو نوازا۔

حقیقت[5] یہ ہے کہ (مجموعی طور پر) اُن کو دوست بھی ایسے ملے تھے کہ اُن پر جان چھڑکتے تھے اور یہ اُن کی بڑی خوش نصیبی تھی۔ یہ سب (مولوی عبدالحق) کے خلوص، سچائی، راست بازی اور محبت کا اثر تھا۔ اس جان[6] لیوا بیماری میں (اُن کے) رفیق حکیم اسرار احمد کریوی، اُن کے نیاز مند متین الرحمٰن مرتضیٰ اور (اُن) کے ملازم (نبارس خاں) نے جیسی خدمت کی نہ جو رو کر سکتی تھی نہ فرزند کر سکتا تھا (یہ) اُن کی خفگی، درشتی اور چڑچڑے پن کو ہنس ہنس کے گوارا کرتے تھے اور اُنھیں خوش رکھنے کی کوشش کرتے۔

(مولوی[7] صاحب کو) عامیانہ خیالات سے بہت چڑ (اور) جھوٹ[8] سے سخت نفرت تھی۔ جھوٹے کو کبھی مُنہ نہیں لگاتے تھے ہمارے شرفا مروّت میں آ کر یا تالیفِ قلوب کی خاطر یا اس خیال سے کہ دل شکنی نہ ہو سچ کو چھپاتے یا جھوٹ کے مرتکب ہوتے ہیں یا ایسے کام کی حامی بھر لیتے ہیں جو وہ نہیں کر سکتے یا ان کا کرنا ان کے ضمیر کے خلاف ہے۔ اس کا نتیجہ کذب یا پشیمانی ہوتا ہے (مولوی عبدالحق) کا مسلک بالکل صاف تھا جب وہ کسی کام کو نہیں کر سکتے تھے یا نہیں کرنا چاہتے تھے یا اسے اپنے اصول اور وضعداری کے خلاف سمجھتے تھے تو صاف انکار کر دیتے تھے۔ وہ[9] راست گفتاری اور صاف گوئی میں نیک نام نہیں بدنام تھے۔ اُنھوں[10] نے اپنے خیالات کو کبھی نہیں چھپایا۔ جو دل میں تھا وُہی اُن کی زبان اور قلم پر تھا۔ کبھی اس کی پروا نہیں کی کہ اس سے اُن کی ذات کو نقصان پہنچے گا۔ اُن کی زندگی میں اکثر ایسے موقعے آئے جب اُن کے خیر اندیش اور مخلص دوستوں نے ان کو کسی فعل سے باز رہنے کی صلاح دی اور دُنیاوی اعتبار سے معاملے کی اُونچ نیچ سمجھائی لیکن اُنھوں نے وُہی کیا جو اُن کے ضمیر نے کہا اور ہمیشہ کمال اخلاقی جرأت سے کام لیا۔ بے ریائی اور صداقت عمر بھر ان کا شعار رہا۔

مصلحت[11] کا داغ اُن کے دامن پر نہ تھا۔ جو جی میں آتا کہہ بیٹھتے اور جو چاہتے کر گزرتے تھے جہاں کسی نے غلطی کی ٹوک دیتے تھے کبھی یہ نہ سوچا کہ اس کا محل و موقع بھی ہے یا نہیں یہی وجہ ہے کہ جو لوگ ان کی طبیعت سے واقف نہ تھے ان کی باتوں

---

1. صفحہ ۲۰۴ سر سید راس مسعود
2. صفحہ ۲۶۰ آہ! عبدالرحمٰن صدیقی
3. صفحہ ۲۶۰ " "
4. صفحہ ۲۰۴ نواب عمادالملک
5. صفحہ ۹۳ مولوی محمد عزیز مرزا
6. صفحہ ۹۳ " "
7. صفحہ ۲۰۱ نواب عمادالملک
8. صفحہ ۳۲۷ سر سید احمد خاں
9. صفحہ ۹۴ مولوی محمد عزیز مرزا
10. صفحہ ۳۴۰ سر سید احمد خاں
11. صفحہ ۲۱۵ نواب عمادالملک
12. صفحہ ۱۱۹ مولانا وحیدالدین سلیم

یہ اکثر ناراض ہو جاتے تھے۔ اُن کے مذہب میں دائی آزادی کی گنجائش تھی لیکن رائے کی آزادی میں وہ سب سے آگے تھے۔ وہ نہایت صاف گو، بے باک اور بے لوث تھے کہ سچ بات کہنے میں کبھی کسی کی پروا نہیں کرتے تھے اس لیے بعض لوگ ان سے خوش نہیں رہتے تھے مگر ان کی لیاقت اور سچائی کے سب قائل تھے۔

انھوں نے ہمیشہ ہر جگہ سچ کی حمایت اور آزادی کی تائید کی۔ اصول کی خاطر دنیا میں نقصان اُٹھایا، دوستوں کی ناراضگی اور لیڈروں کی خفگی برداشت کی لیکن اصول نہ چھوڑا۔ وہ حساب کے کھرے، بات کے کھرے اور دل کے کھرے تھے۔ وہ انگریزی سوسائٹی کو پسند نہیں کرتے تھے اور ان کے آداب و تکلفات کو مہمل سمجھتے تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ انگریزوں کی قوم حُبِّ جاہ و مال میں مبتلا رہتی ہے اور اسے صرف روپیہ کمانا اور اس کا صرف کرنا آتا ہے۔ اور باقی کسی دوسری بات کی پروا نہیں۔ وہ انگریزی قوم کو اچھا نہیں سمجھتے تھے ... کی نسبت مرحوم کا خیال تھا کہ یہ پچاس سال میں فنا ہو جائیں گے کیونکہ ثروت کا مدار تجارت پر ہے اور یہ لوگ تجارت چھوڑ کر نوکری کی طرف ڈھل رہے ہیں۔

اُن کا گھر مہمانوں سے بھرا رہتا تھا۔ آنے جانے والے کھانے کے وقت بے تکلف اُن کے گھر پہنچ جاتے اور وہ اس سے بہت خوش ہوتے تھے ...... بعض اوقات ٹولیاں کی ٹولیاں پہنچ جاتی تھیں اور وہ اُن کی دعوتیں بڑی فیاضی سے کرتے تھے۔ اُن کی مہمان نوازی دیکھ کر سب اہلِ مشرق مہمان نوازی یاد آتی تھی۔ ہندوستان اور بیرونِ ملک کے سیاح اور علما کے لیے اُن کا مکان مہمان خانہ تھا اور بڑی فراخدلی کے ساتھ میزبانی ادا کرتے تھے۔ بڑے دل سے خاطر تواضع کرتے اور مہمانوں کے خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

مولوی عبد الحق کی سیرت میں دو ممتاز خصوصیتیں تھیں۔ ایک سادگی، دوسری درد دل ..... خاکساری اور فروتنی خلقی تھی۔ اس قدر [illegible] چھوٹے بڑے سب سے محبت اور خلوص سے ملتے تھے .... اُن کا رتبہ بہت بڑا تھا مگر انھوں نے کبھی اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھا۔ بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت تو وہ کرتے ہی تھے لیکن بعض اوقات وہ اپنے سے چھوٹوں کا بھی ادب کرتے تھے۔ اس سے بڑھ کر خاکساری کا کیا ثبوت ہوگا کہ انھوں نے اپنی کتابوں پر جو اصل اور تحقیقی متنوں میں تصنیف مولوی تھیں ہمیشہ "مرتبہ" لکھا، "مؤلف" یا "مصنف" کا لفظ نہ لکھا۔

وہ ایک درد مند دل رکھتے تھے۔ مصیبت زدوں کی داستان سن کر اُن کا دل بھر آتا تھا اور فوراً مدد کے لیے آمادہ ہو جاتے۔ ایسے متعدد واقعات میرے سامنے پیش آئے۔ خود میں نے اُن سے کہہ کر بہت سے لوگوں کے کام نکالے۔ مشکل کے وقت اُن سے دوست انہیں ڈھونڈتے تھے۔ وہ بلا تامل سینہ سپر ہو جاتے یہاں تک کہ انھوں نے بعض

۱؎ صفحہ ۲۷۹ [illegible]
۲؎ صفحہ ۳۰۳ [illegible]
۳؎ صفحہ ۲۷۹
۴؎ صفحہ ۱۹۱ حالی
۵؎ صفحہ ۲۰۹ [illegible] غلام مصطفیٰ
۶؎ صفحہ ۳۰۳ [illegible] مولوی سید علی بلگرامی
۷؎ صفحہ ۱۰۲
۸؎ صفحہ ۱۹۲ حالی
۹؎ صفحہ ۲۹۹ آدابِ عبد الرحمٰن صدیقی
۱۰؎ صفحہ ۱۰۱ مولوی سید علی بلگرامی
۱۱؎ صفحہ ۱۹۳ حالی
۱۲؎ صفحہ ۲۰۲ سرسید حالی مسعود

ایسے دوستوں کو مصیبت اور تباہی سے بچایا جو شاید اس کے مستحق نہ تھے۔ حاجت مندوں کی حاجت روا کرنے میں بڑی فراخدلی سے کام لیتے تھے۔۔۔۔۔۔ (اور) اپنے پرائے خصوصاً مصیبت زدہ لوگوں کے ساتھ سلوک کرتے رہتے تھے۔ سفارشیں کر کے لوگوں کے کام نکالتے تھے۔ اس میں چھوٹے بڑے کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ (انھوں نے) غریبوں اور مستحقوں اور مفلوک الحال شرفا کی ہمیشہ مدد کی۔ اکثر اس طرح دیتے تھے جس پر یہ قول صادق آتا ہے کہ "داہنے ہاتھ سے یوں دے کہ بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو۔" مولوی صاحب مرحوم اپنے دوستوں اور عزیز و اقربا سے بھی سلوک کرتے تھے لیکن کبھی کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ روپے پیسے کی بالکل محبت نہیں تھی، بہت سیر چشم اور عالی ظرف واقع ہوئے تھے۔ جب روپیہ اُن کے پاس آتا تو اس کے دینے میں وہ بڑی فیاضی سے کام لیتے تھے، اگرچہ اکثر اس سے وُہی متمتع ہوتے تھے جو چالاک یا چلتے پُرزے ہوتے اور یہی وجہ ہے کہ اُن کے پاس کبھی روپیہ جمع نہ ہوا اور خالی ہاتھ اس دُنیا سے کوچ کیا۔ مرحوم کی عادت تھی کہ جب کوئی شخص علمی کام یا تجارت کے لیے روپیہ طلب کرتا تو حتی الامکان بڑی خوشی سے اس کی مدد کرتے تھے۔ مرحوم بہت بامروّت (بھی) تھے اگر کوئی شخص ان سے کسی قسم کی درخواست کرتا اور وہ اسے پوری نہ کر سکتے تو خاموش ہو رہتے مگر جب دُوسری بار پھر آتا تو اس شرمندگی میں سب سے مقدم اس کا خیال کرتے اور حتی الامکان اس کی مقصد براری میں کوشش کرتے۔

مرحوم اپنے دوستوں کو مدد دینے اور ان کے کام نکالنے میں بڑے بہادر تھے اور اس میں وہ کسی قسم کی رکاوٹ یا مشکل کی پروا نہیں کرتے تھے (اس) کے لیے ہر وقت مستعد رہتے تھے اور بعض اوقات دلیرانہ کام کر گزرتے تھے۔ بیکسوں اور درماندوں کا سہارا اور مایوسوں کی آس تھے، نہایت بے تعصب اور روشن خیال مسلمان تھے اور اس بات کو خوب سمجھتے تھے کہ اس درماندہ قوم کی دستگیری کرنا فرض ہے۔ لڑ جھگڑ کر، خوشامد سے، چاپلوسی سے، غرض ہر طرح کام نکال لیتے تھے۔ اس طرح انھوں نے سینکڑوں آدمیوں کو فائدہ پہنچایا۔ اپنا کام نکال لینے کا بھی خوب ڈھب یاد تھا۔ وہ دُوسروں سے کام لینے کا انھیں بڑا اچھا سلیقہ تھا۔ وہ کچھ ایسے مہر آمیز طریقے سے کہتے تھے اور اس طرح ہمت افزائی کرتے تھے کہ لوگ خوشی خوشی ان کا کام کرتے تھے۔ اپنے ملازموں اور ماتحتوں سے بھی اُن کا حسنِ سلوک ایسا تھا کہ وہ اُن کی فرمائش کی تعمیل ایسی تن دہی اور شوق سے کرتے تھے جیسے اُن کا کوئی ذاتی کام ہو اور وقت پر جان لڑا دیتے تھے۔ کام کرنے والوں کی قدر بھی کرتے تھے اور انھیں فائدہ پہنچانے کی تاک میں رہتے تھے اور بے دھڑک فائدہ پہنچاتے تھے۔ وہ اپنے دوستوں سے بھی خوب پھسلا کر کام لیتے تھے۔ وہ اپنے دفتر کے ملازموں پر نیچے کے نوکروں سے بڑی شفقت اور مہربانی کا برتاؤ کرتے تھے۔ کبھی سختی یا درشتی سے پیش نہیں آتے تھے اور اُن کے عیوب سے چشم پوشی کرتے تھے۔ وہ اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتے تھے کہ ملازموں کے ساتھ بُرا برتاؤ کیا

---

۱ صفحہ ۱۹۳ حالی
۲ صفحہ ۱۰۴ مولوی سید علی بلگرامی
۳ صفحہ ۵۰ " "
۴ صفحہ ۲۰۱ سرسید راس مسعود
۵ صفحہ ۲۲۱ " "
۶ صفحہ ۲۷۷ سرسید احمد خاں
۷ صفحہ ۹۴ مولوی محمد عزیز مرزا
۸ صفحہ ۵۰ مولوی سید علی بلگرامی
۹ صفحہ ۱۶۴ محسن الملک
۱۰ صفحہ ۲۲۲ سرسید راس مسعود
۱۱ صفحہ ۴۲ مولوی چراغ علی
۱۲ صفحہ ۹۲ مولوی سید علی بلگرامی
۱۳ صفحہ ۱۰۵ " "
۱۴ صفحہ ۲۰۱ سرسید راس مسعود

نوکروں پر کبھی سختی نہیں کرتے تھے نہ کبھی کسی پر خفا ہوتے ... نوکروں کو مار پیٹ اور بدزبانی کو نہایت مکروہ فعل اور بد اخلاقی سمجھتے تھے۔ نوکروں پر کبھی سختی نہیں کرتے تھے نہ کبھی کسی جائے۔ نوکروں کو مار پیٹ اور بدزبانی کو نہایت مکروہ فعل اور بد اخلاقی سمجھتے تھے۔

جائے۔ نوکروں کو مار پیٹ اور بدزبانی کو نہایت مکروہ فعل اور بد اخلاقی سمجھتے تھے۔ نوکروں پر کبھی سختی نہیں کرتے تھے نہ کبھی کسی معاملے میں ان سے باز پرس کرتے اور نہ کبھی کوئی سخت کلمہ کہتے۔ بعض اوقات ایسا ہوا کہ کسی نوکر نے ان کی کوئی عزیز یا بیش قیمت چیز توڑ ڈالی، خفا ہونا تو درکنار انھوں نے پوچھا تک نہیں کہ کیوں کر ٹوٹی اور کس نے توڑ دی۔[1]

آدمی کے پہچاننے میں انھیں خاص ملکہ تھا۔ تھوڑی سی ملاقات اور بات چیت میں آدمی کو پوری طرح بھانپ لیتے تھے۔ ان کے ملنے والے بُرے اور بھلے ہر قسم کے آدمی تھے۔ دُنیا نیکوں ہی کے لیے نہیں اس میں بدوں کا بھی حصہ ہے اور شاید دُنیا کی بہت سی رونق انھیں کے دم سے ہے۔ وہ دونوں سے کام لیتے تھے —[2]

(مرحوم) کی چال ڈھال، ان کی ہیئت، ان کی طرزِ معاشرت، ان کا برتاؤ سب نرالے تھے .... وہ اپنے فن میں باکمال تھے .... وہ غریبوں کے غمخوار اور دوستوں کے ہمدرد تھے۔ افسوس کہ مُلک ایک ایسی ذات سے خالی ہو گیا جس کی نظیر اب نہیں ہے لوگ انھیں بہت یاد کریں گے۔ احباب جلسے ان کے بغیر سونے ہوں گے اور سب سے زیادہ ان کے غریب دوست ان کا ماتم کریں گے۔[3]

(دُنیا) میں جہاں ہمیشہ کوئی نہ کوئی فتنہ بپا رہتا ہے اور ایک جھگڑے سے نجات نہیں ملتی کہ دوسرا جھگڑا کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ اسی طرح رہے جیسے طوفان موج خیز میں بطِ آبی .... وہ اپنے تمام سرکاری نیز (ذاتی) امور میں ہر قسم کے تعصبات سے بری تھے (اور) سب جھگڑوں کو فضول اور ہیچ سمجھتے تھے ان کی توجہ اور ان کا دل کہیں اور تھا —

پاک ہیں ذوشتوں میں بند ششوں میں بے لگاؤ

بستے ہیں دُنیا میں سب سے درمیاں رہتے الگ (حالی)[4]

بے تعصبی کا وصف ان ہی بزرگوں میں پایا جاتا ہے جن کی طبیعت میں انصاف ہوتا ہے۔ ان کے احباب میں ہندو اور عیسائی بھی تھے اور ان سے ان کا برتاؤ ویسے ہی خلوص اور محبت کا تھا جیسا مسلمان دوستوں سے۔ انھوں نے کبھی کوئی ایسی بات نہ کہی جس سے دوسرے مذہب والوں کی دل آزاری ہو۔ اگرچہ بعض معاملات میں انھیں ہندو سرگروہوں سے اختلاف تھا لیکن اس اختلاف کا اثر کبھی ان کے اخلاق یا برتاؤ پر نہیں پڑا۔ کسی مذہب و ملت سے انھیں خصومت یا پرخاش نہ تھی یہاں تک کہ وہ اسلامی فرقوں میں سے بھی کسی سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ آخر زمانے میں وہ گفتگو میں اکثر محاسنِ اسلام کا ذکر کرتے تھے اور افسوس کیا کرتے تھے کہ لوگ اصول سے زیادہ فروع پر زور دیتے ہیں اور توہمات کو مذہب سمجھ رکھا ہے۔

شیعہ سُنی کے جھگڑے کے متعلق ان کی رائے یہ تھی کہ یہ پولیٹیکل جھگڑا ہے (وہ اکثر اپنے رفیق حکیم اسرار احمد کریوی سے) ایک مصری عالم کی کتاب (کا ذکر کرتے تھے) جس میں اس نے اس پر خوب بحث کی ہے۔ مرحوم کا ارادہ تھا کہ اس کتاب کا ترجمہ

---

(۱) صفحہ ۹۹ مسوری حیاتِ حالی
(۲) صفحہ ۹۷ " " "
(۳) صفحہ ۹۹ " " "
(۴) صفحہ ۱۴۲ ... [illegible]
(۵) صفحہ ۱۹۴ حالی
(۶) صفحہ ۲۴۴ نواب عماد الملک
(۷) صفحہ ۸۰ حکیم امتیاز الدین
(۸) صفحہ ۲۵ سر رشید احمد خاں
(۹) صفحہ ۹۹ مولوی سید علی بلگرامی

اُردو میں (کرائیں) لیکن افسوس یہ خیال عمل میں نہ آیا۔ مرحوم صحیح بخاری کے بڑے مدّاح اور قدردان تھے اور کہتے تھے کہ عربی زبان سیکھنے کے لیے اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔ مرحوم مولوی نذیر احمد کے ترجمۂ قرآن کو (بھی) بہت پسند کرتے تھے۔

مگرچہ مرحوم تعصب سے بری اور مشرب وسیع رکھتے تھے لیکن غیرت و حمیت قومی اُن میں ضرور تھی اور اسلام و بانیٔ اسلام پر دل سے یقین رکھتے تھے۔ مگر مولویوں کی جاہلانہ اور متعصبانہ باتوں سے سخت ناراض ہوتے تھے۔ وہ اس اسلام کو جس کی تعلیم قرآن نے دی ہے حقیقی مذہب خیال کرتے تھے باقی تمام تفریقوں کو فضول اور لچر سمجھتے تھے۔ مرحوم ہندوستان کے مروّجہ پردے کو بہت بُرا سمجھتے تھے نیز ان لوگوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے جو تعدّدِ ازدواجات کے حامی ہیں۔

(مرحوم) طالب علموں اور اہلِ علم کا بہت خیال کرتے تھے اور خواہ اُن کی دُنیاوی حیثیت کیسی ہی ادنیٰ کیوں نہ ہو اور وہ کیسے ہی پھٹے حال میں کیوں نہ ہوں اُن سے بڑی مروّت اور اخلاق سے پیش آتے تھے اور جائز مدد دینے میں کبھی دریغ نہ کیا تھے، اُن کی صحبت سے خوش ہوتے تھے۔ وہ اہلِ علم سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے اور ایسے اشخاص پر جن میں طالب علمانہ جستجو اور صحیح ذوق ہوتا بہت مہربان ہوتے اور اُن کے لیے جو بھی ممکن ہوتا کرنے کو تیار ہو جاتے۔ اور جب ان کے علم میں آجاتا کہ فلاں عالم کوئی مفید علمی کام کر رہا ہے تو سفارش کر کے حکومت سے امداد دلوانے میں دریغ نہ کرتے (اور اسی لیے) اُن کی مجلس میں عموماً علمی چرچے رہتے تھے........ افسوس کہ اب کوئی جگہ ایسی نہ رہی جہاں ایسی صحبت کا لطف حاصل ہو سکے۔ جب کسی ہونہار تعلیم یافتہ نوجوان کو دیکھتے تو بہت خوش ہوتے تھے اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ یوں تو عام طور پر اور ہم لوگوں میں خاص کر یہ بڑا عیب ہے کہ اپنے لوگ ہم عصروں کے کمال کی داد دینے میں بڑا بخل کرتے ہیں لیکن مرحوم اس میں بڑے فیاض تھے۔ وہ صرف اہلِ علم کی قدر و منزلت نہ کرتے تھے بلکہ ان کے کام کو بھی وُقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ قدردانی کا یہ حال تھا کہ جہاں کوئی اچھی تحریر نظر سے گزری تو فوراً داد دیتے اور خط لکھ کر لکھنے والے کی ہمت بڑھاتے۔

(مرحوم) جدید تعلیم کے بڑے حامی تھے اور اس کی اشاعت اور تلقین میں مقدور بھر کوشش کرتے رہے لیکن آخر عمر میں ہمارے کالجوں کے طلبہ کو دیکھ کر انھیں کسی قدر مایوسی ہونے لگی تھی۔ (انھیں) اکثر یہ خیال رہتا تھا کہ تحصیلِ علم کے لیے سہولتیں پیدا کی جائیں۔ طلبہ میں وہ خاص طور پر مقبول تھے......... طالب علموں سے انھیں دلی ہمدردی تھی اور طرح طرح سے اُن کی مدد کرتے تھے، وہ اپنی جیب سے نادار طلبہ کو وظیفے دیتے تھے۔ سفارشیں کرتے تھے، نوکریاں دلواتے تھے، اُن کی مشکلوں میں کام آتے تھے، جائز معاملات میں اُن کی حمایت کرتے تھے، اُن کے وقار کو اپنا وقار اور اُن کی عزت کو اپنی عزت سمجھتے تھے۔ نام و نمود کی خاطر یا شہرت لینے کی غرض سے نہیں بلکہ وہ ان کے سچے خیر اندیش اور بہی خواہ تھے اور

---

1. صفحہ ۹۸ مولوی سید علی بلگرامی
2. صفحہ ۴۴ 〃 چراغ علی
3. صفحہ ۱۰۴ 〃
4. صفحہ ۹۳ 〃 محمد عزیز مرزا
5. صفحہ ۱۰۵ حالی
6. صفحہ ۱۹۹ سر سید راس مسعود
7. صفحہ ۸۰ مولوی سید علی بلگرامی
8. صفحہ ۱۰۱ 〃
9. صفحہ ۴۲۵ نواب عماد الملک
10. صفحہ ۱۰۵ حالی
11. صفحہ ۱۰۱ 〃
12. صفحہ ۱۹۰ سر سید راس مسعود
13. صفحہ ۹۸ مولوی سید علی بلگرامی
14. صفحہ ۸۰ 〃
15. صفحہ ۳۹۸ نواب عماد الملک
16. صفحہ ۹۶ سید علی بلگرامی
17. صفحہ ۸۴ 〃
18. صفحہ ۲۸۸ سر سید احمد خاں

لیکن بھی اُن سے دلی محبت کرتے تھے اور اُن کی سعادت مندانہ اطاعت کرتے تھے۔

(مولوی عبدالحق) کا اصلی ذوق علمی و ادبی تھا۔ اُن کا مطالعہ طالب علمی سے لے کر آخر تک جاری رہا۔ مطالعے میں بے حد شغف تھا۔ گویا یہی اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا .... تین چار گھنٹے سونے میں اور ایک آدھ گھنٹہ ہوا خوری میں ضرور صرف ہو جاتا تھا ورنہ باقی تمام وقت کام میں اور خاص کر مطالعہ کتب اور تالیف و تصنیف میں صرف ہوتا۔

تحقیق و تفتیش کی یہ کیفیت تھی کہ وہ جس مضمون کا خیال کرتے اس کی تہ تک پہنچتے اور اس کے ماخذ و ماعلیہ کے سراغ میں پھرتے اور دور دور تک نظر ڈالتے اور پاتال کی خبر لاتے۔ اپنی کتاب (یا مضمون) کے واسطے سامان جمع کرنے کے لیے کتابوں کے دفتر چھان ڈالتے۔ اور لوگوں کو بھیج کر دیگر مقامات سے نایاب کتابیں تلاش کرا کر بہم پہنچاتے .... اور بعض اوقات ایسے ایسے مقامات سے خوشہ چینی کرتے جہاں دوسروں کا خیال بھی نہ پہنچتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جس مضمون پر انھوں نے قلم اٹھایا دوسروں کے لیے بہت کم گنجائش چھوڑی ہے۔ اُن کی تصانیف پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا مطالعہ کس قدر وسیع تھا اور مواد فراہم کرنے کے لیے انھوں نے کس قدر محنت اور مشقت اٹھائی ہے۔ وہ قدامت پرست نہ تھے بلکہ انھوں نے بہت سی پرانی رسموں کو ترک کر کے رکھ دیا۔ ہر بات کو تحقیق اور عقل کی کسوٹی پر پرکھتے تھے جو اس میں پوری اترتی اسی پر عمل کرتے۔ تعصب سے مطلق نا آشنا تھے۔ جدت اور نئی روشنی کے حامی تھے۔ وقار اور متانت اُن پر ختم تھی، مستقل مزاجی میں پورے تھے۔ آزاد خیال ایسے تھے کہ سچی بات کہنے اور لکھنے میں کبھی نہ چوکتے۔ مطالعہ اور تحقیق میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔

وہ علم کی قدر کرتے تھے ...... خود بھی طالب علم تھے اور باوجود اس مرتبہ پر پہنچنے کے اُن کے مزاج میں طالب علمانہ سادگی موجود تھی اور روز مرہ کی علمی گفتگو میں اُن کا انداز تخاطب بالکل ویسا ہی ہوتا تھا جیسے ایک طالب علم سے ہوتا ہے۔ اس وقت وہ فرق مراتب کا بالکل خیال نہیں کرتے تھے۔

ان کو کتابوں کا حد درجہ شوق تھا۔ ہمیشہ عمدہ اور نادر الوجود کتابوں کی ٹوہ میں رہتے تھے۔ قلمی کتاب کی دوسری چیزوں کی طرح کوئی خاص قیمت نہیں ہوتی۔ یہ قدر دانی پر ہے۔ بعض وقت سودا کرنے میں [illegible] کتاب ہاتھ سے جاتی رہتی ہے اور اس کا پچھتاوا عمر بھر رہتا ہے۔ مولوی عبدالحق کتابوں کے بڑے قدر دان تھے اور اسی قدر دانی کا نتیجہ تھا کہ جب کوئی ایسی کتاب آ گئی تو بے خریدے نہ چھوڑتے اور منہ مانگی قیمت دیتے۔ چنانچہ انھوں نے ایک نہایت عمدہ کتب خانہ چھوڑا ہے جس میں کتابوں کی تعداد [illegible] ہے۔ [illegible] نادر الوجود ہے اور تمام ہندوستان میں کہیں دوسری جگہ اس کا نسخہ موجود نہیں۔ ان میں بہت سی ایسی کتابیں ہیں جن پر [illegible] کے نشان یا نوٹ نہ ہوں ۔۔۔

---

(۱) صفحہ [illegible] مولوی [illegible]
(۲) صفحہ [illegible] مولوی چراغ علی
(۳) صفحہ [illegible] نواب [illegible]
(۴) صفحہ [illegible]
(۵) صفحہ [illegible] غلام [illegible]
(۶) صفحہ [illegible] سر سید [illegible]
(۷) صفحہ [illegible] مولانا شبلی [illegible]
(۸) صفحہ [illegible]
(۹) صفحہ [illegible] مولوی چراغ علی
(۱۰) صفحہ [illegible] مولوی چراغ علی
(۱۱) صفحہ [illegible]
(۱۲) صفحہ [illegible] سید علی بلگرامی
(۱۳) صفحہ [illegible]

علم وادب کا ذوق انھیں پہلے سے تھا۔ تحقیق اور تلاش و جستجو کی لگن نے اس ذوق کو بہت پختہ کر دیا تھا۔ طبیعت بہت حسّاس اور نظر بہت وسیع تھی۔ دُنیا کے ادبی شاہکار بہت کم ایسے ہوں گے جو اُن کی نظر سے نہ گزرے ہوں گے۔ اس سے اُن کے ذوق میں عجیب لطافت اور وسعت پیدا ہوگئی تھی جو اُن کے مضامین سے صاف ظاہر ہے۔ اس فاضل شخص کی زندگی عجیب و غریب تھی۔ اُنھوں نے تمام عمر علم کے مطالعہ اور علم کی خدمت میں صرف کی۔ گو خود درویشوں کی طرح (زندگی) بسر کی مگر دُوسروں کو ہر طرح فائدہ پہنچایا۔ ہمارے مدارس اور کالج کے اُستادوں اور طالب علموں کو اس بے ریا اور بے نفس شخص کی زندگی سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ سچّے عالم ایسے ہی ہوتے ہیں۔

اُن کی صحبت مغتنمات میں سے تھی۔ اس میں حکیمانہ اور طالب علمانہ دونوں شانیں نظر آتی تھیں۔ اپنے زمانے کے پُرانے حالات (اگلے) بُزرگوں کی خودداری، وضعداری اور شجاعت کے کارنامے اور اُن کے توہمات، اسراف اور شیخی کے قصّے بڑے مزے سے بیان کرتے تھے۔ اُن کا تخیّل اس قدر بلند تھا کہ فہم وہاں پہنچتے پہنچتے لڑکھڑانے لگتا تھا۔ شعر کا ذوق ایسا پاکیزہ اور اعلیٰ درجے کا تھا کہ میں نے آج تک کسی میں نہیں دیکھا۔ اُن کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ قدیم اساتذہ کے کلام پر بہت اچھی نظر تھی اور خاص صحبتوں میں اُن کا منتخب کلام سُناتے اور کبھی کبھی شعر کے محاسن و معائب پر تنقیدی نظر ڈالتے جسے سن کر اُن کے ذوق کی داد دینی پڑتی تھی۔ اگر کوئی ان چیزوں کو قلم بند کر لیتا تو وہ ایک نادر بیاض ہوتی ...... (وُہ خود ہمیشہ) اپنے پاس ایک بیاض رکھتے تھے جہاں کہیں کوئی اچھا شعر یا کوئی خیال یا کام کی بات نظر پڑی وہ جھٹ اپنی بیاض میں لکھ لیتے تھے۔ غرض (مولوی عبدالحق) کی صحبت میں بعض اوقات ایسے علمی و ادبی نکات مل جاتے تھے جو گہرے مطالعہ اور فکر کا نتیجہ ہوتے تھے۔ اُن کے علمی ذوق، علم و ادب کی سرپرستی اور صحبت سے جو فیض لوگوں کو پہنچا وہ (شاید) ان کی تالیفات سے کہیں زیادہ استوار اور دُور رس ہے!

علم کے ساتھ صحیح ذوق بھی ضروری ہے۔ علم کتنا ہی وسیع ہو صحیح ذوق نہ ہو تو علم بے نتیجہ اور بے ثمر ہے۔ آدمی کو علم، دولت، آسائش و آرام، محنت سے مل جاتا ہے لیکن صحیح ذوق بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ یہ دولت نہ علم سے ملتی ہے نہ مال و زر سے اور نہ محنت سے۔ صحیح ذوق زندگی کی جان ہے۔ اس سے زندگی کے ہر شغل و شعبہ میں ایک نرم اور سُہانی سی روشنی آجاتی ہے اور باوجود نشیب و فراز اور اوگھٹ گھاٹیوں کے سفرِ حیات کے طے کرنے میں بہت کچھ سہولت ہو جاتی ہے۔ (مولوی صاحب) کا ذوق بہت سلیم اور پاکیزہ تھا اور یہ ذوق علم و ادب تک ہی نہ تھا .... زندگی کی ہر چھوٹی بڑی چیز میں نظر آتا تھا۔

طبیعت میں نفاست پسندی بہت تھی۔ صناعی کے دل دادہ تھے۔ اچھی چیز کو دیکھ کر پھڑک جاتے تھے۔ بڑی صفائی اور سلیقے سے رہتے تھے۔ کھانے کے بڑے شوقین تھے۔ خوب کھاتے تھے کھلاتے تھے۔ جب کوئی دعوت میں انگریزی کھانے

۱؎ صفحہ ۲۰۹ ڈاکٹر بجنوری — ۴؎ صفحہ ۲۰۵ درویش پروفیسر بی ہٹ سنگ — ۷؎ صفحہ ۲۴۳ نواب عماد الملک
۲؎ " ۱۱۰،۱۱۹ حکیم امتیاز الدین — ۵؎ " ۲۴۴ نواب عماد الملک — ۸؎ " ۲۵۵ ڈاکٹر محمد اقبال
۳؎ " ۲۴۲ نواب عماد الملک — ۶؎ " ۲۵۵ ڈاکٹر محمد اقبال — ۹؎ " ۲۰۳ سر سید راس مسعود

لطف تو بہت ناک بھوں چڑھاتے تھے اور اس کا بہت بُرا مانتے تھے۔ (مولوی) صاحب کھانا تو خیر اچھا کھاتے ہی تھے لیکن کھانے کی خوبی اور اس کی باریکیوں کو خوب سمجھتے تھے (اور) کھانے کے عیب و ہنر کو بھی خوب پرکھتے تھے .... ان کا باورچی بھی خلیفہ بھی (ہیرا جی) کو تھا ...... خوب کھانا پکاتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خاص مزہ تھا۔ رہنے سہنے، کھانے پینے، پوشاک غرض ان کی ہر چیز میں نفاست پائی جاتی تھی۔

سادگی و پرکاری کمال صناعی ہے۔ اس میں ادب بھی شامل ہے۔ سادہ زبان لکھنا آسان نہیں۔ سادہ زبان لکھنے کے یہ معنی نہیں کہ آسان لفظ جمع کر دیے جائیں۔ ایسی تحریر سپاٹ اور بے مزہ ہوگی۔ سلاست کے ساتھ لطف بیان اور اثر بھی ہونا چاہیے یہ صرف باکمال ادیب کا کام ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے کہ زبان پر پوری قدرت ہو اور اسی کے ساتھ موضوع تحریر پر بھی کافی وسیع اور گہری نظر ہو۔ اسی لیے کسی فن یا علم کی ابتدائی یا آسان کتابیں ایسا ہی شخص لکھ سکتا ہے جسے اپنے فن یا علم پر کامل عبور ہے۔ وہ اپنے خیالات کو سادہ الفاظ میں ایسے مرغوب طرز بیان کے ذریعہ عام فہم مثالیں دے کر ادا کرتا ہے کہ مضمون قابل فہم اور دلنشین ہو جاتا ہے۔ جن کا علم ادھورا ہوتا ہے وہ کبھی اپنے خیالات صفائی اور خوبی سے ادا نہیں کر سکتے۔ تحریر یا تقریر کا مقصد ہوتا ہے کہ لوگ اسے سمجھیں، اس کے اثر کو قبول کریں اور لطف اٹھائیں۔ اگر یہ نہیں تو تحریر یا تقریر محض بیکار اور تضییع اوقات ہے۔ (مولوی عبدالحق) کی تحریر اسی لیے مقبول ہوئی کہ وہ سادہ، پُر اثر اور پُرخلوص تھی۔ معمولی لکھے پڑھے شخص کی سمجھ میں بھی آتی اور اس کے دل میں اُتر جاتی ...... یہ اثر رنگین عبارت، مقفیٰ مسجع جملوں، تشبیہوں اور استعاروں کے پیچ پیچ سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنے مطلب کو سادہ لفظوں میں صاف صاف بیان کرنے کا بہت خیال رکھتے تھے اور دوسروں کو بھی اس کی تاکید کرتے تھے۔

(مولوی عبدالحق) کا یہ کمال تھا کہ کیسا ہی مشکل اور پیچیدہ مسئلہ ہو۔ وہ اس خوبی اور صفائی سے بیان کرتے تھے کہ پڑھنے والے کے ذہن میں اُترتا چلا جاتا تھا۔ ضبط اور اعتدال اُن کے بہت بڑے اوصاف تھے۔ یہ دو خوبیاں اُن کے ہاں کامل طور پر پائی جاتی ہیں۔ ورنہ جوش میں اکثر آدمی سر رشتۂ اعتدال کھو دیتا ہے اور بہک کر کہیں کا کہیں نکل جاتا ہے اور بجائے کہنے کے چیخنے چلانے لگتا ہے۔

اسی خیال کا اظہار انھوں نے کئی جگہ کیا ہے کہ جو شخص اردو کا ادیب اور محقق ہونا چاہتا ہے اُسے سنسکرت یا کم سے کم بھاشا کا جاننا ضروری ہے۔ ایک جگہ جب اردو لغت کی ترتیب کا ذکر ان سے آیا تو فرمانے لگے کہ "اردو لغات میں ہندی کے وہ الفاظ جو عام بول چال میں آتے ہیں یا جو ہماری زبان میں کھپ سکتے ہیں بلا تکلف کثرت سے داخل کرنے چاہئیں"۔ خود اپنی تحریر میں وہ ہندی الفاظ ایسی خوبصورتی سے لکھ جاتے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ اسی موقع کے لیے وضع ہوئے

---

۱ صفحہ ۲۴۴ نواب عماد الملک
۲ " ۴۴۴ و ۴۴۵ سر سید احمد خاں
۳ " ۱۹۹ حالی
۴ صفحہ ۱۹۰ محسن الملک
۵ " ۲۰۰ سر سید احمد خاں
۶ " ۱۹۰، ۲۰۰ ...
۷ صفحہ ۱۴۰ محسن الملک
۸ " ۱۴۲ حالی

تھے۔ اُنھوں نے بہت سے ایسے ہندی الفاظ اُردو ادب میں داخل کیے جو ہماری نظروں سے اوجھل تھے اور جن کا آج تک کبھی کسی اُردو ادیب یا شاعر نے کیا ہندی ادیبوں اور شاعروں نے بھی استعمال نہیں کیا تھا۔ لفظ کا صحیح اور برمحل استعمال جس سے کلام میں جان پڑ جائے اور لفظ خود بول اُٹھے کہ لکھنے والے کے دل میں کیا چیز کھٹک رہی ہے ادب کا بڑا کمال ہے اور یہ کوئی (مولوی عبدالحق) سے سیکھے ! ——— دِلوں میں گھر کر لینے کے جو گُر ادب میں ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے !

ایک بار فرمایا کہ "جو لوگ تذکیر و تانیث اور دِلّی لکھنؤ کی زبان کے متعلق دُور از کار اور فضول بحثوں اور جھگڑوں میں پڑے ہوئے ہیں وہ بڑی غلطی پر ہیں . . . . زبان دلّی اور لکھنؤ کی تابع نہیں بلکہ خیالات کی تابع ہے۔ کسی[۱] تحریر یا ادب کی پُشت پر جب کوئی صحیح جذبہ یا خیال نہیں ہوتا تو لفظوں سے کھیلنا پڑتا ہے۔ جن[۲] لوگوں کے خیالات رکیک ہیں اُن کی زبان کبھی فصیح نہیں ہو سکتی"

حقیقت[۳] یہ ہے کہ (مولوی عبدالحق) جیسی طبیعت اور ذہانت اور جدّت کے بہت کم لوگ ہوتے ہیں۔ وُہ[۴] اعلیٰ درجے کے نثّار تھے۔ اُن کی تحریر[۵] جامع و مانع اور حشو و زوائد سے پاک ہوتی تھی۔ یہ حال اُن کی تمام تصانیف کا ہے۔ اُن[۶] کی تحریر میں بڑا قوت تھی اور حافظہ بھی غیر معمولی پایا تھا۔ بات کی تہ تک خُوب پہنچتے تھے اور زبان کے تو اُستاد تھے . . . . وُہ الفاظ کے کینڈوں اور اُن کی فطرت کو خُوب سمجھتے تھے اور لفظوں کی تلاش یا نئے لفظوں کے بنانے میں کمال رکھتے تھے۔ اور یہ لفظ ایسے موزوں اور جلد بنا لیتے تھے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے دماغ میں سانچے بنے بنائے رکھے ہیں جن سے الفاظ ڈھلتے چلے آ رہے ہیں۔ وہ دُوسرے[۷] ادیبوں کی طرح الفاظ اور محاورے سوچ سوچ کر اور ڈھونڈ کر نہیں لکھتے تھے اور نہ عبارت کے بنانے اور سنوارنے کی کوشش کرتے تھے۔ وُہ شروع سے آخر تک بلا توقف اپنے خیالات لکھتے چلے جاتے تھے اور پوری تحریر ایک مسلسل خُوب صورت لڑی ہوتی تھی۔ میں اس کی بہت سی مثالیں پیش کر سکتا ہُوں لیکن طوالت کے خوف سے معذور ہُوں۔

حقیقت[۸] یہ ہے کہ اُردو نثر میں جو انقلاب اور ترقی ہم اس وقت دیکھتے ہیں اور اس میں جو وُسعت اور ادبی صلاحیت پائی جاتی ہے وُہ (اُن ہی) کا طفیل ہے . . . . . . متین، سادہ اور خوشگوار نثر لکھنا جو علمی[۹] اور ادبی مضامین ادا کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ (اُنھوں) نے سکھایا۔ اُردو[۱۰] زبان میں ابھی تک وہ توانائی پیدا نہیں ہوئی تھی جو ایک زبان کے ادب کے لیے لازم ہے (مولوی عبدالحق) نے اس کے قالب میں ایک نئی رُوح پھونکی اور اُردو ادب میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اُنھوں نے زبان کو پستی سے نکالا۔ اندازِ بیان میں سادگی کے ساتھ قوت پیدا کی، سنجیدہ مضامین کا ڈول ڈالا۔ جدید علوم و فنون کے ترجمے انگریزی سے کرائے۔ خود کتابیں لکھیں اور دُوسروں سے لکھوائیں۔

ح۱ صفحہ ۸۷ مولوی سید علی بلگرامی
ح۲ " ۱۲۲ مولانا وحید الدین سلیم
ح۳ " ۱۲۲ " "
ح۴ " ۱۰۴ نواب عماد الملک

ح۵ صفحہ ۲۸۳ سر سید احمد خاں
ح۶ " ۱۱۸ مولانا وحید الدین سلیم
ح۷ " ۲۹۳ سر سید احمد خاں
ح۸ " ۲۸۵ " "

ح۹ صفحہ ۸۷ مولوی سید علی بلگرامی
ح۱۰ " ۲۹ مولوی چراغ علی
ح۱۱ " ۲۹۲ سر سید احمد خاں

اُن کی بڑی خواہش تھی کہ اُردو زبان میں اعلیٰ درجے کے ناول خصوصاً ڈرامے لکھے جائیں اور اس بات پر افسوس کرتے تھے کہ یورپین زبانوں سے بہترین ناولوں اور ڈراموں کا اُردو میں ترجمہ نہیں کیا گیا تاکہ وہ نمونے کا کام دیں۔ بعض وقت جو کوئی اعلیٰ درجے کی کتاب چھپتی تو اس کی تعریف کرتے اور دُوسروں کو بھی پڑھنے کا شوق دلاتے۔

علمی و ادبی اعتبار سے اُردو زبان میں اُن کا بہت بڑا درجہ ہے۔ اُن کا ذوقِ ادب (بہت) اچھا تھا..... اُن کی بیشتر تحریروں میں سے (اگر) ادبی نقطۂ نظر سے ایک انتخاب کیا جائے تو یہ انتخاب ہماری زبان و ادب کا بے مثل شاہکار ہوگا۔ یہ ادبی ذوق ہی تو تھا جس نے انہیں اُردو لغات اور اُردو کی تاریخ لکھنے پر آمادہ کیا۔ اُن کی تحریروں میں اکثر جگہ ادبی جواہر ریزے اور حسنِ بیان کے پہلو ــ بحیثیت زبان کے الفاظ اور محاورے اور مزاح و ظرافت کی پھلجھڑیاں نظر آئیں گی۔ (لیکن اُن) سے یہ توقع کرنا کہ اُن کی ہر تحریر ادب کا اعلیٰ نمونہ ہو، عبث ہے۔ (انھیں) اداے مطلب میں صفائی اور سادگی کا اس قدر خیال تھا کہ بعض وقت وہ مضمون کو عام فہم بنانے کی خاطر حسنِ بیان کو قربان کر بیٹھتے تھے۔ اس وجہ سے (کہیں کہیں) اُن کی عبارت سُست اور پھُسپھُسی معلوم ہوتی ہے لیکن جو ادبی یا علمی تحریریں اور مضامین دل لگا کر لکھے ہیں وہ حسنِ بیان اور خیالات اور زبان کی سلاست و فصاحت کے اعتبار سے اُردو ادب کے خزانے میں بے نظیر جواہر پارے ہیں۔ ان میں تمام ادبی خوبیاں ہیں۔ تلمیحات بھی ہیں، تشبیہات و استعارات بھی ہیں، محاورات بھی ہیں، لطفِ زبان بھی ہے، مزاح اور ظرافت کی چاشنی بھی ہے لیکن ہر چیز اپنے محل پر ہے اور تکلف و تصنع سے بری۔

یُوں تو عمر کے ساتھ ساتھ اُن کے کام بھی بڑھتے گئے جو مختلف نوعیتوں اور حیثیتوں کے تھے لیکن اصل کام جس پر اُن کی پوری محبت اور توجہ صرف ہوئی وہ (اُردو زبان کے پھیلاؤ) کا تھا۔ اُردو کے عاشق تھے اور اسے برصغیر کی قومی زبان خیال کرتے تھے اور اس کی ترقی و فروغ کے لیے طرح طرح کی تدبیریں سوچا کرتے تھے۔ اُردو کی حمایت میں (مولوی عبدالحق) نے کبھی کوتاہی نہیں کی جب کبھی اُردو پر آنچ آتے دیکھی تو اس کی حمایت کے لیے فوراً کمربستہ ہو گئے۔ اُردو کی حمایت کو (وہ) اپنا بہت بڑا فرض اور ایک اہم قومی خدمت سمجھتے تھے اور اس معاملے میں اُنھوں نے کبھی کوتاہی نہیں کی بلکہ سب سے پہلے قدم آگے بڑھایا۔

(یہ) بات اُن کی سیرت میں ایسی تھی کہ جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے..... (اُردو کو اُنھوں نے) اپنی بیٹی کی طرح پالا پوسا..... (اس کی) پرورش کی....... اور مرتے دم تک کبھی اپنے سے جُدا نہ کیا۔ جو کچھ کماتے وہ اس کے (لیے) لا کر رکھ دیتے تھے۔ اُنھوں نے اپنے پیسے (اُردو) کے لیے سے (زبان و ادب) پر بڑے بڑے پُر زور مضامین خود لکھے اور دُوسروں سے لکھوائے اور اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ جگہ جگہ جا کر لیکچر دیے اور تقریریں کیں۔ اُنھیں کیا پڑی تھی کہ (اور نمک

صفحہ ۱۸۲ حالی
۲۹۰، ۲۹۱ سر سید احمد خاں
۴۴۹ سر سید احمد مسعود
۶۰۰ مرد صاحب

صفحہ ۵۰۵ سر سید راس مسعود
۲۲۹ سر سید احمد خاں
۲۰۱
۲۰۰ خواجہ غلام الثقلین

صفحہ ۲۲۳، ۲۲۴ سر سید احمد خاں
۲۵۹ ڈاکٹر محمد اجمل
۲۲۳ سر سید احمد خاں
۲۲۳، ۲۲۴ تمیز صاحب

چھوڑ کر مارے مارے پھرتے لیکن محض (اُردو زبان) کی خاطر وُہ زمین کے گزبنے ہوئے تھے۔ وہ خود طرح طرح کی تکلیف اُٹھاتے لیکن اس پر کسی قسم کی آنچ نہ آنے دیتے تھے...... اُنھیں ہر وقت اس کا فکر رہتا تھا اور اُن کی زندگی کا مقصد ہی یہی تھا... (کہ) جس طرح ہو سکے اس کی خدمت کریں۔ حق (پدری) شاید کسی نے اس طرح ادا کیا ہو۔ یہ وضع داری یہ محبت و شفقت اور ایثار اب کہاں نظر آتا ہے۔ اپنے کو مٹا کر (مقصد) کی خدمت کرنا یہی جوہر انسانیت ہے۔

ہر شخص میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے۔ اس صلاحیت کو درجۂ کمال تک پہنچانے میں ساری نیکی اور بڑائی ہے۔ درجۂ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے اور پہنچ سکتا ہے۔ لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان، انسان بنتا ہے یہ سمجھو کُندن ہو جاتا ہے۔ حساب کے دن جب اعمال کی جانچ پڑتال ہو گی۔ خدا یہ نہیں پوچھے گا کہ تُو نے کتنی اور کس کی پوجا پاٹ یا عبادت کی۔ وہ کسی کی عبادت کا محتاج نہیں۔ وُہ پوچھے گا تو یہ پوچھے گا کہ میں نے جو استعداد تجھ میں ودیعت کی تھی اُسے کمال تک پہنچانے اور اس سے کام لینے میں تو نے کیا کیا اور خلق اللہ کو اس سے کیا فیض پہنچایا۔ اگر نیکی اور بڑائی کا یہ معیار ہے تو (عبدالحق) نیک بھی تھے اور بڑے بھی!

افسوس کہ ان کی زندگی کے آخری ایام انتہا درجے کی تلخی اور کرب و الم میں گزرے۔ (مرحوم[۱] کا) بڑے بڑے حاذق ڈاکٹروں نے علاج کیا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ حالت بہت ردّی ہو چکی تھی...... حکیموں اور ڈاکٹروں کی حذاقت اور چارہ سازی دھری رہ گئی اور حکمت و تدبیر کچھ کارگر نہ ہوئی۔ وُہ وقت جو ٹلنے والا نہیں ہے اور جس سے کوئی جاندار بچ نہیں سکتا آن پہنچا اور وُہ[۲] (۱۶ر اگست ۱۹۶۱ء کو) ہمیشہ کے لیے اس دُنیا سے رُخصت ہو گئے۔

قلم[۳] ان کا آخر دم تک نہ رُکا۔ موت[۴] سے چند روز پہلے تک جب تک کہ بالکل مجبور نہ ہو گئے۔ برابر لکھتے رہے۔ ایسا[۵] جامع صفات اور جامع حیثیت بے لوث و بے نفس، پُر عزم و استقلال، سراپا خلوص و صداقت ہمیں اس سے پہلے (ملا) اور نہ اس کے بعد نصیب (ہوگا)........ اور آخر دم تک مردانہ وار بلکہ دیوانہ وار کام کرتے کرتے دُنیا سے چل بسا۔ اس کے پاس نہ رہنے کو گھر تھا نہ مرنے کو۔

ہمارے[۶] مُلک میں خوشامدیوں کی کوئی کمی نہیں وُہ ہر بڑے آدمی پر اس طرح ٹوٹ کر گرتے ہیں جیسے شہد پر مکھیاں لیکن سچ اور جھوٹ کا امتحان جب ہوتا ہے جب وُہ بڑا آدمی اپنے اقتدار سے محروم ہو جاتا ہے۔ (ان) کی (رحلت) کے وقت کہرام مچ گیا تھا اور ہزارہا آدمی کا ٹھٹھ باہر اور اندر لگا ہوا تھا۔ سینکڑوں آدمی جن میں امیر، غریب، بیوائیں اور یتیم سب ہی تھے زار و قطار رو رہے تھے۔ وُہ کیا چیز تھی جس نے چھوٹے بڑے سب کا دل موہ لیا تھا؟ مرحوم[۷] کی وفات پر تمام اُردو انگریزی اخبارات میں اظہارِ افسوس و ملال کیا گیا لیکن ہم یہاں بخوفِ طوالت صرف دو[۸] تحریروں کو نقل کرتے ہیں ایک (صدر

---

[۱] صفحہ ۳۲-۲۳۱ نام دیو — مالی
[۲] صفحہ ۱۵۳ سرسید احمد خاں
[۳] صفحہ ۱۵۲ سرسید احمد خاں
[۴] صفحہ ۱۴۴ خواجہ غلام الثقلین
[۵] صفحہ ۱۵۳ سرسید احمد خاں
[۶] صفحہ ۲۴۳ محسن الملک
[۷] صفحہ ۵۱ مولوی چراغ علی
[۸] صفحہ ۱۵۳ سرسید احمد خاں
[۹] صفحہ ۵۲ مولوی چراغ علی

[صدرِ مم]لکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خان) کا اظہارِ افسوس جو انھوں نے (زیارت) سے کیا اور جو (مختلف رسائل واخبارات میں) طبع [او]ر شائع ہوا۔ دوسرا (ابو الاثر حضرت حفیظ جالندھری) کا الم نامہ جو اس دردناک خبر (پر) انھوں نے راقم کو لکھا [تھ]ا۔ حقیقت میں دونوں تحریریں سچی اور دل سے لکھی گئی ہیں۔

(از جریدہ "قومی زبان" تعزیتی پیغام فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صدر پاکستان؛ جلد ۱۹ شمارہ ۱۳تا۱۴)

"مولوی عبدالحق کی وفات ایک عظیم قومی نقصان ہے۔ اُن کے انتقال سے ہم علم وادب کے ایک سچے پرستار سے محروم ہو گئے ہیں۔ مرحوم اپنے مقصد کے حصول کے لیے ایک مضبوط اور غیر متزلزل چٹان کی طرح جمے رہے۔ اُن کی ذات برصغیر پاک و ہند کے گزشتہ ایک سو سال کی اسلامی ثقافت کی مظہر تھی۔ اُن کا ہمارے درمیان سے اُٹھ جانا ایک عظیم ادارے کے ختم ہو جانے کے جیسا ہے۔

ذاتی طور پر اُن کے انتقال سے میں اپنے ایک قابلِ احترام دوست سے محروم ہو گیا ہوں۔ اپنے منصب سے انھیں جو لگاؤ تھا میں اس سے ہمیشہ فیض حاصل کرتا رہا ہوں۔

میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔"

(ابو الاثر حضرت حفیظ جالندھری کا اظہارِ غم اور خراجِ عقیدت از مکتوب محررہ یکم اپریل ۱۹۶۲ء)

"اُردو کا ذکر آتے ہی ہمارے دور کے ادب و شعر کی دُنیا میں آج کون ہے جو مولوی عبدالحق مرحوم کے نام پر ادب و احترام کا خراج ادا نہ کرے۔ ہم لوگ میں اور میرے ہم عصر جو اُردو میں شعر و شاعری یا نثر نگاری کے دعویدار ہیں سب کے سب بابائے اُردو مولوی عبدالحق مغفور کے زیرِ بارِ احسان ہیں۔ وہ اوّل سے آخر تک اس زبان کی ترویج و ترقی اور حفاظت کے لیے مصروفِ کار اور برسرِ پیکار رہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اُردو کبھی کی نیا میانہ سہی کونوں کھدروں میں پناہ گزیں ہو چکی ہوتی اور ہم سب بھانت بھانت کی بولیاں بولتے نظر آتے۔

برِ اعظم ہند کے باشندے، وہ کوئی بھی ہوں، اس قدر جلد اُردو اور ہندی کی وہ معرکہ آرائی نہیں بھول سکتے جو اس صدی کے آغاز سے مسلسل جاری ہے اور میں سمجھتا ہوں ابھی مدتوں جاری رہے گی۔ یہ معرکہ آرائی چند نمایاں پہلو اختیار کر چکی ہے۔ اور میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اُردو نے کسی محاذ پر شکست نہیں کھائی۔ مولوی عبدالحق صاحب اس یورش کے مقابل اُردو کی حفاظت کرنے والوں کے محاذ کے سپہ سالار تھے۔

آج پاکستان کی دو قومی زبانوں میں اُردو جو ایک زبان تسلیم کر لی گئی ہے یہ مولوی عبدالحق ہی کی مساعیِ جمیلہ اور ایسی کارگزاری کا ثمر ہے جس کے لیے اس مردِ حق پرست نے اپنی جان تک

دے دی، قربان ہو گئے اور کہہ

ہم یہاں کام آگئے، آگے تمہارا کام ہے

فرما کر جسمانی طور پر ہم سے رُخصت ہو گئے ہیں۔ لیکن الحمد للہ اُردو کا پرچم آگے ہی آگے لہرا رہا ہے۔ مولوی عبدالحق کی رُوح پھول برسا رہی ہے اور ہم سب کو حوصلہ بخش رہی ہے اور آگے بڑھتے جانے کی تلقین فرما رہی ہے۔"

مرحوم[۱] کے انتقال پر بہت سی تاریخیں لوگوں نے کہیں۔ ان میں سے چند یہاں لکھی جاتی ہیں۔ سید (ہاشمی فرید آبادی صاحب) نے جو (عربی) صنائع میں تاریخ کی صفت کو بہت پسند کرتے تھے یہ تاریخ نکالی:

"غَفَرَ اللّٰہُ لَہٗ"

۱۳۸۱ھ

(حضرت[۲] رئیس امروہوی) مدظلہ العالی نے اسے نظم میں اس طرح موزوں فرمایا ہے ؎

"رحلتِ مولوی محترم عبدالحق
مرگِ تازہ پئے ترسیع زبانِ اُردو
زندہ شُد۔ شیوۂ اسلافِ گرامی از وے
بودہ است از صفِ سرسیّدؒ و حالیؔ ہم او
ہاشمی۔ فکر چو فرمود پئے سالِ رئیس
ہاتفِ غیب صدا زد غفر اللہ لہٗ"

۱۳۸۱ھ

(حضرت[۳] رئیس امروہوی) نے خود بھی ایک قطعہ (تاریخ) مرحوم کی وفات پر لکھا ہے جس میں گویا مرحوم کے کام اور سیرت کی کامل تصویر کھینچ دی ہے۔ وہ یہ ہے ؎

"ہزار رنگ یہ دُنیا نئے نو بہ نو بدلے
مگر کہاں بدلِ مولوی عبدالحق

نقوشِ خدمتِ اُردو کہ ہیں جہاں افروز | نتائجِ عملِ مولوی عبدالحق
رفیقِ سیّدؔ و حالیؔ و اکبرؔ و آزادؔ | وجودِ بے بدلِ مولوی عبدالحق
ہر اک محاذ پہ اُردو کا پاسباں ٹھہرا | جہادِ بر محلِ مولوی عبدالحق

۱۔ صفحہ ۷۵ مولوی چراغ علی
۲۔ صفحہ ۷۵ مولوی چراغ علی
۳۔ صفحہ ۷۶ مولوی چراغ علی

اللہ اسے ترقی و خدمت ادب — احساس بے بدل مولوی عبدالحق
فنون نثر میں نظم و نگارش و تحریر — قصیدہ غزل مولوی عبدالحق
رئیس اہل حمیت مجدد نہیں سکتے — حمیت و عمل مولوی عبدالحق

غم اجل میں بھی سال اجل ہے در پیش
کہو "نسیم اجل مولوی عبدالحق"

۱۳۸۱ھ

(پروفیسر حبیب اللہ صاحب غضنفر امروہوی) نے بھی جو ایک عالم شخص ہیں اور ایک زمانے تک (ناگپور) میں ملازم تھے اور اب (اردو کالج، کراچی میں صدر شعبۂ اردو) ہیں ایک اچھا قطعہ تاریخ لکھا ہے جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے ~

اے غضنفر وصف کیا بابائے اردو کے لکھوں — ذات والا فخر پاکستان و صد عظمت نشان
صاحب نقد و نظر بھی صاحب اسلوب بھی — آفتاب نثر اردو بالیقیں و بے گماں

تلخ و شیریں زندگی کا کس قدر انجام ہے
"شام غم" سے ہے سن ترحیل عبدالحق عیاں

۱۳۸۱ھ

(پروفیسر حامد حسن صاحب قادری) نے بھی مرحوم کی دو تاریخیں ایک سن عیسوی میں دوسری ہجری نبوی میں کہیں جو یہ ہیں ~

جدا ہم سے بابائے اردو ہوئے — ہم اب فیض سے ان کے محروم ہیں
انھوں نے جو اردو کی کیں خدمتیں — وہ سب قوم کے دل پہ مرقوم ہیں
بہت ان کے احسان آئیں گے یاد — کہ اب محسن ان کے سے معدوم ہیں
یہ اللہ کے فضل سے ہے امید — کہ باغ جناں میں وہ مرحوم ہیں

لکھا قادری نے یہ سال وفات
کہ تھے "خادم قوم" مخدوم ہیں"

۱۹۶۱ء

مولوی عبدالحق احسان شعار! — جن سے پاک و ہند دونوں فیض یاب ہیں
برگزیدہ محسن علم و ادب — پھر نہ کیوں "بابائے اردو" ہو خطاب

۱؎ صفحہ ۸۵ مولوی چراغ علی — ۲؎ صفحہ ۸۵ مولوی چراغ علی

حضرتِ اُردو میں دی جب جاں عزیز　　ایسی ہستی ہے جہاں میں انتخاب
نام مشتاق زباں میں کر گئے　　بے نظیر و بے مثال و لاجواب!
قادری اُن کی ہے تاریخ وفات
"خادمِ قومی زباں، حسرت مآب!"

۱۳۸۱ھ

بہت سے ایسے ہیں جو ایک چیک پر دستخط کر دینے سے دُنیا میں یکایک نامور ہو جاتے ہیں۔ بہت سے ہیں جنھیں اتفاقاتِ زمانہ نے بڑا آدمی بنا دیا ہے۔ بہت سے ہیں محض نام و نمود کے لیے زمین آسمان ایک کر دیتے ہیں اور شہرت یا نام حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کر گزرتے ہیں اور آخر بڑے آدمی بن جاتے ہیں لیکن کم ہیں جو محض اپنی لیاقت، محنت اور خلوص کے ساتھ کام کر کے عزّت اور بڑائی حاصل کرتے ہیں۔ یہ بڑائی پائیدار ہوتی ہے۔ مرحوم اسی مظلوم اور چھوٹے گروہ میں سے تھے۔ باوجود اس لیاقت و (عظمت) کے اپنی زندگی درویشانہ بسر کی۔ شہرت، دولت اور حکومت جن سے ایک عالم میں ہیجان اور انقلاب برپا ہے اور جن کی آگ تقریباً ہر سینے میں مشتعل ہے وُہ ان کی آنچ سے بالکل محفوظ تھے ورنہ چاہتے تو اس قدر شہرت اور دولت حاصل کر سکتے تھے جو دُوسروں کی قدرت سے باہر ہے لیکن اُنھوں نے حقارت سے اس پر نظر ڈالی اور متانت وقار سے ٹھکرا کر چلے گئے۔

ملٹن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "شہرت انسان کا فطری ضعف ہے" اور حقیقت میں یہ سچ بھی ہے۔ اس سے بچنا قریب قریب محال ہے لیکن بعض خدا کے بندے جنھیں غیر معمولی دماغی قوت عطا ہوئی ہے اور جن کا علم و فضل تبحّر کے رُتبے کو پہنچ گیا ہے ایسے بھی ہیں کہ شہرت پر لات مار کر گنجِ تنہائی کو غنیمت سمجھتے ہیں اور اپنے فلسفے اور خیالات میں، خواہ یا دہوائی کیوں نہ ہوں مگن ہیں۔ یا تو وُہ اس ضعف کی قوت سے واقف نہیں کہ وہ انسان کو کیا سے کیا کر دیتا ہے یا وہ اسے حقارت کی نظر سے دیکھ کر پستی کی طرف مائل نہیں ہوتے اور اپنے تئیں ایک غلام یا بیل گھوڑے کی طرح ناگوار محنت پر مجبور نہیں کرتے اور چند بدمذاقوں کی ۱۱ یا چند سمجھ داروں کی واہ واہ کے لیے کاغذ کو سیاہ اور لب کو وا کرنا گوارا نہیں کرتے۔ بعینہٖ یہی حالت اُن کی تھی۔ وہ کہا کرتے تھے۔ "کیا حاصل ہے شہرت سے؟ یہی نا کہ لوگ ہمارے نام سے واقف ہو جائیں۔ بالفرض اگر یہ ہوا بھی تو اس سے کیا خوشی ہو سکتی ہے اور اگر یہی ہے تو کیوں نہیں ہزاروں لاکھوں کارڈ چھپوا کر اپنا کام اور نام درج کر کے تقسیم کر دیں کہ ایک دُنیا اُن دونوں سے واقف ہو جائے اور پھر پیٹ بھر کر خوش ہو لیں؟" . . . . اس پاک نفس، عالی دماغ شخص کی حالت پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک پارسا صفت، درویش منش، صوفی مشرب اور بالغ نظر حکیم تھا۔ وُہ خواجہ حافظ کی غزلیں اور قطعات پڑھتے اور مزے لیتے۔ وُہ اپنی روزانہ ضروریات کی . . . . . کچھ پروا نہ کرتے اور بے تکلف سادہ زندگی بسر کرتے جس میں نہ نئے فیشن کو دخل

---

۱۱ صفحہ ۱۰۰ خواجہ غلام الثقلین　　۱۲ صفحہ ۱۰۸-۱۰۹ سید محمود

تھا اور دنیاوی عیش و آرام سے بیگانہ تھا۔ مگر جس قدر وہ ان چیزوں سے بے پروا تھے اسی قدر اخلاص میں مستثنیٰ تھے۔

انسان کی اصلی فضیلت اور برتری اس کے اخلاق (ہی) میں ہے۔ افراد ہوں یا اقوام، اخلاق کے زوال میں اُن کا زوال اور اخلاق کی پابندی اور استواری میں اُن کی عظمت و وقعت ہے۔ (مولوی عبدالحق) کی کامیابی کا راز اُن کے اخلاقِ حمیدہ میں تھا۔ اخلاق سے صرف یہی مُراد نہیں کہ آدمی دُوسروں سے خندہ پیشانی سے پیش آئے، خاطر مدارات کرے، وقت پر کسی حاجت مند کی حاجت روا کر دے۔ زبان و قلم سے ہمدردی کا اظہار کرے یا جیسا اکثر تعریف کے طور پر کہا جاتا ہے "مرنجاں و مرنج" ہو ——— اخلاق کی حدود اس سے بہت آگے تک ہیں۔ عزم و استقلال، ضبط و تحمل، جرأت (خصوصاً اخلاقی جرأت) کام کی لگن، فرض شناسی، دیانت، صداقت، رواداری، انصاف، ہمدردی، ایثار، انسان کے اصل جوہر ہیں۔ ان سب میں ایثار کا درجہ سب سے اعلیٰ ہے۔ یعنی ذاتی اغراض پر قومی مفاد کو ترجیح دے۔ انتہا یہ ہے کہ اپنے آپ کو بھول جائے۔ انسانیت اسی سے عبارت ہے ؎

می توان شد قطبِ عالم می توان شد غوثِ وقت
ہر چہ خواہی می توانی شد بجز انسان شدن!

چیست انسانی تپیدن از تپِ ہمسایگاں
وز سمومِ نجد در باغِ عدن پژماں شدن

فارغ از خویشتن را از خوری اجناس نے جنس
در شبستانِ تنگ دلی از محنت زنداں شدن

اخلاق کچھ تو انسان کو فطری طور پر ورثے میں ملتے ہیں اور کچھ تعلیم اور صالح ماحول اور صحبت سے میسر آتے ہیں لیکن اس جدید دور اور جدید تہذیب میں تعلیم، تعلیم نہیں رہی۔ ہماری تعلیم گاہیں دُکانیں ہیں جن میں سوداگری مال کی خرید و فروخت ہوتی ہے یا ایک قسم کے کارخانے ہیں جن میں فرمائشی مال تیار ہوتا ہے۔ ہمارے سکولوں اور کالجوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے اس کی رسائی زیادہ سے زیادہ حافظے یا ذہن تک ہوتی ہے۔ اخلاق، صرف و نحو، منطق یا ریاضیات و تاریخ کی طرح نہیں پڑھائے جا سکتے۔ رہا صالح ماحول اور صحبت ——— قریب قریب سے ناپید ہیں۔ اب ایک صورت یہ ہے کہ اُن بزرگوں اور اولوالعزم ہستیوں کے سوانح حیات اور کارنامے لکھنے پڑھنے اور پڑھانے کا شوق پیدا کیا جائے جنھوں نے اپنی قوم یا مُلک یا بنی نوعِ انسان کی بھلائی کے لیے طرح طرح کی آفتیں اور مصیبتیں اور دُکھ سہے اور اپنے ایسے نقش چھوڑ گئے جو آنے والوں کے لیے ہمیشہ ہدایت و رہنمائی کا کام دیں گے۔ ان قربانیوں، صبر و استقلال اور بے نفسی کے ذکر اذکار سُننے اور پڑھنے والوں کے دلوں پر کچھ نہ کچھ اثر کیے بغیر نہیں رہیں گے۔ (عبدالحق) کی ہستی ایسی ہی تھی:

اُن کی اخلاقی جرأت، آزادیٔ خیال، رواداری، انصاف پسندی، بے تعصبی، فیاضی اور ہمدردی کے ہندو مسلمان سب

۱۔ صفحہ ۲۲۲، ۲۳۵، ۲۳۹ سر سید احمد خاں

۲۔ صفحہ ۲۲۲ سر سید احمد خاں

قابل تھے جس کام کو انھوں نے اپنے ہاتھ میں لیا۔ اُسے کامل خلوص اور تندہی سے انجام دیا۔ ایسے وقت میں جب کہ بے لاگ اور بے ریا کام کرنے والوں کی شدید ضرورت ہے، جب کہ قومی ترقی کے ہر شعبے میں انسانوں کی تلاش ہے، جب کہ کام بہت ہیں اور کام کرنے والے کم، ایک صائب الرائے، معتدل مزاج، بے لاگ اور باخلوص کام کرنے والے کا اُٹھ جانا غضب ہے!—

آدمی کا مرنا کوئی انوکھی بات نہیں۔ موت اٹل ہے اور سب کو آنے والی ہے اور اس لیے کوئی ڈر کی چیز نہیں لیکن ایسی موت جو بے وقت ہو اور خصوصاً جب اس کا وار ایسے شخص پر پڑے جو اپنی خوبیوں اور لیاقت میں عدیم النظیر ہو اور جس کی ذات سے ایسی توقعات ہوں جو اتنی بڑی قوم اور ایسے وسیع ملک میں کسی دوسرے سے پوری ہوتی نظر نہ آتی ہوں۔ اور خاص کر جب کہ یہ سانحہ ایسی قوم میں واقع ہو جو پہلے ہی سے قحط الرجال ہو تو ایسی موت (واقعی) غضب ہے اور قیامت ہے اور اس کا جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے۔

یہی جو اس قوم کے اعضا ہیں جس میں آج کل ایسے لوگ بہت کم پیدا ہوتے ہیں ایسے لوگوں کی بہت قدر کرنی چاہیے جن کا ہونا ہمارے لیے فخر ہے اور جن کے سہارے اور مدد سے قوموں کو ایسی مدد ملتی ہے کہ ایک ایک ان میں سے لاکھوں پر بھاری ہوتا ہے۔ دُنیا میں اکثر ہوا ہے کہ ایک سپاہی کی ہمت سے شکست کھاتے کھاتے فوج فتح پا گئی ہے، ڈوبتے ڈوبتے جہاز صرف ایک شخص کی دانشمندی سے پار اُتر گئے ہیں۔ یہ زمانہ ہمارے لیے بڑا کڑا زمانہ ہے ہمیں ایسے لوگوں کی سخت ضرورت ہے ان کا ہونا ہمارے لیے نعمتِ عظمیٰ اور ان کا مرجانا ہمارے لیے ایک بلائے مبرم ہے ..... اُن کا غم مدتوں ہمارے لیے تازہ رہے گا۔

مرحوم میں اس قدر محاسن اور خوبیاں جمع تھیں کہ آج باوجود تلاش کے کوئی اُن کا جانشین نہیں ملتا۔ لوگ اُنھیں زمانۂ دراز تک یاد رکھیں گے ——— انسان نہیں رہتا لیکن اس کے اعمال رہ جاتے ہیں جو کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتے، یہی اس کی پونجی یہی اس کی آل اولاد اور یہی اس کی کمائی ہے ..... اولاد کس کے نہیں ہوتی اور کون جاندار ہے جو اس پر قادر نہیں، بلکہ جتنے ادنیٰ اور حقیر جانور ہیں اُتنی ہی اُن کے زیادہ اولاد ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض کیڑے ایسے ہیں کہ اُن کے چند گھنٹوں میں ہزاروں لاکھوں بچے پیدا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں لیکن انسان کا نام اُس کے کام سے ہے۔ آج جو ہم مرحوم کو یاد کر رہے ہیں تو کیا اُن کی اولاد، اور مکانات اور جاہ و ثروت کی وجہ سے؟ ——— ہرگز نہیں یہ سب آنی جانی چیزیں ہیں بلکہ اُن کے کیرکٹر اور کام کی وجہ سے۔ اُن کا کیرکٹر اور کام خود ہمیں اُن کی یاد دلا رہا ہے۔ اُن کی بھلائیاں، اُن کے کارنامے اور اُن کے احسانات اُن کی یاد کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ بس یہی ایک چیز ہے جو مرحوم کو زندہ رکھے گی اور یہی ایک چیز ہے جو دُنیا میں اللہ کے نیک بندوں کو زندہ رکھتی ہے۔ میں اُ[illegible]وت کو قومی حادثہ سمجھتا ہوں۔ اُن کے ہونے سے ہمیں بڑا سہارا تھا۔ ہر علمی و ادبی کام میں ہم اُن کا نام سب

ص۹۱ صفحہ ۱۰۰ خواجہ غلام الثقلین
ص۹۲ 〃 ۹۵ مولوی محمد عزیز مرزا
ص۹۳ 〃 ۱۲ سید محمود
ص۹۴ 〃 ۹۵ مولوی محمد عزیز مرزا

ص۹۵ صفحہ ۹۵ مولوی محمد عزیز مرزا
ص۹۶ 〃 ۱ سید محمود
ص۹۷ 〃 ۹۵ مولوی محمد عزیز مرزا
ص۹۸ 〃 ۵۲ مولوی چراغ علی

ص۹۹ صفحہ ۱ سید محمود
ص۱۰۰ 〃 ۹۵ مولوی محمد عزیز مرزا
ص۱۰۱ 〃 ۵۲ مولوی چراغ علی
ص۱۰۲ 〃 ۱۲۲ مرزا وحید الدین سلیم

شریک کرتے تھے۔ اب جو وہ نہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہماری قوت کم ہو گئی ہے۔

مولوی عبدالحق[۱] کی زندگی سے ہمیں بہت سے سبق ملتے ہیں۔ اُن کا اپنے نصب العین پر آخر دم تک قائم رہنا۔ اس کے لیے ہر ممکن ذریعہ کو کام میں لانا۔ مخالف قوتوں کا دلیری سے مقابلہ کرنا۔ محنت و مشقت سے کبھی جی نہ چرانا۔ دن رات کام میں لگے رہنا۔ قناعت اور کفایت کو پاس سے نکلنے دینا خود ایک بڑا کارنامہ ہے۔ ہم میں سے کتنے ہیں جنھوں نے مرحوم کی طرح اپنی ساری عمر علم و ادب کی خدمت میں صرف کر دی ہو۔ اس راہ میں مخدوم بننا آسان ہے مگر خادم ہونا بہت دشوار ہے۔ مرحوم ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے بل بوتے پر کھڑے ہوئے اور اپنی محنت سے دُنیا میں جاہ و ثروت، لیاقت و فضیلت حاصل کی۔ اپنے سہارے آپ کھڑے ہونا خدا کی بڑی نعمت اور بڑے پن کی علامت ہے جو دوسروں کا سہارا تکتا رہتا ہے وہ خود کبھی نہیں بڑھتا اور جو بڑھتا ہے تو جتنا چاہتا ہے اُس سے زیادہ کھوتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُن کی زندگی ایک سبق ہے اُن لوگوں کے لیے جو دُنیا میں بڑھنا اور کچھ کرنا چاہتے ہیں اور اُن کے کارنامے جو اُن ملک کے لیے دلیل راہ کا کام دیں گے۔

یہ[۲] عالی دماغ شخص سرزمین ہندوستان میں ایسے پیدا ہوتے ہیں کہ اُن پر جتنا فخر کریں بجا ہے اور ایسے وقت میں جبکہ موقع بہت نازک ہو چلا تھا۔ غالباً (مولوی عبدالحق) سے بڑھ کر کسی شخص نے کام کو اس طرح بے لوث، بے تعلق اور بے لاگ رہ کر سرانجام نہ دیا ہوگا۔ مرحوم بوجہ اپنی اعلیٰ قابلیت، تجربہ کاری، عالی ظرفی اور راستی و راست بازی کے، ہماری قوم کے بیش قیمت افراد میں سے ہیں۔ قومیں ایسے ہی لوگوں سے بنتی ہیں۔ کاش ہم میں بہت سے عبدالحق ہوتے!!

آج[۳] اُن کی موت پر ایک بڑے شدید قلبی رنج اور افسوس ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُردو علم و ادب کا ایک ستون گر گیا۔ مرحوم ہر اعتبار سے ایک دیو پیکر شخص تھے اُن کے رفقاء اور اُن کے ہم عصر اُن کے سامنے بونے تھے۔ (اُن[۴]) کے انتقال سے اُردو ادب کی صف میں ایک ایسی خالی جگہ ہو گئی ہے جس کا پُر کرنا آسان نہیں۔ (اُن[۵]) کا غم مُدتوں ہمارے لیے تازہ رہے گا۔ اُن[۶] کی زندگی صاف بتاتی ہے کہ شوق اور محنت عجیب چیزیں ہیں جسے ہم کمال کہتے ہیں وہ انھیں دونوں کا خانہ زاد ہے ——

وقت[۷] ایک نعمت ہے اور خدا کی دوسری نعمتوں کی طرح انسان وقت پر بھی اس کی قدر نہیں کرتا اور قدر اُس وقت ہوتی ہے جب کہ وہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ انسان دُنیا میں نہیں رہتا مگر اس کے اعمال رہ جاتے ہیں لیکن کتنے اعمال ایسے ہیں جنھیں بقا ہو؟ جو قدر اور وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہوں؟ اور لوگوں کے دلوں پر قبضہ رکھتے ہوں۔ ۔ ۔ ۔ انسان کی زندگی بہت تھوڑی ہے بہت مشکل ہے کہ وہ اس چند روزہ حیات میں تحصیل بھی کرے، پایۂ تکمیل کو بھی پہنچے اور پھر ایسے کام بھی کرے جنھیں بقائے دوام ہو اور خلق خدا کو اُن سے فائدہ پہنچے۔ ۔ ۔ ۔ مرحوم نے زمانۂ ملازمت اور باقی عمر میں

---

[۱] صفحہ ۲۳۳ سرسید احمد خاں
[۲] ص ۲۲ مولوی چراغ علی
[۳] ص ۳۰ کھردلوں کا دوال۔ نور خاں
[۴] ص ۹۹ مولانا وحیدالدین سلیم
[۵] صفحہ ۱۰۰ مولانا وحیدالدین سلیم
[۶] ص ۲۵ مولوی چراغ علی
[۷] ص ۱۲۳ مولانا وحیدالدین سلیم
[۸] ص ۱۰ سید محمود
[۹] ص ۱۰۷ مولوی سید علی بلگرامی
[۱۰] صفحہ ۱۳ مولوی چراغ علی
[۱۱] ص ۱۱ مولوی چراغ علی
[۱۲] ص ۱۵۵ مولانا محمد علی
[۱۳] ص ۱۲۳ مولانا وحیدالدین سلیم

بہت سے کام ایسے کیے جو دُنیا میں یادگار رہیں گے جن کا اثر دُوسروں کے قلوب اور دماغوں تک پہنچے گا۔ اور یہ اُن کی تحریریں ہیں جو اُن کے قلم سے نکلیں، مُلک میں پھیلیں اور سُورج کی روشنی کی طرح ایک سرے سے دُوسرے سرے تک حیاتِ عالم میں اپنا مُفید کام کرتی رہیں گی اور مرحوم کی یاد کو اُن کے قدر دانوں کے دلوں میں تازہ رکھیں گی۔

جو لوگ[1] یہاں کامیابی اور عزت کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں اُنھیں مولوی (عبدالحق) مرحوم کی مثال پیشِ نظر رکھنی چاہیے اور یہ یاد رکھنا چاہیے کہ زمینِ شور میں قلبہ رانی کا نتیجہ سوائے ندامت کے کچھ نہیں۔ اُنھیں مولوی (عبدالحق) مرحوم کی طرح اُس زرخیز زمین میں تخم ریزی کی کوشش کرنی چاہیے جس کے نتائج اب تک بارور ہیں اور جس کی وجہ سے اُن کا نام ہمیشہ عزت و حُرمت کے ساتھ یاد کیا جائے گا ؎

بارے دُنیا میں رہو، غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو، یاں کہ بہت یاد رہو (بیسمر)

وہ ہم[2] میں نہیں رہے لیکن وہ اپنی زندگی کا ایسا عظیم الشان کارنامہ چھوڑ گئے ہیں، جو ہمارے لیے صحیفۂ ہدایت ہے۔ اُن کی رائے میں کہیں کہیں غلطیاں بھی نظر آئیں گی۔ لیکن اُن کے خلوص و صداقت اور راست کرداری میں مُطلق شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اس[3] میں شبہ نہیں کہ انسان کی اصلی ترقی دماغی قوت پر منحصر ہے۔ دولت اس کی محض معین ہے۔ انسان کی رُوح کو اگر ایک گاڑی تصور کیا جائے تو یہ جوڑی اس کو کھینچنے والی ہے، لیکن اگر اس کی باگ عقل کے ہاتھ میں ہے تو یہ زمین تو کیا فلک الافلاک تک پہنچ جائے گی، لیکن خدانخواستہ اگر اس کی باگ عقل کے ہاتھ سے چھین لی جائے تو وہ پاش پاش ہو جائے گی۔ لیکن ہم اُن کی (آخر) زندگی سے متعلق اس سے زیادہ نہیں کہیں گے کیونکہ اب وہ وہاں ہیں جہاں ہماری آواز نہیں پہنچ سکتی اور جو کچھ اُنھوں نے چھوڑا ہے وہ ایسا کچھ ہے کہ اُس کی نظیر نہیں۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ دُنیا میں نہ کہیں خالص نیکی پائی جاتی ہے اور نہ خالص بدی۔ اسی طرح نہ انسان بے عیب ہوا ہے نہ ہوگا۔ دیکھنا یہ ہے کہ جب کسی شخص میں ایسی خوبیاں ہوں جو عام طور پر دُوسروں میں نہیں پائی جاتیں اور جن کا ہونا عجائبات اا نوادر میں سے ہے تو ایک ایسے شخص کا ہم میں سے اُٹھ جانا کیسے کچھ رنج اور کیسے کچھ اَلم کا باعث نہ ہوگا۔ زمانے کی ترقی کبھی رُکتی نہیں اس کا قدم ہمیشہ آگے پڑتا ہے ممکن ہے ہم میں بہت سے لائق اور فاضل لوگ پیدا ہوں یہ سب کچھ ہوگا مگر (مولوی عبدالحق) کہاں! ـــــ اُن کی باتیں فسانے کے طور پہ رہ جائیں گی اور مدتوں اُن کا ذکر کر کے لوگ اُنھیں یاد کریں گے ؎

دورہا باید کہ تا صاحب دلے پیدا شود
بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

۔۔۔۔۔۔ وہ ہم میں ایسے تھے جیسے پر دنوں میں دیو۔ افسوس ایسی نسیمیں ہم سے مٹتی جاتی ہیں۔ عظیم الشان چیزیں گو

---

[1] صفحہ ۹۴ مولوی چراغ علی [2] صفحہ ۲۵۳ سر سید احمد خاں [3] صفحہ ۹ تا ۱۱ سید محمود

ملاقات سے کیسے ہی ساکت اور صامت ہوں لیکن صرف اُن کے وجود ہی سے دُنیا پر اس قدر اثر پڑتا ہے جو بڑے بڑے کاموں سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ تاروں بھری رات کو جب ہم نیلگوں آسمان پر نظر ڈالتے ہیں جس کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں تو کیا ہمارے دل و دماغ پر کوئی عمدہ اثر نہیں پڑتا؟ — جب ہم سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر اس کی وسیع سطح اور بے چین موجوں کو دیکھتے ہیں تو کیا اس سے قلب پر عجیب کیفیت پیدا نہیں ہوتی؟ یہی حال اُن وسیع النظر عالی دماغ لوگوں کا ہے، گو وہ کچھ نہ کہیں لیکن اُن کا اثر نہایت پر زور اور عجیب و غریب ہوتا ہے۔

آخیر زمانے میں (اُن کے بعض بے تکلف دوست اُنھیں) "ایک شاندار انسانی کھنڈر" کہا کرتے تھے۔ لیکن کیا کھنڈر ہم کو عزیز نہیں ہوتے؟ — کیا کھنڈروں کی وقعت ہمارے دلوں میں نہیں ہوتی؟ — کیا ہم گوارا کر سکتے ہیں کہ کسی زمانے کی وہ زندہ یادگاریں جو زندہ ثبوت ہیں ہماری تہذیب و شائستگی کا، دُنیا سے ملیا میٹ ہو جائیں — ؟ ایک جدید اور نئی عمارت کے خراب ہو جانے اور اس کے ٹوٹ جانے کا اتنا رنج نہ ہوگا جتنا ایک کھنڈر کے مٹ جانے کا۔ لیکن افسوس کہ وہ عالی شان کھنڈر ہماری نظروں سے غائب ہو گیا اور اور گیتی کا نہایت وقیع فرزند زمین کا پیوند ہو گیا اور وہاں جگہ پائی جو اس بزرگ کی سب سے مستحکم اور زندہ یادگار ہے جسے اُس نے اپنے ہاتھوں سے بنایا اور اُسی کی دُھن میں دُنیا سے گزر گیا جہاں اب تک اُس کی رُوح پھر رہی ہوگی۔ یہاں سیاح اور مسافر دُور سے آئیں گے اور دو آنسو بہا جائیں گے!

مرحوم ہماری قدیم تہذیب کا بے مثال نمونہ تھے۔ شرافت اور نیک نفسی اُن پر ختم تھی۔ چہرے سے شرافت ہمدردی اور شفقت ٹپکتی تھی اور دل کو اُن کی طرف کشش ہوتی تھی۔ اُن کے پاس بیٹھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز ہم پر اثر کر رہی ہے۔ اُن کی ذہانت، جودتِ طبع، وسیع النظری اور علم و فضل کو دیکھ کر دل میں عزت و احترام پیدا ہوتا تھا اور جب اُن کی شرافتِ نفس، عالی ظرفی، شفقت دوستی اور خودداری کو دیکھتے تھے تو دل بے اختیار اُن کی طرف کھنچتا تھا اور اُن سے محبت ہونے لگتی تھی۔ ایسے لوگ جن سے ہر شخص حذر کرتا جب اُن سے ملتے تو اُن کے حسنِ سلوک اور محبت کا کلمہ پڑھتے ہوئے جاتے تھے۔ وہ پرلے درجے کے نکتہ چیں جو دوسروں کی عیب گیری کیے بغیر مانتے ہی نہیں اُن کے ڈنک یہاں آکر گر جاتے تھے۔ اخلاق اگر سیکھنے کی چیز ہے تو وہ ایسے ہی پاک نفس بزرگوں کی صحبت میں آ سکتے ہیں ورنہ دُنیا میں پند و نصائح کی کمی نہیں، دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں، کیسا ہی بُرا زمانہ کیوں نہ ہو، دُنیا کبھی اچھوں سے خالی نہیں ہوتی۔ اب بھی بہت سے صاحبِ علم و فضل، باکمال، ذی وجاہت، نیک سیرت اور نیک دل لوگ موجود ہیں۔ مگر افسوس کہ کوئی (عبدالحق) نہیں!!

ے صفحہ ۱۱ سید محمود

ے صفحہ ۱۸۳ حالی
ے ۔ ۱۸۳۰۰۳ ۔

ے صفحہ ۲۰۹ ڈاکٹر بجنوری

اُردو کا قدیم ترین ادب

ڈاکٹر سہیل بخاری

اُردو ادب کے مورخین اپنی بات کی ابتدا حضرت امیر خسرو دہلوی سے کرتے ہیں اور کچھ کہہ مکرنیوں۔ دو سخنوں اور پہیلیوں کا ذکر کرنے کے بعد ایک غزل بھی اُن کے نام سے منسوب کرتے ہیں جس کا مطلع ہے "ز حال مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں"۔ اس کے فوراً بعد وہ دِلّی سے سیکڑوں میل دُور دکن پہنچ کر بیجاپوری شعرا کا کلام سُنانے لگتے ہیں۔ لیکن ان کی اس سلسلہ بندی سے ادب کی تاریخ میں جو جھول پیدا ہو جاتا ہے وہ ایسا نہیں ہے جسے آسانی سے نظر انداز کیا جا سکے۔

حضرت امیر خسرو دہلوی کے فارسی کلام سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اُنھوں نے ہندی زبان میں بھی طبع آزمائی کی تھی لیکن اس بات کی کوئی داخلی یا خارجی شہادت نہیں ملتی کہ وہ جس زبان کو ہندی کہتے ہیں وہ یہی زبان ہے جسے بعد میں زبان اُردو یا زبان اُردوئے معلیٰ کا نام دیا گیا۔ نہ ان کا ہندی کلام ہی کسی مخطوطے یا مطبوعہ کتاب کی صُورت میں ہم تک پہنچ سکا ہے جس سے اُن کی زبان کے متعلق کوئی حتمی فیصلہ کیا جا سکے البتہ ان کا وہ ہندی کلام جس کا اُوپر ذکر کیا گیا روایتاً اُن کے نام سے منسوب چلا آ رہا ہے جس کی حیثیت ابھی تک محض الحاقی ہے۔ جب سے حافظ محمود شیرانی نے اپنی تحقیق کے بعد یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ خالق باری حضرت امیر خسرو کی نہیں بلکہ عالمگیری عہد کے ایک بزرگ خسرو نامی کی تصنیف ہے اس وقت سے حضرت امیر خسرو کا مندرجہ بالا ہندی کلام بھی مشتبہ ہو گیا ہے۔

اس الحاقی کلام کی نوعیت بھی کچھ ایسی ہے جو اس شُبہے کو تقویت بخشتی ہے۔ چنانچہ ان کی مشہور غزل "ز حال مسکیں" کا اگر لسانی تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس کی زبان اُردو نہیں برج بھاشا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد نے اُردو کو برج بھاشا سے مشتق بتایا تھا لیکن یہ بات حافظ محمود شیرانی کی کتاب "پنجاب میں اُردو" کی تصنیف سے پہلے کی ہے۔ اس لحاظ سے ادب اُردو کی تاریخوں میں اس غزل کے تذکرے کا کوئی جواز نہیں ہے اور کہہ مکرنیوں اور پہیلیوں پر ابھی تحقیق کی ضرورت ہے کہ کہیں یہ بھی انھیں بزرگ خسرو کی تصنیف نہ ہوں جنھوں نے خالق باری لکھی ہے۔ البتہ تاریخ ادب میں ان کو اس وقت تک جگہ دی جا سکتی ہے جب تک کہ وہ تحقیق سے کسی غیر کی ثابت نہ ہوں۔

ان مورخینِ اُردو کے پاس جو حضرت امیر خسرو کے بعد تاریخ ادب کا سلسلہ بیجاپوری شعرا کے کلام سے ملاتے ہیں اس بات کا کوئی جواب نہیں ہے کہ اگر اُردو دہلی کی قدیم زبان تھی اور وہاں اس کا اس حد تک چرچا تھا کہ حضرت امیر خسرو جیسے شاعر اس میں پیدا ہوئے تو پھر ان کے بعد اُردو شعر گوئی کی روایت دہلی میں یکایک ختم کیوں ہو گئی۔ متداول کُتب تاریخ میں ہندِ شمالی کی باقاعدہ شاعری دبستان دہلی سے شروع ہوتی ہے جس کی صحیح نمائندگی آرزو، آبرو، مظہر جانجاناں وغیرہ کرتے ہیں لیکن یہ لوگ حضرت امیر خسرو کی وفات کے تین سو سال بعد پیدا ہوتے ہیں۔ جو مورخینِ اُردو تاریخ کے اس طویل خلا کو بیجاپوری شعرا کے کلام سے پُر کرنے کی کوشش کرتے ہیں

یہ نہیں بتلاتے کہ آگرہ اور دلی میں جسے اُردو کی جنم بھوم کہا جاتا ہے حضرت امیر خسرو کے بعد اُردو شاعری کے یکایک سو جانے اور چار پانچ سو سال کے بعد اچانک بیدار ہو جانے کے وجوہ کیا ہیں۔

یہاں اس مسئلے کا یہ پہلو بھی قابلِ غور ہے کہ ہم نہیں ادب بیجاپوری شعرا کے جس کلام کو تاریخِ ادب میں شامل کر رہے ہیں وہ اُردو میں نہیں بیجاپوری زبان میں ہے۔ یہ بات بعض طبائع پر گراں ضرور گزرے گی اور وہ محض سخن پروری یا دُوسری مصلحتوں کی خاطر اس کو تسلیم کرنے سے عاری ہوں گی لیکن کیا کیا جائے کہ حقیقت یہی ہے۔ میں نے ''اُردو نامہ'' کراچی کے اٹھارھویں شمارے میں نہایت تفصیل سے لسانی تجزیہ کر کے اُردو اور دکنی دونوں کے کثیر تعداد اختلافات واضح کر دیے ہیں اور یہ جتا دیا ہے کہ ہم نے تاریخی تسلسل قائم کرنے کی کوشش میں وقت کی کھینچ کر جس مواد سے پاٹنا چاہا ہے وہ اتنا کمزور ہے کہ اس پر سے گزرنا تو درکنار اس پر کھڑا ہونا بھی ناممکن ہے اس لیے اہلِ دہلی کی شعر گوئی کے اس طویل تعطل کی تشریح دکنی شعرا کے کلام سے نہیں ہو سکتی۔

اس مقام پر جس عام غلط فہمی کا اظہار کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ بیجاپوری بولی جس زبان کی قدیم شکل ہے ہماری بول چال اس کا جدید رُوپ ہے یعنی ہماری زبان اور بیجاپوری میں جدید و قدیم کا رشتہ ہے لیکن بیجاپوری کو قدیم کہنے والے شاید اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ بیجاپور میں آج بھی وہی زبان بولی جا رہی ہے جس میں قدیم دکنی شعرا و ادبا نے آج سے چار سو سال پہلے اظہارِ خیال کیا تھا اور جسے ہمارے محققین اُردوئے قدیم کا نام دیتے ہیں۔ آج اُسی زبان میں وہاں لوک گیت گائے جا رہے ہیں اور لوگ اپنے اپنے گھروں اور بازاروں میں اسی بولی سے کام چلا رہے ہیں اس لیے یہ زبان جس قدر قدیم کہلانے کی مستحق ہے اسی قدر اسے جدید بھی کہا جا سکتا ہے۔ دُوسری طرف ہماری زبان (اُردو) جس قدر جدید ہے اسی قدر قدیم بھی ہے بلکہ اس زبان کا سُراغ جو ہم آج کل بول رہے ہیں آج سے چار سو سال نہیں بلکہ چھ سو سال تک بھی مل جاتا ہے جیسا کہ سطورِ آئندہ میں ظاہر ہوگا۔ عجیب بات یہ ہے کہ ایک طرف تو لوگ امیر خسرو کی پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں کو جو قدیم دکنی شاعری سے بھی قدیم تر ہیں اُردو زبان کے اولین نمونے کہتے ہیں اور دُوسری طرف دکنی کو اُردوئے قدیم بھی مانتے جا رہے ہیں حالانکہ ہماری بول چال دکنی کے مقابلے میں امیر خسرو کی مذکورہ بالا تخلیقات سے بہت قریب ہے۔ ایسی صُورت میں دکنی کے بجائے امیر خسرو کی زبان کو اُردوئے قدیم کہنا زیادہ معقول معلوم ہوتا ہے۔

خود دکنی کے بعض شعرا و مصنفین نے بھی اس موقف کی تائید کی ہے کہ دکنی اور اُردو دو مختلف زبانیں ہیں۔ چنانچہ مولوی محمد باقر آگاہ ویلوری نے اپنے رسالے ''من درپن'' (سن تصنیف ۱۲۰۹ھ) میں جو معجزاتِ نبی کریمؐ سے متعلق مفصل معلومات فراہم کرتا ہے اس خیال کو یوں واضح کر دیا ہے۔

اگر جانے میں اُردو کے میں کہتا
کوئی اس کو یہاں کے لوگوں سے نہ پوچھتا

ماہنامہ ''قومی زبان'' کراچی بابت جنوری سن ۱۹۹۴ء کے صفحہ ۱۹ پر اس مقام کی عبارت یہ ہے:

''آگاہ نے اسے آسان دکھنی زبان میں لکھا ہے جسے وہ اُردو نہیں کہتے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے خیال میں دکھنی و اُردو دو جُدا جُدا زبانیں ہیں۔''

حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اُردو ادب کے متعلق ہمارا ایک مخصوص نظریہ قائم ہو گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اُردو صرف اس زبان کو تسلیم کرتے ہیں جو ایرانی لپی میں لکھی جاتی ہے اور ایرانی لپی مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان میں آئی ہے۔ اس لیے اس زبان کا جو ادب مسلمانوں کی آمد سے پہلے دیوناگری لپی میں جمع ہوا اسے ہم اپنے ادب میں شامل نہیں کرتے۔ دوسری طرف ایرانی لپی کا بیجا پوری ادب اُردو ادب سے زیادہ قدیم اور کافی مقدار میں ملتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُردو زبان کو قلم بند کرنے کے لیے ایرانی لپی کا استعمال مسلمانوں کی آمد کے صدہا سال بعد ہوا ہے جبکہ بیجا پور میں مقامی زبان ابتدا ہی سے ایرانی لپی میں منتقل ہو چکی تھی۔ شمالی ہندوستان میں فارسی زبان سن ۱۸۳۲ء تک سرکاری اور دفتری کارروائیوں کا واحد ذریعہ رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا میں فارسی زبان کے مقابلے میں جسے سرکاری پُشت پناہی حاصل تھی اُردو زبان کی طرف لوگوں نے بہت کم توجہ دی اور یُوں اس کا جو تھوڑا بہت سرمایہ جمع بھی ہوا تو وہ انفرادی کوششوں کا نتیجہ تھا لیکن دکن میں بیجا پور کی زبان کو ابتدا ہی سے سرکاری منصب مل گیا تھا اس لیے اسے حکومت اور عوام دونوں کی سرپرستی بیک وقت نصیب ہو گئی تھی۔ غرض لپی کے اس اشتراک نے ہمارے ادب میں ایک غلط فہمی کو جنم دیا اور ہم بیجا پوری ادب کو اُردوئے قدیم کہنے لگے۔

اُردو ادب کا یہ نظریہ جس کی بُنیاد لپی پر قائم کی گئی ہے لسانی اعتبار سے بالکل باطل ہے کیونکہ زبان روح اور لپی اس کا جسم ہوتی ہے اور جس طرح جسم کی تبدیلی سے رُوح کی ماہیت نہیں بدلتی اسی طرح لپی کے فرق سے زبان کی اصلیت میں فرق نہیں آسکتا۔ اس سلسلے میں خود ہمارے خیالات میں ایک عجیب تضاد ملتا ہے کہ ہم نہ صرف اس ایرانی ادب کو جو عربی لپی میں لکھا جا رہا ہے ایرانی تسلیم کرتے ہیں بلکہ اس سرمائے کو بھی ایرانی مانتے ہیں جو ایران میں مسلمانوں کے ورود سے ہزاروں سال پیشتر جمع ہو چکا تھا لیکن جب اُردو ادب کا مسئلہ سامنے آتا ہے تو فوراً اپنا موقف تبدیل کر کے دیوناگری لپی میں جمع ہونے والے اُردو زبان کے ادب کو سنسکرت یا ہندی وغیرہ کہہ کر اپنی تاریخ سے خارج کر دیتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ جس طرح ایران قدیم میں مسلمانوں کے وہاں پہنچنے سے قبل خالص ایرانی ادب کے نمونے ملتے ہیں اسی طرح ہندوستان میں بھی مسلمانوں کی آمد سے پہلے خالص اُردو کے ادب پارے دستیاب ہوتے ہیں جو تاریخ ادب اُردو کی تکمیل کے لیے اسی طرح ضروری ہیں جس طرح قدیم ایرانی نمونے تاریخ ادبیاتِ ایران کا اہم جزو ہیں۔

تاریخ ادب کی اسی کمی کے باعث زبان اُردو کی ابتدا کے بارے میں بھی بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں کیونکہ محققین و مورخین نے تحقیق و تاریخ زبان کی بُنیاد اسی ادب پر قائم کی جو ایرانی لپی میں دستیاب ہوتا ہے چنانچہ اُردو کا آغاز بالعموم شاہجہانی عہد سے کیا جاتا ہے جبکہ اُردوئے معلّیٰ کے علاقے کی نسبت سے اس کا نام زبان اُردو رکھا گیا اور نمونے تو اس کے بھی بعد کے زمانے سے شروع ہوتے ہیں۔ مورخین نے امیر خسرو کو اُردو کا پہلا شاعر ضرور مانا ہے لیکن وہ امیر خسرو کے بعد کے قدمائے دہلی تک ہند شمالی کی اُردو کے نمونے پیش کرنے سے قاصر ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ اس درمیانی عہد کے نمونے دیوناگری لپی میں ملتے ہیں جو تک ان کی نظر نہیں گئی یا اگر ان کی نظر پڑی بھی تو انھوں نے انھیں اس لیے نظر انداز کر دیا کہ وہ صرف ایرانی لپی میں ہی لکھی ہوئی زبان کو اُردو تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں قدیم دیوناگری مخطوطات و مطبوعات کی جستجو از حد ضروری ہے کہ تاریخ ادب کی صحیح تکمیل صرف اسی طرح ممکن ہو سکتی ہے۔

دراصل اُردو اور ہندی ایک ہی زبان کے دو رُوپ ہیں جسے ماہرین علم زبان نے کھڑی بولی کا نام دیا ہے۔ ان کے موجود

دونوں میں دو فرق واضح ہیں۔ ایک لپی اور دوسرا دخیل الفاظ۔ ہندی دیوناگری لپی میں لکھی جاتی ہے اس لیے اس میں سنسکرت الفاظ کی بھرمار لی ہے اور اُردو نے ایرانی لپی میں تحریر ہونے کے باعث بے شمار عربی فارسی الفاظ مستعار لیے ہیں لیکن علم زبان کے لحاظ سے دونوں کے یہ اختلافات قابلِ التفات نہیں کیونکہ ان سے زبان کی بنیادی خصوصیات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس نقطۂ نظر سے ہندی اور اُردو کی تاریخ ایک ہی ہے خاص کر کھڑی بولی کی قدیم تاریخ اُردو زبان کا بھی ایسا ہی اہم حصہ ہے۔ جیسا ہندی زبان کا اور اس کے قدیم ادب میں سنسکرت یا عربی فارسی کے مستعار الفاظ کی موجودگی کے باوجود اسے اُردو نے قدیم ماننے بغیر چارہ نہیں۔

میں نے سطور ذیل میں اسی کھڑی بولی کے کچھ قدیم نمونے پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو ہمارے ادب کے اجنبی نمونے ہیں اور صرف ایسے ٹکڑے منتخب کیے ہیں جن میں سنسکرت الفاظ کم سے کم اور عربی فارسی الفاظ زیادہ سے زیادہ پائے جاتے ہوں۔ اس کے باوجود اگر کہیں سنسکرت الفاظ کی تعداد زیادہ نظر آئے تو اسے نمونوں کی کمی کے بجائے میری تلاش کی کمی سمجھنا چاہیے کیونکہ میں نے کچھ شعرا کا ذکر اس علم کے باوجود کہ وہ کھڑی بولی کے شاعر تھے محض اس وجہ سے نہیں کیا کہ ان کا کلام میرے سامنے نہیں ہے۔ ان کے علاوہ ابھی ایسے بہت سے شاعروں کے نام بھی رہ گئے ہوں گے جن کی دریافت مزید تحقیق کی محتاج ہے۔ چنانچہ جب تک ان تمام شعرا کا مکمل کلام سامنے نہ ہو نہ نمونوں کا قرار واقعی انتخاب ہو سکتا ہے نہ اس ادب پر صحیح تنقید ہی ہو سکتی ہے۔

میر امن نے مقدمہ "باغ و بہار" میں زبان اُردو کی ابتدا عہدِ اکبری سے کی ہے لیکن میں اپنی گفتگو کا آغاز حضرت امیر خسرو کے عہد سے ہی کرتا ہوں جن کو ہمارے مورخین اُردو زبان کا پہلا شاعر مانتے ہیں۔ امیر خسرو کے زمانے میں مہاراشٹر دیس کے ایک نامور درویش گیانیشور نامی گزرے ہیں جو موجودہ پیٹھن (دکن) سے چار کوس پر دریائے گوداوری کے جانب شمال اپنے گاؤں میں سن ۱۲۷۵ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی تصنیفات میں سے آج کل چار گرنتھ ہی ملتے ہیں جن میں بھگوت گیتا کی شرح جو انھوں نے گیانیشوری کے نام سے لکھی تھی بہت مشہور ہوئی۔ ان کے اُردو کلام کا ایک نمونہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

سو ہی کپتا کے ہے کپتا وے نہیں گرو کا بچا
دُنیا تج کر کھاک (خاک) لگائی جا کر بیٹھا بن موں
بھیتر مدرا بھرا کن میں دھیان دھرت ہے کن کن
تیرتھ کرے او مرکھو نی جگ جگت میں ساری
دھن کامن او کھسر تیا گے جوگ کیا یا بھاری
گپت ہونے کر پرگٹ ہوئے گرکل متھرا کاسی
ستہ مد ہونے جی پیان جو نکلے ستیہ لوک کے باسی
شاستروں میں تو نہیں رہا کچھ پیا ان گاین مایا
بھید بدھی کا مارگ چلتا تن کا ٹکڑا کایا
کنڈلی کرن کھوب (خوب) چڑھائے برہم رندھر کو جو دے

چلت ہے پانی کے اُوپر پولت سو ہی ہووے
حکم قدرتی کا گیانیشور کون تن کون اوپر جبانا
سدگرو کی جان کرپا بھئی تان آپ ہی آپ پچھانا

اس نمونے میں کچھ الفاظ سنسکرت کے ہیں کیونکہ دیوناگری لپی کے اشتراک کے باعث ہندوستانی زبانوں میں سنسکرت کے دخیل الفاظ کا پایا جانا فطری ہے۔ ان کے علاوہ چند الفاظ برج بھاشا کے بھی بیساختگی سے نظم ہوگئے ہیں جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ برج بھاشا اور اُردو دونوں زبانوں کے مہاراشٹری گروہ سے تعلق رکھتی ہیں اور اس لیے انھیں مکانی اور زمانی قرب ہمیشہ حاصل رہا ہے۔ دُوسری وجہ یہ بھی ہے کہ گیانیشور ایک بھگت تھے اور بھگتوں کا کلام باغ و بہار زبان میں ملتا ہے۔ بہرحال ان تھوڑے سے لفظوں کو چھوڑ کر پوری نظم میں اُردو کا ٹھاٹھ قائم ہے بلکہ اس میں کچھ فارسی اور عربی کے لفظ بھی موجود ہیں جو اس ابتدائی زمانے میں ہندوستانی زبانوں پر مسلمانوں کے اثرات ثابت کر رہے ہیں۔ اس نظم کا شعرائے بیجاپور کے کلام سے موازنہ کر کے دیکھیے جو گیانیشور کے بعد کے زمانے میں گزرے ہیں اور پھر فیصلہ کیجیے کہ ان میں سے کس کی زبان کو اُردو کہا جا سکتا ہے۔

گیانیشور کی ایک بہن کتا بائی بھی مرہٹی زبان کی شاعرہ تھیں جو ان سے عمر میں چار سال چھوٹی تھیں۔ ان کے کلام میں بھی اُردو زبان کا دخل ملاحظہ فرمائیے۔ نمونہ یہ ہے۔

واہ واہ صاحب جی سدگرو لال گسائیں جی
لول بیچ میں ادلا کالا اونٹھ پیٹھ سون کالا
پیت امنی بھر مرگیجا رس بھونے والا
سہسر دل موں الکھی کھائے آج لون پرمانا
جہاں تہاں سادھو دسو آپ ہی آپ ٹھکانا
سدگرو چیلے دونوں برابر ایک سامون بھائی
ایک سے ایسے درسن پانے مہاراج کتا بائی

اب یہاں سے بھگتوں اور سنتوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ان میں نام دیو کا نام سب سے پہلے آتا ہے جو گیانیشور کے معاصر اور ذات کے درزی تھے۔ ان کے اُردو کلام ملاحظہ کیجیے:

میں اندھلے کی ٹیک تیرا نام کھندکارا (خداوندگار)
میں گریب میں مسکین تیرا نام ہے ادھارا

آج نامے بیٹھل دیکھا مورکھ کو سمجھاؤں رے
پانڈے تری گاتیری لودھے کا کھیت کھاتی تھی

ے کر لیبنا ٹھگی تدی وانگت جاتی تھی
پانڈے تمرا مادھو دیو دھوبے بدچڑھا آوت دیکھا تھا
مودی کے گھر کھانا پکا وا کا لڑکا مارا تھا
پانڈے تمرا رام چند سو بھی آوت دیکھا تھا
راون سیتی سر بر ہوئی گھر کی جوئی گنوائی تھی

نام دیو کے بعد ان سادھوؤں میں کبیر داس کا نام بہت مشہور ہوا۔ یہ قوم کے جلاہے تھے۔ بنارس ان کا مولد اور مگہر (ضلع بستی یو۔ پی) ان کی جائے وفات ہے۔ ان کے عہد کے متعلق محققین میں شدید اختلاف ملتا ہے۔ بہرحال ان کا زمانہ سن ۱۳۹۹ء سے ۱۵۱۸ء مانا جاسکتا ہے کیونکہ یہ سکندر لودھی کے معاصر تھے۔ ان کا نمونۂ کلام یہ ہے:

برہ کی جو ٹھٹ لگی مرے من میں بیدھ کیا تن سارا
اوشدھ مول کچھ نہیں لاگے کیا کرے بید بچارا

ہاڑ جلے جیسے لکڑی کا نڑوہ   کیس جلے جیسے گھاس کا پورہ

جات نہ پوچھو سادھو کی پوچھ لیجئے گیان   مول کرو تروار کا پڑا رہن دو میان

بید کتیب افترا بھائی دل کا فکر نہ جانے   ٹک دم کراری جو کرو حاضر حضور جند لئے

سب آئے اس ایک میں ڈار پات پھل پھول   اب کہو پاچھے کیا رہا گہہ پکڑا جب مول

سم درشٹی ست گرو کیا میٹا بھرم بکار   جاں دیکھو تاں ایک ہی صاحب کا دیدار

رام سمر پچھتائے گا من
پاپی جیئرا لوبھ کرت ہے آج کال اُٹھ جائے گا
لالچ لاگے جنم گنوایا مایا بھرم بھلائے گا
دھن جوبن کا گرب نہ کیجے کاگد جیوں گل جائے گا
جو جم آئے کیس گہہ پٹکے تا دن کچھ نہ بس آئے گا

سمرن بھجن دیا نہیں کبھی تو گر چوٹان کھا ئے گا
دھرم رائے جب لیکھا مانگے کیا مکھ لے کے جائے گا
کہت کبیر سنو رے سنتو سادھ سنگت تر جائے گا

رہنا نہیں دیس برانا ہے
یہ سنسار کاگد کی پڑیا بوند پڑے گل جانا ہے
یہ سنسار کانٹ کی باڑی الجھ پلجھ مر جانا ہے
یہ سنسار جھاڑ اور جھانکڑ آگ لگے بر جانا ہے
کہت کبیر سنو بھئی سادھو ست گرو نام ٹھکانا ہے

من پھولا پھولا پھرے جگت میں کیسا ناتا رے
ماتا کہے یہ پتر ہمارا بہن کہے بر میرا
بھائی کہے یہ بھجا ہماری نار کہے نر میرا
پیٹ پکڑ کے ماتا روئے بانہہ پکڑ کے بھائی
لپٹ جھپٹ کے تریا روئے ہنس اکیلا جائی

ہمن ہیں عشق مستانہ ہمن کو ہوشیاری کیا	رہیں آزاد یا جگ میں ہمن دنیا سے یاری کیا
جو بچھڑے ہیں پیارے سے بھٹکتے در بدر پھرتے	ہمارا یار ہے ہم میں ہمن کو انتظاری کیا
خلق سب نام اپنے کو بہت کر سر پٹکتا ہے	ہمن گرو نام سانچا ہے ہمن دنیا سے یاری کیا
نہ پل بچھڑے پیا ہم سے نہ ہم بچھڑیں پیارے سے	انھیں سے نیہہ لاگی ہے ہمن کو بے قراری کیا
کبیرا عشق کا ماتا دوئی کو دور کر دل سے	جو چلنا راہ نازک ہے ہمن سو بوجھ بھاری کیا

کبیر کے گرو بھائی رے داس کاشی کے ایک چمار خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے باپ نے ان کے سادھو پن سے تنگ آکر گھر سے نکال دیا تھا اس لیے جوتیاں بنا بنا کر اوقات بسر کرتے تھے۔ کبیر داس کے بعد ان کا اتنا اثر ہوا کہ جودھپور کے راٹھور رتن سنگھ کی اکلوتی بیٹی میرا بائی ان کی چیلی ہو گئی تھیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے:۔

نرپت ایک سنگھاسن سویا سپنے بھیا بھکاری — اچھت راج بچھرت دکھ پایا سو گت بھئی ہماری

جل کی بھیت پون کا تھمبا رکت بند کا گارا ۔۔۔ ہاڑ ماس ناڑی کا پنجر پنکھی بسے بچارا

پرانی کیا میرا کیا تیرا ۔۔۔ جیسے ترور پنکھ بسیرا

دکھیا دردوند در آیا ۔۔۔ بہت پیاس جواب نہ پایا

دھرم داس کسوندھن باندھوگڑھ کے بڑے مہاجن تھے۔ ان کے صحیح سن ولادت و وفات کا علم نہیں ہے لیکن کبیر داس کے ہم عصر تھے۔ سن ۱۵۱۸ء میں کبیر کی وفات پر ان کے جانشین ہوئے اور پندرہ بیس سال بعد وفات پائی۔ اُنھوں نے دُور دُور تک یاترا کی تھی متھرا سے واپسی پر ان کی ملاقات کبیر داس سے ہوئی جنھوں نے اُنھیں بھگتی کی طرف مائل کیا۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

ہم ست نام کے بیپاری
کوئی کوئی لادے کانسا پیتل کوئی کوئی لونگ سپاری
ہم تو لادیو نام دھنی کو پورن کھیپ ہماری
پونجی نہ ٹوٹے نفع چوگنا بنج کیا ہم بھاری
ہاٹ جگاتی روک نہ سکے نربھے گیل ہماری
موتی بوند گھٹ ہی میں اپجے سکرت بھرت کٹھاری
نج پد ارتھ لاد چلا ہے دھرما داس بیپاری

گرو نانک کا نام سکھ مت کے بانی کی حیثیت سے کافی مشہور ہے۔ یہ ۱۴۶۹ء میں کلیان چند کھتری کے یہاں پیدا ہوئے جو موضع تلونڈی تحصیل شرقپور ضلع لاہور کے صوبہ رائے بلار پٹھان کے کارکن تھے۔ اُنھوں نے اپنی عمر کے تئیس سال سیر و سیاحت میں گزارے۔ آخر سولہ سال کرتارپور میں گزار کر تقریباً ستر سال کی عمر میں وفات پائی۔ اگرچہ ان کا بیشتر کلام پنجابی زبان میں تھا لیکن کبھی کبھی اُردو میں بھی طبع آزمائی کر لیتے تھے۔ نمونہ یہ ہے:

ٹھاکر کا سیوک آگیاکاری ۔۔۔ ٹھاکر کا سیوک سدا پجاری

ورکر مٹاں بستی گھوڑے بھوڑ روایت دیس گئے ۔۔۔ پیر پیکا مبر سالک صادق چھوڑی دُنیا تھائیں پئے

کوجا بانگ نواج مسقو نیل روپ جواری ۔۔۔ گھر گھر میاں سبھناں جی آں بولی اور تماری
بے تو میر مہی پت صاحب قدرت کون ہماری ۔۔۔ چارے کونٹ سلام کریگے گھر گھر صفت تماری

گھول گیرو رنگ چڑھایا دستر بھیس بھیکاری ــــ کاپڑ پھاڑ بنائی کنتھا جھولی مایا دھاری
گھر گھر مانگے بھگ پر بسے من اندھے پتیاری ــــ بھرم بھلانا سبد نہ چینے جوئے بازی ہاری

انھیں بھگتوں میں پندرھویں صدی عیسوی کے کرشن متی کا بھی نام آتا ہے جو سارنگ گڑھ (پنجاب) کے باشندے تھے اور تجارت کی غرض سے جو مہاراشٹر پہنچے تو وہیں کے ہو رہے۔ یہ مہان بھاو پنتھ کے مبلغ تھے۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے :

جڑ مول بن دیکھا ایک درخت گوزر کا
اس کو انت اُپار گولر لاگے شمار نہیں پھولوں کا
زمیں آسمان برابر دیکھے دودو چندا سورج دیکھے نولاکھ تارے۔
چودھا بھون ساتوں دریا میر و پربت ندی نالے کئی ہزار

بھگتوں کے کلام کے مندرجہ بالا نمونوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس قدیم زمانے بھی ہماری زبان کا رُوپ وُہی تھا جو ہم آج دیکھ رہے ہیں چنانچہ لوگوں نے جو ایک طلسم باندھا ہے کہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں سے صرف اُردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو اپنے رُوپ فلمی تصویروں کی طرح جلد جلد بدلتی رہی ہے وہ ان تحریروں کے پیش نظر یک لخت ٹوٹ جاتا ہے۔ بہرحال سولھویں صدی کے نصف اوّل تک اُردو زبان کے نمونے ہمیں بھگتوں کے یہاں ملتے ہیں۔ اس کے بعد تاریخ ہندوستان میں ایک نیا موڑ آتا ہے اور آگرہ سکندر لودھی کے بعد ایک بار پھر عہد اکبری میں راجدھانی قرار پاتا ہے تو مغل اعظم کے دور کی تمام رعنائیاں ادب و فن کی صورت میں ایک مقام پر جمع ہو جاتی ہیں۔ غالباً آگرے کی اسی چمک دمک کو دیکھ کر میر امّن نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ اُردو زبان کا آغاز اکبر بادشاہ کے زمانے سے ہوا ہے چنانچہ وہ باغ و بہار کے مقدمے میں کہتے ہیں۔

"جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدر دانی اور فیض رسانی اس خاندان کی سُن کر حضور میں آکر جمع ہوئے لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جُدی جُدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین سودا سلف سوال جواب کرتے ایک زبان اُردو کی مقرر ہوئی۔"

حقیقت صرف اتنی ہے کہ عہد اکبری میں اطراف مُلک کے اہلِ کمال آگرے میں سمٹ آئے تھے چنانچہ اس زمانے میں جہاں ادبیات فارسی کو ابوالفضل، فیضی، عرفی وغیرہ سے اور اودھی زبان کو تلسی داس اور ملک محمد جائسی سے اور برج بھاشا کو سُور داس جیسے عظیم شاعروں اور انشا پردازوں سے فروغ ہوا وہاں اُردو زبان کے پودے کو بھی اس وقت کی آب وہوا راس آئی اور اس کے بھی کچھ سرپرست پیدا ہو گئے چنانچہ برج بھاشا میں شعر کہنے والے کبھی کبھی کھڑی بولی یعنی اُردو میں بھی طبع آزمائی کر لیا کرتے تھے۔ یہی حال نثر میں بھی ہے کہ ایک ہی کتاب یا عبارت میں اُردو اور برج بھاشا دونوں شیر و شکر نظر آتی ہیں۔ چونکہ برج بھاشا بھی فرقہ والوں کی مذہبی زبان بن گئی تھی۔ اس لیے ان کی مذہبی کتابوں میں ایسے نمونے ملتے ہیں جن میں برج بھاشا کے ساتھ ساتھ اُردو بھی استعمال کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ اس دور میں جن شاعروں اور نثر نگاروں کی تخلیقات ملتی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو زبان کو مذہب کے علاوہ دُوسرے موضوعات پر اظہار خیال کیلئے بھی استعمال کیا گیا ہے لیکن دیوناگری لپی کے باعث بعض نظموں میں سنسکرت الفاظ کی بھرمار ہے۔

یہاں میں اس عہد کے جن شعرا کا اُردو کلام پیش کرنا چاہتا ہوں ان میں عبدالرحیم خان خاناں کا نام سرفہرست آتا ہے جو عہد اکبری

کے ایک بہت بڑے امیر گزرے ہیں۔ ان کے نام پر آگرے کا ایک محلہ "کٹرہ خانخاناں" آج تک آباد چلا آرہا ہے۔ ان کا سنِ ولادت ۱۵۵۳ء اور سنِ وفات ۱۶۲۵ء ہے۔ یہ بیرم خاں کے بیٹے اور اکبر کے دربار کے نو رتنوں میں سے ہیں۔ اکبر ان کی بہت عزت کرتا تھا۔ عربی فارسی سنسکرت برج بھاشا اور اُردو کے اچھے عالم تھے۔ ان کی محفل میں علما کا ہجوم رہتا تھا۔ جیسے گنگ۔ شریف النفس اور کرشن جی کے معتقد تھے جو ان کی شاعری کا اصلی موضوع ہیں۔ برج بھاشا کے بہت اچھے شاعر ہونے کے باوجود اُردو میں بھی انھوں نے کچھ چھند کہے ہیں جو ان کی کتاب "مدناشٹک" میں پائے جاتے ہیں۔ ایک چھند پیش کیا جاتا ہے۔

کلت لت مالا دا جو حسن جڑا تھا　　　چھل چکھن والا چاندنی میں کھڑا تھا
کمل تنت پیچ میلا پیت سیلا نویلا　　　البیلا البیلا یار میرا اکیلا

پرمانند داس کان کبج برہمن اور قنوج کے باشندے تھے اور ولبھ آچاریہ کے شاگرد تھے۔ ان کا ذکر "چوراسی وشنوؤں کی وارتا" میں ملتا ہے۔ ان کی کھڑی بولی کا چھند ملاحظہ کیجیے۔ کرشن جی کی تعریف میں کہتے ہیں۔

دیکھو ری یہ کیسا بالک رانی جسمت جایا ہے　　　سندر بدن کمل دل لوچن دیکھت چند لجایا ہے
پورن برہم الکھ اپناسی پرگٹ نند گھر آیا ہے　　　پرمانند کرشن من موہن چرن کمل چت لایا ہے

عالم دربارِ اکبری کے ایک مسلمان شاعر تھے جنھوں نے ۹۹۱ھ میں "مادھونل کام کندلا" نامی قصے کو برج بھاشا میں نظم کیا تھا۔ ان کے کلامِ اُردو کا نمونہ ملاحظہ فرمایئے:

غم کے نصیب سے غنی ہے جیسے راج پائے　　　عاشق غریب کو گمان منی ال کیا
ناز سے نواج کے تنک ہی نہال کیا　　　جیونے کی جوک میں جدائی کا زوال کیا
وہ اس روز سے خواب جیسا خاک ہی ہیں　　　خبر نہیں خوفی بیچ تیرا خیال کیا
دل لے جو آئے سو دلا سا بھی پا دے وا تو　　　یار دلدار ایسے بیدل کا حال کیا

اسی زمانے میں سوامی سیپٹ نرنجن نامی ایک اور شاعر ہوئے ہیں جن کے کلامِ اُردو میں برج بھاشا کا پٹ بھی ملا ہوا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

چھن مد چھکا جا کے چھے سے اچپک ہوت　　　اچک چھکا ہے گھوم گھومت خماری کا
نس دن نس دن جب مد آوت ہے　　　تب اچکا دے مد صاحب شماری کا
سیپٹ نرنجن امر مرنے کا ہنس　　　ایک بار بار نام آوے نادو باری کا
ہوں تو متوالا اوچھے مد کا نہ لیں والا　　　پور کر پیالہ گھر رہے نا خماری کا

ایکناتھ سوامی پیتھن (مہاراشٹر) کے ایک سنت اور جناردھن سوامی کے شاگرد تھے۔ انھوں نے شمالی ہندوستان کا بھی دورہ کیا تھا چنانچہ یہ کچھ دن کاشی میں بھی رہے اور وہیں انھوں نے اپنی کچھ کتابیں بھی تصنیف کیں۔ ان کا عہد [illegible] بتایا جاتا ہے۔ ان کی اُردو شاعری کا نمونہ یہ ہے:

اللہ رکھے گا ویسا رہنا　　مولا رکھے گا ویسا رہنا
کوئی دن سر پر چھتر اُڑاوے　　کوئی دن سر پر گھنٹرا چڑھاوے
کوئی دن ترکھٹ اُوپر چڑھاوے　　ماس کھاس چپڑھاوے
کوئی دن شکر دُودھ ملیدا　　کوئی دن اللہ مانگت جیدا
کوئی دن سیوک ہاتھ جوڑ کھڑے　　کوئی دن بھیک نہ آوت ٹکڑے
کوئی دن راجہ بڑا ادھکاری　　ایک دن ہوئے کنگال بھکاری
ایکا جنار دن کرت کرتاری　　غافل کیوں کرتا معذوری

دیو چھنال کا چھنال کا　　کھیل کھلاڑی بانیا
چھند بڑا اسکر کر بانٹا　　جا کر جھروکے میں بیٹھا
بڑا دُھوم کا داتا　　نہیں جات پات کچھ ناتا
ایک ناتھ کا والی　　یا سے کون دیوے گالی

دل کی گانٹھ کھولو　　یارو رام نام بولو
کوئی نہیں آوے ساتھ　　جھنڈے کا ہے کون کرے بات
جورو لڑکے ماں باپ　　سب پیارے ہاتھ
ہتی گھوڑے پالکی لینا　　نہیں آوے ساتھ
دو دن کا بزار یارو　　کا ہے کون کرنا بات
جھوٹی مایا جھوٹی کایا　　جھوٹا سب دن رات
ایکا جنار دن بولے بھائی　　کوئی نہیں آئے ساتھ

حضرت بھولا مولا　　سب دُنیا پالن والا
سب گھر موں سائیں براجے　　کرت ہے بول بالا
غریب نواز میں غریب تیرا　　تیرے چرنن کون رت والا
اپنا سائیں سمجھ کے لینا　　سلیل وہی اللہ
جن رُوپ سے ہے جگت پیدا　　وہی سلال اللہ

جنی جنار دن ایک ناتھ سوامی کے گرو بھائی۔ جنار دن سوامی کے چیلے اور مہاراشٹر کے رہنے والے تھے اور بیجاپور

پر تصنیفات ہیں۔ اُن کی تاریخ وفات سن ۱۶۰۱ء ہے ان کا بھی کچھ کلام اُردو زبان میں ملتا ہے مثلاً

جب تو آیا تب کیا لایا کیا لے جائے گا
کس نے بویا مجو نتھا دھندھا پڑیا پھندا دیکھت کیا ہو اندھا
کہت جنار دن سُن ارے من نہ چھوڑ اس سائیں کے چرن

اس عہد کے سنتوں میں دادو دیال کا نام سب سے نمایاں ہے۔ یہ ۱۵۴۴ء میں احمد آباد (بھارت) کے ایک برہمن گھرانے میں پیدا ہوئے اور ۱۶۰۳ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ہندوستان کا دادو پنتھ انھیں سے چلا ہے۔ جے پوری فوج کے ناگا انھیں کے پنتھ سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ اُردو، برج بھاشا، فارسی، گجراتی، مارواڑی اور مرہٹی کے عالم تھے۔ ان کی زندگی بیشتر راجپوتانے میں گزری ہے اس لیے ان کی زبان پر برج بھاشا اور راجستانی کا زیادہ اثر ہے لیکن کچھ کلام پنجابی اور ریختہ میں بھی موجود ہے۔ ریختے کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔

عشق اللہ کی ذات ہے عشق اللہ کا رنگ — عشق اللہ اوجود ہے عشق اللہ کا رنگ
عاشق معشوق ہو گیا عشق کہاوے سوئے — دادو اس معشوق کا اللہ ہی عاشق ہوئے
سب آیا اس ایک ہی ڈال پات پھل پھول — دادو پیچھے کیا رہا جب نج پکڑا مول
کالا مُنہ سنسار کا نیلے کیے پاؤ — دادو تین طلاق دے بھاویں تیدھر جاؤ
جب سائیں کو سجدہ کیا تب سر دھرا اُتار — یوں دادو جیوت مرے حرص و ہوا کو مار

عہد اکبری کے ایک مشہور شاعر و مصنف گنگ برہم بھٹ نے اُردو نثر میں بھی ایک کتاب "چند چھند ورنن کی مہما" نامی لکھی تھی۔ اس کا نمونہ یہ ہے:

"سدھ شری شری ۱۰۸ شری شری پات ساہی شری دل پت جی اکبر ساہ جی آم کاش (عام خاص) میں تکھت (تخت) اوپر براجمان ہو رہے اور آم کاش بھرنے لگا ہے جس میں تمام امراؤ آئے کرنش (کورنش) بجائے بجائے جوہار کرکے اپنی اپنی بیٹھک پر بیٹھ جایا کریں اپنی اپنی مسل سے۔ جن کی بیٹھک نہیں سو ریشم کے رسے میں ریسم (ریشم) کی لون میں پکڑ پکڑ کے کھڑے تاجیم (تعظیم) میں رہیں۔"

"اتنا سُن کے پات ساہی شری اکبر ساہ جی آد (آدھ) سیر سونا نربرداس چارن کو دیا۔ ان کے ڈیڑھ سیر سونا ہو گیا۔ راس دینچا پورن بھیا۔ آم کاش (عام خاص) برکاس (برخاست) ہوا۔ جس کا سمبت ۱۶۲۷ کا متی چیتر ما سدی ۱۳ گرو وار کے دن پورن بھئے۔"

اکبر کے انتقال پر ہی سولھویں صدی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ۱۶۰۵ء میں سلطنت جہانگیر کو منتقل ہوتی ہے اور پھر ۱۶۲۸ء میں شاہجہاں بادشاہ بن جاتا ہے لیکن آگرہ بدستور پایۂ تخت رہتا ہے یہاں تک کہ ۱۶۴۸ء میں شاہجہاں آگرے سے اُٹھ کر دلی بساتا ہے۔ اس زمانے کی اُردو کا کچھ حال تذکروں اور تاریخوں سے بھی معلوم ہونے لگتا ہے اور پایۂ تخت سے منسلک سمجھنے والوں کے علاوہ اطراف ملک کے مجلّتوں کے یہاں سے بھی اکٹھا کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ نُور جہاں سے بھی مندرجہ ذیل اشعار منسوب کیے جاتے ہیں:

دیں جگہ زخم جفا کو دلِ صد چاک میں ہم ۔ دیکھیں گر کچھ بھی وفا اس بُت بے باک میں ہم
نقش پا کی طرح اے راحتِ جانِ عاشق ۔ تیرے قدموں سے جُدا ہو کے ملے خاک میں ہم

جہانگیر کے بیٹے شہریار کے اُردو کلام کا بھی نمونہ دیکھیے۔

چاند سے چکور ٹلے میگھ سے بھی مور ٹلے ۔ چوری سے چور ٹلے دل سے دلدار جو
روگیوں تے روگ ٹلے بھوگیوں تے بھوگ ٹلے ۔ جوگیوں تے جوگ ٹلے کامیوں تے نار جو
پربت سے میرو ٹلے دھن سے کبیر ٹلے ۔ دل کا بھی پھیر ٹلے ہو بُرا ہزار جو
لیکو (اے) شہریار مانو یہ اعتبار ۔ ٹلے نہیں ہونہار ہووے ہونہار جو

سُندر داس ایک ڈھوسر بنیے پرمانند نامی کے گھر ۱۵۹۶ء میں بمقام دوسہ ریاست جے پور پیدا ہوئے۔ جس وقت دادو دیال دوسہ آئے ہیں اُن کی عمر چھ سال کی تھی۔ یہ اسی وقت سے ان کے چیلے ہو کر ساتھ ساتھ رہنے لگے۔ کاشی میں تیس سال کی عمر تک (۱۹ برس) سنسکرت، ویدانت اور پُران پڑھتے رہے۔ سنسکرت کے علاوہ ہندی، فارسی، گجراتی، مارواڑی وغیرہ زبانیں بھی خوب جانتے تھے۔ [illegible]ء میں ایک اور سادھو کے ساتھ فتح پور (شیخاواٹی) چلے گئے اور وہیں رہ پڑے۔ فتح پور کے نواب الف خان، دولت خان اور طاہر خان سے ان کی اچھی رسم و راہ تھی۔ الف خان بھی بھاشا کے شاعر تھے۔ سندر داس فنِ شاعری کے ماہر تھے۔ اُنھوں نے ویدانت پر اچھے شعر کہے ہیں۔ ان کی مختصر تصنیفات کی تعداد ۴۰ سے اوپر ہے۔ ۱۶۸۹ء میں بمقام سانگانیر (جے پور) انتقال کیا۔ ان کے کلام ریختہ کا نمونہ یہ ہے:

سُندر جو غافل ہوا تو وہ سائیں دُور ۔ جو بندہ حاضر ہوا تو حاضر آن حضور

سُندر اندر پیس کر دل میں غوطہ مار ۔ تو دل ہی میں پائیے سائیں سرجن ہار
سُخن ہمارا مانیے مت کھوجے کہوں اور ۔ سائیں سینے بیچ ہے سندر سدا حضور
سُندر دل کی سیج پر عورت ہے ارواح ۔ اس کو جاگیا چاہیے صاحب بے پرواہ

ملوک داس کڑا ضلع الٰہ آباد کے رہنے والے ۱۵۷۴ء میں سُندر داس کے یہاں پیدا ہوئے جو ذات کے ککڑ کھتری تھے۔ لڑکپن میں کمبل بیچتے گاؤں گاؤں پھرا کرتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد بھگوت گیتا کا ورد شروع کیا۔ دُور دُور تک شہرت پھیلی اور لوگ زیارت کو آنے لگے۔ یہ دراوڑ دیس کے مہاتما بٹھل داس کے چیلے تھے۔ اُنھوں نے ۱۶۸۲ء میں ۱۰۸ سال کی عمر پاکر انتقال کیا ہے۔ کڑا (الٰہ آباد) جے پور۔ گجرات۔ پٹنہ۔ ملتان۔ نیپال۔ کابل۔ مُلتان اور جگناتھ پُوری میں ان کے پنتھ کی خاص گدیاں رہی ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

اجگر کرے نہ چاکری پنچھی کرے نہ کام ۔ داس ملوکا کہہ گئے سب کے داتا رام

تیرا میں دیدار دوانا
گھڑی گھڑی تجھے دیکھا چاہوں سن صاحب رحمانا

ہوا الست خبر نہیں تن کی پیا پریم پیالا
ٹھاڑا ہو دن تو گر گر پڑتا تیرے رنگ متوالا
کہیں ہوک اب قضا نہ کرہوں دل ہی سوں دل لایا
سختے تج بستے ہیں دیکھیا پورا مرشد پایا
جہاں جہاں بیچا پھرے تہاں تہاں پھرے گلے
کہیں ہوک جہاں سنت جن ہنساں دیبا جائے

شواجی کے معاصر تکارام کے ابھنگ بھی اُردو زبان کا اچھا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ ان کے ابھنگوں کی تعداد پانچ چھ ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے۔ یہ مہاراشٹر کے باشندے اور ذات کے شودر تھے۔ سن ۱۶۰۸ء میں پونا کے قریب ایک گاؤں دیہو نامی میں اُن کی پیدائش ہوئی۔ تجارت ان کا ذریعہ معاش تھی۔ ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ ملک میں قحط پڑ گیا اور ساتھ ساتھ ان کے کاروبار میں بھی خسارہ آیا۔ اسی عالم مفلسی و بے کسی میں ان کی بیوی نے فاقوں سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دی تو تکارام کا دل دُنیا سے اُچاٹ ہو گیا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھگت بن گئے۔ شواجی ان پر بڑا مہربان تھا۔ اس نے ایک بار انھیں برہمنوں کے مظالم سے بھی بچایا تھا۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

کیا گاؤں کوئی سُننے والا   دیکھیں تو سب جگ ہے بھولا
کھیلو اپنے رام ہی ساتھ   جیسی ویسی کر رہیں ماست
کہاں سے لاؤں مدھری بانی   ریجھے ایسے لوک پرانی
گردھر لال بھاؤ کا بھوکا   راگ کلا نہیں جانت تکا

سترھویں صدی عیسوی کے وسط میں تاج نامی کوئی مسلمان خاتون بھی گزری ہیں جو کرشن جی کی عقیدت مند تھیں۔ ان کے خاندان اور وطن کے متعلق علم نہیں ہو سکا ہے۔ ان کا کلام رنگیلا اور رسیلا ہے جس میں اُردو کے ساتھ ساتھ پنجابی کے بھی کچھ الفاظ ملتے ہیں۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ ان کا تعلق سرزمین پنجاب سے ہوگا۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

سنو سنو جانی میرے دل کی کہانی   تم دست ہی بکانی بدنامی بھی سہوں گی میں
دیو پوجا ٹھانی میں نماز ہوں بھلانی   تجے کلمہ قرآں سارے گنن گہوں گی میں
سیاہ سلونا سرتاج سر کلے دیے   تیرے نیہ داگ میں نداگ ہو دہوں گی میں
نند کے کمار قربان تانڈی صورت پے   تانڈ نال پیارے ہندوانی ہو رہوں گی میں

چھیل جو چھبیلا سب رنگ میں رنگیلا بڑا   چت کا اڑیلا کہوں دیوتوں سے نیارا ہے
مال گلے سوہے ناک موتی سیت سو ہے   کان موہے ہے من کنڈل مکٹ سیس دھارا ہے
دشٹ جن مارے سنت جن رکھوارے تاج   چت ہت وارے پریم پریت کروارا ہے

نسدھ جو کا پیارا بن گنس کر پھپارا   وہ بندرا بن وارا کرشن صاحب ہمالہے

اسی زمانے میں آگرے کے پنڈت چندر بھان برہمن کا نام بھی سامنے آتا ہے جو دارا شکوہ کے منشی تھے۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی آنجہانی کی تلاش کے مطابق برہمن کی یہ غزل "خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے۔" اُردو کی پہلی غزل شمار کی جاتی ہے۔

۱۶۴۸ء کے آس پاس ایک اور شاعر ونے وجے نامی بھی گزرے ہیں جو سنسکرت کے بہت اچھے عالم تھے۔ ان سے ایک کتاب "ونے ولاس" یادگار ہے۔ ان کا اُردو کلام ملاحظہ کیجیے:

گھوڑا جھوٹھا ہے رے تو مت بھولے اسوارا
توئے مدایہ لاگت پیارا انت ہوئیگا نیارا
چرے چیز اور ڈرے قید سوں وبٹ چلے اٹارا
زین کسے تب سویا چاہے کھانے کو ہشیارا
خوب خزانہ خرچ کھلاو دیو سب نعمت چارا
اسواری کا اوسر آدے گلیا ہوئے گنوارا
چھن تاتا چھن پیاسا ہوئے خزمت کرا ون ہارا
دوڑ دُوڑ جنگل میں ڈارے جھورے دھنی بچارا
کرو چوکڑا چاتر چوکس دیو چابک دو چارا
اس گھوڑے کو ونے سکھاؤ جیون پاؤ بھوپارا

کل پتی مسر آگرے کے رہنے والے اور ذات کے برہمن تھے۔ ان کے والد کا نام پرشرام مسر تھا۔ ان کا سال ولادت ۱۶۲۰ء اور عہد تصنیف ۱۶۶۰ء بتایا جاتا ہے۔ ریاست جے پور کے راجا رام سنگھ کے یہاں رہتے تھے۔ سنسکرت کے اچھے عالم تھے اور فن شعر گوئی میں بڑی بصیرت رکھتے تھے۔ ان کی کھڑی بولی کا چھند ملاحظہ کیجیے:

ہوں میں مشتاق تیری صورت کا نور دیکھ دل بھرپور ہے کہنے جواب سے
مہر کا طالب فقیر ہے مہربان چاتک جیو ن جیوتا ہے سوات والے آب سے
تو تو ہے ایانی یہ خوبی کا خزانہ تسے کھول کیوں نہ دیجے سیر کیجے ثواب سے
دیر کی نہ تاب جان ہوتی ہے کباب 'بول حیاتی کا آب' بولو مہتاب سے

مہاتما ناگری داس ریاست کشن گڑھ (راجپوتانہ) کے راجا، بلبھی فرقے کے گوسوامی رنچھور داس جی کے چیلے اور کرشن جی کے بھگت تھے۔ انھوں نے ۱۶۶۳ء میں برج میں انتقال کیا ہے۔ یہ سنسکرت، فارسی، کھڑی بولی اور ڈنگل کے طالب علم تھے اور گجراتی، پنجابی اور گڑھوالی زبانوں سے بھی واقفیت رکھتے تھے جیسا کہ ان کی تصنیفات سے معلوم ہوتا ہے۔ ان کی کھڑی بولی کا نمونہ یہ ہے:

اس صنم کے مقابل کرنا بیان کیا ہے　　　پھر چشم بد بچاری شاعر زبان کیا ہے

عشق اسی کی جھلک ہے جیوں سورج کی دھوپ　　　جہاں عشق تہاں آپ ہے قادر نادر روپ

آیا عشق لپیٹ میں کھائی چشم چپیٹ　　　سو ہی آیا خلق میں اور بھریں سب پیٹ

[illegible] کے آس پاس بھانسی (یو پی) میں ایک مسلمان شاعر رس رنگ نامی گزرے ہیں۔ یہ بزرگ برج بھاشا اور کھڑی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ ان کی کھڑی بولی کا نمونہ یہ ہے :

تیرے محبوب بانکے نے چشم کی چوٹ ماری ہے　　　کھڑا ہے سامنے ہی میں ذرا نہیں پلک ٹاری ہے
جلایا انھیں نے مجھ کو جھوں یہ گانس ماری ہے　　　تڑپتا کد ہی نہ جیتا بچھوا درد بھاری ہے

بھو دھر داس آگرے کے پاس اور ذات کے جینی ایک شاعر ہوئے ہیں جنھوں نے [illegible] میں جین شتک نامی ایک کتاب بھی تصنیف کی تھی۔ یہ برج بھاشا کے ساتھ ساتھ کھڑی بولی میں بھی شعر کہتے تھے۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے :

جو گی تو بھسم سے تڑا دہ لال کپڑے پہنتا　　　اس رنگ سے محرم نہیں کپڑے رنگے سے کیا ہوا
پوتھی کے پڑھا پنڈتا کھر گر کتھا کہت پھرے　　　نج برہم کو چینا نہیں برہمن ہوا تو کیا ہوا

سینتل ایک مشہور مصنف تھے جو مرادنی شاہ آباد کے قریب کسی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ ان کا عہد [illegible] کے لگ بھگ کہا جاتا ہے۔ انھوں نے ایک پوری کتاب کھڑی بولی میں لکھی ہے جس کے تین حصے ہیں۔ گلزار چمن، آنند چمن اور بہار چمن۔ اس کتاب میں مختلف موضوعات پر ۲۰۵ چھند ہیں۔ سینتل بھاشا، فارسی اور سنسکرت کے علاوہ جوتش کے بھی ماہر تھے۔ ان کا کلام پرجوش اور تشبیہات و استعارات سے مرصع ہے۔ انھوں نے بڑے بڑے قلابے باندھے ہیں اور ندرت مضامین کے ساتھ ساتھ تخیل کی بلند پروازی بھی دکھائی ہے۔ ان کے کلام سے تین نمونے درج کیے جاتے ہیں :

گورے مکھ چند پر پھیر گیا جانی کے بوند پسینے کا
یا کندن کمل کلی اوپر جھمکا ہے رنگ نگینے کا
دیکھے سے ہوش کہاں رہوے جو پڑے رنگ بھی سینے کا
یا لعل بدخشاں پر کھینچا چوکا الماس نگینے کا

ہم خوب طرح سے جان گئے جیسا آنند کا کند کیا
سب رُوپ سیل گن تیج پنج تیرے ہی تن میں بند کیا
تجھ حسن پر بھا کی باتی لے پھر بدھ نے یہ فرفند کیا
چمپک دل سون جوہی نرگس چامی کر چیلا چند کیا

چندن کی چوکی چارپڑی سوتا نعاب گن جٹا ہوا
چھکے کی چمک ادھر بھنسن نقاب داڑم پھٹا ہوا
ایسے میں گرمن سے سیتل اک خیال ٹرا اٹ پڑا ہوا
بھتل نے نجھ نجھ تے اونی گمک اچھلے نٹ کا ناٹا ہوا

اب ہم قدمائے دہلی کے دور میں داخل ہو چکے ہیں اس لیے مزید نمونے پیش کرنے کی حاجت نہیں ہے بلکہ اُردو زبان کے اس قدیم ادب پر ایک سرسری نظر ڈال کر اس کی چند خصوصیات کو واضح کر دینا ضروری ہے۔

(۱) یہ تمام سرمایہ دیوناگری لپی میں لکھا ہوا ملتا ہے جس کے گنجلک حصے مزید تحقیق و تلاش سے صاف ہو سکتے ہیں اور غلطیاں بھی تقابل اور موازنے سے دُور کی جا سکتی ہیں بلکہ مجھے یقین ہے کہ اس طرح ہمیں مندرجہ بالا نمونوں سے بھی بہتر نمونے مل جائیں گے اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ممکن ہے کہ تلاش و جستجو سے ایرانی لپی کے بھی کچھ نمونے دستیاب ہو جائیں لیکن ان کی تعداد نسبتاً بہت کم ہوگی۔

(۲) یہ سرمایہ بیشتر منظومات پر مشتمل ہے جس میں دیسی یعنی پنگل کے عروض سے کام لیا گیا ہے اور اقسام نظم کے نام بھی دیسی ہیں مثلاً دوہا، سوَیا، چوپئی، چھپئی وغیرہ۔ البتہ کہیں کہیں بعض شعرا نے ایرانی اوزان بھی استعمال کیے ہیں جو یقیناً ایرانی ادب کے بڑھتے ہوئے اثرات کا ثبوت دے رہے ہیں۔

(۳) چُونکہ شعرائے مذکورہ بالا میں زیادہ تعداد بھگتوں اور سنتوں کی ہے اس لیے نمونوں کا بیشتر حصہ بھی درویشانہ اور صوفیانہ خیالات سے مملو ہے جس میں طبقاتی امتیاز، رسم پرستی اور نمائشی زہد و اتقا سے بیزاری کا اظہار کیا گیا ہے اور دُنیا کی بے ثباتی کے پیش نظر عمل صالح، مساوات اور انسان دوستی کی تعلیم دی گئی ہے لیکن عام شعرا کے یہاں دُوسرے موضوعات بھی ملتے ہیں جن میں عشق حقیقی کے ساتھ ساتھ عشق مجازی کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے بلکہ کرشن بھگتی کے پردے میں تو شعرا نے حُسن و عشق کی مجلہ واردات کہہ سُنائی ہیں اور ہجر و وصال، سراپا نگاری، معاملہ بندی، درد و غم وغیرہ کے تمام مرقعے کھینچ دیے ہیں۔ تحقیق سے ایسے نمونوں میں بھی کافی اضافہ ہو سکتا ہے۔

(۴) بھگتی [illegible]

ہے کہ یہ مصنفین بھگتی تحریک کے علمبردار تھے جو مختلف علاقوں سے اُٹھے اور جنھوں نے اپنے اپنے عقائد و نظریات کے پرچار کے لیے جگہ جگہ کی یاترائیں کیں اور ہر زبان کی بولیوں کے الفاظ اپنی تبلیغی نظموں میں اس لیے شامل کیے کہ ان کا پیغام عوام کی سمجھ میں آ جائے لیکن عام شعرا کے یہاں برج بھاشا کا اثر زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ دیوناگری لپی میں لکھی جانے والی دُوسری زبانوں کی طرح اس ادب میں بھی سنسکرت کے کافی الفاظ ملتے ہیں جس کا سبب مذہبی وابستگی کے سوا اور کچھ نہیں۔ البتہ عربی، فارسی الفاظ جو اس کے بعض حصّوں میں کم اور بعض شعرا کے یہاں زیادہ نظر آتے ہیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ مُسلمانوں کی زبانوں کا اثر یہاں کے عوام پر ابتدا ہی سے پڑ چلا تھا جو بڑھتے بڑھتے ادیبوں اور انشا پردازوں تک جا پہنچا۔

۵) زبان کی بحث میں ریختے تک سے جاتی ہے۔ "ریختہ" کے لُغوی معنی گری پڑی پریشان چیز کے ہیں۔ فنِ تعمیر کی اصطلاح میں ریختہ گچ کو کہتے ہیں جو پسے ہوئے کنکر اور چونے کے ملانے سے تیار ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستانی اور ایرانی سُروں کو ملا کر جو موسیقی تیار ہوتی ہے اسے بھی ریختہ کہتے ہیں۔ ادب میں ریختہ کا لفظ نظم کے لیے استعمال ہوا ہے جس کی مختلف قسمیں میر تقی میر نے اپنے تذکرے میں تفصیل سے بیان کی ہیں۔ مختلف ادوار کے ریختے دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ یہ لفظ صرف مسلمانوں کی شاعری ہی سے مخصوص نہ تھا بلکہ ریختے تو بہت سے ہندوؤں کے یہاں بھی ملتے ہیں۔ میں نے کبیر داس، رے داس، دادو دیال، غریب داس وغیرہ کے ریختوں کے نمونے دیکھے ہیں جن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ریختے کی تعریف میں لپی یا اوزان کی کوئی پابندی نہیں ہے کیونکہ ریختے دیوناگری لپی میں بھی لکھے گئے ہیں اور پنگل کی بحروں میں بھی۔ البتہ ریختہ دُوسری عام نظموں سے صرف زبان کے معاملے میں مختلف ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے ریختہ اس نظم یا شعر کو کہتے ہیں جس کی زبان اُردو (کھڑی بولی) ہو اور اس میں عربی فارسی کے کچھ الفاظ بھی استعمال کیے گئے ہوں۔ اب اگر اس ادبی یا لسانی اصطلاح کو فنِ تعمیر اور فنِ موسیقی کی اصطلاح سے ملا کر دیکھا جائے تو لفظ ریختہ کے معنی مرکب یا آمیزے کے نکلتے ہیں جس کا فارسی معنی گری پڑی پریشان چیز سے کوئی تعلق نہیں اور اس لیے لفظ ریختہ کو ان معنوں میں خالص دیسی لفظ "ریکھتا" کی تعریف سمجھنا چاہیے۔

اُردو زبان کے مندرجہ بالا نمونوں سے یہ بات بالکل واضح اور صاف ہو جاتی ہے کہ اُردو کا جو قدیم ادب ہماری تاریخوں میں ع ہے اس سے پہلے کا ادب دستیاب ہو سکتا ہے اور ہماری زبان اور ہمارے ادب کی تاریخ میں جو تین سو سال کا خلا ہے اسے با پوری زبان کے ادب سے پُر کرنے کے بجائے خود اُردو زبان کے ادب ہی سے پُر کیا جا سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کام میں محنت تن دہی ر جانفشانی درکار ہے کیونکہ یہ سرمایہ مخطوطات اور مطبوعات کی صورت میں جا بجا بکھرا پڑا ہے لیکن اسے یکجا کرنا ہمارا اور ہمارے ادب کا م فریضہ بھی ہے۔ وما علینا الا البلاغ۔

اس مضمون کی تیاری میں جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے ان کے نام درج ذیل ہیں۔

۱. ہندی ساہتیہ کا وویچناتمک اتہاس مرتبہ سوریہ کانت۔

۲۔ ہندی ساہتیہ کا اتہاس ۔ رام چندر شکل

۳۔ مشر بندھو ونود حصّہ اوّل مرتبہ مشر بندھو

۴۔ ہندی کے مسلمان کوی۔ گنگا پرشاد سنگھ

۵۔ سنت ساہتیہ ۔ بھونیشور ناتھ مسر

۶۔ اشٹ چھاپ ۔ دھیریندر ورما

۷۔ دادو دیال کی بانی مرتبہ پنڈت شری دھرشولال جی

۸۔ مہاتما کبیر۔ ہری نواس دویدی۔

۹۔ گرو گرنتھ صاحب ۔ (گورمکھی)

۱۰۔ تذکرہ جلوۂ خضر حصّہ اوّل۔ صفیر بلگرامی ۔

مشترک الفاظ

رشید حسن خاں

اردو میں "مشترک الفاظ" خاصی تعداد میں ہیں۔ مشترک الفاظ سے وہ لفظ مراد ہیں، جن کی تذکیر و تانیث میں اختلاف ہے۔ یہ اختلاف کئی طرح کا ہے: کچھ لفظ، دلی لکھنؤ کے دبستانی اختلاف کے تحت آتے ہیں، کہ دلی والے مذکر استعمال کرتے ہیں اور لکھنؤ والے مونث، یا اس کے برعکس۔ کچھ لفظوں کی صورت یہ ہے کہ ایک ہی دبستان کے کچھ لوگ مذکر کہتے ہیں، کچھ لوگ مونث۔ یہ بھی ہے کہ ایک ہی اُستاد نے ایک لفظ کو کبھی مذکر نظم کیا، کبھی مونث۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ ایک لفظ ایک زمانے میں مذکر تھا، بالاتفاق؛ رفتہ رفتہ اُس کی تانیث کی طرف رجحان بڑھتا گیا، اور اب وہ بالعموم مونث بولا جاتا ہے۔ لیکن لغات میں یا دوسری متعلقہ کتابوں میں یہ تفصیل موجود نہیں۔

ہمارے یہاں ایک بڑی کمی یہ بھی ہے کہ مختلف لغات میں مختلف قول ملتے ہیں۔ یہ اختلافات کبھی تو اپنے مکتبۂ خیال کی طرفداری کا نتیجہ ہوتے ہیں، اور کبھی عدمِ تحقیق کا۔ معائبِ شعر کے قاعدوں اور تلفظ کے مسائل میں بھی سب سے بڑی دقت یہی ہے کہ عموماً لغات میں نقلِ قول پر بھروسہ کیا گیا ہے۔ بہت سے الفاظ ایسے ملیں گے جن کی تذکیر و تانیث کا تعین شروع میں نہیں ہو سکا۔ استعمال میں دونوں طرح آتے رہے، کچھ دنوں کے بعد کسی نے ایک صورت کو قبول کر لیا، کسی نے دوسری صورت کو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کسی کتاب میں ایک قول کو ترجیح دی گئی، کسی میں دوسرے قول کو جگہ دی گئی۔ مولوی ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب نے اس طرف نہایت خوبی کے ساتھ اشارہ کیا ہے:

"جنس یا تانیث و تذکیر کا اختلاف ہر دور میں رہا ہے۔ اور یہ اختلاف مکان اور زمان دونوں پر مبنی ہے۔ بعض صورتیں ایسی بھی ہیں کہ زمان و مکان کا تفاوت نہیں، پھر بھی اختلاف موجود ہے۔ ایک ہی شاعر ایک لفظ کو کبھی مونث، کبھی مذکر کر جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اردو نے مختلف اور متعدد زبانوں سے لفظ لیے ہیں۔ جب کوئی نیا لفظ آیا، اگر اُس میں اردو کی رو سے کوئی علامت تانیث یا تذکیر کی نہ تھی، تو ایک مدت تک اُس کی جنس معین نہ ہو سکی۔ اور اسی لیے اکثر لفظوں کا فیصلہ آج تک نہ ہو سکا۔ جنس ہی کے معین ہونے پر جمع کی صورت کا انحصار ہوا کرتا ہے۔ اسی لیے اردو میں جنس اور عدد، دونوں سیال حالت میں ہیں۔" (مقدمہ کلیاتِ ولی۔ طبع دوم۔ ص ۴۴)

ایک صورت یہ بھی ہے کہ ایک شاعر نے غلطی سے ایک جگہ کسی لفظ کو رواجِ عام کے خلاف مذکر یا مونث نظم کر دیا۔ اس استعمال کو قبولِ عام حاصل نہیں ہوا، لیکن بعض لغت نویسوں نے اس کو سند کے طور پر قبول کر کے، اُس لفظ کو مختلف فیہ الفاظ میں شامل کر دیا۔ ایسا بھی ہے کہ جن اشعار کو یا کسی ایک شعر کو، کسی لفظ کی تذکیر یا تانیث کے لیے بہ طورِ سند پیش کیا گیا، ان اشعار کو یا اُس شعر کو اصولاً بہ طورِ سند پیش ہی نہیں کیا جا سکتا تھا، محض غلط فہمی کا کرشمہ تھا۔ لیکن اس سے ایک غلط اندراج کا اضافہ ہو گیا اور بعد والوں کے لیے وہ

ایک اختلافی مسئلہ بن گیا۔ ایسے الفاظ کا جائزہ، ایک نہایت دلچسپ اور مفید کام ہوگا۔ ذیل میں ایسے کچھ الفاظ کو ضروری تفصیلات کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ کوشش کی جائے گی کہ اس سلسلے کو جاری رکھا جائے۔ قسطِ اوّل میں ۹ لفظوں کو شامل کیا گیا ہے :

آب، صاد، آغوش، الاپ، ایجاد، املا۔

---

(۱) آب :

یہ لفظ حقیقی معنی کے لحاظ سے، پانی کا مرادف ہے اور بالاتفاق مذکر۔ مجازاً، تاب اور آبداری کے معنی میں بھی مستعمل ہے اور ان معانی میں، مونث ہے۔ اُردو لغات میں بھی اس کو مونث ہی لکھا گیا ہے۔ لیکن جلالؔ نے اپنے رسالۂ تذکیر و تانیث، مفید الشعرا میں اس کو مختلف فیہ الفاظ میں شامل کیا ہے (اگرچہ مونث کو مرجح لکھا ہے) اور سند میں آتشؔ کا ایک شعر اور ایک مصرع، اور بحرؔ کا ایک شعر پیش کیا ہے۔ جلالؔ کی تقلید میں، رشحاتِ صفیرؔ اور ارمغانِ احبابؔ میں بھی اس لفظ کو مختلف فیہ لکھا گیا ہے۔ اور مذکر کی سند میں آتشؔ کا وہی ایک شعر پیش کیا گیا ہے، جس کو جلالؔ نے درج کیا ہے ———— لیکن جلالؔ کا یہ فیصلہ محلِ نظر ہے۔ جلالؔ نے مذکر کی سند میں یہ ذیل شعر پیش کیے ہیں۔ [اُنھوں نے آتشؔ کے دوسرے شعر کا صرف مصرعِ ثانی لکھا ہے۔ مصرعِ اول کا اضافہ کیا گیا ہے] :

۱؎ حکیم سید ضامن علی جلالؔ لکھنوی متوفی ۱۹۰۹ء (تذکرۂ کاملانِ رام پور) کا یہ قابلِ قدر رسالہ پہلی بار ۱۲۹۳ھ میں شائع ہوا تھا۔ اُس وقت اس کا نام کارآمد شعرا تھا۔ جلالؔ نے نظرِ ثانی کے بعد، اس کو مفید الشعرا کے نام سے شائع کیا۔ اس رسالے کے کچھ مندرجات سے اختلاف کیا گیا ہے، لیکن اس کو ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا ہے اور مستند سمجھا گیا ہے۔ جلالؔ کے سب سے بڑے مخالف، مولوی سید ظہیر احسن شوقؔ نیموی نے اس رسالے کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس سے اس کی اہمیت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اُنھوں نے مختلف رسائلِ تذکیر و تانیث کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے : "ان میں مفید الشعرا، جنابِ جلالؔ کی تالیفات سے ہے۔ . . . یہ رسالہ بہ اعتبارِ حجم اگرچہ چھوٹا ہے اور سند کے اشعار بھی بہت کم ہیں۔ مگر الفاظ اس میں سب رسالوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ چونکہ اس کا مولف نامی استاذ لکھنؤ سے ہے اور زبانِ حال لکھی ہے۔ اگرچہ بعض جگہ بمقتضائے بشریت فاحش لغزش بھی ہے، مگر پھر بھی اس کو ترجیح ہے کیونکہ دوسرے رسالوں کی بنا صرف تتبع پر ہے۔ زبانِ قدیم و جدید و شاذ وغیرہ کی کیفیت ان سے ظاہر نہیں ہوتی۔ رشحاتِ صفیرؔ میں اس کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر وہ بات جو مفید الشعرا میں ہے، نہیں۔" (حاشیۂ رسالۂ اصلاح ص ۲۱)

۲؎ شیخ امداد علی بحرؔ لکھنوی، تلمیذِ ناسخؔ (تذکرۂ نادر)۔ "تحقیق الفاظ میں، رشکؔ کے بعد، ناسخؔ کے شاگردوں میں یہی ممتاز تھے" (آبِ بقا ص ۱۴۲)۔ ان کا مطبوعہ دیوان موجود ہے، جس کا نام ریاض البحر ہے۔ قواعدِ زبان و لغت پر مشتمل ایک رسالہ بھی مرتب کیا تھا جس کا مخطوطہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ راقم الحروف نے اس قابلِ قدر رسالے کو، مجلۂ اُردو ادب (علی گڑھ) کے شمارہ ۲؎ ۱۹۶۲ء میں شائع کرا دیا ہے ———— کتابوں میں بحرؔ کا سالِ وفات ۱۳۰۰ھ لکھا ہوا ہے۔ غالباً سب سے پہلے صفیرؔ بلگرامی نے

لٹھے ہی میں یا الٰہی مے کشوں کو موت دے | کیا گھر کی قدر، جب آبِ گہر جاتا رہا (آتش)
جب دیکھتا ہے یار ترے دانت پیستا | ڈوبوں گا میں، ڈبوئے گا آبِ گہر مجھے (")
جب کہ مجھے زندگی مرنا تیرے شمشیرِ یار | اپنے حق میں آبِ حیواں آبِ آہن ہو گیا (بحر)

اس سلسلے میں کئی باتیں قابلِ توجہ ہیں :

(۱) آب، بمعنی تاب و آبداری، مونث ہے۔ لیکن جب یہ مرکب ہو جیسے آبِ گہر، آبِ آہن، آبِ تیغ وغیرہ، اور اس کو مذکر استعمال کیا جائے، تو وہاں درحقیقت آبِ حقیقی سے استعارہ ہوتا ہے۔ لفظ آب کے مجازی معنی (آبداری) مراد نہیں لیے جاتے۔ ایسے مقامات پر آبِ حقیقی کے لوازم مذکور ہوتے ہیں۔ اس لیے ان مرکبات کو لازماً مذکر استعمال کیا جائے گا۔ اس سے مفرد لفظ آب کی تانیث پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ جیسا کہ امیر مینائی نے لکھا ہے :

"شعرا، جب آبِ گہر یا آبِ تیغ کو مذکر باندھتے ہیں، تو وہ آبِ حقیقی سے استعارہ ہوتا ہے۔ اور لوازم آبِ حقیقی کے ثابت کرتے ہیں۔ جیسا کہ بحر کے اس شعر میں، گھٹنوں گھٹنوں یا گلو تک ہونا آبِ حقیقی کے لوازم سے ہے۔ سے ٹوپے کٹواتے ہیں بہرے، بارہ پہرے آبِ تیغ ؎ آج گھٹنوں تک ہوا، کل تا گلو ہو جائے گا۔" (امیر اللغات ص ۱۳)

آتش کے شعرِ ثانی اور بحر کے شعر میں آبِ آہن اور آبِ گہر کی یہی صورت ہے کہ معمول شعرا کے مطابق، دونوں جگہ آبِ حقیقی سے استعارہ کیا گیا ہے اور آبِ حقیقی کے لوازم موجود ہیں۔ اس لیے ان اشعار کو مفرد لفظ آب کی تذکیر کی سند میں کسی طرح نہیں پیش کیا جا سکتا۔

جلوۂ خضر میں اسی سنہ کو لکھا ہے۔ بعد کو اسی کو نقل کیا جاتا رہا۔ امیر مینائی کے ایک شاگرد، مولوی مہدی علی خاں ممتاز رام پوری نے ایک مجموعۂ قطعاتِ تاریخِ وفات مرتب کیا تھا، جس کا مخطوطہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ اس کا نام تاریخِ لطیف ہے۔ اس میں اسیر کا ہوا قطعۂ تاریخِ وفات بھی موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا انتقال ۱۲۹۹ھ میں ہوا تھا۔ اُس قطعے کا شعرِ آخر یہ ہے سے سالِ فکر تاریخِ وفاتش چو اسیر ؎ گفت دل "بحرِ یک موج بگو تر برسید"۔ یہ واضح رہے کہ اسیر کا انتقال ۱۲۹۹ھ میں ہوا ہے۔

(۲) سید فرزند احمد صفیر بلگرامی، متوفی ۱۳۰۹ھ (تلامذۂ غالب) کی معروف تالیف میرے پیشِ نظر اس کا وہ ایڈیشن ہے، جو صفیر کی نظرِ ثانی کے بعد مطبعِ احمدی پٹنہ سے شائع ہوا تھا۔ آئندہ اس کتاب کے لیے صرف لفظ رشحات استعمال کیا جائے گا۔

(۳) مؤلفہ منشی قادر علی صفی پوری، ملازمِ ریاست بھوپال، مطبعِ شاہجہانی بھوپال میں ۱۳۰۱ھ میں چھپا تھا۔ اچھا خاصا رسالہ ہے۔ البتہ تحقیق سے نسبتاً کم کام لیا گیا ہے۔ آئندہ اس کے لیے لفظ ارمغان لکھا جائے گا۔

(۲) آتش کے پہلے شعر میں "آبِ گہر" مذکر اس طرح آیا ہے کہ اس کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہاں اُن سے تسامح ہُوا۔ اور اُنھوں نے بے خیالی میں "آبِ گہر" کو اس طرح نظم کر دیا جیسے آبِ حقیقی سے استعارہ کیا گیا ہو۔ حالانکہ یہاں لفظِ آب مجازی معنی میں آیا ہے۔ اس خیال کی تائید کئی طرح ہوتی ہے:

(الف) آتش کے کلیات میں، زیرِ بحث شعر کے علاوہ، جہاں بھی یہ لفظ بہ ترکیب آیا ہے "آبِ حقیقی" کے لوازم کے ساتھ آیا ہے۔ مثلاً:

کلیاں آبِ گہر کی بھی جو نوشہ کرتے — تیرے دانتوں کی نہ دانتوں میں صفائی ہوتی (کلیات نولکشور پریس ص ۲۲۳)

ہمارے اشک کے قطرے ہیں جام مئے آبِ گوہر سے — بھرا چاہے جو پانی وہ صنم چاہِ زنخداں میں (ص ۱۹۱)

رُوح کو تفریح اُن دانتوں کے دیکھے سے ہوئی — آبِ گوہر سے ہمارا دل کا صنوبر ہو گیا (ص ۹۰)

الٰہی بازوِ قاتل میں زورِ دستِ قدرت دے — روانی ہے اسی کے دم سے آبِ خشکِ خنجر میں (ص ۱۸۹)

(ب) آتش نے مفرد لفظ آب کو (مجازی معنی میں) مذکر نظم نہیں کیا۔ البتہ ایک جگہ مونث ضرور نظم کیا ہے۔ وہ شعر یہ ہے:

جا سے ہر گئے تن اسے کاش میں گردن رکھتا — آب ابرو کے ہر اک بال میں تلوار کی تھی (ص ۲۶۸)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آتش درحقیقت اس کی تانیث کے قائل تھے۔

(ج) آتش اور اُن کے تلامذہ کے یہاں (زیرِ بحث شعر سے قطع نظر کرتے ہوئے) آبِ گہر (موتی کی آب کے معنی میں) کہیں مذکر نظم نہیں ہوا ہے۔ البتہ تانیث کی مثال مل سکتی ہے۔ مثلاً:

چاہیے انسان کو بھی پاسِ حفظِ آبرو — یاد رکھے، جا کے پھر آبِ گہر، ملتی نہیں

رند (دیوان نولکشور پریس ص ۱۰۴)

(د) آتش کے زیرِ بحث شعر کو، مفرد لفظ آب کی تانیث کی سند کے طور پر، جلال اور اُن کی تقلید میں مولفِ ارمغان کے سوا کسی نے تسلیم نہیں کیا۔ نہ "آبِ گہر" کی تانیث کی سند میں قبول کیا بلکہ سب نے یہ صراحت کر دی ہے کہ آتش نے یہ خلافِ جمہور کہا ہے۔ صفیر بلگرامی، جنھوں نے جلال کی تقلید میں اس لفظ کو مختلف فیہ لکھ دیا ہے، لکھتے ہیں:

"یا بعض الفاظ جن میں سب شعرا و فصحا متفق ہیں۔ مگر ایک دو شاعروں نے اُن کے خلاف باندھا۔ تو ہم کو جمہور کی تقلید کرنی ہوگی۔ جیسے آبِ گہر، کہ جو قواعد کی رو سے بھی مونث ہے اور فصحا کا برتاؤ بھی یہی ہے؛ اُس کو آتش مذکر باندھ گئے ہیں۔" (رشحات ص ۳۹)

شوق نیموی نے رسالہ اصلاح میں "آب بمعنی آبداری کو" مونث لکھ کر، لکھا ہے:

ا؎ مولوی سید ظہیر احسن شوق نیموی عظیم آبادی۔ تلمیذ شمشاد لکھنوی۔ اپنے زمانے کے نہایت معروف اہلِ علم میں تھے۔ جلال کے سب سے بڑے حریف تھے۔ کئی رسالے ان کے رد میں لکھے ہیں۔ متوفی ۱۷ رمضان ۱۳۲۲ھ۔ "شوقِ سخنور" مادۂ تاریخِ وفات ہے۔ ان کی مثنوی "سوز و گداز" کے آخر میں قطعاتِ تاریخ بھی شامل ہیں۔ ایک قطعہ میں ان کی تصانیف کے نام بھی ہیں۔ (مثنوی سوز و گداز مطبوعہ

[illegible] جو اس کو مذکر استعمال کیا ہے، وہ جمہور شعرا کے خلاف ہے۔" (ص ۲۱)

یہ درحقیقت ایراد ہے جلال کے اس قول پر کہ یہ لفظ "الفاظ مشترک میں سے ہے" —— اسی ذیل میں شوق نے مزید لکھا ہے: "جہاں جہاں پانی کی رعایت کی گئی ہو، وہاں مذکر بھی استعمال کرنا درست ہے" —— اور مثال میں ناسخ کا ایک مصرع اور تجر کا وہی شعر لکھا ہے، جس کو جلال نے آب بمعنی آبداری کی تذکیر کی سند میں پیش کیا ہے —— یہ بھی درحقیقت ایراد ہے اس پر کہ جلال نے سند میں یہ شعر پیش نہیں کیا اور "لوازمِ آبِ حقیقی" والے مخطے تک اُن کی نظر نہیں پہنچی۔

مؤلف معین الشعرا نے "آب بمعنی آبداری" کو مؤنث لکھ کر حاشیے میں لکھا ہے:

"خلافِ جمہور کے ایک جگہ آتش نے مذکر بھی لکھا ہے۔"

اور آتش کے زیرِ بحث شعر کو درج کیا ہے۔

(د) بحر کا جو شعر جلال نے مذکر کی سند میں درج کیا ہے، جیسا اُوپر لکھا جا چکا ہے، اُس کو لفظ آب کی تذکیر کی سند میں نہیں پیش کیا جا سکتا؛ نہ جلال کے سوا کسی نے اس کو پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں یہ بات خاص طور سے قابلِ ذکر ہے کہ بحر نے ہر جگہ آب (بمعنی آبداری) کو مؤنث ہی نظم کیا ہے۔ اُن کے دیوان میں ایک شعر بھی ایسا نہیں ہے، جس میں یہ لفظ بہ تذکیر آیا ہو۔ مؤنث کی چند اسناد درج کی جاتی ہیں:

جو آب آئنے کی جانے بہ معتقد ہوں	وہ گوہر ہیں جو کسی کی ہیں آبرو لیتے	(ریاض البحر، ص ۲۰۰)
مثالی موتیوں کی آب اس کے دنداں نے	اُڑا دیا ہے، تجھیں نے رنگ لعلوں کا	(ص ۱۴۳)
گرا ان آنسوؤں سے تیرے، زندہ جو نہ پایا سے	ہر ایک قطرے سے موتی کی آب ہو گا	(ص ۲۰)

نیز اُن کے دیوان میں آب گہر یا اس طرح کا کوئی مرکب، جس میں آبِ حقیقی سے استعارہ نہ ہو، بلکہ آبداری کے معنی مراد ہوں، مذکر نظم نہیں ہوا ہے۔

(س) اُردو کے کسی لغت نگار نے لفظ آب بمعنی آبداری کو مذکر نہیں لکھا، سب نے صرف مؤنث لکھا ہے۔ نیز آب گہر، آبِ آہن، آبِ تیغ جیسے مرکبات کو، جن میں آبداری کے معنی ہوں، صرف مؤنث لکھا ہے۔ اسی طرح جن رسائلِ تذکیر و تانیث کا ذکر آ چکا ہے،

ص (بقیہ) انعام پر ہیں، پشنہ [illegible] کا رسالہ اصلاح اس زمانے میں خاصا مقبول ہوا تھا۔ میرے پیشِ نظر وہ ایڈیشن ہے جس کو مولانا حسرت موہانی نے اُردوے معلی گڑھ سے شائع کیا تھا۔ یہ دراصل ان کے دو رسالوں کا مجموعہ ہے۔ ایک فارسی رسالہ اصلاح الاغلاط، جو لغت کے موضوع پر ہے۔ دوسرا اصلاح، جس میں مختلف قواعد زبان درج کیے گئے ہیں۔ کارآمد رسالہ ہے۔

ص۱ مؤلفہ منشی غلام حسین آفاق بنارسی، تلمیذ جلیل مانکپوری۔ متوفی ۹ اکتوبر ۱۹۳۲ء (مقدمۂ معین الشعرا)۔ تذکیر و تانیث کے موضوع پر خاصا سے ضخیم کتاب ہے۔ بلکہ اچھا خاصا لغت ہے۔ اسناد کے ساتھ ساتھ ہر لفظ کے اعداد بھی لکھ دیے ہیں۔ یہ کتاب مؤلف کے انتقال کے بعد صدیقی بکڈپو لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ سالِ طبع درج نہیں۔ سنِ تکمیلِ تالیف ۱۳۵۰ھ ہے۔ اچھی علمی کتاب ہے۔

علاوہ دُوسرے قابلِ ذکر رسائل میں بھی مفرد لفظ آب' یا اس کے مذکورہ مرکبات کو صرف مونث لکھا گیا ہے۔ مثلاً رسالۂ بسیط[1]
یل[2]۔

مختصر یہ کہ مفرد لفظ آب بمعنی تاب و آبداری متفق علیہ مونث ہے۔ اس کے مرکبات' جن میں آب حقیقی سے استعارہ ہو' نے ہیں۔ جن میں آبداری کا مفہوم ہو' وہ مونث آتے ہیں۔ آتش کے ایک شعر کی حیثیت شاذ کی ہے یہ آتش کا تسامح ہے۔ اس شعر کی بنا پر' اس لفظ کو مختلف فیہ الفاظ میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ جلال نے آتش و بحر کے جو دو اور شعر اس کی تذکیر کی پیش کیے ہیں' یہ جلال کا تسامح ہے۔ ان اشعار میں ایسے دُوسرے اشعار کی طرح' آب حقیقی سے استعارہ کیا گیا ہے' اس لیے ب بمعنی آبداری کی بحث میں پیش ہی نہیں کیا جا سکتا۔

:

عربی کے حروفِ تہجی میں چودھواں حرف ہے۔ آنکھوں کو بھی اس سے تشبیہ دیتے ہیں۔ صحیح یا منظور ہونے کی علامت بھی ہے۔ ان معانی میں اس کو مذکر استعمال کیا گیا ہے۔ اسنادِ لغات میں موجود ہیں۔ لیکن ایک غلط فہمی کی بنا پر اس کو بھی مشترک الفاظ میں شامل کر دیا گیا۔ ں اس غلط فہمی کا آغاز کس سے ہوا' البتہ یہ معلوم ہے کہ بیشتر اربابِ لغات و رسائل اس میں مبتلا ہوئے۔ ایک ایسے شعر سے اس کی پر استدلال کیا گیا' جس کو تانیث کی سند میں ہرگز نہیں پیش کیا جا سکتا تھا۔ لیکن "نقل قول" کو کیا کہا جائے' کہ رفتہ رفتہ اس کا یہ ہونا مسلّم ہو گیا۔

جلال نے مفید الشعراء میں اس کو صرف مذکر لکھا ہے اور یہ بالکل صحیح ہے۔ صاحب فرہنگِ آصفیہ نے اس کو" اسم مذکر و مونث" ثال میں مثنوی گلزارِ نسیم کا یہ شعر لکھا ہے :

ساد آنکھوں کی دیکھ کر پسر کی   بینائی کے چشمکے پہ نظر کی

شعر کے نیچے مزید صراحت کی ہے کہ "تانیث کی مثال بھی اسی شعر سے ثابت ہے"۔ ——— مولفین رُشحات و نورُاللغات

یہ رسالہ غیر مطبوعہ ہے۔ اس کا مخطوطہ رضا لائبریری رام پور میں ہے۔ مولفہ آغا محسن علی عرف آغا حجر ہندی لکھنوی' ابن محمد علی خاں ابن نواب شجاع الدولہ (تذکرۂ انتخاب یادگار) یہ دربار رام پور سے متعلق تھے' یہ مخطوطہ' فہرست کتب خانہ کی صراحت کے بموجب' مولف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں الفاظ کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے (۱) مذکر (۲) مونث (۳) مشترک۔ مشترک الفاظ میں اس کی بھی صراحت کر دی گئی ہے کہ مولف کی رائے میں ترجیح کسے ہے۔ رسالے کا سالِ اتمام ۱۲۹۴ھ ہے بعض اعتبارات سے خصوصاً مولف کی شخصیت کے لحاظ سے یہ رسالہ قابلِ ذکر ہے۔ ان کی متعدد تصانیف غیر مطبوعہ کتاب خانۂ رام پور میں محفوظ ہیں۔ ۱۳۱۰ھ میں انتقال ہوا (تاریخ معیت) لکھنؤ میں غفران مآب کے امام باڑے میں قبر ہے (آب بقا)

حافظ جلیل حسن جلیل مانکپوری (تلمیذ و جانشین امیر مینائی) کی تالیف اس کا نام رسالۂ تذکیر و تانیث ہے۔ سالِ ترتیب ۱۳۲۹ھ ہے۔ اختر دکن پریس حیدرآباد میں چھپا تھا۔

وارمتان نے بھی نسیم کے اسی ایک شعر کو تانیث کی سند میں پیش کیا ہے۔ اور اس طرح ان حضرات نے بھی اس لفظ کو مختلف فیہ الفاظ میں شامل کر دیا۔ حالانکہ نسیم کے شعر سے تانیث ثابت نہیں ہوتی۔ اثبات تانیث کے لیے ضروری ہے کہ مصرع کو یوں لکھا جائے کہ صاد آنکھوں کی دیکھ کر پسر کی۔ لیکن یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس مصرع میں "آنکھوں کی" کی جگہ "آنکھوں کے" نہیں ہے؟

قواعد تذکیر و تانیث میں یہ ایک مانا ہوا قاعدہ ہے کہ کوئی ایسا شعر جس میں محض "کی" یا "کے" سے تذکیر و تانیث ظاہر ہوتی ہو اور اس مقام پر غلط الکتابت کا احتمال پیدا ہو سکتا ہو یا اسی قبیل کی اور کوئی محتمل الطرفین صورت ہو، ایسے شعر کو بطور سند پیش نہیں کیا جا سکتا۔ سند کے شعر کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس سے وضاحت اور قطعیت کے ساتھ، تذکیر یا تانیث کا اظہار ہوتا ہو۔ چوں کہ نسیم کے مذکورہ شعر سے اس قطعیت کا اظہار نہیں ہوتا، اس لیے اس شعر کو تانیث کی سند میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔

اس شعر میں میری رائے میں "صاد آنکھوں کے" پڑھنا چاہیے۔ دو وجوہ سے: (۱) "آنکھوں" جمع ہے، تناسب بیان کا تقاضا ہے کہ بیاں اس کی مناسبت کامل کے لحاظ سے مشبہ بہ بھی جمع ہو یعنی مصرع کو یوں پڑھا جائے: ع

صاد آنکھوں کے دیکھ کر پسر کی

(۲) اس وقت تک صاد کی تانیث کی کوئی دوسری سند نہیں پیش کی جا سکی ہے۔ باوصف تلاش، مجھے نظم و نثر میں کہیں بھی یہ لفظ مونث نہیں ملا۔ البتہ مذکر کی بیسیوں مثالیں ہیں۔ ان مثالوں سے بھی "صاد آنکھوں کے" مرجح ہے۔

اب سے پہلے یائے معروف و مجہول کی کتابت میں کوئی امتیاز ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا۔ اسی بنا پر اس زمانے کی کسی تحریر میں اگر کوئی لفظ بیائے معروف یا یائے مجہول لکھا ہوا یا چھپا ہوا ہو، تو اس کتابت کی بنیاد پر اس کی تذکیر و تانیث کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ مثنوی گلزار نسیم کا پہلا اڈیشن ۱۲۶۰ھ میں مطبع حسینی میر حسن رضوی سے شائع ہوا تھا۔ اس میں اس زمانے کے رواج کے مطابق یائے معروف و مجہول کا امتیاز نہیں ہے۔ یہ مصرع اس طرح لکھا ہوا ہے: ع

صاد آنکھوں کی دیکھ کر پسر کی

لطیفہ یہ ہے کہ چکبست نے ۱۹۰۵ء میں اس مثنوی کا جو اڈیشن شائع کیا (جو اس زمانے میں معرکۂ چکبست و شرر کی بنیاد بنا تھا) اس میں بھی "صاد آنکھوں کی" ہے۔ جن لوگوں نے پہلے اڈیشن کو یا نسخۂ چکبست کو دیکھا اور اس بات کو ملحوظ نہیں رکھا کہ یہاں "کی" یا "کے" میں سے کیا مرجح ہو سکتا ہے۔ یا یہ کہ کچھ ہو یا کے، اس سے نہ تانیث پر استدلال کیا جا سکتا ہے نہ تذکیر پر۔ (اس کے لیے دوسرے اساتذہ کا طرز عمل دیکھنا ہوگا) انھوں نے اسے "صاد آنکھوں کی" پڑھا اور اس کی بنیاد پر یہ فرض کر لیا کہ نسیم نے اس لفظ کو مونث نظم کیا ہے ـــــــ شدہ شدہ یہ بات یہاں تک پہنچی کہ جب ایک لغت نویس نے لکھا، دوسروں کے لیے محض اس لغت نویس کا لکھنا، آیت و حدیث ہو گیا۔

مجھے تعجب اس پر ہے کہ صفیر بلگرامی نے رشحات میں اس شعر کو تانیث کی سند میں قبول کر لیا۔ اور اس طرح انھوں نے اس

۱؎ یہ اڈیشن کم یاب ہے۔ رضا لائبریری، رام پور میں اس کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔

لفظ کو مختلف فیہ الفاظ میں شامل کر دیا۔ حالانکہ صفیر نے اس رسالے میں متعدد جگہ یہ صراحت کی ہے کہ جن اشعار میں غلط الکاتب کا احتمال ہو، یا محض "کی" "کے" پر سند کا انحصار، ایسی اسناد کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔ یہی نہیں، اُنھوں نے دُوسروں پر اس سلسلے میں اعتراضات بھی کیے ہیں۔ مثلاً جلال نے مفید الشعرا میں لفظ مُشتری کی تانیث کی سند میں یہ دو شعر لکھے ہیں :

نقد جاں لائی ہے تلے مول نور اُس ماہ سے   مشتری رکھا ہے نام اپنے لیے برجیس کا   (ناسخ)

تیرا غلام کچھ مہ کنعاں فقط نہیں   کہتی ہے مُشتری بھی میں تیری خریدہ ہوں   (")

صفیر نے ان اسناد پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے :

"مولف کہتا ہے کہ کار آمد شعرا کی اِن مثالوں سے مونث ہونا کچھ ضرور نہیں کہ ثابت ہو۔ کیونکہ کتابت کی غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ یعنی نقد جاہ لایا ہے، اور کہتا ہے مُشتری بھی کہہ سکتے ہیں۔"   (رُشحات ص ۴۷)

جلال نے طوطی کی تانیث کی سند میں رشک کا یہ شعر بھی پیش کیا ہے :

طوطی سبزۂ خط صاف یہی کہتی ہے   ہیں وُہی عارضِ آئینۂ جاناں اب تک

صفیر نے اس پر بھی یہی اعتراض کیا ہے :

"اور رشک کے شعر کی سند جو دی گئی، اس کو ماننا مُشکل ہے۔ کیونکہ، طوطی سبزۂ خط صاف یہی کہتا ہے ابھی ہو سکتا ہے۔ از روئے غلطی کتابت یہ مثال کافی نہیں۔ حضرت جلال ایسی ہی مثالیں دیا کرتے ہیں۔"   (رُشحات ص ۴۸)

ایک طرف تو یہ احتیاط کہ، افعال میں بھی غلطی کتابت کے احتمال کی بنا پر اُن کو بطور سند قبول نہ کرنا۔ دُوسری طرف یہ صورت کہ جس سند کی بنا محض "کی" اور "کے" کے فرق پر ہے، اُس کو بے تکلف قبول کر لیا !!

بہر حال، صیاد مذکر ہے۔ جن لوگوں نے گلزارِ نسیم کے زیرِ بحث شعر کی بنا پر مونث فرض کر کے، اس کو مختلف فیہ الفاظ میں شامل کر دیا، اُن سے غلطی ہوئی۔ اس شعر میں "صیاد آنکھوں" کے "مرجّح ہے۔ بالفرض کوئی صاحب مرجّح نہ مانیں، تب بھی اصولاً اس شعر کو تانیث کی سند میں نہیں پیش کیا جا سکتا۔ اور جب تک کوئی مثال تانیث کی نہ ملے۔ اُس وقت تک اس کو مختلف فیہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔

---

۳ - الاپ :

جلال نے مفید الشعرا میں "الاپ" کو مشترک الفاظ میں شامل کیا ہے۔ اِس کی صراحت نہیں کی کہ ترجیح کسے ہے۔ البتہ آغا جو ہندی نے رسالۂ بسیط میں مذکر کو مرجّح لکھا ہے۔ جلال نے مذکر کی سند میں ایک شعر لکھا ہے، اور مونث کے متعلق لکھا ہے کہ اس کی سند کلام اساتذہ میں نہیں ملی۔ ان کی عبارت یہ ہے :

"الاپ مختلف فیہ ہے۔ مذکر و مونث دونوں طرح بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قدرت نے مذکر کہا ہے ؎

ایک ہی پڑھے کے تم مجو تو ہیں یہ سب الاپ   گر صدائے بانگ ہے در نغمۂ ناقوس ہے

اور مونث کی کوئی مثال مؤلف کو کلامِ اساتذہ میں ملی نہیں۔ اقدیا دپڑتا ہے کہ مونث بھی لکھا گیا ہے۔"

جلالؔ نے مذکر کی سند میں جو شعر درج کیا ہے، وہ شاہ قدرت اللہ قدرتؔ دہلوی کا ہے۔ تذکرۂ میر حسن، تذکرۂ ہندی اور سخن شعرا میں یہ انھیں کے نام سے درج ہے۔ یہ ان کی بہت مشہور غزل کا شعر ہے، جس میں وہ معروف ترین قطعہ بھی شامل ہے، جس کا پہلا شعر یہ ہے:

کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے ۔۔۔ کیا ہی مُلکِ روم ہے کیا سرزمینِ روس ہے

ان تذکروں میں زیرِ بحث شعر کا متن مختلف ہے، جو درج ذیل ہے:

ایک ہی پردے کی گر سمجھو تو ہے یہ سب الاپ ۔۔۔ گر صدائے بانگ ہے، ور نغمۂ ناقوس ہے (تذکرۂ میر حسن)

ایک ہی پردے کے یہ سب سمجھیے تو ہیں الاپ ۔۔۔ گر صدائے بانگ ہے، ور نغمۂ ناقوس ہے (تذکرۂ ہندی)

ایک ہی پردے کی گر سمجھو تو یہ ہیں سب الاپ ۔۔۔ گر صدائے چنگ ہے یا نغمۂ ناقوس ہے (سخن شعرا)

تذکرۂ میر حسن کے مطبوعہ نسخے کے ساتھ ساتھ، اس کا ایک قلمی نسخہ (محفوظہ رضا لائبریری رام پور) بھی پیشِ نظر ہے، دونوں میں ایک متن ہے۔ اور اس سے الاپ کی تذکیر کے بجائے، تانیث ظاہر ہوتی ہے۔ اصولاً اس شعر کو سند میں نہیں پیش کیا جا سکتا۔ قدرتؔ کا دیوان ابھی تک نہیں چھپا ہے، سنا ہے پٹنے میں کوئی صاحب اس کو مرتب کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے اس سے کوئی قطعی رائے قائم کرنے میں مدد مل سکے۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ مفید الشعرا، رسالۂ بسیط، اور رشحات میں اس کو مختلف فیہ لکھا گیا ہے۔ جلالؔ نے مذکر کی سند میں قدرتؔ کا شعر پیش کیا ہے، رشحات میں بھی وہ منقول ہے؛ گویا مذکر کی سند میں صرف ایک شعر پیش کیا گیا ہے، جس کو اصولاً پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح اس کی تذکیر جو سند ہے، اور اس اعتبار سے بظاہر محلِ نظر۔

آصفیہ، امیر اللغات، نور اللغات، رسالۂ جلیل اور معین الشعرا میں اس کو صرف مونث لکھا گیا ہے۔ نور اللغات میں تانیث کی سند میں واجد علی شاہ اختر کا یہ شعر لکھا ہوا ہے:

مطربوں پہ کھیلو پڑنے تھا ہیں ۔۔۔ پہنچیں گردوں پہ وہ الاپیں

یہی شعر معین الشعرا میں منقول ہے۔ آصفیہ میں مثنوی میر حسن کا یہ شعر سندِ تانیث میں پیش کیا گیا ہے:

وہ رقص بتاں اور وہ ستھری لاپ ۔۔۔ وہ گوری کی تانیں وہ طبلوں کی تھاپ

یہی شعر امیر اللغات میں ہے۔ مولف بہارِ ہند نے بھی تذکیر و تانیث کی صراحت کے بغیر، اسی شعر کو درج کیا ہے۔ لیکن میر حسن کے اس

۱؎ مولفہ مرزا محمد مرتضیٰ عرف محمد بیگ عاشق لکھنوی، اردو میں سخن آرائیں کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ یہ لغت جولائی ۱۹۲۴ء میں مطبع شرکت جعفری لکھنؤ میں چھپا تھا۔ مرتب کی صراحت کے مطابق اس کو چار جلدوں میں شائع کرنے کا ارادہ تھا، لیکن صرف جلد اول چھپ سکا۔ یہ صرف حرفِ الف پر مشتمل ہے۔ مرتب لکھنؤ کے اربابِ اعتبار میں سے تھے۔ اگر یہ لغت مکمل ہو جاتا تو واقعی کام کا لغت ہوتا۔ بقولِ چکبست: "لکھنؤ کی زبان اور محاوروں کی جتنی تحقیق مرزا صاحب مرحوم کو تھی، اس کا اندازہ ان کی مشہور تالیف 'بہارِ ہند' کے دیکھنے سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ ملک نے اس لغت کی کافی قدر نہ کی، ورنہ اگر اس کے باقی تین حصے بھی چھپ جاتے تو اردو زبان کی اصطلاحوں اور محاوروں کا ایک لاجواب مجموعہ مرتب ہو جاتا۔" (مضامینِ چکبست ص ۲۲۵)

شعر سے تانیث کا ثبوت نہیں ہوتا۔ "مشتری سے الاپ" بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے اس شعر کو تانیث کی سند میں پیش کرنا درست نہیں۔ اختر کے شعر سے یقیناً تانیث ظاہر ہوتی ہے۔ میں فی الوقت یہ کہنے سے قاصر ہوں کہ یہ شعر ان کی کس مثنوی سے ماخوذ ہے اور یہ کہ اصلاً اسی طرح ہے۔ اگر اس شعر کا متن بالکل صحیح ہے اور یہ اختر کا ہے، تو بالیقین اثباتِ تانیث کے لیے کافی ہے ——— لیکن یہ واضح رہے کہ اس سند سے یہ کسی طرح لازم نہیں آتا کہ یہ لفظ صرف مونث ہے۔ جیسے رشک کے اس شعر سے :

وصل کی رات بنا نامۂ شوقِ گیسو   شام لفظیں ہیں، سپیدی ہی آسحر کاغذ کی

(مجموعۂ دواوین رشک، ص ۳۱۴)

یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ "لفظ" صرف مونث ہے۔

ہندی کے متعدد اساتذہ سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ سنسکرت اور ہندی میں الاپ مذکر ہے۔ لغات میں بھی صرف مذکر لکھا ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ ہندی شبد ساگر (شائع کردہ ناگری پرچارنی سبھا) برہت ہندی کوش (شائع گیان منڈل بنارس) سنسکرت شبد ارتھ کوستبھ (مرتبۂ دوارکا پرشاد شرما)۔

یہ لفظ فنِ موسیقی کی ایک اصطلاح ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اس فن سے تعلق رکھنے والے حضرات سے استصواب کیا جائے۔ اس سلسلے میں جناب شاہد احمد دہلوی سے رجوع کیا۔ موصوف اس فن کے قابلِ ذکر جاننے والوں میں سے ہیں۔ شاہد صاحب نے از راہِ التفاتِ خاص ضروری تفصیل سے مطلع کیا۔ موصوف کے مکتوب کا اقتباس درجِ ذیل ہے :

"پیشہ وروں کی زبان پر "الاپ" مذکر ہے اور کتابوں میں بھی، اس لیے میں بھی مذکر ہی بولتا ہوں۔

(۱) معارف النغمات مصنفۂ ٹھاکر نواب علی خاں، جو اردو کی واحد مستند کتاب ہے، اس میں ص ۴۰ پر یہ عبارت درج ہے : "آج کل الاپ بھی، دھرپد کی طرح، چار حصوں پر منقسم کر دیا گیا ہے۔"

(۲) "آجکل" کے موسیقی نمبر مطبوعۂ اگست ۱۹۵۶ء کے ص ۲۶، کالم ۲، سطر ۲ میں کہا گیا ہے کہ "دھرپد کا الاپ یا مین کار کا جوڑ وہ ماحول پیدا کر دیتا ہے جو دوسری گائیکیوں یا باج نے ابھی تک پیدا نہیں کیا ہے" ——— مضمون نگار ہیں استاد رحیم الدین خاں ڈاگر، جن کا کام ہی الاپ کرنا اور دھرپد گانا ہے۔

(۳) کتاب اسرارِ کرامت عرف نغماتِ نعمت، مطبوعہ ۱۸۸۴ء، ص ۸۰، س ۹، "ہر راگ کے الاپ کے واسطے تین سے مقرر کی گئی ہیں" ——— یہ کتاب نعمت اللہ خاں نے لکھی تھی اور اس کی تکمیل ان کے بیٹے کرامت اللہ خاں نے کی تھی۔ نعمت اللہ خاں، دربارِ نیپال کے گائک تھے۔

الاپ مذکر ہی بولا جاتا ہے۔ مگر غیر پیشہ وروں سے مونث بھی سنا ہے۔ لغت میں شاید اسی وجہ سے دونوں طرح درج کر دیا گیا ہو۔"

اس عبارت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ لفظ دونوں طرح مستعمل رہا ہے۔ فنِ موسیقی سے تعلق رکھنے والے بالعموم اس کو مذکر استعمال کرتے رہے ہیں (یہ غالباً ہندی کا اثر ہے) اور دوسرے لوگ بالعموم مونث۔ اسی لیے اکثر اربابِ لغات نے اس

کو صرف مونث لکھا ہے۔

ارمغان میں اوپ کو مذکر لکھ کر سند میں قدرت کا زیر بحث شعر نقل کیا گیا ہے۔ لیکن پہلا مصرع اس طرح لکھا ہوا ہے:

ملک ہی پڑے کی تم مجبور ہیں یہ سب اوپ

اس سے تو تانیث ظاہر ہوتی ہے! یہ تو خیر غلطی کتابت ہو سکتی ہے۔ لیکن واقعی دلچسپ بات یہ ہے کہ جلال نے تو مفید الشعرا میں یہ صراحت نہیں کی تھی کہ قدرت دہلوی ہیں یا لکھنوی۔ مگر مولف ارمغان نے ایجاد بندہ سے کام لے کر انھیں "لکھنوی" بنا دیا۔

مولف آصفیہ نے اوپ کو "غلط العوام" لکھا ہے اور آوپ (بہ الف ممدودہ) کو صحیح لفظ مانا ہے۔ لیکن اس فیصلے میں وہ منفرد ہیں۔ جملہ ارباب لغت اور اساتذہ کا اس پر اتفاق ہے کہ مستعمل عام و خاص اوپ (بغیر مد) ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صاحب آصفیہ نے بغیر غور کیے ہوئے فیلن کی تقلید کی ہے۔ سنسکرت میں آوپ ہے (سنسکرت شبد ارتھ کوستبھ) ہندی میں اوپ ہی مستعمل ہے (ہندی شبد ساگر) متعدد مستشرقین نے اپنے لغات میں اوپ کو "آوپ کی بگڑی ہوئی صورت بتایا ہے" فیلن بھی انھیں میں شامل ہے۔ مولوی صاحب نے اس کا خیال کیے بغیر کہ اردو میں کس طرح مستعمل ہے، اس کے نوشتے کو حرف آخر مان لیا۔

---

۴ آغوش:

جلال نے مفید الشعرا میں لکھا ہے:

"آغوش، بعضوں کے عندیے میں گود کے قیاس پر مونث ہے، حالانکہ بہ قید نظم مذکر پایا جاتا ہے۔"

مذکر کی سند میں آتش و رند کا ایک ایک شعر پیش کیا ہے --- جلال کی عبارت مبہم ہے، حقیقت یہ ہے کہ اساتذۂ دہلی نے اس لفظ کو مونث نظم کیا ہے، اور اساتذۂ لکھنو نے مذکر۔ صرف میر علی اوسط رشک لکھنوی (تلمیذ ناسخ) کا ایک شعر عام طور سے مونث کی سند میں پیش کیا گیا ہے، وہ شعر یہ ہے:

شب فرقت کی آمد پا کے آغوش لحد پھیلی قضا کی مہربانی ہے، اجل سرگرم احساں ہے

(مجموعۂ دواوین رشک ص ۳۰۲)

رشک کے مجموعۂ دواوین میں اور کہیں یہ لفظ اس طرح نظم نہیں ہوا کہ تذکیر یا تانیث کے متعلق کوئی فیصلہ کن بات کہی جا سکے، مثلاً:

منظور الٰہی تھی ہم آغوشی جاناں تب تو مری آغوش تمنا کو بنایا (ص ۸۰)

آغوش زمیں تو ہاتھ آئی گو ہم مردود آسماں ہیں (ص ۲۲۲)

دونوں شعروں میں 'مری' اور 'آئی' کو بیائے مجہول بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ جلال کا یہ لکھنا کہ "بقید نظم مذکر پایا جاتا ہے" صرف اس حد تک صحیح ہے کہ عموماً اساتذۂ لکھنو نے اس کو مذکر نظم کیا ہے۔ لیکن اساتذۂ دہلی نے اس کو مونث باندھا ہے اور اس کی مثالیں عام ہیں۔ یہی صراحت امیر اللغات میں ہے۔ مولف نے لکھا ہے:

"شعرا نے مذکر بھی لکھا ہے اور مونث بھی استعمال کیا ہے، چنانچہ شعروں سے پیدا ہے، مگر مولف کے

نزدیک اس کی مذکر کو ترجیح ہے "۔

صحیح صورتِ حال یہ ہے کہ لکھنؤ سے متعلق حضرات میں سے بیشتر نے اس لفظ کو یا تو صرف مذکر لکھا ہے (رسالۂ بسیط) یا مذکر کو مرجح بتایا ہے (امیر اللغات، مفید الشعرا، معین الشعرا، رسالۂ اصلاح)۔ صفیر نے رشحات میں اس کو مختلف فیہ لکھا ہے لیکن یہ صراحت نہیں کی کہ ترجیح کسے ہے۔ صرف مولفِ نور اللغات نے مونث کو مرجح لکھا ہے۔

دہلی سے متعلق حضرات نے اس کو صرف مونث تسلیم کیا ہے۔ ابتداءً فرہنگ آصفیہ میں آغوش مذکر چھپا ہوا تھا۔ مولفِ اختلاف اللسان؎۱ نے اس سلسلے میں لکھا تھا:

"آغوش۔ لکھنؤ میں مذکر بولا جاتا ہے ...... منشی سید احمد صاحب دہلوی نے فرہنگِ آصفیہ میں آغوش کو مذکر لکھا ہے۔ اس کے متعلق صاحب فصیح اللغات نے شبہ ظاہر کیا ہے کہ یا تو کاتب کی غلطی ہے۔ یا حقیقت میں اہلِ دہلی بھی اس لفظ میں اختلاف رکھتے ہیں۔ حضرت استاد مرحوم (فصیح الملک داغ دہلوی) نے فرہنگِ آصفیہ میں آغوش کو مذکر چھپا دیکھ کر، قافیہ و ردیف کے لحاظ سے یہ لفظ مونث کہا ہے ؎

سُنتا ہی نہیں وُہ بُتِ مے نوش ہماری خالی ہے شبِ وصل بھی آغوش ہماری

اہلِ دہلی آغوش کو عموماً مونث ہی بولتے ہیں۔ فرہنگِ آصفیہ میں جو اس کو مذکر لکھا ہے تو یہ یقیناً کتابت کی غلطی ہے کیونکہ ایسی غلطیاں کتابِ مذکورہ میں اکثر پائی جاتی ہیں۔" (اختلاف اللسان ص ۲)

مولفِ اختلاف اللسان کا خیال صحیح تھا۔ یہ کتابت کی غلطی تھی، کیونکہ اس کے بعد جو باضابطہ اڈیشن شائع ہوئے، ان میں یہ مونث لکھا ہوا؎۲ لیکن اس تبدیلی کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں مولفِ آصفیہ کی دو اور فروگزاشتوں کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا:

(۱) مولفِ آصفیہ نے آغوش کی تانیث کی سند میں دو شعر درج کیے ہیں۔ لیکن ان اشعار سے نہ تانیث ثابت ہوتی ہے نہ تذکیر (یہ اشعار اشاعتِ اوّل میں نہیں تھے) شعر یہ ہیں:

؎۱ مرتبۂ منشی وجاہت حسین وجاہت جھنجھانوی، تلمیذِ داغ، سالِ طباعت ۱۹۰۶ء، مطبوعۂ رفاہِ عام اسٹیم پریس لاہور۔ مولف کے الفاظ میں اس کتاب میں "دہلی اور لکھنؤ کی زبان کے الفاظ اور محاورات کا فرق بیان کیا گیا ہے۔" ۴۸ صفحے کا رسالہ ہے۔ بعض الفاظ سے متعلق طولانی بحثیں بھی شامل ہیں جو اس زمانے میں مختلف رسائل میں شائع ہوئی تھیں۔ ان سے بہت سے اختلافات اور ضروری امور سے متعلق بہت سی کارآمد باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ مولف نے سرورق پر زبانِ دہلی کو "اُردوئے معلّیٰ" اور زبانِ لکھنؤ کو "اُردوئے ...

؎۲ ۱۸۷۸ء میں "ارمغانِ دہلی" کے نام سے اس کا ایک حصہ شائع ہوا تھا۔ ۱۸۸۰ء میں مولف نے چھوٹی تقطیع پر ایک رسالہ نکالنا شروع کیا، جس میں اجزائے لغت شائع ہوتے تھے۔ ۱۹۰۱ء میں فرہنگِ آصفیہ کی چوتھی جلد شائع ہوئی۔ تیسری جلد ۱۸۹۸ء میں چھپ چکی تھی۔ اس وقت مولف نے ان ماہانہ رسالوں کے اجزا کے مجموعے کو جلد اوّل و دوم قرار دیا۔ پھر ۱۹۰۸ء پہلی جلد بڑی تقطیع پر باضابطہ شائع ہوئی۔ دوسری بار یہ ۱۹۱۸ء میں چھپی۔

کروٹ بھی نہ لی راحتِ آغوشِ لحد میں بندہ مگر کے جھکے ہی بسے بستر ایسے (تسلیم دہلوی)

مجھ میں اس میں ربط جھگڑا یا بنگ ہو گئی آغوش میں جیسے گیند اس کا رہا (ذوق)

(۲) "آغوش کھول کر دینا" کی سند میں نقش لکھنوی کا یہ شعر لکھا ہے:

ہو گئی بے فتنہ ار تیشہ مرج دوڑی آغوش کھول کر عمر مرج

صاف ظاہر ہے کہ یہ شعر "آغوش کھول کر دینا" کی سند نہیں ہو سکتا۔ امیر اللغات و نور اللغات میں "آغوش کھول کر دینا" درج نہیں ہاں "آغوش کھول کر لپٹنا" ضرور درج ہے اور سند میں ناسخ کا یہ شعر لکھا ہوا ہے:

بسانِ ساحلِ دریا ہو مشکل چھوٹنا تا صبح لپٹ جاؤں اگر میں کھول کر آغوش، جاناں سے

امیر اللغات میں "آغوش سے نکلنا" کی سند میں داغ کا ایک شعر درج کیا گیا ہے، جس میں کاتب صاحب نے یائے معروف کی جگہ، یائے مجہول لکھ دی ہے۔ جس سے تانیث، تذکیر سے بدل گئی ہے۔ شعر یہ ہے:

جس طرح تو مرے آغوش سے نکلا اے شوخ یوں ہی ہاتھوں سے نکلتی ہے طبیعت میری

"مری آغوش" ہونا چاہیے۔

۵۔ ایجاد:

لفظ ایجاد کی داستان خاصی دلچسپ ہے۔ اساتذۂ دہلی و لکھنؤ نے بالعموم اس لفظ کو بالاتفاق مذکر استعمال کیا ہے، لیکن متعدد تصریحات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اس کی تانیث کے بھی قائل رہے ہیں، اگرچہ تانیث کی کوئی مثال پیش نہیں کی جا سکتی ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں گفتگو میں یہ تانیث رائج ہو گا، چونکہ اساتذہ بالاتفاق اس کو مذکر مانتے رہے ہیں، اس لیے تذکیر نظم کرنے کی جرأت نہیں کی گئی۔ اس سے زیادہ دلچسپ صورتِ حال یہ ہے کہ جس لفظ کو دونوں دبستانوں کے اساتذہ بالاتفاق مذکر مانتے ہیں، رفتہ رفتہ اس کی تانیث کی طرف رجحان بڑھتا گیا، یہاں تک کہ آج کل عام طور سے اس کو مونث استعمال کیا جاتا ہے۔

مفید الشعرا، آصفیہ، امیر اللغات اور ارمغان میں ایجاد کو صرف مذکر لکھا گیا ہے۔ اختلاف کا مطلق ذکر نہیں۔ صفیر نے رشحات میں اس کو مذکر لکھ کر، مزید صراحت کی ہے: "مولف کہتا ہے کہ ایجاد جو مونث مشہور ہے، اس کی سند مجھے ابھی تک نہیں ملی" (ص ۱۵۱) آگے چل کر مزید لکھا ہے: "عوام میں ایجاد کا لفظ مونث مستعمل ہے، حالانکہ مذکر ہے۔" (ص ۲۲۲) مولف نور اللغات نے بھی اس کو مذکر لکھا

---

(۱) مولف مصباح الشعرا نے ایجاد کو مذکر لکھ کر، حاشیے میں یہ صراحت کی ہے کہ منشی امیر اللہ تسلیم نے اسے مونث بھی نظم کیا ہے اور سند میں تسلیم کا یہ شعر لکھا ہے: رشکِ عدو سے کیا تسلیمِ خستہ کو شہید ٭ دیکھیے ایجاد اس ترکِ ستم ایجاد کی۔ لیکن مولف کا یہ خیال صحیح نہیں۔ مخدومی مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی کے مکتوب سے معلوم ہوا کہ اس غزل کی ردیف "کی" کے بجائے "کا" ہے۔ یعنی دوسرا مصرع در حقیقت اس طرح ہے: دیکھیے ایجاد اس ترکِ ستم ایجاد کا۔ تسلیم کی یہ غزل ان کے دیوان موسوم بہ نظمِ دل افروز میں ص ۳۰۹ پر ہے۔

ے، وحیدت یہ صراحت کر دی ہے کہ " بعض عورات کی زبان پر یہ لفظ مونث ہے۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ رشحات کی تحریر
کے برعکس، بعض خواص بھی اس کو گفتگو میں مونث استعمال کرتے تھے۔

امیر مینائی نے امیر اللغات میں تو اختلاف کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا، البتہ ایک خط میں اس کی صراحت کی ہے:

"ایجاد مذکر ہے۔ اس لفظ کی تانیث و تذکیر میں بحث چھڑی ہوئی ہے . . . . . سُنا جاتا ہے کہ نواب مرزا خاں
صاحب داغ کا قول ہے کہ دلی میں مونث ہے۔ مگر کلام میں مونث کا پتا نہیں چلتا۔ اگر ایک معتبر شاعر نے بھی
مونث کہا ہوتا، تو کہا جاتا کہ مختلف فیہ ہے۔ اور بغیر کلام میں آئے ہوئے، کہیں کہیں بول چال میں ہونا،
کافی نہیں۔" (مکاتیب امیر مینائی ص ۱۴۲)

ان تصریحات سے یہ بہ طور ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تانیث بھی معرضِ بحث میں رہی ہے۔ یہاں پہلے اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ امیر نے 'داغ' سے
جو قول منسوب کیا ہے، وہ صحیح نہیں۔ معلوم نے امیر کو یہ غلط اطلاع کہاں سے ملی، جس کو انھوں نے مان بھی لیا۔ داغ قطعیت کے ساتھ اس کی تذکیر
کے قائل تھے۔ انھوں نے اپنے شاگرد مولانا احسن مارہروی کو ایک خط میں لکھا ہے:

"ایک اشتہار اس گلدستے میں آپ چھاپ دیجیے کہ اکثر اُستاد کے شاگرد، بجائے خود استاد بن کر، اپنی غزلیں
بے اصلاح چھپوا دیتے ہیں، اس میں غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ کسی نے لفظ ایجاد اور ارشاد کو مونث باندھا،
حالانکہ اہلِ دہلی کی زبان پر دونوں لفظ مذکر ہیں۔" (انشاے داغ ص ۱۳۳)

مختصر یہ کہ ایجاد کو اساتذۂ دہلی و لکھنؤ بالاتفاق مذکر مانتے آئے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کی تانیث کی طرف رُجحان بڑھتا گیا۔ اس سلسلے میں داغ
کے شاگردِ رشید مولانا احسن مارہروی کے دو اقتباسات قابلِ توجہ ہیں، جن سے اس رُجحان کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے:

احسن صاحب نے، داغ کے خط کے جواب میں لکھا ہے:

"میری غزل میں ایجاد کہیں مونث نہیں ہے اور نہ میں نے لکھا۔ غالباً حضور نے ملاحظہ نہیں فرمایا۔ میاں
احسن شاہجہاں پوری نے مونث لکھا ہے، جس کی اگلے پرچے میں تصحیح ہو جائے گی۔ مولوی عبدالحی بیخود نے
ایجاد کو مونث لکھا ہے۔ خدا جانے کیا بات ہے کہ ایسے کہنہ مشق بھی، ایسی فاش غلطیاں کرتے ہیں۔"

یہی مولانا احسن، ایک زمانے کے بعد، اپنی کتاب تاریخ نثرِ اردو میں لکھتے ہیں:

"لفظ ایجاد، کہ اس کو تمام باکثرت شعرائے دہلی و لکھنؤ نے مذکر استعمال کیا ہے۔ لیکن اب چند شعرا کے
سوا، اس کی تذکیر پر ہر شخص کو تامل ہے۔ یہی حال لفظ فہم وغیرہ کا ہے۔" (ص ۳۵۸)

جناب اثر لکھنوی نے میرے استفسار کے جواب میں لکھا ہے:

"ایجاد اور اپیل میری زبان پر مونث ہیں، مگر اس کے برخلاف بھی سُنا ہے۔ مذکر و تانیث کے لحاظ
سے مختلف فیہ کہنا مناسب ہوگا۔" (مکتوب اثر بنام راقم الحروف)

میں نے بالعموم اس کو مونث سنا ہے اور آج کل کی تحریروں میں بھی مونث دیکھا ہے۔ مثلاً: زبانوں کا سیکھنا سکھانا، جدید زمانے کی ایجاد

ہے۔" عبدالحق صاحب (قواعدِ اُردو ص ۳) "امریکہ کی ایک نئی ایجاد" سب کہتے ہیں۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ "امریکہ کا ایک نیا ایجاد" چونکہ اس کو اساتذہ نے مذکر استعمال کیا ہے اس لحاظ سے اس کو مشترک الفاظ میں شامل سمجھنا چاہیے لیکن اس صراحت کے ساتھ کہ آج کل یہ عام طور سے مونث استعمال کیا جاتا ہے۔

---

۶ - املا :

جلالؔ نے مفید الشعرا میں اس کو مختلف فیہ لکھا ہے :

"املا مختلف فیہ ہے یعنی مذکر و مونث دونوں طرح بولا جاتا ہے لیکن مذکر بیشتر اور مونث کم تر۔ جیسا کہ رشکؔ مغفور مونث فرماتے ہیں ؎

نامۂ جاناں ہے کیا لکھا مری تقدیر کا ۔۔۔ خط کی انشا اور ہے لکھنے کی املا اور ہے

اور مولف اس کی تذکیر ہی کا قائل ہے۔"

رشکؔ کے دونوں مطبوعہ دواوین میں یہ لفظ اور کہیں اس طرح نہیں آیا ہے کہ تذکیر یا تانیث کے متعلق کوئی فیصلہ کن بات کہی جا سکے۔ ارباب فن اس سلسلے میں مختلف الرائے ہیں۔ صاحب فرہنگ آصفیہ نے اس کو صرف مذکر لکھا ہے، تانیث کا مطلق ذکر نہیں کیا ——— مولف فصیح اللغات

۱؎ میر علی اوسط رشکؔ لکھنوی تلمیذ ناسخؔ، متوفی ۱۲۷۴ھ (کلیات نیر شکوہ آبادی) صحت زبان و قواعد شاعری میں یکتا تھے۔ عہد ناسخؔ سے منسوب بہت سی اصلاحات زبان و قواعد کے واضع دراصل رشکؔ تھے (آبحیات ذکر ناسخؔ) رشکؔ کے دو دیوان ایک ہی جلد میں چھپے تھے۔ ایک کا نام "نظم مبارک" ہے، دوسرے کا "نظم گرامی"۔ یہ تاریخی نام ہیں۔ یہ مجموعہ اُن کی زندگی ہی میں ۱۲۶۳ھ میں چھپا تھا۔ ایک دیوان متن میں ہے، دوسرا حاشیے پر۔ تیسرا دیوان جو اُن کی زندگی ہی میں مرتب ہو چکا تھا (دیباچہ نفس اللغۃ) شائع نہیں ہو سکا۔ اس کا ایک نسخہ پاکستان میں ہے اور ایک آزاد لائبریری علی گڑھ میں (حواشی تذکرۂ ابن امین اللہ طوفان ص ۲۲)

۲؎ داغؔ کے عزیز شاگرد مولانا احسن مارہروی نے اس لغت کی ترتیب کا کام شروع کیا تھا۔ بقول مولانا احسن "اوّل اوّل تو حضرت مرحوم (داغؔ) کو اس کتاب سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوئی۔ مگر رفتہ رفتہ جب میرے شوق اور خلوص عقیدت کا اندازہ فرمایا تو اس کتاب کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور ایسی توجہ فرمائی کہ اُٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے، احسن ہے اور فصیح اللغات، فصیح اللغات ہے اور اس کی تالیف (مقدمہ یادگار داغؔ)، داغؔ کا خیال یہ تھا کہ اس طرح "زبان دہلی" کا ایک صحیح لغت مرتب ہو جائے گا۔ فرہنگ آصفیہ بھی زبان دہلی کا گنجینہ ہے۔ لیکن مولف آصفیہ کے متعلق داغؔ کی جو رائے تھی، وہ مولوی عبدالرزاق کانپوری (مولف البرامکہ) کے اس بیان سے معلوم ہوگی۔ مولوی صاحب نے دہلی دربار کے موقع پر داغؔ سے ملاقات کی تھی، اس کا حال لکھتے ہوئے اُنھوں نے لکھا ہے :

"میں نے دریافت کیا کہ مولوی سید احمد دہلوی نے تیس سال کی محنت میں فرہنگ آصفیہ لکھی ہے، تحقیقات لغات اور محاورات اور زبان کی حیثیت سے اس کتاب کی نسبت جناب کی کیا رائے ہے؟ فرمایا کہ سید احمد عرب سرائے کے باشندے تھے۔ اور یہ کہ

نے بھی اس کو مذکر لکھا ہے، اور جلالؔ کے علی الرغم نے اس کی نفی کی ہے کہ فصحا اس لفظ کو دونوں طرح بولتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے :

"یہ لفظ ناواقفوں کی بول چال میں بحالتِ تذکیر و تانیث، دونوں طرح مستعمل ہوتا ہے۔ مگر اب تک شعرائے متقدمین و متاخرین میں، رشکؔ لکھنوی کے سوا، اور کسی کے کلام میں املا کی تانیث نہیں پائی گئی۔" (فصیح الملک۔ مئی ۱۹۰۸ء)

صفیرؔ نے رشحات میں اس کو صرف مختلف فیہ لکھنے پر اکتفا کی ہے۔ مولفینِ امیر اللغات و نور اللغات و معین الشعرا نے اس کو مذکر لکھ کر، یہ صراحت کر دی ہے کہ صرف رشکؔ نے اسے مونث لکھا ہے [یہ واقعہ ہے کہ رشکؔ کے مذکورہ شعر کے علاوہ، اور کوئی مثال اس کی تانیث کی نہیں پیش کی جا سکی ہے] یہی بات نفس اللغۃ[1] کے دیباچہ نگار نے لکھی ہے : "یہ لفظ عموماً زبانوں پر تذکیر کے ساتھ ہے ..... لیکن رشکؔ نے مونث باندھا ہے۔" گویا ان سب حضرات کے نزدیک اس کی تذکیر مرجح ہے، اور یہ کہ رشکؔ کا شعر، از قبیل شاذ ہے۔ ان میں سے کسی نے جلالؔ کی طرح یہ نہیں لکھا کہ یہ لفظ مونث بھی بولا جاتا ہے۔ (کمتر سہی) اس سے واضح طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں بھی یہ لفظ بہ تانیث مستعمل نہیں تھا۔

لیکن صاحب رسالۂ بسیط نے اسے مختلف فیہ لکھ کر، مونث کو مرجح لکھا ہے۔ اس کے علاوہ، مرزا غالبؔ کی ایک تصنیف میں بھی یہ لفظ بہ تانیث موجود ہے : "املا، اہلِ ہند کی املا کے موافق رہی۔" (تیغ تیز۔ مطبوعۂ اکمل المطابع۔ ص ۲۴)

صاحب رسالۂ بسیط کے اُس قول، اور مرزا صاحب کے اس جملے سے، جلالؔ کے اس قول کی مکمل تائید ہوتی ہے کہ یہ لفظ دونوں

(بقیہ) کر خاموش ہو گئے۔ مکرر سوال کرا میں نے بھی ادب کے خلاف سمجھا۔" (یادِ ایام ص ۲۵۴) یہ بات پیش نظر رہنا چاہیے کہ عرب سرائے پرانی دہلی کے باہر ہے۔ اس سے داغؔ کی رسنے کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ مولوی صاحب موصوف کو اہلِ زبان میں سے نہیں سمجھتے تھے۔ افسوس یہ ہے کہ یہ لغت مکمل نہ ہو سکا۔ حیدر آباد کے ایک پریس میں اس کے کچھ اجزا چھپے بھی تھے، لیکن معلوم نہیں کیا ہوئے۔

مولانا احسنؔ نے مئی ۱۹۰۸ء سے رسالۂ فصیح الملک جاری کیا (مقدمۂ یادگار داغؔ) اس لغت کے کچھ اجزا اس میں شائع ہوئے تھے۔ اب اس رسالے کے تمام شمارے بھی یکجا بمشکل ملیں گے۔ یہ نہایت افسوس کی بات ہے۔ داغؔ اس لغت کے لیے سند کے اشعار خاص طور سے کہتے تھے۔ مگر یہ مکمل ہو جاتا تو واقعی کام کی چیز ہوتا۔ صولت پبلک لائبریری رام پور میں اس کے کئی سال کے شمارے محفوظ ہیں۔

[1] یہ رشکؔ کا تصنیف ہے۔ اس کا نام تاریخی ہے۔ اس کا صرف حصۂ اول، اُن کی موت کے بعد، نیر پریس لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ یہ ردیف طرف ت تک ہے۔ باقی حصوں کا پتا نہیں چلتا۔ امیرؔ مینائی نے ایک خط میں لفظ مسالا کے ذیل میں، اس لغت کی ایک عبارت درج کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لغت مکمل ہو چکا تھا اور اس کا مخطوطہ امیرؔ کی نظر سے گزرا تھا۔ امیرؔ کا یہ خط، مکاتیب امیر مینائی (مرتبہ احسن اللہ خاں ثاقبؔ) میں شامل ہے۔ جلالؔ، رشکؔ کے شاگرد تھے۔ انھوں نے اپنے لغت گلشنِ فیض میں، نفس اللغۃ کی بہت سی عبارتوں کو شامل کر لیا ہے اور کہیں حوالہ نہیں دیا۔ نفس اللغۃ کا دیباچہ نشترؔ لکھنوی نے لکھا ہے، جس میں بہت سی کام کی باتوں کو یکجا کر دیا ہے۔

طرح مستعمل تھا، البتہ "مذکر بیشتر اور مونث کمتر"۔ رشک کا مذکورہ شعر اگر قابلِ استناد (تانیث کے لیے) نہ مانا جائے (جس کی بحث آگے آئے گی) تب بھی اس کی تانیث ثابت رہے گی اور اس میں دہلی و لکھنؤ کی تخصیص نہیں ہوگی۔

مختصر یہ کہ بیشتر اساتذۂ دہلی و لکھنؤ کا اس پر اتفاق رہا ہے کہ "ملا" مذکر ہے۔ ارباب لغت نے رشک کے مذکورہ شعر کو از قبیل شاذ مانا ہے۔ لیکن مؤلف فصیح اللغات کی طرح یہ کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہوگا کہ یہ لفظ محض ناواقفوں کی بول چال میں بہ تانیث مستعمل تھا۔ ایک گروہ مختصر اس کی تانیث کا قائل تھا۔ اور یہ لوگ بھی اُتنے ہی معتبر تھے جتنے دُوسرے گروہ کے لوگ۔ یہ بات جلال کی صراحت سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ البتہ آج کل بالعموم مذکر بولا جاتا ہے شاید ہی کوئی شخص اب اسے بہ تانیث استعمال کرتا ہو۔ کم از کم میری نظر سے ایسی کوئی مثال نہیں گزری۔ نہ مونث بولتے ہوئے سُنا۔

اس بحث کے بعد، یہ بات بھی غور طلب ہے کہ کیا رشک کے اس شعر کو تانیث کی سند میں پیش کیا جا سکتا ہے؟ لفظ صاد کے ذیل میں یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ ایسے اشعار جن میں غلط الکاتب کا احتمال ہو سکتا ہو، فائدۂ استناد نہیں دیتے۔ جب تک کسی شعر میں زیر بحث لفظ اس طرح نظم نہ ہوا ہو کہ قطعیت کے ساتھ اُس کو بطور سند پیش کیا جا سکے؛ اُس وقت تک اس شعر کو نہ سند میں پیش کیا جا سکتا ہے نہ قبول کیا جا سکتا ہے ——— رشک کے اس شعر کی یہی صورت ہے۔ اس میں لفظ ملا کی تانیث کی بنیاد "کی" پر ہے۔ یہ مصرع یوں بھی ہو سکتا ہے ؎

خدا کی انشا اور ہے ملے کا ملا اور ہے۔

ایسا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ رشک نے درحقیقت کیا لکھا تھا۔ حقیقی صورت حال کچھ بھی ہو، بمقتضائے قواعد اور مختارات ارباب فن کے اعتبار سے، اس شعر کو بطور سند نہیں پیش کیا جا سکتا۔ اس شعر سے تانیث ملا کی سند لینا، بالکل ایسی بات ہے، جیسے ارباب لغت اور بعض دُوسرے حضرات نے "مثنوی گلزار نسیم" کے ایک شعر سے (جو صاد کی بحث میں مذکور ہوا ہے) محض اس بنا پر کہ "صاد آنکھوں کی" چھپا ہوا ہے، صاد کی تانیث فرض کر لی۔

مجھے تعجب اس پر ہے کہ جلال نے اس شعر کو کس طرح بطور سند قبول کر لیا؟ جب کہ وہ اس کے قائل تھے کہ ایسے مواقع پر محض "کا"، "کی" سے تانیث و تذکیر کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اُنھوں نے لفظ رستم کے ذیل میں اس کی صراحت بھی کر دی ہے:

"ہندسے کے معنی پر رستم کو جناب مرزا دولہا جاہ مرحوم نے مذکر فرمایا ہے ؎

ہمارے رزق کا ہے فردِ قسمت میں رقم خالی ہمیشہ صفر کے مانند رہتا ہے شکم خالی

حالانکہ رقم بمعنی مذکر۔ باتفاق مونث بولا جاتا ہے۔ پس مؤلف ستمام کہتا ہے کہ عجب نہیں ہے کہ اصل میں یہاں "کی" ہو۔ اور کاتب نے "کا" لکھ دیا ہو۔"

صفیر کی بھی اس مسئلے میں یہی رائے تھی کہ ایسے مقامات پر محض کا یا کی سے فائدۂ استناد حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی عبارت لفظ صاد کے ذیل میں پیش کی جا چکی ہے۔ لیکن دونوں حضرات نے رشک کے اس شعر کو قبول کر لیا کسی اختلاف کے بغیر۔ حالانکہ اس کی بھی بالکل یہی صورت ہے۔

اور متنوں میں ایک دل چسپ صورت ہے: اس میں مفرد لفظ املا درج نہیں۔ البتہ "املا و انشا" درج ہے، گویا یہ مرکب امتزاجی ہے؛ مولف نے اس مرکب کو مونث لکھ کر، سند میں رشک کا زیرِ بحث شعر درج کیا ہے۔ موصوف نے املا کی مسئلہ تذکیر کا مطلق ذکر نہیں کیا۔
مہذب اللغات میں 'املا' کو مذکر لکھا گیا ہے۔ مولف نے اس کے بعد یہ صراحت کر دی ہے کہ "رشک اور اختر (شاہ اودھ) نے مونث بھی نظم کیا ہے، لیکن موجودہ دور میں مذکر ہی ہے۔" تانیث کی سند میں رشک کا زیرِ بحث شعر اور واجد علی شاہ کا یہ شعر لکھا ہے:

مگر یہ بھی نکلا سراپا غلط   تھی انشا غلط اور املا غلط

مولف مہذب اللغات کا یہ خیال ہرگز صحیح نہیں کہ اختر کے اس شعر سے املا کی تانیث ثابت ہوتی ہے۔ اس شعر سے نہ تانیث ثابت کی جا سکتی ہے نہ تذکیر۔ مصرعِ ثانی میں یہ لازم نہیں ہے کہ "تھی" کا اطلاق املا پر بھی ہو ——— مولف نے اسی ذیل میں مزید لکھا ہے: "املے کی کاپی، املے کا قلم وغیرہ رائج ہیں۔" لفظ املا میں امالہ روا نہیں۔ ورنہ پھر "انشے کی کاپی" بھی لکھا جا سکتا ہے۔
منیدالشعرا میں رشک کے مذکورہ شعر کا مصرعِ اوّل اس طرح ہے ؏

نامۂ جاناں ہے کیا کھماری تقدیر کا

اس رسالے کے جو اڈیشن میری نظر سے گزرے ہیں، ان میں اسی طرح ہے۔ رشک کے دیوان میں "یا کھماری تقدیر کا" ہے۔ (ص ۳۵۵)

ادب اور زندگی کا تعلق

ڈاکٹر گیان چند

ادب اور زندگی کا تعلق اتنا واضح نہیں جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ ایک عرصہ ہوا شیخ چاند نے سودا پر جو کتاب لکھی تھی اس کا پہلا باب تاریخی پس منظر کا تھا کسی ادبی یا تحقیقی و تنقیدی مقالے میں سیاسی پس منظر دکھانے کی یہ پہلی کوشش تھی۔ "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" اور "دلی کا دبستانِ شاعری" بھی اسی موضوع سے شروع ہوتے۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے "میر۔ حیات اور شاعری" لکھی تو کتاب کا کافی حصہ میر کے زمانے کے تاریخی حالات کی نذر کر دیا۔ پھر کیا تھا ہر مقالہ نگار کو ایک سہل سا نسخہ مل گیا کہ کتاب کی ابتدا میں دلی اور لکھنؤ کی وہ تاریخ دہرا دی گئی جو سو بار پڑھ چکے ہیں۔ وہی غلام قادر روہیلے کا شاہ عالم کی آنکھیں نکالنا۔ وہی نصیر الدین حیدر کی جلوہ داریاں وہی جان عالم پیا کا پری خانہ سجانا۔ اودھ پنچ کے طنز نگاروں نے مسدسِ حالی پر اسکول بچوں کی زبانی فقرہ چست کیا تھا:

> "جناب مصنف نے جغرافیے کا تو خاتمہ کر دیا ہے۔ مسدس یاد کرو اور انٹرنس کا امتحان
> پاس۔ کوئی کہتا ہے کہ علم تاریخ میں تو صولا کر دہ مجبور ہے کہ ہسٹری آف گریس اور ہسٹری
> آف روم تو گویا گھر کی لونڈی ہے۔"

ان مقالوں کے پہلے باب پر بھی یہی پھبتی چست ہوتی ہے اب تو یہ عالم ہے کہ تحقیقی مقالہ لکھنے والوں کو تاریخی پس منظر لکھنے کے لیے تاریخوں کی ورق گردانی بھی نہیں کرنی پڑتی۔ اب تک کے شائع شدہ مقالوں ہی سے کافی سامان مل جاتا ہے۔

تنقید کو محض کیمبرج ہسٹری آف انڈیا بنا دینا اس وقت تک بے سود ہے جب تک کہ ان واقعات کا زیر بحث صنف یا مصنف سے تعلق روشن نہ کیا جائے۔

آرٹ برائے آرٹ کی رسم اتنی ہی پرانی ہے جتنا خود آرٹ لیکن ایک نظریے کی صورت میں اسے سب سے پہلے اٹھارویں صدی کی ابتدا میں فرانس کے وکٹر کزن نے L'art pour l'art کے فقرے سے ادا کیا۔ اس کے برعکس انگلستان میں میتھو آرنلڈ نے ادب کو زندگی کی تنقید قرار دیا۔ اردو میں ادب برائے زندگی کا نعرہ ترقی پسند تحریک کے ساتھ بلند ہوا۔ ڈاکٹر اختر[۲] رائے پوری نے اعلان کیا:

---

(۱) یہ اعتراض مجھ پر بھی صادق ہوتا ہے کیونکہ میرے ڈی لٹ کے مقالے "اردو مثنوی شمالی ہند میں" میں بھی یہ باب ہے۔ ابتداً میں نے اسے مختصر لکھا تھا لیکن ایک ممتحن نے اعتراض کیا کہ تاریخی پس منظر کو اور مفصل ہونا چاہیے تھا۔ مجبوراً میں نے بھی اسے بڑھایا لیکن سیاسی واقعات کی بجائے سماجی اور معاشی حالات پر زیادہ زور دیا۔ (۲) ادب اور انقلاب۔ ص ۰۔ دوسرا ایڈیشن۔

"تحقیق ادب معاشی زندگی کا ایک شعبہ ہے اور ادب زندگی کا پروردہ اور آئینہ دار ہے۔"
مولوی عبدالحق[1] نے بھی شہادت دی۔

"ادب کی بنا زندگی پر قائم ہے اور اگر یہ نہیں تو وہ ایک پریوں کی کہانی ہے۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ ادب زندگی کا ایک آئینہ ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔"

سوال پیدا ہوتا ہے 'کیا اچھا ادب وہی ہے جو زندگی کی آئینہ داری کے ساتھ اس سے بھی بڑھ کر زندگی کی اصلاح کرے ' اس سوال کا جواب دینے کے لیے ہمیں دریافت کرنا ہے کہ

زندگی ادب کو کس حد تک متاثر کرتی ہے ؟

ادب زندگی کو کس حد تک متاثر کرتا ہے ؟

زندگی کے معنی کیا ہیں؟ جتنے ذی رُوح ہیں ان سب کو ملا کر زندگی کہہ سکتے ہیں۔ ان کے جذبات و خیالات کو بھی زندگی کا جزو قرار دیا جائے گا کیونکہ فکر کا چشمہ زندگی ہی سے اُبلتا ہے۔ تو وہ تخلیقیں جن میں کسی جان دار کا بالواسطہ بھی ذکر نہ ہو زندگی سے معرا کہی جائیں گی کہ نہیں مثلاً :

گلابی سا ہو جانا دیوار و در | درختوں سے آنا شفق کا نظر
وُہ چادر کا چھٹنا وُہ بادل کا زور | ہر اک جانور کا درختوں پہ شور
وُہ سروِ سہی اور آبِ رواں | وہ پانی کا مستی سے بہنا وہاں

(مثنوی میر حسن)

یا

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں | ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ | پانی بھی موج بن کر اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا ہو
آغوش میں زمیں کے سویا ہوا ہو سبزہ | پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو

(اقبال ۔ ایک آرزو)

ان اشعار میں زندگی نہیں فطرت ہے لیکن ان کے حسن میں شبہ نہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ زندگی کے بغیر بھی ادب پارے میں حسن ہو سکتا ہے۔ بلکہ یہ بہشتائی صورتیں ہیں۔ یہ نظموں کے اقتباس ہیں۔ ان کے پہلے اور بعد کے اشعار زندگی سے خالی نہیں۔

اگر زندگی کو محض ذی روحوں کے تذکرے کے مترادف قرار دیا جائے تو وہ کون سا ادب پارہ ہے جو اس وسیع حصار میں نہ سما سکے۔ طلسم ہوش رُبا اور مثنوی گلزارِ نسیم میں بھی زندہ کرداروں کا ذکر ہے لیکن ادب برائے زندگی کے نظریے کا کوئی مبلغ ان سے آسودہ نہیں۔ انھیں زندگی کا آئینہ دار نہیں قرار دیا جاتا۔ شاید ان کے فوقِ فطری کردار ان داستانوں کو زندگی کی بارگاہ

---

[1] افکارِ عبدالحق ص ۷۰

سے خارج کر دیئے ہیں انھیں ایسی داستانیں بھی ملتی ہیں جن میں کوئی فوق فطری عنصر نہیں مثلاً باغ وبہار کے پہلے درویش کی سیر یا الف لیلہ میں سوتے جاگتے کی کہانی یا قصۂ عورت ومرد۔ نئے ادیب انھیں بھی زندگی آمیز اور زندگی آموز نہیں ملتے۔ آخر ان میں کسی نہ کسی زمانے کی زندگی کا تو ذکر ہے ہی۔ غالباً ادب کو زندگی کا آئینہ کہنے کے معنی یہ ہیں کہ ادب ہم عصر زندگی کا آئینہ ہو کسی گئے گزرے ماضی کا نہیں۔ چنانچہ اختر[1] رائے پوری کہتے ہیں:

'ادب زندگی کا ایک شعبہ اور اپنے ماحول کا ترجمان ہے'

اس میں پہلی قباحت تو یہ ہے کہ اپنے ماحول کی ترجمانی کا مطالبہ ادیب سے تاریخی ناول اور نظمیں لکھنے کا حق چھین لیتا ہے۔ اس سے قطع نظر ہم عصر زندگی کی محض ترجمانی سے بھی بات نہیں بنتی۔ واسوخت امانت، مثنوی بہار عشق اور دیوان جان صاحب اپنے عہد کی زندگی کے آئینہ دار ہیں۔ ان کی حقیقت نگاری میں شبہ نہیں پھر بھی انھیں سراہا نہیں جا سکتا۔ مجنوں گورکھپوری[2] نے سوال اٹھایا۔

"کیا ادب کے معنی صرف زندگی کی تکرار یا نقل کے ہیں۔ اگر زندگی کے محض اعادہ یا مثنیٰ کو ادب کہتے ہیں تو پھر اصل اور مثنیٰ میں کیا فرق ہے اور اس کی ہم کو کیا ضرورت ہے۔ ادب یا حسن کاری اگر زندگی کی محض ایک سادہ نقل ہے تو یقیناً ایک فعل عبث ہے جو زیادہ سے زیادہ تفریح کا ذریعہ بن سکتا ہے۔"

احتشام حسین[3] نے اس کا جواب دیا۔

"چونکہ ادب ہوائی قلعہ بنانے کا نام نہیں ہے اس لیے شاعر اور ادیب کا کام یہیں نہیں ختم ہو جاتا کہ وہ ایک حقیقت پسند کی حیثیت سے جو کچھ دیکھتا ہے وہی لکھ دے بلکہ وہ جس طرح محسوس کرتا ہے کہ ایسا ہونا چاہیے اس کا اظہار بھی کرے۔"

بھارتیہ ساہتیہ پرشد ناگپور کے تاریخی اجلاس اپریل ۱۹۳۶ء میں جو اعلان نامہ پنڈت جواہر لال نہرو، منشی پریم چند، ڈاکٹر عبدالحق اور اختر رائے پوری وغیرہ کے دستخطوں سے شائع ہوا تھا اس میں کہا گیا تھا

"کیا آج جب ترقی اور پستی کی طاقتوں میں فیصلہ کن جنگ شروع ہو چکی ہے ادب اپنے کو غیر جانبدار رکھ سکتا ہے؟ .... اگر زندگی کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ سماج کے چہرے سے بیکاری، افلاس اور ظلم کے داغ دھوئے جائیں تو شاید کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ ادب کا اشارہ کس جانب ہو .... زندہ اور صادق ادب وہی ہے جو سماج کو بدلنا چاہتا ہے۔"

واسوخت امانت اور بہار عشق یہ فریضہ سرانجام نہیں دیتیں۔ انھیں پڑھ کر کسی ذکی الحس قاری کے دل میں جنسی ظلم کے خلاف جذبات ابھر آتے ہیں تو یہ مصنف کے منشا کی وجہ سے نہیں۔ لیکن اس کوتاہی کا الزام صرف انھیں کتابوں پر کیوں رکھا جائے۔ باغ وبہار، فسانۂ عجائب، مثنوی میر حسن، گلزار نسیم، قصائد ذوق، دواوین میر وغالب چند مستثنیٰ اشعار کے سوا نہ سماج کے چہرے سے بیکاری، افلاس اور ظلم کے داغ دھوتے ہیں نہ سماج کو بدلنے کا اشارہ کرتے ہیں لیکن ہم انھیں ٹھکرا نہیں سکتے سوختنی نہیں قرار دے سکتے۔ ان سے بھی آگے بڑھ کر دیکھا جائے تو عہد عتیق اور عہد وسطیٰ کے عظیم عالمی شاہکار بھی بیکاری افلاس اور ظلم کے خلاف تیغ بکف نہیں نظر آتے۔

---

[1] ادب اور انقلاب ص ۱۱ [2] ادب اور زندگی [3] تنقیدی جائزے ص ۵۸ طبع سوم

ایلیڈ، اوڈیسی، شاہنامہ، کالیداس اور شیکسپیر کے ڈراموں میں سماج کو بدلنے کا جذبہ کوئی خاص نمایاں نہیں۔ جاگیرداری دَور کی ان پیداواروں کو پرکھنے کے لیے ہم اپنے معیاروں کو نہیں بدل سکتے چنانچہ اختر رائے پوری نے کالیداس، تلسی داس، ٹیگور اور اقبال سب کو رُجعت پرستی کا سرٹیفکیٹ دے دیا۔

ماضی کے ادب عالیہ نے ترقی پسند نقادوں کو عجیب دُبدھا میں ڈال دیا۔ اُنھوں نے اچھے ادب کے لیے جو اصول و معیار قائم کیے تھے وہ ان شاہکاروں کے سامنے دم توڑ دیتے تھے لیکن اب ان شاہکاروں کی عظمت اتنی مُسلّم ہے، ان کے بقائے دوام پر صدیوں کی ایسی اَہمیت مُہر لگ چکی ہے کہ جو نظریۂ ادب ان سے مُنکر ہو اس نظریے کو ناقص ٹھہرایا جائے گا اس لیے ترقی پسند نقاد ادب عالیہ کو اپنانے پر مجبور ہوئے۔ سردار جعفری نے 'ترقی پسند ادب' میں اختر رائے پوری کے اعتراضات سے انحراف کیا اور تسلیم کیا کہ ماضی کا عظیم ورثہ ہمارا قیمتی سرمایہ ہے: اُنھوں نے کالی داس، شیکسپیر، ٹیگور، میر، غالب، اقبال سب کی اہمیت اور عظمت کا اعتراف کیا۔

اپنا موضوع ترقی پسندی نہیں۔ صرف یہ اشارہ کرنا مقصود تھا کہ ادب کے وہ شاہکار بھی عظیم ہیں جو زندگی اور سماج کے معاشی حالات کو بہتر بنانے کے مدعی نہیں اور اس کا اعتراف ترقی پسندی کے سرکاری ترجمان بھی کرتے ہیں۔

اب تین طرح کی تخلیقات ملاحظہ ہوں۔ اوّل وہ ہیں جن میں زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش بھی ہے اور جمالیاتی پہلو بھی خاطر خواہ ہے مثلاً

شہانِ کج کلہ پر تنگ ہے عالم کی پہنائی — درِ دہقاں پہ دستک دے رہی ہے شانِ دارائی
جہاں بانی دہکتی آگ ہے گرتی ہوئی بجلی — ہمیشہ اُس نے دُنیا میں کیا دورِ محن پیدا
ہزاروں تجربوں کے بعد اب انسان یہ سمجھا ہے — کہ شاہی سے نہیں ہوتا شرافت کا چلن پیدا
نہ ہو جب تک جبینِ شہریاری پر — نہیں ہوتا کلاہِ خسروی میں بانکپن پیدا
سُن اے غافل کہ تا روزِ قیامت نسلِ شاہی سے — نہ ہوگا بزمِ انسانی کا صدرِ انجمن پیدا

(جوش۔ زوالِ جہاں بانی)

یہ سماں اور اک قوی انسان یعنی کاشتکار — ارتقا کا پیشوا، تہذیب کا پروردگار
جس کی محنت کا عرق تیار کرتا ہے شراب — اُڑ کے جس کا رنگ بن جاتا ہے جاں پرور گلاب
خُون جس کا بجلیوں کی انجمن میں باریاب — جس کے سر پر جگمگاتی ہے کلاہِ آفتاب
جس کی محنت سے پھبکتا ہے تن آسانی کا باغ — جس کی ظلمت کی ہتھیلی پر تمدّن کا چراغ

(جوش۔ کسان)

کسی بھی پیمانے سے دیکھا جائے۔ ادب میں ان کا اعلیٰ مقام ہے اور رہے گا۔

دُوسری وہ تحریریں ہیں جن میں زندگی کو سنوارنے کی کوشش نہیں جو بعض نقادوں کے نزدیک رجعت پسندانہ بھی کہی جا سکتی ہیں لیکن جن کی حسن کاری میں کوئی شبہ نہیں مثلاً

رہیئے اے دل اب وہاں چل کر جہاں کوئی نہ ہو ۔۔۔ ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے ۔۔۔ کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار ۔۔۔ اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو
(غالب)

یہ نغمے یہ ترانے یہ شباب و شعر کا عالم
یہ آرائش مکانوں کی یہ زیبائش مکینوں کی
یہ رعنائی حسینوں کی یہ صحبت نازنینوں کی
یہ عمریں یہ بہاریں یہ شباب و شعر کا عالم
نہ لے جا خُلد میں یا رب یہیں رہنے دے تو مجھ کو
یہ دُنیا ہے تو جنت کی نہیں ہے آرزو مجھ کو
(دُنیا کی بہاریں۔ اختر شیرانی)

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ۔۔۔ ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
(درد)

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز ۔۔۔ میں ہوں اپنی شکست کی آواز
(غالب)

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں ۔۔۔ ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں
(فانی)

اگر نہ زہرہ جبینوں کے درمیاں گزرے ۔۔۔ تو یہ حیات کو کس طرح کہاں گزرے
(جگر)

ان تخلیقات میں کہیں شکست ہے کہیں فرار، کہیں فقدانِ عمل ہے، کہیں افسردگی لیکن یہ انسان کے بنیادی جذبوں اور آفاقی تجربوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں سے بعض پر ایک یا ڈیڑھ صدی گزر چکی ہے لیکن وہ ابھی تک تر و تازہ ہیں۔ حافظ و خیام کی شاعری کئی صدیاں دیکھ چکی ہے اگر اس کی بہار ابھی تک جواں ہے تو کیوں نہ ہم امید کریں کہ یہ ابھی اور کئی صدیوں تک وقت کے دھارے کی حریف ہو سکے گی۔ ادبیاتِ ماضی کے بیشتر کارناموں میں زندگی کو بدلنے کا کوئی بلند بانگ دعویٰ نہیں۔ نثر میں الف لیلہ، باغ و بہار، نیاز کا افسانہ کیوپڈ و سائکی اسی طرح کی ہوش رُبا تخلیقات ہیں جو ذہن پر چھاپہ مار کر قلب کو مسحور کر دیتی ہیں۔

تخلیقات کی تیسری قسم وہ ہے جن میں زندگی کو بہتر بنانے کا سودا ہے لیکن جو شعریت کے حسن سے عاری ہیں مثلاً

کام اچھا کرنا چاہیے نہ کہ جلد۔

کام اچھا کوئی ہو پایا اگر انسان سے ——— اس میں کی تاخیر اُس نے جس قدر اچھا کیا
کب کیا کیونکر کیا یہ پوچھتا کوئی نہیں ——— بلکہ ہیں یہ دیکھتے جو کچھ کیا کیسا کیا

حالی

غریبوں کی فاقہ کشوں کی صدا ہے
مرے جلد ہے ہیں
امیروں کے عیشوں کا انبار سر پر
لدے ہیں زمانے کے افکار سر پر
زمیندار کا ندھوں پہ سرکار سر پر
مرے جا رہے ہیں

(ڈاکٹر تاثیر ۔ غریبوں کی صدا)

اے مئے پندار سے مخمور اے سرمایہ دار ——— اے کہ ہے دولت پرستی تیرا بے مایہ شعار
اے کہ دولت ہی تری دُنیا ہے اور دولت ہی دیں ——— اے کہ تو دولت کو ہے سمجھا ہوا پروردگار
زعم میں سرمایہ داری کے یہ وحشت یہ جنون ——— قصۂ مزدور سُننا بھی ہے تجھ کو ناگوار
خود نچوڑی تُو نے دولت خون سے مزدور کے ——— اور پھر غم خواری مزدور بھی ہے تجھ پہ بار
حق محنت اس کا دینے میں تجھے سو عذر ہیں ——— ہیں عرق جس کی جبیں کا تیرے دُرِّ شاہوار
اپنی عشرت گاہ میں تو محو خواب عیش ہے ——— اور مزدور اک شکستہ جھونپڑی میں بے قرار

(سیماب ۔ اے سرمایہ دار)

یہ تخلیقات گرد آلود کتابوں میں دفن ہیں۔ یہ زندگی آمیز بھلے ہوں لیکن خود اُن کی قسمت میں زندگی نہیں۔ ان کی پیدائش کے چند سال بعد ہی ان کا کوئی نام لیوا نہیں۔ زندگی اور سماج کو بہتر بنانے کی خواہش بڑا نیک جذبہ ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ یہ ادب کی حیات ابدی کا ضامن نہیں۔ ہم لاکھ چاہیں کہ بہترین ادب وُہی قرار دیا جائے جو ان طاقتوں کا ساتھ دے جو دُنیا سے ہر قسم کی بے انصافی کو مٹانا چاہتی ہیں لیکن زمانے کا فیصلہ کچھ اور ہے اور کہا گیا ہے کہ وقت بہترین منصف ہے۔

تلنگانہ میں کسانوں کی شورش ہوئی جھٹ ایک ناول لکھ دیا گیا۔ کوریا کی لڑائی ہوئی یا لومبا کی شہادت ہوئی ایک افسانہ وجود میں آگیا۔ ہندوستان پر چین کا حملہ ہُوا تو قومی نظموں کا سیلاب آگیا گویا گولہ بارود کی جگہ یہ نظمیں ہی معرکہ سر کریں گی۔ ان ہنگامی موضوعات سے متعلق ہنگامی ادب کو اپنے دور میں ضرور داد و تحسین مل جاتی ہے لیکن کیا آپ سوچ سکتے ہیں کہ سو دو سال بعد اس قسم کی تخلیقات یاد رکھی جائیں گی۔ مگر نہیں تو انھیں ادب عالیہ میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی مثال سینما کے ان چلتے ہوئے چٹپٹے گانوں کی سی ہے جو کچھ دن کے لیے ہر ریڈیو، ہر لاؤڈ سپیکر، ہر زبان پر شور قیامت مچا دیتے ہیں۔ یہ فلم کوئی چار چھ ماہ تک رہتا ہے۔ اس کے بعد

ان گیتوں اور شاعروں کی اندر کی منزل کو اس طرح طاقِ نسیاں میں ڈال دیا جاتا ہے جیسے وہ کبھی تھیں ہی نہیں۔ ان کے مقابلے میں پختے راگ کبھی اس طرح زبان زدِ عوام نہیں ہوتے لیکن یہ بہاں سے وہاں تک یونہی چلے جائیں گے۔ زندگی کی سب سے بھرپور آئینہ داری روزانہ اخبار کرتا ہے لیکن اخبار ایک دن کے بعد ہی ایسا باسی، بے جان اور مُردہ ہو جاتا ہے کہ ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں زندہ جاوید ادب عالیہ زندگی کا اتنا بڑا عکاس نہ ہوتے ہوئے بھی زندہ و پائندہ رہتا ہے۔

ادب کو زندگی کا آئینہ کہنے والے بیشتر نقاد یہ غلطی کرتے ہیں کہ زندگی کو خارجی ماحول کا ہم معنی سمجھ لیتے ہیں۔ زندگی میں ذوق ماحول کی اہمیت مسلّم ہے۔ ہم اکثر مسائل کو (سب کو نہیں) اپنے معاشی طبقے کے زاویۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ادیب کے ذہن اور جذبات کی تعمیر و تشکیل میں ماحول بڑی حد تک اثر انداز ہوتا ہے لیکن فن کار کی شخصیت کے خدوخال تنہا یہی متعین نہیں کرتا۔ آخر کیا بات ہے کہ میر اور سودا، انشا اور مصحفی، ذوق اور غالب، اصغر اور جگر ایک شہر ایک ماحول میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے اتنے ہی مختلف تھے جتنے دو مختلف علاقوں دو مختلف زمانوں کے باشندے ہو سکتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اجتماعی ماحول کے ساتھ ساتھ ہر شخص کا انفرادی ماحول بھی اتنا ہی اہم ہے لیکن یہ بھی انسانی ذہنیت کی پوری تاویل نہیں کر سکتا۔

کیا آپ نے ایسی مثالیں نہیں دیکھیں کہ دو حقیقی بھائیوں کے مزاج اور سیرت میں بُعدِ مشرقین ہے۔ دونوں ایک معاشرے کے جزو ہیں۔ دونوں کا انفرادی ماحول یکساں ہے لیکن خیالات یکساں نہیں۔ ایک خوش باش محفل آرا تو دوسرا خلوت پسند فلسفی مزاج ہو سکتا ہے۔ اکبر الٰہ آبادی نے کہا تھا۔

شیخ جی کے دونوں لڑکے باہنر پیدا ہوئے ایک ہیں خفیہ پولس میں ایک پھانسی پا گئے

بہت ممکن ہے دونوں کا ماحول مختلف ہو گیا ہو۔ دونوں مختلف قسم کے حلقوں میں اٹھتے بیٹھتے ہوں لیکن دونوں کے مزاج اور کردار، پسند ناپسند میں بھی ضرور فرق رہا ہوگا۔

سماجیات میں ایک بحث ہے کہ انسانی ذہن و کردار کی تشکیل میں ماحول زیادہ اہم ہے کہ وراثت۔ سماجیات کا موضوع چونکہ سماج ہے اس لیے وہ وراثت کو نظر انداز کر کے ماحول کے حق میں فیصلہ دیتی ہے۔ اس کے مقابلے میں علم الاجسام (Biology) ماحول پر وراثت کو ترجیح دیتا ہے۔ نسلی خصوصیات پر زور دینا مبالغہ ہے لیکن بالکل بے اصل بھی نہیں۔ شیخ محمد اکرام نے غالب نامے میں غالب کے کلام میں نسلی ذہنیت کے نقوش تلاش کیے۔

انگریزی کی کہاوت [illegible] بادن تو لے پاؤ رتی سچ ہے۔ کسی تخلیق کا اسلوب مصنف کی شخصیت کا عکس ہوتا ہے۔ انشا ہنسوڑ تھے تو ان کی اکثر تخلیقات میں بھی وہی ہنسوڑ پن مسکراتا منہ چڑاتا دکھائی دیتا ہے۔ حالی نہایت شریف اور منکسر المزاج تھے تو ان کی تحریریں سادہ ہوتی ہیں۔ شبلی کا جمالیاتی ذوق بالیدہ تھا تو ان کا اسلوب بھی جمالی پہلو کو نظر انداز نہیں کرتا۔ انسان کا مزاج ایسی پیچیدہ گتھی ہے کہ اس کے عوامل اور محرکات کا صحیح تجزیہ مشکل ہے۔ بعض انسان خلوت پسند ہوتے ہیں تو بعض گنبدِ افلاک میں غلغلہ پا کر دینا چاہتے ہیں۔ بعض شتی القلب ہوتے ہیں تو دوسرے آپ اپنے خود نہ پسندی۔ دیگر ان پسند کو اپنا اصول حیات بنا لیتے ہیں۔ بعض اشخاص حسن سرراہ کو دیکھ کر آنکھ بچا لینے کے قائل ہیں تو بعض ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں

کاں کے چکر میں پھنسے رہتے ہیں۔ کبھی کوجنس زدہ ([illegible]) بنا دینے کی ذمّے داری اس کے خارجی ماحول پرہی نہیں ہوتی۔ جذباتی شخصیت کی تشکیل کرنے والے عوامل کی تعیّن موجودہ مقالے کا مقصد نہیں نہ راقم السطور کو اس کی صلاحیت ہے لیکن یہ طے ہے کہ شخصیت محض ماحول کی زائیدہ نہیں ہوتی اور ادب شخصیت کا انعکاس ہوتاہے۔

کہا جاتاہے کہ انسانی دماغ میں مختلف جذبوں اور صلاحیتوں کے مختلف خطّے ہوتے ہیں۔ اعصابی نظام، بعض غدود اور ان کی رطوبتیں انسان کی داخلی شخصیت میں ترمیم کرتی رہتی ہیں۔ انسان کی نفسیاتی دُنیا محض شعور پرمشتمل نہیں اس میں تحت الشعور اور لاشعور بھی محو لعب ہیں۔ جوانی اور ضعیفی میں انسان کے مزاج، پسند و ناپسند اور رُجحانات میں جو تبدیلی ہوتی ہے کیا وہ خارجی ماحول میں تبدیلی کے باعث ہوتی ہے؟ نہیں ماحول اور معاشرے میں اکثر کوئی انقلابی فرق نہیں ہوجاتا ہاں جسم کی ساخت میں ضرور انقلاب ہوجاتا ہے۔ اسی لیے شباب اور ضیعب کی ادبی تخلیقات کا رنگ جُدا جُدا ہوتاہے۔ صحت مند اور مریض دُنیا کو مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں۔

اب تک کی بحث سے یہ نتیجہ نکلتاہے کہ:

> اگر 'ادب زندگی کا آئینہ ہے' کہہ کر زندگی سے خارجی ماحول مُراد لیا جاتاہے تو یہ مکمل صداقت نہیں۔ 'ادب ماحول کا آئینہ ہے' سے بہتر صداقت ہے "ادب شخصیت کا آئینہ ہے۔" اور شخصیت کی تعمیر میں ماحول کا بڑا ہاتھ ہوتاہے لیکن یہ تنہا محرک نہیں۔

بحث کا دُوسرا رُخ یہ ہے کہ ادب زندگی کو کہاں تک متاثر کرتاہے۔

حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری میں کچھ واقعات درج کیے ہیں کہ شاعر کی نظموں نے بدصُورت کنواریوں کی خانہ آبادی کرادی۔ نبیوں کو انتقام لینے پر اُکسا دیا اور غریب الدیار بادشاہ کے دل میں وطن کی یاد گُدگُدا دی۔ بعض تنقیدی مضامین میں یہ پڑھنے میں آتا ہے کہ نئی نسل شبلی سے (یا کسی اور سے) متاثر ہے تو ذہن میں یہی سوال اُبھرتا ہے کہ الٰہی نئی نسل کے کتنے افراد ہیں جن تک شبلی کی رسائی ہوسکی ہے۔ شخصی حکومتوں کی بات دُوسری تھی بادشاہ یا رئیس جس شاعر کو نوازتے تھے عوام بھی اس کے گرویدہ ہوجاتے تھے۔ رسل و رسائل کے آج جیسے ذرائع تو تھے نہیں نتیجہ یہ تھا کہ نثری کتابوں کی اشاعت کم ہوپاتی تھی چونکہ نظموں کا یاد رکھنا آسان ہے اور وہ دلوں کو گرماتی بھی ہیں اس لیے زبان سے زبان پر گزر کر وہ دُور دُور تک پہنچ جاتی تھیں۔ آج جس کثرت سے کتابیں رسالے اور اخبار جاری ہیں ان میں منظومات کا حصّہ عشرِ عشیر بھی نہیں۔

ہمارے مُلک کی آبادی میں پڑھے لکھوں کا تناسب ۲۰ فی صد سے زیادہ نہ ہوگا۔ ان میں اُردو پڑھے لکھے اور بھی تھوڑے ہوں گے۔ ان میں بھی ادبیات کا مطالعہ کتنے آدمی کرتے ہیں۔ حکومت اور سیاسی پارٹیوں کے پاس پروپگینڈے کے کتنے وسائل ہیں۔ ریڈیو۔ اخبار دستاویزی فلمیں وغیرہ۔ ہم پر دن رات اس پروپگینڈے کی بوچھار ہوتی رہتی ہے۔ ہمارے عقائد اسی سے تشکیل پاتے ہیں۔ اُردو پڑھنے والے بھی کوئی مستثنیٰ مخلوق نہیں ان کی محبت و نفرت کے موہدات کی تشکیل میں اقبال و جوش، نیاز اور کرشن چندر کی تحریروں کا زیادہ اثر ہوگا یا روزانہ اخبار اور ریڈیو کا۔ ہم اخبار میں پڑھتے ہیں کہ امریکہ میں گورے نوجوانوں کی ایک جیپ حبشیوں پر گولیوں کی

اُچھالا کرتے تھے کہ گنی یا افریقہ سے ہندوستانیوں کو نکالا جا رہا ہے تو ہمارے دماغ کا درجۂ حرارت ایک سو ۱۰ ڈگری پر پہنچ جاتا ہے۔ ادب اتنا زود اثر کہاں۔

آج کی زندگی بڑی پیچیدہ ہے۔ ادیب لاکھ اپنے مُنہ میاں مٹھو بنیں کہ وہ زندگی کو یوں جنت بنا رہے ہیں اور یوں استحصال و بربریت کی طاقتوں کے خلاف محوِ حرب ہیں لیکن واقعتاً سماجی زندگی کا رُخ متعین کرنے میں ان کی حیثیت پہاڑ پر چیونٹی یا سمندر میں قطرے سے شاید ہی زیادہ ہو۔

جنگِ آزادی میں شاعرِ انقلاب نے اپنی نظموں میں غلامی کے خلاف کیا کیا جھلاہٹیں اور جھنجھلاہٹیں دکھائیں ع اے ہند کے ذلیل غلامانِ روسیاہ اور ع نامرد قوم میں مجھے پیدا کیا ہے کیوں ——— وغیرہ۔ ان سے پوچھا جا سکتا تھا کہ حضرت ان کوسنوں سے کہیں آزادی مل سکتی ہے۔ اس ڈانٹ ڈپٹ کی بجائے کچھ کیجیے کوئی راہِ عمل بتائیے کہ بدیسی حکومت سے کیونکر گلو خلاصی ہو۔ اور کرنے والے کر رہے تھے۔ ان کی جد و جہد اور قربانیوں نے آزادی دلائی۔ جوش اور دوسرے ادیبوں کی تخلیقات سے اس کی رفتار میں کوئی نمایاں فرق پڑتا نہیں دکھائی دیا۔ ملک کی آزادی اور تقسیم جوش و اقبال کی مرہونِ منت نہیں بلکہ مختلف سیاسی تحریکوں کی آویزش اور سرگرمیوں کا نتیجہ ہے۔

ملک کا سماجی اور معاشی ارتقا کس جہت میں ہوگا یہ نہ ادیبوں کے ناول طے کرتے ہیں نہ شاعروں کی نظمیں۔ یہ سیاسی پارٹیوں اور تکنیکی ماہروں کا میدان ہے۔

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند   گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

سیاسی پارٹیوں کا پروگرام ایوانِ قانون ساز اور حکومت کی معرفت عمل کے سانچے میں ڈھلتا ہے۔ منصوبہ بندی کمیشن ہے۔ قومی لیبوریٹریاں ہیں۔ طرح طرح کے ماہرین ہیں ہماری زندگی کس طرح گزرے گی اس کا فیصلہ ان کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ جو کچھ سمجھاتے ہیں ہم اس پر بھنک سکتے ہیں۔ ان کے اور ہمارے درمیان براہِ راست کا وسیلہ روزانہ اخبار ہیں۔

آج دُنیا کی تقدیر سیاستدانوں اور تکنیکی ماہروں (Tech no c i a l) کے ہاتھ میں ہے ادیبوں کے نہیں۔ ادب کی تاثیر اور ہمہ گیری کی بات صرف ادیب کرتے ہیں۔ اربابِ اقتدار کے سامنے یہ دعویٰ دُہرایا جائے تو وہ اس معصوم دعوے پر مسکرا کر گزر جائیں گے۔ مزدور یا کسان کے سامنے بڑے بڑے ادیبوں کا ذکر کیا جائے تو وہ حیرت سے پوچھیں گے کہ یہ کن مخلوقات کا نام لے رہے ہو۔

ہمارے ذہن اور معتقدات کو سب سے زیادہ متاثر کرنے والے ہمارا پسندیدہ روزنامہ اور ہمارے قومی ریڈیو کی خبریں ہیں۔ تاثیر کی وسعت اور گہرائی کے لحاظ سے ادبی تخلیقات صحافت کے آگے پانی بھرتی ہیں۔ یہ صورتِ حال صرف ان ممالک میں نہیں جہاں خواندگی کی کمی ہے۔ مغرب میں جہاں تعلیم بہت عام ہے اور ادیبوں کی آواز بہت زیادہ لوگوں تک پہنچتی ہے وہاں بھی ادیب سماجی ارتقاء کا رُخ متعین نہیں کرتے۔ وہاں کی حکومت، سیاسی گروہوں اور سرمایہ داروں کے پاس رائے عامہ کو متاثر کرنے والے وسائل افراط سے ہیں۔ وہاں پروپیگنڈا ایک فنِ لطیف بن گیا ہے۔

اچھی ادبی تخلیقات اثر آفریں ہوتی ہیں اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

بڑے بڑے مصنفوں کے قلم میں جادو ہوتا ہے۔ وہ قاری کو کم از کم وقتی طور پر اپنا ہم خیال بنا لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز حکومت نے جوش کی نظم ضبط کی اور روسی حکومت نے نوبل پرائز پانے والے ناول کو اپنی قلم رو میں شائع نہ ہونے دیا۔ ایک اچھے ناول یا افسانے کا اثر کئی روز تک رہتا ہے اور شاید تحت الشعور میں بس کر رہ جاتا ہے لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ہمارے ملکوں کے سیاست دان ادبیات کا مطالعہ نہیں کرتے۔ قانون ساز ایوانوں کے بیشتر اراکین تو محض حرف شناس ہی ہوتے ہیں۔ جو پڑھے لکھے ہیں انہیں بھی ادبیات کے مطالعے کی فرصت نہیں۔

آج ادبیات کے علاوہ دوسرے موضوعات مثلاً تاریخ، معاشیات، سیاسیات، سائنس وغیرہ پر کثرت سے لکھا جا رہا ہے ادبیات کے طلبہ کے علاوہ دوسرے قارئین اپنے اپنے پسندیدہ موضوع کا مطالعہ کرتے ہیں۔

سردار جعفری[1] نے سچ کہا ہے۔

"ادب حقیقت کو بدلتا ضرور ہے لیکن خارجی فطرت اور ماحول پر براہِ راست اثر انداز نہیں ہوتا۔۔۔ وہ پہلے انسان کے جذبات پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس طرح انسان میں داخلی تبدیلی پیدا کرتا ہے۔"

ادب کا اثر ہوتا ہے لیکن اُن پڑھے لکھوں پر جن تک اس کی رسائی ہو سکے۔ ابھی ملک میں خواندگی بہت کم ہے۔ مستقبل میں جوں جوں خواندگی بڑھے گی ادب کے قارئین کا حلقہ وسیع تر ہوتا جائے گا۔ لیکن اب ایک اور خطرہ ہے۔ ملک کی ضرورتوں کے درپیش بجا طور پر یہ زور دیا جا رہا ہے کہ فنون کی تعلیم کے مقابلے میں سائنس اور تکنیکی تعلیم کو زیادہ فروغ دیا جائے۔ ادبیات کا ہر پروفیسر اپنے بچوں کو انجینیری یا ڈاکٹری کی تعلیم دلا رہا ہے اور کسی انجینیر یا میڈیکل کالج کے پروفیسر یا ماہرِ معاشیات کے سامنے شعر و ادب کا ذکر چھیڑا جائے تو وہ اسے بیکاری کے مشغلے سے زیادہ اہمیت نہ دے گا۔ آنے والی نسلوں میں تعلیم کے ساتھ ساتھ ادب کی مقبولیت اسی تناسب سے بڑھ جائے گی ایسا سوچنا خوش فہمی ہے۔ تعلیم کے فروغ کے معنی مطالعۂ ادب کا فروغ نہیں۔

جب یہ صاف نظر آتا ہے کہ سماج کے ارتقا میں جو طاقتیں کام کر رہی ہیں ادب ان میں سب سے پیچھے سب سے کم زور ہے تو پھر ادب میں مقصدیت کی بحث اپنی بہت کچھ معنویت کھو دیتی ہے۔

سماج کی بہتری کی کوشش کتنا مستحسن کام ہے لیکن یہ کام ادب کی نسبت صحافت، سیاسی کتابیں، سیاسی نیتا، ماہرینِ معاشیات، موجدانِ سائنس زیادہ حُسن و خوبی سے سرانجام دے رہے ہیں۔ ادب کو بھی اس مُبارک کام میں ہاتھ بٹانا چاہیے لیکن ادب اگر کبھی کبھار اس جدّ و جہد سے مُنہ موڑ لے تو بھی سماجی ترقی کی رفتار میں کوئی نمایاں فرق نہ پڑے گا۔ یہ مسلّم کہ ادیب کو کوئی ایسی چیز پیش نہ کرنی چاہیے جو سماج کو مضر ہو

---

[1] ترقی پسند ادب بار دوم ص ۲۹

بوچھاڑ کرتے جیسے گزر گئی یا افریقہ سے ہندوستانیوں کو نکالا جا رہا ہے تو ہمارے دماغ کا درجۂ حرارت ایک سو ۱۰ ڈگری پر پہنچ جاتا ہے۔ ادب اتنا زود اثر کہاں۔

آج کی زندگی بڑی پیچیدہ ہے۔ ادیب لاکھ اپنے منہ میاں مٹھو بنیں کہ وہ زندگی کو یوں جنت بنا سکتے ہیں اور یوں استعمار و بربریت کی طاقتوں کے خلاف محوِ حرب ہیں لیکن واقعتاً سماجی زندگی کا رُخ متعین کرنے میں ان کی حیثیت پہاڑ پر چیونٹی یا سمندر میں قطرے سے شاید ہی زیادہ ہو۔

جنگِ آزادی میں شاعرِ انقلاب نے اپنی نظموں میں غلامی کے خلاف کیا کیا جھلاہٹیں اور جھنجھلاہٹیں دکھائیں ع اے ہند کے ذلیل غلامانِ روسیاہ اور ع نامرد قوم میں مجھے پیدا کیا ہے کیوں ـــــ وغیرہ۔ ان سے پوچھا جا سکتا تھا کہ حضرت ان کوسنوں سے کہیں آزادی مل سکتی ہے۔ اس ڈانٹ ڈپٹ کی بجائے کچھ کیجیے، کوئی راہ عمل بتائیے کہ بدیسی حکومت سے کیونکر گلو خلاصی ہو۔ اور کرنے والے کر رہے تھے۔ ان کی جد و جہد اور قربانیوں نے آزادی دلائی۔ جوش اور دوسرے ادیبوں کی تخلیقات سے اس کی رفتار میں کوئی نمایاں فرق پڑتا نہیں دکھائی دیا۔ ملک کی آزادی اور تقسیم جوش و اقبال کی مرہونِ منت نہیں وہ مختلف سیاسی تحریکوں کی آویزش اور سرگرمیوں کا نتیجہ ہے۔

ملک کا سماجی اور معاشی ارتقا کس جہت میں ہوگا یہ نہ ادیبوں کے ناول طے کرتے ہیں نہ شاعروں کی نظمیں۔ یہ سیاسی پارٹیوں اور تکنیکی ماہروں کا میدان ہے۔

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند   گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

سیاسی پارٹیوں کا پروگرام ایوانِ قانون ساز اور حکومت کی معرفت عمل کے سانچے میں ڈھلتا ہے۔ منصوبہ بندی کمیشن ہے۔ قومی لیبوریٹریاں ہیں۔ طرح طرح کے ماہرین ہیں ہماری زندگی کس طرح گزرے گی اس کا فیصلہ ان کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ جو کچھ سمجھاتے ہیں ہم اس پر لبیک کہتے ہیں۔ ان کے اور ہمارے درمیان مراسلت کا وسیلہ روزانہ اخبار ہیں۔

آج دنیا کی تقدیر سیاستدانوں اور تکنیکی ماہروں (Tech no c i a l) کے ہاتھ میں ہے ادیبوں کے نہیں۔ ادب کی تاثیر اور ہمہ گیری کی بات صرف ادیب کرتے ہیں۔ اربابِ اقتدار کے سامنے یہ دعویٰ دہرایا جائے تو وہ اس معصوم دعوے پر مسکرا کر گزر جائیں گے۔ مزدور یا کسان کے سامنے بڑے بڑے ادیبوں کا ذکر کیا جائے تو وہ حیرت سے پوچھیں گے کہ یہ کن مخلوقات کا نام لے رہے ہو۔

ہمارے ذہن اور معتقدات کو سب سے زیادہ متاثر کرنے والے ہمارا پسندیدہ روزنامہ اور ہمارے قومی ریڈیو کی خبریں ہیں۔ تاثیر کی وسعت اور گہرائی کے لحاظ سے ادبی تخلیقات صحافت کے آگے پانی بھرتی ہیں۔ یہ صورتِ حال صرف ان ممالک میں نہیں جہاں خواندگی کی کمی ہے۔ مغرب میں جہاں تعلیم بہت عام ہے اور ادیبوں کی آواز بہت زیادہ لوگوں تک پہنچتی ہے وہاں بھی ادیب سماجی ارتقا کا رُخ متعین نہیں کرتے۔ وہاں کی حکومت، سیاسی گروہوں اور سرمایہ داروں کے پاس رائے عامہ کو متاثر کرنے والے وسائل افراط سے ہیں۔ وہاں پروپیگنڈا ایک فنِ لطیف بن گیا ہے۔

اچھی ادبی تخلیقات اثر آفریں ہوتی ہیں اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ع

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

بڑے بڑے مصنفوں کے قلم میں جادو ہوتا ہے۔ وہ قاری کو کم از کم وقتی طور پر اپنا ہم خیال بنا لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز حکومت نے جوش کی نظم ضبط کی اور روسی حکومت نے نوبل پرائز پانے والے ناول کو اپنی قلم رو میں شائع نہ ہونے دیا۔ ایک اچھے ناول یا افسانے کا اثر کئی روز تک رہتا ہے اور شاید تحت الشعور میں بس کر رہ جاتا ہے لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ہمارے ملکوں کے سیاست داں ادبیات کا مطالعہ نہیں کرتے۔ قانون ساز ایوانوں کے بیشتر اراکین تو محض حرف شناس ہی ہوتے ہیں۔ جو پڑھے لکھے ہیں انھیں بھی ادبیات کے مطالعے کی فرصت نہیں۔

آج ادبیات کے علاوہ دوسرے موضوعات مثلاً تاریخ، معاشیات، سیاسیات، سائنس وغیرہ پر کثرت سے لکھا جا رہا ہے ادبیات کے طلبہ کے علاوہ دوسرے قارئین اپنے اپنے پسندیدہ موضوع کا مطالعہ کرتے ہیں۔

سردار جعفری نے سچ کہا ہے۔

"ادب حقیقت کو بدلتا ضرور ہے لیکن خارجی فطرت اور ماحول پر براہِ راست اثر انداز نہیں ہوتا... وہ پہلے انسان کے جذبات پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس طرح انسان میں داخلی تبدیلی پیدا کرتا ہے۔"[۱]

ادب کا اثر ہوتا ہے لیکن اُن پڑھے لکھوں پر جن تک اس کی رسائی ہو سکے۔ ابھی ملک میں خواندگی بہت کم ہے مستقبل میں جوں جوں خواندگی بڑھے گی ادب کے قارئین کا حلقہ وسیع تر ہوتا جائے گا۔ لیکن اب ایک اور خطرہ ہے۔ ملک کی ضرورتوں کے درپیش بجا طور پہ یہ زور دیا جا رہا ہے کہ فنون کی تعلیم کے مقابلے میں سائنس اور تکنیکی تعلیم کو زیادہ فروغ دیا جائے۔ ادبیات کا ہر پروفیسر اپنے بچوں کو انجنیری یا ڈاکٹری کی تعلیم دلا رہا ہے اور کسی انجنیر یا میڈیکل کالج کے پروفیسر یا ماہر معاشیات کے سامنے شعر و ادب کا ذکر چھڑ جائے تو وہ اسے بیکاری کے مشغلے سے زیادہ اہمیت نہ دے گا۔ آنے والی نسلوں میں تعلیم کے ساتھ ساتھ ادب کی مقبولیت اسی تناسب سے بڑھ جائے گی ایسا سوچنا خوش فہمی ہے۔ تعلیم کے فروغ کے معنی مطالعۂ ادب کا فروغ نہیں۔

جب یہ صاف نظر آتا ہے کہ سماج کے ارتقا میں جو طاقتیں کام کر رہی ہیں ادب ان میں سب سے پیچھے سب سے کم زور ہے تو پھر ادب میں مقصدیت کی بحث اپنی بہت کچھ معنویت کھو دیتی ہے۔

سماج کی بہتری کی کوشش کتنا مستحسن کام ہے لیکن یہ کام ادب کی نسبت صحافت، سیاسی کتابیں، سیاسی نیتا، ماہرین معاشیات، موجدان سائنس زیادہ حسن و خوبی سے سرانجام دے رہے ہیں۔ ادب کو بھی اس مبارک کام میں ہاتھ بٹانا چاہیے لیکن ادب اگر کبھی کبھار اس جد و جہد سے منہ موڑے تو بھی سماجی ترقی کی رفتار میں کوئی نمایاں فرق نہ پڑے گا۔ یہ مسلم کہ ادیب کو کوئی ایسی چیز پیش نہ کرنی چاہیے جو سماج کو مرجھا

۱؎ ترقی پسند ادب بار دوم ص ۲۹

انفرادی طرف سے جانے کا لیکن اگر وہ بعض اوقات ایسی چیزیں پیش کرے جو سوسائٹی کو مادی اعتبار سے دنیا میں نہ بنا سکیں بلکہ جذباتی سکون اور مسرت عطا کریں تو کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو :

سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں
بہار و کیف کی دنیا اتر آئے گی وادی میں
سرود و نور کا کرشمہ چھڑک جائے گی وادی میں۔
نسیم بادیہ منظر کو مہکائے گی وادی میں
شباب و حُسن کی بجلی سی لہرائے گی وادی میں
سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

(اختر شیرانی)

دُنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یا رب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو
مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم
امید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو

(اقبال)

میں نہیں کہہ سکتا کہ اس قسم کی تخیلات مفید ہیں کہ نہیں ہیں لیکن انھوں نے انسان کو ہمیشہ آسودگی بخشی ہے اور ہمیشہ آسودگی بخشیں گی مجھے مجنوں کے اس قول سے کامل اتفاق ہے۔

"اخبارات میں سوائے روح عصر کے کچھ نہیں ہوتا اور ادب میں علاوہ روح عصر کے بھی ایک عنصر ہوتا ہے جس کا تعلق ماورائے عصر سے ہوتا ہے اور جس کی بدولت وہ ادب ہر زمانے کی چیز بن جاتا ہے یعنی وہی واقعیت (Realism) اور تخیلیت (Romanticism) کا شیر و شکر ہونا۔ آج کل کے مشہور انگریزی نقاد جے۔ بی۔ پریسٹلی (J. B. Priestley) کا خیال بہت صحیح ہے کہ حسن کاری یعنی آرٹ کو زندہ رکھنے کے لیے تھوڑی سی افیون کی ضرورت ہمیشہ پڑے گی۔"

زندۂ جاوید ادب میں اس افیون کا شائبہ ضرور رہتا ہے لیکن افیون کی مقدار تھوڑی ہی ہونی چاہیے۔ زیادہ ہوگی تو وہ زندگی کے لیے سم قاتل ہے۔

۱؎ ادب اور زندگی باب دوم ص ۰۰

اہلِ نوایط کی اُردو خدمات کا ایک جائزہ

نصیر الدین ہاشمی

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جنوبی ہند میں مسلمان فوجی تزک و احتشام سے آنے سے صدیوں پہلے جہازوں کے ذریعہ پُرامن طریقے پر تجارت اور تبلیغِ اسلام کے لیے آچکے تھے۔ ان آنے والے مسلمانوں میں اہلِ نوایط کا بڑا حصّہ تھا۔ چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنی کتاب عرب اور ہند کے تعلقات میں حسب ذیل صراحت فرمائی ہے:۔

> "روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اور عربوں کا تیسرا مرکز ہندوستان کا وہ آخری کنارہ ہے جس کو ہندوؤں کے پرانے زمانہ میں کیرالا کہتے تھے اور بعد کو ملیبار کہنے لگے ...... ملیبار کے یہی مسلمان عرب تاجر اور سوداگر اور تارکینِ وطن ہیں جو موپلا اور نائت کے ناموں سے ہندوستان میں مشہور ہیں اور جن کے ہاتھوں میں پرتگیزوں سے پہلے تک سمندر کی باگ تھی ...... (صفحہ ۲۶ تا ۲۶۹)

ملیبار کے دوسرے مقابل ساحل کو عرب معبر کہتے تھے اس کا موجودہ مشہور نام کارومنڈل ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ساحل کا یہ حصّہ بھی چند صدیوں کے بعد عربوں کے استعمال میں آیا ہے۔ چند ہی صدی کے آخر سے اس کا نام سننے میں آتا ہے۔ ساتویں صدی میں یہاں عربوں کا اچھا خاصا عمل دخل معلوم ہوتا ہے۔ (صفحہ ۲۷۰ تا ۲۷۱)۔

اگرچہ مولانا سید سلیمان نے صرف کیرالا کے سلسلہ میں اہلِ نوایط کا ذکر کیا ہے اور کارومنڈل کے تذکرہ میں ان کا نام نہیں پایا گیا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ کیرالا کی طرح کارومنڈل میں اہلِ نوایط آئے ہیں۔ چنانچہ ندوی صاحب نے ساتویں صدی کا جو تذکرہ کیا ہے وہ ابنِ بطوطہ کے سفرنامہ سے ماخوذ ہے اس کی صراحت بھی ندوی صاحب نے فرمائی ہے۔ ابن بطوطہ کی صراحت خصوصیت سے پڑھنے کے قابل ہے جس کی صراحت آگے آتی ہے۔

یہ امر ہنوز تحقیق طلب ہے کہ اہلِ نوایط کس سنہ میں ہندوستان آئے۔ چونکہ تمام اہلِ نوایط شافعی مذہب کے پیرو ہیں اس لیے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ تیسری صدی ہجری کے بعد آئے ہوں گے۔ لیکن جو دوسرے تاریخی شواہد ملتے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تیسری صدی ہجری کے بہت پہلے ہی ہندوستان میں آگئے تھے۔ بہرحال ان کے ہندوستان آنے کا زمانہ صحیح طور پر ہنوز متعین نہیں کیا جاسکتا۔

اہلِ نوایط کے ہندوستان میں منتقل ہونے کے متعلق جو مواد ملتا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اوّلاً سواحل کارومنڈل اور کوکن پر اُترے اور جنوبی ہند میں دُور دُور تک پھیل گئے۔ جن مقامات پر اہلِ نوایط نے قیام کیا وہ کوکن، بھٹکل، بمبئی۔

گوا۔ گلبرگہ ۔ بیدر ۔ بیجاپور۔ حیدرآباد۔ ویلور ۔ ارکاٹ ۔ مدراس ۔ بنگلور ۔ میسور ۔ سدھوٹ ۔ کرنول وغیرہ مقامات ہیں ۔ ان میں سے اکثر مقامات پر اب بھی اُن کی خاصی تعداد موجود ہے ۔

اہل نوایط کا ذریعۂ معاش تجارت تھا اس کے ساتھ ہی وہ درس و تدریس تبلیغ اسلام کے کاموں میں پوری توجہ ، مشغولی اور انہماک سے مصروف عمل رہے ۔ جب وہ ہندوستان آئے تھے تو ان کی مادری زبان عربی تھی ۔ ہندوستان میں آکر بود و باش کرنے لگے ۔ تجارت اور تبلیغ اسلام میں مصروف ہوئے تو دیسی زبانوں کو حاصل کرنا ان کے لیے ضروری تھا ۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جنوب میں آپس کے میل جول سے زبان پیدا ہونے لگی یعنی قدیم اُردو میں اُن کا بڑا حصہ تھا ۔ مگر سردست اس کے متعلق بھی صحیح طور پر دلائل پیش نہیں کی جاسکتی ۔

دکن میں جب اسلامی حکومتیں ، بہمنی ، عادل شاہی ، قطب شاہی ۔ نظام شاہی ۔ مغلیہ اور پھر آصفیہ وغیرہ قائم ہوئیں اور ان میں سے اکثر حکومتوں کی سرکاری زبان فارسی تھی تو اہل نوایط نے بھی عربی کے ساتھ فارسی اور پھر اُردو کو اپنایا ۔

دکن کی ادبی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ یہاں عربی فارسی ایک عرصۂ دراز تک علماء اور فضلاء اور اصحاب علم کی تصانیف اور تالیفات کی زبان رہی حتیٰ کہ خطوط بھی فارسی میں لکھے جاتے تھے ۔ اگرچہ دکن میں سنہ ۸۰۰ ھ کے اوائل سے دکنی (قدیم اُردو) کا رواج رہنے کا ثبوت ملتا ہے ۔ اور نہ صرف بول چال بلکہ تحریر میں آجانے کا کثیر ذخیرہ ہم دست ہوگیا ہے لیکن اس کے باوجود علماء اور اصحاب علم میں فارسی کا ہی رواج عرصۂ دراز تک باقی رہا ۔ کیونکہ اکثر علماء اُردو میں تصانیف کرنے کو ' اپنی شان کی تصور کرتے اور پس و پیش کرتے تھے ۔ اظہار خیالات کے لیے اس کو ہی ادنیٰ تصور کیا جاتا رہا ۔

میرے مضمون کا عنوان اہل نوایط کی اُردو خدمات کا جائزہ ہے علمی خدمات نہیں ہے اس لیے اہل نوایط کے علمی و ادبی کارناموں کو جو عربی فارسی میں ہوئے نظر انداز کر کے صرف اُردو کے متعلق صراحت کی جاتی ہے ۔

اہل نوایط کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو واضح ہوتا اور اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ صدیوں سے اہل نوایط نے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا رکھا تھا اور اس قوم کے کئی مشاہیر اس خصوص میں نام آور ہوئے ہیں ۔ چنانچہ مشہور اسلامی سیاح ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامہ میں اس قسم کے دو بزرگوں کا حال اس طرح قلمبند کیا ہے :

" دوسرے دن صبح کو ہنور میں پہنچے ۔ یہ ایک بہت بڑی کھاڑی پر واقع ہے ۔ اس شہر کے عابدوں میں شیخ محمد ناگوری ہیں انھوں نے میری دعوت اپنی خانقاہ میں کی ۔ فقہ اسمٰعیل جو کلام اللہ پڑھاتے ہیں اس شہر میں رہتے ہیں ۔ وہ نہایت پرہیزگار خوش خلق اور فیاض .... اس شہر میں تیرہ مکتب لڑکیوں کے ہیں اور تیئیس مکتب لڑکوں کے ہیں ۔ یہاں کا بادشاہ جمال الدین ہے یہ سلطان ... کے ماتحت کر کچھ معین خراج دیتا ہے ۔ بادشاہ سلطان جمال الدین محمد بن حسن ہر ایک جماعت ... نماز پڑھتا ہے ۔ جب میں اس کے پاس ٹھہرا ہوا تھا تو افطار کے وقت مجھے بلایا کرتا تھا ۔ فقہ علی اور فقہ اسمٰعیل بھی موجود ہوتے تھے ۔ "

(ہنور کو اب ہونور کہتے ہیں احاطہ بمبئی میں شمالی کنڑا کے ضلع میں ایک تحصیل کا صدر مقام ہے۔ ملا علی جن کا تذکرہ ہے مُلّا علی ہاشمی تفسیر رحمانی کے مصنف ہیں اور فقہ اسمٰعیل راقم کے اسلاف میں شامل ہیں اس سے واضح ہے کہ اہلِ نوایط کرالا کے علاوہ کارومنڈل میں بھی آ گئے تھے۔ یعنی مُلک کوکن کا مرکز بنا ہوا تھا۔)

اس زمانہ کے بعد بھی اس قوم کے مشاہیر نے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کو جو ان کا آبائی ورثہ تھا متروک نہیں کیا۔ اہلِ نوایط کی عربی اور فارسی تصانیف کا سلسلہ ۱۳۰۰ھ کے بعد بھی جاری رہا۔ اگر مشاہیر نوایط کی صرف عربی فارسی تصانیف کی فہرست پیش کی جائے تو کئی سو کتابوں کا تذکرہ کرنا ہوگا۔ یہاں اس موقع پر دشوار ہے کیونکہ ہم کو صرف اُردو کا تذکرہ کرنا ہے۔ اوّلاً یہ بحث پیدا ہوتی ہے کہ اہلِ نوایط نے اُردو کی خدمت کی ابتدا کب سے کی ہے۔ اور کس نے اُردو کا نامہ پیش کرنے کا آغاز کیا۔

واضح ہو کہ اہلِ نوایط کا بڑا کارنامہ تبلیغ اسلام اور درس و تدریس کے ساتھ تجارت بھی رہا۔ زمانہ سابق میں عام طور سے تمام علماء و فضلاء اُردو کے قطع نظر عربی فارسی کو اپنے اظہارِ خیال کا ذریعہ قرار دیتے تھے چنانچہ ان ہی وجوہ سے سنہ ۱۳۰۰ھ (سنہ ۱۸۸۳ء) تک ہی ان کے فارسی یا عربی تصانیف دستیاب ہوئے ہیں حتّٰی کہ خطوط بھی عرصۂ دراز یعنی ۱۳۲۲ھ[1] تک بعض اصحاب فارسی میں لکھا کرتے تھے۔

اگر میں یہ صراحت کروں کہ قاضی محمود بحری وہ پہلے نائطی شاعر اور مصنف ہیں جنھوں نے قدیم اُردو میں طبع آزمائی کی ہے تو شاید یہ اعتراض کیا جائے کہ اب تک مورخین ادب نے قاضی صاحب کو نائطی نہیں لکھا ہے پھر کس طرح قاضی صاحب کو اہلِ نوایط میں شامل کیا جاتا ہے۔ اس خصوص میں مصنف تذکرہ گلزارِ اعظم کی صراحت قابلِ ملاحظہ ہے جو حسب ذیل ہے:

"مختار تخلص باقر حسین مخاطب بہ خطاب پدر خود حسن علی خان از اولاد قاضی محمود بحری از قوم نائطہ معززان این شہر است۔" صفحہ (۳۴۷)

یہ تذکرہ ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۶ء) میں طبع ہوا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ قاضی محمود بحری کی اولاد اس زمانہ میں موجود تھی اور اہلِ نوایط میں ان کو شامل کیا گیا تھا۔

اگر سرِدست قاضی محمود کے نام کو مزید تحقیق کے لحاظ سے حذف کر دیا جائے تو جس نائطی شخص کو اُردو کا پہلا نائطی شاعر تسلیم کرنا چاہیے وہ سعادت اللہ ہیں۔

یہ وہی سعادت اللہ خان ہیں جن کو عالمگیر نے ذوالفقار خان کے خطاب سے ارکاٹ کا صوبہ دار بنایا تھا۔ آپ کے دربار میں فارسی گو شاعروں کا ایک جمگھٹا ہوتا تھا۔ جن میں قزلباش خان، فضل اللہ خان۔ آغا محمد منیم دکھنی، رائے بست رائے وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ مصنف سعید نامہ (جو ان کے عہد کی تاریخ ہے) اس امر کی صراحت کرتا ہے کہ ان کے دربار میں شعراء کے کلام

---

[1] دادا صاحب امیر نواب شرف الدولہ جو راقم کے دادا تھے ۱۳۲۲ھ تک فارسی میں خط لکھا کرتے تھے۔

پر مباحثہ ہوتا تھا۔ خواص مثنوی اور منقبت کی تصانیف کا ذکر رہا کرتا۔ سعادت اللہ خان خود بھی شاعر تھے اور ان کو شعر کا اچھا مذاق تھا۔ فی البدیہہ شعر کہا کرتے۔ ایک مرتبہ بیجاپور کے شاعر عبداللہ ذکی نے اپنی درخواست شعر میں پیش کی . . . . . .
. . . . . . محرم میں اکثر اوقات دکنی زبان میں مرثیے کہا کرتے جو فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے اپنی آپ نظیر ہوتے
افسوس ہے کہ ان کا کوئی مرثیہ دستیاب نہیں ہوا۔ ۱۲۲۲ھ میں ان کا انتقال محمد پور (ارکاٹ) میں ہوا۔ بہرحال موجودہ معلومات کے لحاظ سے اہلِ نوایت میں ان کو پہلا اردو گو شاعر تسلیم کرنا صحیح ہو سکتا ہے۔

اب مضمون کو سہولت کی غرض سے چند ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے تاکہ ہر دور کی اُردو خدمات کا حال واضح ہو سکے۔ حسب ذیل ادوار قائم کیے جائیں گے۔

پہلا دور	ماقبل سنہ ۱۸۰۰ء تا سنہ ۱۸۰۰ء
دوسرا دور	سنہ ۱۸۰۱ء تا سنہ ۱۸۵۷ء
تیسرا دور	سنہ ۱۸۵۸ء تا سنہ ۱۹۰۰ء
چوتھا دور	سنہ ۱۹۰۱ء تا سنہ ۱۹۴۷ء
پانچواں دور	سنہ ۱۹۴۷ء تا سنہ ۱۹۶۳ء

ان ہی ادوار کے تحت یہاں مختصر صراحت کی جاتی ہے۔ امید ہے کہ موجب دلچسپی ہوگی۔

پہلا دور

ماقبل سنہ ۱۸۰۰ء تا سنہ ۱۸۰۰ء

اس دور میں اہلِ نوایت کی اُردو خدمات کے سلسلہ میں صرف شاعری اور نثر نگاری کی صراحت کی جاتی ہے۔ اس دور کے کئی ایک نوایت کے نظم اور نثر نگاری کے ذخیرے دستیاب ہوئے ہیں۔ جن شعراء اور نثر نگاروں کو پیش کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہیں:۔

مولوی محمد باقر آگاہ — ان کے والد بیجاپور کی عادل شاہی حکومت کے خاتمہ کے بعد ویلور (علاقہ مدراس) آ گئے اور باقر آگاہ کی ولادت، نشو و نما اور تعلیم و تربیت ویلور میں ہوئی۔ آپ ۱۱۵۸ھ میں تولد ہوئے اور مدراس میں ۱۲۲۰ھ میں انتقال فرمایا۔ آگاہ کی عربی فارسی تصانیف کی تعداد (۳۰۳) ہے۔ اس میں سے (۱۹) اُردو میں۔ تمام کتابیں نظم میں ہیں اور مثنوی کی صورت میں ہیں مگر اکثر کتابوں میں کئی صفحوں کا دیباچہ نثر میں ہے۔ ان کتابوں میں اشعار کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہوتی ہے۔ مثنویاں بجز ایک کے باقی تمام سوانح سیرت و مناقب نبوی کے عنوان پر لکھی ہیں خصوصیت سے عورتوں کے لیے ان کتابوں کو لکھنے کا تذکرہ کیا گیا ہے کیونکہ اصحاب علم عام طور سے عربی فارسی میں تعلیم پاتے اور ان ہی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ عورتوں کے لیے یہ سہولت نہیں تھی اس لیے باقر آگاہ نے خصوصیت سے عورتوں کا تذکرہ کیا ہے۔

باقر آگاہ کا کلیات بھی ہے جس میں اصنافِ سخن کے کئی اقسام مثلاً قصیدہ، غزل، رباعی، قطعہ، مرثیہ سب کچھ شامل ہیں۔ اگرچہ آگاہ کو خاندان والاجاہی ارکاٹ کے دربار سے زیادہ تعلق رہا مگر ان کا کوئی قصیدہ والیٔ ملک کی مدح اور ستائش میں نہیں ہے بلکہ تمام قصاید نعتیہ ہیں، آگاہ کی بلند کرداری کی یہ ایک عمدہ مثال ہے۔ آگاہ کی مثنویوں، قصیدہ اور غزل کے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں۔

آنحضرت صلعم کی سخاوت کا تذکرہ

سخاوت میں کوئی اوس کا ثانی نہیں — نہ تھا جود کون اس کی . . . نہیں
سوال سون دیا اُونٹ روز حسین — غریبان کون او خلق کا نورِ عین
بقول ہوازن دیا چھے ہزار — درم او شہنشاہ عالی تبار
نے یک مسلمان کون او بے بدل — دیا یک جنگل بھر کو بجری سیگل
کہاں قوم کون جا کو اے گریبان — محمد اوپر لاؤ ایمان جان
سخاوت کون اوس کی نہیں انتہا — جو ظاہر سخاوت کا ہے مدعا
میں رحمت کا اوس کی کرون کیا بیان — سراپا ہے اوس کوں خدا در قرآن
دکھا رحمت العالمین اوس کا نام — رؤف رحیم بھی اے شاد کام
شہنشاہ کی رحمت اسے نام ور — ابھی سب پر حتیٰ کہ شیطان و دہر

اُمت میں نبی کی جو ہیں عورات — افضل ہیں سب عورتان سے سُن بات
لکھتا ہوں میں اس کتاب اندر — احوال نساء کا اے برادر
اس شاہ کی دختران کا احوال — اس شاہ کی عورتان کا احوال
اُمت میں جو عورتان تھے کامل — تھا قربِ خدا کا ان کو حاصل

غزل کا نمونہ:۔

فریاد میری تیرے تغافل کو بڑھایا — کیا خوب ملا ثمر مجھے میری فغان کا

کرن سے گلرو کی جلوہ گاہ ہے تاب اندر شراب
یوں جھلکتی ہے جواب میرے گلاب اندر شراب

دل میں میرے سماتی نہیں داستان شوق
کس طرح سے کروں میں پیارے بیان شوق

جب لگائے خندہ دل کو میرے شرار
پانی ہی بھرتے بھرتے سزا اپنی پائے چشم

ہے میری جان و دل پر حکم غمزہ کا تیری نافذ
مگر تقدیر کے نایب ہیں تیری آج کل انکھیا

ہستی سے تنگ دل ہوں اب نیستی کی
پھر کاش اس جہان سے ہو جاؤں بے خبر میں

جو چشم تجلی سے تیرے دور پڑے ہیں
حیرت میں ہموں کر تو نے مجبور پڑے ہیں

عشق بن ہم تو کچھ گنہ نہ کیا
بے گنہ ہوں کر کیوں ستاتے ہو

جب سے ہم تجھکو یک نظر دیکھے
تجھکو ہر شے میں جلوہ گر دیکھے
تو ہی منظور چشم و دل ہے سدا
کیا ہوا گر ادھر ادھر دیکھے
کب شعلہ زار عشق کا دل تاب لا سکے
ذرہ میں آفتاب کہاں سے سما سکے

رباعی :-

تا دل میں سماتا ہے تیرا عکس جلال
نہ آنکھ میں ماتا ہے تیرا نورِ جمال
ہیں ملک و ملک میں جتنے ارباب کمال
تمہید میں تیرے ہو گئے یکسر لال
اس گریہ و زاری و دُعا سے توبہ
اس توبہ پر عجب دریا سے توبہ
پستی کی علامات ہیں یہ سب چیزیں
یا رب یہ علامات بلا سے توبہ

۲- دیوان

زین العابدین نام دیوان تخلص۔ علی دوست خان فرزند حسین خان دوست خان چندا صاحب کے داماد تھے۔ فارسی اور اردو میں شاعری کرتے تھے۔ صاحب گلدستہ کرناٹک اور تذکرہ گلزار اعظم میں آپ کا حال درج ہے۔
افسوس ہے کہ ان کے دیوان کے غزلیات وغیرہ دستیاب نہیں ہونے۔ صرف مرثیوں کا مواد دستیاب ہوا ہے۔ نمونہ پیش ہے :

آج سلطان پیمبر پر ہے غم — شاہ مردان شبیر اکبر پر ہے غم
سخت ہے خاتون جنت غم میں — شاہِ دین شبیر و شبر پر ہے غم

کیا کربلا میں آل عبا پر ستم ہوا — جب اور امام دوسرا پر الم ہوا
آل رسول حق پہ تظلم کا حال دیکھ — ... کے دل عیش بکام عدم ہوا
مانند گور غم سوں بکربلا .... تشنہ دان — عالم پہ پی جب سُنے ایجاد غم ہوا

. . . .

افسوس کیا کہ غم سوں کہے دوکے زار زار
دیوان پر کیا یوما تم جسم ہوا اٹھ

۱؎ کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد - رقعات امام اللہ حسینی - ادب نثر فارسی (۱۴۴)

مرثیہ :-

ہوا ختم یارغم سوں سرو بستان نبوت کا
ہوا بادظلم سوں گل شمع بزم ولایت کا
سدا غم نگینی دو عالم کوں کیا ہے چاند ماتم کا
سکایا ہے نہال عیش کوں یا دختران غم کا
دھلیا تخت امامت جب منے سروں دو عالم کی
گھڑی . . . . رہنی حرف ختم کا
ہوا ختم شہادت قتل خاک کربلا مین جب
خوشی کا نام مجلسوں کم ہوا ہے جام جیوں جم کا

. . . .

شفاعت . . . . کوں کریں گے ساقی کوثر
رکھیا ہوں اس امید کوں اس شاہ مکرم کا
سدا دیوان ردیا حسین کا غم سو شہیداں کی
چھتر ہے سر پہ اس کی گرد اہل بیت اکرم کا

مرثیہ :- کربلا جب مقتل شہزادۂ اکمل ہوا
خاک اس کا بر زمین آسمان افضل ہوا
غم کیوں نہ ہو دو عالم کوں محیط
آفتاب دین کی مغرب عرصہ کربل ہوا

---

(۳) اس دور کے ایک اور شاعر عجز ہیں :-

غلام تقی الدین نام تھا۔ ارکاٹ میں ۱۲۱۱ھ میں تولد ہوئے اور ۱۲۹۲ھ میں مدراس میں انتقال ہوا۔ والا جاہ کے تیسرے فرزند عظیم اللہ ولد کی تعلیم اور تربیت سے متعلق کئی فارسی کتابوں کے مصنف ہیں اپنے انتقال تک درس و تدریس میں مشغول رہے۔ فارسی اور اردو میں دیوان مرتب کیے تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں جو فارسی اور اردو میں ہیں۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔

ہے خبر عشق بتاں سے تھا میرا دل افسوس
اس بچارہ پہ بہشت تنسہ ہیں آنکھیں

یار کے عشق نے جب سے مجھے سرشار کیا
چشم انگار کو . . . . خون بار کیا
ہمیں کعبہ و دیر سے نہیں کچھ کام
کہ ہر جا ترا جلوہ ہم دیکھتے ہیں
کیا تیری چشم کا پیمانہ ہے
حسن جس لسر کا مستانہ ہے
مدت گزر گئی نہ سنی یار کی خبر
اس شوخ دلربا نے غم خوار کی خبر
معجز خیال ہستی موہوم کو وداع
درپیش ہے سفر مجھے دار البقا طرف
ایک دم جلنے پر مت لاف کرلے پروانہ
شمع کو دیکھ کہ تا صبح جل جاتی ہے

مختار

باقر حسین نام مختار تخلص ۔ قاضی محمود بحری کے پوتے تھے ۔ فارسی شاعری میں اچھی دست گاہ حاصل تھی ۔ مشاعر اعظم میں شریک ہوا کرتے ۔ اپنے دادا کی طرح اردو سے بھی دلچسپی تھی ۔ تصوف سے بھی شغف تھا ۔

افسوس ہے کہ اردو کلام اب تک دستیاب نہیں ہوا ہے ۔

ان کے علاوہ کئی اور شعرا کا پتہ چلتا ہے جو اس دور میں اردو کی خدمت کرتے تھے ۔ بہرحال اردو کی خدمت شاعری کے لحاظ سے کئی اصحاب نے کی ہے ۔

شاعری کی طرح نثر نگاری کی جانب بھی اہل نوایط نے توجہ کی تھی اس دور کی نثر کا نمونہ پیش ہے ۔

(۱) مولانا باقر آگاہ کی نثر کا نمونہ یہ ہے :-

اگرچہ باقر آگاہ نے اردو نثر میں اپنی کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی ہے مگر اکثر نظم کی کتابوں میں طویل دیباچہ نثر میں قلمبند کرتے رہے ہیں جس میں اردو کی تاریخ اور تنقید بھی آگئی ہے ۔ چنانچہ یہاں اس قسم کا ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے ۔ جو نصرتی کے متعلق گویا تنقید ہے ۔

" متعصب کو یک طرف رکھ کر کلیات سودا کو بنظر ملاحظہ کر کر انتخاب کرنے اور ان سبھوں کو یک

داستان گلشن عشق یا علی نامہ سے مقابلہ دیوے تو انداز سے اس کی ادراس کی باقی واقف ہوئے۔ سودا کو چھوڑئے جس شاہ فارسی کرے چاہے خواہ قصاید میں ہوں خواہ مثنوی میں لے مقابل کیا جائے۔ بالفعل بھی مہرواہ یحاسنے فن طرازی باقل نشان رازی کتیں نقشہ مہرواہ کا ہے گلشن عشق سے مواجہ کر دیکھئے تا معنی مثل دکھنی کے ہاتھ کنگن کو آرسی کیا کا خوب سمجھے۔"

کب نصرتی سُن کے یہ دولہ　　　　ملا بعد مدت کے مجکو صلہ
کہا سوداکیتیں انصاف سے　　　　کہ صدقے کرد مجکو آگاہ سے

---

(۲)

مولوی محمد غوث شرف الملک عربی فارسی کے عالم متبحر تھے۔ چند سال تک ریاست ارکاٹ کی وزارت عظمیٰ کے فرائض انجام دیے مگر اپنے علمی مشاغل میں اس ملازمت کو حارج قرار دے کر مستعفی ہوئے۔ آپ کی تصانیف کی تعداد (۲۱) ہے جو عربی اور فارسی میں ہیں۔ آپ کی ایک کتاب جو فقہ کا ترجمہ ہے اُردو میں ہے۔ آپ سنہ ۱۱۹۲ھ میں تولد ہوئے اور سنہ ۱۲۳۸ھ میں انتقال ہوا۔ نمونہ نثر یہ ہے:-

"جان تو بے شک بندہ جانچا گیا ہے درمیان اس کے کہ فرمانبرداری کرے وہ اللہ برتر کی پس ثواب پاوے اور درمیان اس کے کہ نافرمانی کرے اس کی پھر عذاب کیا جاوے اور جانچ اللہ کی موقوف ہے ساتھ عمل شرع کے اور ساتھ عمل غیر شرع کے۔"

تبصرہ اگرچہ اس پہلے دور کے شعرا اور نثر نگاران کی تعداد زیادہ نہیں ہے مگر شعرا نے اصناف سخن کے تمام شعبوں میں اپنے فکر کی جولانیاں کمائی ہیں۔ مثنوی۔ قصیدہ۔ غزل۔ رُباعی۔ قطعہ اور مرثیہ میں اپنے خیالات کے تخیل کے جوہر پیش کیے ہیں۔ ان کی شاعری اسلوب کی جدت طرز ادا کی ندرت اور تخیل کی بلند پروازی کے لحاظ سے قابل داد ہی ہے۔ انھوں نے اس وقت کی عام اور سلیس زبان کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا تھا۔

دکن کے دوسرے شعرا داستانوں میں اپنے افکار کو زیادہ سے زیادہ پیش کرتے رہے مگر نامی شعرا نے عشقیہ داستانوں کے بجائے۔ سیرۃ مناقب۔ سوانح، فقہ اور عقاید کے مضمون کو اپنے خیالات کی جولان گاہ بنا رکھا تھا۔ انھوں نے باوجود تقرب شاہی مدحیہ قصاید پیش کرنے سے اجتناب کیا۔ نعتیہ قصاید پیش کرتے رہے۔

دُوسرا دور

سنہ ۱۸۰۰ء تا سنہ ۱۸۵۷ء

اس دور کے کئی شعرا کا تذکرہ تذکرہ گلزار اعظم میں موجود ہے جن میں سے بعض فارسی کے ساتھ اُردو میں بھی

جیع آزمائی کرتے تھے۔ مگر افسوس ہے ان شعرا کا اُردو کلام سردست بہدست نہیں ہوا۔ اس دور کے فارسی گو شعرا جن کا تذکرہ گلزار میں ہوا ہے ان کے نام حسب ذیل ہیں:۔

(۱) آگاہ، علی رضا خان (۲) احمد، قاضی احمد (۳) انست، حکیم اشرف الدین (۴) رفیع، حسن علی (۵) احسن، سید محمد اسحٰق (۶) برہان، سید برہان الدین (۷) بیہوش، محمد قادر علی متوفی سنہ ۱۲۲۰ھ (۸) جودت، غلام حسینی (۹) حیدری، غلام حسن متوفی سنہ ۱۲۱۳ھ (۱۰) ذہن، علی دوست (۱۱) رسا، محمد رحمت اللہ (۱۲) شایان، محمد اسلم متوفی سنہ ۱۲۲۴ھ (۱۳) صاحب، غلام علی (۱۴) عزت، عبدالقادر (۱۵) عتیق، محمد صبغۃ اللہ (۱۶) فرحت، محمد صبغۃ اللہ (۱۷) لائق، غلام دستگیر (۱۸) مختار، باقر حیدر (۱۹) نجمین، اشرف الدین (۲۰) گوہر، محمد باقر خان (۲۱) نصرتی، افضل خان (۲۲) وازح، حکیم شاہ زین العابدین (۲۳) افسر

ان میں سے بعض کے اُردو میں شعر کہنے کی صراحت کی گئی ہے مگر افسوس ہے کہ ان کا اُردو کلام تذکرہ مذکور میں نہیں ہے اور دُوسرے ذرائع سے سردست کوئی کلام نہیں ملا ہے۔

جن شعرا کا کلام بہدست ہوتا ہے ان کی صراحت کی جاتی ہے:۔

(۱) ملک محمود نام جوہر تخلص تھا۔ کرنول کے جاگیردار تھے۔ والیٔ کرنول کے مصاحبوں میں شامل تھے۔ آپکے فرزند غلام حیدر گوہر اور پوتے غلام حیدر شہوار تخلص بھی شاعر تھے۔ جوہر کا قلمی دیوان کُتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔

چاہ میں اوس مہ کنعان کی جو میں ڈوب رہا
میری آنکھوں کی مدد گریۂ یعقوب رہا

قیامت کا مجھے کیا ڈر ہے اپنے دل کو اے جوہر
بھروسہ ہے پیمبر کا بھروسہ ہے پیمبر کا

بوسہ دے لبوں کا تو کہا چشم کالی ہے
شکر سے بھی شیریں ہے بادام محبت

آج آنے سے تیرے میرا ہُوا گھر آباد
تا قیامت رہے تو اور تیرا گھر آباد

تم آؤ بیٹھو میرے لال لال آنکھوں میں
رکھوں گا پتلی سا تم کو سنبھال آنکھوں میں

اس چشم پُر خمار میں جوہر نہیں ہے دل
یک سوختہ کباب ہے جام شراب میں

یوں دُرِ اشکِ غمِ شاہ نجف سے نکلے
ایسے موتی نہ کبھو صافِ صدف سے نکلے

یاد تیری مجھے اے ساقی کل رات لگی
ہچکی شیشے کو بھی فی الفور بہ سرعت لگی
جہاں اوس اختر روشن کی جلوہ گاہ رہی
بشکل قبلہ نما اپنے بھی نگاہ رہی

عجب اپنی بنی ہے شکل اوس کے عشق میں جوہر
نہ طاقت وصل کی ہے مجکو نہ تاب جدائی ہے

۲۔ ناظر غلام عبدالقادر نام اور ناظر تخلص۔ قادر اعظم خان خطاب، دربار ارکاٹ سے ملا تھا۔ سنہ ۱۲۰۰ھ میں ولادت ہوئی اور سنہ ۱۲۴۳ھ میں انتقال ہوا۔ ناظر تخلص تھا۔ ریاست ارکاٹ کے مہر سامان اور مہتمم کتب خانہ تھے۔ فارسی اور اُردو میں طبع آزمائی کرتے تھے۔

بہار اعظم۔ شرح سکندر نامہ۔ گلستان نسب اُن کی تصانیف ہیں۔

۲۔ ذکا حبیب اللہ نام۔ ذکا تخلص۔ سنہ ۱۲۴۴ھ میں تولد ہوئے اور سنہ ۱۲۹۲ھ میں وفات پائی۔ اگرچہ آپکا انتقال سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہوا ہے مگر آپ کی شاعری کا آغاز اور اُس کے پختہ ہونے کا زمانہ سنہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کا ہے اس لیے آپ کا تذکرہ قدرے کیا گیا ہے۔

ذکا نے غالب سے بھی اصلاح سخن لی اور غالب کو اپنے شاگرد رشید پر فخر تھا۔ ذکا اصنافِ سخن کی ہر شاخ میں طبع آزمائی کرتے تھے قصیدہ، غزل، مثنوی میں ذکا کا مزاحیہ کلام بھی ملتا ہے۔

ذکا کے متعلق غالب کی صراحت یہ ہے :-

ا۔ یہ کلام کسی بادشاہ کا نہیں کسی امیر کا نہیں کسی شیخ و شاب کا نہیں ۔ یہ کلام میرے ایک دوست روحانی کا ہے اور فقیر دوست کے کلام کو معرض اصلاح میں بنظر دشمنی دیکھتا ہے

پس جب . . . . . . بنیں ادا نہیں   تو جو مجھ کو نظر آتا ہے بے حیف

میں کہوں کا نثر میں نعمت خان عالی کے طرز کا احیا کیا ہے مگر پیرایہ کچھ اور دیا ہے ۔ قصاید میں انوری کا پیرہ اٹھایا ہے مگر طبیعت نے اعجاز دکھایا ہے ۔ غزل میں متاخرین کا انداز عاشقانہ سوز و گداز منشی محمد حبیب اللہ صاحب ذکا سخن رس سخن دان و یکتا نکتہ طراز ۔ آفرین آفرین صد آفرین صد ہزار آفرین ۔"

اس سے واضح ہو سکتا ہے کہ ذکا کا شاعری میں کیا درجہ تھا ۔ نمونہ ملاحظہ ہو ۔

اے خداوند کار بندہ نواز   فی المثل تو طبیب میں بیمار
ہے جگہ رحم کی تیرے آگے   کہ میں چلاؤں روؤں زار نزار
شعر و انشا کی قدر ایک طرف   ہوں میں چودہ برس کا کارگزار
اتنی مدت ہوئی مگر نہ ہوا   کسی صورت سے ملزم سرکار
چاہتا ہی رہا کوئی خدمت   جس میں دو ماہ ہوئے بیش قرار
ہے میری ذات میں وہ استعداد   کہ نہیں شیوا میرا استعداد
ہے کوئی کام جو نہ دوں انجام   کون سا گھاٹ جو نہ اتروں پار
بس ذکا دیکھی تیری لسانی   باادب ہے یہ آصفی دربار

فاضل کبھی مجھ سے وہ ستمگر نہ ہوا تھا   یعنی کہ میں اندیشۂ محشر نہ ہوا تھا
اچھا کیا پہلی سے جو رخصت کی شادی   مرنے کا مرے وقت مقرر نہ ہوا تھا

نازک تم ایسے ہو تو مجھے کیا امید قتل
ایک ہاتھ کی تو ہاتھ میں تلوار چاہیے

تمام ہو گیا کام اپنے روتے رونے میں
بہانا اشک کا پس موت کا بہانا ہوا

مجھ سے سامنا کے تجھے دیکھتے نہیں
ہندوں کو اپنے عجز پہ کتنا غرور ہے

گیسو و رُخ کا بوسہ دو
چاند گہن ہے صدقہ دو
بیسٹر لگی ہے اوپر اوسکے
آگے سے سر کو رستہ دو

میرا جنازہ اُٹھتا ہے
تم بھی آکر کندھا دو

قابو نہیں جو چھا... پر اونکے پاؤں میں
گنگا کو سات گھاٹ کا پانی پلاؤں میں
ہاتھ گرمی سے میرے نفس کے جل جائیگا
موسیٰ بن جاؤ گے یا حضرت عیسیٰ دیکھو

قائل ہوں میں غالب کے ذکا طرزِ سخن کا
ایسا کوئی دلّی میں سخنور نہ ہوا تھا

طاعت کی کس کو سوجھتی ہے حد نفس میں
کعبہ کو کون جائے جو گھر میں حرم رہے

زلفیں عنبک پہنے کی رہے خط سبز ہے
کیوں حال کچھ مدک کے بھی چہرے اُڑا... میں

اس دور کے نثر کے نمونہ کے لیے ہم حریف قاضی بدر الدولہ کو پیش کرتے ہیں جن کی تصانیف کی آج بھی مانگ ہے۔

مولوی محمد صبغۃ اللہ

مولوی محمد صبغۃ اللہ[۱]۔ مولوی محمد غوث شرف الملک کے چھوٹے فرزند تھے۔ سنہ ۱۲۱۱ھ میں تولد ہوئے اور سنہ ۱۲۸۰ھ میں انتقال ہوا۔ مدراس کی جامع مسجد میں مدفون ہیں۔

مولوی محمد صبغۃ اللہ نے اپنے زمانہ کے جید علماء سے تعلیم حاصل کی اور اپنے ذوق و شوق سے بہت جلد فارغ التحصیل ہو گئے۔ حدیث، فقہ، تفسیر، تاریخ، فلسفہ کے علاوہ ریاضی، ہیئت اور طب میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے۔

اعظم جاہ اور غلام غوث خان کے زمانہ میں خدمات صدارت قضات اور مفتی سے سرفراز تھے اولاً عمدۃ العلماء بدر الدولہ قاضی الملک معتمد جنگ کا خطاب ملا۔ پھر امام العلماء منصف الدولہ۔ معدلت خان قاضی الاسلام مستعد جنگ کے خطاب سے موسوم ہوئے مگر آپ زیادہ تر قاضی بدر الدولہ کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔

قاضی بدر الدولہ ایک بلند پایہ مصنف تھے۔ عربی، فارسی کے علاوہ آپ اُردو زبان کے بھی مصنف ہیں۔ آپ کی دیگر کتابوں سے قطع نظر اُردو کتابیں (۱۳) ہیں جن کی فہرست حسب ذیل ہے۔

شمار	نام کتاب	فن	کیفیت
(۱)	ریاض النسواں	فقہ	خاص کر عورتوں کے لیے لکھی گئی ہے۔
(۲)	رسالہ در احکام عدت	"	بیوہ عورتوں کے لیے مرتب فرمایا تھا۔
(۳)	فواید بدریہ	سیر	آنحضرت صلعم کی مکمل سیرت ہے۔
(۴)	بہشت گلزار	"	ابو بکر صدیق کے حالات ہیں۔
(۵)	نثر الجواہر	"	شیخ عبدالقادر جیلانی کے حالات
(۶)	خزانہ معدلت	اخلاق	
(۷)	توشہ فلاح	مناسک	حج کے مناسک
(۸)	قوت الارواح	"	توشہ فلاح کی شرح ہے۔ کتاب کی ضخامت بڑے سائز کے ۸۰۰ صفحے ہیں۔ عربی میں بھی کوئی کتاب اس فن میں اتنی ضخیم نہیں ہے۔
(۹)	گلزار ہدایت	عقاید	
(۱۰)	ترجمہ حصن حصین	حدیث	
(۱۱)	حواشی بر مسلم	"	

۱؎ تاریخ احمدی و تاریخ النوایط

۱۱۴	فیض الکریم	تفسیر	یہ مکمل نہیں ہوئی تھی کہ مصنف کا انتقال ہوگیا۔

باقر آگاہ نے جس کام کو شروع کیا تھا اس کو قاضی بدرالدولہ نے پوری طرح ترقی دی اور نظم کی بجائے نثر میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا چونکہ آپ کی زبان لحاظ ارتقا تدریجی زیادہ صاف تھی اس لیے اب آگاہ کی جگہ آپ کی کتابوں نے لے لی۔ حقیقت میں اس لیے آپ کی تصانیف کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔

فوائد بدر۔ سیرۃ النبی کی بہترین کتاب ہے۔ سنہ ۱۲۶۸ھ میں اس کی تالیف ہوئی ہے۔ اس کے دو باب ہیں۔ پہلے باب میں پیدائش سے وفات تک کے حالات درج ہیں اور دوسرے باب میں صورت اور سیرت، اخلاق و عادات کا ذکر کیا گیا ہے۔

پہلے باب میں جو واقعات بعثت و ہجرت کے سنین کے لحاظ سے بیان کیے گئے ہیں اور دوسرے باب میں شمائل کا ایسا بے مثل خلاصہ مرتب کیا ہے جس سے زیادہ واضح اور بہتر اور ناممکن ہے۔ عربی الفاظ کے لیے نہایت موزوں و مناسب الفاظ لکھنا اور پھر ایسا کہ پڑھنے والے کو اردو زبان کا لطف آئے اور نامانوس الفاظ نہ معلوم ہوں درحقیقت کامیاب کوشش ہے۔ اس امر کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ فی زمانہ بھی ایسی مستند اور مکمل کتاب معدودے چند ہی ہوں گے۔

اس کتاب کا ایک جدید ایڈیشن حال ہی میں حیدرآباد سے شائع ہوا ہے۔ قاضی بدرالدولہ کی دیگر اردو کتابیں بھی اسی طرح قابلِ قدر ہیں۔ شرح ترشہ فوح مناسک میں ایک ایسی گراں قدر کتاب ہے کہ فارسی تو کجا عربی میں بھی ایسی کوئی کتاب نہیں ہے۔ ہشت گلزار میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی مفصل سیرت لکھی گئی ہے جو اپنی حیثیت سے اردو زبان کی تنہا کتاب ہے۔

قاضی بدرالدولہ نے زبان اردو کی جو خدمت انجام دی ہے وہ فراموش نہیں ہو سکتی۔ اب تک ان کی تصانیف کا مروج رہنا خود اس امر کی دلیل ہے کہ ایک صدی کے بعد بھی وہ اسی طرح قابلِ قدر ہیں۔ قاضی صاحب کی عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

"آنکھیں حضرتؐ کے بڑے تھے اور آنکھوں میں سرخی تھی اور حلقہ بہت سیاہ تھا۔ جب حضرت دیکھتے تو پورا دیکھتے اور آنکھیں نیچے کرتے۔ پیشانی مبارک کشادہ تھی اور بھوں دونوں ملے ہوئے اور کمان دار تھے اور اس کے موے پر سے تھے۔ بینی مبارک ہموار باریک اور بیچ میں بلند تھی اور دہن شریف بلند تھا۔ دندان مبارک نہایت سفید روشن براق آبداری اور رونق کے ساتھ تھے۔"

آنحضرت صلعم کی بزم کا حال اس طرح قلمبند فرماتے ہیں:۔

"بعد عروج صحابہ کو کوری آنکھ دیکھنے لگا کہ حضرت کے روبرو نہایت ادب بیٹھتے ہیں اور کچھ کام فرمائے تو اس کو کرنے دوڑتے اور وضو کیے تو اس پانی کو پینے ایک پر ایک گرتے ہیں اور بات پکار نہیں کرتے اور تعظیم سے حضرت کی طرف نظر جماتے ہیں۔"

ایک جنگ کے واقعات کو یوں تحریر فرمایا ہے:۔

"مسلمانان بھی اپنی فوج آراستہ کر کر ان کے مقابلہ میں گئے اس قدر جنگ ہوا آخر زید بن حارثہ نیزوں
کے ماروں سے زخمی ہوئے اور نشان کے تئیں جعفر بن ابی طالب نے لے کے جنگ پر مستعد ہوئے دونوں
لشکر جب باہم خلط ہوئے جعفر گھوڑے پر سے اُتر کر اس کے ٹاپنے مار کے جنگ شروع کیے۔ سیدھا
ہاتھ اُڑ گیا بائیں ہاتھ میں نشان لیے۔ وہ بھی کٹ گیا تو چھاتی سے لگائی آخر شہید ہوئے۔"

مصنف مرحوم کی سب سے پہلی تصنیف ریاض العنوان ہے جس کو آپ نے سنہ ۱۲۲۴ھ میں تصنیف فرمایا جب کہ آپ کی عمر (۱۹) سال کی تھی۔ یہ فقہ شافعی کی بہترین کتاب ہے جس میں عقاید و احکام طہارت و عبادت بشرح بسیط جمع کیے ہیں۔ اس کتاب نے جس قدر عام نفع پہنچایا ہے اس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تمام ضروری مسائل عام فہم زبان میں بیان کر دیے گئے ہیں کہ سامنے پھر دُوسری کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ دیباچہ میں فرماتے ہیں۔

"کتابان فقہ شافعی کے عربی زبان میں بہت تصنیف ہوئے ہیں لیکن عورتاں اور اکثر عوام الناس
کے تئیں زبان عربی سے کچھ آشنائی نہ ہونے کے سبب سے ان کے حاصل کرنے سے قاصر رہتے
ہیں اس واسطے یہ عاجز چند مسایل فقہ کے زبان ہندی میں جمع کیا تا لوگاں مستفید ہوں۔"

اس کے بعد آپ نے مختلف باب میں اپنی کتاب کو تقسیم کیا ہے اور اس کو کتاب کا نام دیا ہے مثلاً کتاب الایمان، کتاب الطہارت، کتاب الصلوٰۃ وغیرہ اور پھر ان میں فصل مقرر کیے ہیں جن میں مختلف مسائل کو بیان کیا ہے۔ مسائل کے بیان کا طریقہ یوں ہے:-

"اول رُکن اسلام کا بعد از کلمہ توحید کے نماز ہے اور نماز بے طہارت کے درست نہیں اور پانی مستعمل
یعنی ٹھنڈا پانی جو ایک بار کسی فرض کام میں آیا ہے اگرچہ پاک ہے لیکن پاک کرنے والا نہیں ہے۔
فرض کام کیا مثلاً اس پانی سے غسل فرض یا وضو فرض کیا ہووے یا کوئی نجاست دُور کیا ہووے۔"

آپ کی آخری تصنیف تفسیر فیض الکریم ہے جس کو آپ نے صرف سات پاروں تک ختم فرمایا تھا کہ سنہ ۱۲۸۰ھ[۱] میں پیام اجل آپہنچا۔

نفس مضمون کے پہلے آپ نے نزول قرآن اور اُس کے جمع کرنے اور تفسیر و تاویل پر بحث کی ہے اور پھر سورہ فاتحہ کی تفسیر اور اُس کی فضیلت بیان کی ہے۔ آپ کی تفسیر کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے قرآن کی آیت لکھتے ہیں اور اس کے معنے بیان کرنے کے بعد اس پر بحث کرتے جاتے ہیں۔ سحر کا حکم، کسب مباح۔ ریا، شفاعت، خدا رسول اور اولی الامر کی اطاعت، خلق آدم علیٰ سورۃ، جہاد کرنے والے کا مرتبہ، اجماع امت، تحریف انجیل، ذبح وغیرہ عنوانات پر کافی بحث کی ہے چونکہ مصنف کی یہ آخری تصنیف ہے اس لیے نمونہ اس کا بھی درج کرنا بے جا نہ ہوگا۔

---

۱ تاریخ النوائط

• واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً • اور مضبوط پکڑو اللہ کی رسّی سب مل کر۔ اللہ کی رسّی سے مراد اللہ کا دین ہے یعنی دین اسلام کو اختیار کرو اس کو رسّی سے تعبیر کیا کیونکہ باریک تنگ راہ میں گرنے اور پیر پھسلنے کا اندیشہ ہو جسے تو رسّی جس کے دونوں طرف راہ کے دو جانب سے باندھے ہوں پکڑے تو اس کو خوف نہیں رہتا۔ حق کی راہ بھی بہت باریک تنگ ہے اکثر لوگوں کے پیر اس پر لغزش پاتے ہیں جس نے دین اسلام مضبوط پکڑا اس نے خوف سے نجات پایا۔ بعض کہتے ہیں اس سے مراد قرآن ہے کیونکہ جو اس کے احکام پر چلے گا تو اس کو نجات ہوگی۔ الخ۔

نزول الٰہی کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

• اللہ تعالیٰ اُترتا ہے کر کے جو آیا ہے اس سے اللہ کی رحمت اور بندوں پر متوجہ ہونا اور اُن پر لطف اور مہربانی کرنا مُراد ہے۔

اس مختصر بیان سے اس امر کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ قاضی بدرالدّولہ کی وجہ سے زبانِ اُردو نے مذہبی علوم کے دائرہ میں کہاں تک ترقی کی تھی۔

تبصرہ

دُوسرے دور کا تذکرہ ختم ہو چکا اس دور میں سردست جن شعرا اور نثر نگاروں کا تعارف کیا گیا ہے ان کے کارنامے تاریخ اُردو ادب میں خصوصیت رکھتے ہیں۔ ہندی والے بھی ان کو اپنی تاریخ میں نمایاں طور سے جگہ دیتے ہیں۔ ان کی خدمات ہر آئندہ قابلِ تحسین ہیں۔ اگرچہ سنہ ۱۸۵۰ء کے قبل صرف شاعری اور نثر نگاری کے سوا دُوسرے اُردو خدمات نہیں ہوئے یعنی کسی علمی اخبار، رسالہ یا انجمن کا تذکرہ نہیں ہوا ہے۔

تیسرے دور میں شاعری اور نثر نگاری کے علاوہ دُوسرے اُردو خدمات کا حال بھی قلم بند کیا جائے گا۔

(باقی آئندہ)

---

۱ قاضی بدرالدولہ کی تمام کتابیں شایع ہو گئی ہیں اور ریاض الصنوان کے ترکی کئی اڈیشن شایع ہوئے ہیں۔ ابھی حال میں یہ دونوں کتابیں حیدرآباد سے شائع کی گئی ہیں۔

حضرت آغا شاعر

محمد حبیب اللہ رشدی

حیدر آباد دکن میں ۱۹۳۲ء کا غالباً اکتوبر کا مہینہ تھا۔ ایک روز میں، میرے محترم بزرگ مولانا سید مختار احمد مرحوم، اپنے چھوٹے بھائی جناب سید مرغوب احمد مرحوم کے ہاں گئے۔ انھوں نے بڑی مسرت اور مباہات کے ساتھ ہمیں یہ خبر سُنائی کہ ــــــ "میرے اُستاد حضرت آغا شاعر قزلباش تشریف لائے ہوئے ہیں اور شہید یار جنگ کے ہاں مقیم ہیں ــــــ" میں نے بڑے اشتیاق سے اُن سے درخواست کی کہ ہمیں بھی وہاں لے چلیں۔ انھوں نے کہا ــــــ "وہاں جانے کی ضرورت نہیں، حضرت قبلہ روز صبح ٹہلتے ہوئے یہاں تک آجاتے ہیں۔ آپ کل علی الصبح یہاں آجائیں تو ملاقات ہوجائے گی اور اطمینان سے بات چیت بھی کرسکیں گے۔" ہم نے کہا ــــــ "بہت اچھا کل صبح ہم ضرور یہیں آجائیں گے۔"

میرے ان دونوں بزرگوں کے والد، عربی کے جید عالم، مولانا سید عبداللہ ٹونکی تھے جنھوں نے انیسویں صدی کے اواسط میں مصر کے جامعہ ازہر میں عربی کی تکمیل کی تھی، اس کے بعد کئی مرتبہ مصر آتے جاتے رہے تھے۔ عربی زبان پر انھیں اتنی قدرت حاصل ہوگئی تھی کہ بے تکلف شعر کہتے تھے۔ ان کے ایک بے نقط مدحیہ قصیدہ کو دیکھ کر توفیق پاشا خدیو مصر نے تعجب کا اظہار کیا تھا اور لارڈ ڈفرن وائسرائے ہند کے نام ایک سفارشی خط دیا تھا۔ جناب سید مرغوب احمد مرحوم نے اپنے والد کے ورثہ علم و ادب میں سے اپنا حصہ رسدی بڑے بھائی سے طلب کرنا شاید خلافِ ادب سمجھا اس لیے اس سے دست بردار ہوکر اپنے لیے ایک ایسا میدان عمل تلاش کرلیا تھا جو نہ صرف خاندانی روایات کے لحاظ سے نیا تھا بلکہ خود شہر حیدر آباد کے لیے بھی نیا نیا تھا۔ انھوں نے اُس زمانہ میں ــــــ یعنی بیسویں صدی کے آغاز میں ــــــ موٹر کار کی سی نئی نئی ایجاد کی مشینری سے واقفیت حاصل کی تھی اور بیمار موٹروں کو ٹھیک ٹھاک کرنے میں کمال پیدا کیا تھا۔ ان کا کارخانہ جس میں موٹروں کی اور دُوسری عام مشینری کی مرمت کی جاتی تھی، حیدر آباد کی ایک بارونق سڑک پر تھا۔ کارخانے سے ملا ہوا اپنے رہنے کا مکان بھی بنوا لیا تھا۔ اُن کی آمدنی ہزاروں روپیہ ماہوار کی تھی۔ وہ ہمارے سامنے کئی مرتبہ اپنے اُستاد حضرت آغا شاعر کا ذکر کرچکے تھے۔ شاگردی کا یہ تعلق تیس سال پہلے کا تھا جبکہ حضرت آغا شاعر اپنے اُستاد حضرت داغ دہلوی کی زندگی میں حیدر آباد میں قیام فرما تھے۔ میں خیال کرتا تھا کہ جناب مرغوب احمد صاحب کو نوجوانی میں شاعری کا چسکا پڑا ہوگا اور اتفاقات نے حضرت آغا شاعر کے سے خوش گو شاعر کا شاگرد بننے کا موقع فراہم کردیا ہوگا۔

حضرت آغا شاعر نے ریاست جھالرا پاٹن (راجپوتانہ) سے ایک ماہوار رسالہ "آفتاب" جاری کیا تھا۔ یہ رسالہ میں نے حیدر آباد کے کسی کتب خانہ میں یا کسی کالج میں یا کسی اہلِ علم کے ہاں نہیں دیکھا۔ صرف جناب مرغوب احمد کے ہاں ۱۹۲۱ء میں دیکھا تھا جبکہ میں فرسٹ ایر میں زیرِ تعلیم تھا۔ اس وقت حضرت آغا شاعر کو حیدر آباد سے گئے ہوئے اٹھارہ انیس برس ہوچکے تھے۔ لوگ انھیں

بھلا چکے تھے۔ جس انہماک اور اشتیاق سے رسالہ "آفتاب" کا مطالعہ کیا کرتا تھا اس کو دیکھ کر جناب مرغوب احمد صاحب نے اس کے بہت سے پرانے شمارے مجھے دے دیئے تھے جن کو میں نے تقسیم ہند کے وقت تک بڑی احتیاط سے رکھا تھا۔ لیکن حیدرآباد سے میری منتقلی کے دوران میں بہت سی کام کی کتابوں کے ساتھ ساتھ "آفتاب" کے سارے پرچے خبر نہیں کہاں ہجرت کر گئے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وطن کی محبت نے انھیں میرے ساتھ ہجرت کرنے نہیں دی۔ اس وقت میری کتابوں میں صرف ایک نومبر ۱۹۲۱ء کا پرچہ رہ گیا ہے۔

جناب مرغوب احمد مرحوم کی زبانی حضرت آغا شاعر کی آمد کا میں نے جو ذکر کیا ہے اس زمانے میں حضرت جوش ملیح آبادی ہمارے مکان سے چند قدم کے فاصلہ پر ایک باغ والے بنگلے میں اُٹھ آئے تھے۔ اُن دنوں ہمارا یہ معمول تھا کہ میں صبح سویرے تیار ہو بیٹھتا تھا کہ حضرت جوش ملیح آبادی تشریف لاتے ہم دونوں تفریح کے لیے "باغ عامہ" جاتے جو قریب ہی تھا۔ گھنٹہ آدھا گھنٹہ گھوم پھر کر سورج نکلنے کے بعد اپنے اپنے گھروں کو واپس آجاتے۔

جس روز حضرت آغا شاعر سے ملاقات کا ارادہ تھا، اُس روز بہت ہی سویرے سے میں اور حضرت مولانا مختار احمد صاحب تیار ہو کر باہر نکلنے ہی والے تھے کہ جناب جوش کا ڈنڈا دروازے پر برسا۔ میں فوراً باہر نکلا۔ تشویش یہ تھی کہ حضرت جوش غزل کے مخالف ہیں، اس لیے حضرت آغا شاعر کے سے قدیم غزل گو سے ملنا پسند بھی کریں گے یا نہیں۔ میں نے جناب جوش سے کہا ——— "حضرت آغا شاعر آئے ہوئے ہیں، وہ صبح سویرے مرغوب احمد صاحب کے کارخانہ تک آتے ہیں۔ اس وقت میں مولانا سید مختار احمد صاحب کے ساتھ وہیں جا رہا ہوں، کیا آپ بھی تشریف لے چلیں گے؟" ——— یہ میں نے کچھ ایسے منفعل لہجے میں کہا جس کا جواب میرے نزدیک یقینی انکار تھا۔ لیکن میری توقع کے خلاف جناب جوش نے بھی حضرت آغا شاعر سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا۔ حضرت جوش سے پہلے جناب مرغوب احمد کوئی نئے آدمی نہیں تھے۔ حضرت جوش کی موٹر کار کو اکثر بیمار پڑ جانے کی عادت تھی اس کی وجہ سے یہ دونوں مدت سے ایک دوسرے سے متعارف تھے۔

غرض، ہم تینوں جناب مرغوب احمد کے ہاں پہنچے۔ وہ اپنے کارخانے کے پھاٹک کے سامنے کھڑے انتظار کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا ——— "حضرت قبلہ بس اب آتے ہی ہوں گے" ——— پھر یہ کہا ——— "یہاں انتظار کرنے کے بجائے کیوں نہ ہم خود اُدھر چلے چلیں؟" ——— ہم لوگ تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ دور سے حضرت آغا شاعر آتے دکھائی دیے۔ جناب مرغوب احمد صاحب نے کہا ——— "دیکھیے وہ تشریف لا رہے ہیں۔" ——— انھوں نے آغا صاحب سے ہمارا تعارف کرایا۔ اب ہم سب آغا صاحب کے ساتھ کارخانے کی طرف پلٹے۔ وہاں پہنچنے سے پہلے جناب مرغوب احمد صاحب نے آغا صاحب سے کہا ——— "حضرت آپ کو حیدرآبادی نہاری کھائے بہت زمانہ ہو گیا ہوگا، یہاں قریب ہی ایک نیا ہوٹل کھلا ہے جس میں نہاری کا بھی انتظام ہے۔ اگر کوئی حرج نہ ہو تو نہاری کھائی جائے" ——— آغا صاحب نے کہا ——— "ہاں، ہاں، چلیے چلو" ———

یہ صحبت دیر تک رہی۔ گفتگو میں جناب مرغوب احمد اور جناب جوش ہی زیادہ حصہ لیتے رہے .... کبھی کبھی حضرت مولانا مختار احمد بھی ایک آدھ فقرہ فرما دیتے تھے۔ میں خاموش تماشائی بن کر

اس افسانوی ہستی کی باتیں سُنتا رہا جس کا برسوں سے ذکر سُن چکا تھا۔ میرے لڑکپن میں حیدرآباد دکن میں ایک غزل بہت گائی جاتی تھی جس کا مطلع ہے:

یہ کیسے بال بکھرے ہیں یہ صورت کیوں بنی غم کی
تمہارے دشمنوں کو کیا پڑی ہے میرے ماتم کی

ادبی شعور پیدا ہونے کے برسوں بعد مجھے یہ معلوم ہوا کہ یہ غزل حضرت آغا شاعر کی تھی۔ میرے لڑکپن میں حیدرآباد میں حضرت داغ کا بڑا چرچا تھا۔ انہیں انتقال کیے چند ہی سال ہوئے تھے۔ شہر میں اُن کے کئی شاگرد موجود تھے جو اُستاد مانے جاتے تھے۔ ایک شاگرد حضرت نادان تھے جو حضرت داغ سے قرابت بھی رکھتے تھے۔ ایک صاحب ضیاء الدین ضیا گورگانی تھے جن کی بیوی حضرت داغ کی اہلیہ کی قریبی عزیزہ تھیں۔ اس لحاظ سے وہ گویا حضرت داغ کے داماد تھے۔ غالباً حضرت داغ ہی کے تعلق سے حیدرآباد آئے تھے اور سرکاری ملازم ہو گئے تھے۔ یہ مُغلیہ شہزادے تھے۔ "صاحب عالم" پکارے جاتے تھے۔ غزل کے معاملے میں کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ (اُنھوں نے طویل عمر پائی۔ تقسیم ہند سے سال دو سال پہلے مجھے ایک مرتبہ اُن سے نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا تھا اور چند غزلیں اُن کی زبان سے سُنی تھیں۔ اُس وقت اُن کی عمر اسّی پچاسی سال کی تھی) ایک طوائف بھی بقیدِ حیات تھیں جو حضرت داغ کی ملازمت میں رہ چکی تھیں۔ اکثر شاگردانِ داغ اس معمر خاتون کی بڑی عزت و تعظیم کیا کرتے تھے۔ بعض شاگرد مشاعرے میں جانے سے پہلے اُن کو اپنی غزل سُنانا باعثِ برکت سمجھتے تھے اس لیے اُنھیں غزل سُنائے بغیر مشاعرے میں نہیں جاتے تھے۔ ایک حضرت بارق تھے جن کا اُسی زمانے میں انتقال ہو چکا تھا۔ ان کے ایک عزیز میرے ہم محلہ اور لڑکپن کے ملاقاتیوں میں سے تھے۔ مجھ سے عمر میں بڑے تھے۔ ہم لوگوں کو اپنی غزل سُنا کر بڑا رُعب جماتے تھے۔ بعض واقف کار کہتے تھے کہ ——— اس کے ہاں حضرت بارق کا کلام ہے۔ اُنھیں کی غزلیں ہیں جو یہ اپنے نام سے سُناتا ہے۔ اس کو تو ایک مصرع بھی موزوں کرنا نہیں آتا۔

غرض، ۱۹۳۲ء میں حضرت آغا شاعر کے سامنے بیٹھ کر اُن کی باتیں سُنتے ہوئے لڑکپن کی ساری باتیں حافظے میں اُبھر آئیں۔ داغ پرستی کا زمانہ گزر چکا تھا۔ یونیورسٹی سے ہر سال بیسیوں گریجویٹ نکل رہے تھے۔ مولانا سید وحید الدین سلیم پانی پتی اُردو کے پروفیسر تھے۔ غزل دشمنی اُن کی علیت کا جزوِ ایمان تھی۔ اُن کی تلقین اور تبلیغ سے بہت سے شاگرد غزل اور غزل گوئی کے خلاف ہو کر کالج سے نکلتے تھے جن کے نزدیک داغ اور امیر شاعر ہی نہیں تھے۔ ہاں خوب یاد آیا ——— ایک مرتبہ حضرت سلیم کے مکان پر ہم چند طالب علم بیٹھے ہوئے۔ مولانا حسبِ عادت، غزل کے خلاف تشنیع اور تضحیک کے تیر چلا رہے تھے۔ رفتہ رفتہ داغ بھی زیرِ بحث آ گئے۔ میرا ادبی شعور داغ پرستی کی فضا میں بیدار ہوا تھا، مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے جو کچھ عرض کیا اُس کا مفہوم کچھ اس قسم کا تھا کہ کچھ ہی ہو داغ کو شاعر نہ ماننا بڑا ظلم ہے۔ اس پر حضرت سلیم بپھر گئے۔ کہنے لگے ——— اچھا داغ کا کوئی ایسا شعر سُناؤ جسے تم واقعی شعر سمجھتے ہو ——— حضرت سلیم نے اس تیقن کے ساتھ یہ فقرہ فرمایا تھا کہ میں جو بھی شعر سُناؤں گا اُس میں وہ تضحیک کا کوئی نہ کوئی پہلو نکال ہی لیں گے۔ کچھ غور کے بعد مجھے داغ مرحوم کا یہ شعر یاد آیا:

ہم مر مٹے تو پرسشِ نام و نشاں ہے اب   اس کی تلاش کر کہ محبت کہاں ہے اب

خدا بخشے [illegible] مرحوم کی بہت سی خوبیوں میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ حق ناشناس نہیں تھے۔ مجھ سے یہ شعر سُن کر کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ تضحیک یا تشنیع کا کوئی پہلو نظر آیا۔ دھیمے لہجے میں یہ فرمایا —— "بھئی، کہتے کہتے غزل کہنے ایک آدھ اچھا شعر بھی سرزد ہو جاتا ہے —— یہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا!" —— غرض حضرت آغا شاعر کی سحر کُن گفتگو کی وجہ سے وہ صحبت دیر تک جمی رہی۔ رخصت کے وقت حضرت آغا سے آئندہ ملاقات کے وقت و قیام کا تعین کر کے ہم لوگ گھر واپس ہوئے۔

اس کے بعد حضرت آغا شاعر سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ رفتہ رفتہ مجھ پر بڑی نظرِ عنایت فرمانے لگے تھے۔ ان ملاقاتوں میں مجھے جو باتوں کا علم ہوا ان میں ایک یہ بھی تھی کہ انھوں نے تھیٹروں کے لیے کئی ڈرامے بھی لکھے تھے جو تھیٹریکل کمپنیوں کے مالکوں کو فروخت کر دیے گئے اور بکے بھی تھے۔ حضرت آغا شاعر سے جب حشر کاشمیری کا ربط ضبط بڑھا تو ایک مرتبہ آغا حشر نے کہا —— "تمہارے نام کے ساتھ یہ آغا کا لفظ بہت اچھا لگتا ہے۔ اگر تم بُرا نہ مانو تو میں بھی اپنے تخلص کے ساتھ یہ لفظ استعمال کروں" —— آغا شاعر نے فرمایا —— "اس میں بُرا ماننے کی کیا بات ہے۔ شوق سے یہ لفظ استعمال کیجیے" —— آغا صاحب نے بڑی صاف دلی کے ساتھ یہ بھی فرمایا تھا کہ —— "ڈرامے کے معاملے میں آغا حشر کے ڈراموں کی قدر میرے ڈراموں سے زیادہ تھی۔ انھیں اپنے ڈرامے کے دو ہزار روپیہ ملتے تھے اور مجھے صرف ایک ہزار۔"

آغا صاحب کو اپنے منظوم ترجمہ قرآن مجید کی طباعت کی بڑی فکر تھی۔ ۱۹۳۲ء میں حیدرآباد دکن آنے کا ایک بڑا مقصد یہی تھا۔ منجملہ اور باتوں کے ہماری گفتگو کا موضوع زیادہ تر اسی مقصد کی تکمیل کے سلسلے میں پیروی اور تدبیر کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ مسلمانوں کے قومی زوال کے اسباب میں اس خاص سبب پر بہت کم غور کیا جاتا ہے کہ حقیقی خادمانِ علم و ادب کے ساتھ ہمارے صاحبانِ اقتدار کس درجہ مجرمانہ تغافل سے کام لیتے ہیں۔

انگریزوں کے دورِ حکومت میں صرف چند والیانِ ریاست اور اُمرا نے ادبی سرپرستی کے فرض کو پہچانا۔ ایسی ریاستوں میں حیدرآباد کی ریاست کو شاید پہلا درجہ حاصل تھا اور ریاست کے امرا میں مہاراجہ کشن پرشاد کا نام سرِفہرست تھا۔ افسوس ہے کہ حیدرآباد میں حضرت آغا شاعر نے جن صاحبانِ اقتدار کی سرپرستی پر بھروسا کیا انھوں نے اس فرض کو نہ پہچانا۔ آغا صاحب کی بزرگی، اُن کی زبان دانی اور شعر گوئی میں اُن کے وسیع تجربے وغیرہ کا کوئی لحاظ نہیں کیا گیا، ورنہ منظوم ترجمہ قرآن مجید کی طباعت کے اخراجات کی منظوری اور آغا صاحب کا ایک معقول وظیفہ علمی کا جاری ہونا کچھ مشکل بات نہیں تھی۔ ڈھائی مہینے کی تگ و دو کرنے کے بعد آغا صاحب کو مایوس ہونا پڑا۔

(۲)

مولانا سید مختار احمد مرحوم کے کتب خانہ میں ماہنامہ رسالہ "زبان" کے ایک سال کے پرچے مجلد تھے۔ یہ رسالہ دہلی کے ایک ہندو رئیس[1] نکالتے تھے۔ میں نے حضرت آغا شاعر کا نام اس میں دیکھا تھا۔ میں نے بڑے شوق سے اس کا مطالعہ کیا تھا۔ مگر اب مجھے یاد نہیں کہ

---

[1] لالہ جیشور پرشاد مائل دہلوی۔

رسالہ "زبان" کی وہ جلد کس سنہ کی تھی البتہ اتنا یاد ہے کہ اس کے ایک شمارے میں حکیم محمود خاں دہلوی کی وفات کا تذکرہ تھا۔ پرچہ کے مالک نے اپنی والدہ کی علالت کا حال بیان کر کے یہ بتایا تھا کہ حکیم صاحب مرحوم نے کیسا عجیب علاج کیا تھا۔ حکیم محمود خاں دہلوی کی وفات ۱۸۹۱ء میں ہوئی اس لیے رسالہ "زبان" کی وہ جلد بھی اُسی سنہ کی ہوگی۔

حضرت داغ دہلوی ۱۸۹۱ء سے پہلے حیدرآباد دکن آ چکے تھے اور امیدوار ملازمت تھے۔ فروری ۱۸۹۱ء میں مرحوم حضور نظام میر محبوب علی خاں نے اپنی غزلوں کی اصلاح اُن کے ذمّہ کی۔ تنخواہ ایک ہزار روپیہ ماہوار منظور ہوئی۔ بعض لوگ بارہ سو اور بعض پندرہ سو بھی بتلاتے ہیں۔ میرے قدیم کرم فرما مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی نے اپنی کتاب "دکن میں اُردو" میں دو ہزار بتائی ہے غرض اس سال سے حضرت داغ کو ذریعۂ معاش سے اطمینان حاصل ہوا۔ داغ کی شہرت تمام ہندوستان میں تھی۔ وہ پہلے دربار رام پور سے وابستہ تھے۔ نواب کلب علی خاں مرحوم کی وفات کے بعد رام پور میں نہ رہ سکے۔

شاہ دکن میر محبوب علی خاں کے اُستاد بن جانے کے بعد حضرت داغ حیدرآباد کے رؤسا اور شرفاء سے بھی روشناس ہوئے اور شعراء سے بھی۔ حیدرآباد میں اُن کے بہت سے شاگرد تھے۔ ڈاک کی سہولتوں کے عام ہو جانے کی وجہ سے سارے ہندوستان سے اصلاح کے لیے غزلیں آنے لگیں۔ حضرت علامہ اقبال نے بھی چند غزلیں اصلاح کے لیے بھیجی تھیں۔

قیاس یہ ہے کہ حضرت آغا شاعر بھی اپنی غزلیں اصلاح کے لیے بذریعہ ڈاک حیدرآباد بھیجنے لگے ہوں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ رسالہ "زبان" سے آغا صاحب کا تعلق منقطع ہونے کے بعد اُنھوں نے حیدرآباد آنے کا ارادہ کیا ہو اور اُستاد سے مشورہ کر کے حیدرآباد کا رُخ کیا ہو اور دہلی سے اپنی روانگی کی اطلاع بھی کر دی ہو۔ لیکن دُوسرا قیاس یہ ہے کہ آغا صاحب کے کوئی بزرگ جو پہلے سے حیدرآباد میں مقیم تھے اور حضرت داغ سے ربط رکھتے تھے وہی اُستاد شاگرد کے درمیان متوسّل رہے ہوں۔ یہ قیاس اس بناء پر قائم ہوتا ہے کہ آغا صاحب نے "بزمِ داغ کے چشم دید نقوش" کے عنوان سے جو سلسلۂ مضامین لکھا ہے اُس میں اپنے خلاف شاگردانِ داغ کی ایک سازش کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ——— "مجھ سے یہ ساری کہانی چچا صاحب مرحوم نے نقل کی تھی" ——— بہرحال "حیدرآباد" میں اُستاد شاگرد کی پہلی ملاقات ایک دلچسپ لطیفہ ہے جو یہاں پیش کرتا ہوں۔

حضور نظام میر محبوب علی خاں مرحوم کے زمانے تک حیدرآباد کے امرا قدیم مغلیہ دربار کے امرا کا نمونہ تھے۔ ایک نواب خان خاناں تھے جن کے متعلق مشہور تھا کہ وہ شہنشاہ اکبر کے مشہور سپہ سالار عبدالرحیم خان خاناں کی اولاد سے تھے۔ ایک مہاراجہ کشن پرشاد تھے جن کے خاندان کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ راجہ ٹوڈرمل کی نسل سے ہے۔ ایک راجہ شیوراج رائے رایاں تھے جو کایستھ قوم کے تھے اور مشہور تھا کہ اُن کے جدِّ اعلیٰ، بانیٔ سلطنت آصفیہ نظام الملک آصف جاہ اوّل کے محاسب اعلیٰ یا جدید اصطلاح میں وزیر فینانس تھے اور اُنھیں کے ساتھ دہلی سے دکن آئے تھے۔ ان کے علاوہ امرائے پائیگاہ اور دُوسرے بڑے بڑے جاگیردار بھی تھے جو سلطنت آصفیہ کے رُکن رکین تھے۔

مہاراجہ کشن پرشاد، حضور نظام میر محبوب علی خاں کے ساتھ کھیلے تھے۔ ریاست کا ایک قدیم عہدہ "پیشکاری" (یعنی پرسنل سیکرٹری کا) تھا جو مہاراجہ کا موروثی عہدہ بن گیا تھا۔ یہ عہدہ اگرچہ نام کا عہدہ رہ گیا تھا اور کوئی فرائض اس سے متعلق نہیں تھے مگر ریاست

سے اس کی تنخواہ برابر جاری تھی۔ حضور نظام مرحوم نے انھیں جدید طرز کی حکومت یعنی مجلس وزرا (کیبنٹ) میں پہلے پہل اُن کو وزیر افواج بنایا تھا اور بعد میں "دیوان" یعنی وزیر اعظم بنا دیا تھا۔ وہ اس عہدے پر مرحوم حکمران کی وفات تک کارگزار رہے۔ موجودہ نظام میر عثمان علی خاں نے اپنی تخت نشینی کے بعد انھیں وزارت عظمیٰ سے ہٹا دیا اور سر سالار جنگ اوّل کے پوتے نواب یوسف علی خاں سالار جنگ ثالث کو وزیر اعظم بنایا تھا۔ علم و ہنر کی قدر دانی اور شرفاء نوازی میں مہاراجہ کشن پرشاد کے برابر کوئی دوسرا امیر نہیں تھا۔

جس زمانے میں حضرت آغا شاعر حیدر آباد گئے ہیں، مہاراجہ کشن پرشاد جوان تھے، شعر و شاعری سے بڑا شغف رکھتے تھے، مشاعروں کی خود صدارت کرتے تھے۔ آغا صاحب کے بیان سے تو یہ اطلاع ملتی ہے کہ اکثر "چندو لعل کی بارہ دری" میں بزم مشاعرہ منعقد ہوتی تھی۔ مہاراجہ کشن پرشاد دیوان چندو لعل شاداں کے پرنواسے اور اُن کی جاگیر، املاک اور عہدۂ پیشکاری کے وارث تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ مشاعرے انھیں کے ایما سے ہوتے تھے اور سرکاری مشاعرے سمجھے جاتے تھے۔

آغا صاحب جب حیدر آباد پہنچے تو اُنھوں نے محلہ دار الشفا میں اپنے ایک دوست سید حسن مرزا صاحب دہلوی اودوسیر کے ہاں قیام کیا لیکن یا تو ریل ہی میں بیمار ہو گئے تھے یا شہر میں داخل ہوتے ہی مرض نے حملہ کیا۔ مرض کچھ اس قسم کا تھا کہ معالجہ کے لیے اُن کا ہسپتال میں داخل ہونا ضروری ہو گیا۔ چنانچہ حیدر آباد کے صدر ہسپتال میں جو "دواخانۂ افضل گنج" کہلاتا تھا، داخل ہو گئے۔ کئی روز زیر علاج رہنے کے بعد ان کی طبیعت ٹھیک ہوئی اور ڈاکٹر نے گھر جانے کی اجازت دے دی۔ شفاخانے سے باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ آج ہی شام کو سرکاری مشاعرہ ہے۔ مصرع طرح پر ایک پھڑکتی ہوئی غزل کہی اور شام کو مشاعرے میں جا پہنچے۔ مہاراجہ کشن پرشاد صدر مشاعرہ تھے۔ ان کے قریب حضرت داغ تشریف فرما تھے۔ آس پاس اُس عہد کے نامور شعرا اور اُدبا جمع تھے۔ مشاعرہ شروع ہوا۔ جب شمع آغا صاحب کے سامنے آئی تو آغا صاحب نے حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا کہ —— "میرا منشا یہ ہے کہ میں اپنا ناچیز کلام سنانے سے پہلے تبرکاً اپنے استاد کا کچھ کلام سناتا ہوں۔ اس وقت میں اپنے اُستاد کے دو اشعار پیش کرتا ہوں" —— یہ کہہ کر آغا صاحب نے اپنے اُستاد کا نام لیے بغیر دو اشعار سنائے۔ اشعار سن کر شاگردانِ داغ اور خود حضرت داغ سنّاٹے میں آ گئے کہ یہ کون شخص ہے جو میرے اشعار کو اپنے اُستاد کے اشعار کہہ کر سنا رہا ہے۔ حضرت داغ نے پوچھا —— "آپ کے اُستاد کون ہیں، ذرا ان کا نام بتا دیجیے" —— آغا صاحب نے بلند آواز سے کہا —— "میرے اُستاد ہیں حضرت فصیح الملک نواب مرزا خاں داغ دہلوی" —— مہاراجہ بہادر نے چپکے سے پوچھا "یہ کون صاحب ہیں؟" اُستاد داغ نے فرمایا —— "میں نہیں جانتا، آج پہلی مرتبہ یہ صورت دیکھی ہے" —— پھر اُستاد داغ نے پوچھا —— "آپ کون صاحب ہیں، ذرا اپنا نام بتائیے" —— آغا صاحب نے کہا —— "جی میں آغا شاعر ہوں" —— داغ نے کہا —— "ارے بھئی آغا تم کب آئے؟ مجھ سے کیوں نہیں ملے؟ ذرا یہاں آؤ" —— آغا صاحب قریب گئے۔ اُستاد نے گلے سے لگا لیا۔ پھر پوچھا —— "تم مجھ سے ملے کیوں نہیں" —— آغا صاحب نے کہا —— "بتائیے؟ آتے ہی بیمار پڑ گیا، ہسپتال میں داخل ہوا۔ اتنے دن ہسپتال میں رہا لیکن آپ نے خبر تک نہ لی۔"

اُستاد سے مل ملا کر اپنی جگہ جا بیٹھے جو غالباً نو مشق شعرا میں تھی۔ صدر مشاعرہ مہاراجہ کشن پرشاد نے کہا —— "آغا صاحب ذرا قریب آ جائیے" —— آغا صاحب جھجک جھجک کر کچھ آگے بڑھے۔ مہاراجہ نے کہا —— "اور آگے آئیے" —— آغا صاحب

اور آگے بڑھ کر ہمارا بجرے کے قریب پہنچ گئے۔ ہمارا بجر نے کہا ـــــــ "اور آگے آئیے" ـــــــ اس سے آگے بڑھنے میں ادب مانع تھا۔ آغا صاحب نے جھلا کر کہا ـــــــ "تو کیا حضور کی گود میں آ بیٹھوں؟" ـــــــ آغا صاحب کی اس جھلاہٹ پر ہمارا بجر زیرِ لب مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ آغا صاحب نے غزل سنائی اور خوب خوب داد پائی۔ یہ تھی شاگرد کی اُستاد سے پہلی ملاقات!

۱۹۲۱ء میں آغا صاحب نے اپنے رسالہ "آفتاب" میں ایک نہایت دلچسپ سلسلۂ مضامین شروع کیا تھا۔ جس کا عنوان تھا ـــــــ "بزمِ داغ کے چشم دید نقوش" ـــــــ اس سلسلہ کا غالباً پہلا مضمون یہی واقعہ تھا جس کو میں پڑھ چکا تھا۔

۱۹۳۲ء میں آغا صاحب سے جو ملاقاتیں رہیں اُن میں ایک روز میں نے اس واقعہ کا ذکر چھیڑ دیا۔ آغا صاحب نے تفصیل کے ساتھ سارا واقعہ سنایا۔ رسالۂ آفتاب میں جو کچھ چھپا تھا وہ بہت مختصر تھا۔ خود آغا صاحب کی زبان سے اس واقعہ کو سن کر جو مزا آیا وہ چھپے ہوئے مضمون سے کہیں زیادہ تھا۔

افسوس ہے کہ میں اُن سے یہ نہ پوچھ سکا کہ وہ پہلی مرتبہ کس سنہ میں حیدرآباد تشریف لائے تھے کچھ تو اُن کی بزرگی کا رعب اور کچھ میری حیثیت' اِن دونوں نے میرے لبوں پر مُہر سی لگا دی تھی۔ وہ جو کچھ فرماتے اُسے سن لینا ہی اپنی خوش قسمتی سمجھتا تھا۔ اپنی طرف سے کوئی سوال کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ صرف حضرت جوش ہی ایسے آدمی تھے جو اپنے شوخ ظریفانہ فقروں سے اُن مرحوم کو مُسکرانے پر مجبور کر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ جناب جوش کے ہاں (اسی باغ والی کوٹھی میں) حضرت آغا شاعر تشریف فرما تھے' میں بھی موجود تھا۔ جناب جوش نے نہایت اصرار کے ساتھ کہا ـــــــ "حضرت آپ میرے یہاں قیام فرمائیں" ـــــــ آغا صاحب نے اپنے عادتی حزنیہ لہجہ میں جواب دیا ـــــــ "نہیں جوش' تمہیں بڑی زحمت ہو گی۔ مجھے صبح سویرے ہی وضو کے لیے گرم پانی درکار ہوتا ہے" ـــــــ وہ کچھ اور کہنا چاہتے تھے کہ جناب جوش نے بات کاٹتے ہوئے ڈرامائی لہجہ میں کہا ـــــــ "کیا حضرت آپ وضو' طہارت وغیرہ یہ سب حرکتیں کرتے ہیں؟" ـــــــ جناب جوش نے یہ فقرہ کچھ اس انداز سے کہا کہ آغا صاحب ہنس پڑے اور اپنے اسی لہجہ میں جواب دیا ـــــــ "جوش کبھی میں بھی جوان تھا" ـــــــ میں نے کہا یہ نادر اتفاق ہے کہ "جوان جوش" اور "بڈھا جوش" دونوں یکجا ہیں۔

(۳)

آغا صاحب پہلی مرتبہ کس سال حیدرآباد دکن گئے؟ کتنی مُدت وہاں قیام کیا؟ ان کا ذریعۂ معاش وہاں کیا رہا؟ ـــــــ یہ تین سوالات ایسے تھے جن کا جواب مجھے حیدرآباد میں کسی ذریعے سے حاصل نہیں ہوا۔ ۱۹۳۲ء میں مجھے حیدرآباد میں آغا صاحب سے ملنے کا موقع ملا تھا۔ اب ۱۹۶۲ء میں اُس ملاقات کو تیس سال ہوتے ہیں۔ اتنی مُدت کے بعد یہاں کراچی میں چند ہی روز قبل ان سوالات کا جواب ملا ہے۔ آغا صاحب کے فرزند جناب سرخوش کی عنایت سے مجھے رسالہ "کنول" کا مارچ ۱۹۲۳ء والا نمبر دیکھنے کا موقع ملا جس میں آغا صاحب کا ایک مضمون ـــــــ "فقیر کی پہلی پھیری" ـــــــ شائع ہوا ہے۔ اس مضمون سے نہ صرف ان سوالوں کا جواب ملتا ہے بلکہ حیدرآباد کے دَور کی ایک جھلک بھی نظر آ جاتی ہے جو میری آنکھوں کے سامنے شمعِ سحری کی طرح جھلملا کر ختم ہو گیا۔

آغا صاحب فرماتے ہیں کہ ۱۹۰۱ء میں پہلی مرتبہ حیدرآباد گئے اور محلہ "دارالشفا" میں اپنے ایک دوست سید حسن صاحب

دہلی؎ اور میرٹھ کے مکان پر قیام کیا۔ چند ہی روز کے بعد وہ راجہ رائے رایاں بہادر، امانت دولت آصف جاہی کی بارگاہ میں پہنچا دیے گئے۔ راجہ صاحب کے یہ سب خاندانی خطابات ہیں۔ آغا صاحب نے جس ہستی کا ذکر فرمایا ہے ان کا نام "شیوراج" تھا۔ ان کے صاحبزادے راجہ شام راج بہادر، تقسیم ہند سے پہلے حکومت حیدرآباد کے وزیر رہ چکے ہیں اور غالباً حیات ہیں یہ خاندان حیدرآباد کے امرائے عظام میں شمار کیا جاتا ہے۔ آغا صاحب شہسوار بھی تھے۔ فرماتے ہیں:-

"شرگیا مہاراجہ رائے رایاں بہادر کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں صرف قلم ہی کا مرد نہیں ہوں، بلکہ اچھا خاصا شہسوار بھی ہوں، پھر تو راجہ صاحب کے اصطبل سے گزر کر سرمہاراجہ بہادر (کشن پرشاد) کے اصطبل تک رسائی ہوگئی۔ نیلی، رستم، کیوترس جیسے قیمتی گھوڑے صبح و شام میری سواری کے لیے مخصوص ہو گئے۔"

اس زمانے میں حیدرآباد کے امرا کو شاعری سے کتنی دلچسپی تھی۔ آغا صاحب کے اس بیان سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے:-

"اسی زمانے میں راجہ رائے رایاں بہادر کو بھی شاعری سے کچھ ایسی دلچسپی ہوئی کہ ایک خاص مشاعرہ بھی قائم ہوگیا جس میں سکری میر نادر علی برتر اور مرحوم منشی منتجب الدین تجلّیؔ سکرٹری و نائب سکرٹری ہوئے۔ یہ فقیر بھی ان مشاعروں کا جزو لاینفک بن گیا۔ غرض خوب خوب صحبتیں ہوئیں ۔ . . . . القصہ، میں اکثر مشاعروں میں رُوحِ رواں مشاعرہ قرار دیا جانے لگا۔ خدا غریق رحمت کرے، اس وقت حضرت فصیح الملک بہادر مرزا داغ مرحوم بھی زندہ تھے۔ پھر تو مولانا ضیاء، گرامیؔ، ترکیؔ، حسامیؔ، رسوا، اچھے اچھے کہنے والوں سے صحبتیں رہیں۔ اللہ اللہ، اس وقت کا حیدرآباد کچھ جہان آباد؎ سے کم نہ تھا۔"

میر نادر علی برترؔ غازی پوری حضرت ظہیر دہلوی کے شاگرد تھے اور حضرت ظہیرؔ غالب کے شاگرد تھے۔ حضرت برترؔ کی ایک غزل میری طالب علمی کے زمانے میں بچہ بچہ گاتا پھرتا تھا۔ یہ غزل سارے ہندوستان میں مقبول ہوئی۔ حقانی محفلوں میں قوال اس کو برسوں گاتے رہے۔ گراموفون ریکارڈوں میں بھی بھری گئی تھی۔ حضرت برترؔ کے ایک شاگرد، حیدرآباد کے ایک معزز خاندان کے فرد، جناب عبدالکریم واکانی المتخلص بہ "تہذیب" سے میری ملاقات یہاں کراچی میں ۱۹۵۲ء میں ہوئی۔ حضرت برترؔ کے بہت سے حالات مجھے "تہذیب" مرحوم سے معلوم ہوئے جن میں ایک بات یہ تھی کہ حضرت برترؔ شاعری میں راجہ رائے رایاں کے استاد تھے۔ حضرت خواجہ شمس الدین (مدفون اورنگ آباد، دکن) کے مرید ہوئے۔ بیعت کے بعد انھوں نے وہ غزل کہی تھی جو اتنی مقبول عام ہوئی۔ مجھے پوری غزل یاد نہیں تھی۔ "تہذیب" مرحوم نے مجھے اس کے پانچ شعر سنائے تھے جو یہاں درج کرتا

؎ دلی - شاہجہان آباد

یوں :

جانے کیا ساقی کی آنکھوں نے اشارا کر دیا
نذرِ ساغر آج ہم نے زُہد و تقویٰ کر دیا
دل کو آزارِ محبت کے مزے آنے لگے
اُس کے میں قربان جس نے درد پیدا کر دیا
میکدے میں کل تو تھا میں خشک ساحل کی طرح
آج ساقی نے مجھے قطرے سے دریا کر دیا
کعبہ والوں سے جو پُوچھی میں نے منزل یار کی
بتکدے کی سمت چپکے سے اشارا کر دیا
ہم بُرے سے تھے بُرے بر ترؔ خدا کا شکر ہے
اک نگاہِ شمس نے اچھے سے اچھا کر دیا

حضرت نادر علی برترؔ ۱۹۲۱ء تک بقیدِ حیات تھے۔ آغا صاحب نے اپنے رسالہ " آفتاب " کے نومبر ۱۹۲۱ء کے پرچے میں اُن کی ایک غزل شائع فرمائی ہے جس کا مطلع ہے :

پھر بہار آئی جنونِ فتنہ ساماں بڑھ گیا
تا بدامن پھر مرا چاکِ گریباں بڑھ گیا

مُنشی منتجب الدین تجلّیؔ مرحوم کے صاحبزادے تمکین کاظمی میرے قدیم کرم فرما تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں ایک مرتبہ میں گلبرگہ میں تمکین کاظمی صاحب سے ملنے کے لیے اُن کے مکان پر گیا تو حضرت تجلّیؔ کی زیارت بھی نصیب ہُوئی تھی۔ اس کے دو تین سال . . . بعد انھوں نے وفات پائی۔ تمکین کاظمی صاحب نے بے شمار مضامین اور دو تین کتابیں لکھیں۔ ۱۹۶۱ء میں رسالہ افکار کراچی کے جوش نمبر کے لیے اُنھوں نے ایک مضمون حیدر آباد دکن سے بھیجا تھا افسوس ہے کہ اس رسالہ کی اشاعت سے پہلے تمکین کاظمی صاحب کی وفات کی خبر آئی۔

ضیاؔ مُفتی نور الضیاء الدین، ضیا یار جنگ، اورنگ آباد کے ایک جاگیردار خاندان کے جانشین تھے۔ حیدر آباد میں کئی سال تک مُفتی عدالت العالیہ (ہائی کورٹ) رہے اور بعد میں ہائی کورٹ کے جج ہو گئے تھے۔ مولانا گرامی کی طرح فارسی ہی میں شعر کہتے تھے اور استاد مانے جاتے تھے۔ شاعری کے علاوہ شطرنج اور اپنی قانونی بصیرت میں بہت مشہور تھے۔ موجودہ حضور نظام کے دربار میں بڑا رسوخ اور وقار رکھتے تھے۔ مہاراجہ کشن پرشاد کے گہرے دوست تھے۔ قدیم حیدر آبادی شرافت اور روایات کو قائم رکھنے میں اپنی آپ نظیر تھے۔

اس مضمون میں آغا صاحب نے راجہ رائے رایاں بہادر کو کئی جگہ " آغائے نادر " لکھا ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً

وہ راجہ صاحب کی سرکار میں بہ سلسلۂ ملازمت منسلک رہے ہوں گے۔

ایک جگہ سر عبدالقادر مرحوم کے حیدرآباد تشریف لانے اور آغا صاحب کو مولانا شبلی اور عبدالحلیم شرر لکھنوی سے متعارف کرانے کا بھی ذکر فرمایا ہے:

> اسی اثنا میں علامہ شبلی نعمانی اور مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی مرحوم جو حسنِ اتفاق سے حیدرآباد کے کسی علمی ادارے میں کام کر رہے تھے میرے محبوب ترین دوست محبی سر عبدالقادر ہی کی وساطت سے ان حضرات کی بھی دید وا دید ہو گئی۔ مولوی شبلی مرحوم تو مجھ ناچیز کے کلام اور طرزِ خواندگی کے اس قدر دلدادہ و شیدا ہوئے کہ بار بار تشریف لائے اور ناچیز کی عزت بڑھائی۔ دو چار دفعہ مولوی صاحب نے مجھے اپنے دولت کدہ پر طلب فرمایا اور اس قدر اصرار سے میرے ناچیز کلام کو پڑھوایا کہ میں پہلے ہی دیوانہ تھا اور رہے سہے حواس کھو بیٹھا۔

آغا صاحب جب حیدرآباد گئے تھے تو پنڈت رتن ناتھ سرشار مصنف فسانۂ آزاد وغیرہ بقید حیات تھے۔ جناب سرشار کو غالباً مہاراجہ کشن پرشاد نے خود حیدرآباد بلایا تھا اور اپنے ہاں رکھا تھا۔ ان کی ہر ضرورت کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ سرشار ہی کے مشورے اور اصلاح سے مہاراجہ بہادر نے دو تین ناول لکھے تھے جو شائع ہو چکے ہیں۔ مہاراجہ کشن پرشاد کی سرپرستی میں ایک رسالہ "دبدبۂ آصفی" شائع ہوتا تھا۔ اس کی ادارت مہاراجہ بہادر نے سرشار کے سپرد کر دی تھی۔ میں نے حیدرآباد کے ثقہ لوگوں سے یہ سنا تھا کہ آخری زمانے میں جناب سرشار کا توازن دماغی غالباً کثرتِ مے نوشی سے بگڑ گیا تھا۔ اس حالت میں وہ کاغذ کی پرچیوں پر ناول کے دو ایک مکالمے لکھتے اور کسی شاگرد پیشہ کو دے کر کہتے کہ مہاراجہ بہادر کو دے آؤ۔ وہ حکم کی تعمیل کرتا۔ شروع شروع میں تو مہاراجہ بہادر نے ان پرچیوں کو لے کر دیکھا ہوگا۔ بعد میں جب سب کو یقین ہو گیا کہ ان کا دماغی توازن قائم نہیں ہے تو خود شاگرد پیشہ ان کی ایسی پرچیوں کو ادھر ادھر کہیں ڈال دیتے تھے مہاراجہ کے ملاحظہ میں پیش نہیں کرتے تھے۔

۱۹۰۲ء میں جناب سرشار نے وفات پائی۔ ان کی وفات کا دردناک واقعہ آغا صاحب نے اپنے ایک مضمون میں بیان کیا ہے جو اُن کے مجموعۂ مضامین "خارستان" میں شائع ہوا ہے۔ وہ ایک مشاعرہ کا حال بیان کرتے ہیں جو شہر کے باہر چندولعل کی بارہ دری میں منعقد ہوا تھا:

> ..... جب گرامی مرحوم پڑھ چکے تو بارہ بج چکے تھے۔ ان کے بعد صفاتی نے دو تین رباعیاں پڑھی تھیں جو رام زکی کے متوالے ملک کے نامور ادیب پنڈت رتن ناتھ سرشار لڑکھڑاتے ہوئے شمع کے سامنے خود آ بیٹھے اور کہا ——— بجگر تمام کے جیشو مرن باری آئی۔

مشاعرے کے ختم ہو جانے کے بعد کے حالات لکھتے ہیں:

جیسا کہ اُوپر ذکر آ چکا ہے، پنڈت رتن ناتھ سرشار جو آج ضرورت سے زیادہ پُر کیف تھے، وہ آج شہر نہ جا سکے اور اپنے ایک رفیقِ سفر شاید منشی دوارکا پرشاد اُفق لکھنوی کے ہمراہ اسی بارہ دری میں شب باش ہونا پڑا۔ یہ دونوں صاحب چونکہ حضور وزیر صاحب سر مہاراجہ بہادر کے مہمان تھے اس لیے یہاں بارہ دری میں بھی اُن کے لیے ایک خاص کمرہ مخصوص تھا۔ دونوں صاحب وہیں اپنے اپنے بستروں پر جا لیٹے۔ یہ کمرہ بارہا دیکھا بھالا تھا، مگر اس میں لکڑی کی گھڑونچیوں پر آب دار خانہ تھا جس پر پانی کے مٹکے، گگریں، صراحیاں اور گلاس سجے ہوئے تھے اور دُوسری طرف ویسی ہی گھڑونچیاں رکھی ہوئی تھیں جن پر ڈھلی ہوئی نواڑ کی چکتیاں تہ بہ تہ دھری اُوپر چھت تک چنی ہوئی تھیں۔ اب قسمت کی بات اس کا کسی کو دھیان بھی نہیں رہا کہ پانی کی گھڑونچیاں کس طرف ہیں اور نواڑ کی چکتیاں کدھر ہیں۔ اتفاق سے اسی رات پنڈت جی کو پیاس کی شدت اور خمار کی ترنگ نے یکایک چونکا دیا۔ حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ آپ دیوانہ وار بستر سے اُٹھ کر پانی کی تلاش میں چلے۔ اس شدتِ اضطراب میں اپنی دانست میں یہی سمجھے کہ آب دار خانہ اُوپر ہی ہے۔ آہ، آہ، مگر وہ موت کا دھکا تھا، قضا اس غریب کو ان گھڑونچیوں کی طرف لے گئی جن پر نواڑ چنی ہوئی تھی اور وہ اُسی گھبراہٹ میں ٹٹولتے ہوئے، اُنھیں گھڑونچیوں پر جا چڑھے۔ ستم یہ ہوا کہ پانی کا وہاں نشان نہ پا کر جو عالمِ بدحواسی میں ہاتھ پاؤں مارے تو ان غریب کا پاؤں پھسل گیا اور وہ اوندھے منہ اس گھڑونچی کے حلقے میں جا گرے۔ ان کے گرتے ہی اُوپر سے اُدھر رکھی ہوئی نواڑ کی چکتیاں دھڑا دھڑ اُنھیں پر آ پڑیں جس کے صدمے سے ان کی جان نکل گئی۔

آہ، آہ، دُوسری صبح کو یہ ہولناک خبر مقامی اخباروں میں تھی۔ بس جو پڑھتا تھا سر پھڑک کر رہ جاتا تھا۔

آغا صاحب نے سرشار کی موت پر ایک مرثیہ بھی کہا تھا۔ اس کے متعلق اپنے مضمون "فقیر کی پہلی پھیری" میں لکھتے ہیں:

> اسی زمانے میں مشہور و معروف فسانہ نگار پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی کا افسوس ناک حادثہ ہو گیا۔ میں نے بھی متاثر ہو کر ایک نظم کہی جو راجہ رائے رایاں بہادر کو بہت پسند آئی۔ سرشار مرحوم مہاراجہ بہادر کے مہمان تھے اور مجھ پر کرم فرماتے تھے۔ میری نظم ان کا مرثیہ تھی۔ ایک دن راجہ رایاں بہادر نے مجھے اپنے ہم رکاب لیا اور سر مہاراجہ بہادر کے حضور میں لے جا کر وہی نظم مہاراجہ کو سنوائی۔ اس طرح حضرت شاد بالقابہ تک بھی رسائی ہو گئی۔ بس قسمت چمک گئی۔

جنوری ۱۹۰۱ء میں ملکہ وکٹوریہ کی وفات ہوئی اور ان کے سب سے بڑے لڑکے ایڈورڈ ہفتم جو پرنس آف ویلز تھے تخت نشین ہوئے۔ انگلستان میں ان کا دربار تاج پوشی ۱۹۰۲ء کے غالباً ابتدائی مہینوں میں ہونے والا تھا۔ لارڈ کرزن ہندوستان کے وائسرائے تھے، انھوں نے ہندوستان میں بھی باہتمام دہلی جشن تاج پوشی منعقد کرنے کا فیصلہ کیا چنانچہ تمام والیانِ ریاست کو اس دربار میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ لارڈ کرزن کے پیش نظر ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ تمام والیانِ ریاست کے سامنے انگریزی فوج کی شان و شوکت کا مظاہرہ کر کے انھیں اور عام ہندوستانیوں کو مرعوب کیا جائے۔ اس سلسلے میں آغا صاحب اپنے اسی مضمون ——— فقیر کی پہلی پھیری ——— میں لکھتے ہیں:

> غرض میں انھیں رنگ رلیوں میں تھا کہ یکایک ۱۹۰۳ء کا دلّی دربار زبان زدِ خلائق ہو گیا۔
>
> .... تمام راجہ مہاراجہ طلب ہوئے یہاں تک کہ خود خلد آشیان، نواب میر محبوب علی خاں، اعلیٰ اللہ مقامہٗ، آصف سادس بھی مع اپنے تمام خدم و حشم، جاگیرداروں اور اشراف کے دلّی جانے پر تیار ہو گئے۔ اعلیٰحضرت خلد آشیاں کا ایما پاتے ہی ہز ایکسلنسی مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر نے بھی پا تراب کر لیا۔ انھیں کے ساتھ ساتھ تمام روسائے دکن کی بھی عنانِ توجہ اُدھر ہی تھی۔ مرحوم راجہ رائے رایاں بہادر، امانت ونت، آصف جاہی کا بھی پیش خیمہ برآمد ہوا۔ ان کی طرف سے دلّی کیمپ کا انتظام کرنے کے لیے مولوی علی احمد صاحب سب سے پہلے دلّی جانے کو آمادہ ہو گئے۔ قسمت کی بات ابھی بیسیوں ہمراہی حضرات اپنے اپنے انتظامات ہی میں تھے کہ سب سے پہلے ——— قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند ——— کے موافق، میں بدبخت جو ڈیڑھ سال سے دلّی جانے پر اُدھار کھائے تھا، فوراً ایک بیش قرار رقم لے کر چلے سے پہلے انتظام کرنے کو چل پڑا۔
>
> یہ خبر شدہ شدہ نواب فصیح الملک بہادر حضرت داغ مرحوم کو بھی پہنچی کہ آغا شاعر انتظام کے لیے دلّی جا رہا ہے۔ آہ! وہ مر گئے ہیں، اور مجھے مرنا ہے، انھوں نے مجھے فوراً بلوایا اور ہر چند ڈرایا، دھمکایا کہ یہ کیا حماقت ہے جی ——— بھلا! آغا شاعر اور انتظام! جو لوگ تمھیں وہاں خدمت پر وہاں بھیج رہے ہیں وہ یا تو تمھارے سخت دشمن ہیں یا ان کے حواس بجا نہیں۔ دیکھو آغا شاعر! حیدرآباد نہ چھوڑو۔
>
> مگر میں کب سنتا تھا۔ میں نے ان کی منتیں بھی کیں کہ آپ یہ بھاگی کیوں ملنے

ہیں ؛ حضرت ! میں خود ڈیڑھ برس سے وطن جانے کو ترس رہا تھا۔ اب قدرت نے یہ غیب سے سامان پیدا کر دیا ہے۔ خدا کے لیے آپ اس چلتی گاڑی میں روڑا نہ اٹکائیں۔

آخر وہ بہشتی بھی مجھے اتنا بضد دیکھ کر خاموش ہو گئے اور میں ۱۹۳۱ء میں دِلّی واپس آ گیا۔

جہاں تک مجھے یاد ہے حضرت آغا صاحب نے یہ فرمایا تھا کہ کیمپ سنبھالنے کے لیے انھیں مہاراجہ کشن پرشاد نے دس ہزار روپے دے کر بھیجا تھا۔ حضرت داغ نے اُس کی مخالفت کی تھی۔ آغا صاحب نے جب اس مخالفت کا گلہ شکوہ کیا تو حضرت داغ نے کہا مجھے یہ یقین ہے کہ تم پھر حیدر آباد نہیں آؤ گے۔ یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لیکن آغا صاحب بضد ہوئے تو خاموش ہو رہے۔ ممکن ہے میرا حافظہ غلطی کر رہا ہو اس لیے میں نے آغا صاحب ہی کا بیان یہاں نقل کر دیا۔ دُوسری بات یہ ہے کہ آغا صاحب ۱۹۱۰ء کے آخری مہینوں میں حیدر آباد سے گئے ہوں گے۔ لندن میں جشن تاج پوشی ایڈورڈ ہشتم کی اچانک بیماری کی وجہ سے کئی ماہ ملتوی کرنا پڑا تھا۔ ان کا اپن ڈی سائٹس کا اپریشن ہوا اور کئی ماہ کی علالت کے بعد اگست ۱۹۱۰ء کردہ رسم تاج پوشی کے قابل ہوئے۔ ہندوستان میں یہ دربار جنوری ۱۹۱۱ء میں منعقد کیا گیا۔ ظاہر ہے کیمپ وغیرہ کے انتظامات کے لیے لوگوں کو کئی ماہ پہلے دلّی جانا پڑا ہو گا۔

میرا خیال ہے کہ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۵ء تک آغا صاحب مختلف مقامات میں مختلف مشاغل میں مصروف رہے۔ ڈرامہ نویسی کا یہی دور ہو گا۔ ممکن ہے کہ آغا حشر کاشمیری سے اسی دور میں ملاقات ہوئی ہو۔ اُنھیں نے آغا شاعر کو ڈرامہ لکھنے کی ترغیب دی ہو اور اُنھیں کی کوششوں سے تھیئٹروں کے مالکوں تک رسائی اور ڈراموں کی فروخت کے مراحل طے ہوئے ہوں۔ ڈرامانویسی کے سلسلے میں آغا صاحب نے کلکتہ اور بمبئی کا سفر بھی کیا ہو گا اور ممکن ہے کچھ مُدت ان شہروں میں مقیم بھی رہے ہوں۔

۱۹۱۵ء کے لگ بھگ، آغا صاحب کا ریاست جھالاواڑ سے تعلق قائم ہوا ہو گا۔ یہ قیاس میں نے اس بناء پر قائم کیا ہے کہ میرے ہاں رسالہ "آفتاب" کا جو شمارہ ہے وہ نومبر ۱۹۲۲ء کا ہے۔ اس پر جلد ۷ اور نمبر ۱۱ درج ہے گویا ۱۹۲۲ء کے ختم تک رسالہ "آفتاب" کو جاری ہوئے سات برس گزر چکے تھے۔

ریاست جھالاواڑ کے حکمران 'رانا سر بھوانی سنگھ' آغا صاحب پر بہت مہربان تھے۔ جھالاواڑ کے دس بارہ سال کے قیام میں آغا صاحب نے بڑے اطمینان اور فراغت سے زندگی بسر کی۔ وہاں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ ۱۹۲۴ء کے لگ بھگ جھالاواڑ سے آغا صاحب کا تعلق منقطع ہو گیا ہو گا۔ اپنے اُس خط میں جو جنوری ۱۹۳۵ء میں لکھا گیا ہے آغا صاحب فرماتے ہیں:

.... میں کیا اور میرا کلام کیا ؟ ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ ہوں جو اب یقیناً گل ہو جائے گا۔ کیونکہ آج ۷۔۶ برس سے ۱۶ سو میل کے دھاوے کر رہا ہوں اور کہیں پاؤں نہیں ٹکتا.......

اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ چھ سات برس پہلے یعنی ۱۹۲۳ء کے لگ بھگ ریاست جالاواڑ سے آغا صاحب کا تعلق ٹوٹ گیا تھا۔ ظاہر ہے اسی وقت سے رسالہ "آفتاب" کی اشاعت بھی بند ہو گئی ہو گی۔ ریاست سے قطع تعلق کی وجہ غالباً مہاراجا بھوانی سنگھ والی ریاست کی وفات ہو گی۔ نئے والی ریاست نے آغا صاحب سے تغافل برتا ہو گا۔ آغا صاحب وہاں سے چل کھڑے ہوئے ہوں گے۔

ریاست جالاواڑ کے قیام کے آخری سال دو سال میں یا ریاست سے تعلق ختم ہو جانے کے بعد آغا صاحب عشرۂ محرم ریاست خیرپور میں گزارا کرتے تھے۔ وہاں سے انہیں چار سو روپیہ (سالانہ) ملتے تھے۔ ذی قعدہ ۱۳۵۰ھ (جون ۱۹۳۲ء) کے آخری دنوں میں آغا صاحب نواب شہید یار جنگ کی طلبی پر حیدرآباد آئے تھے، جمادی الاول ۱۳۵۱ھ (اکتوبر ۱۹۳۲ء) میں شہید صاحب نے پھر آغا صاحب کو حیدرآباد بلایا۔ ڈھائی ماہ کے قیام کے بعد ماہ شعبان ۱۳۵۱ھ (دسمبر ۱۹۳۲ء) میں دہلی واپس آ گئے۔ اس کے بعد پھر کبھی حیدرآباد نہیں آئے۔

آغا صاحب کے جاننے والوں میں شاید دو فی صدی کو بھی ان کا اصلی نام معلوم نہ ہو گا۔ مجھے بھی یہاں کراچی میں جناب سرخوش سے معلوم ہوا کہ نام "مظفر علی" ہے جو تاریخی نام ہے اس سے ۱۲۹۶ھ کے اعداد نکلتے ہیں اور ۱۸۷۹ء اس سے مطابقت رکھتا ہے۔ ستاون (۵۷) برس کی عمر پا کر ۱۲، مارچ ۱۹۳۵ء میں آغا صاحب نے رحلت فرمائی۔

الفریڈ نوبل

ضیاء الدین احمد برنی

ڈائنامیٹ جیسی دھماکہ پیدا کرنے والی چیز کی آمدنی سے نوبل انعامات کی بنیاد ڈالی گئی تھی اور اب بھی جب جب انعامات کا اعلان ہوتا ہے دُنیا کے علمی طبقوں میں ایک بہت بڑا دھماکہ پیدا ہو جاتا ہے۔

آج سے ۱۳۱ سال قبل (۱۸۳۳ء میں) ۲۱ اکتوبر کی صبح کو سویڈن کے پایۂ تخت اسٹاک ہام (Stock holm) کے ایک امیر گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام الفریڈ برنارڈ نوبل رکھا گیا۔ یہی وہ بچہ ہے جس نے بڑے ہو کر ڈائنامیٹ ایجاد کیا اور اس کے ذریعے جو کروڑوں روپے کمائے اُس کا بہت بڑا حصہ مرتے دم ایسے انعامات کے لیے وقف کر دیا جو سب سے بڑے بین الاقوامی علمی اعزازات سمجھے جاتے ہیں اور ان کے پانے والے نہ صرف عالمگیر اور دوامی شہرت حاصل کر لیتے ہیں بلکہ عمر بھر کے لیے مالی مشکلات سے بھی آزاد ہو جاتے ہیں۔

الفریڈ نوبل چھوٹے سے قد کا اور معمولی شکل و صورت کا آدمی تھا۔ اس کی صحت کبھی اچھی نہیں رہی۔ وہ بڑا محنتی اور جدوجہد کرنے والا انسان تھا۔ مالدار اور مشہور ہونے کے باوجود اُس کی زندگی بڑی سادہ تھی، اس میں غرور اور بڑائی کا احساس نام کو نہ تھا۔ وہ تقریباً اپنا سارا وقت اپنی تجربہ گاہ میں گزارتا، اور اس سے جو وقت بچتا اپنی ماں کی خدمت میں صرف کرتا۔ اُس نے شادی نہیں کی۔ اُس کی ساری محبتوں کا مرکز اُس کی ماں تھی۔

نوبل کا انتقال ۱۰ دسمبر ۱۸۹۶ء کو صبح کے وقت ہوا۔ اس وقت اس کی عمر ساٹھ سال کی تھی۔ نوبل ایک عجیب و غریب خبط میں مبتلا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ زندہ نہ دفن ہو جائے اور اس لیے اس نے نصیحت کی تھی کہ مرنے کے بعد اس کی لاش جلا دی جائے۔ چنانچہ یہ وصیت پوری کی گئی۔ مرنے سے کچھ پہلے اس نے ایک پھٹے ہوئے کاغذ پر اپنی مشہور زمانہ وصیت لکھی جس میں درج تھا کہ

> رشتے داروں کو تھوڑی سی رقم دینے کے بعد میری ساری دولت (۱¾ ملین پونڈ) ایک انعامی فنڈ کے قیام میں صرف کی جائے جس کا سالانہ منافع برابر کے ۵ انعاموں میں تقسیم کر کے ایک انعام اس شخص کو دیا جائے جس نے فزیکل سائنس (طبیعات) میں نہایت اہم کام کیا ہو، دوسرا انعام کیمسٹری (علم کیمیا)، تیسرا انعام فزیالوجی (علم الادویہ) میں اہم دریافت کرنے والے اشخاص کو دیا جائے۔ چوتھا انعام اس مصنف کو دیا جائے

جس نے تحقیقی نوعیت کی کوئی کتاب لکھی ہو اور پانچواں انعام اس شخص کو دیا جائے جس نے اقوامِ عالم کے ابین امن پیدا کرنے کے سلسلہ میں نمایاں کردار ادا کیا ہو۔ میں تاکید کرتا ہوں کہ یہ انعامات بلا امتیاز مذہب و قومیت صرف مستحق لوگوں کو دیے جائیں۔"

الفریڈ نوبل بہت مالدار شخص تھا۔ وہ پندرہ فیکٹریوں اور ۵۳ تیل بردار جہازوں کا مالک تھا۔ ڈائنامیٹ ایجاد کرنے کے علاوہ اس نے ۲۵۵ اور چیزیں بھی پیٹنٹ کرائیں جن میں مزدوروں کی بازو، مصنوعی ربڑ کا پارچہ اور ایک قسم کا راکٹ شامل ہیں۔ یہ انعامات ۱۹۰۱ سے دیے جاتے ہیں۔

نوبل کے انتقال سے لے کر اب تک تقریباً ڈھائی کروڑ روپیہ انعامات کی شکل میں تقسیم ہو چکا ہے۔ سب سے زیادہ نوبل پرائز پانے والے اہلِ جرمنی ہیں۔ اس کے بعد انگلستان کی، پھر فرانس کی، پھر امریکہ کی باری آتی ہے۔ سویڈن اور ناروے کے لوگوں نے بھی ۲۲ انعامات حاصل کیے ہیں۔ برصغیر ہند و پاکستان کے صرف دو آدمیوں ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور (۱۹۱۳) اور سر سی۔ وی رامن (۱۹۳۰) کو انعام ملا ہے۔ روس کے کسی شخص کو آج تک انعام نہیں دیا گیا حالانکہ نوبل کی وصیت میں یہ چیز خاص طور پر صاف تھی کہ انعامات کی تقسیم میں قومیت و مذہب کا ذرا سا بھی لحاظ نہ رکھا جائے۔ ہند و پاکستان میں اقبال اور گاندھی اور روس میں چیخوف اور ٹالسٹائی اس قابل تھے کہ انہیں انعامات دیے جاتے مگر یہ سب نظر انداز ہو گئے۔

ہر سال اسٹاک ہام میں ۱۰ دسمبر کو الفریڈ نوبل کی برسی کے موقع پر بڑی پُرشکوہ تقریب منعقد ہوتی ہے جس میں سویڈن کے بادشاہ بہ نفسِ نفیس انعامات تقسیم کرتے ہیں۔ مشہور امریکی مصنفہ پرل بک نے اس تقریب کا حال یوں بیان کیا ہے۔

"میں ۹ دسمبر کو اسٹاک ہام کے ہوائی اڈے پر پہنچی اور مجھے ایک زبردست استقبالیہ کمیٹی نے خوش آمدید کہا جس میں متیم سویڈن امریکی سفیر کے علاوہ نوبل کمیٹی کے افسر اور سویڈن کے محکمہ خارجہ کے ممبر شامل تھے۔ مجھے فوراً گرانڈ ہوٹل پہنچا دیا گیا جہاں مخصوص شاہی کمرے میں میرے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ دوسرے دن (۱۰ دسمبر) صبح کو محکمہ خارجہ سے دو ایلچی آئے جنہوں نے شام کی رسومات کے بارے میں ساری تفصیلات بتانے کے بعد یہ درخواست کی کہ بادشاہ کے ہاتھ سے انعام لینے کے بعد میں اُلٹے پاؤں اپنی کرسی تک واپس آنے کی کوشش کروں کیونکہ اس سے پہلے دو انعام لینے والوں نے بادشاہ کی طرف پیٹھ کر دی تھی جس کا سویڈن کی رعایا نے بہت بُرا مانا تھا۔ چنانچہ شام کو میں وقت پر اُس آراستہ و پیراستہ ہال میں جا پہنچی۔ ٹھیک ۵ بجے ایک سویڈش سپاہی اور ایک سویڈش طلایہ نے بگل بجا کر شاہی آمد کا استقبال کیا۔ بادشاہ کے بیٹھ جانے کے بعد نوبل کمیٹی کے ممبر آ کر اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ ان کی آمد پر بادشاہ تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ یہی وہ واحد موقع ہے جبکہ بادشاہ اپنی رعایا کے کسی ممبر کی آمد پر کھڑے

ہوتے ہیں۔

میرے برابر کی کرسی پر ایک اور نوبل پرائز جیتنے والے اطالوی ڈاکٹر ایزیکو فرمی بیٹھے ہوئے تھے۔ سویڈش زبان میں تقریریں ہوئیں جن کو میں مطلق نہیں سمجھ سکی۔ اس کے بعد میرا تعارف ہوا اور میں انعام لینے کے لیے بادشاہ کے سامنے جا پہنچی۔ بادشاہ نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور ایک سونے کا تمغہ دیا جو چمڑے کے بکس میں رکھا ہوا تھا جس کے ایک طرف نوبل کی تصویر اور دوسری طرف اس کا نام کندہ تھا۔ ایک لفافہ میں انعام کا وہ حکم نامہ تھا جس کو بعد میں چیک کی صورت میں بدل دیا جاتا تھا اس رسم کے بعد الٹے پیروں لوٹنے کی مصیبت درپیش تھی۔ ایک تو میں اونچی ایڑی کے جوتے پہنے ہوئے تھی جن کی ایڑیاں مشرقی بیش قیمت قالینوں میں دھنسی جاتی تھیں۔ دوسرے میرے زریں فراک کے پیچھے کا حصہ فرش پر لٹکا ہوا تھا۔ میں بہت سنبھل سنبھل کر ایک ایک قدم پیچھے ہٹ رہی تھی۔ میری اس مشکل کو دیکھ کر لوگوں نے ہمدردی میں تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ میں نے قالین کے ڈیزائن کو ذہن نشین کر لیا تھا ورنہ ممکن تھا کہ میں اپنے برابر والی کرسی پر بیٹھے ہوئے ڈاکٹر کی گود میں جا پڑتی۔ اگلے روز اسٹاک ہام کے اخبارات نے بڑی بڑی سرخیوں میں یہ خبر چھاپی: "پرل بک بڑی تمکنت سے پیچھے کو لوٹیں۔"

نوبل پرائز پانے والے کے لیے ضروری ہے کہ چاہے وہ دنیا کے کسی حصہ میں ہو خود ایک سال کے اندر اندر اسٹاک ہام پہنچ کر نوبل پرائز حاصل کرے ورنہ انعام ضبط ہو جاتا ہے اور نوبل فنڈ میں جمع کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۹ میں جرمنی کے مشہور ڈاکٹر —— Gerhard Domagk کو سلفانا مائڈ معلوم کرنے پر نوبل پرائز ملا لیکن ہٹلر نے اہل جرمنی کو نوبل پرائز لینے سے منع کر لیا تھا اور اس کی جگہ نیشنل اسٹیٹ پرائز نکالا تھا اس لیے جنگ ختم ہونے کے بعد ۱۹۴۰ میں اس ڈاکٹر نے اپنا انعام طلب کیا۔ اسے رقم تو ملی نہیں، البتہ تمغہ اور سند مل گئی۔

نوبل پرائز کی رقم اتنی بڑی ہوتی ہے کہ اب تک کسی شخص نے اس کے لینے سے انکار نہیں کیا سوائے جارج برنارڈ شا کے۔ جب شا کو سویڈن کے سفیر نے انعام ملنے کی خوشخبری سنائی تو بڑے میاں نے زور سے چلا کر کہا کہ "میں اس روپیہ کا کیا کروں گا؟" سفیر نے بڑی متانت سے جواب دیا کہ "سوچ سمجھ کر تحریری جواب دیجیے گا۔" ایک ہفتہ بعد شا کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور انھوں نے انعام کی رقم دے کر اسے ایک ایسی سوسائٹی قائم کرنے میں لگا دیا جو سویڈن اور انگلینڈ کے درمیان ادبی اور ثقافتی تعلقات بڑھانے میں مدد دیتی ہے۔

نوبل پرائز پانے والوں کی کیا عمر ہونی چاہیے؟ کیا نوبل کا مقصد یہ تھا کہ یہ انعام ان لوگوں کو دیے جائیں جو ایک عرصے سائنس، طب، ادب اور امن کے بارے میں عظیم شہرت کے مالک رہے ہیں یا ان انعامات سے ایسے ذہین اور جدت پسند نوجوانوں کو بھی نوازا جائے جو اپنے کارناموں سے دنیا میں اپنے لیے اعلیٰ جگہ حاصل کرنے کی جد و جہد میں مصروف

رہتے ہیں ؛ لیکن عموماً انعام پانے والے بہت زیادہ عمر کے ہوتے ہیں۔ رُڈیارڈ کپلنگ سب سے زیادہ کم عمر تھا جسے نوبل پرائز ملا۔ انعام پانے کے وقت اس کی عمر صرف ۴۲ سال تھی۔ بقول برنارڈ شا :

"نوبل پرائز ایک ایسی بچاؤ پیٹی ہے جو تیراک کی حفاظت کے لیے اس وقت سمندر میں پھینکی جاتی ہے جبکہ وہ تقریباً کنارے پر پہنچ چکا ہے۔"

غالباً نوبل پرائز بانٹنے والوں کو نوبل کی یہ بات یاد ہوگی کہ

"میں عملی آدمی کو ایک پیسہ بھی دینا نہیں چاہتا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس میں جدوجہد کرنے کی رغبت ہی نہ رہے۔"

یہ ہے مختصر سی داستان سویڈن کے ایک باشندے کی جو انسانیت کی تاریخ میں ایک سنگِ میل ہے۔

جرمن افسانہ اور اس کا ارتقا

علی ناظم

بیسویں صدی کی ابتدا ہی سے جرمن قوم میں جو شکست و ریخت اور تعمیر و تشکیل کا عمل نظر آتا ہے اس کی خارجی صورت تو دو عالمگیر جنگیں ہیں لیکن اس کے ساتھ پوری تہذیبی و ادبی زندگی پر جو اثرات مرتب ہوئے ہیں ان میں بھی جرمن قوم کی انفرادیت نمایاں نظر آتی ہے۔ وثوق سے تجزیہ نہیں کیا جا سکتا کہ جرمنی کو ان منازل تک لانے کے لیے تنہا اس کی جغرافیائی حیثیت، معاشی نظام یا بسمارک کی سیاسی بصیرت کو دخل ہے یا تنہا ان افکار کا نتیجہ ہیں جن میں کانٹ کی انتقادیت، ہیگل کی تصوریت، شوپنہار کی قنوطیت، نطشے کی شدت پسند روحانیت یا اس کی قوم کی سائنسی مادیت شامل ہے، یا پھر اس کے قومی خصائل ہی تنہا اس کے عوامل بنے ہیں۔ اسباب کچھ ہی کیوں نہ ہوں یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ پچھلے تیس برس میں جرمنی جن سیاسی، سماجی اور شعوری حوادث سے دوچار ہوا ہے اس کی نظیر کسی اور ملک میں نہیں ملتی۔ یوں تو گزشتہ جنگِ عظیم سے دنیا کے اور بہت سے ممالک بھی شدت سے متاثر ہوئے لیکن ان ممالک میں ابتلا کا دور گزر جانے کے بعد حالات معمول پر آ گئے اور کوئی شے دائمی انقلاب کی محرک نہ بن سکی لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ ۱۹۳۳ء میں ہٹلر کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد جرمن قوم جس انقلاب آفریں دور میں داخل ہوئی تھی آج بھی منقسم برلن اور مغربی و مشرقی محاذ کی شدید کشمکش کی موجودگی میں وہ دور ختم کر چکی ہے۔ آج کی جرمن قومی زندگی میں جو سیاسی بے یقینی کا ماحول پیدا ہو چکا ہے اس کے اثرات صرف بین الاقوامی سیاست تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ اس کی صدائے بازگشت زندگی کے ہر شعبہ میں سنی جا سکتی ہے۔ آج کا جرمن ادب اس کی ایک واضح مثال پیش کرتا ہے۔

یہاں ہم اس قوم کے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں کہ جنگ اور مابعد کے اثرات کی ذہنی کیفیت کا ایک سلسلہ دیکھ سکیں اور اس میں خصوصیت کے ساتھ افسانوی ادب ہمارے پیشِ نظر ہے کہ یہ زندگی کا براہِ راست مطالعہ کرتا ہے۔ اس کا زمانہ اگرچہ جنگ یا اس کے آس پاس کا زمانہ ہے لیکن آج کے جرمن افسانوی ادب کا جائزہ لینے سے پیشتر ہمیں مجموعی حیثیت سے ان تمام مسائل کو زیرِ بحث لانا ہے جو جدید جرمن افسانہ کی تشکیل، اس کے نشوونما اور اس کے تدریجی ارتقاء کا موجب بنے ہیں۔ ان عوامل کے بغیر آج کے جرمن افسانہ کو سمجھنا ممکن نہیں۔ اس سلسلہ کے بنیادی حقائق مندرجہ ذیل ہیں:-

۱۔ جرمن ادب میں افسانہ کی حیثیت کا تعین اور اس کا تاریخی ارتقا۔

۲۔ جنگ سے پہلے کا افسانوی ادب۔

۳۔ انقلابی پس منظر۔

۴۔ موجودہ افسانوی ادب کا جائزہ۔

جرمن فکشن کو بھی دیگر بین الاقوامی زبانوں کی مانند تین بڑے شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

جرمن فکشن

Der Roman	Die Novelle	Die Erzählung or Die Kurzgeschichte
(ناول)	نویلے (طویل قصے)	افسانہ (مختصر کہانی)

یہاں ناول اور اس کی تکنیک سے قطع نظر صرف "نویلے" اور "مختصر کہانی" ہی زیر بحث ہیں۔ آج کا جرمن افسانہ اسی نویلے کی ایک ذیلی صنف سمجھا جاتا ہے لہذا افسانہ کا جائزہ لینے سے قبل نویلے کا تفصیلی مطالعہ ناگزیر ہے۔

نویلے کی تعریف کا مسئلہ نزاعی نوعیت رکھتا ہے۔ اس بارے میں نقادوں کی آرا میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے چنانچہ اب تک کئی کتابیں اس مخصوص ٹیکنیک کی تشریح و توضیح میں لکھی جا چکی ہیں۔ یہاں اختلافات سے بچتے ہوئے صرف انہی تعریفوں کو زیر بحث لانا مقصود ہے جن سے نویلے کا مفہوم بآسانی سمجھا جا سکے۔

نویلے (Novelle) دراصل اطالوی زبان کے لفظ 'Novello' سے ماخوذ ہے جس کے معنی جرمن زبان میں Neuigkeit یا "خبر" ہوتے ہیں۔ ادب میں یہ لفظ نثر کی اس صنف کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جس میں کسی واقعہ یا شخصیت کا بیان مخصوص اور غیر معمولی انداز میں کیا جائے۔ یہاں اس واقعہ یا شخصیت کا اہم یا غیر اہم ہونا چنداں ضروری نہیں البتہ اس کو پیش کرنے کے لیے جو انداز اختیار کیا ہے وہ بالکل انوکھا اور کسی قدر غیر متوقع ہوتا ہے۔ گوئٹے نے نویلے کی ایک مختصر لیکن جامع تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

'Was ist eine Novelle anders als eine sich ereignete unerhörte Begebenheit ?

ترجمہ: نویلے کیا ہے؟ صرف یہی کہ یہ ایک ان سنی لیکن آپ بیتی واردات کا بیان —

گویا بیان کا مخصوص انداز میں پیش کیا جانا ہی نویلے کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ جدید جرمن نقاد جارج فن لیوکاس[1] نے اپنی انتقادیات کی مشہور کتاب "ذہن اور ہیئت"[2] میں نویلے کی ایک پُرشکوہ تعریف کی ہے۔ وہ کہتا ہے:

"Das Wesen der Novelleform ist kurzgefasst ein Menschenleben durch die unendliche Kraft einer Schicksalsstunde gedruckt"

---

1 George von Lukacs.
2 'Die Seele and die Formen'.

ترجمہ : نویلے کی تخلیق وہی ہے جس میں انسانی زندگی قسمت کے کسی ازلی لمحہ کے ہاتھوں ناقابلِ بیان قوت کے ساتھ منضبط ہو جائے ۔

نویلے کی ہیئت میں سب سے اہم شے اس کا انوکھا انداز ہے جس کو "نثری آرٹ میں تخلیق اور ہیئت"[1] کے مصنف پیٹش[2] نے بار بار "غیر معمولی" (ungewöhnlich) اور "انوکھا" (neues) کہا ہے ۔ اس کے نزدیک نویلے میں یہ غیر معمولی پن موڑ کے نقاط نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور بیان کیا جانے والا زندگی کا جز محض اکائی کی حیثیت سے بیان ہوتا ہے جس کی وجہ سے شدت برقرار رہتی ہے ۔ یہی شدت اور ارتکاز بیان کو انوکھا ، غیر معمولی اور غیر متوقع بنا دیتی ہے چنانچہ انگریزی میں نویلے کی ایک بہت ہی مختصر تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے ۔

Novelle —— a description of intense maturity.

ترجمہ : نویلے ، کمال شدت کا ایک بھرپور بیان ۔

یہاں نویلے کا مفہوم اور اس کی طوالت اس کو دیگر مروجہ اصناف سے ممیز نہیں کرتے بلکہ اس کی پیش کش کا عجیب و غریب انداز جس میں شدت اور تاثر کے عناصر بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں اس کو مختلف اصنافِ سخن سے ممتاز بنا دیتا ہے تھیوڈور اشٹورم[3] کا مشہور نویلے "باسی گلاب"[4] صرف چند صفحات پر مشتمل ہے اس کے برخلاف لڈوک ٹیک[5] کی تخلیق "جوان بڑھئی"[6] پورے چار سو صفحات پر چھپے ہونے کے باوجود نویلے ہی ہے ۔

نویلے ، ناول یا کہانی سے طوالت اور کینوس کے سائز ہی میں مختلف نہیں ہوتا بلکہ موضوع اور نوع کے اعتبار سے بھی اس کی بالکل جداگانہ حیثیت ہوتی ہے ۔ نویلے اور ناول کا ایک بڑا فرق یہ ہے کہ ناول میں پھیلاؤ کی آزادی ہوتی ہے چنانچہ واقعات یکے بعد دیگرے وجود میں آتے بنتے ہیں جن سے شخصیت کے تمام پہلوؤں کی تعمیر ہوتی رہتی ہے اور آخرکار یہی ارتقا ہیرو کا انجام بن جاتا ہے برخلاف اس کے نویلے کا پورا زور صرف کسی ایک پہلو پر رہتا ہے اور باقی پہلو محض ضمنی نوعیت سے بیان کیے جاتے ہیں ۔ اسی طرح افسانہ میں جہاں ایک نقطہ سے دوسرے نقطے تک عموماً براہِ راست رسائی ہوتی ہے ضمنی اجزا بڑی اہمیت رکھتے ہیں لیکن نویلے ہمیشہ مرکزی دلچسپی کے نقطہ (Centre of interest) سے وابستہ رہتا ہے ۔ وہ اطراف کا تذکرہ ضرور کرتا ہے لیکن ہمیشہ مرکز کے رشتے سے ۔ ہولس ہوف[7] کا ایک طویل نویلے "یہودی کی کتاب"[8] اپنے ہیرو فریڈرش میرگل[9]

---

1. 'Wesen u. Formen der Erzahlkunst
2. R. Petsch
3. Theodor Storm
4. 'Spate Rosen'
5. Ludwig Tieck
6. 'Der junge Tischlermeister'
7. Hulshoff
8. 'Die Judenbuche'
9. Friedrich Mergel

کی پوری زندگی اس کی پیدائش سے لے کر موت تک بیان کرتا ہے لیکن پوری کہانی صرف ایک مرکزی فعل ([illegible]) کے ضمن میں بیان ہوتی ہے جو قصّہ میں 'یہودی کا قتل' ہے۔

انگریز نقادوں میں کیمبرج کے پروفیسر بینیٹ نے خصوصیت کے ساتھ نویلے کی صنف پر جو تحقیق کی ہے اُنھوں نے نویلے کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے۔

A Novelle is a narrative in prose, usually shorter than a novel, dealing with one particular situation, conflict, event or an aspect of a personality, it narrates somthing 'new' in the sense of somthing 'striking'.

ترجمہ: نویلے ایک نثری بیان ہے جس کی طوالت عام طور پر ناول سے کم ہوتی ہے۔ یہ کسی شخصیت کے کسی مخصوص پہلو، تضاد، واقعے سے متعلق ہوتا ہے اور ہمیشہ کسی 'نئی' بات کو بیان کرتا ہے جسے 'نیا' اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی قدر چونکا دینے والی ہوتی ہے۔

ان مختلف تعریفوں کی روشنی میں نویلے کا مفہوم بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ بین الاقوامی ادب میں یہ یا اسی کے آس پاس کی صنف مختلف ناموں کے ساتھ رائج ہے چنانچہ انگریزی کا طویل مختصر افسانہ (Long short story) یا فرانسیسی کا نویلیت (Nouvelle) کم و بیش جرمن نویلے ہی کے مفہوم کو ادا کرتے ہیں۔ پچھلی دو صدیوں میں دُنیا کے بہت سے نامور ادیبوں نے اسی صنف کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا تھا۔ اس سلسلہ میں رُوسی ادب سے پشکن، گوگول، ٹالسٹائی، ترگنیف، چیکوف، فرانسیسی ادب سے موپساں، ہسپانوی ادب سے الارکون اور اطالوی ادب سے پیرانڈیلو کے نام بطورِ مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔

جرمن ادب میں نویلے اٹھارویں صدی کے آخر میں آیا اور بہت جلد ادب کی ایک مقبول صنف بن گیا۔ جرمن مزاج کی شدت پسندی اس صنف کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز تھی چنانچہ اس کو 'قومی صنفِ ادب' کی حیثیت سے اپنا لیا گیا۔ کلاسیکی عہد سے لے کر آج تک جرمن نثر کی سب سے مقبول صنف یہی نویلے رہا ہے۔ اگر اس دور میں ہم 'جرمن افسانہ' کی تاریخ اور اس کے ارتقا کا جائزہ لیں تو ہمیں 'افسانہ' کی جگہ 'نویلے' ہی نظر آتا ہے۔ گوئٹے کے عہد سے لے کر موجودہ دور تک جرمن ادب میں لاتعداد نویلے لکھے گئے ہیں جو زندگی کے مختلف شعبوں پر محیط ہیں۔ اسی بنا پر مضامین کے اعتبار سے ان کو مختلف گروہوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ نویلے کے خاص مجموعے یہ ہیں:

۱۔ کلاسیکی نویلے۔ ۲۔ مابعد الطبیعاتی نویلے۔

---

1. E K Bennet
2. Marco
3. Pirandello

۳۔ رُومانی نویلے۔ ۵۔ شاعرانہ یا حقیقی نویلے

۴۔ بیانیہ نویلے۔ ۶۔ نفسیاتی نویلے۔

جرمن ادب میں نویلے نویسی کی تاریخ اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں گوئٹے کے "جرمن آوردہ گردوں کی گفتگو"[1] سے شروع ہوتی ہے۔ یہ دور روائیت پسندی کا تھا جس میں کچھ ہی عرصہ بعد داخلیت کی شدت ہو گئی اور تقریباً پوری انیسویں صدی تک یہی رنگ چھایا رہا۔ اس انداز نے بالآخر اپنی انتہا پر پہونچ کر ہیئت کے مروجہ اصولوں سے انحراف کیا اور کلائسٹ[2] نے مابعد الطبیعاتی مسائل کو بھی نویلے کی صنف میں داخل کر دیا اس کے ساتھ ہی اس نے تاریخی و شخصی نویلے لکھ کر اس ٹیکنک میں بالکل نئے تجربے کیے۔ خالص رومانی مضامین[3] کی فضا لڈوک ٹیک، آئشن ڈورُف، آرنم اور ہوف من نے پیدا کی۔ خاص طور پر ہوف من نے فنی نویلے (Künstlernovelle) لکھ کر اس صنف میں بڑا حُسن پیدا کیا۔ حقیقت پسندانہ اور تخیلی تجربوں کی ابتدا گوٹ ہیلف[4] اور آئر باخ کے ہاتھوں ہوئی اس دور کے نویلے (Dorfnovelle) کہلاتے ہیں۔ اس دور تک جرمن نویلے فنی طور پر انتہائی پختہ اور تخیلی دولت سے مالا مال ہو چکا تھا اس کی وسعت بھی بے اندازہ تھی چنانچہ اب عوامی ترجمانی کا کام بھی اسی صنف سے لیا جانے لگا۔ اس عہد نے اشٹورم[5]، کیلر، گوٹ فریڈ، موریکے، رابے، اوٹو لڈوگ اور گرل پارسر جیسے فنکار پیدا کیے۔ اس دور کے اختتام پر نفسیاتی تجربوں کا آغاز ہوا چنانچہ پاول ہیزے[6] اور مائر نے نفسیاتی مسائل پر کامیاب نویلے لکھے پیچھے آگے چل کر تھومس من، رلکے اور ہوف من انشتال کی فنی صلاحیتوں نے معراجِ کمال پر پہونچا دیا۔ اس درمیان میں ہیئت کی بے قاعدگی جو ایک عرصہ سے چلی آتی تھی ویلیم شیفر[7] اور پاؤل ارنسٹ[8] کے ہاتھوں دُور ہوئی۔

نویلے نویسی کی ابتدا سے لے کر موجودہ عہد تک کی تاریخ یہیں پر ختم ہوتی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ادب کی یہ مخصوص اور روایتی صنف عہدِ جدید کے تقاضوں کو بھی پورا کر سکتی ہے یا نہیں؟ تاریخی شہادت کی روشنی میں اس کا جواب نفی میں ملتا ہے جبکہ بیسویں صدی کے آغاز اور اس کے ابتدائی ایام گزر جانے کے بعد ہمیں نویلے اپنی روایتی عظمت کھوتا نظر آتا ہے۔ اب اس میں وہ شکوہ باقی نہیں جو قدیم زمانہ سے بطور ورثہ چلا آرہا تھا اور بیسویں صدی کی ایک چوتھائی گزر جانے کے بعد تو نویلے فنی اعتبار سے بالکل بے جان معلوم ہوتا ہے اس کے ساتھ ہی مختصر افسانہ کا آغاز ہوتا ہے۔

نویلے کی اس ہمہ دانی کے نتیجہ میں نثر کی دیگر اصناف کو پنپنے کا موقعہ نہیں مل سکا۔ لیکن مختصر نثر نویسی کے تجربات جاری ضرور رہے چنانچہ Marchen Parabeln, Ankdote, Grotesken کے عنوانات سے اس

---

1. 'Unterhaltungen deutscher Ausgewanderten
2. Kleist
3. Ludwig Tieck
   Eichendorff
   Arnim
   E.T.A. Hoffmann
4. Gotthelf
   Aurbach
5. Storm
   Keller
   Gottfried
   Morike
   Rabe
   Otto Ludwig
   Grillparzer
6. Paul Heyse
   C. F. Mayer
   Thomas Mann
   Rilke
   Hoffmannstahl
7. Wilhelm Shafer
8. Paul Ernst

دور میں جو کچھ لکھا جاتا رہا وہ بڑی حد تک مختصر افسانہ سے قریب معلوم ہوتا ہے اس دور میان میں لکھی جانے والی بعض کہانیاں تو قطعاً افسانوی انداز رکھتی ہیں چنانچہ یہاں مختصر زمین کے اس دور کا مجموعی حیثیت سے تذکرہ کیا جانا ضروری ہے جو اس پر فیصلے کی سرپرستی میں گزرا۔

جرمن ادب کا مطالعہ کرنے کے لیے اس کو تین بڑے تاریخی ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱. گوئٹے کا دور	۱۷۵۰	تا	۱۸۳۲
۲. حقیقت پسندی کا دور	۱۸۳۲	تا	۱۸۸۵
۳. فطرت پسندی سے جدید رومانیت تک ۱۸۸۵		تا	موجودہ عہد۔

گوئٹے کا عہد بظاہر افسانوی ادب سے کوئی ربط نہیں رکھتا لیکن اس عہد کا تذکرہ جرمن ادب کی ہر صنف کے تذکرے کے ساتھ ناگزیر ہے کہ اس دور نے جرمن ادب پر دائمی اثرات چھوڑے ہیں۔ اسی زمانہ میں جرمن ادب کا نشاۃ ثانیہ ہوا جو تاریخ میں "طوفان و ہیجان" (Sturm und Drang) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کا آغاز اگرچہ ہرڈر[1] کے عہد سے ہو چکا تھا لیکن گوئٹے اور شلر نے اس کو معراج کمال پر پہونچا دیا۔ اٹھارویں صدی کی اس انقلابی تحریک نے جرمن ادب میں ایک نئی رُوح پھونک دی۔ اس دور میں ادب کو کلاسیکی بندھنوں سے آزاد کیا گیا، اس میں داخلیت کی جذبات پرستی اور انفرادیت کے عناصر کو ابھارا گیا اور فرسودہ اخلاقی و تمدنی اقدار سے اعلانیہ بغاوت کی گئی جس کے باعث جرمن قوم زندگی کی ایک نئی حرارت محسوس کرنے لگی اسی حرارت کو "خالص جرمن رُوح" کا نام دیا جاتا ہے چنانچہ آج تک جرمن ادب میں کسی نہ کسی انداز سے یہی رُوح کارفرما نظر آتی ہے۔ ان خوبیوں سے قطع نظر اس تحریک کی بے انتہا شدت، داخلیت اور انفرادیت کا اپنی حدود سے تجاوز ادب میں عام بے راہ روی، غیر آہنگی اور کسی قدر بے ترتیبی کا بھی موجب بنا چنانچہ بعد کے حقیقت پسند دور میں "طوفان و ہیجان" کے اس خروش کے ساتھ ہی اس کی خوبیاں اور خامیاں بڑے نمایاں طور پر محسوس کی جاتی ہیں۔

نثری ادب میں اس دور کی اہم ترین شخصیت جورج بیوشنر[2] ہے جس کی واحد کہانی "لینس" (Lenz) جرمن مختصر افسانے کی قدیم مثال کہی جا سکتی ہے۔ یہ کہانی "طوفان و ہیجان" کے آخری دنوں میں لکھی گئی ہے جس میں اس تحریک کے جمالیاتی اصولوں کو شاعرانہ حقائق کو بڑے واضح انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ بدقسمتی سے بیوشنر کے انفرادی خیالات (خصوصاً اس کی فلسفہ میں عینیت اور ادب میں رومانیت سے نفرت) اس کو شہرت نہ دے سکی۔ انگریزی ادب میں کیٹس کی طرح بیوشنر کی جوان موت نے جرمن ادب کو بھی ناقابلِ تلافی نقصان پہونچایا۔ اس دور کی ایک اور اہم مختصر کہانی ہے "برجیٹا" (Brigita) ہے

---

1. Johann Gottfried Herder (1744 1803)
2. George Buchner

جس سے اڈلبرٹ اشٹیفٹر[1] کی فنی مہارت کے ساتھ اس کے مشاہدۂ فطرت کا احساس ہوتا ہے۔ موقمن اشتھال کی کئی مختصر کہانیاں بھی جن میں اس کی فنکاری، شاعرانہ فکر اور انداز کی جدّت نمایاں ہے اس دور کے مختصر افسانہ کی عمدہ مثالیں ہیں۔

انیسویں صدی کے آخری ایام میں حقیقت پسندی کا دور بھی ختم ہوا اور اس پر تاثریت کا غلبہ ہونے لگا اسی زمانے میں جرمن ادب بین الاقوامی تاثرات بھی قبول کیے خاص طور سے فلاؤبر، موپساں، دوستووفسکی، ڈی انیزیو[2]، اسکر وائلڈ اور ڈی ایچ۔ لارنس کی تحریروں نے جرمن لکھنے والوں کو شدّت سے متاثر کیا چنانچہ رومانیت کے اس رجحان کو اپنا لینے کے بعد سماجی برائیوں کا برملا اظہار کیا جانے لگا۔ اگرچہ اس تشہیر کا مقصد (خود فطرت پسندوں کے بقول) 'بدی' کا استیصال' تھا لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ۱۹۰۰ء کے آس پاس بدی کی یہ نشرو اشاعت بالآخر ابتذال کی حد تک پہونچ گئی۔ افسانوی ادب میں اس دور کی اہم شخصیت[3] آرتھر شنشلر ہے جسے خالص آسٹرین فطرتیت کا نمائندہ کہا جاتا ہے اس کا فن ترقی یافتہ ہونے کے ساتھ زندگی کی توانائی سے بھرپور ہے۔ محبت کے مسائل کو اس نے روایتی انداز کے مقابلہ میں عقل وشعور کی میزان پہ جانچنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ جابجا نفسیاتی حقائق بھی بیان کرجاتا ہے اس کی فن کارانہ ذہانت موپساں سے کم نہیں تاہم اظہار کی بے باکی اور مخصوص رنگ کی اشاریت کہیں کہیں اخلاقی حدود سے متجاوز ہو جاتی ہے جہاں وہ (Ruhe ه Ilec) کو بھی محض ایک "بے ضرر کھیل" کہہ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس کے برعکس اسی تحریک کے دوسرے بڑے علمبردار گیہارٹ ہاؤپٹ من[4] کے یہاں خیالات میں تنوّع کے ساتھ زندگی سے ہم آہنگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی تخلیقات مختلف المتنوع عناصر کا مرکب ہیں جن میں زندگی کے مسائل کی تشریح کے ساتھ ان کا حل ڈھونڈنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ فنی اعتبار سے بھی اس کا انداز بڑا پختہ اور بھرپور ہے۔ ہاؤپٹ من کی سب سے بڑی خوبی اس کی ہمہ گیری ہے یہی وجہ ہے کہ فطرتیت کے دور سے اگر اس شخصیت کو نکال دیا جائے تو یہ دور بالکل بے رنگ نظر آتا ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز کا زمانہ یورپ میں عام نفسیاتی تحریک کا زمانہ ہے۔ اس دور میں فرائڈ کی نفسیاتی تحلیل، پراوسٹ اور جوئس کا تجزیاتی اسلوب ہر یورپی فنکار کے ذہن پر مسلط تھا۔ دوسری طرف فرانسیسی اہل قلم موضوع، ہیئت اور اسلوب میں نت نئے تجربے کر رہے تھے اس سلسلہ میں فلاؤبر کا انداز خصوصیت کے ساتھ جرمن لکھنے والوں کو متاثر کر رہا تھا۔ انہی محرکات نے جرمن ادب میں ایک ایسی شخصیت کو جنم دیا جو آج بھی نہ صرف جرمن بلکہ بین الاقوامی ادب میں پائے کی شخصیت سمجھی جاتی ہے۔ یہ شخصیت ٹھومس من[5] ہے جس نے پرانی قدروں کا زوال اور نئی قدروں کا عروج خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور آج بھی وہ ان دونوں کے درمیان ثابت قدمی سے کھڑا نظر آتا ہے اس دور کے ٹھومس من کا افسانوی سرمایہ اگرچہ قلیل ہے لیکن اس میں بھی فن کارانہ صلاحیتوں کا غیر معمولی اظہار پایا جاتا ہے۔ "ابتری اور ابتدائی آلام"[6] میں اس نے خیالات وجذبات کو دانشورانہ خطوط پر پیش کرنے کے کامیاب تجربے کیے ہیں۔ بعد کی کہانیاں

---

1. Adelbert Stifter
2. Gabriele d Anunzio
3. Anther Schnitzler
4. Gehart Hauptmann
5. Thomas Mann
6. 'Disorder & Early Sorrows'

ساتھ بڑا مصلح بھی ہے لہٰذا زندگی کی بے قاعدگیوں
ہے اس کے یہاں محاسبہ کا سب سے بڑا معیار نفسیات ہے جس کی
ے تحفظ اور اس کی سلامتی کا خواہاں ہونے کی حیثیت سے وہ عوامی قدروں
والے دور میں اس کو انہی خیالات کے جرم میں معتوب کیا گیا۔ نازی غلبہ کے زمانہ میں اس نے
امریکہ کی شہریت قبول کر لی۔ برلن یونیورسٹی کے اعزازی گریجویٹوں کی فہرست سے بھی نام خارج
کیے جانے پر اس نے یونیورسٹی کے ڈین سے مراسلت میں اپنے نظریات کی فاضلانہ توجیہات دی ہیں۔ افسانوی ادب کے علاوہ فکشن
کے دوسرے شعبوں پر بھی تھومس من کی شخصیت چھائی نظر آتی ہے۔ اس کا اثر و نفوذ آج کے جرمن ادب میں بھی سرایت کیے
ہوئے معلوم ہوتا ہے۔

۱۹۱۴ء میں جرمنی کی پہلی سیاسی موت واقع ہوئی جس سے ادب شدت کے ساتھ متاثر ہوا۔ جنگ کے خاتمہ پر فاتح اقوام اپنی تمدنی زندگی کی از سرِ نو تعمیر میں مصروف ہو گئیں لیکن جرمنی اس سے محروم رہا۔ شکست اور پھر صلح، دونوں سے جرمنی پسماندگی کا شکار ہو گیا اور مدت تک اس کو اپنے حریفوں کا دستِ نگر رہنا پڑا اس طرح قومی زندگی میں شکست خوردگی اور درماندگی کی فضا پیدا ہو گئی۔ عوام برسرِ اقتدار طبقہ کے خلاف عام بیزاری کا اظہار کرنے لگے یہی رجحان تاریخ میں "منکریت" (NIHILISM) کے نام سے موسوم ہے جس میں اشپنگلر[1] نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "زوالِ مغرب" (untergang des Abendlandes) لکھ کر یورپی تمدن کے انہدام کا اعلان کیا۔

اس تھکن، افسردگی اور بیچارگی کے ماحول نے فنکاروں کو کسی ذہنی پناہ گاہ کی تلاش کے لیے مجبور کیا۔ یہی پناہ گاہ ادب میں اظہاریت کی تحریک تھی۔ یہ لفظ اگرچہ ۱۹۱۱ء کے لگ بھگ ہی جرمن ادب میں متعارف ہو چکا تھا تاہم اس وقت تک اس کو محض تاثریت کے مخالف نظریہ کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا تھا۔ اظہاریت پسندوں نے نپولین عہد کے رومانیت پسندوں کی فنکارانہ روش اور ان کی رائج کردہ اخلاقی و فلسفیانہ قدروں کو یکسر بدل ڈالا۔ انھوں نے حقیقت پسندوں کے اس نظریہ کا بھی بطلان کیا کہ محض معلومات صداقت کو پیش کرنا فن ہے۔ ایک طویل عرصہ تک یہی اظہاریت کی تحریک جرمن ادب پر چھائی رہی جس کا سلسلہ کم و بیش وائمر جمہوریہ[2] کے آغاز تک جاری رہا۔ یہاں پہونچکر اس تحریک نے ایک ایسا موڑ لیا جو آگے چل کر خود ایک ہنگامہ پرور تحریک کی صورت اختیار کر گیا۔

یہ ماورائیت کی تحریک تھی۔ جرمن ادب اس نئی تحریک سے جس حد تک متاثر ہوا اس کا اندازہ آج کی تخلیقات سے بھی بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ اسی ضمن میں جرمن ادب میں ایک ایسی شخصیت کا نام لیا جاتا ہے جس نے نہ صرف جرمن بلکہ بیسویں صدی کے فکشن پر بھی گہرے نقوش چھوڑے ہیں آج کے جرمن افسانے میں جا بجا اسی کی صدائے بازگشت سنی جاتی ہے۔ یہ

---

1. Oswald Spengler (1880-1936)
2. Weimar Republik

حقیقت فرانس کافکا ہے جو جرمن زبان میں ماورائیت کا سب سے بڑا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ کافکا کا فن اور اس کی تخلیقات کلیتہً اسی تحریک سے وابستہ ہیں جن کا مطالعہ کرنے کے لیے اس تحریک کا پس منظر پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

بیسویں صدی کے ادب کی یہ انقلابی تحریک فرانس سے شروع ہوئی اور بہت جلد یورپ امریکہ کے ممالک تک پہونچ گئی۔ ادب کے ساتھ آرٹ کے دیگر شعبوں پر بھی اس سے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ ہمسایہ ملک ہونے کی حیثیت سے جرمنی نے ان اثرات کو شدت سے قبول کیا۔

بیسویں صدی کے فرانسیسی ادب پر برگساں کے وجدانی فلسفے نے گہرا اثر ڈالا جس نے مصوری میں تاثریت اور بعد میں پکاسو کے فن مکعبیت' (Cubism) کی صورتیں اختیار کیں۔ اسی زمانہ میں فرائڈ کی نفسیاتی تحلیل نے لاشعور کی پُر اسرار قوتوں سے آگاہی دے کر یورپی ذہنوں میں انقلاب برپا کر دیا چنانچہ فرانسیسی شاعری میں اپولی نیر[1] کی شخصیت میں یہی دو عناصر نمایاں نظر آتے ہیں اسی شخص نے سب سے پہلے 'ماورائیت' کا لفظ بھی استعمال کیا جو آنے والے دور میں ایک عظیم ادبی تحریک کا مرکز بنا۔ اپولی نیر نے خارجی صداقتوں سے ہٹ کر ماورائی حقیقتوں کو اپنا موضوع بنایا اس کے ساتھ ہی اس نے ہئیت کے مروجہ اصولوں سے انحراف کا آغاز کیا جس نے پہلے 'دادیت' (Dadaism) اور بعد میں ماورائیت (Surrealism) کی صورتیں اختیار کیں۔

'دادائیت' کا آغاز ۱۹۱۶ء میں سوئٹزرلینڈ میں زرتیش تسارا[2] اور اس کے معاصرین نے کیا۔ یہ لوگ اپولی نیر کے تتبع میں "خالص شاعری" کے قائل تھے جس میں خارجیت ایک بے معنی لفظ تھا۔ اس شاعری کا مقصد (خود اس نظریے کے بانیوں کے بیان کے مطابق) محض تحت الشعور سے آنے والے پیغامات کی ترسیل تھا، جس کے لیے اوزان بحور اور ردیف و قافیہ کی پابندی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس تحریک نے اپنے وقت کے تمام اخلاقی و ذہنی تحفظات کو بالائے طاق رکھ کر آرٹ میں ہر بے راہ روی کو جائز قرار دے لیا۔

دادائیت کے اس منفی رجحان اور اس کی بے اعتدالیوں کے باعث اس کے بہت سے حامی اس سے الگ ہو گئے جنھوں نے ایک نئے مکتبۂ فکر کی بنیاد ڈالی۔ یہی مکتبۂ فکر ماورائیت کہلاتا ہے جس کا بانی آندرے بریتوں[3] تھا۔ اس تحریک کے ماننے والوں کا کہنا تھا کہ عالم محسوسات کے علاوہ ایک اور عالم بھی اپنا وجود رکھتا ہے جو اس ظاہری اور حسی عالم سے بالکل مختلف ہے۔ اس عالم تک رسائی حاصل کرنے کا واحد ذریعہ لاشعور ہے جس کو استعمال کرنے کے لیے انسان کو عقل و منطق سے کنارہ کش ہو جانا ضروری ہے چنانچہ ماورائیت میں خارجی اور معروضی حقیقت کوئی معنی نہیں رکھتی اس کی جگہ لاشعور کی داخلی حقیقت سب پر مقدم ہوتی ہے۔ ماورائی فنکار حقیقت کو خارجی اشیاء میں تلاش نہیں کرتا بلکہ اس کے لیے وہ لاشعور کی مدد سے خود اپنے وجود کی گہرائیوں میں اُتر جاتا

---

1. Guillaume Apollinaire
2. Tristan Tzara
3. Andre Breton

س کے ترقی یافتہ فن کی بہترین مثالیں ہیں۔ وہ ایک عظیم فن کار ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا مصلح بھی [illegible] اور بے اعتدالیوں سے چشم پوشی نہیں کرتا بلکہ ان کی اصلاح چاہتا ہے اس کے یہاں محاسبہ کا [illegible] ہے جن کی صداقتوں سے وہ کبھی روگردانی نہیں کرتا۔ نوع انسانی کے تحفظ اور اس کی سلامتی کا خواہاں ہونے کی حیثیت سے وہ [illegible] قدروں کا پورا پورا احترام کرتا ہے۔ آنے والے دور میں اس کو انہی خیالات کے جرم میں منسوب کیا گیا [illegible] اس نے وطن کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہا اور امریکہ کی شہریت قبول کرلی۔ بون یونیورسٹی کے اعزازی ڈگری [illegible] خارج کیے جانے پر اس نے یونیورسٹی کے ڈین سے مراسلت میں اپنے نظریات کی فاضلانہ توجیہات [illegible] ادب کے علاوہ فکشن کے دوسرے شعبوں پر بھی ٹھومس من کی شخصیت چھائی نظر آتی ہے۔ اس کا اثر و نفوذ [illegible] میں بھی سرایت کیے ہوئے معلوم ہوتا ہے۔

۱۹۱۴ء میں جرمنی کی پہلی سیاسی موت واقع ہوئی جس سے ادب شدت [illegible] جنگ کے خاتمہ پر فاتح اقوام اپنی تمدنی زندگی کی از سرِنو تعمیر میں مصروف ہوگئیں لیکن جرمنی اس سے محروم [illegible] سے جرمنی پسماندگی کا شکار ہوگیا اور مدت تک اس کو اپنے حریفوں کا دست نگر رہنا پڑا اس طرح قومی [illegible] کی فضا پیدا ہوگئی۔ عوام برسراقتدار طبقہ کے خلاف عام بیزاری کا اظہار کرنے لگے یہی [illegible] (NIHIL[illegible]) کے نام سے موسوم ہے جس میں اشپنگلر[1] نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "زوالِ مغرب" (unte rgang [illegible]) لکھ کر یورپی تمدن کے انہدام کا اعلان کیا۔

اس تھکن، افسردگی اور بیچارگی کے ماحول نے فنکاروں کو کسی ذہنی پناہ گاہ کی تلاش کے لیے مجبور کیا۔ یہی پناہ گاہ ادب میں اظہاریت کی تحریک تھی۔ یہ لفظ اگرچہ ۱۹۱۱ء کے لگ بھگ ہی جرمن ادب میں متعارف ہوچکا تھا تاہم اس وقت تک اس کو محض ناٹزیت کے مخالف نظریہ کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا تھا۔ اظہاریت پسندوں نے نپولین عہد کے روایت پسندوں کی اسلوبِ روش اور ان کی رائج کردہ اخلاقی و فلسفیانہ قدروں کو یکسر بدل ڈالا۔ انھوں نے حقیقت پسندوں کے اس نظریہ کا بھی بطلان کیا کہ محض معلومات صداقت کو پیش کرنا فن ہے۔ ایک طویل عرصہ تک یہی اظہاریت کی تحریک جرمن ادب پر چھائی رہی جس کا سلسلہ کم و بیش وائمر جمہوریہ[2] کے آغاز تک جاری رہا۔ یہاں پہونچکر اس تحریک نے ایک ایسا موڑ لیا جو آگے چل کر خود ایک منظم تحریک کی صورت اختیار کرگیا۔

یہ ماورائیت کی تحریک تھی۔ جرمن ادب اس نئی تحریک سے جس حد تک متاثر ہوا اس کا اندازہ آج کی تخلیقات سے بھی بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ اسی ضمن میں جرمن ادب میں ایک ایسی شخصیت کا نام لیا جاتا ہے جس نے نہ صرف جرمن بلکہ بیسویں صدی کے فکشن پر بھی گہرے نقوش چھوڑے ہیں آج کے جرمن افسانے میں جا بجا اسی کی صدائے بازگشت سنی جاتی ہے۔

---

1. Oswald Spengler (1880-1998)
2. [illegible]

ہیئت فرانس کا کافکا ہے جو جرمن ادب میں ماورائیت کا سب سے بڑا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ کافکا کا فن اور اس کی تخلیقات کلیتہً اسی
...یب سے وابستہ ہیں جن کا مطالعہ کرنے کے لیے اس تحریک کا پس منظر پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

بیسویں صدی کے ادب کی یہ انقلابی تحریک فرانس سے شروع ہوئی اور بہت جلد یورپ و امریکہ کے ممالک تک
...پہنچ گئی۔ ادب کے ساتھ آرٹ کے دیگر شعبوں پر بھی اس سے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ ہمسایہ ملک ہونے کی حیثیت
...سے جرمنی نے ان اثرات کو شدت سے قبول کیا۔

بیسویں صدی کے فرانسیسی ادب پر برگساں کے وجدانی فلسفے نے گہرا اثر ڈالا جس نے مصوری میں تاثریت اور بعد
...ن پکاسو کے فن 'مکعبیت' (cubism) کی صورتیں اختیار کیں۔ اسی زمانہ میں فرائڈ کی نفسیاتی تحلیل نے لاشعور کی پر اسرار
...دنیاؤں سے آگاہی دے کر یورپی ذہنوں میں انقلاب برپا کر دیا چنانچہ فرانسیسی شاعری میں اپولی نیئر[1] کی شخصیت میں یہی دو عناصر
...م آہنگ نظر آتے ہیں اسی شخص نے سب سے پہلے 'ماورائیت' کا لفظ بھی استعمال کیا جو آنے والے دور میں ایک عظیم ادبی تحریک کا
...م بنا۔ اپولی نیئر نے خارجی صداقتوں سے ہٹ کر داخلی حقیقتوں کو اپنا موضوع بنایا اس کے ساتھ ہی اس نے ہیئت کے
...روجہ اصولوں سے انحراف کا آغاز کیا جس نے پہلے دادیت (Dadaism) اور بعد میں ماورائیت (surrealism)
...صورتیں اختیار کیں۔

'دادائیت' کا آغاز ۱۹۱۶ء میں سوئٹزرلینڈ میں زرتیس تسارا[2] اور اس کے معاصرین نے کیا۔ یہ لوگ اپولی نیئر کے تتبع میں
...خالص شاعری کے قائل تھے جس میں خارجیت ایک بے معنی لفظ تھا۔ اس شاعری کا مقصد (خود اس نظریے کے بانیوں کے بیان
...کے مطابق) محض تحت الشعور سے آنے والے پیغامات کی ترسیل تھا، جس کے لیے اوزان بحور اور ردیف و قافیہ کی پابندی کوئی
...معنی نہیں رکھتی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس تحریک نے اپنے وقت کے تمام اخلاقی و ذہنی تحفظات کو بالائے طاق رکھ کر آرٹ میں
...پ... جائز قرار دے لیا۔

...یت کے اس منفی رجحان اور اس کی بے اعتدالیوں کے باعث اس کے بہت سے حامی اس سے الگ ہو گئے جنھوں نے
...کی بنیاد ڈالی۔ یہی مکتبہ فکر ماورائیت کہلاتا ہے جس کا بانی آندرے بریتوں[3] تھا۔ اس تحریک کے ماننے والوں کا کہنا تھا کہ
...کے علاوہ ایک اور عالم بھی اپنا وجود رکھتا ہے جو اس ظاہری اور حسی عالم سے بالکل مختلف ہے۔ اس عالم تک رسائی
...کا واحد ذریعہ لاشعور ہے جس کو استعمال کرنے کے لیے انسان کو عقل و منطق سے کنارہ کش ہونا ضروری ہے چنانچہ
...اور معروضی حقیقت کوئی معنی نہیں رکھتی اس کی جگہ لاشعور کی داخلی حقیقت سب پر مقدم ہوتی ہے۔ ماورائی
...خارجی اشیاء میں تلاش نہیں کرتا بلکہ اس کے لیے وہ لاشعور کی مدد سے خود اپنے وجود کی گہرائیوں میں اتر جاتا

1. Guillaume Apollinaire

ہے جو عمل عقل و ارادے کا تابع نہیں چنانچہ آندرے بریتوں نے اس عمل کو ' خالص نفسیاتی خود حرکیت ' (Psychic Automatism) کا نام دیا ہے۔ حقیقت کی اس لاشعوری تلاش میں ' مادی انسانیت ' کا ادبا سے خود بخود رشتہ قائم ہوجاتا ہے جس کی کوئی منطقی توجیہ نہیں کی جاسکتی۔ ایڈ شمڈ کازیمیر[1] نے اپنی شاعرانہ ' اظہاریت '[2] میں اس رشتہ کی سب سے بڑی خوبی یہی بتائی ہے کہ یہ ہر قسم کی عقلی و منطقی توجیہات سے بالاتر ہے۔ ماورائیت پسندوں کی دلیل ہمیشہ یہ رہی کہ موضوع اور معروض کے تضاد کی موجودگی میں انسان اپنی حقیقت کو نہیں پاسکتا کہ ' خالص معروض فریب نظر یا خالی خولی بے حقیقت صورت ہے ' اس کے لیے انسان کو باطنی وجدان سے کام لینا چاہیے جو لاشعور کی اتھاہ گہرائیوں میں موجود اور حقیقت کے اسرار منکشف کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماورائیت میں لاشعور کو ' مطلق حقیقت ' (Absolute Reality) کی حیثیت دی جاتی ہے۔

ماورائی فنکاروں نے اظہار کے لیے بالواسطہ (Symbolism) کا طریقہ اختیار کیا ہے جس میں ہیئت اور موضوع کا کوئی تعین نہیں ہوتا۔ رمزیت کا ہر ہر لفظ کسی نہ کسی ذہنی کشمکش کی علامت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے جس سے لاشعور میں دبی ہوئی یادوں کا ایک سلسلہ قائم ہوجاتا ہے۔ رمزیت کے کسی لفظ کا مفہوم خارجی حقیقتوں کو سامنے رکھ کر نہیں نکالا جاسکتا کیونکہ یہ تو محض کسی ذہنی کیفیت کی جانب ایک اشارہ کی حیثیت رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات رمزیت محض الفاظ کا ایک چیستان معلوم ہوتی ہے۔ ملارمے کہتا ہے " نظم تو ایک معمہ ہے جس کا حل پڑھنے والوں کو نکالنا چاہیے۔"

جرمنی میں واگنر[3] کی موسیقی رمزیت کی فضا کے لیے بہت سازگار ثابت ہوئی اور فنکاروں نے جا بجا اس سے استفادہ بھی ... کیا۔ اس موسیقی کی مضراب نے یادوں کا ایک طلسمات پیدا کرتی ہے جس کے ذریعہ انسان لاشعور کی پُراسرار اور اتھاہ گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ اس پُراسرار دھندلکے میں بھٹکنے سے انسانی شعور خود بخود منتشر تو زنات سے ہم آہنگ ہوجاتا ہے۔ رمزیت کا یہی انداز ماورائی فنکاروں میں قبولیت کا باعث بنا۔

کہا جاتا ہے کہ ماورائیت کی تحریک محض دادائیت کے رد عمل کے نتیجہ میں پیدا ہوئی جس کا خود اپنا کوئی بڑا محرک نہیں تھا۔ تاریخ کی روشنی میں اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ بین الاقوامی طور پر ماورائیت کا رجحان اس وقت سے بہت پہلے ہی سے محسوس کیا جا رہا تھا جس کے بنیادی عوامل میں فرائڈ کی لاشعور کی بصیرت ' ہیگل کے تصوراتی نظریات اور مارکس کے سیاسی افکار شامل تھے جن کا زمانہ دادائیت سے پہلے کا ہے۔ خصوصاً فرائڈ کا پیش کردہ نظریہ لاشعور[4] ' انا ' فوق الانا اور اصول حقیقت کا نظریہ اس تحریک کا سب سے بڑا محرک کہا جاسکتا ہے جس کے ذریعہ انسان نے پہلی مرتبہ مافوق الفطرت عناصر سے چھٹکارہ پاکر لاشعور کے ذریعے خود اپنے وجود کی حقیقت اور زندگی کے آلام کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں وہ کہاں تک

---

1. Edschmid Kasimer
2. Über den Expressionismus in der Literatur & die neue Dichtung
3. Richard Wagner (1813-1883)
4. Freud: 'Unbewusstsein, ich, uberich & Princip des Wirklichkeit

یاب ہُما اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے البتہ اتنا وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ اس تجربہ سے انسان نے ایک ایسی حقیقت ضرور پالی جو مسرت ماورا تھی۔ یہ حقیقت خود اس کی اپنی آگہی تھی

اسی حقیقت کی تلاش بودلیئر، مالارمے اور ریں بو کی گہری رمزیت میں پوشیدہ ہے اور اسی منزل تک پہنچنے کے لیے ٹو کو پراسرار تی فضا کے جنگلوں سے گزرنا پڑا ہے۔ کافکا اسی دنیا کا ایک ہیبت ناک کابوس ہے۔

جرمن ادب میں نظم میں میرنک[1] اور نثر میں کافکا[2] ماورائیت کے اوّلین علمبردار کہے جاتے ہیں۔ کافکا کی اہمیت کا سبب اس کا رمزی انداز، اس کے تخیل کی ہمہ سائی اور اس کا عجیب و غریب احساس ہے۔ اس کا فن ثبوتیت اور سائنس کے دور میں بھی پُراسرار عناصر ہمیت کو منواتا ہے۔ ماورائی فنکار ہونے کی حیثیت اس کے یہاں بھی ہیئت کی عام بے قاعدگیاں پائی جاتی ہیں جہاں وہ خارجیت کے ھنوں سے آزاد ہو کر محض لاشعور کی دھندلی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرتا ہے اور اس دنیا کے عجیب و غریب اور منتشر تلازمات کی جانب اراتی و علامتی میں اشارے دیتا ہے۔ وجود اور حقیقت کا انکشاف اس کے فن میں کسی قدر خوف کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ "تغیر[3]" ں انسانی وجود کا مجہول ہو کر ایک ہولناک حشراتی مخلوق میں تبدیل ہو جانا اسی خوف کی علامت ہے جہاں زندگی پر خارجی قوتوں کی یورشیں سے بے بس کیے دیتی ہیں۔ تمدن کی پیچیدہ ساخت اور اس کے من مانے اصول و قواعد میں جکڑ جانے کے بعد انسان کرب محسوس کرنے لگتا ہے یہاں کافکا اپنی حسی گرفت میں ان پُراسرار مافوق طاقتوں کو بھی محسوس کرتا ہے جو غیر مرئی طور پر انسان کا گلا گھونٹ رہی ہیں۔ یہی احسا سزا کی بستی[4] میں شدت سے محسوس کیا جاسکتا ہے جو جرم و سزا کی ایک پُراسرار لیکن انتہائی ہولناک داستان ہے۔ اسٹیفن اسپینڈر نے کیا خوب ہا ہے کہ اس منزل پر کافکا آنے والے دور کا پیغمبر نظر آتا ہے کہ 'بے جرم سزا' کا جو میکانی انداز کافکا کے تخیل نے ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ سوس کر لیا تھا، صرف بیس سال کے اندر ہی اندر آؤشوٹس[5] اور دیگر بتیس[32] نازی مقتل گاہوں میں اس کی عملی تشکیل بھی دیکھ لی گئی۔ اسی طرح شہری ڈاکٹر[6] "خواب[7]" اور بعد کے مختصر نثری مجموعہ (Die Erzähulngen) کی ایک ایک کہانی اس کے عظیم فن کی نمائندگی ستی ہے۔ کافکا کا احساس قاری کو تخیل کی ایک ایسی دنیا میں پہنچا دیتا ہے جہاں کرب کے ہوتے ہوئے بھی اس کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ اس جنگ میں وہ جابجا واہمہ کی مدد لیتا ہے لیکن اس واہمہ پر حقیقت کا دھوکہ ہوتا ہے اور کبھی کبھی اس اجنبی احساس میں حقیقتیں بھی واہمہ معلوم دینے لگتی ہیں۔ اس کی تخیلات بلاشبہ جاگتے انسان کا خواب ہیں جو خواب ہونے کے باوجود بیدار حقیقتیں نظر آتی ہیں۔

کافکا کے فن پر اس کی دائم المریض شخصیت، باپ سے اس کے ذہنی تصادم (Father complex) اور آریائی معاشرے" میں اس کی یہودی نسلیت نے گہرا اثر ڈالا ہے۔ یہی تمام عناصر اس کو زندگی سے خوف دلانے کا بھی محرک ہوئے یہی وجہ ہے کہ بعض حلقوں میں اس پر شخصیت سے انحراف کا الزام بھی عاید کیا جاتا ہے لیکن کافکا کا فن ایک ایسی دنیا کی نمائندگی کرتا

---

1. Mernik
2. Franz Kafka
3. 'Die Verwondlung'
4. 'In der Straf Colonie'
5. 'Auschwitz'-the concentration camp.
6. 'Der Landarzt'
7. 'Der Traum'

ہے جو شخصیت کی دار و گیر سے بالاتر ہے۔ ایک نقاد نے اس عظیم فنکار کی شخصیت اور اس کے فن کو "منجمد سمندر" سے تعبیر کیا ہے۔ ایسا سمندر جو اپنے اندر ناقابلِ قیاس وسعت اور بے پناہ عمق کو لیے ہوئے منجمد ہو جاتے، اس کی بے پایاں وسعت اور گہرائی کا صحیح اندازہ اسی وقت دیکھے جا سکتے ہیں جب یہ پگھل جائے۔

کافکا کا انتقال ۱۹۲۴ء میں ہوا۔ ۱۹۳۰ء کے آس پاس کا زمانہ جدید جرمن افسانہ کی تشکیل کا زمانہ ہے جسے ہم "خالص جرمن افسانہ" (Deutsche Erzählung) کہہ سکتے ہیں خواہ وہ نوفیلے کے ارتقاء سے وجود میں آیا ہو یا قدیم کہانی (Ankdot) کی ترقی یافتہ شکل ہو۔ جیسا کہ مضمون کے ابتدائی حصہ میں بیان کیا گیا ہے کہ جرمن ادب میں نوفیلے کچھ اس طرح رچ بس چکا ہے کہ عام طور پر (Short story) کی بجائے غلطی سے نوفیلے ہی کا نام دے دیا جاتا ہے حالانکہ تکنیک کے اعتبار سے دونوں میں بڑا فرق ہے جس کی وضاحت پہلے تو پیش کی جا چکی ہے۔

اس ضمن میں افسانہ کا نام آتے ہی ہمارے ذہنوں میں فوراً چیخوف، موپساں یا پو کے مثالی افسانوں کا خاکہ ابھرتا ہے جس میں بقول پو "وحدتِ تاثر" ایک لازمی شرط ہے اور واقعات کی مناسب و موزوں ترتیب محض تاثر کی شدت میں اضافہ کرنے کے لیے کی جاتی ہے۔ بیان و دیگر پہلوؤں سے عمداً گریز کیا جاتا ہے برخلاف اس کے جرمن افسانوں میں عموماً مضمون کے مطابق کسی جزو کو اکائی مان کر اس کو مکمل حیثیت سے بیان کرنے کے تجربہ پائے جاتے ہیں جس سے افسانہ (Short story) کی تکنیک سے ہٹ جاتا ہے اور اس پر پھیلی ہوئی کہانی (Extended Anekdote) کا گمان ہونے لگتا ہے۔ ایسے قصے عام طور پر مختصر افسانے کے مقابلہ میں زیادہ طویل ہوتے ہیں۔ لیکن اس صورت کا ہر جرمن افسانہ پر اطلاق ضروری نہیں۔ آج کے جرمن افسانے عام طور پر "وحدتِ تاثر" کی نہج پر ہی لکھے جاتے ہیں جو مختصر افسانہ کا بین الاقوامی معیار ہے۔

جدید جرمن افسانہ کی تشکیل کا زمانہ بدقسمتی سے جرمنی کی تاریخ کا انتہائی ہیجانی زمانہ ہے جسے پکّا اور اُبلتا ہوا (Kochende Zwanziger) زمانہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب جرمنی میں معاشی حالات انتہائی ابتر ہو چکے تھے سارے ملک میں اقتصادی بدحالی، سیاسی عدم استحکام اور سازشوں کا دور دورہ تھا۔ "قومیت" کا دیوانہ وار پروپیگنڈا کیا جا رہا تھا اور ہٹلر کی پارٹی ہر ممکن طریقے سے پارلیمنٹ (Reichstag) میں اکثریت حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ بالآخر یہ افراتفری کا دور ختم ہوا اور جرمنی میں مکمل طور سے ڈکٹیٹرشپ قائم ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس ملک کا وہ انقلابی دور شروع ہوتا ہے جس کے سنگین نتائج آج بھی جرمن دنیا بھگت رہی ہے۔ اس انقلاب نے زندگی کے مفہوم کو سرے سے بدل ڈالا جس کا براہ راست اثر ادب پر بھی ہوا۔ اس دور کے بیشتر فنکار اسی ہنگامے سے منسلق رہے ہیں اور ان کی زیادہ تر تخلیقات میں یہی انقلاب سرایت کیے ہوئے ہے لہٰذا ان مصنفین اور ان کی تخلیقات کو سمجھنے کے لیے اس انقلاب کا پس منظر اور اس کے اثرات کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ جرمن ادب پر اس کے اثرات دائمی نوعیت رکھتے ہیں۔

جرمنی کی تاریخ کا یہ بھیانک دور ۱۹۳۳ء میں نیشنل سوشلسٹ تحریک کی کامیابی سے شروع ہوا اور مسلسل بارہ[1] برس تک انتہائی ڈرامائی انداز میں جاری رہ کر ۱۹۴۵ء میں برلن میں ہٹلر کی خودکشی پر ختم ہو گیا لیکن اس کے منحوس اثرات جرمن زندگی پر آج اور آئندہ بھی محسوس کیے جاتے ہیں جنگ کے خاتمہ پر جرمنی کی سیاسی حیثیت یکسر بدل گئی۔ اس کو بشمول آسٹریا چار فوجی منطقوں میں بانٹ دیا گیا۔ اس وقت ملک کی اقتصادی حالت مکمل طور پر تباہ ہو چکی تھی۔ جنگ کے بعد کے تین سال تک یہی اقتصادی بحران جاری رہا جس کا خاتمہ ۱۹۴۸ء کی کرنسی اصلاحات پر ہوا اور ملک کی معیشت رفتہ رفتہ پھر اپنی اصلی حالت پر واپس آنے لگی۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد امریکی، برطانوی اور فرانسیسی منطقے ملا کر 'وفاقی جمہوریہ جرمنی' (Bundes Republic Deutchland) کی تشکیل کی گئی اور روسی علاقہ میں جداگانہ طور پر ڈیموکریٹک ریپبلک (Deutche Domokratische Republik) کی حکومت قائم ہوئی۔ ۱۹۵۵ء میں اتحادی قوتوں نے باضابطہ طور پر جرمنی سے اپنے سیاسی و فوجی دستبرداری کا اعلان کیا جس کے ساتھ ہی آسٹریا اور سوئٹزرلینڈ کو ان کی روایتی سیاسی غیر جانبداری حاصل ہو گئی۔ جرمنی کا سب سے بڑا شہر اور دارالخلافہ برلن اتحادیوں اور روس کے درمیان سیاسی اکھاڑہ ثابت ہوا۔ یہ شہر اطراف سے روسی منطقہ سے گھرا ہونے کے باوجود زبردست جنگی اہمیت رکھتا تھا لہذا دونوں حریفوں میں سے کوئی بھی اپنے حق سے دستبردار نہیں ہوا۔ اس طرح برلن کی تقسیم عمل میں آئی۔ مشرقی برلن روسی علاقہ تسلیم کیا گیا اور مغربی برلن میں امریکہ، برطانیہ اور فرانس تینوں طاقتوں کے لیے فوجی منطقے قائم ہو گئے۔ ابتدا میں برلن کی تقسیم محض خاردار تاروں کے ذریعہ عمل میں آئی لیکن بعد میں سیاسی پیچیدگیوں کے باعث پختہ دیوار تعمیر کر دی گئی۔ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ دیوار دو علاقوں کے درمیان خط فاصل ہے یا خط متارکہ جنگ جبکہ آج بھی اس کے ہر دو طرف موجودہ سیاسی بلاکوں کا زبردست جنگی محاذ قائم ہے۔

جنگ شروع ہوتے ہی ادب میں بھی غیر صحتمندانہ ماحول پیدا ہو گیا۔ جذباتیت کی شدت نے ادب کی اعلیٰ کلاسیکی قدروں کو 'کمتر' اور 'غیر مفید' بنا دیا۔ اس ہیجانی دور کا ادب کس حد تک 'ادبی' کہا جا سکتا ہے اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس میں دشمن سے اندھی نفرت کے مقابلہ میں سچی حب الوطنی کے عناصر کا بھی فقدان ہے۔ ہل یونیورسٹی کے پروفیسر واٹر ہاؤس[1] نے اس جنگی ادبی سرمایہ کی قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے ریاضی کا ایک کلیہ دریافت کیا ہے:

Quality of litrature & its moral justification

ان کا کہنا ہے کہ اس دور کے ادبی اوصاف اپنے اخلاقی محاسبہ سے نسبت رکھتے ہیں۔ یعنی اخلاقی محاسبہ جتنا سخت کیا جائے ادب کی قیمت اتنی ہی کمتر دکھائی دے گی۔ اس معیار پر ادب کے اس دور کو بدترین دور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے صرف یہی نہیں بلکہ دوسری اس عہد کے انتہا پسندانہ نظریات اور خطرناک سیاسی رجحانات نے عام ادب کی ترقی اور اس کے ارتقا کو بھی شدید نقصان پہنچایا۔

جرمن ادب کی تاریخ میں نازی عہد سے زیادہ سنگین اور مستبد دور آج تک نہیں گزرا۔ اس عہد میں زندگی کے دیگر شعبوں مانند ادب پر بھی کڑی پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ ہر اس ادبی تخلیق کو "ناپسندیدہ" قرار دیا گیا جس میں خالص آریائی روح "نہیں

---

1. Prof. Water House

جاتی تھی اور ہر ایسی صنف کو غدار ٹھیرایا گیا جس کا فن اس جوہر سے خالی تھا۔ خوش قسمتی یا بد قسمتی سے اس دور کے لکھنے والوں کی بہتات تھی جن میں سے اکثر یہودی تھے جبکہ یہودی ہونا نازی عہد کا ناقابل معافی جرم تھا۔ چنانچہ تمام یہودی ادیب بالخصوص معتوب کیے گئے۔ ان کے علاوہ وہ تمام ادیب بھی جو غیر یہودی ہونے کے باوجود نیشنل سوشلزم پر یقین نہ رکھتے تھے نازی عتاب کا شکار ہوئے۔ ان میں سے بیشتر کو ملک بدر کر دیا گیا اور وہ ادیب جنہوں نے جرمنی کے حدود میں رہتے ہوئے نازیت کے خلاف آواز اٹھائی زندگی کے بدترین عذاب میں مبتلا کر دیے گئے۔ مئی ۱۹۳۳ء میں نازی حکام نے باضابطہ طور پر ایسی تمام تصانیف نذر آتش کر دیں جو ان کے نزدیک 'قومی مفاد' کے منافی تھیں اور آئندہ کے لیے ایسی تصانیف کو جرم قرار دے دیا۔

نازی آمریت کے نزدیک صرف وہی ادیب پسندیدہ تھے جو "آریائی فخر" کے ترانے لکھیں یا پھر 'خاک و خون' کے ورد پڑھ پڑھ کر قوم کو جنگ کے جہنم میں دھکیل سکیں تاکہ Seig . Heil , Seig . Heil (فتح مرحبا، فتح مرحبا) کے فلک شگاف نعروں کی عملی تکمیل کی جا سکے۔ اس قسم کے ادیبوں کو اس دور میں بھی تصنیف و تالیف کی مکمل آزادی رہی۔ ان خوش نصیبوں میں کولبن ہیر، یوسٹ، بلنک اور گرم وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ البتہ بد نصیبوں کی فہرست کا شمار مشکل ہے جنہیں "خاموش" رہنے سے لے کر موت تک کی سزائیں دی گئیں۔ اس سلسلہ میں مشہور ناول نویس جارج ہرمن[2] کی ہولناک موت عبرت ناک واقعہ ہے جسے ۱۹۴۳ء میں آؤشوٹس کے نازی کیمپ میں محض صیہونیت کے مسئلہ پر اظہار خیال کے جرم میں مع تصانیف زندہ جلا دیا گیا۔ یہاں تمام متاثرہ ادیبوں کا تذکرہ ممکن نہیں صرف افسانوی ادب سے متعلقہ وہ شخصیتیں پیش نظر ہیں جن کا تذکرہ مضمون میں شامل ہے یہ وہ ادیب تھے جنہیں بہر حال جرمنی کے حدود میں رہنے کی اجازت حاصل رہی لیکن ان کو اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔

کازمیر[3]، ارنسٹ ینگر، برگن گرین، ہاؤس من اور الزبتھ لنگسر کو 'خاموش رہنے' کی سزا دی گئی اور تاحکم ثانی تصنیف و تالیف سے روک دیا گیا۔[4] یہی نہیں بلکہ الزبتھ سے جنگ کے دوران فیکٹری میں جبریہ محنت بھی کروائی گئی اور اس کی بڑی لڑکی کو آؤشوٹس کے کیمپ میں بھیج دیا گیا۔ الزے آئشنگر[5] کے بہت سے اعزا پولینڈ کے جنگی کیمپوں میں قتل کر دیے گئے۔ اسی طرح وولف گانگ بورشرٹ[6] کو ہٹلر کی حکومت کے خلاف باغیانہ خیالات رکھنے کے جرم میں دو مرتبہ قید کی سزا بھگتنی پڑی۔ تیسری مرتبہ اسی جرم کے ارتکاب میں اس کو موت کی سزا بھی سنا دی گئی جو بعد میں جبراً روسی محاذ پر بھیجے جانے کی صورت میں تبدیل کر دی گئی۔

جبری ترک وطن کی سزا پانے والے ادیبوں میں سے کچھ نے پہلے قریب و جوار کے یورپی ممالک مثلاً آسٹریا، سوئٹزرلینڈ، اٹلی،

---

1. Kolbenheyer
   Jost
   Blunk
   Grimm
2. George Hermann
3. Kasimir
   Ernest Junger
   Bergengruen
   Hausmann
   Elisabeth Langgaser
4. Schreib Verbot
5. Ilse Aichinger
6. Wolfgang Borchert

یا فرانس میں پناہ ڈھونڈھی لیکن نازی تسلط کے بعد یہ لوگ براعظم چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور ان میں تھومس من[1]، برٹولٹ بریشٹ، اسٹیفن سوائیگ، آرنولڈ سوائیگ، اسٹیفن انڈرس، فرانس ورفل، جورج کائزر، کارل سوکمائر اور ارنسٹ گلیسر جیسے ادیبوں کے نام شامل ہیں۔ ان ادیبوں نے جلاوطنی کے زمانہ میں جو کچھ لکھا وہ تاریخ میں "پناہ گزین ادب" (Emigrantenliteratur) کہلاتا ہے۔ پناہ گزین ادب میں اس دور کے ہنگامی اثرات کے ساتھ ان ممالک کا مقامی رنگ بھی شامل ہو گیا اس کے علاوہ ایک طویل عرصہ تک ملکی اور پناہ گزین ادیبوں کے درمیان کوئی مادی رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے اس میں ملکی ماحول سے ہم آہنگی باقی نہ رہ سکی۔ جنگ کے بعد جب ان پناہ گزینوں کو جرمنی واپس آنے کا موقع ملا تو انھیں خود بھی مقامی ماحول بالکل اجنبی محسوس ہونے لگا جس کا اثر ان کی تخلیقات پر بھی نمایاں نظر آتا ہے۔

اس پس منظر سے اس پُرہول فضا کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے جو جرمن ادب پر سراسیمگی، دہشت اور بے یقینی کا باعث بنی۔ جنگ کے بعد بلکہ آج بھی جرمن تخلیقات پر جنگ کا یہی دہشت ناک کابوس مسلط نظر آتا ہے۔ موجودہ دور کے تقریباً تمام بڑے لکھنے والے اسی پُرآشوب عہد کی صدائے بازگشت ہیں۔ مولر فان دین برک[2] نے اپنی کتاب (Das Dritte Reich) میں اس جابر عہد کو "تیسری حکومت" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ وہ قرونِ وسطیٰ کے جرمنی کو "پہلی حکومت" اور بسمارک کے جرمنی کو "دوسری حکومت" کہنے کے بعد نیشنل سوشلزم کی عملداری کو "تیسری حکومت" کہتا ہے۔ آج جرمن زبان میں ہٹلر کے جرمنی کے لیے یہی لفظ "تیسری حکومت" طنزیہ طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ہمارے مضمون کا یہ حصہ بڑی حد تک "تیسری حکومت" ہی سے متعلق ہے۔

یہ افسانوی دور جنگ سے پیشتر کے عہد سے شروع ہو کر موجودہ عہد تک پھیلا ہوا ہے جس میں بے شمار ادبی شخصیتیں شامل ہیں ان تمام کا تذکرہ مضمون کو کتاب بنا دینے کے مترادف ہو گا لہٰذا صرف ان شخصیتوں اور ان کی تخلیقات کے مختصر بیان پر اکتفا کی گئی ہے جو کسی نہ کسی اعتبار سے افسانوی عہد کی ممتاز شخصیتیں ہیں اور جدید جرمن افسانہ کی تشکیل میں ان کے تجربات کا نمایاں حصہ ہے۔ ان لوگوں کا محض افسانہ نگار ہونا چنداں ضروری نہیں جب کہ بہت سے ادیبوں کے ساتھ یہی معاملہ درپیش ہے۔ یہ لوگ بحیثیت خاص شاعر، ناول نویس یا ڈرامہ نگار ادب میں جانے جاتے ہیں لیکن ان کی افسانوی تخلیقات (خواہ وہ کتنی ہی محدود کیوں نہ ہوں) جرمن افسانہ کی تاریخ میں غیر معمولی اضافہ ہیں۔

یہاں جرمن سے مراد صرف جرمنی ہی کے اہلِ قلم نہیں بلکہ اس کا دائرہ ان تمام ممالک تک وسیع ہے جہاں جرمن ادبی زبان کی حیثیت سے استعمال کی جاتی ہے ان میں وسطی اور مشرقی یورپ کے بہت سے ملکوں کے نام آتے ہیں جہاں اور زبانوں کے

---

1. Thomas Mann
Bertolt Brecht,
Stefan Zweig
Arnold Zweig
Stefan Andres
Franz Werfel
George Kaiser
Karl Zuckrneyer
Ernst Glaser

2. Moller van den Bruck

ادبی زبان کی حیثیت سے جرمن ہی مستعمل ہے۔ اس سلسلہ کی سب سے بڑی مثال کافکا ہے جس نے چیک (Czech) ہونے کے باوجود تمام تصانیف جرمن میں چھوڑی ہیں یا آرتھر کوسٹلر جو ہنگری کا متوطن ہے لیکن ہمیشہ جرمن ہی میں لکھتا ہے۔ سوئزرلینڈ اور آسٹریا کے ادیب تو جرمن کو اور بھی مکمل حیثیت ہی سے استعمال کرتے ہیں کیونکہ یہ ان کی قومی زبان بھی ہے۔

جیسا کہ اب تک بیان کیا جا چکا ہے جنگ سے قبل کے جرمن ادب پر اظہاریت ہی کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ نیشنل ازم کے رجحان نے اس تحریک کے ماننے والوں میں قومی احساسات کو شدید تر بنا دیا چنانچہ برٹولٹ بریشٹ کے یہاں یہی اجتماعی احساس انقلابی شعور کے ساتھ ظاہر ہوا۔ وائمار جمہوریہ کے آغاز ہی میں اس نے بحیثیت ڈرامہ نگار بڑے جرأت مندانہ تجربات کیے۔ اس کے یہاں پسماندگی کا احساس غالب تھا جس کی وجہ سے لہجہ میں تلخی اور جا بجا طنز کے پہلو سے نفرت کا اظہار ملتا ہے۔ "کلینڈر کی کہانیاں" میں اگرچہ اس کا اسلوب بہت سادہ ہے لیکن اس سادگی میں بھی انقلابی رجحان کی جھلک ملتی ہے۔ اس کا یہی فکری انداز آگے چل کر اشتراکی مسلک سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ بریشٹ کی تخلیق "بڑھی عورت" موجودہ جرمن افسانہ کی ایک نمائندہ مثال کہی جا سکتی ہے۔

ہرمن ہیسے سوئزرلینڈ کا باشندہ ہے لیکن اس کا انداز خالص جرمن نمونہ کا ہے۔ افسانہ کے علاوہ اس کو ناول نگار اور شاعر کی حیثیت سے بھی جانا جاتا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں ادب کا نوبل پرائز حاصل کرنے کے بعد اس کی شہرت بین الاقوامی حلقوں تک پہونچ چکی ہے۔ ہیسے کا اسلوب معنویت سے بھرپور رہنے کے ساتھ ہی بڑا پُراسرار اور اجنبی محسوس ہوتا ہے۔ اس کے یہاں وقت کا کوئی خاص تعین نہیں۔ وہ جبریت کا قائل ہے اور زندگی کے ناقابل حل مسائل کو انسان کا مقدر جانتا ہے۔ اپنے فن کے بارے میں اس نے ایک جگہ خود بھی کہا ہے

"میں جانتا ہوں، میں کوئی ادیب نہیں۔ ہم آج کے لکھنے والے آرٹ کو آلے کے لیے استعمال کر رہے ہیں جس کی سرے سے کوئی ہستی نہیں۔"

ہیسے مسیحیت کے ایک قدیم مسلک پیٹ ازم (Pietism) کا پیرو ہے جس کی وجہ سے اس کی شخصیت میں روحانیت کا عنصر نمایاں رہتا ہے۔ اسی فرقہ کی ایک خاتون کیتنبرگ اٹھارویں صدی میں گوئٹے کے خیالات پر بھی اثر انداز ہوئی تھی۔ مسیحی مبلغ کی حیثیت سے اس کو جوانی میں ہندوستان جانے کا بھی اتفاق ہوا جہاں سے اس نے قدیم ہندو ویدانت اور بدھ فلسفہ کا گہرا اثر قبول کیا جسے اس کی تخلیق "سدھارتا" میں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کی بیشتر تخلیقات میں مشرق و مغرب پہلو بہ پہلو ہی نظر آتے ہیں۔ ابتدائی افسانوی مجموعہ "اس طرف" کا انداز [illegible] قنوطی ہے لیکن بعد کی تخلیقات میں اس کی متنوع شخصیت کے تمام عناصر پائے جاتے ہیں۔ اس انداز میں وہ بہت کچھ قدیم جرمن انشاپرداز واسرمن سے ہم آہنگ ہے۔

---

1. Aurther Koestler
2. Bertdt Berecht
3. Weimar Republik
4. 'Kallendergeschichten'
5. 'Die Unwurdige Greisen'
6. Hermann Hesse
7. Frau Kotenberg
8. 'Sidharta'
9. 'Diesseits'
10. Wassermann

جنگ کے بعد کی ناساز گار فضا میں لکھنے والوں میں ایمل[1] اشتراؤس، ویلیم شیفر، ویشرت، فرانس ویرفل، جورج ہیم، اور گوٹ فریڈ بینے کے ادیب بھی جانتے ہیں۔ ان کے یہاں فطری حقیقت نگاری میں سماجی شعور بھی نمایاں ہے۔

ایمل اشتراؤس جنوب مغربی خطے سے تعلق رکھتا ہے۔ ادب میں اس کا سرمایہ اپنے ہمعصروں کے مقابلہ میں بہت کم ہے لیکن اس نے بدلتی ہوئی قدروں کو نئے زاویوں سے سمجھانے کی کوشش کی ہے اس کے مقابلہ میں شیفر کا ادبی سرمایہ بہت زیادہ ہے۔ اسلوب میں وہ اگرچہ قدیم اساتذۂ فن کلائسٹ، کیلر اور ہیبل کا تتبع کرتا ہے لیکن اس کا طرزِ اظہار اُن سے بالکل مختلف ہے۔ "قصے"[2] "گلوبند کی کہانی"[3] اور "ہولڈرلن کی اقامت گاہ"[4] اس کے جدید اور ترقی یافتہ فن کی عمدہ مثالیں ہیں جن میں خارجیت نمایاں ہے۔ ویشرت کے یہاں حقائق کا تلخ اظہار ہے۔ وہ انسانیت کا ہمدرد اور اس کی فلاح کا خواہاں ہے چنانچہ آمرانہ عناصر کے خلاف اس کا لہجہ ہمیشہ سخت رہا ہے۔ قیصری حکومت کی علمداری اس کے نزدیک قوتِ کے عدم توازن کی بدترین مثال ہے۔ ویشرت کا مجموعہ "سفید بیل"[5] شروع سے آخر تک سیاسی شعور کا آئینہ دار ہے۔

ویرفل کے فن میں سچائی اور حقیقت نمایاں ہے۔ غنائی شاعر ہونے کی حیثیت سے نثر میں بھی اس کا لہجہ بہت شیریں اور دل آویز معلوم ہوتا ہے۔ جذبات کی صحیح صحیح ترجمانی کے علاوہ شعوری مسائل کی بھی بہتات نظر آتی ہے۔ نازیت کا ہدف بننے کے بعد وہ ترکِ وطن پر مجبور ہوا۔ چنانچہ پناہ گزیں ادب میں بھی ویرفل کا بڑا حصہ ہے۔

اس عہد کے چند نامور شعرا مثلاً جورج ہیم، ارنسٹ[6] اشٹڈلر اور ٹراکل وغیرہ نے بھی خال خال مختصر نثری تجربے کیے ہیں جو فنی اعتبار سے اتنے اہم نہیں جتنا اُن کا کلام وقیع سمجھا جاتا ہے۔ ہیم اظہاریت پسند شاعر ہے نثر میں بھی اُس کا انداز معتبرانہ خوبیاں رکھتا ہے بین مشاہدے کی گہرائی بعض اوقات الہام تک پہنچ جاتی ہے۔ گوٹ فریڈ بین ہمعصروں میں سب سے الگ ہے بلکہ منکریت (Nihilism) کے دور میں کسی قدر چونکا دینے والی آواز ہے اس کے یہاں ذہن اور آرٹ دونوں میں نظم و ضبط پایا جاتا ہے اس کی شخصیت میں کسی حد تک رواقی فلسفہ کا پرتو بھی ہے، ایک زمانہ تک اس نے نازیت کی طرفداری بھی کی لیکن اس کی تحریروں میں پروپگنڈائی رنگ نہیں آسکا البتہ فکر کی گہرائی اور فن کی سطح کم ہو گئی۔

رابرٹ[7] والزر کو سوئز (.....) ہونے پر بھی جرمنی کے چوٹی کے لکھنے والوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ناول نویس ہونے کے ساتھ ساتھ اس نے بہت سی مختصر نیز طویل کہانیاں لکھی ہیں جو اسلوب کی جدت کے ساتھ زبان میں والزر کی مہارت کا نمونہ ہیں۔ زبان میں وہ ہمیشہ اپنی مخصوص جدتوں سے کام لیتا ہے جو مترجمین کے لیے دشواریوں کا سبب بنتی ہیں۔

---

1. Emil Strauss
   Wilhelm Shafer
   Wiechert
   Franz Werfel
   George Heym
   Gottfried Benn
2. 'Anakdoten'
3. 'Halsbandgeschichte
4. 'Holderlins Einkehr
5. Der Weisse Buffel
6. Ernst Stadler
   George Trakl
7. Robert Walser

اشٹیفن سوائیگ[1] اشرافیہ کے اس طبقے سے تعلق رکھتا ہے جو جدید روایت کے بجائے پرانی اقدار کا احاطہ کرتا ہے۔ اس کی تحریریں پیچیدہ سماجی و نفسیاتی حقائق سے علم و آگاہی دیتی ہیں۔ ایک ماہر فطرت شناس فنکار ہونے کی حیثیت سے اس نے قنوطیت پسندی کے دور کا بغور مشاہدہ کیا تھا اور وہ اس کے انہدام سے بھی واقف تھا۔ حالات کا اس نے پیش از وقت ادراک کر لیا تھا۔ ہر طرح کے احساس نے اس کے نفسیاتی سیاست کے منظر کو نمایاں کر دیا ہے۔ یہی سیاست اس کی موت کا بھی باعث ہوئی۔ جرمنی کی شکست کے بعد سوائیگ نے برازیل میں خودکشی کر لی۔ موجودہ نسل کے لکھنے والوں میں اس کی تخلیقات کو قدر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

جنگ کی ہولناک تباہ کاریوں نے ایک مرتبہ پھر جرمن قوم پر جنگ کے بُرے اثرات کو واضح کر دیا اور یوں جنگ دنیا والوں کے لئے فریب کا نشانہ بنی۔ کو ہلا دینے والی دہشت ناک آسیب کی طرح ذہنوں پر چھا گئی جس کے سائے میں خود اپنے "جنگ"، "بیاباں"، "ہنگامہ"، "قتل و غارت گری"، "آہ و بکا"، "آہ و فریاد" سب کچھ دکھائی دینے لگا۔ دوسری جانب انفرادیت نے نثر کا انداز بھی بدل ڈالا اور ادب ہیئت کے ساتھ اسلوب پر بھی خصوصی توجہ دی جانے لگی۔ اس کی نمائندگی کامیاب اور ترقی یافتہ صورت ایڈشمڈ کازمیر[2] کے یہاں ملتی ہے۔ اس کا انداز تمثیلی اور حقیقت آفریں ہے جس میں ذاتی مشاہدات نے اعتماد کی فضا پیدا کی ہے۔ جبکہ معاصر حالات کے نفسیاتی تقاضوں سے وہ پہلے سے بھی باخبر نظر آتا ہے۔

ارنسٹ گلیزر[3] سیاسی خلفشار سے بے حد متاثر ہے۔ وہ ملک کی تمدن کی غارت گری کا حوالہ کرتا ہے اس کے برعکس ہرمن کیسٹن[4] کے یہاں اعتماد کی کمی محسوس نہیں آتی۔ وہ زندگی کے مصائب و مسائل سے واقف ہو چکا ہے اور ہر شے کو بدلتے ہوئے عالم میں دیکھتا ہے۔ ایک ساتھ انا سیگرز[5] فضا آفرینی کا ملکہ رکھتی ہے جس کے یہاں شدت جذبات کے باوجود زندگی کا اثر غالب ہے۔ غیر جانبدارانہ حالات کے مطالعے نے اس کے فن کو بھی شدت سے متاثر کیا ہے۔ بالکل یہی حال ولی بریڈل[6] کے یہاں بھی ہے اس کا افسانوی سرمایہ کافی ہے جس کا بیشتر حصہ غیر جانبدار حکومت سے متعلق ہے۔

کارل زوکمائر[7] کا انداز کس قدر شگفتہ ہے وہ اس حرکت فزیں دور میں بھی زندگی کے خوش آئند پہلو کو نظر انداز نہیں کرتا۔ طنز کے لطیف حربے سے اس نے جابجا زندگی کی لغزشوں اور کوتاہیوں کا احساس دلایا ہے۔ ابتدا میں وہ محض ڈرامہ نگار کی حیثیت سے جانا جاتا تھا لیکن بعد کی مختصر کہانیوں نے اسے مختصر افسانہ کی فہرست میں شامل کر دیا۔

اس دور کی ایک منفرد آواز الفریڈ پولگار[8] کا ہے جس کے یہاں حالات کا تیکھا، واضح، مربوط اور حقیقت پسندانہ تجزیہ ملتا ہے۔ اس کی تخلیقات بلاشبہ اپنے وقت کی انسائیکلوپیڈیا ہیں جن کو دیکھ کر اس عہد کے مسائل کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کو زبان پر بھی حیرت انگیز قدرت حاصل ہے جس سے انداز میں شوخی، جدت، طنز اور مستعملات کی خوبیاں پیدا کرتا ہے۔ ابتدائی کہانیوں میں کی اور کل میں گرا

---

1. Stefan Zweig
2. Edschmid Kasimir
3. Ernst Glaser — 'Gestern u. Heute'
4. Hermann Kesten — 'Ich bin Zeuge'
5. Anna Segher — 'Schwarz auf weiss'.
6. Willi Bredel
7. Karl Zuckmayer
8. Alfred Polgar

"سفید سیاہ" اور "جھپکتے لمحوں میں" "دوسری طرف"[1] اور "دھندلکے میں ملاقات" مختصر نثر کے بہترین مجموعے ہیں۔ جوزف ہوفملر[2] نے زوال تخلیقات کو آنے والے دور سے کلاسیک سے تعبیر کیا ہے۔

آسٹریا کے کیتھولک حلقہ سے مادیت کی خلاف بارہا آواز اٹھائی گئی ہے جن میں ایک آواز میل ماکس[3] کی بھی ہے۔ وہ روحانی قدروں کا علمبردار ہے اور شعور کی تمام کاوشوں کو مذہب کے تابع کر دینا چاہتا ہے اسی سے ملتا جلتا رنگ آرنلڈ سوائیگ[4] کا ہے جو انسانیت کی ترقی کے لیے مکمل ہمدردی کا احساس پیدا کرنا ———— ضروری سمجھتا ہے۔

ہنگری سے آرتھر کوسلر[5] کی شخصیت غیر معمولی صلاحیتوں کی مظہر ہے اس کی بیشتر تخلیقات میں سیاسی عنصر غالب ہے۔ اسپین کی خانہ جنگی سے لے کر جنگ عظیم تک کے بین الاقوامی بحران نے کوسلر کو سیاسی بصیرت دی ہے گزشتہ سالوں میں خود ہنگری کے انقلاب سے اس کی تحریریں نمایاں طور پر متاثر معلوم ہوتی ہیں۔ ایسے ہی تجربات کا دانشورانہ اظہار فان ڈر ویرنگ[6] کے یہاں ملتا ہے البتہ اس کے یہاں فرانسیسی انداز کی تعقید موجودہ جرمن روایت کے برعکس نظر آتی ہے۔

ارنسٹ ینگر[7] اس دور کی اہم ترین شخصیتوں میں شامل ہے۔ اس کی شخصیت ادب کے مختلف شعبوں پر حاوی ہے۔ اس عہد کی سیاسی و نفسیاتی الجھنوں کو اس نے اپنا موضوع قرار دیا ہے۔ کہیں کہیں ماحول کا عمیق مشاہدہ اس کو قنوطی بھی بنا دیتا ہے اور یکایک منکوریت کی صدائے بازگشت سنائی دینے لگتی ہے۔ برتری کا احساس اس کے یہاں بھی ہے لیکن فسطائی فلسفہ کے ساتھ نہیں۔ ینگر کی تخلیقات پر مادیت کا اثر بھی نمایاں ہے خصوصاً جدید اشاریت میں اس کو حیرت انگیز قدرت حاصل ہے۔

جنگ سے کچھ سال پیشتر یا اس کے دوران ادب پر سیاست جس انداز سے اثر انداز ہوئی اس کے نتیجہ میں انتہا پسند گروہ نے ادب کو بھی سیاسی تحریک بنا دیا ان لوگوں نے اپنا مقصد کو حاصل کرنے کے لیے نیشنل سوشلزم کو مختلف صورتوں کے ساتھ ذہنوں پر مسلط کرنے کی جد و جہد کی اور بڑا مکار طریقہ سے قومی جذبات کو مشتعل کیا۔ کولبن ہیئر، بلنک، گرم، سلش وغیرہ اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔[8] ان کے نظریات کا محرک خود جرمنی کا اپنا ماضی تھا جس کی تاریخ میں پسماندگی اور بیچارگی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کے علاوہ ان لوگوں نے ان خطرات کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا جو مستقبل میں اس قوم کا مقدر بننے والے تھے چنانچہ فسطائی فلسفہ کے بموجب اپنے آئیڈیل کو حاصل کرنے کی ہر طرح کی کوشش کرنا، خواہ اس کا انجام ہلاکت ہی کیوں نہ ہو، ان کے ذہنوں پر بھی مسلط تھا۔ اس انتہا درجہ کی جذباتیت نے ادب کو خالص پروپیگنڈا بنا دیا۔ بلنک کا مجموعہ "کہر میں آگ"[9] اسی رنگ کی ایک عمدہ مثال ہے۔

---

1. 'Anderseits'
   'Begegnung im Zwie licht.
2. Joseph Hofmiller
3. Mell Max
4. Arnold Zweig
5. Aurther Koestler
6. Von der Viring
7. Ernst Junger
8. Kolbenheyer
   Blunck
   Grimm
   Zellich
9. 'Feuer im Nebel.'

زندگی کے حقائق کو فنکارانہ بصیرت سے پرکھنے کا انداز گزشتہ کے عہد سے جرمن ادب میں رائج ہے۔ ہنس کاروسا[1] کے یہاں یہی بصیرت الہامی انداز میں پائی جاتی ہے۔ وہ بظاہر تمدن کی پرانی قدروں کا پابند ہے لیکن حقائق کو ہمیشہ نئے زاویوں سے پیش کرتا ہے حقیقت اور اشاریت کے پردے میں کہنا اس کی سب سے بڑی فنکاری ہے جس میں جابجا فلسفہ کا تتبع ملتا ہے۔ اس کے برعکس ہرمن کلاڈیس[2] کے یہاں فلسفیانہ مباحث کی کوئی اہمیت نہیں وہ روزمرہ کے مسائل ہی کو اپنا موضوع قرار دیتا ہے۔ ہنس فرانک[3] کی تخلیقات زبان و بیان کی خوبیوں سے مزین ہیں وہ خیالات کی ترجمانی کے لیے ہمیشہ دلچسپ پیرایہ ڈھونڈتا ہے۔ من فریڈ ہاؤس من[4] کا انداز ایک بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح قاری کو مختلف دنیاؤں کی سیر کراتا ہے۔ بنیادی حیثیت سے وہ روایت پسند ہے اور قدیم المانی زندگی کو دلکش انداز سے پیش کرتا ہے۔

ولیم لے من[5] کے یہاں بعض بڑی عام واقعات کی ترجمانی ہے اسی طرح زیریں جرمنی کے مقبول افسانہ نگار ارنسٹ پیٹر[6] کے یہاں بھی مسائل کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ کارل ہنس اشترول[7] نے جدید مختصر افسانہ کی ترقی یافتہ ٹیکنیک استعمال کی ہے جس میں مشاہدے کی شدت کے ساتھ تخیل کی سطح بھی بلند ہے۔ بشوف فریڈرش[8] نے زندگی کے اہم مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ وہ قدیم روایت کا منکر ہے اور اس کو ذہنی ناآسودگی کا سبب بتاتا ہے۔ اس کا موضوع جدید روایت ہے جس میں اس کے خیال کے مطابق تخیل حقیقت سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

آسٹریا سے قنوطی انداز کی ایک آواز ہنرخ واگرل[9] ہے جس کے اسلوب پر دوستوفسکی کا فنی اثر اندازہ ہوتا ہے۔ اس اضطرابی دور میں اینا زیڈل[10] کا تشفی آمیز لہجہ واقعی تشفی کا موجب ہوتا ہے۔ فن کی انتہائی پختگی کے ساتھ وہ زندگی کے شدائد پر ایک مادرانہ شفقت کے ساتھ تسلی دیتی ہے۔ سب کچھ ہو جانے کے باوجود اس کو یقین ہے کہ بھٹکی ہوئی روحیں سکون پا جائیں گی اور اس دن دنیا کے سارے دکھ درد مٹ جائیں گے۔ خود اسی کے الفاظ میں۔

"ایک دن ایسا ضرور آنے والا ہے جب ماؤں کے آنسو اتنی مقدار میں جمع ہو جائیں گے کہ جنگ کا غضب ناک شعلہ خود بخود بجھ جائے گا۔"

تسلی کا ایک بڑا ذریعہ مذہب بھی ہے چنانچہ لیفورٹ[11] کے یہاں خالص روحانی فضا ہے جس میں روایتی اور دیومالائی حکایتیں بھی کیتھولک تصوف میں ڈوبی نظر آتی ہیں۔ اسی طرح اشٹیفن انڈرس[12] کی تخلیقات میں خود اس کی کلیسا کی تربیت کا رنگ نمایاں ہے۔ اسپین کی خانہ جنگی اور گزشتہ جنگ عظیم کے تجربات نے اس کے فن کو بھی شدت سے متاثر کیا ہے۔ اس کی تخلیقات میں جوش و ولولہ کا بھی عنصر غالب ہے۔ زبان کی صحت اور تخیل کی جدت کے لحاظ سے اس کو آج کے جرمن افسانہ نگاروں میں ممتاز حیثیت حاصل ہے۔

---

1. Hans Carossa
2. Hermann Cladius
3. Hans Frank
4. Manfried Hausmann
5. Wilhelm Lehmenn
6. Ernst Peter
7. Karl Hans Strobl
8. Bischoff Friedrich
9. Heinrich Waggrel
10. Ina Siedel
11. Gertude von Lefort
12. Stefan Anders

سنجیدہ مزاج کے مضمون کو ارنسٹ[1] پینزولڈ نے بڑی عمدگی سے نبھایا ہے اس کا انداز بہت کچھ ہرمن ہیسے سے ملتا جلتا ہے طنز کے ساتھ نفاست اور حسنِ بیان کی خوبیاں برٹنگ جورج[2] کے یہاں ملتی ہیں وہ حقیقت پسند تحریک کا نمائندہ ہے اور عام انسانی کمزوریوں پر کڑی تنقید کرتا ہے۔ مقصدیت سے بھرپور تجربات ولف گانگ ملر[3] نے کیے ہیں۔ البرشٹ[4] گوز کی تحریریں تلخ حقائق سے پُر نظر آتی ہیں۔ وہ تیسری حکومت کی بداعمالیوں پر سفاکانہ انداز میں تبصرہ کرتا ہے اس کے ساتھ ہی آنے والے دور سے پُرامید بھی ہے لیکن والٹر جینس[5] اور ہرمن لینس[6] نے ساری خطاؤں کا سزاوار دُوسروں ہی کو گردانا ہے۔ اس دور میں اُن کی یہ قنوطیت بڑی حد تک سیاسی حالات کا تقاضا کہی جا سکتی ہے۔ والٹر کے یہاں سراسیمگی کا احساس بھی غالب ہے لیکن لینس کی تحریروں میں تلخی کے ساتھ ندامت بھی محسوس ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک ہنگاموں سے زیادہ اہم ان کے اندر پوشیدہ عوامل ہیں جن کو وہ بڑی سنجیدگی سے پرکھتا ہے اس لحاظ سے اس کا اسلوب اوروں سے کچھ مختلف ہے۔

روڈولف[7] بورشارڈ کو ایک عرصہ تک ڈرامہ نویس اور مضمون نگار کی حیثیت سے ہی جانا جاتا تھا لیکن بعد کے افسانوی مجموعہ نے اس کو صفِ اوّل کے افسانہ نگاروں میں شامل کر دیا۔ زندگی کے تمام اور جانے بوجھے مسائل پر قلم اٹھاتے ہوئے وہ زبان کے اعجاز سے عجیب و غریب تاثرات پیدا کرتا ہے۔

پچھلی نصف صدی سے جرمن ادب میں برگنگرین[8] کی کثیر اور مختلف النوع تصانیف کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس نے جرمن افسانہ کو بھی نئی تکنیک سے روشناس کیا ہے اس کا محتقبۂ فکر بہت وسیع نظر آتا ہے جس میں نفسیات و رومانیت کے مضامین خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ کیتھولک عقیدہ کی پابندی سے وہ عام انسانی قدروں کو سب پر ترجیح دیتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کو نازی عملداری میں تصنیف و تالیف کے حق سے محروم کر دیا گیا۔ برگنگرین کے ابتدائی مجموعہ "ریوال میں موت[9]" کا رنگ عموماً جذباتی ہے لیکن بعد کے مجموعے "آخری شہسوار[10]" اور "آخری شہسوارہ[11]" اس کے فن کی بہترین مثالیں ہیں۔ مختلف حلقوں کی مخالفت کے باوجود اس کو آج کے صفِ اوّل کے ادیبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

جنگ کے بعد جرمن افسانہ کو نئی تکنیک سے پیش کرنے میں پرانے فن کاروں کے ساتھ نئی نسل نے بھی سرگرمی سے حصہ لیا ہے جس کی وجہ سے پچھلے پندرہ برس میں جرمن افسانہ نے حیرت انگیز ترقی کی۔ اور آج وہ ہر اعتبار سے بین الاقوامی سطح پر نظر آتا ہے۔ اس دور کو جرمن افسانے کی نشاۃ ثانیہ بھی کہا جاتا ہے۔ ویڈسن[12] کا خیال ہے کہ صحیح معنوں میں "خالص جرمن افسانہ" کا دور یہی زمانہ ہے۔ اس دور کے بیشتر فنکاروں کی تخلیقات جرمن رواج کے مطابق ریڈیو کے ذریعہ سامعین تک پہونچیں اور بعد میں

---

1. Ernst Penzoldt
2. Britting George
3. Wolfgang Muller
4. Abrecht Goes
5. Walter Jens
6. Hermann Lenz
7. Rudolf Borchardt
8. Bergengruen
9. 'Der Tod von Reval
10. 'Der letzte Rittmeister'
11. 'Die letzte Rittmeisterin
12. Prof. W. Waidson

مستقل تصانیف کی صورت میں آئیں۔

گرڈ گائزر[1] کا نام جنگ کے بعد کی فضا کی عکاسی کے لیے مشہور ہے۔ اس نے جنگ سے واپس ہونے والے فوجیوں کی زندگی پر فنکارانہ انداز میں قلم اٹھایا ہے جس کی تہ میں ایک عظیم ہنگامہ پوشیدہ نظر آتا ہے۔ ہائنس ہوبر[2] کا انداز بڑی حد تک روایتی اسلوب والا کہا جا سکتا ہے۔ افسانے کے مقابلہ میں رپورتاژ میں زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔

ہنس ایرش نوساک[3] بنیادی طور پر ڈرامہ نگار ہے۔ افسانوی ادب میں اس کا سرمایہ جنگ کے بعد کا ہے۔ وہ آج کے عام انسان کے روزمرہ مسائل پر گہری بصیرت رکھتا ہے۔ روایت سے متعلق نہ ہونے کے باوجود اس کی باریک بینی اور مخصوص اشاریت کہیں کہیں بڑا انداز اختیار کر لیتی ہے۔ "نیکیا"[4] "موت سے انٹرویو"[5] اور خاص [illegible] اس کی دانشورانہ بصیرت کی عمدہ مثالیں ہیں۔

ہلڈے شائمر[6] کی تحریریں دیکھ کر اس ہولناک دور کی یاد تازہ ہوتی ہے جب جرمنی خاک و خون اور کھنڈرات کا ملک بن گیا تھا۔ جنگ کا خوفناک آسیب اس کی تخلیقات پر بھی چھایا نظر آتا ہے۔ اسی ہنگامے نے اس کو وطن سے دور کر دیا۔ جنگ کے بعد اس کو نورمبرگ کی عدالت میں بھی پیش ہونا پڑا جہاں اس نے نازی جنگی مجرموں کے مترجم کے فرائض انجام دیے۔ اس کی تحریروں میں انہی حادثات کا اثر غالب ہے۔

الزبیتھ لنگیسر[7] جنگ سے قبل غنائی شاعرہ اور ناول نویس کی شہرت رکھتی تھی۔ نازی عہد کی "جبری خاموشی" کے بعد ۱۹۴۶ء سے اس نے دوبارہ لکھنا شروع کیا۔ اس مرتبہ اس کی توجہ کا مرکز خصوصیت کے ساتھ مختصر افسانہ رہا۔ چنانچہ اٹھارہ کہانیوں کے مجموعہ "تورزو"[8] سے اس کو افسانہ نگاروں میں بھی صف اول کی فنکارہ تسلیم کر لیا گیا۔ یہ تمام کہانیاں جنگ کے دوران یا اس کے فوراً بعد کی لکھی ہوئی ہیں۔ الزبیتھ کی تصانیف بڑی پُرمعنی اور اشاراتی انداز کی ہوتی ہیں جن میں جا بجا خود کلامی کی تکنیک استعمال کی جاتی ہے۔ اس کے یہاں خارجی عمل کے مقابلہ میں نفسیاتی تحلیل پر زور ہوتا ہے۔ وہ جرمنی کے متوسط طبقہ کی بہترین ترجمانی کرتی ہے۔ اس کے فن پر بھی جنگ اور [illegible] پر نازی آمریت کے اثرات نمایاں ہیں۔

ہرمن کاسک[9] حقیقت کو تخیل سے ماورا جانتا ہے۔ زندگی کے عملی و نظری پہلوؤں پر اس کی گرفت بہت مضبوط ہے وہ ارادے کی استقامت کا قائل ہے۔ تمثیلی افسانوں[10] کے تند و تیز لہجہ میں اس نے اس اندھی تقلید کے خلاف اعلانیہ بغاوت کی جو قومی شعور کو ہلاک کر رہی تھی۔ وہ تمدن کی میکانی ساخت سے بیزار ہے اور تباہ شہروں کے ملبے پر کھڑا ہو کر خواب کی پناہ گاہیں تلاش کرتا ہے۔ اس رمزیت میں جا بجا کافکا کا اثر و نفوذ سرایت کیے نظر آتا ہے۔ اس کا فن حال کی ساری ناامیدیوں اور مایوسیوں کا آئینہ دار ہونے کے باوجود ایک خوش آئند مستقبل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

---

1. Gerd Gaiser
2. Heinz Hober
3. Hans Erich Nossack
4. 'Nekyia'
5. 'Interview mit dem Tode
6. Wolfgang Hildesheimer
7. Elisabeth Langgässer
8. 'Der Torso'
9. Hermann Kasack
10. 'Der Webstuhl'

کرٹ کوزنبرگ[1] اپنے رنگ کا واحد لکھنے والا ہے جس نے معقولات کی ساری حد بندیاں توڑ کر لمحات و توہم کی فوقیت کو منوانے کی کوشش کی ہے۔ وہ زندگی کی یکسانیت اور بے کیفی سے اُکتا کر تخیل و مبالغہ کی دُنیا میں جا بستا ہے۔ معقولیت کے خود ساختہ اور مصنوعی ضابطوں پر اس نے تمسخر کے حربے استعمال کیے ہیں ان عجیب و غریب انداز میں کہیں کہیں ہوف فن کے روایتی انداز کا بھی پرتو نظر آنے لگتا ہے۔ آج کے جرمن افسانہ نگاروں میں کوزنبرگ صفِ اوّل کا فنکار شمار ہوتا ہے۔ اب تک اس کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں "نیلا خواب[2]" "سورج مکھی کے پھول[3]" "زندگی کی شراب[4]" اور "لا بوتیلا[5]" خاصی شہرت رکھتے ہیں۔

ہائنس ریسے[6] کے یہاں اخلاقی و مابعد الطبیعاتی اقدار کا پورا پورا احترام ہے۔ وہ فرد اور جماعت کے باہمی رشتہ پر فلسفیانہ مباحث سے گریز کرتا ہے لیکن فرد کو معاشرے میں اس کے صحیح مقام پر دیکھنا چاہتا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے وہ معاشرے کی مروجہ قدروں سے مکمل بغاوت نہیں کرتا لیکن اس کے کمزور پہلوؤں پر طنز کے بھرپور حملے کرتا ہے۔ "بے راہ رو[7]" "جینوا میں سانپ[8]" اور "خود اپنا انعام[9]" اپنے طنزیہ انداز، سادگی اور واقعیت کی بنا پر جدید جرمن افسانوں کے عمدہ مجموعے خیال کیے جاتے ہیں۔

ہائنرش بول[10] موجودہ جرمن افسانہ نگاروں میں چوٹی کا فنکار سمجھا جاتا ہے۔ جنگ کے باقیات کا اثر اس پر بھی نمایاں ہے لیکن وہ ان مسائل پر مابعد الطبیعاتی بصیرت بھی رکھتا ہے۔ روزمرہ کی جرمن زندگی پر بھی اس کا مشاہدہ بہت عمیق ہے۔ روحانیت پر کامل اعتقاد اس کے نزدیک سب مصائب کا مداوا ہے۔ حقیقت کو موثر بنانے کے لیے وہ جا بجا تمثیل کا انداز اختیار کر لیتا ہے۔ "نہ صرف کرسمس کے لیے[11]" "ابتدائی سالوں کی روٹی[12]" "پل پر[13]" یا "چاقو پھینکنے والا[14]" اس ضمن میں اس کی بہترین مختصر کہانیاں کہی جا سکتی ہیں۔

وولف گانگ بورشیرٹ[15] کی شہرت کا سبب اس کی معرکۃ الآرا ڈرامائی تخلیق "دروازے کے باہر[16]" ہے لیکن بعد کے مجموعوں نے اسے شاعر، افسانہ نگار اور رپورتاژ نویس کی حیثیت سے بھی منوا لیا۔ بورشیرٹ کی افسانوی تخلیقات اگرچہ مروجہ پلاٹ کی پابند نہیں ہوتیں لیکن ان کا دلچسپ اور موثر انداز بیان قاری کو متاثر کرتا ہے۔ اکثر موقعوں پر وہ محض وقتی اور لمحاتی تاثرات کو بھی فنکاری کے ساتھ کینوس پر پھیلا دیتا ہے۔ اس کی تخلیقات اپنے وقت کے ہنگاموں کی جیتی جاگتی داستانیں ہیں جن میں زندگی کی خواہش بھی ہے اور اس سے خوف بھی۔ ان شدائد کے خلاف بورشیرٹ کی آواز ایک ماندہ لیکن شدید احتجاج کی حیثیت رکھتی ہے۔ نثر میں وہ عظیم جرمن ڈراما نگار جارج بیوشنر سے متاثر ہوا ہے لیکن ہیئت کی جدید تشکیل میں اس کے تجربے منفرد نوعیت رکھتے ہیں جس کی مثالیں "اس منگل کو[17]" اور "سنگِ میل" میں دیکھی جا سکتی ہے۔

---

1. 'Kurt Kusenberg
2. 'Der blaue Traum'
3. 'Die Sonnenblumen'
4. 'Wein auf Lebenzeit'
5. 'La Botella'
6. Heinz Risse
7. 'Irrfahrer'
8. 'Schlangen in Genf'
9. 'Belohne dich Selbst'
10. Heinrich Böll
11. 'Nichtnur zur Weinachseit
12. 'Das brot d. Fruhen Jahre'
13. 'Uber die Brucke'
14. 'Der Man mit dem Messern'
15. Wolfgang Borchert
16. 'Draussen vor der Tur.'
17. 'An diesem Dienstag'

الزے آئشنگر جرمنی کے صنفِ اناث میں سب سے زیادہ شہرت یافتہ فنکارہ ہے۔ اس کا اسلوب مروجہ انداز سے بالکل مختلف نظر آتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ روایتی افسانہ کی تشکیل میں الزے کا جوہر بہت نمایاں ہے۔ اس کی تخلیقات میں انسانی جذبات و محسوسات ایک آفاق گیر انداز میں پیش ہوتے ہیں۔ ماورائیت میں وہ براہ راست کافکا اسکول کا تتبع کرتی ہے چنانچہ اس کے یہاں بھی حقائق، اساطیر، علائم اور اسرار و رموز کی مجہول پہیلیاں قاری کے لیے خواب کی تمثیلوں کا کام کرتی ہیں جن میں گم ہو کر زمانی و مکانی احساسات ختم ہو جاتے ہیں اور پڑھنے والا تصورات کی دنیا ہی کو حقیقی دنیا سمجھنے لگتا ہے۔ الزے کا ابتدائی افسانوی مجموعہ "بندھا انسان" کے نام سے ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا تھا جس کا اب تک یورپ کی تمام بڑی زبانوں میں ترجمہ کیا جا چکا ہے حال ہی میں فشر لاگ نے اس کی نثری تخلیقات کا ایک اور مجموعہ "معدوم لمحہ" کے نام سے شائع کیا ہے جس میں ماورائیت کی جدید ٹیکنیک استعمال کی گئی ہے۔

الزے کے بیان پر جدید جرمن افسانہ کا جائزہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس میں ابتداء سے لے کر موجودہ عہد تک کے تمام نامور فنکار شامل ہیں لیکن ان لکھنے والوں کے علاوہ بھی نئی نسل کے اور بہت سے قلم کار ہیں جن کی تخلیقات جرمن اخبارات و رسائل میں چھپتی رہتی ہیں۔ دورِ حاضر میں یہ لوگ بھی جرمن افسانہ کی ترقی میں نمایاں حصہ لے رہے ہیں ان کی تخلیقات کا محور آج کی جرمن زندگی ہے جو ناقابلِ حل مسائل سے دوچار ہے اس ضمن میں جنگ کے باقیات، جرمنی پر یورپ و امریکہ کی یلغار، مختلف معاشروں کا تصادم، سیاسی و نظریاتی کشمکش، برلن کا بحران، ایٹمی خطرات اور سب سے بڑھ کر آنے والی جنگ کا خوف موجودہ لکھنے والوں پر اثر انداز ہے۔ ان فن کاروں میں اندریش الفرید، بیہائم شوارسباخ، بینڈر ہاؤس، ہربرٹ آئزن رائش، ولی فیرے، ہوگو ہارٹنگ، مائنراڈ انگلن، ولی کرامپ، فرانس نابل، گیہارٹ پول، لوئزے رنسر، ارنسٹ شنابل اور ہاؤس شوماخر جیسے قلم کار شامل ہیں ——

۱۷۹۷ء میں گوئٹے نے ادب کی دائمی قدروں کے بارے میں کہا تھا۔

ادب کی دنیا اپنا ایک وجود رکھتی ہے جسے کبھی ختم نہیں کیا جا سکتا۔ آرٹ کی اس دنیا سے اس جیسی یا اور دوسری نئی دنیا میں پیدا ہوتی رہیں گی۔ اس دنیا میں ابد کا زندگی سانس لیتی ہے جو ہمیشہ سے بوڑھی، جوان اور

---

1. Ilse Aichinger
2. Der Gefesselte
3. Zu keiner Stunde
4. Andresch Alfred
5. Beheim Schwarzbach
Bender Haus
Herbert Eisenreich
Willi Fehse
Hugo Hartung
Meinrad Inglin
Willi Kramp
Franz Nabl
Gebart Pohl
Luise Rinser
Ernst Schnabl
Hous Schumacher

بچ رہی ہے۔ آنے والے حوادث اس کی اس ازلی حیثیت کو نہیں بدل سکیں گے اور اس دنیا میں بسنے والے فن کی سعادتوں سے یوں ہی فیضیاب ہوتے رہیں گے جن کا عام آدمی احساس بھی نہیں کر سکتا۔"

صرف چار سال گزرے تھے کہ حالات کے تغیر نے کارولینے[1] شیلگل کے دل میں خدشات پیدا کر دیے۔ ۱۸۰۲ء میں اس نے آنے والے خطرات سے متاثر ہو کر ولیم[2] شیلگل کے نام ایک خط میں لکھا۔

"میرے دوست، مسلسل دوہرائے جا۔ یہ زندگی کس قدر مختصر ہے لیکن پھر بھی کتنی عظیم! بالکل آرٹ کی دنیا کی مانند۔ نقاد لکھتے رہیں گے، توانا نسلیں پنپتی رہیں گی، نظام بدل جائیں گے اور جب یہ دنیا کاغذ کے ایک حقیر پرزے کی طرح جلے گی تو یاد رکھو آرٹ کا یہ سارا مال و متاع اس بجھا ہوا شعلہ کی آخری لپک ثابت ہوگا، اور پھر اندھیرا چھا جائے گا۔"

نہیں کہا جا سکتا آج کی جرمن دنیا کیا محسوس کر رہی ہے؟ آیا وہ گوئٹے کی اس 'یقینی دہائی' سے مطمئن ہے یا شیلگل والے خطرات سے خائف ——— ؟؟

---

1. Karoline Schlegel
2. Wilhelm Schlegel

۸۰ برس کے بعد

ادارۂ نقوش

مکاتیب نمبر

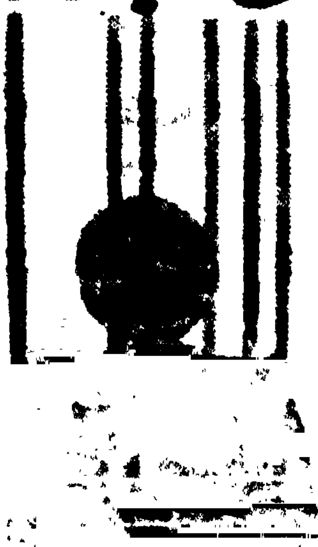
کی صورت میں

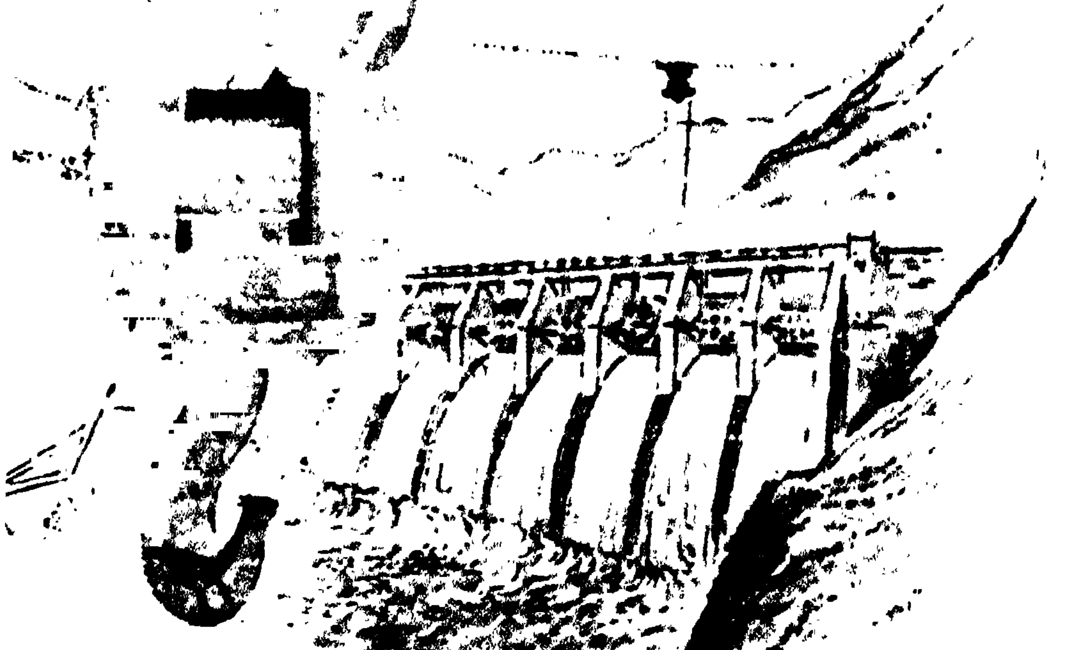
خطوط کا دُوسرا غیر مطبوعہ اور نایاب سرمایہ

اردو ادب

کے حوالے کرنے کا اہتمام کر رہا ہے

اگر آپ بھی اس سلسلے میں ہماری کچھ مدد کر سکتے ہوں
تو اس سے دریغ نہ فرمائیں تاکہ ادب کا مکاتیبی باب
ابدیت کی حدوں کو چھو لے







ریب اور دیدہ زیب پارچہ جات
خوش رنگ
اور
خوش وضع
کالونی
ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ
اسماعیل آباد (ملتان)
کالونی سیلز ڈپو
۴۴۔بی ایڈورڈ روڈ صدر راولپنڈی
۴۸، دی مال۔ لاہور۔
L.A.A 5/10.

برقِ جہندہ

جوش ملیح آبادی

چرخ تک شورِ لن ترانی ہے — ہائے کیا مدھ بھری جوانی ہے
شوخ، بے باک، چلبلی، مضطر — نتھ میں طوفاں، اینٹوں میں بھنور
انکھڑیوں میں غزل سرا کاجل — گرمیٔ تن سے کھولتی ہیکل،
انکھڑیوں میں نہیں یہ نیند کا بھاؤ — جوئے صہبا میں چل رہی ہے ناؤ
یوں جوانی کی زد پہ بالک پن — جوں ہوا میں حریر کا دامن
کم سنی و شباب کا سنگم — رُخ پر اک جھٹپٹے کا ہے عالم
موجِ گل نے، بدن کو ڈھالا ہے — سایۂ شاخِ گل نے پالا ہے
شوخیوں سے ہیں خال و خد روشن — موتیوں پر دمک رہی ہے کرن
"جوگیا" کی للک تکلم میں — بھیرویں کی رکھب تبسم میں
چال میں گھومتا ہے یوں کولا — جیسے جھولے دھناسری جھولا
روئے تاباں پہ دولے ایسے — قصرِ مرمر پہ چاندنی جیسے
یوں اُبلتا ہے جسم سے کندن — موجِ زر ہے تمام پیراہن
زیرِ پوشاک شعلۂ دل جُو — جیسے پتو میں پرفشاں جگنو
زلف کی چھاؤں میں طرب گاہیں — تارِ زر کی بنی ہوئی باہیں

الاماں! تابِ رخ میں لاکھوں طور
وَقِنا ربّنا عذابَ النور

الھڑ

جوش ملیح آبادی

الھڑ، چنچل، شوخ، دِوانی
بات ھلال، لہجہ کٹانی
اپنے سے خود کھینچا تانی
لٹ میں لرزاں پیت کہانی
جیسے کھلتی بال کمانی
آہا ہا، چت چور جوانی
اوہو ہو، گھنگھور جوانی

گاہ سراب و گاہے جیحوں
گاہے لیلیٰ، گاہے مجنوں
دن کو "آہا" شب کو "اوں ہوں"
وقتِ ایفا، رشکِ قاروں
وقتِ پیماں، حاتمِ ثانی
آہا ہا، چت چور جوانی
اوہو ہو، گھنگھور جوانی

تن میں بجتا رم جھم ساون
من میں چلتی پُروا سَن سَن
چھنکتا پنڈا، تپتا جوبن
گاہے چُٹکیں، گاہے اَن بَن
پل میں شوخی، اور پل میں دانی
آہاہا، چت چور جوانی
او ہو ہو، گھنگھور جوانی

دور رہو تو یار خنداں
پاس جو آؤ تیغ عریاں
خلوتِ کفر و جلوتِ ایماں
پاؤں پڑو تو شاداں فرحاں
ہاتھ بڑھے تو آنا کانی
آہاہا، چت چور جوانی
او ہو ہو، گھنگھور جوانی

دیکھا مجھ کو ندیا نارے
پلّو ڈھلکا، مچلے دھارے
پلکیں جھپکیں، ٹوٹے تارے
آنکھ جھکا لی، ڈر کے مارے
بھولی ساری آنی بانی
آہاہا، چت چور جوانی
او ہو ہو، گھنگھور جوانی

ایک لٹک میں سو ہلکورے
نیناں جیسے پھول کٹورے
کہتے ہیں یہ پاپی ڈورے
گال نہ چھونا سیّاں مورے
نہیں تو ہوں گی اور دوانی
آہا! چت چور جوانی
او ہو ہو، گھنگھور جوانی

بائیں چمپا، دہنے بیلا
جوبن لونڈی، گیسو اچھیلا
رنگوں کا وہ مکھ پر ریلا
سندر بن میں جیسے میلا
میلا، جیسے بھور سہانی
آہا، چت چور جوانی
او ہو ہو، گھنگھور جوانی

ابل گھسی، اٹھنا، اچپل
ٹمٹکتی پلکیں، چبھتا کاجل
گھور بھنور کی تن میں ہلچل
گھٹ میں آندھی، لٹ میں بادل
مکھڑے پر ہیں رات کی رانی
آہا، چت چور جوانی
او ہو ہو، گھنگھور جوانی

تال کے بر ہیں، جھل جھل زیور
لے ہیں، ترچھی موج کوثر
سر کے سر پر آڑا جھومر
پل ہے دھنک کا دھن کے اوپر
بول گلابی، تانیں دھانی
آہاہا، چت چور جوانی
او ہو ہو، گھنگھور جوانی

آبی آنچل، سرخ شلوکا
نیناں بجرے، مکھڑا لوکا
رنگ سنہرا، انگ بھبھوکا
بال کھلے تو جنگل کوکا
بات جو کی تو برسا پانی
آہاہا، چت چور جوانی
او ہو ہو، گھنگھور جوانی

فراق گورکھپوری

فرزانگی بڑھی تو سراسر خوشی گھٹی ‏ ‏ ‏ اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شدی

میری خطاؤں پر بھی نہیں لطف میں کمی ‏ ‏ ‏ یعنی تمہاری اب وہ محبت نہیں رہی

تھی تیری چشمِ ناز میں یا میرے دل میں تھی ‏ ‏ ‏ وہ مے کہ جام ہی میں رہی اور چھلک گئی

اس بزمِ ناز میں جو کسی تھی نہ اَن سُنی ‏ ‏ ‏ عشقِ زباں دراز نے وہ داستاں کہی کہی

وہ دادِ حسن وہ میری زباں پر رکی رکی ‏ ‏ ‏ ہونٹوں پہ تیرے موجِ تبسم تھمی تھمی

شاعر سے کہہ رہی ہے یہ ہونٹوں کی پنکھڑی ‏ ‏ ‏ سو خوش بیانیوں کا جواب ایک خامشی

گو مر مرے وہ ضبطِ تبسم نہ ہو کہیں ‏ ‏ ‏ ہونٹوں کی اوٹ میں وہ کرن سی دبی دبی

آزردگیٔ حسن کے صدقے کہ ہونٹ پر ‏ ‏ ‏ اک مسکراہٹ اور یہ آنکھیں بھری بھری

اے طالبِ بقائے محبت یہ جان لے ‏ ‏ ‏ ہر چیز آنی جانی ہے ہر شے ہے رفتنی

یہ تو نہیں کہ عشق پہ دائم رہے عتاب ‏ ‏ ‏ تو مہرباں نہ ہو ور ہو لیکن کبھی کبھی

ساقی ترے نثار دیا ارغوانِ نشاط ‏ ‏ ‏ لیکن لہو بھی کچھ رگِ پیمانہ دے گئی

یہ سحر کا بیاں تری آنکھوں کو وقف ہیں ‏ ‏ ‏ موسیٰ کے معجزے ہیں نہ جادوئے سامری

بیداریاں بھی منتظر انگڑائیوں کی ہیں ‏ ‏ ‏ وہ اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

ہم دیکھتے ہی رہ گئے اندازِ چشمِ ناز ‏ ‏ ‏ وہ دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی

میری فسردگی کو مٹاتے تو میں کہوں ‏ ‏ ‏ یوں تو تری نگاہ ہے پیغامِ زندگی

ہم شاعروں کو چھوڑ کے تھی جن کی دھوم دھام ‏ ‏ ‏ دنیا کو یاد آ نہ سکے ان کے نام بھی

میں نے سکوتِ حسن کو دیکھا جو غور سے ‏ ‏ ‏ وہ درد تھا کہ روحِ محبت تڑپ گئی

آئی تھی شاعری سے گلے ملنے روحِ عصر
کہہ کر تجھے فراق کو سونپا گزر گئی

سید عابد علی عابد

بے سبب آپ کا وہ بر سرِ احساں ہونا ناگہاں عقدۂ دشوار کا آساں ہونا
دوستو! دولت کونین کہاں ملتی ہے؟ در بدر خاک بسر چاک گریباں ہونا
دلبری میں تری جانب سے کمی کوئی نہ تھی میری قسمت میں ہے درماندہ و حیراں ہونا
قفسِ باغ میں وہ شورشِ آہنگِ طیور وہ مرا فصلِ بہاراں میں غزل خواں ہونا
ناصحا! تجھ کو بہ ایں دشمنیٔ اہلِ نیاز زیب دیتا تھا درِ ناز کا درباں ہونا
ہمدمو! وقت یہ کہتا ہے کہ اب لازم ہے رو بروِ قتل گہِ کوچۂ جاناں ہونا
اے حیا! انجمنِ ناز میں بیٹھا کوئی آج لبِ لعلیں کی جگہ چشمِ سخن داں ہونا
غمِ دنیا مجھے رکھتا ہے پریشاں خاطر کاش دیکھوں ترے گیسو کا پریشاں ہونا
مرے جانے کی تمنا میں جیے جاتے ہیں چارہ گر! دیکھ بیادرد کا درماں ہونا

کیا تماشا ہے کہ شہروں کو ملا ہے عابد
آتشِ لالہ کا صحرا میں فروزاں ہونا

صدائے بے صدا

احمد ندیم قاسمی

اظہارِ مدعا کی اجازت کا شکریہ
لیکن مری زبان تو واپس دلائیے
الفاظ سے صدا کی صفت کس نے چھین لی
اِس رہزنی کا کھوج تو پہلے لگائیے

جب مل گیا مجھے مری آواز کا سراغ
جنباں رہیں گے کُنجِ لحد میں بھی میرے لب
یوں بولنے کو بول تو دوں آج بھی، مگر
تاروں کے ٹوٹنے سے نہ ٹوٹا سکوتِ شب

احمد ندیم قاسمی

آج کی شب تم نہ آپائے، مگر اچھا ہوا
چاندنی روئی ہوئی ہے، چاند ہے ٹوٹا ہوا

شام کا جادو تھا یا شدت تمھاری یاد کی
وقت کیا، مجھ کو تو دریا بھی لگا ٹھہرا ہوا

جان و تن جلتے ہیں لیکن ایک کیفیت کے ساتھ
حسن اک شعلہ تو ہوتا ہے، مگر پگھلا ہوا

ہجر کا احساس تنہائی ہے بے قید مقام
مجھ کو تو صحن چمن بھی دامن صحرا ہوا

جذبۂ تخلیق نے ماتم کی مہلت ہی نہ دی
ہر لٹے منظر سے اک منظر نیا پیدا ہوا

وقت کی اپنی طبیعت، عشق کا اپنا مزاج
زندگی پر چھا گیا ہے ایک پل گزرا ہوا

آدمی اک تھا، مگر اس کے ہزاروں روپ تھے
وہ کبھی بندہ، کبھی آقا، کبھی مولا ہوا

کیا سوائے موت، کچھ بھی دست قدرت میں نہیں؟
یہ تماشا تو ہے صدیوں سے مرا دیکھا ہوا

دشمن

قتیل شفائی

میں اور وہ جب ملتے ہیں تنہائی میں
بند کواڑوں پر لہرانے والے کچھ پردوں کے سوا
کوئی اور نہیں ہوتا

میرے ہونٹوں کے پیچھے
اور اس کے دل کی دھڑکن میں
کہرام سا مچنے لگتا ہے
میں سوچتا ہوں
سب کچھ کہہ دوں
وہ چاہتی ہے
سب کچھ سن لے
ہر بار مگر
کچھ کہنے سننے سے پہلے
اک انجانا سا شخص کوئی
معلوم نہیں کس رستے سے
ان بند کواڑوں کے اندر آ جاتا ہے
تب میرے ہونٹوں کے پیچھے
اور اس کے دل کی دھڑکن میں
کہرام مچاتی باتوں کا
اک مدفن سا بن جاتا ہے
تھراتے لب سل جاتے ہیں
گاتی دھڑکن رک جاتی ہے
اس بار مگر
جی چاہتا ہے
اک سازش کریں ہم دونوں
جب بند کواڑوں کے اندر
مجبور پرانی عادت سے
وہ شخص اگر پھر آ جائے
اس شخص کی روشن آنکھوں کو
ہم داغیں گرم سلاخوں سے
اس شخص کے سنتے کانوں میں

ہم پگھلا ہوا سیسہ بھر دیں
پھر کھول کے بند کواڑوں کو
اور نوچ کے بوجھل پردوں کو
میں بے کھٹکے
سب کچھ کہہ دوں
وہ بن سہمے
سب کچھ سن لے

○

قتیل شفائی

نیند کے گہرے سمندر میں جہاں غرقاب تھا ‌ ‌ ‌ ایک میں ساحل پہ تھا سو ماہیٔ بے آب تھا
کیا بتاؤں دوستو ان کے خیال آنے کا حال ‌ ‌ ‌ جھلملاتی جھیل میں لرزاں کوئی مہتاب تھا
بہہ گئے آنکھوں سے جب آنسو تو یاد آیا مجھے ‌ ‌ ‌ اِک جہانِ آرزو آباد زیرِ آب تھا
اب بھی ہے میرے گریباں پر کسی ہاتھوں کی تاب ‌ ‌ ‌ کون کہتا ہے خلوصِ دوستاں نایاب تھا
دور مجھ سے ہو گئیں کچھ اس لیے بھی منزلیں ‌ ‌ ‌ ہمسفر میرا غلامِ ریشم و کمخواب تھا
بر سرِ محفل سبھی کو مل گیا اعزازِ جام ‌ ‌ ‌ ایک دیوانہ ترا بیگانۂ آداب تھا
دل منور ہو گیا اک جلوۂ خورشید سے ‌ ‌ ‌ ورنہ میں اب تک فدائے کرمکِ شب تاب تھا
سوچتا رہتا ہوں آنکھیں بند کر کے رات دن ‌ ‌ ‌ میں نے دیکھا جو کھلی آنکھوں وہ کیسا خواب تھا

میری کشتی کے لیے آغوش پھیلائے قتیل
یا خدا کی ذات تھی یا حلقۂ گرداب تھا

ایکٹرس کا کنٹریکٹ

مجید امجد

مرا وجود، مری زندگی کا بھید ہے، دیکھ
یہ ایک ہونٹ کے شعلے پہ برگِ گل سے خراش
یہ ایک جسم کے کندن میں گدگدی سے گداز
یہ ایک روح، بھنچے بازوؤں میں کھیلتی لہر

ذرا قریب تو آ، دیکھ تیرے سامنے ہیں
یہ سرخ رس بھرے لب، تن کی اک جھلک کے لیے
کبھی قبیلوں کے ان جوشنوں میں دھڑکے تھے
جو تو کہے تو یہی ہونٹ، سرخ رس بھرے ہونٹ
ترے لہو میں شگوفہ کھلا بھی سکتے ہیں

قریب آ، یہ بدن، میری زندگی کا طلسم
تری نگاہ کی چنگاریوں کا پیاسا ہے
جو تو کہے تو یہی نرم، اسریا، آنچل
یہی نقاب، مری چٹکیوں میں اٹکی ہوئی
یہی ادا، مری انگڑائیوں سے کسی ہوئی
یہ آبشار، ڈھلانوں سے گر بھی سکتی ہے
بس ایک شرط! یہ گوہرِ سطرِ دستاویز
ذرا کوئی یہ وثیقہ رقم کرے تو سہی
الاؤنس کے اِدھر جتنے دائرے ہوں گے
اِدھر بھی اُتنے ہی عکس ان برہنہ شعلوں کے

○

میکش اکبرآبادی

جنگ میں بھی اک صلح کا پہلو، صلح میں بھی اک جنگ کی آن
ان گھاتوں کے نام ہیں کیا کیا ان باتوں کو کیا کہتے ہیں

بات ہوائی جیسے بادل، آنکھ جھپکتی جیسے بجلی
جسم مہکتا جیسے گلشن چال لچکتی جیسے لہریں

جسم پہ یوں پوشاک سجی ہے جیسے شبنم پھولوں پر
رنگ سنہری گل گالوں پر جیسے مانک کندن میں

اُس کی زلفیں جیسے ناگن بل کھائے بجلی لہرائے
اور نہ جانے کیسی ہیں وہ چھو کر کس نے دیکھی ہیں

اُس کی آنکھیں؟ اُس کی آنکھیں! کیسی ہیں کیا بتلاؤں
ٹھہریے مجھ کو سوچنے دیجئے اُس کی آنکھیں، اُس کی آنکھیں

○

شاد عارفی

قدم سنبھل کے بڑھاؤ کہ روشنی کم ہے
اگر یہ بھول نہ جاؤ کہ روشنی کم ہے

گھروں کو آگ لگاؤ کہ روشنی کم ہے
یہیں سے بات بناؤ کہ روشنی کم ہے

جواب یہ کہ کوئی رہنما ہے قوم میں آپ
اگر کسی کو بتاؤ کہ روشنی کم ہے

سحر کو شام سمجھنا جو بس کی بات نہیں
یہی سوال اٹھاؤ کہ روشنی کم ہے

"شریکِ بزمِ سیاست" ہیں کچھ بجھے چہرے
ذرا قریب تو آؤ کہ روشنی کم ہے

صدا لگاؤ کہ "آنکھیں عجیب نعمت ہیں"
انھیں یقین دلاؤ کہ روشنی کم ہے

جھپٹ پڑیں نہ کہیں دن میں مشعلیں لے کر
عوام کو نہ سجھاؤ کہ روشنی کم ہے

روا نہیں کہ کسی ڈوبتے ستارے کو
چراغِ راہ بناؤ کہ روشنی کم ہے

ذرا پہنچ کے تو دیکھو سوادِ منزل تک
تم اس خبر پہ نہ جاؤ کہ روشنی کم ہے

یہ شاعرانِ "غلط" ہیں کہیں گے اک دن شاد
ہمیں چراغ دکھاؤ کہ روشنی کم ہے

○

صوفی تبسم

جن پہ ہیں تیری نظر کے سائے
اُن بہاروں پہ خزاں کیوں آئے
دُور ہیں اہلِ وفا کے مسکن
دل کی آواز کہاں تک جائے
تیری یادوں کی کڑی دیواریں
کون اس شہر سے باہر جائے
آج ہر بات سے جی گھبرایا!
آج ہر بات پہ وہ یاد آئے
کل تھی جس بات سے دل کو تسکین
آج اس بات سے جی گھبرائے
دلِ غمگیں میں امیدوں کا ہجوم
ڈوبتی شام کے لمبے سائے
کھو کے دنیا کو تجھے پایا ہے
تجھ کو کھوئے تو کوئی کیا پائے
ایسے تیور نہ بدلنا اے دوست
دیکھ کر تجھ کو نظر پچھتائے
کتنی شیریں ہے ترے غم کی کسک
لب پہ آئے تو تبسم بن جائے

○

احسان دانش

تھی کس کو خبر آج یہ قسمت نہ رہے گی
راتوں کو خوشی دن کو مسرت نہ رہے گی

یہ علم کہاں تھا مرے پندارِ جنوں کو
آنکھیں بھی اٹھانے کی جسارت نہ رہے گی

پابندِ وفا عشق بھی ملتا ہے بمشکل
اس دین میں یہ شرطِ عبادت نہ رہے گی

شکوہ تو محبت کے بھروسے پہ کیا تھا
یہ کس کو خبر تھی کہ محبت نہ رہے گی

تقدیر تھی یہ عرضِ تمنا کا نتیجہ
معروضِ تمنا کی اجازت نہ رہے گی

بارِ غمِ دنیا تو میسر ہی کسے ہے
بارِ غمِ ہستی کی بھی ہمت نہ رہے گی

آجاؤ کہ آثارِ زمانہ سے ہے ظاہر
اب بھی جو ہے ملنے میں سہولت نہ رہے گی

یہ دن تھا خیالات و تصور سے بھی باہر
ہم سے تمہیں ملنے کی بھی فرصت نہ رہے گی

چل دو گے کہیں چھوڑ کے تنہا مجھے اک دن
تم سے بھی کبھی خط و کتابت نہ رہے گی

درپیش ہیں کچھ میرے جنوں کو وہ مراحل
اب تم کو نہیں پھر مجھے فرصت نہ رہے گی

راتوں کی کہیں گرد سے وہ نکلیں گے تارے
صبحوں کی جبیں پر یہ صباحت نہ رہے گی

دانشؔ یہ زمانے کے رویّے سے ہے ظاہر
باقی کوئی اب قدرِ شرافت نہ رہے گی

ذاتیات

خلیل الرحمٰن اعظمی

جو مجھ پہ بیتی ہے
اس کی تفصیل میں کسی سے نہ کہہ سکوں گا
جو دکھ اٹھائے ہیں
جن گناہوں کا بوجھ سینے میں لے کے پھرتا ہوں
اُن کو کہنے کا مجھ میں یارا نہیں ہے
میں دوسروں کی لکھی ہوئی کتابوں میں
داستاں اپنی ڈھونڈتا ہوں
جہاں جہاں سرگذشت میری ہے
ایسی سطروں کو میں مٹاتا ہوں
روشنائی سے کاٹ دیتا ہوں
مجھ کو لگتا ہے لوگ ان کو اگر پڑھیں گے
تو راہ چلتے میں ٹوک کر مجھ سے جانے کیا پوچھنے لگیں گے

○

ناصر کاظمی

کہاں گئے وہ سخنور جو میرِ محفل تھے
ہمارا کیا ہے بھلا ہم کہاں کے کامل تھے

بھلا ہوا کہ ہمیں یوں بھی کوئی کام نہ تھا
جو ہاتھ ٹوٹ گئے ٹوٹنے کے قابل تھے

حرام ہے جو صراحی کو منہ لگایا ہو
یہ اور بات کہ ہم بھی شریکِ محفل تھے

اب اُن سے آنکھ ملانے کو جی ترستا ہے
کبھی جو لوگ مرے رتجگوں میں شامل تھے

شناوروں کو ترے ڈوبنا ہی تھا منظور
قدم قدم پہ وگرنہ ہزار ساحل تھے

فضا ابن فیضی

ہم تو خیر ہیں جیون بیری خوار ہوئے معتوب ہوئے
ان سے پوچھے کوئی آخر کیوں اتنے محبوب ہوئے

تیرے گیسو کی موجوں سے خوشبو خوشبو راہ گزر
تیرے عارض کے افسانے پھولوں سے منسوب ہوئے

حسن و عشق کی یہ تعریفیں اپنی سمجھ سے باہر ہیں
ہم خود اپنے طالب ٹھہرے خود اپنے مطلوب ہوئے

حد سے زیادہ معصومی بھی وجہِ سزا بن جاتی ہے
کانٹوں سے دامن کو بچایا، پھولوں کے معتوب ہوئے

مصلحتِ ایام نہ تھی، یہ مجبوری حالات کی تھی
ہم ہاتھوں میں پتھر لے کر شیشے سے مرعوب ہوئے

ایک طرح کی شہرت ٹھہری عشق میں یہ رسوائی بھی
جس کی تم نے بات نہ پوچھی اس کے چرچے خوب ہوئے

جب آتا ہے موسمِ گل تو اس کی خبر سے آتا ہے
گویا ہنستے پھول چمن کے سب اس کے مکتوب ہوئے

یہ بھی ہے اک رسمِ زمانہ کیسی ہار اور کیسی جیت
طوفاں کا رخ پھیرنے والے تنکوں سے مغلوب ہوئے

لوگ نہ جانے عشق میں کیسے دکھ کا رونا روتے ہیں
وہ غم کتنے شیریں نکلے جو تجھ سے منسوب ہوئے

اب جو کچھ ہو، موسمِ گل کے پہلے یہ تیور تو نہ تھے
کتنے نازک غنچے اپنی شاخوں پر مصلوب ہوئے

گردش دانش و فن کی پونجی ماتے ماتے پھرتے تھے
ہم فن کار کہاں بن بیٹھے کیوں نہ کوئی مجذوب ہوئے

تیری راہ گزر سے ہٹ کر چلنا اب مشکل ہے فضا
تو نے جو اسلوب نکالے وہ سب کے اسلوب ہوئے

○

جمیل ملک

نہ یہ زمیں ملا ۔ نہ تہہ آسماں ملا
ہم جس پہ مرمٹے ہیں وہ پیکر کہاں ملا

تم ڈھونڈنے چلے ہو کسے چاند رات میں
اب چاند کو بھی منزلِ شب کا نشاں ملا

ہر اک سے پوچھتا ہوں سرِ رہگزارِ شوق
کیا تم کو راستے میں کوئی ہم زباں ملا

جب زندگی پہ ختم ہوئی شامِ زندگی
وہ مہرباں ملا بھی ہمیں تو کہاں ملا!

پھر اُس کے بعد دل پہ جو گزری گزر گئی
اک شخص زندگی میں ہمیں ناگہاں ملا

ہم آئینہ بھی جس کے مقابل نہ لائے تھے
وہ جب ملا تو ہم سے بہت بدگماں ملا

مرنے کا مرحلہ ہو کہ جینے کی قید ہو
جو غم ملا جمیل غمِ جاوداں ملا

○

شاعر لکھنوی

پیار کی خوشبو پھیل گئی تو ہوتی ہے رسوائی بھی
محفل سے گھبرانے والے ملے گی تنہائی بھی

جن آنکھوں کو خشک سمجھ کر تم نے نظر انداز کیا
اُن آنکھوں میں ڈوب گئی ہے دریا کی گہرائی بھی

آئی تھی کیا کیا ارماں لے کر، مل نہ سکی دیوانے سے
خالی در پر دستک دے کر لوٹ گئی تنہائی بھی

عشق کی راہ میں چلنے والے اپنے کو تنہا نہ سمجھ
شہرت بن کر ساتھ چلے گی صدیوں کی رسوائی بھی

کس گُل کو سینے سے لگائیں کس گُل کا دیدار کریں
راہِ بہاراں تکتے تکتے خون ہوئی بینائی بھی

زعم تھا کتنا حسنِ بیاں پر اُن سے مگر کچھ کہہ نہ سکے
اپنی طلب کی آگ میں جل کر خاک ہوئی گویائی بھی

O

شاعر لکھنوی

اک اک پل اک ایک برس ہے، دیکھ کے اُن کے جانے سے
ہم لمحوں کو ناپ رہے ہیں صدیوں کے پیمانے سے

الجھے الجھے گیسو، کھوئے کھوئے، بیگانے بیگانے سے
پاس کھڑے ہو سوالی سب ہیں، کیا پوچھیں دیوانے سے

رخ پہ پسینہ، تیز نفس، نادم سا احساسِ وفا
ہم پہ عجب کچھ بیت گئی ہے ایک ترے شرمانے سے

دل ہے جیسے کھویا کھویا آنکھیں جیسے خواب میں ہیں
کتنی دوری بڑھ جاتی ہے اس کے قریب آجانے سے

کارِ جنوں پہ رسوائی کی تہمت رکھنا سہل نہیں
جرأت ہو تو آنکھ ملا کر بات کرو دیوانے سے

دل میں جو تھی اک بوند لہو کی اشکوں میں تبدیل ہوئی
آج حقیقت بھیس بدل کر گزری ہے افسانے سے

پھول بھی غم دیدہ ہیں شاعرؔ، کلیوں کی بھی آنکھ ہے نم
گلشن پر کیسی اوس پڑی ہے موسمِ گل کے آنے سے

○

مظہر امام

اپنے رستے ہوئے زخموں کی قبا لایا ہوں
زندگی! میری طرف دیکھ! کہ "میں" آیا ہوں

تشنگی حد سے سوا تو نہ تھی مے خواروں کی
جانے کیوں جام اٹھاتے ہوئے تھرّایا ہوں

کام آئی ہے وہی زلف، جو میری نہ ہوئی
وقت کی دھوپ میں جس وقت میں کملایا ہوں

خیریت پوچھنے والے ہیں بہت سنجیدہ
جرم اتنا ہے کہ اک شوخ کا ہمسایہ ہوں

صبح ہو جائے تو اس پھول کو دیکھوں کہ جسے
میں شبستانِ بہاراں سے اٹھا لایا ہوں

عصرِ نو! مجھ کو نگاہوں میں چھپا کر رکھ لے
ایک مٹتی ہوئی تہذیب کا سرمایہ ہوں

نکہتِ آسودہ

شاذ تمکنت

لمس کی آنچ سے ہر پور میں مہکار سی ہے
گردشِ خوں ہے کہ شریانوں میں جھنکار سی ہے

آنکھیں جھکتی ہیں بہ اندازِ حجابِ دوشیں
شب کے پارے ہوئے کاجل کی چمک مدھم ہے
سخن زیرِ لب و قوسِ تبسم موہوم
احتیاط اتنی کہ کنگن کی کھنک مدھم ہے
چمپئی چھوٹ سی چھنتی ہوئی گھونگھٹ کے تلے
تیز ہے شعلۂ رخ، دل کی کسک مدھم ہے
کھلتی ہوئی انگڑائی کی محراب دو نیم
شاخِ ہر عضو کے غنچوں کی چٹک مدھم ہے

کون سا گوشۂ دامن ہے سراپستۂ ناز
نکہتِ پرچۂ و باسِ شکن آلودہ لیے
موجِ انفاس میں اک نکہتِ آسودہ لیے

فارغ بخاری

بازگشت

سالہا سال پکارا ہے تجھے
زندگی نے کئی گوشوں سے
میری آواز کا جادو لیکن
تیری بے رحم سماعت پہ کبھی چل نہ سکا
اور میں سنتا رہا
اپنی ہی غمزدہ آواز کی گونج

ہمہ اوست

سحر سے لہرا اٹھی
شوخ نشیلی، چنچل
لہرا اٹھی — تڑپی، اڑی
اڑ کے بنی — سطحِ فلک پر بادل

جھانک کر نزدِ گردوں سے زمیں کو دیکھا
اپنی ہم جنسوں سے جب آنکھ ملی
شرم سے ہو گئی پانی پانی

ناخلف

پیڑ کا خون پی کے شاخیں
پھیلتی بڑھتی ہیں
پھولتی پھلتی ہیں
رفعتوں کے بار کو چھوتی ہیں
بار ور ہو گیا
سارے جہاں کو فیض یاب
لیکن اپنے پیڑ سے ہی بے نیاز

نفرت

فارغ بخاری

یہ مسجد یہ مندر یہ دیر و حرم
ہمیشہ ہمیشہ نمایاں رہے جن کی چتون کے خم
یہ اندھی محبت کی قربان گاہیں
حسیں زندگی کی حرارت نگلتی ہوئی سرد راہیں
کھلی کفر و ایماں کی یہ منڈیاں
وفا و محبت کا نیلام اکثر رہا ہے جہاں
اور ان میں یہ پھیلی ہوئی دور تک
ایک کالی سڑک
خلوص آزماؤں کو بہکا رہی ہے
افق تا افق پھیلتی جا رہی ہے
سحر کے جواں نور کی بے پناہی
سے بھی چھٹ نہ پائی یہ ظالم سیاہی
ہزاروں طرحدار ابھرے مرے دہر کا خونِ ناحق
بھی لایا نہ سیلِ تباہی
ہمیشہ اسی طور قائم رہا
اس کا سرمایۂ کجکلاہی
اور اب تو ازل سے ابد تک
یہ کالی سڑک
دلوں کے بیاباں میں پھیلی ہوئی دور تک
بھیانک لہو کا سمندر بنی ہے

گناہوں کی ندی

شاد امرتسری

آبنوسی رنگ تیکھے خال و خط
جسم کے اندر کہیں پوشیدہ روحِ بے سکوں
روح سے پیتی ہوئی آلودگی
آبنوسی رنگ اب تک یاد ہے

سنگِ اسود کی چٹانوں کے قریں
ریشم و اطلس کی ڈھلوانوں کے خم کے وسط میں
مخملیں کیفیتوں کی لہلہاتی جوئبار
تیز اور بدمست آنکھوں میں گنہ کی چاشنی
جیسے کوئی دیوداسی خواہشوں کی راہ میں
دیوتاؤں کے بھجن کو تیاگ کر
مندروں کے پروہتوں سے بھاگ کر
اک مغنّی کے جسم کی چاہت کرے کرتی رہے
اور گناہوں کی ندی بہتی رہے . . . . .

آبنوسی رنگ اب تک یاد ہے

○

شکیب جلالی

جلتے صحراؤں میں پھیلا ہوتا — کاش میں پیڑوں کا سایا ہوتا
تو جو اس راہ سے گزرا ہوتا — تیرا ملبوس بھی کالا ہوتا
میں ہوا ہوں نہ پون ہوں نہ چراغ — ہمنشیں میرا کوئی کیا ہوتا
زخمِ پنہاں تو نہ دیکھے گا کوئی — میں نے کچھ بھیس ہی بدلا ہوتا
کیوں سفینے میں چھپاتا دریا — گر مجھے پار اترنا ہوتا
بن میں بھی ساتھ گئے ہیں سائے — میں کسی جا تو اکیلا ہوتا
مجھ سے شفاف ہے سینہ کس کا — چاند اس جھیل میں اترا ہوتا
اور بھی ٹوٹ کے آتی تری یاد — میں جو کچھ دن تجھے بھولا ہوتا
راکھ کر دیتے جلا کر شعلے — یہ دھواں دل میں نہ پھیلا ہوتا
کچھ تو آتا مری باتوں کا جواب — یہ کنواں اور جو گہرا ہوتا
نہ بکھرتا جو فضا میں نغمہ — سینۂ نے میں تڑپتا ہوتا

تھی مقدر میں خزاں ہی تو شکیبؔ
میں کسی دشت میں مہکا ہوتا

پاداش

شکیب جلالی

کبھی اس سبک رَو ندی کے کنارے گئے ہی نہیں ہو
تمھیں کیا خبر ہے
وہاں ان گنت کھردرے پتھروں کو
سجل پانیوں نے
ملائم، رسیلے، مدھر گیت گا کر
امٹ چکنی گولائیوں کو، دا سونپ دی ہے

وہ پتھر نہیں تھا
جسے تم نے بے ڈول، ان گھڑ سمجھ کر
پرانی چٹانوں سے ٹکرا کے توڑا
اب اس کے سلگتے تراشے
اگر پاؤں میں چبھ گئے ہیں
تو کیوں چیختے ہو؟!

○

شفقت کاظمی

شکوہ تو کوئی تیرے جہاں سے نہ تھا مجھے
یہ اور بات ہے کہ نہ راس آسکا مجھے

اس طرح میں کسی کی جفا سے ہوں مطمئن
جیسے نہ ہو کسی کی شکایت روا مجھے

قسمت سے وہ نگاہ بھی تیور بدل گئی
لے دے کے جس نگاہ کا تھا آسرا مجھے

منزل پہ آگیا ہوں مگر کچھ نہ پوچھیے
کن سخت مرحلوں سے گذرنا پڑا مجھے

آباد کس دیار میں ہیں اب خبر نہیں
یارانِ رفتہ دے نہ گئے کچھ پتا مجھے

شفقت پھر اُس دیار کی جانب چلا ہوں میں
آئی تھی جس کی خاک سے بوئے وفا مجھے

○

بشیر بدر

"کتابِ دل" ہے دکانوں پہ بکے گی ۔۔۔ زمانے کی نظر تجھ پہ پڑے گی
بتاؤ کون ہے جو روک لے گا ۔۔۔ محبت جب ہمیں آواز دے گی
ہمارے پاؤں تھک جائیں گے لیکن ۔۔۔ گلی تیری سدا چلتی رہے گی
جگاتا ہے مجھے یہ وہم شب بھر ۔۔۔ یہ دنیا اب نہ سو کر اٹھ سکے گی
ذرا ٹھہرے ہوئے پانی میں دیکھو ۔۔۔ کوئی تصویر ہے جو بول دے گی
شبِ تاریک کے کاندھے سلامت ۔۔۔ ستاروں کی یونہی ڈولی اٹھے گی
بنیں ہم لاکھ مہر و ماہ لیکن ۔۔۔ یہ مٹی، مٹی میں آخر ملے گی
یہی ہے دل کی بستی کا طریقہ ۔۔۔ ابھی سوئی، ابھی پھر جاگ اٹھے گی
کہیں جاؤں، زمیں کہ آسماں ہو ۔۔۔ یہ تنہائی مرا پیچھا کرے گی

نہ جانے دل پہ کس کی بد دعا ہے
یہ بستی ہر برس اجڑا کرے گی

رفعت سلطان

بہار آئی ہے اُس شوخ گلبدن کی طرح
مہک اُٹھا ہے چمن جس کے پیرہن کی طرح

ہمیں بھی ہے کسی شیریں ادا سے عشق مگر
ہمیں پسند نہیں موت کوہکن کی طرح

اُسی نے کی ہے عطا روشنی زمانے کو
وہ اک نظر کہ ہے تاروں کے بانکپن کی طرح

طلوعِ صبح کی مانند یہ حقیقت ہے
کہ لازوال ہے وہ حسن میرے فن کی طرح

نہ پوچھ مجھ سے کہ میں کیوں جیوں زمانہ میں
اُلجھ گیا ہوں تری زلفِ پُرشکن کی طرح

ہزار بار رہے شاد وقتِ غربت میں
وہ یاد آتے ہیں بے ساختہ وطن کی طرح

نہ بے رُخی سے مجھے اس طرح مخاطب کر
کہ میرا دل بھی ہے نازک ترے بدن کی طرح

ہوا نے دہر سے بدلی ہے شکل برگِ خزاں
وہ چہرہ جو کبھی شاداب تھا چمن کی طرح

کہیں سے آئے وہ آواز دینے یار کہ دل
خموش ہے کسی ویران انجمن کی طرح

غرض بدل وطن تو یہ کب ہوا کہ مجھے
وطن بھی اب نظر آتا نہیں وطن کی طرح

وہ جس کا اسمِ گرامی بھی ہم نہ پوچھ سکے
چلا گیا ہے کہیں خوشبوئے یاسمن کی طرح

اُسے نہ چاند کہوں میں تو کیا کہوں رفعتؔ
اُتر گیا ہے مرے دل میں جو کرن کی طرح

وقت کا دھارا

صدیق کلیم

روشنی تیز کرو
درد کی لَے تیز کرو
کس کے ہاتھوں میں ہے تقدیر کا ساز ؟

آؤ گاؤ کوئی نغمہ
کہ اب اظہار کا وقت آیا ہے
جل اُٹھے ساز کے تار
پھر کوئی رقص کرو
صبح جب خواب سے اُٹھو تو ہنسی رُخ پہ نمایاں ہو جائے

صبح جب دھوپ کی چھاؤں میں چلو
کبھی اس جسم سے لپٹی ہوئی زنجیر
کبھی افکار کی بوجھل حرکت
آپ ہی آپ سبک ہو جائے

صبح کی پہلی کرن دولت ہے
کس لیے وقت کی مقدار کو کم کرتے ہو ؟
وقت کو دھیان کی لہروں میں بہہ جانے دو
آج پھر وقت کی تمثیل کو مٹ جانے دو

شہر میں اجنبی

صدیق کلیم

ترا سواگت نہیں کریں گے
جو سارے احباب مل کے بیٹھیں
وہ دل لگی سی ۔ وہ قہقہے سے
جو وجہ سے ہیں سرخ لب بھی نہیں گے بکھر
تجھے وہ لیکن بٹھا تو لیں گے
ترا سواگت نہیں کریں گے

جو فرق ہو اُن میں ہم ہی کہہ دیں :
وہ خود سے باہر ہیں جب سے شامل ہوا ہوں میں بھی
لہو کی رنگت مہک کا ساماں بنی ہوئی ہے
سفید چاندی کی تین لہروں پہ قلعی بنی ہے
بہار کا یہ سماں ہے گویا :
یہ ساری چیزیں ہیں اُن کا تحفہ ــــ گراں بہا ہیں !!
یہ تیرے منہ میں زباں ترے ہاتھ میں قلم ہے
تجھے وہ لیکن بٹھا تو لیں گے
ترا سواگت نہیں کریں گے

یہ کیسی باتیں سنا رہا ہے ؟
یہ بیتے دن کے سرود ہیں ہی
یہ چڑھتے دن کا مزاج پرکھیں
کہ تجھ کو جانیں کہ خود کو جانیں
یہ ساز کیا ہے : ارے او مورکھ! جو آج شب بھی بجا رہا ہے
الگ الگ ہے سبھی کی دنیا ۔
یہ دائروں کی طرح ہے اُن کا بس ایک مرکز
جہاں سے چل کر
سمندروں کی طرح بڑھی ہیں ۔ عجیب صورت

ترا جہاں بھی ہے ایک نقش
فقط وہ ہے تری رگوں کا
تجھے وہ لیکن بٹھا تو لیں گے
ترا سواگت نہیں کریں گے

•

اختر ہوشیارپوری

دولتِ قرار آئے نکہتِ نگار آئے
آنا ہے تو یوں اب کے موسمِ بہار آئے

زندگی کے صحرا میں گونجتا تھا سناٹا
کیسی کیسی منزل تھی ہم جہاں پکار آئے

پھول کھلتے جاتے ہیں کانٹے پھیلتے جاتے ہیں
کیا خبر کسے اب کے وقت سازگار آئے

مینہ کے بعد دھرتی کی کیا بھڑاس نکلی ہے
کاش میری بستی میں ابر بار بار آئے

کارواں میں گُل میں بھی ہیں گرد بھی ہے کنکر بھی
دیکھیے کہ منزل سے کون کامگار آئے

باغ کے ہوا خواہو جنگلوں میں آ بیٹھو
شاید اس طرف سے ہی دولتِ بہار آئے

کھڑکیاں کھلی رکھیے شب کو جاگتے رہیے
جانے کب ہواؤں سے لپٹے زلفِ یار آئے

آندھیوں سے ڈرتے سارا رات جاگتے ہیں
کوئی چارہ ساز آئے کوئی غمگسار آئے

یہ تو ہے بات اور اختر کوئی بھی نہ کچھ بولے
ورنہ اُن کی محفل سے سب ہی شرمسار آئے

○

انور انجم

جہان بھر سے نہ یوں بیسبب تذکرہ کیجیے
میں دل کا راز ہوں دل سے مرے گلہ کیجیے

یہ کیا یقیں نہ سمجھے کا ہر اشارہ وہ
لبوں کا فرض نگاہوں سے کیوں ادا کیجیے

نصیب میں جو کبھی صبح کا اجالا ہوا
تو مل ہی جائے گا ہر رات کیا دعا کیجیے

خلوص کو بھی یہاں مصلحت لیے ہیں لوگ
بھلا یہی ہے کسی سے نہ کچھ بھلا کیجیے

درِ ہوس پہ ہے ہر لحظہ اک نئی دستک
جو خود سے چھپتے نہ پھریے تو اور کیا کیجیے

یہ جی میں ہے کہ ترا بت تراش کر پہروں
ترے حضور کھڑے عرضِ مدعا کیجیے

تمھارے حال سے تو بے خبر نہیں انجم
پر اب بتاؤ کہ کیا رنج کے سوا کیجیے

شاعرِ ابہام سے

آغا صادق

اے شاعرِ ابہام یہ ہے طرزِ ادا کیا
لاشے کا ترا شعر، تأثر کی فضا کیا

ہر بات جب اسرار کے پردوں میں چھپی ہو
حاصل ہو کہو وہم سی جدت کے سوا کیا

تبلیغِ حقائق کا ذریعہ ہے تکلّم
ہو خوانِ حقائق تو تکلّم کی ادا کیا

تقدیر کے ڈانڈے جو خموشی سے ملے ہوں
اظہار سے انسان ہو پھر عہدہ برآ کیا

یہ جنبشِ لب بھی تو عجب جنبشِ لب ہے
معلوم کسی کو نہ ہوا تو نے کہا کیا

ہے وہ مخاطب کہ کہی بات انوکھی
حیران مخاطب کہ مگر اس نے کہا کیا

جب ہو گیا کہنا بھی نہ کہنے کے برابر
کہیے کہ اس انداز میں کہنے کا مزا کیا

جب نطق خموشی کی طرح مہر بلب ہو
پھر نطق کو سمجھے کوئی انعامِ خدا کیا

یہ شعر ہے یا لغز، سخن ہے کہ معمّا
سمجھیں نہ اگر قاری و سامع کی خطا کیا

الفاظ میں ہوتا ہے معانی کا ذخیرہ
معنی نہ رہے ان میں تو پھر ان میں رہا کیا

مانا کہ اشارات میں بھی لطفِ سخن ہے
جب حد سے بڑھے رمز تو پھر لطف ادا کیا

جب شعر کا مطلب رہے شاعر کے شکم میں
ارشاد ہوا ارشاد سے محفل کو ملا کیا

کیا شمع کہ جو بن نہ سکے کرنِ محفل
جو راہ نہ دکھلائے وہ نقشِ کفِ پا کیا

لب پر کبھی آئیں تو دلوں میں بھی اتر جائیں
سینے میں رہے گھٹ کے تو وہ آہ رسا کیا

غالب کی طرح خوش ہے کہ سمجھے نہ کوئی بات
منظور ہوئی تجھ کو سماعت پہ جفا کیا

مقصودِ سخن یہ ہے کہ دل تک ہو رسائی
پہنچے نہ دلوں تک وہ صدا کیا وہ نوا کیا

○

ضمیر اظہر

کوئی چارہ گر جو ملتا دل و جاں لہو نہ کرتے
سبھی درد بھول جاتے کبھی ہاو ہو نہ کرتے

گریبانِ چاک ہی ہے ہم وحشیوں کا درماں
ہمیں گر خبر یہ ہوتی گریباں رفو نہ کرتے

غمِ زندگی سے بڑھ کر غمِ آرزو نے مارا
غمِ آرزو نہ ہوتا تو غمِ نمو نہ کرتے

تری بے رخی سے اکثر یہ خیال دل میں گذرا
تری آرزو نہ ہوتی، تری آرزو نہ کرتے

ہمیں یار تھے سبھی کے کوئی یار تھا نہ اپنا
رہ و رسم ہم سے کیسے بھلا پھر عدو نہ کرتے

کھلا کاوشِ طلب سے یہی راز ہم پہ اظہر
کوئی جستجو نہ ہوتی، کوئی جستجو نہ کرتے

○

کسریٰ منہاس

خاک ہونا دلیلِ ہستی ہے — کس بلندی پر اپنی پستی ہے
کاوشِ عشق دل کی ہستی ہے — جان دے کر ملے تو سستی ہے
میری ہستی بھی کوئی ہستی ہے — زندگی موت کو ترستی ہے
کوئی سمجھا نہ آج تک یہ راز — ہر نفس اک فریبِ ہستی ہے
پھر بھی ساحل پہ جاکے دم لیں گے — گو تلاطم میں بحرِ ہستی ہے
یاد آتا ہے کوئی مستِ شباب — جب گھٹا جھوم کر برستی ہے
ہوش آیا تو ہم بھی دیکھیں گے — ان کی آنکھوں میں کتنی مستی ہے
کوچۂ عشق میں یہ راز کھلا — زندگی کیا ہے؟ غم پرستی ہے
حسن مغرور عشق محوِ نیاز — اک بلندی ہے ایک پستی ہے
شعر کہتا ہے ہر کس و ناکس — ہائے یہ جنس کتنی سستی ہے

جس کو کہتے ہیں زندگی کسریٰ!
رنج و غم کی وہ ایک بستی ہے

○

رضا زیدی

پھیکا ہے کائنات کا ہر نقش رنگ و بو
تم کس قدر حسین ہو تم کتنے خوب رو

با وصفِ پاسداریٔ خاطر نہ کچھ ملا
رسوا ہے اس دیار میں چاہت کی آبرو

اس پیکرِ حسیں کی شعاعیں تھیں الاماں!
ہم اس کو دیکھ بھی نہ سکے اس کے روبرو

گو ہم کبھی یقیں کی حدوں تک نہ جا سکے
لیکن تمام عمر رہی تیری جستجو!

حسن ایک معجزہ ہے، مگر دیرپا نہیں
ادراک عشق میں ہے بڑی قوتِ نمو

یہ وحشتِ جنوں ہے کہ تہذیبِ عشق ہے
اٹھی جدھر نگاہ نظر آیا ہے تو ہی تو

میں کس طرح بدل کے چلوں جادۂ وفا
تم مقصدِ حیات ہو تم جانِ آرزو

دیکھی ہے ہم نے چہرۂ مہتاب میں رضا
اپنے تخیلات کی تصویر ہو بہو

حسنِ گریزاں

شاعر ندیم

کہنا بھی جو چاہوں تو نہ کہہ پاؤں کہ کیا ہے
وہ حسنِ گریزاں کہ بہت ہوش ربا ہے

ہنگامِ حیا ہاتھوں سے آنکھوں کو چھپانا
کچھ شوخی سی ہے شوخی ادا سی کچھ ادا ہے

اس ڈر سے پکڑ لینا ڈھلکتا ہوا آنچل
اُبھرے نہ کہیں راز جو سینے میں چھپا ہے

بیٹھی ہو اگر سامنے اُٹھنے میں تکلف
اُٹھ جائے اگر بیٹھنا پھر مرحلہ سا ہے

دو گام بھی چلتی ہے تو بہکی سی روش سے
شاید مری نظروں ہی سے وہ لغزش پا ہے

ٹوٹے ہوئے لفظوں میں لبوں پر ہے شکایت
نظروں کا مری اس کو بھی احساس رہا ہے

اقرار میں پوشیدہ ہیں انکار کے انداز
انکار میں اقرار کا پہلو بھی چھپا ہے

میرے لیے ہنگامے ہیں اُس دل میں بھی روشن
وہ لاکھ چھپائے مجھے اِس کا بھی پتا ہے

وابستہ خوشی سے مری ہے اُس کی خوشی بھی
میں روٹھ گیا ہوں تو اُسے دُکھ بھی ہوا ہے

اُٹھنے جو لگوں میں تو ہیں رکنے کے تقاضے
رخصت پر اُن آنکھوں نے مرا پیچھا کیا ہے

وہ میری نگاہوں سے کہیں پردہ نہ کر لے
ڈرتا ہوں یہ کہتے ہوئے تُو میری خدا ہے

○

شمیم حنفی

ہم ہیں پریت نگر کے باسی ہم سے رسمِ وفا نکلی
ایک ستارے دم سے یارو دنیا سی دنیا نکلی

ہم کو گماں تھا چاند کے پیالے میں ہوگی صہبائے خلوص
پی جو چکے تو اپنے منہ سے جلتے جور و جفا نکلی

دنیا والو اوپر دیکھو عرش تلک آ پہنچے ہم
ایک کرن سوزِ الفت کی اپنی راہ نما نکلی

قرب میں دوری کا عالم تھا ہم کس درجہ پریشاں تھے
جس کو ہم دیوار سمجھتے تھے وہ تیری حیا نکلی

اے دل روپ نگر کی گلیوں میں کیا سناٹا ہے
کل جو بستی صحنِ چمن تھی آج اک ویرانہ نکلی

رات نے اپنے بال بکھیرے سورج نے انگڑائی لی
ننھی ننھی کلیوں کا دل خوں کرنے کو صبا نکلی

دونوں عالم تجھ پہ قرباں جذبۂ دل پائندہ باد
دل نے اس کو یاد کیا ہی تھا کہ وہ پگلی آ نکلی

ہم نے وفا کے راگ الاپے کوئی نہ سن کے مست ہوا
اپنی صدا بھی اس بستی میں آوازِ صحرا نکلی

اے غمِ جاناں اے غمِ جاناں تجھ سے بچ کے کہاں جاتے
دنیا بھی اپنی نظروں میں تیری ایک ادا نکلی

ہائے اسی جنبشِ لب پر جیتی تھی ساری دنیا
ہونٹوں تک جو بات نہ آئی جانے کیا سے کیا نکلی

کاسہ چاند کا لے کر فطرت مانگنے آئی حسن کی بھیک
وہ بھولی بھالی سی لڑکی بھی دل کی دریا نکلی

○

ظہیر صدیقی

شورشِ دہر سے ہے ارض و سما کی قیمت
خندۂ گل سے ہے جس طرح صبا کی قیمت

وہ تو ہم ہی تھے کہ جس نے اسے برتر سمجھا
ورنہ کیا ہوتی خدا جانے خدا کی قیمت

اس کے رگ رگ میں مچلتے ہیں ہزاروں شعلے
ورنہ پھر کیا ہے اس اک برگِ حنا کی قیمت

خون باقی ہے ابھی قلب و جگر میں میرے
دے تو سکتا ہوں ترے ناز و ادا کی قیمت

دل کا ہر قطرۂ خوں وقف تری مژگاں کو
میں تو اک مشتاقِ جفا، دوں کیا جفا کی قیمت

چاکِ داماں و رسوائی و دشنہ کا ہوں!
اور کیا چاہیے اب اپنی وفا کی قیمت

رشکِ فرزانہ بہ ایں حال پریشاں ہوں میں
دے سکا کوئی مری چاکِ قبا کی قیمت

اے ظہیر! آج طلب میری ہوئی مقتل میں
ہاں ملی آج مری آہِ رسا کی قیمت

حزیں لدھیانوی

وقت ایسا اے حزیںؔ کبھی ہم پر پڑا نہ تھا
سب آشنا تھے، پھر بھی کوئی آشنا نہ تھا

بارِ الم سے اپنے ہی زانو پہ جھک گیا
جو سر کبھی کسی کے بھی آگے جھکا نہ تھا

وہ جس کو حادثات کی صرصر بجھا گئی
دیر و حرم کی شمع تھی دل کا دیا نہ تھا

ہم ہی نے جاگ جاگ کے کاٹی شبِ حیات
ہر شخص کے نصیب میں یہ رتجگا نہ تھا

جینے کو جی لیے مگر اس بے کسی کے ساتھ
جیسے بھرے جہاں میں ہمارا خدا نہ تھا

میں گلشنِ حیات میں نغمہ سرا رہا
گو بجلیوں کی زد میں مرا آشیانہ تھا

رسوائیوں کی آگ میں جلتے نہ کس طرح
دن کو بھی تیرے درد کا سورج چھپا نہ تھا

گونجے گی اب صدائے شکستِ قفس ضرور
قفلِ قفس، قفس کا فقط آب و دانہ تھا

میری نگاہ اٹھی تو پاتال تک گئی
ہر ذرہ اے حزیںؔ مجھے آئینہ خانہ تھا

○

شارق میرٹھی

ان کو جب دیکھا ہوا اپنا یہ حال
جیسے دل سے مٹ گیا ہر اک ملال

تبصرے کرتی رہی دنیا مگر
کس نے جانا کون سمجھا دل کا حال

پھر بھی دنیا ہے خراب آرزو
جانتی ہے آرزوؤں کا مآل

ہر نظر اس کی اٹھی کھنچی ہوئی
دیکھنے والے ذرا خود کو سنبھال

یوں کہیں ہر ایک کو ملتا ہے یہ
مل گیا جس کو ملا اس کا ملال

آہ شارق حال اس دل کا نہ پوچھ
ماورائے حال ہے اب اس کا سال

سوئمبر

شاہد شیدائی

جب مجھے کوئی جواں جسم نظر آتا ہے
میری ہر سانس تری یاد میں ڈھل جاتی ہے
لمحہ بھر کے لیے رُک جاتی ہے نبضِ ہجراں
لمحہ بھر کے لیے تو پاس چلی آتی ہے!

اس کے ماتھے میں دمکتا ہوا سورج ایسے
تیری بھولی ہوئی صورت کا پتہ دیتا ہے
جیسے عاشق کو ۔ جدائی میں ، چمکتا ہوا چاند
اپنے محبوب کی تصویر دکھا دیتا ہے!

اور پھر ۔ نئی عارض کے شرارے یکسر
میرے جذبات میں یوں آگ لگا دیتے ہیں
جیسے انبار کی جلتی ہوئی سرخی کے ہونٹ
آتشِ وقت کے شعلوں کو ہوا دیتے ہیں

جم گئے تھے جو کبھی ۔ آج وہ غم پھر پگھلے
مل گئی سرد تمنا کو حرارت، پھر سے!
اور مے زیست کی تلخی میں گھڑی بھر کیلئے
گھل گئی شہد سے ہونٹوں کی حلاوت، پھر سے!

آج پھر ایک حسینہ کے لبِ خنداں نے
مونالیزا کے تبسم کو بھی شرمایا ہے
سیلِ خواہش پہ دکھا کر مجھے پھر آس کی ضو
چند روز اور مجھے جینے پہ اُکسایا ہے

یوں مرا ذہن ترے جسم کی موجوں میں گھرا
جیسے طوفان کی زد میں ہو سمندر کوئی:
اور گردابِ حوادث سے اچانک بچ کر
میری خوش بختی نے جیتا ہو سوئمبر کوئی

○

نجیب اسلم

اِدھر کچھ اُجالے، اُدھر چند سائے
کوئی سوچتا ہے کہاں بیٹھ جائے

وہ انسان ہے یا کہ رستے کا پتھر
جسے، جو بھی گزرے وہ ٹھوکر لگائے

جنھیں خونِ دل دے کے سینچا تھا میں نے
وہی پھول میری نظر تک نہ آئے

غمِ زیست کی تند آندھی میں کوئی
کہاں تک چراغِ تمنا جلائے

سرِ شام کس موڑ پر آگیا ہوں!
جہاں سب نظر آ رہے ہیں پرائے

دیہ دل پر پھر دستکیں دے رہی ہے
کوئی یاد دامن میں آنسو چھپائے

سرِ منزلِ آرزو تیرگی ہے
کسی سے کہو، دل کی شمع جلائے

مجھے یوں دل سے مٹا دینے والے
تجھے بھی اگر کوئی دل سے مٹائے

نجیبؔ اس مسافر کی حالت نہ پوچھو
جسے، چاندنی بھی نہ رستہ دکھائے

○

مظفر حنفی

چونکہ میں "منجملۂ خاصانِ میخانہ" نہیں
اس لیے پہچان کر بھی اُس نے پہچانا نہیں
آدمی "اُونچی اڑانیں" لے رہا ہے آج کل
آدمیت ناپنے کا کوئی پیمانہ نہیں
مسکرا کر جب شگوفوں نے کہی "خوش آمدید"
ہاتھ پھولوں نے ہلائے "اس طرف آنا نہیں"
بدظنی پھیلا رہا ہے میرے اس کے دل کا چور
میں بھی دیوانہ نہیں ہوں وہ بھی دیوانہ نہیں
بزم میں "پروانہ ہائے راہداری" شرط ہیں
شمع اس غم میں سلگتی ہے کہ پروانہ نہیں
مجھ کو یہ اصرار "پھولوں کی جھلک" دکھلائیے
آپ کو یہ ضد کہ "گلشن ہے یہ ویرانہ نہیں"
اے مظفرؔ! طنزیہ غزلوں کے دشمن ہیں بہت
اور میرا رشتہ میں غزلوں سے یارانہ نہیں!

سندباد جہازی کا سفرِ آخرت

(صوتی تمثیل)

ابو سعید قریشی

(ملاحوں کا نغمہ اور سمندر کا شور آہستہ آہستہ ابھریں
اور پھر عقب میں چلے جائیں)

سندباد: یہ کیسا نغمہ ہے؟
کیسے سانے ہیں؟
یہ سفینے؟

(ہوا کا شور)

یہ بادبانوں سے اڑتے بادل
دریدہ دامن

(ہوا کا شور اور ساحل سے ٹکراتی لہریں)

مری رگوں میں
لہو کی لہریں
جلوسِ سینہ زناں کی مانند
گونجتی ہیں
سپر چٹانوں پہ جیسے کشتی
ہجومِ موجِ بلا کے آگے
کمر جھکائے
سکونِ ساحل کی آرزو میں سفینہ کوئی ۔ فگار سینہ
صدائے گریہ پہ ڈولتا ہو

(طوفان اور چیخ و پکار)

یہ کیسا ہنگامۂ ہاؤ ہو ہے؟

(طوفان تھم جاتا ہے اور پھر چند ساعت کی مکمل
خاموشی کے بعد)

مری نگاہوں میں دھند کے یہ دبیز پردے
کبھی اجالے کبھی اندھیرے کی چلمنوں پر مچل رہے ہیں
یہ پگھلے سیسے پہ سرمئی سا مہیب گنبد
افق افق سمت و سُو سے عاری
نشانِ منزل کہیں نہ ساحل
نہ روزِ روشن نہ جلوۂ شب
نگارِ شمس و قمر کہیں پر —
نہ رقصِ زہرہ!
عجیب صحرائے بے کراں ہے
رمِ غزالاں کہیں نہ محمل
عروسِ لالہ کہیں نہ شبنم
سراب ہے نے صبا و صرصر
رباطِ رامشگراں نہ صوتِ نفیر و شہنا
عجیب دریائے چیستاں ہے
فسوں زدہ
گنگ

ہجومِ طوفاں
نمودِ بادِ مراد ہے نے کہیں نوائے پیامِ طوفاں
گریز پا ہے نگاہِ دریا
فغانِ غولِ ہیولیٰ برپا
صدائے صور و ہجومِ حشر آشیاں

یہ کیا ہے؟
میرے سفینے پہ شور و شیون
یہ التجائیں؟

(طوفان اور بھی [illegible])
([illegible] موجودگی کا احساس ہوتا ہے)

ناخدا: خدائے آدم و داؤد و یونس و یعقوب
ترے اشارے سے گلزار نارِ ابراہیم
خدائے موسیٰ و ہارون حکومت تیرے
[illegible] نیل بنی راہِ اسرائیل:
ترے ارادے سے صحرا میں چشمۂ زمزم
خدائے برتر و قدوس و ربِ اسمٰعیل
خدائے رحمتِ کونین
خدائے احمدِ مرسل ؐ
ترا نفس تنِ مردہ میں زندگی کا لہو
ترے اشارے سے شق القمر — شہادتِ حق
ترے کرم سے سفینے کئی کنارے لگے
ترا کرم ہو تو یہ کشتیِ جبر بھی آج
چٹان سے حلقۂ گرداب سے نکل جائے

(طوفان!)

سندباد: میرے اللہ
یہ موجِ جنوں خیز و فلک بوس و زمیں دوز
یہ دیدۂ گرداب
منزل ہے کہ انجام کا آغاز
(طوفان تھم جاتا ہے)

یہ ساحلِ صد پارہ و کف زا
یہ خواب ہے یا خواب کی تعبیر

صدف!
کنارا!
قطارِ نخیل و دشت و جبل
عروسِ تاک و خمارِ ہوائے توبہ شکن
ہجومِ لالہ و گل
رموزِ شعر و عہدِ شباب
رگوں میں دوڑتے پھرتے لہو کی شادابی
فسانۂ شبِ رفتہ
فسونِ زہد گداز
(دور سے گانے کی آواز میں —)
خیز و در کاسۂ زر آبِ طربناک انداز
پیشتر زانکہ شود کاسۂ سر خاک انداز

سندباد: ایک آواز کی لہر جانے کیا کیا خس و خاشاک لیے آتی ہے
دلِ خوں گشتہ کے دکھوں ارماں
مۓ دیرینہ و معشوقِ جواں
طلبِ لالہ رخاں
نغمۂ ناہید گلو
لیلیٰ زلفِ محبوب
ہوسِ عشرتِ نایاب

لذتِ لمسِ لبِ ماہوشاں
عقدۂ بندِ قبا
گرمیِ آغوشِ بتاں
ساقِ سیمیں کا فسوں
رنگِ جنوں
ساز و نیاز
نغمہ و ساز صدائے صدفِ گوہرِ تاب

یہ کیسا ساحل ہے
میں کہاں ہوں
مرا سفینہ
ابھی یہاں تھا
ابھی نہیں ہے
مرے سفر کا یہی تھا حاصل
سوال بن کر مری نگاہوں میں زندگی پھر اُبھر رہی ہے
نئے جزیرے
نئے نشیمن
نئی نئی امتحاں کی راہیں
(لہریں ابھر کر دو۔ سوتی جاتی ہیں)

سند باد: اے مردِ پیر کون ہے تو
پیرِ تسمہ پا: ملک التجار
میرا نام
مگر میری کہانی
اک قصۂ طولانی ہے
الف لیلیٰ کی طرح
بات سے بات نکل آئے

یوں
شمعوں کی لوئیں
بھڑک کر بجھ جائیں
مگر قصہ میرا ختم نہ ہو
امتحاں ایک سے ایک
حسرت و شوقِ سفر کے عنواں
بحرِ زخار
سفینے
طوفان
شہرِ بغداد کی گلیوں میں سنانے کے لیے
شاہزادی کے شبستاں کے طلسم
مگر ... میری نقاہت
میری آواز
حلق میں کانٹا ہوئی جاتی ہے
مجھ کو اس چشمے پہ لے چل میرے دوست
میرے پاؤں
سنگریزوں کی چبھن سے میرے زخمی پاؤں
مجھ میں اب چلنے کی طاقت بھی نہیں
آہ!
ایسے نہیں
جس طرح
شہرِ بغداد کے حمّال
اپنے کاندھے پہ اٹھاتے ہیں کوئی بوجھ
اٹھا

سند باد: شہرِ بغداد کے حمّال
تو انھیں جانتا ہے

میرے قصوں کے وہ رسیا ہیں
شہر یک محفل
وہ مجھے جانتے ہیں

پیرِ تسمہ پا : ایک عالم ہی کیا تو بھی مجھے جانتا ہے
تو کون ہے
میں کون
کیا ہے یہ کہانی
یہ سحر ہے
عقدہ ہے
طلسمات ہے
احساس ہے یا سایۂ احساس
یہ کہ وہ گناہوں کی سزا ہے
کہ ستم
ناکام تمناؤں کا
احساسِ زیاں کا
تو کون ہے
میں کون ہوں
اس چشمے کے آئینے میں پہچان

(سند باد کی چیخ پر پیرِ تسمہ پا کے قہقہے)

سند باد : اف یہ عفریت
میرا ہی عکس نظر آتا ہے
میری ہی مسخ شدہ صورت ہے
میرے کندھوں سے اتر
میرے سینے پہ ترے پاؤں کی قینچی
مری شہ رگ پہ ترا ہاتھ
اف میرا سانس — میرا سانس (ہانپتا ہے)

پیرِ تسمہ پا : (قہقہہ) میں کون ہوں
تو کون ہے
لے جان گیا اب (قہقہہ)

سند باد : (ہانپتے ہوئے) شیطان! (بوڑھے کا قہقہہ)

پیرِ تسمہ پا : شیطان کہ فرشتہ ہوں کہ انساں
میں تجھ سے ہوں
تو مجھ سے ہے

نادان
غمِ ہستی کا نہیں کوئی بجز مرگ علاج

سند باد : بادۂ تاک مگر
ذلتِ زیست
ستم رانیٔ احساس کا ہے یہ بھی علاج
آگہی ایک اذیت ہے مگر
مگر
زہر ہی زہر کا تریاق ہوا کرتا ہے
بے خودی بادۂ انگور میں ڈھل جائے گی
میرے عفریت کو آج
سایۂ تاک نگل جائے گا

(پیتا ہے — ہنستا ہے)

پیرِ تسمہ پا : اسے — تو یہ کیا پیتا ہے

سند باد : یہ بھی ایک راز ہے
سربستہ و محفوظ

پیرِ تسمہ پا : بتا

سند باد : آہ
مگر میرا گلا
میری شہ رگ پہ ترا ہاتھ ہے

بولیں کیسے
پیرِ تسمہ پا: لے
چھوڑ دیا
اب بول
تو یہ کیا چیتا ہے
سند باد: نسخۂ عمرِ جواں
آبِ بقا
مرگِ پیری کا علاج
نسخۂ عہدِ شباب
پیرِ تسمہ پا: مرگِ پیری کا علاج
نسخۂ عہدِ شباب
راحت و عیشِ دوام
سند باد: خضر و الیاس کا سربستہ و محفوظ طلسم
پیرِ تسمہ پا: آہ یہ آتشِ سیال
میری رگ رگ میں جوانی کی اُمنگ
بادباں بن کے مجھے
کسی انجانے جزیرے میں لیے جاتی ہے
سند باد: ہے صاعقہ و شعلۂ سیماب کا عالم
یہ گرمئ جذبات سے گدرائے ہوئے جسم
ہے کاشی کا مندر کہ یہ جمنا کا کنارا
ہے شامِ سراندیپ کہ یہ صبحِ بنارس
یہ لعبتِ بغداد ہے یا دخترِ بابل
رقاصۂ افلاک کی پازیب سے اُڑتے ہوئے جگنو
(رقص کی موسیقی جس میں ذیل کی غزل تحلیل ہو جائے
نسوانی آوازیں)

غزل
پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب
رونقِ شہرِ غزالاں ہے قریب آجاؤ
میری باہوں میں امیدوں کے کنول کھِلتے ہیں
دعوتِ موجِ بہاراں ہے قریب آجاؤ
آرزو صاعقہ ساماں ہے قریب آجاؤ
جنتِ پہلوئے جاناں ہے قریب آجاؤ
قریب آجاؤ
قریب — اور قریب
(موسیقی ڈوب کر پس منظر میں چلی جاتی ہے)
سند باد: مگر پاس آکر بھی تم دور کیوں ہو
تمھارے تنفس کی آواز
اک سرد شعلہ ہے
حدّت سے عاری
جلاتے نہیں ہیں شرارے تمھارے لبوں کو
تمھیں پاس پاکر بھی آغوش خالی ہے میری
تمھارے بدن کی تمازت کہاں کھو گئی ہے
بتاؤ
بتاؤ
تمھاری گھٹاؤں سی زلفوں میں آسودگی کیوں
تمھاری نگاہوں میں یہ فاصلے
دور سے دور تر کیوں چلے جا رہے ہیں
کنارے پہ ملاح کو چھوڑ کر جیسے کشتی رواں ہو
عورت: نہیں تو
تمھیں چھوڑ کر میں کہاں جا رہی ہوں
یہیں ہوں

نہیں تھی
تفنگ کی سرگوشیوں کی طرح
بوسۂ گل کی طرح

سندباد : ان کہی جیسے کوئی
ادھوری کہانی
مگر کون ہو تم؟

عورت : تیرا خواب
تصویر
تخیل، جھونکا ہوا کا
کرشمہ، تصور کی تخلیق
تیری تمنا کا
خواہش کی جادوگری کا ہیولیٰ

(لہریں۔ طوفان)

سندباد : جانے اب کونسا ساحل مری تقدیر میں ہے
کونسا تیرا ابھی حلقۂ تقدیر میں ہے
جانے کس کشورِ گم گشتہ پہ لے جائے گی
مجھ کو یہ موجِ بلا
سفر کب میرا ختم بھی ہوگا کبھی

(آوازیں)

آواز ۱ : یہ محل کیسا ہے
کیسا گنبد ہے
بلبلا سا درونِ صحرا
نہ در، نہ دربان

۲ : نہیں نہیں
یہ نہیں ہے گنبد
تو پھر یہ کیا ہے

۳ : کسی عجب جہاں کا محل
میانِ دشتِ جفا
وفا کا نشان روشن

۱ : نہیں نہیں
یہ کسی جفا جو جہاں گزیدہ کی خانقہ ہے

۳ : نہ محل ہے یہ
نہ خانقہ ہے
نہ مقبرہ ہے

۱ : تو پھر یہ کیا ہے

۳ : سبا کے آثار
یہ خزانہ ہے
شہِ بلقیس و سلیمان کا
ایک صحرا نے جس کو صدیوں سے ڈھانپ رکھا تھا
جستجو میں ہزاروں سیاح جس کی نذرِ اجل ہوئے ہیں

۱ : ہماری قسمت چمک اٹھی ہے
تو آؤ اب اس کو مل کے ڈھائیں (ہما ہمی)

سندباد : ٹھہر جاؤ
جس کو دفینہ سمجھتے ہو تم
وہ دفینہ نہیں ہے
یہ پتھر نہیں ہے
یہ چونا نہیں ہے
نہیں ہے کوئی سنگ و خشت کی کوئی تعمیر
کہ جس پہ گماں ہو عمارت کا تم کو

۲ : مگر کچھ تو ہے یا فقط واہمہ ہے
تمہارے فسانوں کی مانند (قہقہے)

سند باد : [illegible] سوداگروں کی زبانی
کہ صحرا میں [illegible] نام
اک طائرِ دیو پیکر بھی ہوتا ہے
مجھے یوں نظر آ رہا ہے کہ
یہ بیضۂ رخ ہے
اس کو نہ چھیڑو
مبادا کوئی ابتلا ہم پہ نازل ہو اس سے
ت : ہٹاؤ میاں ایسے قصے
ہزاروں سنے ہیں
حکایت تمہارے سفر کی تو صد داستاں ہے
مگر اس کو حمّال ہی مان سکتا ہے
ہم نام تیرا (قہقہہ)
سند باد : مگر جلد بازی کا انجام اچھا نہ ہوگا۔
ش ہٹاؤ میاں
ہم تو آج اس دفینے کو حاصل کریں گے
رہے تم
سو تم
اس کے سائے میں ستاؤ
آہیں بھرو (قہقہے)
اور اگر
کوئی خطرہ ہو
(قہقہے - بیضۂ رخ کو توڑنے کی کوشش - ہما ہمی)
ارے یہ
یہ اندھیرا سا کیوں چھا گیا ہے
یہ بادل سے کیا ہیں
(رخ کے پروں کا شور)

سند باد : یہ رُخ ہیں بھائی۔
بچاؤ جانیں
وگرنہ آج ایک ایک ہم سے
اجل رسیدہ ہے
چند لمحوں کا مہمان ہے
(بھگدڑ - خوفزدہ - ہجوم - پرندوں کی چیخیں
- پرندوں کی سرسراہٹ جیسے آندھی)
مقدر میں میرے خرابی لکھی ہے
مجھے چھوڑ کر چل دیے میرے ساتھی
گناہوں کا ان کے نتیجہ
مجھی کو بھگتنا پڑے گا
عجب قاعدہ ہے
عجب کھیل ہے یہ سزا و جزا کا
مگر یہ پرندے
چٹانیں لیے اپنے پنجوں میں
کشتی کی جانب
کہاں جا رہے ہیں
(دور سے چیخ پکار اور سمندر میں چٹانیں گرنے کی آواز)
سفینہ ٹوٹ گیا
اور سب میرے ساتھی !
قضا و قدر کے راز آدمی کو کیا معلوم
رہائی کا اس دشت بے در سے امکان کیا ہے
نہیں کچھ نہیں سوجھتا
مجھے سایۂ موت میں زندگی دینے والے
وسیلہ رہائی کا میری
سوائے تیرے

سرو کوئی نہیں ہے
مگر یہ صنوبر سا کیا ہے
ستون سا

یہی تو نہیں ہے
نکلنے کا اس دشت بے در سے زینہ
خرما کے پیڑوں پہ چڑھتے ہیں ملاح جیسے
اسی طور
میں بھی
چمٹ جاؤں گا پائے زینہ سے
بنے گا یہی میرا شہ پر
رہائی کا اس دشت بے در سے رستہ

آدمی حسرت پرواز پہ دم دیتا ہے
آج وہ طاقت پرواز میسر ہے مجھے
گوشۂ مکاں کی طرح مجھ کو نظر آتا ہے یہ کرۂ ارض
اس کے سب کوہ و دَر
دشت و جبل
بحر پر شور نہیں جن سے سفینوں کو مفر
کسی سائل کی ہتھیلی کی طرح
خط تقدیر کی مانند نظر آتے ہیں
کاش دکھ اس کے بھی، سوچتا ہوں
برف کے گالوں کے مانند بکھر جائیں گے
سوچتا ہوں کہ خلاؤں سے خلاؤں سے پرے
کتنی دنیائیں ابھی ابن آدم کی نگاہوں سے
تصور سے نہاں
نیلگوں گنبد افلاک میں پوشیدہ ہیں

کتنے پیکر ابھی اس پردۂ تصویر میں نادیدہ ہیں
سوچتا ہوں کہ مہ و مہر کی روشن قندیل
کون سے منبع انوار کی شرمندہ ہے
کہکشاں کون سے افلاک کی ہے راہگزر
کون ہے کس کے ارادے سے ہیں قائم دا
یہ ستاروں کے مدار
گردش شمس و قمر کون سی پرکار پہ ہے
حیرتی کس کے ہیں یہ لیل و نہار
سوچتا ہوں
کہ نہاں خانۂ ادراک کی بے راہ روی
شوق بے حد کا جنوں
زیست اور زیست کی دریوزہ گری
فکر فردا و غم دوش و ستم رانی امروز
سوچتا ہوں کہ مرے عشق کا انجام یہی ہو نہ
مجھ سے پہلے مرے اندیشۂ بیباک سے پہلے
میری تخلیق سے
تخریب سے پہلے کیا تھا
اس کے انکار

میری لغزش پا سے پہلے
آدم و حوا کی تشہیر سے رسوائی سے پہلے
شجر ممنوعہ تھا کیا، سوچتا ہوں
کیا کوئی راز تھا، سربستہ و محفوظ
جس کو وا کرنے کی پاداش میں آج
عیش امروز ہوا مجھ پہ حرام
یہ مری سوچ مگر
مجھ سے کہتی ہے کہ ہے

مری افتادِ زباں کاریٔ ایام کا راز
اک وہی راز کہ سربستہ بھی ہے عام بھی ہے
وائے بے مہریٔ ایام و ستم رانیٔ تدبیر مری
کس خرابے میں مجھے لے گئی تقدیر مری
پیکرِ خاک تھا میں
کرۂ خاک ہوا مجھ کو نصیب
مری پرواز مگر ٹوٹ رہی ہے شاید
قعرِ دریا میں اُترتی ہوئی کشتی کی طرح
دل مرا ڈوب رہا ہے ہر آن
جانے وہ کون سے افلاک تھے روزن تھے
دریچے تھے مرے پیشِ نظر
کون سے خواب کی سوغات تھے
وہ لولوئے انجم
اے وائے
غبار اب تو ہے تا حدِ نظر
پھر وہی دشت و جبل
عزم ہے یہ
نہ

سوچتا ہوں شہپرِ غیر کی پرواز کا انجام یہی ہونا تھا

پھر وہی میں ہوں
وہی گردشِ ایام بھی ہے
پھر وہی دانہ، وہی دام بھی ہے
مرکب مجھے اک وادیٔ آدم میں لے آیا ہے
ایسی وادی کہ نہیں جس میں گذرگہ و خیاباں
جس کے غاروں میں نہاں مارِ سیاہ
جس کے سایوں میں پڑے سوتے ہیں

شعلہ فگن
اژدہے
نیشِ عقرب سے سوا جس کی چٹانوں کی چبھن
ایسی وادی کہ جیسے
سحر و افسون و طلسمات کی وادی جیسے
دیو آسا ہیں کھڑے جس کے پہاڑ
حاتم طے کے فسانوں کی فضا ہو جیسے
اک طلسمات کا عالم ہے مرے پیشِ نظر
ان گنت لعل و گہر — نیلم و یاقوت کئی
چاند کا جن پہ گماں ہو وہ زمرد کے شجر
وہ جواہر کہ اندھیروں میں اجالا ہو جائے
رقصِ طاؤس کا ہر سمت گماں ہوتا ہے
ایک اک لعلِ بدخشان و یمن
دُرِ ناسفتہ و نایاب کئی
مضطرب ہیں کہ انھیں زینتِ دستار کروں
اس نہاں خانۂ کوہسار کے اسرار
مگر مثلِ کہسار
واہمے بن کے مری راہ میں حائل ہیں
نہیں بن سکتے
سوچتا ہوں
یہ جواہر نہیں انگارے ہیں
ان طلسمات کی دنیا کے شرارے ہیں جنھیں
کسی جادو نے افسوں کر کے سُلا رکھا ہے
ان کے چھوتے ہی کئی مارِ سیاہ
اژدہے خوابیدہ کئی
جاگ اُٹھیں گے جلا دیں گے مجھے

یا [illegible] بھول جائیں گے یہ سب دکھ
وہ گیا ہے کدھر، وہ دیکھو غار کے پاس
پھر مری گھات میں شاید ہے وہی مارِ حسین
مری رسوائی کا ساماں جو بنا
آج پھر دشمنِ دیرینہ مرا
ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہا ہے اس طور
جیسے کہتا ہو

شیطان : مقدّر کے دھنی

دیکھ میں تجھ کو کہاں لایا ہوں، میرے جنّت کے رفیق
مجھ کو بھی یاد ہے وہ باغِ جناں
جس کے سایوں کا خمار
آج بھی تجھ کو لیے پھرتا ہے یوں خاک بسر
بحر و بر جس کے لیے
ایک جیسے ہیں تو نے
تجھ کو تو یاد ہی ہوگا لیکن
باغِ جنّت میں بھی یہ سب دکھ
تو نے دیکھے تھے کبھی
سچ تو یہ ہے کہ وہاں اور بھی کیا رکھا تھا
بس شب و روز ثنا خوانی و تسبیح و درود
ایسی یکسانیِ اوقات کہ جی جل جائے
کوئی ہنگامہ نہ شورش
نہ کچھ اپنے جہانِ گذراں
دردِ ہجراں نہ کہیں راحتِ وصل
کہیں طوفاں نہ کنارا نہ امیدِ ساحل
آرزو کوئی نہ خواہش نہ خیال
تیری حالت پہ اگر رحم نہ آتا مجھ کو

نسلِ انساں کا نشاں بھی کہیں پر ہوتا
ایک تیرے سوا
تیرا ہم جنس بھی واں کوئی نہ تھا
تھا بھی کوئی ؟
وہی بے عزم ملائکہ
وہی بے جان حوریں
ان سے نبھتی بھی تو کیسے نبھتی
خیر — اس ذکر کو اب جانے دو
آج ان ساکن و بے کیف فضاؤں کی جگہ
ایک دنیا ہے تری تجربہ گاہ
آج تدبیر تری تابعِ تقدیر نہیں
کسی مشّاق صنم گر کی طرح
خود ترا ہاتھ ہے خلّاق ترا
ایک ہی پل میں ہزاروں پیکر
منتظر ہیں تری صنّاعی کے
میں تو کیا
میں تو خادم ہوں ترا
روزِ ازل کا مدّاح
خود خداوند بھی قائل ہے ترا
تری ایجاد کا فن کاری کا مدّاح ہے وہ
تو اگر خود کو خدا بھی کہہ دے
پھر بھی زیبا ہے تجھے
اور یہ سب دکھ
یہ ترا بخت رسا ہے کہ تجھے
آج وہ دولتِ نایاب ملی ہے کہ
سلاطینِ زمن

ہیں تیرے در کے غلام
اور حسینانِ جہاں
فرودیتی و کلوپطرہ تائیس و سلومی اک ایک
خلوتِ خاص کی ہوں تیری رفیق
سندباد: ملکۂ حسن فرودیتی و قتالۂ مصر
نازشِ شہرِ سکندر — تائیس
اور وہ رنگولۂ بابل — سلمے
ابلیس: عشرتِ شمعِ شبستانِ خیال
لذتِ شہرِ تمنائے وصال
ایک سے ایک حسین
ان جواہر کے تصدق تیرے مقدور میں ہے
ہیں تصرف میں ترے
رعبِ شہی
جاہ و جلال
عظمت و شہرتِ جاوید
کنیزیں ہیں تری
بے خطر ہاتھ بڑھا
ہیچ اندیشۂ فردا ہے
عبث فکرِ زیاں
گر حقیقت ہے تو بس ایک — یہی ساعتِ امروز
سندباد: مگر یہ کیا ہے۔
یہ کون گذرا ہے اس گلی سے
یہ کس کے پاؤں کا خون رس رس کے سنگریزوں
پہ جم گیا ہے
مرا گریبان چپک رہا ہے
مرے لبوں پہ لہو کی بوندیں
مری بیبیانہ آرزوؤں پہ ہنس رہی ہیں

پیاس بن کر مرے گلے میں
ہزار خواہش سلگ رہی ہے
مرے رگ و پے میں پھانس بن کر سرک رہی ہے
میرے سینے پہ بوجھ کیسا ہے
یہ کیسا کرگس ہے
جس کا سایہ
سیہ تعفن کا اک بگولا سا
میرے لاشے کو لے کے لعل و گہر کی وادی سے
جانے کس سمت جا رہا ہے
(ڈھول اور لوگوں کا شور جیسے ہانکا ہو رہا ہو)
نہ جانے کس سمت جا رہا ہے مرا سفینہ
کوئی بتاؤ
مرے سفینے کے ناخداؤ
مگر یہ کیا ہے
تمہارے چہروں پہ خوف کیوں ہے
تمہارے ہونٹوں پہ کپکپی بن کے بات کوئی
صدا کو جیسے ترس رہی ہو
تمہارے ہونٹوں پہ پپڑیاں بن کے جم رہی ہیں
تمہاری آہیں
تمہارے سانسوں میں سوکھے پتوں کی سرسراہٹ ہے
سرد سایوں کی سنسنی سی
تمہاری آنکھوں سے جھانکتی ہے
بتاؤ
بولو
یہ بات کیا ہے
عجب معما ہے

یا مرے ہاتھ کی [illegible] پھیل جائیں گے یہ لعل و گہر
وہ جو گیا ہے [illegible] وہ وہیں غار کے پاس
پھر مری گھات میں شاید ہے وہی مارِ حسین
مری رسوائی کا ساماں جو بنا
آج پھر دشمنِ دیرینہ مرا
ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہا ہے اس طرح
جیسے کہتا ہو

شیطان : مقدر کے دھنی
دیکھ میں تجھ کو کہاں لایا ہوں ۔ میرے جنت کے رفیق
مجھ کو بھی یاد ہے وہ باغِ جناں
جس کے سایوں کا خمار
آج بھی تجھ کو لیے پھرتا ہے یوں خاک بسر
مجھ کو بھی جس کے لیے
ایک جیسے ہیں تو نے
تجھ کو تو یاد ہی ہوگا لیکن
باغِ جنت میں بھی یہ لعل و گہر
تو نے دیکھے تھے کبھی
سچ تو یہ ہے کہ وہاں اور بھی کیا رکھا تھا
بس شب و روز ثنا خوانی و تسبیح و درود
اور یکسانیِ اوقات کہ جی جل جائے
کوئی ہنگامہ نہ شورش
نہ تکاپوئے جہانِ گذراں
دردِ ہجراں نہ کبھی راحتِ وصل
کہیں طوفاں نہ کنارا نہ امیدِ ساحل
آرزو کوئی نہ خواہش نہ خیال
تیری حالت پہ اگر رحم نہ آتا مجھ کو

نسلِ انساں کا نشاں بھی نہ کہیں پر ہوتا
ایک حوا کے سوا
تیرا ہم جنس بھی واں کوئی نہ تھا
تھا بھی کوئی ؟
وہی بے عزم ملائکہ
وہی بے جان حوریں
ان سے بنتی بھی تو کیسے بنتی
خیر ـــــ اس ذکر کو اب جانے دو
آج ان ساکن و بے کیف فضاؤں کی جگہ
ایک دنیا ہے تری تجربہ گاہ
آج تدبیر تری تابعِ تقدیر نہیں
کسی مشّاق صنم گر کی طرح
خود ترا ہاتھ ہے خلاّق ترا
ایک اک پل میں ہزاروں پیکر
منتظر ہیں تری صنّاعی کے
میں تو کیا
میں تو خادم ہوں ترا
روزِ ازل کا مدّاح
خود خداوند بھی قائل ہے ترا
تری ایجاد کا فن کاری کا مدّاح ہے وہ
تو اگر خود کو خدا بھی کہہ دے
پھر بھی زیبا ہے تجھے
اور یہ لعل و گہر
یہ ترا بخت رسا ہے کہ تجھے
آج وہ دولتِ نایاب ملی ہے کہ
سلاطینِ زمیں

ہوں ترے در کے غلام
اور حسینانِ جہاں
نرو دیتی و قلوپطرہ تائیس و سلومی اک ایک
خلوتِ خاص کی ہوں تیری رفیق

سند باد : ملکۂ حسن فروتینی و قتالۂ مصر
نازشِ شہرِ سکندر — تائیس
اور وہ رنگولۂ بابل — سلمے

ابلیس : عشرتِ شمعِ شبستانِ خیال
لذتِ شہرِ تمنائے وصال
ایک سے ایک حسین
ان جواہر کے تصدق تیرے مقدور میں ہے
ہیں تصرف میں ترے
رعب شہی
جاہ و جلال
عظمت و شہرتِ جاوید
کنیزیں ہیں تری
بے خطر ہاتھ بڑھا
ہیچ اندیشۂ فردا ہے
عبث فکرِ زیاں
گر حقیقت ہے تو بس ایک — یہی ساعتِ امروز

سند باد : مگر یہ کیا ہے۔
یہ کون گذرا ہے اس گلی سے
یہ کس کے پاؤں کا خون رس رس کے سنگریزوں
پہ جم گیا ہے
مرا گریبان چیک رہا ہے
مرے لبوں پہ لہو کی بوندیں
مری بیاسی آرزوؤں پہ ہنس رہی ہیں
پیاس بن کر مرے گلے میں
ہزار خواہش سلگ رہی ہے
مرے رگ و پے میں پھانس بن کر سرک رہی ہے
میرے سینے پہ بوجھ کیسا ہے
یہ کیسا کرگس ہے
جس کا سایہ
سیہ تعفن کا اک بگولا سا
میرے لاشے کو لے کے بعد و گہر کی وادی سے
جانے کس سمت جا رہا ہے
(ڈھول اور لوگوں کا شور جیسے ہانکا ۔ ہو رہی)
نہ جانے کس سمت جا رہا ہے مرا سفینہ
کوئی بتاؤ
مرے سفینے کے ناخداؤ
مگر یہ کیا ہے
تمہارے چہروں پہ خوف کیوں ہے
تمہارے ہونٹوں پہ کپکپی بن کے بات کوئی
صدا کو جیسے ترس رہی ہو
تمہارے ہونٹوں پہ پپڑیاں بن کے جم رہی ہیں
تمہاری آہیں
تمہارے سانسوں میں سوکھے پتوں کی سرسراہٹ ہے
سرد سایوں کی سنسنی سی
تمہاری آنکھوں سے جھانکتی ہے
بتاؤ
بولو
یہ بات کیا ہے
عجب سماں ہے

[illegible]
تمہارے [illegible]

تمہاری زندہ دلی کو کیا ہو گیا ہے — [illegible]
اسے کوئی بات بھی ہو آخر
ہوا موافق ہے
ناؤ سالم ہے
دن کا سورج ہے
شب کو تارے
تو پھر یہ اُجڑے ہوئے سے چہرے
یہ خوف و وحشت
اگر خدا نہیں تو کیا ہے
کوئی فسوں ہے کہ جس نے آخر
تمہاری عقل و خرد کو [illegible] گویا
[illegible] تو تمہاری یادوں نے تم کو دیوانہ کر دیا ہے
مجھے تو سب [illegible]
مجھے [illegible]
[illegible] ساحل
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
تو پھر [illegible]

غمِ زمانہ کو بھول جاؤ
ہنسو کہ ہر سانس موجِ دریا ہے جو پلٹ کر کبھی نہ آئی
کسے خبر ہے وہ صبح تھی بھی
اگر یہی ہے مآلِ ہستی
تو پھر یہ غم کیوں
مری کنیزیں کہاں ہیں — جاؤ
انھیں بلاؤ
بلاؤ ناہید و مشتری کو
ہماری محفل میں یادِ ماضی و فکرِ فردا کا ذکر کیا
اٹھاؤ بربط
مرا سفینہ رواں دواں ہے
نہ کوئی تھی نہ کوئی ہوگی
جو سانس جاتی ہے پھر نہ آئے گی
کہ جشنِ طرب مناؤ
[illegible]
وہ دیکھو کیا ہے!
اُفق کی جانب وہ سوئے مغرب!
میانِ دریا سیاہ جنگل
سراب ہے یا کوئی جزیرہ ہے جس کی تم کو خبر نہیں تھی مرے سفینے کے ناخدا
ناخدا: یہی وہ ساحل ہے جس کا سایہ
ہمارے ذہنوں پر خوف بن کر چھا رہا تھا
اسی کے قصے ہمارے ہونٹوں پہ منجمد تھے
اسی کی وحشت سے سوکھے پتوں کی سرسراہٹ
ہمارے سانسوں میں
بس رہی تھی

یہی وہ جنگل ہے جس کے سایوں میں وہ کشش ہے
کہ اس سے بچ کے کوئی نہ اب تک نکل سکا ہے
یہی ذخیرہ ہے جس کی شاخوں میں ابنِ آدم کے
اب وجد

عروجِ انساں پہ ہنس رہے ہیں
(بندروں کے خوخیانے کی آوازیں۔ عورتوں کی
چیخیں —— دہشت زدہ لوگوں کا شور)

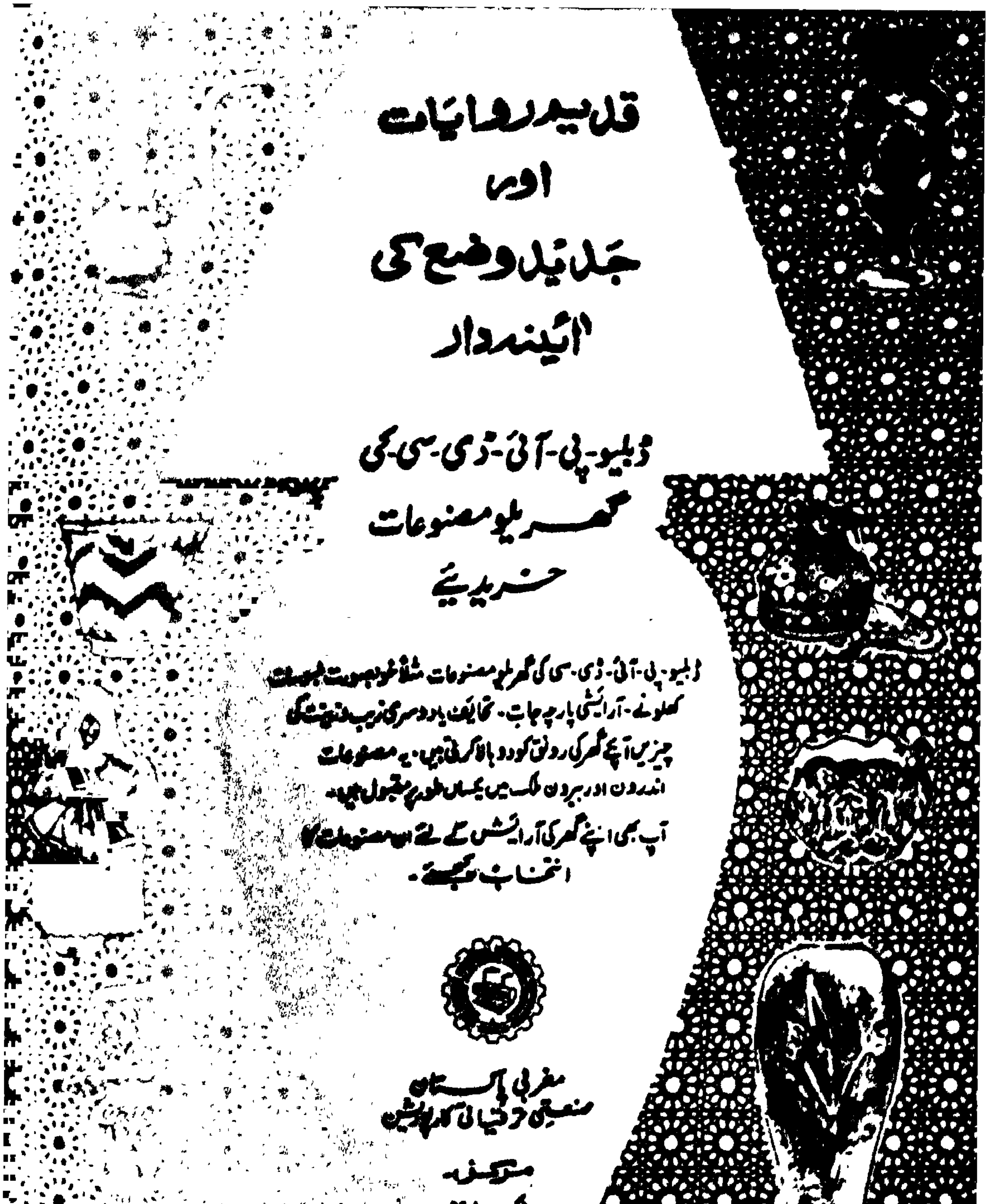
سندباد: اُف خدایا یہ وحوش
مری تہذیب و تمدن کے یہ آئینہ صنعت۔ چہرہ نما
اُف یہ ہمزاد میرے
جانے کشتی کو مری لے کے کہاں جائیں گے
مرا سامانِ سفر
میری من و سلوی
میرے آلاتِ حرب
میرے خُم
میرے سبو
سب کے سب
اب مرے ہمزاد لیے جاتے ہیں
اے وائے
(چیخ و پکار۔ مردوں کا شور)

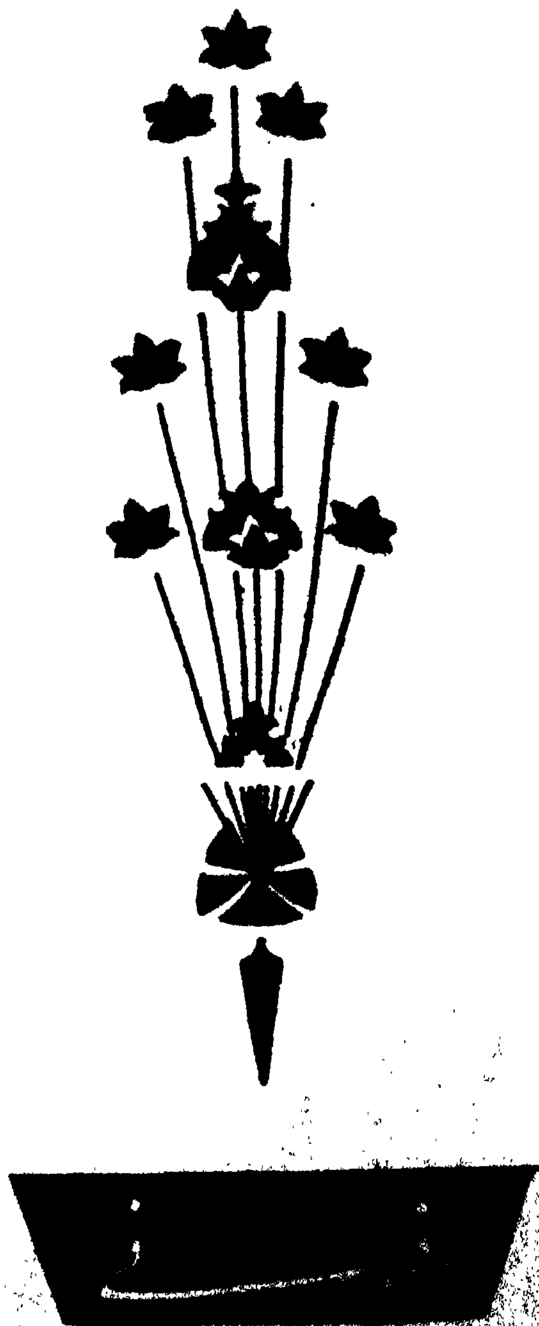
سندباد: آج پھر عزمِ سفر دل میں مرے
مثلِ امواج بدلتا پہلو
کسی انجانے جزیرے کی خبر دیتا ہے
آج پھر موجِ ہوا
پردۂ محملِ لیلیٰ سے اُڑا لائی ہے
نغمۂ سحر و چمن

گوشۂ چشمِ آہو!
مجھ کو اب میرا جنوں
جانے کس قلزمِ بے جادہ پہ لے جائے گا؟
ہر سبک رو پہ مجھے خضر و الیاس کا گذرا ہے گماں
مجھ کو ہر راہ سے منزل کی ہوا آئی ہے
میں نے فرعون کو موسیٰ سمجھا
میری کوتاہ نگاہی کے سبب
یدِ بیضا لیے آیا ہے نظر
مجھ کو ہر شعبدہ گر
میں نے ہر بت کو خدا مانا ہے
ہر صنم خانے کے ناقوس کی اللہ صدا
پاؤں کو میرے لیے
حلقۂ زنجیر بنی
نقش ہر پا پہ مرا ذوقِ سجود
قصۂ زیست کا عنوان بنا
ہر قدم دوریٔ منزل کی خبر لایا۔ مگر
آبِ حیواں کے بہانے ہر بار
ظلمات میں ہر خضر مجھے چھوڑ گیا
جادہ پیمائی مری پھر بھی کم نہ ہوئی
قلزم آشام مرا شوقِ سفر
آج پھر مجھ کو بلاتا ہے کہ آؤ!
پھر کسی ناقۂ نادیدہ سے آوازِ جرس
پھر کوئی منزلِ موعود بلاتی ہے مجھے
مجھ کو ہر موج پہ محمل کا گماں ہوتا ہے
ناخدا بن کے نظر آتی ہے ہر موجِ سراب
فردِ عصیاں کے سوا ... سوچتا ہوں

نامۂ اعمال مرا
کچھ بھی نہیں
ہے یہی رختِ سفر ـــ دامنِ صد چاک مرا
اور یہ تختۂ غسّال کی مانند زمانی ناؤ
نہ وہاں جس کے ہیں
پتوار
نہ مستول کوئی
جانے کس ساحلِ گم گشتہ پہ لے جائے گی
کون جانے مری منزل ہے کہاں!
دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک"


PIA


قدیم روایات
اور
جدید وضع کی
آئینہ دار
ڈبلیو۔ پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی۔ کی
گھریلو مصنوعات
خریدیئے
ڈبلیو۔ پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی کی گھریلو مصنوعات مثلاً خوبصورت
کھلونے۔ آرائشی پارچہ جات۔ تحائف یا دوسری زیب و زینت کی
چیزیں آپ کے گھر کی رونق کو دوبالا کرتی ہیں۔ یہ مصنوعات
اندرون اور بیرون ملک میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔
آپ بھی اپنے گھر کی آرائش کے لئے ان مصنوعات کا
انتخاب کیجئے۔
مغربی پاکستان
صنعتی ترقیاتی کارپوریشن
مرکز۔
پاکستانی
گھریلو مصنوعات
دی مال پشاور۔ تلک چاڑی حیدرآباد۔



پیاسا

کرشن چندر

نواب نیم تریا اور زنانہ لونڈا تھا۔ زرینہ کو اس لیے پسند تھا کہ وہ زرینہ کے ہاتھوں سے پٹ کر اور رو دھو کر صبر کر لیتا تھا۔ دوسرے نوکروں کی طرح بوریہ بستر باندھ کر رخصت نہیں ہو جاتا تھا۔

اس کے گندمی رنگ چہرے پر چیچک کے داغ تھے اور وہ بہت دُبلا تھا اور بہت کھاتا تھا اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جو وہ کھاتا ہے وہ کہاں جاتا ہے۔ اس کی آواز میں ایک ہلکی سی تُتلاہٹ تھی۔ جب وہ کھڑا ہوتا تھا تو کبھی سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ کسی دیوار یا کسی دروازے سے ٹیک لگا کر نیم دراز حالت میں یوں کھڑا ہوتا تھا کہ پاؤں فرش پر گھسٹ رہے ہیں سر بائیں طرف کو لٹکا ہوا ہے اور دائیں طرف کو نکلا ہوا ہے ایک ہاتھ ملتے پر ہے تو دوسرے سے پیٹ کھجا رہے ہیں۔ نواب کو عورتوں کی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر باتیں کرنے کا بہت شوق تھا۔ انہی کی طرح وہ فقروں کو چبا کے یا چپا کر کے یا بڑی طرح کھینچ کھینچ کے بولتا تھا۔ مگر باہر کے کام میں بہت ہوشیار تھا۔ اس لیے اپنی تمام مضحکہ خیز اداؤں اور نخروں کے باوجود قابل برداشت تھا۔ گھر کا باورچی تین دن سے غائب تھا اور نواب کو کچن میں کام کرنا پڑ رہا تھا حالانکہ اُسے صرف اُوپر کے کام کے لیے رکھا گیا تھا۔ زرینہ لڑکیوں کے کالج میں پڑھانے جاتی تھی، میں اپنے دفتر جاتا تھا اس لیے اگر نواب کھانا نہ پکائے تو کون پکائے اور اس سے مشکل مسئلہ یہ تھا کہ باورچی کون ڈھونڈے اور کب؟ یہاں کسی کو فرصت ہی میسر نہ تھی۔

نواب کو جب تین دن کچن میں بینگن بگھارنا پڑے اور لہسن کی چٹنی جیسی کڑوے مسالے کا قورمہ تیار کرنا پڑا تو اس کی ساری تتلاہٹ اور نسائیت ختم ہو گئی۔ مردوں کی طرح بڑے کرخت اور جھنجھلائے ہوئے لہجہ میں بول پڑا۔ صاحب ہم سے نہیں ہوتا ہم کو ایک دن کی چھٹی دو تو آپ کے لیے ایک باورچی ڈھونڈ کے لائے گا۔

”کوئی باورچی ہے تمہاری نظر میں؟“ زرینہ نے اُس کی جھنجھلاہٹ پر مسکرا کے پوچھا۔

کچن سے باہر آ کر نواب کو جو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے لگے تو اس کے مزاج کی نسائیت پھر اُبھرنے لگی۔ اس پر اُسے زرین مالکن کی مُسکراہٹ جو ملی تو اور بھی پھیل گئے۔ آپ نے ایک کندھا اُوپر اُچکایا دُوسرا نیچے کیا، بائیں کولھے کو اندر کی طرف کھینچا، دائیں کو ذرا سا باہر نکالا اور اپنے دونوں ہاتھ بڑی ادا سے ملتے ہوئے بولے۔

”اب لائیں گے کہیں نہ کہیں سے اچھا سا باورچی۔“ نواب نے اپنے دیدے گھماتے ہوئے باورچی کے مسئلہ کو ایک پُراسرار سا رنگ دے کر ہمارے سامنے کچھ اس طرح پیش کیا کہ جی جل کے کباب ہو گیا۔ جی چاہا سالے کی گردن دبا بیٹھوں اور اس کی ساری اترا ہٹ نکال دوں۔ مگر ضرورت باورچی کی تھی اور باورچی ڈھونڈنے کی فُرصت مجھے تھی نہ زرینہ کو۔ اس لیے نواب کو ایک دن کی چھٹی دینا پڑی۔

ایک دن کے بعد اتوار تھا میں اپنے کمرہ میں بیزار بیٹھا ہوا کھڑکی سے صبح کی نیلی نیلی روشنی میں اپنا سر خود ہی ہولے ہولے دبا رہا تھا۔ کبھی

کبھی مجھے اپنا سر [illegible] چیت کی لیمپ کی طرح معلوم ہوتا تھا جب تک [illegible] نہیں کچھ نظر نہیں۔

اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ نواب دونوں ہاتھوں سے دروازہ کی چق اٹھائے اندر [illegible] کو نکالے نیم باز آنکھوں سے مجھے دیکھ رہے ہیں۔

"میں [illegible] . . . . . وہ [illegible] ہیں۔ ہم [illegible] آئے۔"

"کہو [illegible] ہے؟" میں نے [illegible] پوچھا۔

نواب [illegible] بیٹھے ہوئے اپنے دونوں بازو دروازہ کی چق سے اتار کر اپنی کمر پر رکھ لیے پھر ذرا پیچھے [illegible] اور [illegible] کر لیے۔

"اندر چلے آؤ۔"

[illegible] آنکھوں والا نواب [illegible] کوئی پچیس برس کی بھولی بھولی [illegible] کالے ہونٹ، چھوٹی چھوٹی [illegible] دانتوں کی رگوں میں [illegible] کا ابھار میں نمایاں [illegible] اور [illegible]

[illegible] ہوئی

"تم [illegible] ہو؟" میں نے [illegible] پوچھا۔

"جی"

"[illegible] تمھارا"

"[illegible]"

میں نے [illegible] سے [illegible] تھا [illegible] بیگم صاحب کے پاس لے جاؤ وہ دیکھیں اور چاہیں تو رکھیں۔ [illegible] کے سامنے میں [illegible] تھا [illegible] میں [illegible] اور دم کیے آ [illegible] منہ چڑا [illegible] اور [illegible] اور [illegible] میں [illegible] گئیں [illegible] والی۔

میں نے خوش ہو کر کہا [illegible] تو تم [illegible] چکے ہو۔"

"[illegible] دیکھ کر [illegible] مگر اس کا نام تو اشتیاق ہے؟"

[illegible] دونوں ہاتھ ناف پر [illegible] تھا اور مجھے دیکھنے کی بجائے زمین [illegible] رہا تھا

[illegible] میں نے [illegible] سے پوچھا۔

[illegible] صاحب [illegible] آپ کو دیکھا تو ایسا لگا کہ شاید آپ [illegible] تو میں نے آپ کو اپنا نام [illegible] بتایا۔ پھر میں بیگم صاحب کے [illegible] گیا تو [illegible] ایسا لگا جیسے وہ [illegible] ہیں تو میں نے ان کو اپنا نام اشتیاق بتا دیا۔"

"مگر [illegible] اور [illegible] کہ میں اشتیاق کیسے ہو سکتے ہو؟"

"دلی میں ایسا کرنا پڑتا ہے صاحب۔ ایک گھر میں اوم پرکاش تو دوسرے گھر میں اشتیاق بتانا پڑتا ہے...... پیٹ روٹی [illegible] ہے صاحب!" اُس نے کسی قدر شکایت کے لہجے میں کہا اور اس کے لہجے سے یہ بھی معلوم ہوتا تھا جیسے اس کو شکایت اس امر کی [illegible] ہے کہ اسے اپنا نام غلط کیوں بتانا پڑا بلکہ اس بات کی ہے کہ پیٹ روٹی کیوں مانگتا ہے؟

گرمیوں کے دن تھے۔ دوپہر میں جب حبس بڑھنے لگا تو میں گھبرا کر دوبارہ نہانے کے لیے باتھ روم میں گھسا۔ ٹونٹی کھلا کر معلوم کیا [illegible] خراب ہو چکا ہے۔ خواب کو آواز دی تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے کمرے میں تیل چڑھا رہا ہے۔ اشتیاق [illegible] آیا۔ میں نے اُس [illegible]

"چوک میں جا کر منشی [illegible] کو بلا لاؤ شاور خراب ہے۔"

"میں ٹھیک کیے دیتا ہوں" اشتیاق بولا۔

"[illegible]"

وہ سر جھکا کر بڑی عاجزی سے بولا۔ "جی میں [illegible] کا کام بھی جانتا ہوں۔"

پانچ منٹ میں اُس نے شاور ٹھیک کر دیا۔

[illegible]

"کیا تم [illegible] کا کام بھی جانتے ہو؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

سر جھکا کر بولا "جی [illegible]"

[illegible]

[illegible]

"[illegible]"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کو جواب دے دوں۔ پھر لگے ہیں رونے میں معلوم ہوا کہ عورت نہیں، اس قسم کے کئی سب پیشے بھی جانتے ہیں۔ کرسیاں بنتے ہیں، موڑھے ٹھیک کر دیتے ہیں، لڑکوں کا [illegible] سامان ٹھیک کر دیتے ہیں کیونکہ بڑھئی کا کام بھی آتا ہے۔ سینما کے گیٹ کیپر بھی رہ چکے ہیں۔ کٹھ پتلیاں بھی بیچ چکے ہیں۔ [illegible] کام کیا ہے۔ [illegible] فیکٹری میں کام کیا ہے۔ حجام بھی رہ چکے ہیں۔ سلائی سے سلے کپڑوں کی دھلائی کے سب کام [illegible] حیثیت سے کر چکے ہیں۔ [illegible] ہیں۔ سرکس کے استاد ہیں۔ [illegible] بھی ہیں۔ چاٹ بنانا بھی جانتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ انتہائی کم خوراک ہے۔ [illegible] کو ان کی یہ عادت بہت بھا گئی۔ کیونکہ وہ نواب کی اشتہا سے عاجز رہتی تھی۔ اس لیے اس نے دھیرے دھیرے گویا سارا کام اشتیاق کو سونپ دیا۔

دو ماہ میں اشتیاق کا [illegible] گھر پر چڑھ گیا۔ اسی طرح بھاگ بھاگ کے کام کرتا تھا کہ نواب اور بھی کاہل اور نکما ہو گیا۔ بعد میں نے دیکھا کہ اشتیاق بھی [illegible] چاہتا ہے۔ [illegible] نواب اشتیاق سے سترہ اٹھارہ برس چھوٹا ہوگا۔ مگر تھوڑے ہی عرصے میں نواب اشتیاق سے پیار کرنے لگا جیسے وہ اس کا [illegible] ہو اور اشتیاق اس کا خادم ہو۔ پہلے تو میں نے یہ کہا کہ یہ سب کچھ جذبۂ احسان مندی میں ہو رہا ہے۔ [illegible] اشتیاق نواب پر عاشق ہو گیا ہو [illegible] نواب پر عاشق ہو جانے والی لڑکی کا کام ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ عاشق کی [illegible] اور کوئی [illegible] نہ ہو۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میرا یہ خیال بھی صحیح نہ تھا۔ اشتیاق نواب کو اپنا [illegible] سمجھتا تھا۔ اس پر فریفتہ تھا۔ جس طرح دوسروں کو [illegible] اور دوسروں کو کھلا کے [illegible] جیسے خوشی [illegible] اپنے [illegible] نواب کو منتقل کر دیا۔ ہمارے [illegible] کے لیے [illegible] نواب نے کام [illegible] بالکل ترک کر دیا۔ [illegible] کی طرح [illegible] اشتیاق [illegible] بیان کرنے میں بڑا مزا لیتا اور [illegible] منتقل [illegible] کر دیتا۔ [illegible] کے پیسے بھی خود دیتا۔ کبھی کبھی ایک آدھ قمیض شرٹ [illegible] اشتیاق کی تنخواہ [illegible] نواب [illegible] اپنی تنخواہ کی کچھ رقم بچا کے اپنی ماں کو [illegible] بھیجنے لگا۔

[illegible] اشتیاق کو [illegible] اپنی تنخواہ [illegible] اشتیاق پر اس کے کھانے کھلانے کا [illegible] اثر [illegible] ہوا۔

"[illegible] صاحب۔ [illegible]"

"[illegible] کیوں مرتا ہے۔"

"[illegible] صاحب۔" اشتیاق [illegible] جواب دیتا۔ "بھائی نہیں، بہن نہیں، ماں نہیں، باپ نہیں، سب [illegible]"

کچھ دنوں کے بعد نواب کی [illegible] نے نواب کے لیے ایک لڑکی ٹھیک کر لی تھی۔ [illegible] شادی تھی۔ [illegible] نواب [illegible] کے لیے تیار تھا

...ہیے نواب جاہیں ——— جانے کے لیے تیار ہو گیا ہم بھی اندر سے بہت خوش تھے کیونکہ نواب اب تو تقریباً مفت کی کماتا تھا۔ وہ سارا کام تو اشتیاق نے سنبھال لیا تھا۔ زرینہ نے بھی طے کر لیا تھا کہ نواب کے جانے کے بعد دوپہر کے کام کے لیے کسی کو نہ رکھے گی اشتیاق کی موجودگی میں کسی دوسرے نوکر کی ضرورت نہ تھی۔

زرینہ بولی: "دیکھ نواب کی شادی ہو رہی ہے اب تو بھی شادی کر لے اشتیاق میں تیری بیوی کو رکھ لوں گی مجھے ایک ملازمہ کی ضرورت ہے۔"

شادی کے نام پر میں نے دیکھا کہ اشتیاق کچھ چڑ سا گیا ہے۔ اس کی بھنویں تن گئیں۔ تنگ ماتھے پر بالوں کی لٹیں ڈھلنے لگیں اور ...کے پھولنے سے ہونٹ پھڑکنے لگے مگر وہ کچھ بولا نہیں۔ سر جھکا کر کھانے کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد نواب ...کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ آئی کھانے کی میز کے قریب آ کر بڑی رازداری سے بولا۔

"اے صاحب۔ یہ کیا شادی کرے گا اس کی بیوی تو شادی کے دوسرے دن ہی اسے چھوڑ کر بھاگ گئی تھی۔"

"کیوں؟" زرینہ نے پوچھا۔

"معلوم نہیں بیگم صاحب۔" نواب بولا۔ "یہ کچھ بتاتا تو ہے نہیں۔"

چند منٹ کے بعد جب ہم لوگ کھانا کھا کے صحن میں ہاتھ دھونے کے لیے آئے تو دیکھا کہ اشتیاق کچن میں میلے برتن اور راکھ کا ...ڈھیر اپنے سامنے رکھے خلا میں گھور رہا ہے اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں کسی نامعلوم جذبے سے جھلک کر ایک عجیب سی چمک ...میں مجھے پہلی بار اشتیاق میں دلچسپی پیدا ہوئی۔

آٹھ دس روز کے بعد نواب نے علی گڑھ واپس جانے کا پروگرام بنا لیا۔ اس کے جاتے ہی اشتیاق چپکے چپکے بہت رویا اس کی ...میں سرخ تھیں اور ہونٹوں کے کونے بے طرح پھڑکتے تھے مگر زبان سے اس نے کچھ نہیں کہا۔ اس نے نواب کے لیے سفر کا ناشتہ تیار ...حالانکہ صرف ساڑھے گھنٹے کا سفر تھا مگر قیمے کے پراٹھے اور سرخ مرچوں کا اچار، اور نواب کا محبوب اچار، چینی روٹی اور مکھن لا کر رکھ دی۔ وہ ...کی بھوک سے واقف تھا۔ خود اپنے خرچ سے اس نے نواب کا ناشتہ تیار کیا تھا اس سے زیادہ شاید بیٹا بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ خود نواب ...کے سوٹ کیس کرایا اس کا سامان سکوٹر میں رکھا اور اسے پرانی دلی کے سٹیشن پر گاڑی میں سوار کرا کے واپس آیا۔

وہ دن بھر اسی طرح مضطرب اور بے چین پھرتا رہا جیسے اس کا کوئی بہت اپنا ...

اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ ...اس کے جذبے کی حرارت تھا اور ... ایسا لگتا تھا جیسے ... پر ... کا ... پڑا ہو ... چلا گیا ...ا ... اور بے ڈھنگی اور ان پر چند حد ... کی دلکشی ہوتی۔ ... تو ... کسی ... طرح صبر کر کے کھانا زہر مار کیا اور یہ سوچ ... اگر معاملہ یونہی چلتا رہا تو اشتیاق کو جواب دینا پڑے گا۔

مگر دو دن کے بعد اشتیاق سنبھل گیا۔ کہیں سے وہ ایک بلی کا بچہ اٹھا لایا اور اب وہ بلی کا بچہ اشتیاق کی توجہ کا مرکز بن گیا ...وہ کام کرنے کے بعد وہ اپنا سارا وقت جو اس سے پہلے وہ نواب کو دیتا تھا اب بلی کے بچے پر صرف کرنے لگا۔ اور اپنی تنخواہ کا کافی حصہ بلی کے لیے دودھ اور گوشت پر خرچ کرنے لگا اور یوں دکھانے لگا کہ بلی کا بچہ نواب سے کچھ کم نہیں کھاتا تھا۔ اس نے مشو...

اندر سے بھی ذہن سے علم نہ تھے وہ اتنا ہی تڑپایا تھا اور ویسی ہی ادائیں دکھاتا تھا۔ دو ہی دنوں میں اشتیاق سنبھل گیا اور کام کے معیار بھی ٹھیک ہوتے ہوتے پھر اپنی پہلی اور اصلی حالت پر آگیا اور ہم لوگوں نے سکھ کا سانس لیا۔

اشتیاق کسی کام کو نہ [illegible] تھا [illegible] وہ اپنی دانست میں سب کچھ جانتا تھا۔ یہ کسی [illegible] کی عادت [illegible] جس قدر یہ احساس کہ مجھے یہ کام بھی کر کے دکھا دینا چاہیے۔ اسے اپنے ذاتی وقار کے تحفظ کا بہت خیال تھا اور ایک ایسے ہی کام کی [illegible] کے دل میں [illegible] کام [illegible] کرنے سے بے نیاز تھی۔ چاہے وہ [illegible] جانتا ہو یا نہ جانتا ہو۔ کئی دنوں سے ریڈیو خراب تھا اور میں چونکہ ریڈیو کا کام بھی [illegible] جانتا ہوں اس لیے [illegible] ریڈیو ٹھیک کرنے کے لیے [illegible] مگر دفتری [illegible] کے بعد [illegible] ہم دونوں اس قدر تھک جاتے ہیں کہ ریڈیو کو کھولنے اور ٹھیک کرنے کی ہمت کہاں سے لائیں؟ میں اس کام کو [illegible] ٹال رہا تھا

[illegible] اور اشتیاق عجب گھبرائی ہوئی حالت میں [illegible] میں نے [illegible] کے [illegible]

[illegible] اشتیاق [illegible] اس لیے میں نے اشتیاق کو [illegible]

[illegible]

[illegible] اور اشتیاق [illegible]

[illegible] ریڈیو ٹھیک [illegible] اشتیاق کو [illegible] مگر چند دنوں کے بعد پھر اشتیاق کی شامت آئی [illegible] کیا تم [illegible] سکتے ہو؟"

[illegible] اشتیاق [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] اشتیاق [illegible] قریب [illegible]

[illegible]

"جی۔ یہی خاکسار نے"، اشتیاق دروازہ سے لگ کر نظریں جھکا کر پاؤں سے فرش کو کُریدنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"بالکل بازار کے سے معلوم ہوتے ہیں!" زرینہ تعریف کرتے ہوئے بولی۔

"یہی تو ان کی خوبی ہے۔ میں نے کہا۔ "سیدھے بازار سے لائے گئے ہیں؟"

"جی نہیں" اشتیاق نے زور سے احتجاج کیا۔

اُس کے احتجاج کی شدت دیکھ کر زرینہ کا شبہ اور بڑھ گیا۔ بولی۔ "تو آج رات کو میرے سامنے رس گلے بناؤ۔ میں خود دیکھوں

"جی بہت اچھا۔"

اشتیاق نے رس گلوں کے سلسلے میں چند چیزوں کی فہرست پیش کی جو منظور کر دی گئی۔ دوپہر میں بہت دیر تک اشتیاق بازار ... سرِ شام زرینہ نے اُس کے کمرے کی تلاشی لی کہ کہیں وہ رس گلے بازار سے نہ لے آئے ہوں۔ رات کے کھانے کے بعد ... بڑے اہتمام سے رس گلے بنانے کا کاروبار کچن میں پھیلا دیا۔ زرینہ نے گھر کو اندر سے بند کر کے تالا لگا دیا تھا اور ہر چند رہ ... کے بعد کچن میں جھانک لیتی تھی۔ کوئی دو بجے کے قریب جب نیند کا غلبہ شدید ہونے لگا تو رس گلے تیار ہو گئے۔ اشتیاق ایک ... میں رس گلے لے کر آئے۔ کمانڈ کے مقطر شیرے میں فٹبال کی گیندوں سے بھی دو تہائی کم حجم کی سفید سفید گولیاں تیر رہی ...

زرینہ چیخی!

"... یہ رس گلے ہیں، بکری کی مینگنی کے برابر؟"

"ابھی چھوٹے ہیں! دیکھیے بیگم صاحب۔ یہ رس گلے ابھی چھوٹے ہیں مگر رات بھر شیرا پی کے صبح کو پھول کر پورا ... ہو جائیں گے۔"

اشتیاق نے کہا!

زرینہ کو یقین آیا نہ مجھے مگر نیند کا غلبہ شدید تھا اس لیے ہم سو گئے۔ صبح اٹھے تو ناشتے پر پورے بھرے بڑی گولائی کے سفید ... کے لانے کو شے۔ کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ رات کو گولیوں کے برابر تھے۔ رس گلے پھول کر اس قدر بڑے ہو گئے ... رات بھر کون جاگے، اور کون چوکیداری کرے، اشتیاق نے ضرور صبح کو بازار سے رس گلے خرید لائے ہوں گے اور رات کی ... گولیوں نے نالی میں بہا دیا ہو گا۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ جو شخص اپنے ذاتی وقار کی خاطر رات بھر جاگ سکتا ہے اور اپنی جیب ... سے ... خرید کر رس گلے کھلا سکتا ہے محض اپنی ذات کی اہمیت جتانے کے لیے، اُس سے اُلجھنا بے کار ہے۔

... بولتی کا بچہ بڑا ہوتا گیا، اشتیاق کا جذبہ ... اور بڑھتا گیا۔ وہ ہمارے سامنے ایک خوبصورت بلی صحن میں گھوم رہی تھی ... حسن کی طرح ... جو انسانی ... سرگوشی میں ... کرتی تھی اور جب گردن موڑ ... آنکھیں جھپکا کے اشتیاق کی طرف ... تو وہ بے چارہ دل تھام کے رہ جاتا۔ تھی بھی قیامت کی حرافہ۔ موٹی گول گوتھنی سی۔ کبھی دھیرے دھیرے مٹک مٹک کر چلتی ... اچھل کر دم اٹھاتی اور اشتیاق کے کندھے پر جا کے بیٹھ جاتی اور پیار سے اُس کی گردن چاٹنے لگتی۔ کبھی اُن

نگاہ بنی ہوئی پائنتی پر بیٹھ کر ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ دیتی کبھی اس کی بانہوں میں پڑی کا پھیل کر بیٹھ جاتی۔ عورت کی مکمل سپردگی کے بڑے انداز میں کبھو شریر تغافل و ادا سے کھیت ست انگڑائی لیتی اور جب اشتیاق اسے پکڑنا چاہتا تو بل کھا کر بھاگ نکلتی اور اشتیاق ایک عجب مسرت اور مسرت سے اس کی صورت دیکھنے لگتا۔ اشتیاق نے اس کا نام گلشن رکھا تھا مگر پیار کی حالت میں اسے صرف گلو کہہ کر پکارتا تھا۔

ایک دن بڑی فرصت میں اشتیاق نے زرینہ کے بیٹھک روم پر دستک دی۔

سردیوں کے دن تھے اس لیے زرینہ صبح ختم ہونے کے باوجود اپنے ناشتے کے بعد لمبی سی ایک سویٹر بُن رہی تھی۔

"کون ہے؟" زرینہ نے پوچھا۔

"میں ہوں اشتیاق"

"اندر آجاؤ" زرینہ بولی۔

کاغذ پنسل لیے ہوئے اشتیاق جھجکتے جھجکتے انتہائی مؤدب انداز میں دروازے سے لگ کر کھڑا ہوگیا پھر اس نے جھجکتے سے کاغذ اور پنسل آگے بڑھا دیا اور بولا

زرینہ بولی کیا حساب لائے ہو، ابھی نہیں بعد میں دیکھ لوں گی۔"

"حساب نہیں ہے۔"

"پھر کیا ہے؟"

"آپ لکھیے تو۔" اشتیاق ادب سے کاغذ اور پنسل آگے بڑھا رہا تھا۔ زرینہ نے کاغذ اور پنسل تھام کر ذرا سختی سے پوچھا۔

"تو لکھوں کیا؟"

"آپ غزل کے چند شعر لکھ دیں۔"

زرینہ چند لمحوں کے لیے چپ ہو گئی، لیکن پھر اس کے دل میں ہنسی کا چشمہ پھوٹنے لگا، مسکرا کر بولی۔

"تم خود نہیں لکھ سکتے؟"

"جی نہیں۔ میں نہ لکھ سکتا ہوں نہ پڑھ سکتا ہوں۔"

"مگر شعر کہہ سکتے ہو؟" زرینہ نے فقرہ کس دیا۔

"جی ہاں، البتہ کہہ سکتا ہوں۔ آپ لکھیے میں بولتا ہوں۔"

"لکھیے" زرینہ نے سنجیدہ ہو کر کہا

اشتیاق نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ایک عجب کیفیت کے عالم میں بولا۔

تمہارا میرا کام ہے گلشن تیرا نام ہے جو ہو سو ہو
ہم مرتے ہیں تجھ پر تو ڈرتی ہے کس سے۔ جو ہو سو ہو

"مگر اس کا مطلب کیا ہے؟" زرینہ نے پوچھا۔

"بحر؟" اشتیاق نے حیرت سے آنکھیں گھما کر پوچھا۔ "بہر حال غزل تو غزل ہے۔"

"مگر اس کا وزن؟" زرینہ نے پھر توجہ دلائی۔

"بڑی مذاقی غزل ہے بیگم صاحب۔ آپ سنیے تو" اشتیاق نے کمال دلجمعی سے کہا۔

بڑی مشکل سے زرینہ نے اپنی ہنسی روکی۔ بولی: "آگے چلیے۔"

اشتیاق نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور گہرے مراقبے میں جا کر بولے۔

تیری جدائی میں ہم نے ہم مست نگار جو ہو سو ہو۔
کہتا ہے تنہائی اب گلشن میں کون آیا جو ہو سو ہو۔

زرینہ نے پوچھا۔ "کہتا ہے تنہائی! مگر تنہائی تو مونث ہے!"

"مگر تنہائی تو میرا تخلص ہے اور میں مونث نہیں ہوں" اشتیاق نے سمجھایا۔

اس کے چہرے پر کچھ ایسی مسکراہٹ تھی جیسے وہ کہنا چاہتا ہو "اجی بیگم صاحب۔ یہ شعر و شاعری ہے آپ کیا جانیں۔"

"اور یہ مست نگار۔ کہاں کی ترکیب ہے تنہائی صاحب؟" زرینہ نے پھر پوچھا۔

"ہمارے مراد آباد میں ایسا ہی بولتے ہیں۔" اشتیاق نے جواب دیا۔

زرینہ نے ایک دم کاغذ پنسل بیڈروم کی کھڑکی سے باہر پھینک دیے۔ گرج کر بولی۔ "اشتیاق اگر آج کے بعد تو نے کبھی مجھے اناڑی شعر سنایا تو کھڑے کھڑے گھر سے باہر نکال دوں گی۔" اشتیاق نے کھسیا کر سر جھکایا، پھر سر کھجانے لگے۔ بے حد مجرم اور شرمندہ سے دکھائی دے رہے تھے۔ زرینہ کو اس پر رحم آگیا۔ نرم لہجہ میں مسکرا کر کہنے لگی۔

"میرے خیال میں اگر آپ شعر و شاعری چھوڑ کر ناول نگاری کی طرف توجہ کریں تو بہتر ہوگا۔"

ذرا سر اٹھا کر بولے۔ "ایک ناول بھی تیار کر رہا ہوں۔"

"کیا نام ہے اس ناول کا؟" زرینہ نے پوچھا۔

"وائف اینڈ کک۔" اشتیاق انگریزی میں بولے۔

اشتیاق کی انگریزی ایسی تھی جیسے پرانے زمانے میں ان بادرچیوں کی ہوا کرتی تھی جو انگریزوں کے پاس کام کرتے تھے یا آج کے مزدوروں کی جو ان پڑھ ہونے کے باوجود ٹیکنیکل دھندوں میں پڑ جاتے ہیں۔ یہ انگریزی بڑی مختصر اور جامع ہوتی ہے اور بالعموم گرامر کی محتاج نہیں ہوتی مگر اپنا مفہوم ادا کرنے میں اس انگریزی سے کہیں بہتر ہوتی ہے جسے آج کل کے طالب علم میٹرک تک پڑھتے ہیں۔

ایک دن جب اشتیاق میرے سر کی چمپی سے فارغ ہو چکا تو میں نے اس سے کہا۔ "تم اتنے ڈھیر سارے دھندے جانتے ہو، اگر تم کسی ایک دھندے کو پکڑ کر بیٹھ جاتے تو غالباً بہت ترقی کر جاتے۔"

"صاحب! میرا کسی کام میں زیادہ دیر تک جی نہیں لگتا۔" اشتیاق ایک عجیب لہجے سے تولیہ سے اپنے ہاتھ صاف کرتے

کمرہ بنی ہوئی پائنتی پر بیٹھ کر دھوپ کا مزہ لیتی کبھی اُس کی بانہوں میں اُون کا گولا لپیٹ جاتی۔ عورت کی مکمل سپردگی کے ساتھ لیکن کبھی شریر تنافر ادا سے ایک ہی سمت اکڑ جاتی اور جب اشتیاق اُسے پکڑنا چاہتا تو بھاگ کر جا کھڑی ہوتی اور اشتیاق ایک عجب مسرت اور حسرت سے اُس کی طرف دیکھنے لگتا۔ اشتیاق نے اس کا نام گلشن رکھا تھا مگر پیار کی گھڑیوں میں اُسے صرف گل کہہ کر پکارتا تھا۔

ایک دن دوپہری فرصت میں اشتیاق نے زرینہ کے بیڈ روم پر دستک دی۔

سردیوں کے دن تھے، اس لیے زرینہ کام ختم ہونے کے باوجود اپنے نائٹ گاؤن میں ملبوس ایک سوئیٹر بُن رہی تھی۔

"کون ہے؟" زرینہ نے پوچھا۔

"میں ہوں اشتیاق"

"اندر آ جاؤ" زرینہ بولی۔

کاغذ پنسل لیے ہوئے اشتیاق جھجکتے جھجکتے انتہائی مؤدب انداز میں دروازہ سے لگ کر کھڑا ہو گیا پھر اُس نے جھجکتے سے کاغذ اور پنسل آگے بڑھا دیا اور بولا،

زرینہ بولی۔ کیا کل کا حساب ہے، ابھی نہیں بعد میں دیکھ لوں گی۔"

"حساب نہیں ہے۔"

"پھر کیا ہے؟"

"آپ پڑھیے تو۔" اشتیاق بار بار کاغذ اور پنسل آگے بڑھا رہا تھا۔ زرینہ نے کاغذ اور پنسل تھام کر ذرا سختی سے پوچھا۔

"آخر ہے کیا؟"

"آپ غزل کی بہت شوقین ہیں۔"

زرینہ چند لمحوں کے لیے سوچتی رہ گئی پھر اُس کے دل میں ہنسی پھوٹنے لگی، مسکرا کر بولی۔

"تم خود نہیں لکھ سکتے؟"

"جی نہیں۔ میں نہ لکھ سکتا ہوں نہ پڑھ سکتا ہوں۔"

"مگر شعر کہہ سکتے ہو؟" زرینہ نے فقرہ کسا۔

"جی ہاں بالکل کہہ سکتا ہوں، آپ لکھیے میں بولتا ہوں۔"

"لکھیے"۔ زرینہ نے تیار ہو کر کہا

اشتیاق نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ایک عجب کیفیت کے عالم میں بولا۔

تنہائی میں ایک کام ہے گلشن تیرا نام ہے جو ہو سو ہو۔
ہم مرتے ہیں تجھ پر تو ڈرتی ہے کس سے، جو ہو سو ہو۔

"مگر اس کا مطلب کیا ہے؟" زرینہ نے پوچھا۔

"بحر؟" اشتیاق نے حیرت سے آنکھیں کھول کر پوچھا۔ "بہرحال غزل تو غزل ہے۔"

"مگر اس کا وزن؟" زرینہ نے پھر توجہ دلائی۔

"بڑی وزنی غزل ہے بیگم صاحب۔ آپ سنیے تو۔" اشتیاق نے کمال دلجمعی سے کہا۔

بڑی مشکل سے زرینہ نے اپنی ہنسی روکی۔ بولی: "آگے چلیے۔"

اشتیاق نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور گہرے مراقبے میں جا کر بولے

تیری جدائی میں ہوئے ہم مست فگار جو ہو سو ہو۔
کہتا ہے تنہائی اب گلشن میں کون آیا جو ہو سو ہو۔

زرینہ نے پوچھا۔ "کہتا ہے تنہائی! مگر تنہائی تو مونث ہے!"

"مگر تنہائی تو میرا تخلص ہے اور میں مونث نہیں ہوں۔" اشتیاق نے سمجھایا۔

اس کے چہرے پر کچھ ایسی مسکراہٹ تھی جیسے وہ کہنا چاہتا ہو "اجی بیگم صاحب۔ یہ شعر و شاعری ہے آپ کیا جانیں۔"

"اور یہ مست فگار۔ کہاں کی ترکیب ہے تنہائی صاحب۔" زرینہ نے پھر پوچھا۔

"ہمارے مراد آباد میں ایسا ہی بولتے ہیں۔" اشتیاق نے جواب دیا۔

زرینہ نے ایک دم کاغذ پنسل بیڈ روم کی کھڑکی سے باہر پھینک دیے۔ گرج کر بولی۔ "اشتیاق اگر آج کے بعد تو نے کبھی مجھے بیہودہ شعر سنایا تو کھڑے کھڑے گھر سے باہر نکال دوں گی۔" اشتیاق نے کھسیا کر سر جھکا لیا، پھر سر کھجانے لگے۔ بے حد مجرم اور نروس سے دکھائی دے رہے تھے۔ زرینہ کو اس پر رحم آ گیا۔ نرم لہجے میں مسکرا کر کہنے لگی۔

"میرے خیال میں اگر آپ شعر و شاعری چھوڑ کر ناول نگاری کی طرف توجہ کریں تو بہتر ہوگا۔"

ذرا سر اٹھا کر بولے۔ "ایک ناول بھی تیار کر رہا ہوں۔"

"کیا نام ہے اس ناول کا؟" زرینہ نے پوچھا۔

"وائف اینڈ لک۔" اشتیاق انگریزی میں بولے۔

اشتیاق کی انگریزی ایسی تھی جیسے پرانے زمانے میں ان باورچیوں کی ہوا کرتی تھی جو انگریزوں کے پاس کام کرتے تھے یا آج کے ان مزدوروں کی جو ان پڑھ ہونے کے باوجود ٹیکنیکل دھندوں میں پڑ جاتے ہیں۔ یہ انگریزی بڑی مختصر اور جامع ہوتی ہے اور بالعموم گرامر کی محتاج نہیں ہوتی مگر اپنا مفہوم ادا کرنے میں اس انگریزی سے کہیں بہتر ہوتی ہے جسے آج کل کے طالب علم میٹرک تک پڑھتے ہیں۔

ایک دن جب اشتیاق میرے سر کی چمپی سے فارغ ہو چکا تو میں نے اس سے کہا۔ "تم اتنے ڈھیر سارے دھندے کرتے ہو۔ اگر تم کسی ایک دھندے کو پکڑ کر بیٹھ جاتے تو غالباً بہت ترقی کر جاتے۔"

"صاحب! میرا کسی کام میں زیادہ دیر تک جی نہیں لگتا۔" اشتیاق ایک میلے سے تولیے سے اپنے ہاتھ صاف کرتے

ہوتے ہوا۔ [illegible] ایک [illegible] میں [illegible] زندگی کے [illegible] ہیں۔ ابھی [illegible] گزر جائے گی :

"تو تم کسی ایک دفعہ میں بھی کیوں نہیں سنبھالتے۔" میں نے پوچھا ؛

"جی نہیں سنبھالتا۔" اشتیاق سر جھکا کر کسی اقبالی مجرم کی طرح شرمندہ ہو کے کہا۔

"میرا سینہ ہر وقت خالی خالی سا رہتا ہے۔"

"میاؤں۔"

دروازہ پر مُنّو تشریف لائیں اور دم اُٹھائے بڑی بڑی آنکھوں سے اشتیاق کی طرف دیکھنے لگی۔ اشتیاق نے اسے گود میں اُٹھالیا اور اس کے بالوں پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "مُنّو بچو کے لیے دودھ لے آؤں؟"

"میاؤں۔"

اشتیاق پر کبھی کبھی ذہنی غشی کے لمبے لمبے دورے پڑتے تھے۔ جب وہ گھنٹوں اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا کہیں غائب رہتا۔ جانے کہاں رہتا ہے۔ خود ہی مسکراتا ہے خود ہی گھورتا ہے خود ہی ہنسنے لگتا ہے۔ کبھی کبھی منہ میں بڑبڑانے لگتا ہے۔ لب کانپتے ہیں۔ اس پر وہ کون سا رب ہے جو اُسے اندر ہی اندر کھائے جاتا ہے۔ کون جانے۔ کچھ بتاتا تو ہے نہیں۔ کبھی کبھی نشہ بھی کرتا ہے۔ قیاس غالب ہے کہ جب دل کی گھٹن اور سینے کا سُونا پن حد سے گزرنے لگتا ہے تو کوئی نشہ ضرور کرتا ہے۔ کیونکہ مہینے میں ایک دو دن ایسے آتے ہیں جب اشتیاق کوئی کام نہیں کر سکتا۔ سارا دن تقریباً نیم غشی کی حالت میں اپنی چارپائی پر پڑا رہتا ہے اور اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چلتا رہتا ہے اور دو دن کے بعد جب وہ ہوش میں آتا ہے تو اصرار کرتا ہے کہ نہ وہ بیمار ہوا ہے نہ اس نے کوئی نشہ کیا ہے اور ہم بھی اس لیے چپ رہتے ہیں کہ اپنا کام بہت اچھا کرتا ہے۔ [illegible] اپنے کام کا اور فنکاروں کے دماغ کی ایک [illegible] ہوتی ہے۔ یہ سب جانتے ہیں

اس لیے کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس سے کہا حیدرآبادی بیگن بنائے اور وہ لے آیا کچھ عجیب سی ڈش — جس میں شوربہ پانی کی طرح پتلا تھا اور اس کے اندر بیگن کے کالے کالے ٹکڑے [illegible] جونکوں کی طرح تیر رہے تھے۔

"یہ حیدرآبادی بیگن ہیں؟" زرینہ چیخ کر پوچھتی ہے۔

"جی نہیں یہ چائنا ڈش ہے۔" اشتیاق کہتا ہے۔ "بالکل نئی ڈش ہے کھا کے دیکھیے۔ بیگم صاحبہ بالکل نیا مزہ ہے۔"

"اُٹھا کے لے جا ابھی یہاں سے ورنہ تیرے سر پہ دے ماروں گی!" میں تسلیم کرتا ہوں کیونکہ مجھے تو اس ڈش کو دیکھ کر ہی متلی ہونے لگی تھی۔

اس وقت تو اشتیاق ڈش اُٹھا کے لے گیا مگر بعد میں اُس نے زرینہ سے کہا۔ "صاحب لوگ کیسی ناانصافی کرتے ہیں، چکھے بغیر پاس کر دیتے ہیں کھانے کو۔"

اشتیاق مرغی قیمہ بہت عمدہ پکاتا ہے۔ ایک دفعہ گھر پر مخصوص مہمانوں کی دعوت تھی۔ اشتیاق سے مرغ قیمہ پکانے کو کہا

گئی۔ جب دسترخوان بچھا تو بہت سی دوسری چیزوں کے ایک نہایت بدبودار اور سڑی ہوئی ڈش سامنے آئی۔

"یہ مرغی قیمہ ہے؟" زرینہ نے حیرت سے پوچھا۔

"جی نہیں۔" اشتیاق فوراً بولے۔ "یہ پیسٹ ہے۔"

"پیسٹ کیا؟ تمہیں تو مرغی قیمہ تیار کرنے کو کہا تھا، کہا تھا کہ نہیں؟" زرینہ خفا ہو کے بولی۔

"جی۔ مرغی قیمہ بگڑ گیا۔ اس لیے میں نے نئی ڈش تیار کر دی۔" اشتیاق کی یہ عادت اب ہمیں معلوم ہو چکی ہے کہ جب کوئی سالن بگڑ جاتا ہے وہ فوراً اسے کوئی نیا نام دے کر دسترخوان پر پیش کر دیتے ہیں اور ڈش کے بگڑنے کا یوں تذکرہ کرتے ہیں جیسے کبھی خدا ان کا لاڈلا خود بخود بگڑ بیٹھے اور اس کے بگاڑنے میں ان کا کوئی ہاتھ نہ ہو۔

سبکیا کہیں۔ چند ایسے مہمانوں کی دعوت تھی جن کے سامنے میں بے تکلف نہ ہو سکتا تھا ورنہ آج میرا ارادہ اشتیاق سے بے تکلف ہونے کا تھا۔ گھر مہمان موجود تھے اور دوسرے سالن بے حد عمدہ تھے اس لیے خاموش رہ جانا پڑا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد ہم اپنے مہمانوں کے ساتھ کرسٹنی شو دیکھنے چلے گئے اور چلتے چلتے زرینہ نے اشتیاق کو رات کے کھانے کے متعلق ہدایات دے دیں۔ سینما شو دیکھ کر جب ہم شام کو واپس آئے تو دیکھا کہ گھر کے باہر فائر بریگیڈ کھڑا ہے۔ بہت سے لوگ جمع ہیں اور کچن کی چمنی اور چھت اور کھڑکیوں سے دھوئیں کے بادل اٹھ رہے ہیں۔

"آگ۔ آگ میرا گھر بچاؤ۔" سینٹ لارڈ زور زور سے چیخ رہا تھا۔

"اشتیاق کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کیا معلوم؟" سینٹ لارڈ اپنے سر کے بال نوچتے ہوئے بولا۔ "ایک گھنٹے سے چیخ رہا ہوں دروازہ ہی نہیں کھلتا اندر کچن میں شاید نشہ کر کے بے ہوش پڑا ہے۔"

میں نے اور زرینہ نے۔ دونوں نے چلا چلا کر اشتیاق سے دروازہ کھلوایا۔

اشتیاق بے حد حیرت زدہ کچن سے نکلے اور دھواں دیکھ کر پلٹے اور کچن کی دونوں انگیٹھیوں پر پانی ڈال کر بجھانے لگے۔ دونوں انگیٹھیوں کے سالن جل چکے تھے۔ مگر خدا جانے ان میں اس نے کون سا مسالہ ڈالا تھا کہ دھوئیں کے گہرے سیاہ بادل اب تک انگیٹھیوں سے اٹھ رہے تھے۔

"آگ آگ" سینٹ لارڈ غصے سے چیخ رہا تھا۔

"کدھر ہے آگ؟" اشتیاق حیرت سے پوچھنے لگے۔

زرینہ بولی۔ "یہ بے چارے ایک گھنٹے سے چیخ رہے ہیں دروازہ پیٹ رہے ہیں اور تمہیں کچھ پتہ ہی نہیں۔ فائر بریگیڈ تک آ گیا اور تم کچن کا دروازہ بند کیے غافل بیٹھے ہو۔"

اشتیاق سب لوگوں کو متوجہ دیکھ کر کچھ جھینپے۔ شرمندہ ہو کر سر کھجانے لگے۔ ایک انگلی اپنی کھوپڑی پر رکھ کر بولے۔

"بحث چل رہی تھی۔"

"کیسی بحث؟" زرینہ پوچھنے لگی۔ "تم تو یہاں اکیلے بیٹھے تھے۔"

"کرشمہ مقدمہ تھا۔"

"کیسا مقدمہ؟"

"اپنی عدالت کا مقدمہ تھا میرے اور بھائی حنیف کے درمیان، وکیل استغاثہ اور وکیل صفائی میں بحث ہو رہی تھی۔"

"کیسے وکیل استغاثہ اور وکیل صفائی؟" زرینہ کے غصے کا پارہ چڑھنے لگا۔ "میں خود دونوں طرف سے وکیل ہوں، خود ہی گواہ ہوں، خود ہی مدعی، خود ہی مدعا علیہ، خود ہی بحث کرتا تھا، خود ہی جواب دیتا تھا۔" اشتیاق نے بتایا۔

"مگر کہاں بحث چل رہی تھی؟" زرینہ نے دانت پیس کر پوچھا۔

"یہاں۔" اشتیاق نے اپنی کھوپڑی پر انگلی رکھ کر کہا اور سر جھکا لیا۔

زرینہ کا دل اشتیاق سے بجھنے لگا۔ میری بھی، محمد اور بچے ہونے کے باوجود اس کی خامیاں اب جلد ہی ثابت ہونے لگیں۔ ادھر اشتیاق سے زیادہ اس کی بلی پنکش نے مجھے عاجز کر دیا۔ میں دراصل اشتیاق کی وجہ سے اس سے بے اعتنائی برتتا تھا کیونکہ اشتیاق نہیں چاہتا تھا کہ اس کے سوا کوئی دوسرا اس کی بلی پر توجہ دے۔ مگر غالباً پنکش کو یہ بات پسند نہ تھی وہ مجھے بھی اپنے چاہنے والوں کی فہرست میں شامل کرنے پر مصر تھی۔ وہ ایک بار وہ میرے کمرے میں ٹہلتی ہوئی آئیں مگر میں نے کوشش کر کے بھگا دیا۔ پھر میری غیر حاضری میں ایک بار وہ میرے بستر پر چڑھ کے سو گئیں۔ دراصل سوئی نہیں، میرے کا بائیکاٹ کر رہی تھیں۔ وقت بھی پنکش نے وہ چنا تھا جب میں دفتر سے آنے والا تھا۔ منشا یہ تھا کہ دیکھو ہم تو تمہارے بستر پر چڑھ کے سوئیں گے اور اگر تم نے برداشت کر لی تو دوسری بار تمہارے تکیے پر چڑھ کے سوئیں گے۔ یعنی میں جس قدر بے اعتنائی دکھاتا تھا اسی قدر وہ مجھے اپنے قریب لانے پر مصر تھیں۔ اسی وقت میں نے جو انہیں بستر پر سوتے ہوئے دیکھا تو غصے میں آ کر انہیں دم سے پکڑا اور بستر سے نیچے پھینک دیا۔ بے حد خفا ہو کر غرائیں اور پھر کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ مگر اس کا بدلہ پنکش نے یوں لیا کہ دوسرے دن دفتر سے جو آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے کمرے میں کمبل کی ریشمی ڈوری کے دونوں پھندے ادھڑے پڑے ہیں اور پنکش انہیں پنجے مار مار کر نوچ رہی ہے اور کمبل کو ہوا میں اڑا رہی ہے۔

میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ جھپٹا مارنے کے لیے آگے بڑھا تو پنکش چھلانگ لگا کر دروازے سے باہر۔ اور بلی چیخنے لگی: میاؤں، میاؤں۔ مگر آج میں نے بھی قسم کھا لی تھی۔ آج میں اس حرام زادی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے صحن کا دروازہ بند کر دیا اور ڈرائنگ روم سے بیڈ روم اور ڈائننگ روم سے کچن، کچن سے باتھ روم، تمام پنکش کے پیچھے پیچھے بھاگ کر آخر میں نے اسے پکڑ لیا اور دونوں ہاتھوں سے دبا کر اسے گھر سے باہر لے چلا۔ اشتیاق سہما ہوا میرے پیچھے پیچھے آنے لگا مگر میرے غصے کو دیکھ کر منہ سے کچھ بول نہیں رہا تھا۔ صرف اس کے ہونٹوں کے کنارے پھڑک رہے تھے۔

بڑی سڑک پر آ کر میں ایک کنارے پر کھڑا ہو گیا۔ اس سڑک پر کئی کوڑے اور گڑھے تھے اور اس پر دن رات مال ٹرک گھوما کرتے ہوئے گزرتے تھے۔ میں نے ایک ٹرک کو قریب آتے ہوئے دیکھ کر بلی پنکش کو زور سے گھمایا اور نشانہ باندھ کر گزرتے ہوئے ٹرک کے نیچے پھینک دیا۔ اشتیاق کے گلے سے ایک گھٹی گھٹی ہوئی چیخ نکلی۔

اک موٹر پاس سے گزر گئی چند لمحوں تک ایسا محسوس ہوا جیسے گلشن سڑک پر پس کر رہ گئی ہے — پھر یکایک وہ چونک کر کھڑی ہوئیں اور بجلی کی سرعت سے چھلانگ لگا کر سڑک کو پار کرتی ہوئی مخالف سمت چلی گئیں۔ وہ ایک بار اُس نے پلٹ کر ہماری طرف دیکھا مگر ادھر ہمارے گھر کی طرف آنے کی بجائے وہ مخالف سمت ہی دوڑتی چلی گئی اور پھر کبھی ہمارے گھر نہیں آئی۔

تین دن تک اشتیاق نے انتظار کیا مگر گلشن کہیں نظر نہیں آئی۔ چوتھے دن اُس نے سامان باندھ لیا اور بولا "صاحب میرا حساب کر دیجیے میں جانا چاہتا ہوں۔"

"کیوں۔ تمہیں یہاں کیا تکلیف ہے؟" زرینہ نے پوچھا!

اشتیاق نے مجھ سے آنکھیں چرا کے زرینہ سے کہا "بیگم صاحب جس طرح صاحب نے میری بلی کے ساتھ سلوک کیا ہے وہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔"

"اور وہ جو تمہاری بلی نے میرے چالیس روپے کے دو قیمتی تکیے پھاڑ ڈالے ہیں اس کا ہرجانہ کون دے گا؟" میں نے غصے سے بلند آواز میں کہا۔

زرینہ معاملے کو سلجھانے کے خیال سے بولی۔ "ارے ایک بلی کی وجہ سے لگی لگائی نوکری چھوڑتا ہے۔ میں تجھے ایسی ایسی دس بلیاں لا دوں گی۔"

"نہیں۔ وہ تو میری گلشن تھی" اشتیاق کی آواز کمزور ہو کر لرزنے لگی جیسے وہ ابھی رو دے گا۔

"ارے گلشن تھی تو زمرد کر لیں جو نام چاہے رکھ لینا۔" میں نے بھی اُسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "سینکڑوں بلیاں گھومتی ہیں اس علاقہ میں۔"

اشتیاق نے پھر نظریں چرا کر مجھ سے رُخ موڑ کر زرینہ کی طرف دیکھا۔ بولا!

"مجھے صاحب سے ڈر لگتا ہے اب تو۔"

"کیوں؟" زرینہ نے پوچھا۔

"جب صاحب نے گلشن کو اٹھا کر سڑک پر پھینک دیا تو مجھے ان کا چہرہ بالکل اپنے باپ کی طرح نظر آیا۔"

"اپنے باپ کی طرح! کیا بکتے ہو؟" زرینہ غصّے سے بولی۔

اشتیاق نے ایک دو لمحہ توقف کیا پھر گمبھیر لہجے میں کہنے لگا۔ "اسی طرح میرے باپ نے ایک دن نشہ کی حالت میں مجھے گھر سے لا کر باہر سڑک پر پھینک دیا تھا۔ اس وقت میری عمر صرف چار سال کی تھی میں یقیناً مر جاتا مگر سڑک پر جہاں میں گرا اس پر ایک بڑا سا گڑھا تھا اور میں اُس گڑھے سے باہر نہیں نکل سکا اور رات کا وقت تھا اور دو ایک ٹرک پاس سے پرے سے گزر گئے پھر شاید میں بے ہوش ہو گیا میری ماں دو ہتڑ مار کر چیخنے لگی۔ یکایک میرے باپ کو ہوش آ گیا اور وہ بھاگا بھاگا آیا اور سڑک کے گڑھے سے مجھے اُٹھا کر اپنے سینے سے لگا کے گھر لے گیا اور وہ میرا مُنہ چومتا تھا اور زور زور سے روتا تھا اور کبھی میری ماں مجھے اُس سے چھین کر اپنے سینے سے لگا لیتی تھی اور کبھی میرا باپ مجھے میری ماں سے لے کر اپنی چھاتی سے لگا لیتا تھا۔ مگر میں اس کا وہ چہرہ کبھی نہیں بھول سکا جب

اس نے مجھے غصے میں اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر سڑک پر پھینک دیا تھا۔ اصل میں ایسا ہی ہونا اس وقت مناسب تھا۔ اس لیے میرا مطلب ہے کہ وہ یہاں نہیں رہو گے۔"

اشتیاق میرے پاس آ کر ہاتھ ملانے لگا۔ جیسے اپنی گستاخی کی مجھ سے معافی مانگ رہا ہو۔

زرینہ نے اس کا حساب کر دیا۔

تین سال کے بعد جب ہمارا تبادلہ بمبئی میں ہو گیا تو وہ ہمیں بمبئی میں ملا۔ ہمیں ایک گھر کی تلاش تھی اور اشتیاق ایک ہاؤس ایجنٹ تھا اور اس کا اسسٹنٹ ایک واکرانی تھا۔ اور وہ سندھی تھا اور سندھی زبان وہ بہت روانی سے بولتا تھا۔ وہ کھدر کا پاجامہ اور کھدر کا ایک لمبا کرتہ پہنتا تھا۔ اور سچی خدمت میں کسی سنتر کمپنی کا کارکن بنا معلوم ہوتا تھا۔

"یہ کیا ڈھنگ ہے تمہارے یہاں پر؟" زرینہ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر اس سے پوچھا۔

"ادھر ـــــ بس ـــــ بڑے نمک کا اگلا دھندا سندھی لوگ کے پاس ہے اس لیے ہم بھی سندھی ہو گیا ہے بیگم صاحب! کیا کریں پیٹ روٹی اٹھانا ہے۔"

"کوئی بیوی بال بچہ ہے ادھر بھی؟" میں نے اس سے پوچھا۔

وہ شرمندہ سا ہو گیا آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ "صاحب ادھر بمبئی میں زندہ رہنا بھی مشکل ہے ـــ ایک ایرانی ہوٹل کے مالک نے ترس کھا کر میرا ٹرنک اور بستر اپنے باورچی خانہ میں رکھنے کی اجازت دے دی ہے رات کو اس کی دوکان کے سامنے پڑ رہتا ہوں۔ صبح گیارہ بجے تک اس کی دوکان میں سرے بناتا ہوں۔ پھر سامنے اس ماکی جانی کے دفتر میں جاتا ہوں۔"

"یہ ماکی جانی کون ہے؟" زرینہ نے پوچھا۔

"اصل میں ہاؤس ایجنٹ تو وہی ہے۔ میں اس کا دوسرا اسسٹنٹ ہوں۔"

"تم کو کیا ملتا ہے؟"

"کمیشن ملتا ہے۔"

"کتنا؟"

"ماکی جانی کو ٹوٹل فائیو پرسنٹ ملتا ہے۔ پہلے اسسٹنٹ کو فائیو پرسنٹ ملتا ہے۔" اشتیاق انگریزی بگھارنے لگے: "ہم کو ون پرسنٹ!"

"ون پرسنٹ؟" زرینہ نے پوچھا۔ "ون پرسنٹ آف واٹ! One percent of what!"

اشتیاق بولے۔ "ون پرسنٹ آف دی فائیو پرسنٹ آف دی ٹوٹل فائیو پرسنٹ آف دی ہنڈرڈ پرسنٹ!"

زرینہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی۔ اشتیاق خود بھی بے حد محظوظ ہوئے۔ آخر جب زرینہ نے کسی طرح سے اپنی ہنسی پر قابو پایا تو بولے۔

"آپ کو ایک فلیٹ دے سکتا ہوں۔"

"کیسا ہے وہ فلیٹ ؟"

اشتیاق اُنگلی پر گنواتے ہوئے بولے: "ون بیڈ رُوم، ون باتھ روم، ون بیٹھک رُوم مع ون کچن، ون ہال اینڈ سیپرٹیں۔"

"یہ and Separaters کیا بلا ہے ؟" زرینہ نے پُوچھا۔

"یس اینڈ سیپرٹیں!" اشتیاق نے اس طرح حیرت سے زرینہ کی طرف دیکھا۔ گویا کہہ رہا ہو۔ ایم اے کرنے کے باوجود اتنی معمولی سی انگریزی نہیں سمجھ سکتیں آپ ؟

"اینڈ سیپرٹیں ؟ بیگم صاحب" اشتیاق نے پھر سمجھایا۔

زرینہ نے یکایک سمجھ کر کہا۔ "اچھا تمہارا مطلب ہے آل Separate یعنی ہر کمرہ دُوسرے سے الگ ہے۔"

"یس اینڈ سیپرٹیں۔" اشتیاق کے چہرے پر احساسِ برتری کی ایسی جھلک آئی گویا کہہ رہا ہو۔ اتنی دیر سے بات آپ کی سمجھ میں آئی ہے۔

زرینہ پھر ہنسنے لگی۔ میں نے بات ٹالنے کی غرض سے کہا "اور بھی کچھ کام کرتے ہو ؟"

"جی ہاں۔ ایک ڈرتھ پیٹ تیار کیا ہے۔ میری ڈرتھ پیٹ۔"

"یہ میری کون ہے۔" زرینہ نے چونک کر پُوچھا۔

شرما کر بولے۔ "ایک چھوکری ہے!"

"تمہاری منگیتر ؟"

"جی نہیں" سر جھکا کر بولے: "ہمارے ہوٹل میں ایک عیسائی بڑھیا کام کرتی ہے اُس کی چھوکری ہے۔ کوکن کے گاؤں میں بڈھی رہتی ہے اُس کی شادی بنانا ہے۔"

"تمہارے سنگ ؟" زرینہ نے خوش ہو کر پُوچھا۔

"نہیں کسی عیسائی چھوکرے کے سنگ۔ ایلفرڈ اس کا نام ہے وہ بھی اُدھر کوکن کے گاؤں میں رہتا ہے مگر بڈھی بہت غریب ہے اس کے پاس پیسہ نہیں ہے اس لیے ہم نے میری ڈرتھ پیٹ نکالا ہے اور اس کو شام کے شام میں بیچتا ہے اور اس کا پیسہ اس بڈھی کو دیتا ہے۔"

"اور اپنی چھوکری کی شادی تمہارے سنگ کیوں نہیں کرتے ؟" زرینہ نے بے ساختہ ہو کر پُوچھا۔

یکایک اشتیاق سٹپٹا گیا اس کی آنکھوں کی پتلیاں جلدی جلدی گھومنے لگیں اس کے ہونٹوں کے کونے تیزی سے پھڑکنے لگے اور کان اور بھی اندر کو دھنس گئے اور اس کا چہرہ ایک میلی کالی کھردری کی طرح نظر آنے لگا جس پر حرف کمال بھی کمال سے ہو۔

مجھے اس کرد کے پر بہت رحم آیا وہ اس وقت زرینہ سے نظریں چرا کر نیم وا دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے باہر والی طرف سے کوئی یہاں پر آکر چھپ رہا ہو اس کے یہاں نکلنے کا کہیں کوئی راستہ نہ ہو۔

میں نے جلدی سے بات کا رُخ بدلتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"شعر و شاعری جاری ہے؟"

اُس نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"اب تو ایک فلم کی کہانی لکھ رہا ہوں۔" اشتیاق نے ذرا فخر سے اعلان کیا وہ اب اپنی گھبراہٹ پر قابو پا چکا تھا۔

"ہیرو کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اشتیاق!" اپنا نام لے کر ہنسے۔ "ڈبل رول ہے اشتیاق کا اس فلم میں۔"

"اور ولن کون ہے؟" زرینہ نے پوچھا۔

"شاید دلیپ کمار نبھا جائے!" اشتیاق سر پر ہاتھ رکھ کر ہنسے۔ "ولین کا رول بہت مشکل ہے۔"

زرینہ نے ہنسی روکنے کے لیے اپنے منہ میں دوپٹہ ٹھونس لیا۔

"اور ہیروئن؟" میں نے پوچھا۔

"فلم انڈسٹری میں تو کوئی ہے نہیں۔" اشتیاق سنجیدہ ہو کر بولے۔ "باہر دیکھ رہا ہوں۔"

"فلم انڈسٹری میں کوئی نہیں ہے۔" میں نے پوچھا جیسے اُس کا انگریزی فقرہ میں نے دہرا کر پوچھا۔

"Not even one percent of the five percent of the twenty five percent of the hundred percent ?"

"نو سر۔" اشتیاق نے سر ہلا کر کہا۔

"تو اس فلم کے گانے کون لکھے گا؟ تم نے تو شاعری ترک کر دی ہے۔"

"ہاں!" اشتیاق اپنے ہاتھ کے ایک ناخن کو دوسرے ناخن سے کریدتے ہوئے بولے۔ "شاعری تو چھوڑ دی ہے مگر اس فلم کے گانے تو میں ہی لکھوں گا۔ ایک گانا لکھا ہے . . . "

"کیا؟"

نگاہیں نیچی کیے آنکھوں کے کونوں سے ڈرتے ڈرتے چرانا ہوں سے زرینہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ "صاحب بات یہ ہے کہ غزل سے ہم کو حکیم صاحب نے بہت ڈرا دیا تھا کہ اس کا وزن بہت بڑا ہوتا ہے اس لیے ہم نے غزل کو چھوڑ دیا مگر گیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا وزن بہت ہلکا ہوتا ہے۔ کیا سب کو پتہ ہے ہم نے کئی ٹکڑے جوڑتے ہیں اور پیانو پر میوزک ہوتا ہے۔ اس ہم نے ایک فلمی گیت شروع کیا ہے۔ اس طرح پہلا مصرع ہے ٹوٹنے والا۔

"تو سناؤ" میں نے بے چین ہو کر کہا۔
اشتیاق نے کھنکار کے گلا صاف کیا۔
"او صنم! او صنم!
میں نے لیا۔
الّو کا جنم۔
او صنم۔
تیرے لیے۔"

زرینہ کی بُری حالت تھی۔ مُنہ میں دوپٹہ ٹھونستے ہوئے اس کا چہرہ لال ہوتا جا رہا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنی ہنسی روکی اور اس سے پوچھا۔

"مگر الّو کا جنم کیوں اشتیاق؟" روکنے کے باوجود میری ہنسی میرے سوال سے باہر چھلکی پڑ رہی تھی۔

"الّو کا جنم اس لیے صاحب" اشتیاق نے گہری سنجیدگی سے کہا کہ اشتیاق کو یعنی نظم کے ہیرو کو رات میں نیند نہیں آتی ہے ہیروئن کے ... دن میں ..... ہیروئن کے فراق میں رات رات بھر جاگتا ہے اور الّو بھی رات کو جاگتا ہے اس لیے ..... بات کو ذرا سوچیے۔ کیا گہری حقیقت بیان کیا ہوں۔"

"ارے الّو کے پٹھے!" زرینہ نے دوپٹہ مُنہ سے نکال کر یکایک چیخ کر کہا۔ "بھاگ جا یہاں سے ورنہ اپنی چپل اُتار کر اتنے ماروں گی کہ ....."

زرینہ چپل اُتارنے لگی۔
اشتیاق بھاگ کھڑا ہوا۔

اشتیاق کا کاروبار ایرانی ہوٹل والے کے ہاں خوب چمک گیا پہلے وہ صرف سموسے بناتا تھا پھر اُس نے ایرانی ہوٹل کے مالک کو ... پر لاگت سے شاہی ٹکڑے بیچنے کی ترغیب دی۔

"بہت سستے میں بن جانے کا سیٹھ تمہارے ادھر ڈبل روٹی کا کتنا ٹکڑا بیکار میں پھینکتا ہے۔ ہم اس کو کام میں لائے گا۔ ... تھوڑا خرچ ہے اور تھوڑی سی ملائی" اشتیاق نے اُسے کہا "اور تمہارے پاس تین تین ریفریجریٹر ہے۔ ایک ریفریجریٹر میں شاہی ٹکڑے رکھے گا۔ گاہک کو ٹھنڈا ٹھنڈا سرو (...) کرے گا۔" ایرانی مان گیا کیونکہ خرچ بہت کم تھا اس مٹھائی کا۔ ... اشتیاق نے جو شاہی ٹکڑا بنایا تو وہ دیکھتے ہی ٹکڑے کے حساب سے ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ ایسی عمدہ ڈش جس سے ... بہت ہی سستے اور مٹھائی کی مٹھائی بھی معلوم ہو ایرانی ہوٹل میں بیٹھنے والوں نے آج تک کاہے کو کھائی تھی۔ اب تو یہ حالت ہو گئی کہ اشتیاق ... دو دو درجن شاہی ٹکڑے تیار کرنے پڑتے اور بکری کو بڑھتے دیکھ کر ایرانی ہوٹل کے مالک نے اشتیاق کو اپنے کچھ کا ... مقرر

کر دیا۔ مجھے یہ کام کرنے والے ذرا سب اشتیاق کو استاد جی کہہ کے پکارتے تھے اور ہوٹل کا مالک اشتیاق کو شاہی ٹکڑوں کی مناسبت سے میٹھے دل کا ٹکڑا کہتا تھا۔

مگر میں نے کبھی اشتیاق کے جسم اور روح پر بہار آتے ہوئے دیکھی ہے تو وہ یہی دن تھے ...... اُس کے [illegible] اور کالے نرم خندوں پر مسکراہٹ دوبارہ کھلنے لگی۔ اور وہ کشتیاں سی کی تھیں جو اُس کی آنکھوں میں ہر وقت ہنسی اور شوخی جو کہ تیرتی سی رہتی تھیں اب بمبئی کے ساحل پر نظر آتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں جہاں اشتیاق نے ہمیں مکان دلوایا تھا اس کے قریب کوکنی ذرا کے فاصلے پر وہ ایرانی کا ہوٹل تھا۔ چوک کے نکڑ پر سامنے ٹیکسیوں کا اڈہ تھا اور قریب ہی ملیٹری ایک شکل کی گلی تھی اس لیے صبح سے شام تک اس ایرانی ہوٹل میں بڑی بھیڑ رہتی تھی۔ بوٹ پالش کرنے والے اور پان بیچنے والے اور بھیل پوری کی چاٹ بیچنے والے اور آس پاس کے گھروں اور بنگلوں کے ڈرائیور اور ساہوکاروں کے بیٹے [illegible] اور شام کی تلاش میں گھومنے والے بے کار اور آوارہ و نشے جوانی کے مارے لڑکوں سے زیادہ بیٹھے معلوم ہوتے تھے۔ ان سب کا مجمع اس ہوٹل کے اندر اور باہر رہتا تھا۔ اور اس ہوٹل میں [illegible] بہت پاپولر ہو گیا تھا آتے جاتے میں نے دیکھا تھا۔ ہر ٹیکسی [illegible] وہ اپنے اچھے کپڑوں میں ہی کبھی کبھی کھانا کھانے کے لیے باہر [illegible] کر دکھلا دیتا۔ کوئی چار بجے کے قریب وہ نہادھو کر گہرے رنگ کا بنگالی کرتا اور اس کے نیچے کھلے پائنچوں والا پاجامہ اور چپل پہن کر ہوٹل کے باہر آ کھڑا ہوتا۔ اس وقت [illegible] کی تلاش میں آتے ادھر ادھر سے بہت سے [illegible] ادھر ادھر کے بنگلوں اور فلیٹوں میں ان لڑکوں کو [illegible] دیتا کیونکہ وہ اس ہوٹل کا اسسٹنٹ ہونے کی وجہ سے آس پاس کے بنگلوں میں اس کی خاصی جان پہچان ہو گئی تھی۔ [illegible] آنے کا شوربہ [illegible] کر جاتا کہ [illegible] بیڑی سلگا کر ٹیکسی ڈرائیوری کے [illegible] اچھی کرتا جو اس کا ہم وطن تھا [illegible] آباد کار بنے والا تھا اور جس کے لیے وہ ایک نہایت ہی عمدہ اور نہایت ہی سستی [illegible] حاصل بنا لیا تھا جس میں خرچ بہت کم ہو اور کپڑے بھی بہت عمدہ دھل جائیں مگر اشتیاق ابھی اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہوا تھا۔

ٹیکسی ڈرائیوری سے فارغ ہو کر وہ اپنے اس ایجنٹ کے ہاں چلا جاتا اپنے گاہکوں کے لیے کر مکان دکھانے کے لیے چلا [illegible] رات کو دس بجے فارغ ہو کر ایرانی ہوٹل میں کھانا کھاتا پھر ایک کپ چائے پی کر اور بیڑی سلگا کر اور پان کھا کر وہ سنتو باورچی کی کوٹھڑی میں جا کر سو رہتا کیونکہ اب وہ بڑا آدمی ہو گیا تھا۔ وہ اب ایرانی ہوٹل کے باہر نہیں سو سکتا تھا۔ سنتو باورچی کا [illegible] بارھویں نمبر کی سڑک کے پچھواڑے چھوٹے سے خالی پلاٹ پر تھا اور اس کی بیوی پچھلے سال اپنے بیٹے [illegible] گڑھوال کے کسی گاؤں میں گئی تھی اور کہیں چار ماہ کے بعد واپس آنے والی تھی۔ تب تک اشتیاق سنتو کے جھونپڑے میں رہ سکتا ہے سنتو نے اشتیاق سے کہا [illegible]

شاہی ٹکڑوں کی روز افزوں بکری کو دیکھ کر میں نے اندازہ کیا تھا کہ اب اشتیاق کے قدم یہاں جم جائیں گے۔ اس لیے [illegible] کے بعد مجھے بڑی حیرت ہوئی جب ایرانی ہوٹل کے مالک نے مجھے بتایا کہ اس نے اشتیاق کو نکال دیا ہے۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔ "کوئی غبن کیا؟"

"نہیں۔ آج تک ایک پیسے کا غبن نہیں کیا۔" ایرانی ہوٹل کا مالک بولا۔

"پھر کیا کام میں گڑبڑ کرتا تھا؟"

"نہیں۔ کام تو اشتیاق بہت اچھا کرتا تھا۔"

"پھر؟"

ایرانی ہوٹل کے مالک نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پھر جلدی سے بند کر لیا پھر ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بولا۔ "اُس کا بھیجا پھر گیا ہے ہم اس کو ستر روپیہ پگار دیتا تھا وہ پگار بھی اُس نے ضائع کر دیا اُوپر سے پانچ سو کپ چائے اور دو سو سلائس کا بل ہو گیا۔"

"پانچ سو کپ چائے اور دو سو سلائس؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "اشتیاق تو اتنا پیٹو کبھی نہ تھا وہ تو بہت ہی کم خوراک کھاتا تھا۔"

"ہم جانتا ہے اس لیے تو ہم کو قلق ہے۔" ایرانی ہوٹل کا مالک خفا ہو کے بولا "وہ خود پانچ سو کیا سات سو کپ چائے پیتا تو ہم اس کو منع نہیں کرتا تھا مگر وہ خود نہیں پیتا تھا ادھر اُدھر کے سب بے کار اور نکھٹو لوگ جو ادھر آ جاتا جو کی بلڈنگوں میں نوکری بنانے کے واسطے ہے وہ اُن کو بٹھا کے پیٹ دیکھ کر چائے پلاتا تھا۔ جب ہم منع کرتا تھا تو بولتا تھا میرے حساب میں لکھ دو۔ اب پانچ سو کپ چائے اور دو سو سلائس کا بل ہو گیا۔ اس کو کس کے حساب میں لکھے گا؟ اس لیے ہم نے اُس کو نکال دیا۔"

"بہت اچھا کیا۔" میں نے ایرانی سے کہا اور پیسے کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے کہا۔ "ایک ڈبیہ کیونڈر کی دو!"

"عجب سنکی پھر گیا ہے اس کا۔" ایرانی نے میرے پیسے گنتے ہوئے کہا: "دو پیسہ کم ہے۔"

"معاف کیجئے" کہہ کر میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اُسے دو پیسے اور دیے اور کیونڈر کی ڈبیا لے کر اس سے پوچھا۔ "تو آج کل اشتیاق کہاں رہتا ہے؟"

"جیل میں ہے۔"

"جیل میں؟" میں حیرت سے ایرانی کی طرف دیکھنے لگا۔ "تم نے اُس بے چارے کو جیل بھجوا دیا؟"

"ہم نے کہاں پہنچایا ہے صاحب۔ وہ تو اپنی کرنی سے گیا ہے۔ شراب کی سمگلنگ کے دھندے میں۔"

"اچھا۔ یہ دھندا بھی اُس نے شروع کر دیا تھا۔"

"وہ تو یہ دھندا نہیں کرتا صاحب۔ مگر ہمارا باورچی سنتو اپنے کھالی ٹائم میں یہ دھندا کرتا تھا اور ادھر اُدھر کی بلڈنگوں میں دارو پہنچاتا تھا۔" ایرانی بولا۔ "پھر ایک رات پولیس نے اُس کے جھونپڑا پر چھاپہ مارا۔ پچ بوتل پکڑا گیا تو اشتیاق بولا کہ سنتو بے گناہ ہے۔ میں نے یہ پچ بوتل شراب کا ادھر لا کے رکھا تھا اس واسطے اشتیاق کو تین مہینے کی سزا ہو گئی ہے۔"

"اُس نے ایسا کیوں بولا؟"

"وہ بولا۔ ہمارا کیا ہے ہم اکیلا آدمی ہے تین مہینے کی سزا جھیل جائے گا کاٹ لے گا۔ مگر جب سنتو کی گھر والی اپنے بچے ساتھ کر کے پھر جھونپڑا میں آئے گی تو جھونپڑا کھالی دیکھ کر روئے گی!"

ایرانی ہوٹل کا مالک اپنے سر پر انگلی رکھ کے بولا: "بھیجا پھر گیا ہے اس کا۔"

زرینہ کو خیال آیا کہ یہیں سے رہا ہوتے ہی اشتیاق ہمارے گھر آنے لگا۔ لیکن جب تین ماہ سے اُوپر کئی دن گزر گئے اور اشتیاق نہ آیا تو اسے کچھ مایوسی سی ہوئی۔ مایوس بھلے بھی ہوئی پھر میں نے سوچا کہ اشتیاق اگر ہمارے گھر نہیں آتا تو ٹھیک ہے بعد میں ایمانی جیل کے باہر ضرور دکھائی دے گا۔ پر اُدھر بھی نہیں۔ سنتری بادشاہ سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ اُس کے ہاں بھی نہیں آیا۔ پھر ہم لوگوں نے سوچا ٹھیک ہے اشتیاق شرم کے مارے یہ علاقہ ہی چھوڑ گیا ہو یا بھٹے کہیں باہر چلا گیا ہو۔ جب دو ڈھائی ماہ اور گزر گئے تو اشتیاق نہ آیا تو ہمارا یہ خیال پکا ہو گیا۔

پھر ایک روز۔ ہم نے یکایک اُسے ایک دعوت میں دیکھا۔ سردار زور آور خان کے ہاں ہماری دعوت تھی جن کی بیوی نصرت خانم میری بیوی کی خاص سہیلی تھی۔ ہم تو کھانے کے شروع کے دو لقمے کھاتے ہی ہو گئے کہ یہ کس کا شاپلی ہے۔ پہلو گھر کچھ ہی میں نے زرینہ کی طرف اور زرینہ نے میری طرف چونک کر دیکھا مگر ہم دونوں چپ رہے۔ کھانے کے بعد جب دعوت کی تعریفیں ہونے لگیں تو بیگم نے خواہ مخواہ اشتیاق بلا بھیجے۔ کالی پتلون کے اُوپر اُول بوشرٹ اور اُول ٹیش شرٹ کے اُوپر بھورے رنگ کا ایک میلا ایپرن پہنے ہوئے اور سر جھکا کر کورنش بجا لاتے ہوئے شاہوں کے انداز میں داد ٹھہرنے لگے۔

نہ میں نے نہ زرینہ نے اُس وقت اُنھیں پہچاننا مناسب سمجھا۔ اشتیاق نے بھی اُس وقت ہمارا رویہ سمجھ کر مکمل اجنبیت اختیار کی۔

بعد میں نصرت نے زرینہ کو الگ لے جا کے بتایا۔ بہت اچھا کک مل گیا ہے مجھے۔ اشتیاق احمد خان نام ہے اس کا۔ اپنی طرف کے قاضی خیل کا پشتو بہت اچھی بول لیتا ہے حالانکہ بچپن ہی سے اِدھر رہا ہے پھر کھانا تو غضب کا پکاتا ہے۔ کچن میں بڑی بچت سے کام لیتا ہے۔ جب سے یہ آیا ہے جب سے کچن کا خرچ ڈھائی سو روپے کم ہو گیا ہے۔ پورے ڈھائی سو روپے۔ تنخواہ میں اس کو صرف ستر دیتی ہوں حالانکہ سو بھی دوں تو سستا رہے گا۔

زرینہ انجان بن کر بولی۔ " آدمی تو شریف معلوم ہوتا ہے۔"

" اسے شریف ایسا شریف" نصرت اشتیاق کی تعریف کرتے ہوئے بولیں۔ " میرے بچوں پر تو جان چھڑکتا ہے اور جب سے بچے بڑے ہو گئے تو دل و جان سے چاہتا ہے۔ کوئی سگی ماں اُس کی کیا خدمت کرے گی جیسی وہ بچوں کی کرتا ہے۔ ابھی چار دن کی بات ہے بچوں نے موٹر مانگی تھی۔ میں نے کہا لا دوں گی۔ میں ٹال رہی تھی کیونکہ گھر میں دو کھلونے موٹروں کے پہلے سے پڑے ہیں۔ پرانے ہو گئے ہیں ذرا تو کیا ہوا" نصرت زرینہ کا ہاتھ پکڑ کر خوشی سے بولی۔ " یہ مرا اشتیاق دس روپے کی موٹر میرے بچوں کے لیے لایا تو میں نے غصے سے جھڑک کر کہا " میں تو اس موٹر کے پیسے نہیں دوں گی تم رکھو۔" " دیکھیے بیگم صاحب۔ میں تو اپنے پیسے لے کر لایا ہوں تم کہیے۔" اس پر وہ غصے سے کہتا کہ بیگم " تو تم سے کس نے کہا تھا بچوں کے لیے موٹر خریدو" تو اشتیاق چلے تو ان کی گڑیا سی ہو کر سہم گیا۔ بچوں سے پیار کرتا ہو۔ " صاحب میں بچوں کا کہا نہیں ٹال سکتا۔ وہ جو کہیں گے میں مزے سے کر دوں گا۔"

اُس نے ایسے معصوم لہجہ میں اُن سے بات کی کہ دوں کا سارا غصہ اُتر گیا۔ مسکراتے ہوئے ایک طرف کو سرک گئے میں

بی کیا بولتی بس، چپ ہو کر سر تے سے پیڈی کاٹنے لگی۔

زرینہ خاموشی سے مسکرا مسکرا کر نصرت کی باتیں سنتی رہی مگر اس نے ایک دفعہ بھی نہیں بتایا کہ وہ اشتیاق کو چاہتی ہے۔ نہ اگلے ایک سال میں اشتیاق نے ایک بار بھی بتایا کہ وہ بم ورگن کے پیچھے سے جانتا ہے۔ ہم نے سوچا ہے چارہ جہاں لگا ہے لگا ہے اس کی خامیاں بتانے سے کیا فائدہ؟ اور یہاں زور آور خان صاحب کے ان دو کر اشتیاق بہت ٹھیک ہو چلا تھا بال ماتھے پر نہیں لٹکتے تھے۔ ذہنی طور پر بہت ذہانت رہتا تھا کپڑے صاف ستھرے پہنتا تھا۔ شعر و شاعری ترک کر دی تھی۔ دن بھر یا تو کچن میں رہتا یا خان صاحب کے بچوں کی دیکھ بھال کرتا۔ حالانکہ ان کی دیکھ بھال کے لیے دو آیائیں الگ سے مقرر تھیں مگر بچے جس قدر اشتیاق سے مانوس ہو گئے تھے اتنے گھر کے کسی دوسرے ملازم سے نہ تھے۔ میں نے اور زرینہ نے شکر کا سانس لیا۔ "چلو۔ یہ اشتیاق نارمل تو ہوا۔"

ایک رات زور کی گھنٹی بجی کوئی تین بجے کا وقت تھا میں نے گھبرا کر دروازہ کھولا باہر سردار زور آور خان کا ڈرائیور رحمت کھڑا تھا۔

"حضور جلدی چلیے۔ بیگم صاحب نے گاڑی بھیجی ہے۔"

"کیا بات ہے حامد؟" میں نے پوچھا۔

"اشتیاق نے زہر کھا لیا ہے!"

"کیسے؟" میرے منہ سے نکلا

"ہاں صاحب۔ اشتیاق نے زہر کھا لیا ہے اور خان صاحب پونا میں ہیں گھر پر بیگم صاحبہ کے دو بھائی ہیں مگر ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا جائے۔ ڈاکٹر مقصود کو ٹیلیفون کیا تھا بیگم صاحب نے مگر وہ بولے یہ پولیس کیس ہے۔ میں نہیں آسکتا۔ اور اشتیاق مر رہا ہے۔"

زرینہ میرے پیچھے کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ لرزتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "تم جلدی سے چلے جاؤ بے چاری نصرت سخت پریشان ہو گی۔"

خان صاحب کے ڈرائنگ روم کے عین مرکز میں فرش پر سر سے پاؤں تک ڈھکی ہوئی ایک لاش رکھی تھی اور نصرت اور اُن کے دونوں بھائی اور گھر کے دوسرے ملازم حیرت سے گم سم کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔

"کیا مر گیا؟" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"نہیں ابھی تو زندہ ہے!" ایک آیا آہستہ سے سسکتے ہوئے بولی۔

میں نے چادر ہٹا کر نبض دیکھی سینے کے زیر و بم میں زندگی کی گھر گھراہٹ تھی اور نبض ٹوٹ رہی تھی۔ نصرت ایک بھورے شال اوڑھے ذرا فاصلے پر خوف زدہ کھڑی پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔

"کب اس نے زہر کھایا؟" میں نے نصرت سے پوچھا۔

نصرت کچھ نہیں بولی۔ جیسے اس نے میرا سوال سنا تک نہ ہو۔

نصرت کا چہرہ اچانک زرد ہو گیا۔ کچھ دیر بعد میں نے اپنے بستر کے قریب کسی کی آواز سنی۔ کوئی آہستہ آہستہ مجھے جھنجھوڑ کر جگا رہا تھا۔ جب جاگا تو معلوم ہوا اشتیاق ہے۔ وہ اوپر کی منزل سے چل کر میرے کمرے میں پہنچا تھا اور مجھ سے کہہ رہا تھا "مجھے بچاؤ میں نے زہر کھا لیا ہے۔"

میں نے پوچھا "کون سا زہر؟"

"بورا ٹک ٹو۔"

"کھٹمل کا؟"

"کھٹمل ٹک ٹو۔" اس کی زبان زہر سے موٹی ہو چکی تھی اور آواز میں لکنت تھی۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ ایک ٹوٹی ہوئی شیشی اس کے منہ سے لگا تھا مگر ... پھر وہ مجھ سے کہنے لگا۔ پانی سے قے کرانے کو کہنے لگا۔ میں نے مزید باتیں سننے کے بجائے جلدی سے کہا۔ "اسے اٹھا کر نیچے لاؤ۔ میں ڈرائیور کو ... ہسپتال لے جائیں گے۔"

"مگر پولیس۔" نصرت کانپ گئی۔

"پولیس کو ہم بعد میں اطلاع کر دیں گے" میں نے کہا۔ "نزدیک کا ہسپتال کون سا ہے؟"

"چاند بی بی۔"

"یہاں سے کتنی دور ہو گا؟"

"کوئی چار میل۔"

"جلدی چلو۔"

جس وقت چار آدمیوں نے مل کر اشتیاق کو پہلی منزل سے نیچے اتارا اس وقت ہلکی ہلکی سی بارش ہو رہی تھی۔ سڑک کے کنارے کھمبوں کی روشنیاں لمبی لمبی پانی میں بھیگے ہوئے ... جیسے اپنی زرد زرد زندگی پر رو رہے ہوں۔ بھیگی ہوئی سڑک پر کہیں کہیں روشنی کے دھبے ... نظر آتے پھر اندھیرا انہیں نگل جاتا ... ایک کتا ... سڑک پار کر ... جیسے ایک عورت اپنی عصمت کی ... اپنے گھر کی طرف بھاگ رہی ہو۔

ایمرجنسی وارڈ میں!

اے فارم بھرو!

بی فارم بھرو!

سی فارم بھرو!

زندگی تم بھی تو رکو!!

اشتیاق کا سر بھورے رنگ کے تیل کا تہ کے گدے پر ٹکا ہے۔ اس کی آنکھیں کسی گہرے گڑھے میں جا گری ہیں اور ...

دل کی دھڑکن کم ہوتی جا رہی ہے۔

پچھتر روپیہ ایڈوانس دو۔

یہ رسید لو۔

جلدی۔ مریض کو کمرہ ۸ میں لے جاؤ اوپر۔ لفٹ سے۔ میں ابھی ڈاکٹر کوٹھاری کو ٹیلی فون کرتا ہوں۔

باہر کوئی ٹرک گزرتا ہے۔

گھوں گھوں۔

اشتیاق کا سینہ بیٹھتا ہے

ہُوں ہُوں۔

آئیل کلاتھ کا بھورا بستر اپنے پایوں میں لگی ہوئی ربڑ کی چرخیوں کے ذریعہ لفٹ کی جانب حرکت کرنے لگتا ہے۔ لفٹ اوپر کی منزل پہ جا کے رک جاتی ہے۔ بستر برآمدے میں سے گزر رہا ہے کمرہ نمبر سات کے اندر جاتا ہے۔ ایک ڈاکٹر اور دو نرسیں اندر آتی ہیں۔ سات نمبر کا پردہ گرا دیا جاتا ہے۔ ایک ڈاکٹر اور دو نرسیں آتی ہیں اور ہم باہر بنچ پر بیٹھ جاتے ہیں۔

بلیک وردی میں بے آواز نرسیں خاموشی سے گھوم رہی ہیں۔ اردلی نیند کی غنودگی سے بیزار شل رہے ہیں۔ کہیں کوئی مریض تھکے کراہتا ہے رک رک دھیرے دھیرے سسکتا ہے۔

"اشتیاق نے زہر کیوں کھایا؟" میں پوچھتا ہوں

"نہیں کیا ہوگا۔" نصرت کا چھوٹا بھائی اندازہ لگا کے کہتا ہے۔

"میں نے ہوتے ہوئے بھی گھر کا سارا خرچ اشتیاق کے سپرد کر دیا تھا۔ ہر وقت چار پانسو روپے اشتیاق کی جیب میں رہتے تھے۔ ابا نے اشتیاق سے حساب دینے کو کہا تھا۔ آج اس نے زہر کھا لیا۔ میرا خیال ہے کہ . . . ."

"تمہارا خیال غلط ہے۔" نصرت کا دوسرا بھائی بولا۔ "اشتیاق میں دس برائیاں ہوں مگر وہ چور نہیں ہے۔ آج تک اس نے ایک دھیلے کی بے ایمانی نہیں کی۔ میرے خیال میں پچھلے ہفتے جو مراد آباد سے اسے اطلاع ملی تھی کہ اس کے آبائی مکان والے مقدمہ کا فیصلہ اس کے خلاف ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس کا اسے بہت صدمہ ہوا ہے۔"

"جی نہیں۔" ماموں جان اپنی گھنی بھنوؤں پہ ہاتھ پھیر کر بولے۔ "اشتیاق کو مکان دکان روپے پیسے سے کبھی محبت نہیں رہی۔ یہ سب اس عورت کا چکر ہے۔ گلشن کا!"

"گلشن؟" میرے کان کھڑے ہوئے۔ "گلشن کون ہے؟" میرے ذہن میں ایک بجلی کوندنے لگی . . . .

"ایک نئی ٹائپسٹ ہے صاحب۔ نئی لڑکی، خوبصورت اینگلو انڈین لڑکی ہے۔ عمر سولہ سترہ برس کی ہے۔ بھاگ بھاگ کر کام کرتی ہے۔ اس کا نام گلشن ہے۔ صاحب ہم نے سنا ہے کہ اشتیاق کی پہلی بیوی کا نام بھی گلشن تھا۔"

"ایسے؟" میں چونک گیا۔

"جی ہاں۔ اس منشیات کے چکر میں زہر کھا لیا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"پہلے تو صاحب سے کہتے رہے کہ اس لڑکی کو نکال دو۔ یہ کام ٹھیک سے نہیں کرتی ہے پھر ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ میں اسے کام پر سے نکلوانا چاہتا ہوں کہ اس کا نام گلشن ہے۔ میں نے کہا بھلے مانس۔ اس کا نام گلشن ہے تو کیا ہوا کام تو ٹھیک کرتی ہے۔ مگر اشتیاق نہیں مانے۔ بار بار اس کی شکایت کرتے رہے مگر جب صاحب کسی طرح نہیں مانے تو صاحب کو تو معلوم نہیں کب انھوں نے ارادہ بدلا اور کب اشتیاق میاں نے رویہ بدل دیا۔ اب یہ اس لڑکی پر مہربان ہونے لگے۔ دوسرے نوکر تو چائے پیتے تھے یہ اس کو کافی پلانے لگے جو صرف صاحب اور بیگم صاحب پیتی ہیں۔ پھر ایک دن گلشن کو جو پتہ چلا کہ اس کو کافی ملتی ہے جبکہ دوسرے نوکروں کو صرف چائے ملتی ہے تو وہ ایک دم بھڑک گئی اور اس نے اس دن سے کافی پینے سے انکار کر دیا۔ ایک دن اس نے اشتیاق کو بازار سے دیسی صابن لانے کو کہا تو یہ اس کے لیے انگریزی صابن لے آئے۔ اس نے کہا پیسے کا تیل لانا تو یہ گلوز ہیئر آئل نمبر ون اٹھا لائے۔ کل گلشن کی ماں کا خط آیا جو بیگم صاحب نے پڑھ کر سنایا۔ اب اشتیاق کی تو عادت تھی دروازہ پر چھپ کر دوسروں کی بات سنتے رہتے تھے۔ گلشن کی ماں نے لکھا تھا۔ اس نے گلشن کی شادی کی بات چیت پکی کر لی ہے لڑکا کسی سیٹھ کی کمپنی میں دربان ہے۔ یہ خیال ہاں ہی تھے وہ آئینہ کیا منہ لگاتی۔ بس جب سے یہ سنا کمرہ ہی میں بیٹھے ٹھنڈی سانسیں بھرتے تھے اور مجھ سے کہتے تھے اب جینا بیکار ہے۔ میں نے پوچھا کیا ہوا؟ بولے کچھ نہیں! اور پھر اپنے سینے پر ہاتھ مار کر بولے گلاب جینا بیکار ہے۔ یہ تو دوپہر کی بات ہے .... رات کو انھوں نے زہر کھا لیا.......۔" حامد اتنا کہہ کر چپ ہو گئے۔

میں نے چند لمحوں کے سکوت کے بعد پوچھا۔ "مگر زہر کھانے سے پہلے اس کمبخت نے لڑکی سے کوئی بات نہیں کی؟"

"جی نہیں صاحب۔" حامد خفا ہو کے بولے۔ "اصل میں یہ عاشق تھا۔ دس دن تو ہوئے ہیں گلشن کو آئے ہوئے۔ ان دس دنوں میں انھوں نے اس لڑکی سے نفرت بھی کی۔ دوستی کی ابتدا بھی کی محبت بھی کی پھر آپ ہی آپ مر بھی گئے۔ سب کچھ دس دنوں میں کر لیا۔ لڑکی کو تو کچھ خبر بھی نہیں ہے صاحب۔ وہ تو ایسی بدصورت ہے اور ایسی بھیجے کی خالی ہے کہ اسے تو گمان تک نہیں گزر سکتا کہ کوئی اس سے عشق کر سکتا ہے۔"

حامد چونکہ بڈھے تھے اور زندگی کے اس دور میں سے گزر رہے تھے جب کوئی کسی سے محبت نہیں کر سکتا ہے اس لیے داستان سناتے وقت ان کے لہجہ کی شدت یہ تھی جس طرح ان کی مجبوری کی غمازی کر رہی تھی اس سے مجھے بڑا لطف آیا۔

کوئی ساڑھے چھ بجے کے قریب ڈاکٹر کوٹھاری کمرہ نمبر سات سے برآمد ہوئے اور مجھے دیکھ کر بولے۔ "ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا مگر اگلے چوبیس گھنٹے اس پر بہت نازک ہیں۔ میں نے اس کا معدہ صاف کر دیا ہے۔ گلوکوز کے سیلائن پر رکھ دیا ہے کھانے کو دوائیں دی ہے انجکشن دیے ہیں کچھ لکھ دیے ہیں۔"

"شکریہ ڈاکٹر صاحب۔ مگر کیا مریض اس وقت ہوش میں ہے۔"

"ہوش میں تو ہے مگر ابھی بہت کمزور ہے ابھی زیادہ لوگ اس سے نہ ملیں تو بہتر ہوگا۔" ڈاکٹر نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "صرف آپ اس سے چند منٹ کے لیے مل لیں۔ میں نے تھانے ٹیلی فون کر دیا ہے کسی وقت بھی پولیس انسپکٹر اس کا بیان لینے کے لیے

...ہے کیونکہ مریض کی حالت بہت نازک ہے......"

...نا کہ ڈاکٹر کو نظروں سے چلے گئے تو تہمت کا چھوٹا بھائی برافروختہ ہو کے بولا " خان صاحب گھر پر نہیں ہیں اور یہاں پولیس کے
...نے کس کس کے بیان جوں گے۔ آپ کے بیٹے کو اتنی عقل نہیں آئی کہ اگر مرنا ہی تھا تو سمندر میں ڈوب کے ہی مر جاتا۔ کسی گاڑی
...نیچے آ کر ہی مر جاتا۔ کہیں پر مرتا مگر اس گھر سے دُور رہ کر ہی مرتا اور یوں ہم سب کو پریشان کر کے تو زہر نہ کھاتا...!

...بجا فرمایا آپ نے۔" میں نے کہا " مرنے والوں کو ہمیشہ اپنے بعد زندہ رہنے والوں کی سہولیت کا خیال کر کے مرنا چاہیے اس سلسلے
...آپ ایسے رہنمائے خودکشی شائع کریں تو بہتوں کا بھلا ہوگا۔"

...اندر میں کمرہ ضربات میں داخل ہو گیا۔

...اتفاق سے اُس وقت کمرہ میں کوئی نہیں تھا۔ نرس کوئی دوا لانے کے لیے گئی تھی۔ اشتیاق گھرے تکیوں میں سر نکالے لیٹا تھا۔ اس
...بازو کی رگ میں گلوکوز چڑھ رہا تھا۔ دُوسرا بازو اس کے سینے پر تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کے سیاہ چہرے کے پیچھے سفید تکیوں
...کی پلکوں پر بارش کے قطرے لرز رہے تھے اور کانچ کی سطح پر روشنی اور سائے امید و بیم کی کشمکش کی طرح لرزاں تھے۔
...اشتیاق!" میں نے اُس کے بستر کے قریب جا کر سرگوشی میں کہا۔ " اشتیاق سُنو!"
...میں نے پھر ذرا اونچی سرگوشی میں کہا۔ " کان کھول کے سُنو میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے نرس آ رہی ہے۔"
...اشتیاق نے آنکھیں کھولیں۔ اور جب میں نے دیکھا کہ اُس نے مجھے پہچان لیا ہے تو میں نے اُس کے قریب جھک کر کہا۔ " کسی وقت بھی
...تمہارے پاس بیان قلم بند کرنے کے لیے آ جائے گا۔ اُس سے صرف یہ کہنا ہو گا کہ تمہارے پیٹ میں درد تھا اور تم امرت دھارا لے
...تے رہتے ہو۔ اتفاق سے کمرہ میں تمہارے سرہانے 20 - DDT کی شیشی بھی پڑی تھی وہ بھی اتنی ہی بڑی ہوتی ہے جتنی امرت
...اس لیے رات کو جب تمہارے پیٹ کا درد بڑھا تو تم نے غلطی سے امرت دھارا کی جگہ 20 - DDT پی لی۔ غلطی سے پی
...ہو سکتا۔ سمجھتے ہو!"

...اشتیاق نے میری طرف دیکھ کر خاموشی سے سر ہلا دیا۔

...آنسوں کی پتلیاں نیم ساکت، ہونٹ اندر کو بھینچے ہوئے، رُخساروں کے گڑھے گہرے اور ماتھا تاریکی میں کھوئے ہوئے، سینہ کھلا اور ماتھا
...ہے ڈھانچہ کسی ویران جزیرہ کی مانند اور دُبلی پتلی پسلیاں کشتی شکستہ جہاز کی سیڑھیوں کی طرح زندگی کے ہوکتے تالاب کی طرف

......

...اشتیاق۔ تم نے ایسا کیوں کیا؟" میں نے اُس کے سر پر جھک کر گہری شدت سے پوچھا۔
...وہ دیر تک بالکل ساکت رہا جیسے اُس نے میرا سوال نہ سُنا ہو۔ پھر اس کا ہاتھ اس کے سینے پر سرکنے لگا۔ دھیرے سے
...اپنا سینہ انگلیوں سے سہلاتے ہوئے ہوا کی سی سرگوشی میں بولا۔
...خالی ہے۔"
...خالی ہے۔ کتنی صدیوں سے انسان کا سینہ خالی ہے اور انسان نے اس خالی سینے کو رام نہ بھر سکے اور مسیح نہ بھر سکے اور

بیٹھ دیر تک علاج کیا مگر کے ساتھ [illegible] ۔ اسے اس سینے کے اندر خلا لگتے ہیں اور ہر کی کلیاں ہیں ایک ایک [illegible]
اندر تم کہاں کہاں سے کوڑا کباڑا لا کے ڈالتے رہے ہو۔ اگر کسی طرح سے یہ خلا پر ہو جائے۔ پہلے تم نے اس [illegible]
ایک [illegible] کر دھوکے ہاتھ کر اس میں بٹھا دیا۔ پھر سیکڑوں [illegible] تم نے اس میں [illegible] ڈال دیئے [illegible] کاٹ کاٹ کر اس کے
پیچھے رہے ہو۔ تم ہر روز پیٹ بناتے رہے اور خود [illegible] دوسروں کے [illegible] کرتے رہے اور اپنے آپ کو [illegible]
کے لہو سے محبت کرتے رہے مگر تم کوشش کر کبھی سنبھال دے۔ اور کسی طرح یہ خلا پُر نہ ہو سکا۔ گلی گلی تم کانٹے چنتے رہے اور [illegible]
جو کہ ایک پیشے سے دوسرے پیشے کی کھوج میں بھٹکتے رہے۔ اگر کسی طرح تم اس خلا کو پر کر سکو جسے صرف ایک عورت کی محبت پر کر سکتی ہے....

بچے!

نرس اندر آگئی۔

میں نے ایک بار کے لیے اشتیاق کے [illegible] ہوئے [illegible] چہرے کو دیکھا آنکھوں کے نیچے [illegible] سے چند
قطرے [illegible] کے رخساروں پر بہتے ہوئے چلے گئے ..... میں کمرے سے باہر نکل آیا۔

نسیم منزل

شوکت تھانوی

——— شکورا بیٹھا خود ہی بڑبڑا رہا ہے ———

شکورا: (خود ہی بڑبڑاتے ہوئے) واہ جی واہ۔ بڈھے ہو گئے شکورا میاں تم بھی اسی ڈیوڑھی پر۔ اپنی بات تو پوری کر دکھلائی۔ جب نوکری کرنے آئے تھے تو یہی کہا تھا کہ اب جنازہ ہی اُٹھے گا اس گھر سے اپنا۔ تو اب جنازہ اٹھنے میں کسر ہی کیا رہ گئی ہے۔ اس عمر میں تو موت سر ہی پر منڈلاتی رہتی ہے۔ آج مرے کل دوسرا دن۔ مگر اتنے ہی دنوں میں کیا کچھ نہیں دیکھا تم نے شکورا میاں من برستا دیکھا اس گھر پر۔ گردش کے کھلائے جان دیکھے۔ پھر جوانوں کے کرتوت دیکھے۔ دونوں ہاتھوں سے دولت اُڑائی گئی بڑے صاحبزادے نے پیسے کو ہاتھ کا میل سمجھا۔ اسے جی قارون کا خزانہ ہو تو وہ بھی خرچ ہو جائے۔ آخر یہ حال ہو گیا کہ مکان کرائے پر اٹھ رہا ہے۔ کرایہ پر نہ اٹھے گا تو بک جائے گا۔ اب بڑے بھائی کہتے ہیں۔ پگڑی لو۔ سال بھر کا کرایہ پیشگی اور چھوٹے بھائی کہتے ہیں کہ یہ ڈکیتی ہے مگر کوئی پوچھے شکورا میاں تم کون۔ تین میں نہ تیرہ میں ستلی کی گرہ میں ———

نسیم: (آواز آتی ہے) شکورا۔ شکورا بابا۔

شکورا: (بلند آواز سے) حاضر سرکار۔ آ رہا ہوں۔ (پھر بڑبڑاتا ہوا جاتا ہے) شکورا کو بیٹھنے نہ دینا دو گھڑی۔ ڈر یہ ہے کہ کہیں اس بڑھاپے کی کمر سیدھی نہ ہو جائے اگر اس کی تھکن دور ہو گئی تو ایک روٹی نہ کھائے گا۔ یہ پیٹوا اندھیرے منہ اٹھو اور پھر آدھی آدھی رات تک آپ لوٹے جا ہے لوٹنے ..... (بلند آواز سے) مجھے بلایا تھا میاں؟

نسیم: جی ہاں۔ کلیم میاں سے کہیے کہ ذرا میرے کمرے میں آئیں۔

شکورا: بہت اچھا (جاتا ہے) کوئی پوچھے یہی آواز کلیم میاں کو بھی دے سکتے تھے جو شکورا کو دی گئی ہے۔ مگر کلیم میاں کو آواز دیں ان کے دشمن۔ جب ان کو بلانے کے لیے شکورا موجود ہے تو اس سے کام کیوں نہ لیں۔ دو وقت کی روٹی اور بیس روپے مہینہ مفت میں تھوڑی دیے جاتے ہیں۔ ان دامروں نوکروں کے پیر میں سنیچر اسی لیے تو باندھا جاتا ہے کہ وہ بس چکر ہی چکر رہے اور چکتے چکتے گھس کر رہ جائے۔ پھر نوکر بھی ایسا جو کہے کہ جنازہ ہی جائے گا اس گھر سے۔

چھوٹے میاں۔

کلیم میاں: کیا بات ہے شکورا بابا۔

شکور : میاں نے کہا، کیا نہیں فرمایا ہے کہ آپ اُن کے کمرے میں آ جائیں۔ آ جائیں یہیں تشریف لے آئیں۔

کلیم : شکریہ بابا۔ میں چلا جاتا ہوں آپ اس تکلف کی تکلیف نہ فرمایا کریں۔ شاید آپ بھول جاتے ہیں کہ آپ نے مجھے گودوں کھلایا ہے بہتر ہے میں جا رہا ہوں۔

شکور : اب میں بھول جاؤں گا ان کو گود میں کھلانا، تو یہی رہتا ہے اگر کہیں یہ بھول گئے ہوں۔ بابا ذکر کیا ہے وہ ذکر کرنے سے چھوٹا بن جاتا ہے۔ شکرا دو تو بچہ پرور دیا۔ اس تمہاری بھولی باتیں ہیں شکور میاں۔ سٹھیا گئے ہو۔ دیا کس کا ہے۔ ذکر بس ذکر ہی ہوتا ہے، سو یہ سے یہ وقت آیا تم سے وہ تحفہ چھوڑ کر ہو۔ اب اگر ہم چل نہ سکیں ہو تو شاید بخشا نصیب ہو جائے نہیں تو پھر سے بھرو اور جب ہم چلے تو پھر آواز دینے شکور۔ تم نے میاں شکور، تم پرانے ہو۔ تم آدمی تھوڑے ہو کولہو کے بیل ہو۔

کلیم : مجھے بڑا اچھا بھائی جان آپ نے۔

شمیم : بھئی وہ آیا تھا بھائی جان صاحب سے جو مکان دیکھنے آئے تھے؟

کلیم : اُن کو مکان پسند ہے کرایہ کا مسئلہ بھی طے کر گیا ہے۔ آدمی بھی شریف معلوم ہوتے ہیں۔

شمیم : صاحب ان کی شرافت کو لے کر کیا ہمیں چاٹنا ہے۔ ہم کو کسی ان سے رشتہ داری جوڑنی ہے کہ آپ ان کا حسب نسب معلوم کرنے بیٹھ گئے۔ سوال تو یہ ہے کہ وہ سال بھر کا پیشگی کرایہ اور کرایہ کے علاوہ دو ڈھائی ہزار دینے پر آمادہ ہیں یا نہیں۔

کلیم : یہ بات میں نے اُن سے نہیں پوچھی۔

شمیم : جو آپ نے پوچھا ہی کیا، صرف ان کے خاندانی حالات، جواب نہیں ہے آپ کا بھی کلیم میاں۔ پوچھنے اور سوچنے کی جو باتیں تھیں وہی آپ چھوڑ گئے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ باتیں آپ نے کیوں نہیں پوچھیں؟

کلیم : اس لیے کہ میں ان باتوں کو جائز نہیں سمجھتا۔

شمیم : کیا غضب، کمال کرتے ہیں بھیا آپ بھی۔ بھائی میرے آپ کو معلوم نہیں ہے کہ مکانوں کی اتنی قلت ہے اور کرایہ داروں کی اتنی کثرت کہ ہم جو مطالبہ بھی اُن کے سامنے رکھیں وہ ہاتھ جوڑ کر اس کو منظور کریں گے۔ ذرا غور تو کیجیے کہ جائیداد عنایت کیا کم ہے کہ ہم ان کو رہنے کے لیے مکان مہیا کر رہے ہیں جس کا وہ خواب بھی نہ دیکھ سکتے۔ اب آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم صرف ایک مہینے کا کرایہ لے کر مکان اُن کے حوالے کر دیں۔

کلیم : ہونا تو یہی چاہیے اور جائز طریقہ تو یہی ہے۔ مگر آپ ضرورت مندوں کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے ان کا خون چوسنا چاہتے ہیں۔ میں اس کو ظلم سمجھتا ہوں۔ پگڑی کا ناجائز مطالبہ کم سے کم مجھ سے ممکن نہیں ہے۔

شمیم : بھئی حد کر دی آپ نے بھی۔ میرے بھائی صرف یہی طریقہ ہے کہ ہم مکان کی فوری مرمت بھی کرا سکتے ہیں۔ اور اپنا کچھ قرض بھی ادا کر سکتے ہیں۔ ارے بھئی ڈھائی ہزار نہ سہی ڈیڑھ ہزار سہی مگر کچھ نہ کچھ تو لینا ہی چاہیے۔

نعیم : بہرحال یہ تو اصولی اختلاف ہے۔ میں اس کرایہ کو زیادتی بلکہ مجرمانہ زیادتی سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک تو ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار جو کرایہ مقرر کیا گیا ہے وہ ہی بہت زیادہ ہے اس زیادتی کے بعد یہ زیادتیاں جو آپ فرما رہے ہیں اصولاً یا قانوناً کسی حیثیت سے بھی جائز نہیں۔

نسیم : موقعہ سے فائدہ نہ اٹھانا میرے نزدیک حماقت ہے۔ اس وقت سب ہی یہ کر رہے ہیں۔ ہمارے پڑوسی میر صاحب ہی ہیں اپنے دو مکان پگڑی پر اٹھا کر تیسرا مکان بنوا رہے ہیں یا نہیں۔ جب سب ہی پگڑی لے رہے ہیں تو آپ کو کیا پس و پیش ہے۔

نعیم : پس و پیش صرف یہی ہے کہ یہ جرم ہے اور جرم بھی ایسا کہ میری طبیعت اس کو قبول نہیں کرتی۔

نسیم : بہتر ہے۔ آپ یہ قصہ مجھ پر چھوڑ دیجیے۔ میں یہ مکان بھی اٹھائے دیتا ہوں کرایہ پر اور پگڑی کی یہ رقم بھی لیے لیتا ہوں کہ بغیر کسی انتظار کے فوراً ہی اس کی مرمت بھی شروع ہو جائے اور اس کا حلیہ بھی بدل جائے۔

نعیم : میری رائے یہ ہے کہ اس سلسلے میں آپ ابا جان سے مشورہ کر لیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ خود اس طریقے کو پسند نہ فرمائیں گے۔

نسیم : پھر وہی ابا جان۔ صاحب ہزار مرتبہ آپ سے کہا ہے کہ ابا جان کو آپ ہر معاملے میں نہ لایا کریں ان کو بیٹھا رہنے دیجیے اپنے گوشۂ عافیت میں۔ وہ کیا جانیں کہ ہوا کا رخ کیا ہے۔ انھیں کیا معلوم کہ دنیا ان کے زمانے سے کس قدر مختلف ہو چکی ہے۔ اس دنیا سے نپٹنا اب ہمارا کام ہے ان کا نہیں۔

نعیم : جب میرے اور آپ کے درمیان اتنا اہم اصولی اختلاف موجود ہے تو فیصلہ ابا جان ہی کر سکتے ہیں۔

نسیم : پھر وہی پہلے والی بات۔ اصول اور اختلاف سے کر بھائیوں بھائیوں میں کہیں اختلاف ہوتے ہیں۔ جب ہزاروں روپے کے نوٹ ہاتھ میں پھڑپھڑائیں گے یہ سب اختلاف ختم ہو جائے گا۔

نعیم : آپ خدا کو سب سے بڑی بھائی جان نوٹوں کی اس سے دبیز گڈی تو کر ڈال کر جا سکتی ہے۔ اس سے بھی زیادہ دبیز گڈی قتل کرا سکتی ہے اگر جرم ہی کرنا ہے اور نوٹوں کی گڈیوں کے لیے کرنا ہے تو یہ ایک جرم ہی کیوں کیا جائے کوئی بڑا ہاتھ مارنے میں کیا مضائقہ ہے۔

نسیم : آپ کے خیال میں اپنے مکان کو پگڑی پر اٹھانا اور اپنے مکان کا پیشگی کرایہ لینا گویا ڈکیتی اور قتل قسم کے جرائم کی صف میں آتا ہے۔ کمال ہے صاحب بھائی میرے روپے کی ہم سب کو شدید ضرورت ہے ورنہ ڈھل جائیں گے۔ سچ پوچھو تو میں اسی ایک ترتیب کی وجہ سے مکان کرایہ پر اٹھانے کے خیال سے متفق ہو گیا ورنہ ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار بھی بھلا کوئی رقم ہے۔

نعیم : سو باتوں کی ایک بات یہ ہے بھائی جان کہ اگر آپ کو یہ مکان پگڑی پر اٹھانا ہے یا اس کا سال دو سال کا کرایہ پیشگی لینا ہے تو میں نہایت ادب کے ساتھ معافی چاہتا ہوں میں بیچ میں نہ پڑوں گا۔

نسیم : بہتر ہے نہ پڑیے آپ بیچ میں اور اگر آپ کا خیال یہ ہے کہ ابا جان ہی کو اس سلسلے میں فیصلہ کرنا چاہیے تو بدرجہ مجبوری

میں بھی تیار ہوں ورنہ میں نہیں چاہتا تھا کہ ابا جان کو خواہ مخواہ یہ زحمت دی جائے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ ہم بھائیوں میں کا اتفاق نہیں ہے۔

کلیم : اگر اتفاق اس طرح نہیں ہو سکتا ہے کہ ہم دونوں بھائی سازشیں نہیں کر سکتے تو بہت مبارک ہے یہ اختلاف۔

حلیم : خیر میں آپ سے یہ بیجا پند و نصائح سننا نہیں چاہتا۔ آپ بے شک ابا جان سے کہہ دیں کہ میں چنگی کرایہ وصول کرنے کی تائید میں ہوں اور کچھ مزید روپیہ بھی چاہتا ہوں بلکہ آپ یہ زحمت کیوں فرمائیں میں خود بات کیے لیتا ہوں (جاتا ہے۔)

شکور : (بڑبڑاتا ہے) کچھ نہیں رہا ہے اب لے دے کر یہ ایک گنبد رہ گیا ہے اب اس پر دانتا کل کل ہو رہی ہے۔ بڑے صاحبزادے کا بس چلے تو کمبل ڈال کر لوٹ لیں جو ان کو ملے اور چھوٹے میاں کے بس میں ہو تو ساری دنیا کو سمیٹ میں کا گھر میں رکھ لیں ملتا ہے تو یہ ہے مگر شکور میاں سچ پوچھو تو دونوں ہی کا جواب نہیں پر تم کرو شکور میاں۔ تین میں نہ تیرہ میں دستی کی گرہ میں۔ تم یہ باتیں سوچتے ہو کیوں جلدی کا شکر کرو زندگی کے کا ہی ہی ہی ہی بھی بیت گئی۔ بی بی بہ ہیں کہ جیسے آئی تو کچھ سے کیا مگر وہ تیرے سے پہلے تو ادھر پا اُجرکی روٹی اور چولہ کا ساتھ ہے۔

حلیم : (زور سے آواز دیتا ہے) شکور، شکور !!

شکور : حاضر ہوا میاں۔

حلیم : (آواز دے کر) چھوٹے میاں کو بھیجو ابا جان یاد فرماتے ہیں۔

شکور : (چند قدم آگے) بہت اچھا (پھر بڑبڑاتا ہے) یاد فرماتے ہیں مطلب یہ کہ ہوتے ہیں چھوٹے میاں بھی کوئی سبق ہیں کہ ان کو یاد فرمایا جائے۔ آدمیوں کی طرح یہ بلیں کہا ابا ابا جان بلاتے ہیں اس زبان کو تو شکور ہی سمجھتا ہے کوئی نیا نوکر آئے تو خود یاد کر رہ جائے ان باتوں کا مطلب۔ اسے میں نے کہا چھوٹے میاں حضور یاد فرماتے ہیں آپ کو۔

کلیم : (کمرہ آ جاتا ہے) میں اسی طرف جا رہا تھا۔

شکور : (پھر بڑبڑاتا ہے) اب یہ گئے ہیں لے ابا جان کو کون ٹھیک کرتا ہے۔ میں ہوتا ان کی جگہ تو اس جھگڑے کو بیچ ہی ایک ایک رسب کا حصہ دے دیتا اور خود اللہ اللہ کرتا۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ بڑا بیٹا تو اڑائے گل چھرے اور چھوٹا رہ جائے منہ دیکھتا۔ پر تجھ سے کیا شکور میاں تم تین میں نہ تیرہ میں دستی کی گرہ میں (دروازے پر دستک)

مولوی صاحب : تشریف لے آئیے۔ بیٹھے رہیے کلیم میاں۔ بیٹھ جائیے اپنے بھائی جان کے برابر۔ مجھے ابھی حلیم میاں سے معلوم ہوا ہے کہ آپ کرایہ دار رکھنے کے سلسلے میں اب کچھ پس و پیش کر رہے ہیں۔

کلیم : جی نہیں تو۔ جو زیر ہو آپ کی ہستی میں پس و پیش کس طرح کر سکتا ہوں۔ البتہ بھائی جان کی اس رائے سے متفق نہیں ہوں کہ کرایے کے علاوہ کرایہ دار سے ایک مستقل رقم پگڑی کے طور پر لی جائے اور کرایہ بھی کم سے کم ایک سال کا پیشگی وصول کیا جائے۔

نوری صاحب: پگڑی ؟ یہ خیال آپ کو کیسے آیا شمیم میاں۔ میرے تو تصور میں بھی نہ تھا کہ اس صنعت تک آپ کا ذہن رسا پہونچ سکتا ہے۔

شمیم : ابا جان میں خود پگڑی اور پیشگی کرایہ کی تائید میں نہیں ہوں مگر خیال صرف یہی تھا کہ اس طرح ہم مکان کی فوراً مرمت کرا سکتے ہیں۔ اور کرایہ داروں سے جو کرایہ وصول کر رہے ہیں مکان اس کے مطابق بنا سکتے ہیں۔ اگر آپ پگڑی کی تائید میں نہیں ہیں۔ تو ایک سال کا کرایہ ہی پیشگی مل جائے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔

نوری : آپ کے نزدیک یہ بجائے خود ایک قسم کی پگڑی نہیں ہے ؟

شمیم : ابا جان آج کل عموماً یہی ہو رہا ہے۔ اور مکان کے متلاشی اس سے زیر بار نہیں ہوتے بلکہ ان کو خوشی ہوتی ہے کہ نہ صرف مکان مل گیا بلکہ اس استحکام کے ساتھ ملا ہے کہ اب گویا سال بھر تک ان کو مالک مکان بے دخل نہیں کر سکتا۔

نوری صاحب: ان کو جس قسم کی مسرت ہو سکتی ہے اس کا اندازہ آپ ان کی جگہ پر ہوں جب ہی کر سکتے ہیں۔ میری سمجھ میں تو یہ بات آئی نہیں کہ تقریباً دو ہزار روپیہ یکمشت آپ کو دے کر کوئی خوش ہو سکتا ہے۔

شمیم : ابا جان یہ پیش کش خود حکیم صاحب کی طرف سے ہوئی ہے کہ ہم سال بھر کا پیشگی کرایہ لے کر مکان اُن کی مرضی کے مطابق بنا دیں۔

نوری صاحب: یہ غلط ہے میں مکان کرایہ پر دے رہا ہوں اپنی مرضی کرائے پر نہیں دے رہا ہوں۔ اس مکان کی مرمت میری مرضی کے مطابق ہو گی۔ آپ یہ چاہتے ہیں کہ سال بھر کا پیشگی کرایہ لے کر ہم سال بھر کے لیے کرایہ دار کی مرضی کے غلام ہو جائیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ نے اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ جو شخص یکمشت اتنی بڑی رقم دے گا اس کے مطالبات کس قدر سخت ہوں گے۔ دو ہزار کی رقم پر تو آپ ریجھ گئے مگر یہ اندازہ نہ کیا کہ اس کے بعد کرایہ دار کی فرمائشوں کی تعمیل سال بھر کا کتنا شدید اور مسلسل عذاب ہو گا کہ آج غسلخانوں میں ٹیش کا اہتمام کر دیجیے۔ آج باورچی خانے میں پنکھا لگا دیجیے۔ اس کمرے کا رنگ فیروزی ہو۔ اور اس کمرے کا شہابی۔

شمیم : ابا جان ان میں سے کوئی مطالبہ ان کی طرف سے نہیں ہے وہ تو صرف معمولی مرمت اور قلعی چاہتے ہیں۔

نوری صاحب: جی ہاں میں جانتا ہوں ابھی کوئی مطالبہ اس لیے نہیں ہے کہ ان کو صرف مکان کی ضرورت ہے مگر جب مکان مل جائے گا تو ان کو بعض بعض نئی آسائشوں اور آرائشوں کی ضرورت بھی ہو گی اس کے علاوہ جس سے ہم اتنی بڑی رقم یکمشت لیں اس کے لیے اہتمام کرنا بھی ہمارا فرض ہو جاتا ہے۔ پھر آپ نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ سال بھر کا کرایہ تو آپ یکمشت لے کر خرچ کر دیں گے اس کے بعد کیا ہو گا۔ سال بھر کی ضروری مرمت کہاں سے ہو گی۔ ہم کو یقیناً یہی محسوس ہو گا کہ ہم نے آدھا مکان مفت کرایہ پر اُٹھا دیا اور اب خود اپنی گرہ سے اس کی دیکھ بھال پر روپیہ صرف کر رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ بجائے یہاں ضرورت کے لیے روپیہ پس انداز کرنے کا نہ طریقہ ہے نہ سلیقہ لہذا میں آپ کو اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ کہ آپ سال بھر کا کرایہ پیشگی وصول کر کے اپنے مصائب میں اور بھی اضافہ کر لیں۔

شمیم : جیسی آپ کی مرضی۔
کلیم : میری رائے یہ تھی کہ حکیم صاحب یا جو کرایہ دار بھی آتا ہے اس سے ہم یہ طے کر لیں کہ سال بھر میں ایک مہینے کا کرایہ اس مکان کی مرمت پر صرف ہوا کرے گا۔
ویسے ہونا تو یہی چاہیے مگر چونکہ مکان کافی مرمت طلب ہے لہٰذا فی الحال بجائے ایک مہینے کے دو مہینے کا کرایہ مرمت پر صرف ہو گا مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ دو دو مہینے کا کرایہ چھوڑ دیا جائے۔ اصولاً ہم صرف ایک مہینے کا کرایہ چھوڑ سکتے ہیں اسی طریقے پر عمل کیا جائے آپ لوگ تشریف لے جا سکتے ہیں۔
شکور : (بڑبڑاتے ہوئے اپنا پیچھا چھڑاتی ہوئی) . وہ بہت تھے کرتے کی ایک ہوئی سی رقم اور ملتے جاتیں گے کچھ دن جو۔ بچے کو تاشوں کی پیچھے ہوں گے پار وہ بڑے میاں نے سارا قصہ ہی صاف کر دیا۔ بس ایک مہینے کا کرایہ اور لگا دو مکان پر نہ باسی بچے کو تاکہ لگانے شکور میاں بقدر فائدہ اس میں تھا کہ بچے یہ تاش پتے کھو۔ نہ کچھ مل ہی جاتا تم کو بھی چلو نہ سہی۔ اللہ مالک ہے اپنا بھی۔ تو بیوں اس گھر میں گھوم تم سے کیا تم تو تن میں یہ تیرہ میں دستی کو گرہ میں یہ تماشہ بھی دیکھو تو بڑے بھائی شاید کچھ روٹھ گئے ہیں چھوٹے بھائی سے۔
کلیم : (شمیم کا تعاقب کرتے ہوئے) بھابی جان۔ بات تو سنیے۔ ٹھہریے تو سہی۔
شمیم : مجھے کچھ نہیں سننا ہے جو آپ کا جی چاہے کیجیے۔ میری بلا سے آپ ایک مہینے کا کرایہ چھوڑیں نہ لیں بلکہ کرایہ دار کو اپنے گھر میں رکھنے کا معاوضہ خود اپنی گرہ سے دیں۔ میں اب اس گھر کے کسی معاملے میں دخل دینا ہی نہیں چاہتی آپ جانیں اور آپ کا کام۔
کلیم : میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ اب آپ حکیم صاحب سے خود بات کریں گے یا
شمیم : میں کسی سے کوئی بات وات نہیں کروں گی۔ آپ کا گھر ہے آپ مالک و مختار ہیں آپ کے اشاروں پر اس گھر کا انتظام چل رہا ہے۔ میں ہوتی کون ہوں کسی سے کوئی بات کرنے والی۔ مجھ سے اب کوئی مطلب نہیں۔
کلیم : آپ اس وقت تو ناراض ہو رہی ہیں۔ مگر بعد میں آپ ہی کو معلوم ہو گا کہ بگڑے ہوئے بیٹے کے جرم سے بچ کر آپ نے اپنے احساس کو کس قدر ٹھیس لگائی ہے اور چھوٹی کرایہ نہ لے کر اپنی ذمہ داریوں کو کس قدر کم کیا ہے۔
شمیم : مجھے آپ کے ان قیمتی مشوروں کی ضرورت نہیں آپ اپنے نیک احساس اور اپنی ذمہ داریوں کی نیک دلی کے ساتھ جو چاہیں کریں مگر مجھ کو بخش دیں میں ان معاملات میں پڑنا ہی نہیں چاہتی میری بلا سے لوم بنے یا کچا سبے۔

(جاتا ہے۔)

شکور : (بڑبڑاتا ہے) لو شکور میاں بس۔ وہ تو بالکل ہی روٹھ گئے۔ مگر یہ بیچ آپ ہی کی بگڑنے کی بات اتنی بڑی قسم آتی نظر آ رہی تھی۔ نہ جانے کیا کیا منصوبے بنے ہوں گے سب خاک میں مل کر رہ گئے۔ جیسے سال بھر کچھ ہو کا چار دن کی چاندنی تو ہو ہی جاتی پیسے وہ ایک مرتبہ پھر جھلک دکھا ہی جاتے۔ مگر ان چھوٹے میاں نے سارا مزہ کرکرا کر دیا۔ یہ جب سے کیا ہے کراہنے تھے ہی نہ تیرہ میں دستی کی گرہ میں۔

خزانے کا سانپ

علی عباس حسینی

مادھو کا مکان ... پور میں سب سے اونچے ٹیلے پر تھا۔ وہ گاؤں کا سب سے بڑا کسان اور "بھوم دھر" تھا۔ چاول کی کھیتی تھی اور ... کی پیداوار۔ اتنا ڈھیروں نفع اور کھانے والے تین! ایک وہ، ایک اس کی بیوی ... اور ایک ان کی محبت یا رفاقت جو بیٹے ... باپ بیٹے کی صورت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ مادھو پانچ فیٹ کا موٹا، توندیل، چندیا بھی صاف اور داڑھی مونچھ بھی۔ ... اور اسی کپڑے کی اونچی دھوتی پہنے، ننگے پاؤں، ننگے سر، بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے غلاف چڑھا ہوا بہت ہی ... ہے!

چھوٹو سترہ برس کا نوجوان تھا۔ سبزہ آغاز، چھریرا بدن، ساڑھے پانچ فیٹ سے نکلتا ہوا قد، متناسب اعضا، کھلتی رنگت۔ ... اس کے بھی ہوتے اور اگر پھٹے بھی، مگر جوانی خود ایک حسن ہے اسے کون چھپا سکتا ہے! یہ دلکشی اسے باپ کی جگہ ماں ... کسی زمانے میں یقینی صورت شکل کی اچھی رہی ہوگی۔ وہ اب بھی مرجھایا یا مگھا پھول تھی۔ جسم کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں، ... ہو گئی تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں "نینوں کے بان" نہ چلتی تھیں۔ وہ تیر غلافی پلکوں کے کونے کی کیچڑ میں پھنس کر رہ جاتے تھے۔ ... کھانے دیتی تھی نہ پہننے۔ مرلی مارکیہ کی ساری اسی وقت اترتی جب وہ میلی چکٹ ہو جاتی۔ گھٹنوں میں سے صرف ہاتھ ... کپڑے سے تھے۔ چلتی تھی تو سوکھی پتیوں والی کھڑکھڑاہٹ سنائی دیتی۔ باتیں کرتی تو معلوم ہوتا کبھی کرتی تھی یا ... پڑتا ہے۔ لفظیں مشکل سے ملتی ہیں اور دقت سے منہ سے نکلتی ہیں۔ ہر وقت خیال رہتا کہیں کوئی ایسی بات منہ ... نہ جائے کہ شوہر خفا ہو جائے، لیکن اس سوکھی گڑیا میں چھوٹو کی حیات کے موقع پر کبھی نیل کا جوار بھاٹا آجاتا۔ اس وقت وہ گویا چھلک ... پڑتی۔ لڑکا ... ہاتھ پاؤں سے سڈول، ناک نقشے کا درست، پھر بے زبان ایسا کہ بچپنے میں ہٹ کی، نہ جوان ہو کر ... جہاں باپ نے کھلایا کھایا، جو پہنایا پہنا۔ دیکھتا تھا کہ گھر پہ چاول کی کھیتی ہے منوں غلہ پیدا ہوتا ہے، ہزاروں ... روپے ... مگر نہ گیہوں کھانے کو ملتا ہے، نہ اچھے چاول۔ بس جوار چنا جیسے قسمت میں لکھ گئے تھے۔ مگر یہ بھی دیکھتا تھا کہ ... اس کا مالک تھا جس کے سب کچھ اختیار میں تھا، وہ خود بھی انہی موٹے جھوٹے کپڑے میں اور انہی روکھے سوکھے کھانے پر ... تھا۔ پھر چھوٹو کیا کہتا کیا سنتا! وہ کیسے کوئی چیز اپنے منہ سے مانگتا۔

مادھو ... ضرور تھی۔ اب اس طرح ننگے بھوکے رہنے کی غرض کیا ہے! زندگی کا کوئی مقصد تو ہوتا ہی ہے۔ وہ ... روپیہ کمانا، اسے گاڑ کر ... جوڑ جوڑ کر رکھنا بھی منزل و مقصد حیات ہو سکتا ہے اور اس کا شوہر ... سب سے بڑی منزل سمجھتا ہے۔ منزل کا انسانی خواہشوں، منصوبوں اور لالچوں کی طرح کہیں سمت کنارہ نہیں ہوتا! پہلے ایک قریب

کی منزل دکھائی دیتی ہے۔ آدمی وہاں پہنچا تو اُسے معلوم ہوا کہ اُس کے آگے ایک اور دلفریب مقام ہے۔ جیسے ابوالہول کی نگاہ پہنچا جب بلال تک سارے ساحل کی، تو آس سے کہیں زیادہ بہت کچھ پیچھے عکس دکھائی دینے لگے۔ جب جان کی بازی لگا کر اس ساحل میں بدر دکھا تو اس سے دیپ نے ایک اور ادھ بن کا محل کھڑا کر دیا۔ غرض یہ راہ ہر منزل پر کھلنے کی بجائے بڑھتی جاتی ہے۔

اُدھو کے دیکھنے کے ساتھ ساتھ اُس کا دماغ بھی بڑھتا جاتا تھا۔ جیسے جیسے اُس کا کھیت بیس دو بیس سے گیتی تو دو بیسی تو بنا اور اس سے چلے کر اور بھی بڑھانے کے خواب دیکھنے لگا۔ اور وہ ان میں اس طرح کھو جاتا، کھو جاتا کہ اسے بیٹے کی بڑائی دکھائی دیتی اور نہ اماں نہ یاد دکھائی پڑتی۔ وہ کہتی، "آنے والوں کی بیزاری بیاہ کی گئی ہے۔ اب ہو گئے، گھر کا کام سنبھالے۔ لیکن اب جوان ہوا، دیکھتے نہیں اس کا کام میں اب دنیا بھی نہیں تھا۔ بس شام اُدھر، اُدھر تکیہ لگا اٹھا بیٹھا جاتا۔ ڈرتا اچھا ہے کہ کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو بیچے بچانے تک جگ ہنسائی ہو جائے گی۔"

اُدھو اپنی توند پر ہاتھ پھیر کر کہتا۔ "تم تو مفت میں ہلکان ہوتی ہو اور پریشان کرتی ہو بیکار۔ اس دھرم میں کیا ہے کہ ایک جو تو کمانے والا اس گھر میں سے آؤں۔ پھر تم اتنا تنبا ہی تو اس بیاہ جا ہے۔ ہم کیسی کیسی بھاگتے۔ اگر وہ ہم بھی اس کے سن میں کریا کرتے تھے ہیں ہیں ہا ہا!" اور وہ توند کی سہمی بیوی کو آنکھ مار کر قہقہہ لگاتا۔ یہ مردانہ وار قہقہہ نہ ہوتا تھا۔ اس کے نزدیک جذبات کی اتنی فضول خرچی کوئی اچھی چیز نہیں تھی۔ اس لیے ماں باپ کر کچھ نہ ہو جاتا۔ یعنی شکل کھلے ہوئے پھولوں کی جگہ اور وہ کھسیانی کھسانی سی۔

محکمے کے ابر ایسے اُدھو بہت خوش تھا۔ گیہوں کی فصل بہت اچھی ہوئی تھی۔ سرکار سے کنٹرول بھی اٹھ گیا تھا۔ زیادہ نفع حاصل کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے خواہ مخواہ سستے بھاؤ اسے بیچنا پڑا تھا۔ پار سال تو اس نے صرف پانچ سو من گیہوں کٹتے ہی بیچ دیا تھا اور جب بھاؤ چار سیر کی جگہ ڈھائی سیر پہنچا تو اسے پچھتاوا۔ اب کے اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو، وہ اپنا گیہوں بیچ کر اس وقت جمع نکالے گا جب تک منڈی سے مسنا نقد نہ بکنے لگے۔ اس نے گھر کے بڑے صحن کو پکا فرش کر کے کھدوایا اور تہہ میں بھوسا بھروا دیا اور گیہوں کی بڑی بڑی بوریاں اس پر تلے اوپر رکھوا دیں۔ اوپر بھی اور بھوسا ٹھونس کر اس نے صحن کو دوبارہ برابر کر دیا۔ یہ مٹی اس نے اصلی اور پیلی بھر دی۔ اس نے دو دن چار چار مزدور لگا کر دُرمٹ سے اسے کٹوا کر سڑک کی طرح ہموار کر دیا اور اسے ہر طرح مضبوط بنا دیا۔

اب وہ بے فکر تھا۔ بڑے بڑے آڑھتیے اور بیوپاری کلکتے سے آتے، گیہوں خریدنے پر اصرار کرتے مگر اُدھو نے سانپ کی طرح کھیتی پر بیٹھا سب کو پھنکاریں مار مار کر بھگا دیا۔ وہ کہتا "جب ہی تو کہتا کہ جب کہیں ضلع بھر میں گیہوں ڈھونڈے میں نہ ملے گا۔ چھوٹے کسان زیادہ پیداوار بازاروں میں بیچ چکیں گے اور دکانوں اور گوداموں میں بھی کہیں ایک دانہ نہ رہ دے گا۔"

اُدھو کے گول مول جسم سے اکثر لوگ دھوکا کھا جاتے تھے۔ سمجھتے تھے اس ڈھول میں خول ہی خول ہو گا۔ ایسے ہٹے کٹے سے عقل سے کیا واسطہ۔ مگر وہ بلا کا ہوشیار اور مستقل مزاج تھا۔ آج سیدپور میں سب سے بڑی کاشتکاری اور سب سے اونچی حویلی

...ت اہمیت تھی۔ باپ مرا تھا تو اس نے دو بیگھے کھیت، دو جوڑ بیل اور ایک کچا مکان چھوڑا تھا۔ مادھو نے اپنی محنت، اپنی کنجوسی، اپنی
...روپے، پیسے پیسے کو دانت سے پکڑ کر گاؤں کا سب سے شاندار مکان بھی بنوایا۔ وہ چار بیل کی کھیتی بھی کرنے لگا اور پچاس بیگھے زمین کا
...مالک بھی ہو گیا۔ مکان کی نیو ٹیلے پر بڑی گہری ڈلوائی تھی۔ اسے اس کا خیال تھا کہ بید پور گھاگھرا کے کنارے ہے اور دریا اس کے گھر
...کے سامنے پر بہتا ہے۔ لیکن ایسے معاملات میں "آگم کا سوچ" اس کا اصول تھا۔

اس لیے اب وہ گھر کی طرف سے بے فکر اور کھیتی کی طرف سے مطمئن ہو کر بسکٹ پر بیٹھا نریل گڑگڑاتا اور اس کی آواز میں ایک
...ہوتی اور اس کی دھڑکن میں ایک رقص کی کیفیت محسوس کرتا۔ اسے معلوم ہوتا جیسے کبھی دیوی گنگا جل میں غوطہ لگا کر سطح آب سے
...نکلتے ہوئے اپنے کو سکوڑنے کے بل سے بھی زیادہ باریک ساری میں لپٹتی جاتی ہیں اور ناچتی جاتی ہیں اور ان کے گھنگروں کی جھنکار اتنی
...دلفریب، اتنی ہی شرمیلی، اتنی ہی رسیلی تھی جتنی کہ ٹکسال میں گرتے اور بستے ہوئے زرد و سپید سکوں کی۔ وہ یکبارگی اٹھ کر نریل کو
...کے کونے سے لگا دیتا۔ جھومنے لگتا، سوچنے لگتا، گنگنانے لگتا اور اس طرح مسکرا پڑتا جیسے بلی چوہے کو کھا کر مسکراتی ہے، جیسے
...ڈاکٹر ایک پرپیچ کا آپریشن کر کے مسکراتا ہے، جیسے گدھ میدان جنگ کو لاشوں سے بھرا ہوا دیکھ کر مسکراتا ہے۔

...دن گزرتے گئے۔ رت بدلی، موسم بدلا، جون کا مہینہ آیا، بادل کے ہجوم آئے۔ انہوں نے کچھ دنوں تو آسمان پر چہل قدمی
...کے قدم ذرا تیز کیے، دوڑنے بھاگنے لگے اور آخر میں تھک کر جگہ جگہ پر دم لینے کے لیے ٹھہرنے لگے۔ گاؤں والوں نے چھپر
...روں کو سیدھا شروع کیا۔ کھلیانوں میں پڑا ہوا اناج، بھوسا، اپلے، چپاتیاں، ... اپلوں کے ڈھیر، ... سوکھی لکڑیوں کے گٹھے کاٹ
...کر چھپروں، کوٹھریوں میں رکھنے لگے۔ جہاں پانی روکنے اور دھان لگانے کے لیے دس بیس کھیتوں کی مینڈیں اونچی کرتے،
...پانچ سات گھاگھرا کے بڑھتے تیور بھی ضرور دیکھ آتے۔ ... بلندی پر ... تھا گھاگھرا کا کیا اعتبار، کس وقت کون سی کروٹ
...وہ ہمیشہ برسات میں آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ اتنا بڑا دریا چھوٹی ندی میں بدل جاتا ہے۔ ادھر ابلا اور ادھر بڑھا۔ اس کنارے
...اس قصبے کو ڈوبا۔ کہتے ہیں: ویاڈ راجہ کے ... اس دریا کے لیے برساتی ہوا کا ایک جھونکا ہی کافی سے زیادہ
...ہے۔ اس کی کلیں ایک بدمست ہاتھی کی طرح ہو جاتی ہیں۔ اس باغ کے درخت، اس سبزہ زار کو روندا، فیل خانے کی دیواریں پاش
...پاش ... چاہا کر سونڈ سے کھینچ کھینچ کر توڑ پھینکا۔ اخبار والے، ریڈیو والے بھی برابر خبردار کر رہے تھے۔ اب کی برس
...زوروں ہے۔ پچھلے برسوں کی سی جانی پہچانی نہیں ہے۔ ... میں گرانے ہوئے ... اور سائنس ... نے
...میں نہ جانے کتنی تبدیلیاں کر دی ہیں۔ روسی اسپتنکوں اور امریکی راکٹوں نے پوری ہوائی فضا میں ہلچل ڈال دی ہے۔ پانی کی قیامت کا
...اندازہ کتنے پڑھیں ... کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

مادھو ایسی ... اَن سنی کر دیتا۔ اسے یقین تھا اس کا مکان ... سب دریا سے کئی فرلانگ کے فاصلے پر ...
...بات ... کی کوئی وجہ ... جب ... اس طرح کی آفتیں آئیں۔ ہزاروں اپنا ... گھر ...
...گئے۔ ہزاروں خاندان برباد ہو گئے۔ ... ایسے ...
...گئے۔

جس سے دھیا پانی بہنے لگا۔ ایک ہفتہ تک متواتر دن رات برسا۔ بادل کھل کے برسا، بجلی تڑپ کے برسا، کڑاک کڑک کر برسا
گرج کر برسا۔ کچی دیواریں اور چھتیں بیٹھ گئیں، چھپروں کی ٹٹیاں اور کچی جھونپڑیاں ملبے کا ڈھیر ہو گئے۔ کچھ مویشی دب کے مر گئے
کچھ لوگ زخمی ہو کے سلو یا کر نکل گئے، کچھ بیگ کر انتظار تیز اور دیہاتوں میں گرفتار ہو گئے۔ ادھر دریا نے ہاتھ پاؤں نکالنے شروع کیے
تو دونوں کناروں کو بھرا، پھر چھلک کر پھیلا اور بڑھا اور اس بھیانک اس طرح ادراس شتنے سے چلا، تیز تھا اور دوڑنے
کے مترادف تھا۔ اس کی لہریں اچھل کر جاتا اور کٹتے، وادیاں اپنے پل میں بہا کر لاتا اور پلوں کو گراتا، سڑکوں کو پامال کرتا، بستیوں کو
ڈراتا، جنگلوں کو اکھاڑتا، آبادیوں کو ڈھاتا، نکل جاتا۔ میرپور کی بستیوں کو چاٹتا، ٹکریں مارتا اور کاٹنا شروع کر دیا۔ ایک دن
دریا سے قریب والے گھروں میں شور تھا۔ "پانی دیواروں کو توڑ کر اندر گھس رہا ہے۔" لوگ مویشیوں کو ہانکتے، بچوں کو بچاتے
تھوڑا سا سامان کندھوں اور سروں پر رکھ کر اور بہت کچھ گھروں میں چھوڑ کر نکل بھاگے۔ حکام ضلع کی طرف سے بھی کچھ لوگ آ گئے
کی رہنمائی اور ان کی ہدایت پر عمل کر کے دوسری شام تک سارا گاؤں دوسرے دیہات میں پناہ لینے چلا گیا۔
مگر مادھو اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ کہتا تھا: "جان ہے تو جہان ہے۔ یہاں تو گھر ہی جان تھا اور گھر ہی جہان۔ ولی کی طرح اس نے اپنے گھر میں مضبوط جڑیں گاڑ لی تھیں۔ اُس نے اس دن کا پہلے ہی سے بندوبست کر رکھا تھا۔ وہ کیوں جاتا؟ پانی
چڑھتا ہے تو چڑھنے دو۔ بھوکے بھی تو جئیں گے۔ اسی روز سیاہ میں تو اس کی تقدیر چمکنے والی تھی۔ اسی اندھیرے میں تو اس کے
گھر کے چراغ جگمگ جگمگ کریں گے۔

جب بیوی نے دریا کی اور بیٹے نے بھی ڈرتے ڈرتے "گر نہیں ہونے پر بھی" والا دیا چاہی تو مادھو کڑک کر بولا: "تم
دونوں ابھی جاؤ اور مویشیوں کو بھی ساتھ لیتے جاؤ۔ میں بعد میں آؤں گا۔" بیا نے بھی وہ کہ جتنا کہ سکتی تھی کہا، بہت تڑپی مگر وہ
اپنا جان اپنی بات سے نہ ٹلا اور گھر سے قدم نکالنے پر تیار نہ ہوا۔ بیا ہار گئی مگر شوہر پرست ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ماں
بھی تو تھی۔ اُس نے گنگو کو سمجھا بجھا کر مویشیوں کو ساتھ لے کے جانے کے بہانے دوسرے گاؤں بھیج دیا۔

گنگو کا سارا دن اسی کام میں گزرا۔ جانوروں کے لیے چارے کا بندوبست کرنے میں رات ہو گئی۔ پانی بھی بڑھتے
دھندلے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس طرح تڑپ کے ساتھ آیا کہ ہر شخص اپنی اپنی چھت پر بیٹھ گیا اور رام رام کرنے لگا۔ کسی
میں باہر نکلنے کی ہمت نہ تھی۔ گنگو بھی بھیگ کر چوہا ہو گیا تھا۔ گاؤں کے پناہ گزینوں نے اسے زبردستی پکڑ کر اپنے پاس بٹھایا۔
اسے ایک سوکھی دھوتی دے کر کپڑے بدلوائے اور آگ کے پاس بٹھایا۔ اسے اپنے چنے چبینے میں شریک کیا اور اسے اُس کالی ڈراؤنی
بھیانک رات میں کسی طرح میرپور نہ جانے دیا۔ صبح تڑکے ہی کروٹ لی پہلی ہی کاٹھی کاٹھی کے ساتھ وہ اٹھ کر میرپور کی طرف
بھاگا۔ گاؤں سے ذرا دور ہی اُس نے دیکھا سامنے جل تھل ہے، صرف مادھو کا گھر جزیرہ بنا بیچ میں کھڑا ہے۔ کنارے
ہی سے کھڑے کھڑے اُس نے "پتا جی، پتا جی" کہہ کر پکارا۔ مادھو نے چھت پر آ کر آواز دی۔ "کشتی اور پھاوڑا لے کر آؤ گھبراؤ
نہیں، یہاں سب ٹھیک ہے۔"
وہ کھویا ہوا گنگو کشتی ڈھونڈنے لگا۔ اسے پولیس والے مل گئے۔ داروغہ جی نے کشتی بھی دلوائی، پھاوڑا بھی لا

اور خوش خان ایک سپاہی کو بھی ساتھ لے گیا۔ وہ جوان بھی تھا، ہمت والا بھی تھا اور پیراکی کا ماہر بھی۔ دونوں کشتی میں چلے لیکن پانی کے بہاؤ سے زیادہ وہ دو خطروں سے تھے۔ ایک تو ڈوبے مکانوں کے "ڈینو تھیر" دوسرے بہتے ہوئے درختوں کے "ڈینو سر" پر موجوں سے تڑپتے، دھار سے کر کاٹتے نیچے اُوپر کی بلاؤں سے بچتے، جب دونوں کنارے پر پہنچے تو مادھو اپنے دالان میں کھڑا بے چین ملا۔ اس نے جھٹ کر کشتی سے پھاوڑا اٹھایا اور اندر گھس گیا۔ لکھو "ماں، ماں" پکارتا پیچھے دوڑا۔ زنان خانے کے کمرے سے کراہنے کی آواز آئی۔ جا کر دیکھا تو ماں چھت سے گرے بیم کے نیچے دبی پڑی ہے اور کمزور ہاتھوں سے دھنی اور مٹی ہٹانے کی کوشش کر رہی ہے اور مادھو زخمی بیوی کو نکالنے کی بجائے آنگن کی زمین کھود رہا ہے۔ لکھو کے پکارنے پر خوش بھی دالان کے پیچھے ہی کشتی باندھ کر اندر آگیا۔ دونوں نے مٹی، پلاسٹر کا ڈھیر ہاتھوں سے ہٹایا اور بے ہوش ماں کو نکالا۔ لکھو اسے گود میں اُٹھا کر کشتی میں لے گیا۔ وہاں اپنے زانو پر ماں کا سر رکھ کر اس کے چہرے سے خاک و خون پاک کیا۔ "ماں، ماں" پکارا اور جواب نہ پانے پر اس کے سینے پر منہ رکھ کر رونے لگا۔

دُوسرے کنارے سے گاؤں والوں نے شور کیا۔ "ارے لکھو جلدی کر جلدی! بھر آئی ہے تاڑ بھر اُونچا پانی بس کوس بھر اُدھر ہے۔ جلدی سب کو لے آ، بھاگ! بھاگ!" خوش خان نے پکارا۔ "مادھو! مادھو، جلدی کر و جی جلدی!" اور جواب نہ پانے پر لکھو کو مُردہ ماں پر روتا چھوڑ کر پھر اندر گھسا۔

مٹی کے صحن کو پانی نے جگہ جگہ سے کاٹ دیا تھا۔ کمتّے کا حصّہ صاف اُبھر آیا تھا اور نالیوں کی جگہ تیزی سے کٹتے میں جا رہا تھا۔ مادھو نے دیوانہ وار آس پاس کی مٹی پھاوڑے سے کاٹ کر دراڑوں میں بھرنا شروع کر دی تھی۔ نہ جانے کہاں کی اس میں قوت اور پھرتی آگئی تھی۔ وہ دوڑا جاتا تھا اور سوراخوں کو، خالی جگہوں کو بھرتا جاتا تھا۔ پھاوڑے سے مٹی رکھ کر دباتا، پاؤں سے کُوٹتا اور کہتا — "کمتّے میں گھُسے گا، نہیں جاتا، مادھو کا ہے! مادھو موجود ہے۔ ہونہہ، دیکھیں اب کیسے جاتا ہے۔"

خوش دُور ہی سے چیخا۔ "ارے چھوڑ اسے، بھاگ چل! سارا گھر گرنے والا ہے۔" مادھو نے اسے ایسے حقارت سے دیکھا۔ "تو جان بچا اپنی۔ میں تو جیتے جی اپنا کمتّہ برباد نہ ہونے دوں گا۔" خوش لپکا کہ زبردستی پکڑ لے چلے۔ مادھو پھاوڑا ہاتھ میں تول کر کھڑا ہو گیا۔ "اب قدم بھی آگے بڑھایا تو سر توڑ دوں گا۔" خوش نے بچانے کی کوشش کی۔ مادھو ہنسنے لگا۔ "تجھ کو کس نے یہاں بلایا؟ جا، تا کیوں نہیں؟ جا یہاں سے! چل!" اور وہ وار کرنے والے انداز سے سپاہی کی طرف بڑھنے لگا۔

دفعتاً زمین ہلنے لگی۔ پھر تڑخنے کی آواز ہوئی۔ ایک بہتے ہوئے شیشم کے درخت نے مادھو کی دیوار کو ٹکر ماری۔ پانی کی چھینٹیں بہت اونچی اُڑیں۔ چھت پر گری، صحن میں آ کر پاش پاش ہوئیں۔ مادھو نے قہقہہ لگایا۔ لال لال آنکھیں کر کے خوش کی طرف بڑھا، ٹھوکر کھائی، لڑکھڑایا اور پھاوڑا ہاتھ سے پھسل کر خوش کی طرف چلا۔ سپاہی چیخ کر بھاگا۔ کشتی میں اُچک کر آگیا۔ ساتھ ہی ناڑے سے اُونچی موج مادھو کے مکان سے آ کر ٹکرائی۔ موجوں نے کشتی کو دُور پھینک دیا۔ ایک چادر آب پھیلی جس میں نہ مکان تھا، نہ کمتّہ اور نہ اسے جان سے عزیز رکھنے والا مادھو!

لکھو دیوانہ وار چیخا۔ "پتاجی! پتاجی!" خوش پاس والوں کے غیر ہمدردانہ لہجے میں بولا: "اسے جانے بھی دے، بھوت نے اسے پاپ تھا پاپی!"

آپا

اپنے ایک افسانہ کا تجزیہ

ممتاز مفتی

میری نظر میں آپا حد درجہ ساز ایک [illegible] مینوفیکچرڈ کہانی رہی۔ اس کی دو وجوہ تھیں۔

پہلی وجہ یہ تھی کہ یہ کہانی کسی کی فرمائش پوری کرنے کے لیے لکھی گئی تھی۔ فرمائش کرنے والے لوگ میرے محسن تھے۔ مجھے ان کے احسان کا بدلہ چکانا تھا۔ ایک اخلاقی فرض پورا کرنا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ اخلاقی فرض پورا کرنے کی خواہش چاہے کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو پھر بھی اس سے عہدہ برآ ہونا جان چھڑانے کے مترادف ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ آپا میں نے اپنے جذبے کی وجہ سے نہیں لکھی تھی۔ اور اگر فرمائش نہ ہوتی تو شاید میں آپا پر کبھی افسانہ نہ لکھتا۔

دوسری وجہ بھی سن لیجیے!

میں ان لکھنے والوں میں سے ہوں جنہیں شہرت پہلے ہی سے چھپی مدد پر مل گئی۔ اور بعد میں افسانہ نویسی سیکھنا پڑی۔ عام طور سے ہوتا یوں ہے کہ لوگ پہلے لکھتے ہیں بار بار لکھتے ہیں۔ پھر چھپتے ہیں۔ بار بار چھپتے ہیں پھر کہیں شہرت حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ بھی لازم نہیں کہ ضرور شہرت حاصل ہو جائے۔

میں نے پہلی چیز ہی فرمائش پر لکھی۔ جذبے سے نہیں ویسے ہی لکھ دی۔ جان چھڑانے کے لیے۔ وہ چیز چھپ گئی نہ صرف چھپ ہی نہیں بلکہ بڑے دھوم دھڑلے سے چھپی۔ یوں بیٹھے بٹھائے انجانے میں شہرت حاصل ہو جانے کے بعد یہ مشکل آپڑی کہ مجھے سنجیدگی سے سوچنا پڑا کہ کیا لکھوں۔ کیسے لکھوں۔ سوچا سوچا کر میں نے یہ طے کیا کہ افسانے کا موضوع اچھوتا ہونا چاہیے۔ کوئی عظیم حقیقت۔ عام حقیقت نہیں۔ دل کی تہوں میں چھپی ہوئی کوئی بات۔ جتنی دور کی کوڑی لاؤں اتنا ہی اچھا۔

اس زمانے میں آپا ایک عام کردار تھا۔ ہر گھر میں پہلے کے قریب ہی کی یا پرے پرے ایک نہ ایک آپا بیٹھی ہوتی تھی جو نگاہیں جھکائے رکھتی۔ چپ کی اوٹ میں مسکاتی اور دھیمی آواز میں بات کرتی۔ اس زمانے میں سبھی آپا کی تعریف کرتے تھے لیکن کوئی بھی اسے دل سے نہیں چاہتا تھا البتہ ان دنوں ساجو باجی عام نہ تھی۔ بڑے بوڑھے اس کو دیکھ کر کانوں پر ہاتھ رکھتے۔ بڑی بوڑھیاں منہ میں انگلیاں ڈال لیتیں۔ نوجوان ساجو باجی کو دیکھتے تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں۔ باچھیں کھل جاتیں۔

آج کل تو سڑکوں پر، بازاروں میں، دکانوں پر، بسوں میں، سٹیشنوں پر، کلبوں میں ہر جگہ ساجو باجیوں کی بھیڑ لگی ہے آج کل تو آپائیں معدوم ہوتی جا رہی ہیں لیکن اس زمانے میں آپا ایک عام چیز تھی بے حد عام۔ ایک ایسے افسانہ نویس کے لیے جسے شہرت مل چکی تھی آپا سے عام موضوع پر قلم اٹھانا بے کار بات تھی ——— ان دو وجوہ کی بنا پر میرے نزدیک آپا کی حیثیت ایک [illegible] افسانے سے زیادہ نہ تھی۔

اب فرمائش کی تفصیلات بھی سُن لیجیے۔ یعنی آپا سے ملنے کی فرمائش کرنے والے لوگ کون تھے۔ کن حالات میں فرمائش کی گئی اور میں اس فرمائش کو پورا کرنے پر کیوں مجبور تھا۔

یہ ۱۹۴۰ کی بات ہے ان دنوں میں ایک ہائی سکول میں ٹیچر تھا۔ تنخواہ نہایت قلیل تھی۔ کھانے والے تعداد میں زیادہ تھے۔ اگرچہ میں نے یہ اصول بنا رکھا تھا کہ ٹیوشن نہیں کروں گا لیکن حالات نے مجبور کر دیا۔ میں نے اپنے ایک بزرگ اور صاحب رسوخ دوست سے کہا کہ اگر ہو سکے تو کوئی ٹیوشن دلوا دیجیے۔ ایک روز میرے دوست میرے ہاں آئے، بولے 'ٹیوشن کرو گے' ارادہ بدل تو نہیں گیا۔ میں نے کہا مضبوط کر دوں گا ارادہ اور بھی پکا ہو گیا ہے۔ وہ مجھے شہر کے ایک رئیس کے گھر لے گئے۔ تعارف کرایا۔ معزز رئیس نے میرا جائزہ لیا۔ پھر کہنے لگے آؤ میں تمہیں تمہارے شاگردوں سے ملا دوں۔ معزز رئیس میرا تعارف کرا کر چلے گئے تو میں نے آزادانہ آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہ دونوں میرے روبرو بیٹھی ہیں۔ آپا اور ساجو باجی۔ آپا بڑی تھی سانولی تھی۔ نظریں جھکائے ہوئے تھی کبھی کبھار کنکھیوں سے دیکھتی اور پلو کی اوٹ میں مسکاتی۔

ساجو چھوٹی تھی گوری چٹی چلبلی تھی۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی۔ مسکرائے جاتی اور لگاتار باتیں کیے جاتی۔ کچھ دیر تک وہ دونوں میرا جائزہ لیتی رہیں۔ آپا جھکی جھکی آنکھوں سے ساجو علانیہ طور پر۔ ساجو نے منہ بنایا۔ بات بدلنے کے لیے میں نے پوچھا کیا پڑھو گی۔ ساجو پیچھے سے اٹھی اور حساب اور الجبرے کی کتابیں اٹھا کر میرے سامنے رکھ دیں ——— ——— حساب اور الجبرا میں نے صرف میٹرک تک پڑھے تھے۔ میٹرک کے امتحان میں حساب اور الجبرے کے پرچے میں میں نے ۱۰۰ میں سے صرف ۲۹ نمبر حاصل کیے تھے۔ حساب الجبرا اپنے بس کی بات نہ تھی۔ دراصل میرا خیال تھا کہ ٹیوشن انگریزی کی ہو گی اور انگریزی کا میں میں اپنے آپ کو تیس مار خان سمجھتا تھا۔ حساب کو دیکھ کر ہی اپنی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ ساجو بات کو بھانپ گئی۔ اور اس کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکی۔ جھٹ اپنا رومال نکالا اور میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے کہا اس رومال سے کیا بنے گا۔ گھر سے کوئی تھان اٹھا لاؤ۔ بس اس جملے نے مجھے قائم کر دیا۔ ابتدائی جائزے کے تاثرات گویا معدوم ہو گئے۔

میں نے کہا ہٹاؤ اس مضمون کو۔ ہم بنیوں کا مضمون نہیں پڑھاتے۔ انگریزی پڑھو۔ مضمون ہوا نا۔ ساجو بولی انگریزی کیوں پڑھیں اس میں تو ہم آپ والی فائق ہیں۔ اس پر میں نے فیصلہ کر لیا کہ کل سے پڑھانے نہیں آؤں گا۔ لہٰذا ادھر اُدھر کی گپ میں وقت گزار دیا۔

اس کے بعد میں انہیں پڑھانے نہ گیا۔ تیسرے روز وہ رئیس بزرگ سکول میں آ گئے بولے میاں تم نے کمال کر دیا ایک روز آئے اس کے بعد رسید ہی نہ دی۔ میں نے صاف کہہ دیا جناب عالی حساب پڑھانا اپنے بس کا روگ نہیں۔ بولے میاں کسرِ نفسی کی حد ہوتی ہے کوئی۔ لڑکیاں تو کہتی ہیں کہ حساب میں تم سے زیادہ لائق اتالیق کبھی دیکھا ہی نہیں۔ میں نے لاکھ سمجھایا مگر وہ نہ مانے اور مجھے زبردستی اپنے ساتھ گھر لے گئے۔

میں پہنچا تو وہ دونوں مسکا رہی تھیں۔ ساجو کی مسکراہٹ میں تمسخر کی جھلک تھی۔ میں نے بے تکلفی سے کہا کیوں مجھے مصیبت میں ڈال رہی ہو تم۔ ایک سوال حل کرنے میں اپنا پتا مار کر خون خشک ہوتا ہے۔

اس پر ساجو نے اٹھ کر میرے سامنے دو حل کیے ہوئے پرچے رکھ دیے۔ یہ دراصل امتحان کے حساب کے پرچے تھے۔

نے سوچ سے سو نمبر لیے تھے اور ساجو نے سوچ سے ۸۰۔ میں حیران رہ گیا۔ ساجو بولی آپ تو خواہ مخواہ گھبرا گئے۔ میں نے کہا لیکن پر لیرش کا کیا مطلب۔ ساجو بولی۔ پڑھ پڑھ کر تھک جاؤ تو کوفت بھی تو شافی ہوتی ہے۔

پہلے دو ماہ ہم تینوں کوفت مٹاتے رہے۔ کتابیں سامنے پھیلا کر گپیں مارتے رہے۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے مجھے باپ یا شاگرد ہی ما تحت بنوں۔ اور وہ حاجت روائی کرتی رہی تھیں۔ جب ساجو مجھے ہمدردانہ دیتے ہوئے مسکراتی تو میں کہتا کیا تو یہ ہماری دام کی کمائی ہے۔ اس پر وہ ہنس پڑتی۔ سوال کی کمائی سے کسی کو کیا مرنا ہوتا ہے کیا!

دو مہینے کے بعد میرا تبادلہ ہو گیا۔ رخصت ہوتے وقت میں نے ازراہ مذاق کہا کاش کہ میں کوئی خدمت کر سکتا۔ اس پر آپا نے ساجو کو اشارہ کیا۔ ساجو بولی۔ کر سکتے ہیں آپ۔ میں نے پوچھا وہ کیسے بولی۔ آپ ہم پر ایک کہانی لکھ سکتے ہیں۔ ان دو ماہ کے دوران انہیں علم ہو چکا تھا کہ میں افسانے لکھتا ہوں۔ رخصت ہوتے وقت آپا نے دبی زبان سے کہا۔ کہانی ضرور لکھیے گا۔ آپا کی وہ سرگوشی ابھی تک فضا میں بکھری ہوئی ہے۔

آپا چھپی تو گویا سلگتی پر تیل پڑ گیا۔ چیلی شہرت نصیب ہو گئی اس کے باوجود میں نے اس حقیقت کو نہ سمجھا کہ عام حقیقتیں کس قدر پُر اثر ہوتی ہیں۔ اور حقیقت کو چھپانے کے لیے ماہیت کا پردہ دبیز ترین پردہ ہے۔ آج تک یہ حقیقت میرے دل کی گہرائیوں میں نہیں بیٹھ سکی۔ اور آج تک میں افسانے کے لیے انوکھے موضوع ڈھونڈتا ہوں۔

آپا چھپی تو مشہور نقاد اور افسانہ نویس حسن عسکری نے مجھے پہلی مرتبہ خط لکھا۔ لکھا تھا۔ "آپا بہت پسند آئی لیکن ازراہ کرم کسی ساجو باجی کا پتہ لکھ بھیجیے۔" میرے اس افسانے پر اس سے بہتر تنقید نہیں ہو سکتی تھی۔ حسن عسکری کے اس ایک جملے میں معانی کا سمندر بھرا ہوا تھا۔ آج بھی جبکہ ساجو باجیاں گھر گھر موجود ہیں اور ساجو باجی کا پتہ پوچھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ آج بھی حسن عسکری کا وہ جملہ اسی طرح بامعنی ہے۔

انگریزی میں ایک کہاوت عام ہے:

"Gentlemen prefer blondes but they marry brunettes."

میرا افسانہ آپا اس کہاوت کی ضد تھا۔ میں نے اس افسانے میں یہ کہا کہ شرفا آپا کے مداح ہوتے ہیں لیکن ساجو سے بیاہ رچانے کی تمنا رکھتے ہیں۔ لیکن اب مجھے شک ہونے لگا ہے جس تیز رفتاری سے ساجو باجیاں عام ہوتی جا رہی ہیں اسے دیکھ کر خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید جلد ہی ایسا ہو کہ اس افسانے کو پڑھ کر لوگ یہ محسوس کرنے لگیں یا کوئی نقاد مجھے خط میں لکھے کہ ساجو باجی بہت پسند آئی کسی آپا کا پتہ بتائیے۔

حالات کا رخ دیکھ کر خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید مستقبل قریب میں آپا ایک خیالی کردار کی حیثیت اختیار کر لے۔ اور آپا کی مجسم شخصیت افسانوی باتیں معلوم ہونے لگیں۔ اور حسن عسکری کا وہ جملہ اپنی آفاقیت کھو دے ——— لیکن تاریخ شاہد ہے کہ کئی ایک بار ساجو باجیاں زمین کے کسی خطے پر کھمبیوں کی طرح اگیں۔ ٹڈی دل کی طرح حملہ آور ہوئیں۔ لیکن ہمیشہ یہ کھنکتا آندھی کی طرح آیا اور بگولے کی طرح چلا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کے کسی ان جانے اصول کے مطابق صدیوں کے بعد ساجو

یوں آ جاتی ہے اور پھر صدیوں آپا میں راج کرتی ہے۔ آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ جتنی دیر ستارہ ٹوٹتا ہے۔ جتنی دیر رہتا ہے۔ اور صرف اتنی دیر رہتا ہے۔ آتا ہے اور دور
... پسند کرتے ہیں لیکن ساجو باجی کا پتہ پوچھتے پھرتے ہیں۔ ... لوگ انہیں بے حد پسند کرتے ہیں لیکن ساجو باجی کا پتہ پوچھتے پھرتے ہیں۔

ساجو باجی ازلی محبوب ہے اور قدرت ساجو باجی کو شاید اس لیے عام نہیں ہونے دیتی کہ مبادا وہ اپنی محبوبیت کھو ... اور عورت کی کشش عام ہو کر ختم ہو جائے۔ نہیں حسن عسکری کا وہ جملہ اپنی آفاقیت نہیں کھو سکتا۔

میں نے محبت کے موضوع پر کئی ایک افسانے لکھے ہیں۔ میں نے بار بار یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ کئی ایک ڈھکے چھپے ... ت محبت کا بہروپ دھار لیتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے ایک مرتبہ ایک بھڑ بھن بھن کرتا ہوا پروانوں کی محفل میں آ دھمکا بھن بھن ... بھی پروانہ ہوں ——— اسی طرح کبھی نفرت کا بنیادی جذبہ بھن بھن کر کے کہتا ہے میں محبت ہوں۔ کبھی انتقام کا جذبہ اپنی ... محبت کا روپ دھار لیتا ہے۔ کبھی حالات ایسی شکل اختیار کر لیتے ہیں کہ محبت کا سوانگ بھرنے کے بغیر چارہ نہیں ... کبھی مروت محبت ایجاد کر لیتی ہے۔ کبھی پڑوس کی شرارت محبت کی شکل میں پھوٹ نکلتی ہے۔

ہاں میں نے محبت پر کئی افسانے لکھے۔ دُور دُور کی کوڑی لانے کی کوشش کی۔ ان جانی باتیں کہنے کی کوشش کی۔ مجھے یہ خیال ... عام محبت کی بات کروں۔ میں کوئی چھوٹا موٹا لکھاڑ تھوڑے ہی تھا کہ عام محبت پر افسانہ لکھتا۔ اور کسی عام کردار کو پیش کرتا۔ آپا ... عام کردار تھا۔ اور اس افسانے میں محبت کی عام تفصیلات درج ہیں۔ یقیناً اگر فرمائش نہ ہوتی تو میں کبھی یہ افسانہ نہ لکھتا ——— لیکن قاری نے "آپا" پڑھ کر تالیاں بجائیں اور میرے محبت کے دُوسرے افسانوں کو نظرانداز کر دیا۔ یہ دیکھ ... دل میں اُلٹی ضد پیدا ہوئی۔ اگر عام پڑھنے والے ایسے عام افسانے پسند کرتے ہیں تو کیا کریں ہمیں کیا عام آدمیوں کے ... افسانوں؟

اور پھر آپا۔ آپا کا افسانہ تو خلوص سے خالی ہے۔ بجیر خالی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں جو آپا کا مصنف ہوں ... ہوں میں نے لوگوں کی نگاہیں آپا کی طرف منعطف کیں۔ یہ دیکھیے یہ آب دار موتی دیکھیے۔ اس کی آب و تاب دیکھیے ... قیمت کا اندازہ کیجیے ——— لیکن لوگوں کی توجہ آپا کی طرف منعطف کر کے میں خود ساجو باجی کا پتہ پوچھتا پھرا۔ کسی ساجو باجی ... ہوتا ہے۔ جلد کسی ساجو کا پتہ بتا سکے۔ اور پڑھنے والوں نے افسانہ پڑھ کر کہا۔ آپا خوب ہے بے حد خوب ہے۔ لیکن کسی ... باجی کا پتہ بتائیے۔

عنوان کا مسئلہ

کنہیا لال کپور

شاعر ہونا کتنی مصیبت ہے! واللہ ہم اس بات کا شکوہ نہیں کر رہے کہ شعراء کو داد و واہ کے علاوہ اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ یہ تو ازل سے ہی اُن کی قسمت میں لکھا ہے کہ وہ خوبصورت اشعار کی تخلیق کریں لیکن اُن کے لیے انہیں معاوضہ نہ دیا جائے۔ یا اتنا کم دیا جائے جس سے ان کی گزر نہ ہو سکے۔ جب ملٹن ایسے شہرۂ آفاق شاعر کو اُس کے لافانی شاہکار "پیراڈائز لوسٹ" کے معاوضے میں پانچ پونڈ پیش کیے گئے تو باقی شعراء کس کھیت کی مولی ہیں۔ آپ کہیں گے شاید ہم اس بات کی شکایت کر رہے ہیں کہ شعراء کو اکثر مشاعروں میں "ہوٹ" کیا جاتا ہے۔ آپ پھر غلط ہیں۔ شاعر تو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر مشاعروں میں شرکت کرتا ہے وہ کبھی اس بات پر پریشان نہیں کہ آیا اس کے اشعار کا خیر مقدم "سبحان اللہ" "مرحبا" "بہت خوب" کے نعروں سے کیا جائے گا یا اُسے مطلع کے بعد فوراً منقطع پڑھنے کو کہا جائے گا۔ ہم تو صاحب اُس سخت مقام کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو شاعر کی راہ میں سنگِ گراں کا درجہ رکھتا ہے۔ یعنی اپنی نظم کے لیے مناسب عنوان تجویز کرنا۔ آپ فرمائیں گے: بھلا یہ کونسی مشکل بات ہے۔ آخر شاعر جس موضوع پر نظم لکھتا ہے۔ وہی اس کا عنوان ہو سکتا ہے: آپ نے بجا فرمایا لیکن اگر آپ جدید شاعری کے لوازم پیشِ نظر رکھیں تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ عنوان کا مسئلہ خطرناک حد تک پریشان کن ثابت ہو سکتا ہے۔

مثال کے طور پر آپ ہماری اس نظم کو لیجیے جو ہم نے "آل انڈیا مشاعرہ لکھنؤ" میں پڑھی اور جس کا عنوان ہم ابھی تک دریافت نہیں کر سکے۔

جھیل میں مینڈک بھی ہیں کچھوے بھی ہیں
آسماں میں دیکھ کر قوسِ قزح
آگیا کیوں مجھ کو پھر تیرا خیال
دیکھتا ہوں جب میں سطحِ آب پر مرغابیاں
سوچتا ہوں کاش اُڑ سکتا میں مشکیزے کی طرح
مجھ سے تو اچھے ہیں مینڈک اور یہ مرغابیاں
جھیل ہی گھر اور ہے جن کا جھیل ہی جن کا مزار
کوئی پھر دیکھ کر مجھ کو روئے
مجھ سے ہمدردی جتانے کے لیے

پانی سے باہر بھاگ گئے گا کیوں ؟
تم تو ہو مجھ سے ہزاروں کوس دُور
حالِ دل تم کو سُنانا ہے محال
قرضخواہ کو آج کیا دُوں گا جواب
کل بڑی مشکل سے ٹالا تھا اُسے
کاش میں ہوتا ہی ہوتا دہر میں
ٹائیں ٹائیں کرتا رہتا شاخ پہ بیٹھا ہوا
دیکھتا وہاں سے کہ بیچ سامنے جو جھیل ہے
اُس میں کچھوؤں کے علاوہ چار سو مینڈک بھی ہیں۔

آپ ہی فرمائیے اس نظم کا کیا عنوان ہو سکتا ہے۔ آپ کہیں گے: کچھوے اور مینڈک۔ ہم عرض کریں گے اس میں مُرغابیوں اور طوطے کا بھی تو ذکر ہے۔ اس لیے "شکرا اور مُرغابیاں" کیوں نہیں۔ اور آپ قوسِ قزح، کرُسی، دُور بیٹھی محبوبہ اور قرضخواہ کو کیوں بھول گئے۔ اور پھر آپ نے اُن داخلی واردات کے بارے میں کیا سوچا ہے جو اس نظم کی جان ہیں۔

چلتے چلتے آپ کو ایک نقّاد کا قصہ بھی سُنا دیں جن کی خدمت میں ہم اس لیے حاضر ہوئے کہ وہ اس نظم کا کوئی مناسب عنوان تجویز کریں۔ نظم سُننے کے بعد وہ ہم سے پوچھنے لگے: "آپ کو مرگی یا خفقان کے دورے تو نہیں پڑتے؟" ہم نے حیران ہو کر جواب دیا "نہیں، آپ کو کیسے وہم ہو گیا کہ ہم ان نامراد امراض میں مبتلا ہیں۔" انھوں نے دوبارہ سوال کیا: "کیا آپ بھنگ یا چرس کے زیرِ اثر رہ نہیں سکتے؟" ہم نے جب اس سوال کا جواب نفی میں دیا تو بڑی شفقت کے ساتھ فرمایا: "آپ دماغی بیماریوں کے کسی لائق ڈاکٹر سے فوراً رجوع کیجیے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے آپ کا دماغ چل گیا ہے یا چل جانے کی تیاری کر رہا ہے۔" ہمیں اُس نقّاد سے اس رخاسی بات سے ہوئی۔ مگر ہنس کر ہم نے ایک اور نظم لکھی جو آپ کی تفریحِ طبع کے لیے پیش کرتے ہیں:

جتنے نقّاد ہیں زمانے میں
یعنی قدرت کے کارخانے میں
ان سے مل کر خوشی نہیں ہوتی
زندگی زندگی نہیں ہوتی
ان سے مل کر اُداس رہتا ہوں
وقفِ حرمان و یاس رہتا ہوں
بات آتی ہے اور ڈھ کر کمیل
ٹکا کر ہے کہتی شام سے

کس لیے شکل آہ و زاری ہے
زندگی موت سے پیاری ہے
اُٹھ کر دُنیا ہے منتظر تیری
ہر طرف بج رہے ہیں نقارے
باغ میں شور ہے عنادل کا
پالے تو بھی سراغ منزل کا
موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
ایسے ہی وہ اگر یہاں آئے
زندگی میں بہار آ جائے
یہ مگر مس ہے جنوں میرا
پی کے قطرہ بہک گیا ہوں میں
کتنا کڑوا مزا ہے قطرے کا
رونے رہتے ہیں رات بھر کتے
اُن کی شب کی سحر نہیں ہوتی

نظم لکھنے کو تو لکھ لی لیکن یہ بات سمجھ میں نہ آئی اس کا عنوان کیا ہونا چاہیے۔ درجنوں عنوانات قائم کیے لیکن کوئی بھی پسند نہ آیا۔ آخر ایک پروفیسر صاحب سے کہ جن کی لیاقت کی دھوم تھی مشورہ کیا۔ وہ نظم پڑھنے کے بعد کہنے لگے: ساری نظم میں صرف دو کام کے مصرعے ہیں اور وہ غالب سے چرائے گئے ہیں۔ اس لیے نظم کا عنوان ہونا چاہیے غالب کے ہاں ڈاکہ"۔ ہمیں اُن کا مشورہ ناگوار گزرا۔ ہم اُن کی لیاقت کے علاوہ اُن کی نیت پر بھی شک کرنے لگے۔

اُنہی دنوں ایک مشہور ادبی رسالے کے ایڈیٹر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ نظم سننے کے بعد اُن پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ جب ذرا ہوش و حواس ٹھکانے ہوئے تو فرمایا: "اس میں کوئی شک آپ اس نظم میں کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن کیا کہنا چاہتے ہیں اس کا اتا پتا نہیں لگ سکا۔ بات تو آپ نے نقاروں سے چلائی۔ اس کے بعد رات کا قصہ لے بیٹھے۔ اور پھر نہ جانے کیوں آپ کو فضا میں نقارے بجتے سنائی دیے۔ نقاروں سے یکلخت آپ کا تخیل عنادل کی طرف پہنچا۔ پھر آپ کو غالب کا شعر یاد آیا۔ خاتمہ آپ نے کتوں کے رونے پر کیا۔ اب آپ کی نظم کا مرکزی خیال کیا ہے۔۔ کہ یہ تو ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ بہر حال بہتر ہے آپ عنوان رکھیے۔ "پی کے قطرہ بہک گیا ہوں میں"۔ ہم نے دریافت کیا: "وہ ... بصورت نظم کا آتا ہے ہو وہ عنوان" ایڈیٹر صاحب نے فرمایا: "پہلے اس نظم کو ہم اپنے رسالہ میں بغیر کسی عنوان

...ب دیتے ہیں اور قارئین سے عنوان تجویز کرنے کے لیے کہتے ہیں"۔ ہم نے اُن کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے جواب
...میں منظور ہے چنانچہ نظم چھاپ دی گئی۔ ہماری توقع کے خلاف قارئین نے عجیب و غریب عنوانات تجویز کیے۔ مثلاً
...رکھ دھندا ... بھول بھلیاں ... ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ ... بکسرا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ ... اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ
...سمجھانے کا" وغیرہ وغیرہ۔

ہمیں یہ عنوانات پڑھ کر قارئین کی عقل پر رونا آیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے سخن فہمی کا دیوالہ پٹ چکا ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا ...س نظم کا عنوان سوچیں گے۔ چنانچہ آج سہ پہر سے مغز پچی کر رہے ہیں۔ لیکن ہماری مشکل حل ہوتی نظر نہیں آتی۔ آپ نے ...یہ نظم ملاحظہ فرمائی۔ آپ ہی کچھ دستگیری کیجیے۔ ہاں ذرا سوچ کر بتائیے تو کہ اس نظم کا کیا عنوان ہونا چاہیے۔

احتیاطِ عشق

حجاب امتیاز علی

میں اوپر کی منزل میں وشنہ گھر پر بیٹھی ایک کتاب پڑھ رہی تھی۔ نیچے پائیں باغ موتیا کے پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔

اتنے میں باہر کے صدر دروازے پر کسی نے اطلاعی گھنٹی بجائی۔ "کیا واہیات ہے" میں نے اپنے دل سے کہا۔ "کتاب کا یہ ورق کتنا دلچسپ تھا۔ تحریر میں روانی کے ساتھ کشش تھی۔ لوگ واقعی بہت ستاتے ہیں۔ کم از کم یہ صفحہ ختم کرنے دیتے۔ مجھے چاہیے وہ ایک خفیہ کتا پال لوں تاکہ بے وقت دوستوں سے نجات ملے۔"

کڑھتے ہوئے میں نے کتاب بالکنی کی دیوار پر رکھی نیچے باغ کی طرف جھانک کر دیکھا۔ نجانے میں نے کتنی ہی کتابیں دوستوں کی مداخلت بےجا کی وجہ سے بالکنی پر رکھیں اور بھول گئی یا ہوا کا جھونکا انہیں اڑا لے گیا۔ اگر وہ سب جمع کیا جائے تو اچھا خاصا چھوٹا سا کتب خانہ بن جائے۔ اور یہ سب دوستوں کی وجہ سے! ہاں ــــــ تو میں نے کتاب حسب معمول و عادت بالکنی کی دیوار پر رکھی اور نیچے باغ میں جھانک کر آنے والے کو دیکھنے لگی۔ دیکھا تو میری پیاری اور راز دار سہیلی ایلزا اوپر چلی آ رہی تھی۔ میرا غصہ خوشی سے اور اکتاہٹ مسکراہٹ سے بدل گئی۔ ہم مذاق دوست آئے تو دل کی کلی کھل جاتی ہے۔

"آؤ آؤ۔ چلی آؤ۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ تم تھیں" میں نے چلا کر کہا۔

"سنو" وہ زینے دو دو کرکے چڑھتے کرتے بولی: "میں تم کو ایک بہت ہی پیاری بات سنانے آئی ہوں۔"

"ہائے جلدی سناؤ"

"آج رات منیر آ رہا ہے۔" وہ ہانپتے ہانپتے بولی۔

"منیر!!" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

وہ ہنس پڑی: "تم بھلے کو منیر۔ پانچ دن کی چھٹی پر آ رہا ہے۔ میں نے تمہیں کہا تھا کہ اس سے میری ملاقات رزم کی بندرگاہ پر ہوئی تھی۔ میں نے یکایک اپنے دل میں اس کی گہری محبت محسوس کی تھی اور اس کے بعد ہمارے عہد و پیمان ہوئے۔" یہ کہہ کر اس نے جھک کر دیوار پر سے عشق پیچاں کا ایک پھول توڑ لیا اور اسے سونگھنے لگی۔

"لیکن ایلزا۔ تم نے محبت میں عجلت تو نہیں کی؟" میں نے نیچے کے مہکتے آسمان پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"بس رہنے دو تم اپنی احتیاطِ عشق رہنے دو۔ تم دوسروں کو بزدلی سکھاتی پھرتی ہو۔ میں نے پہلی ہی نظر میں دل کھو دیا

دوستی شروع کر دی۔ بات یہ ہے۔ اس کے صندلی رنگ اور اس کی دیو قامتی کی میں شیدائی ہوں۔ آنکھوں میں گہرائی ہے اور مسکراہٹ میں دل ربائیت ہے۔"

میں اپنی کتابیں سمیٹ کر ایک طرف رکھتے ہوئے اور اطمینان سے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی: "بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ جواب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ تم میرے پاس کس غرض سے آئی ہو؟"

ایفو ہرشہ چمن کی ایک نیچی سی دیوار پر بیٹھی ٹانگیں ہلا رہی تھی مسکرا کر بولی: "میں چاہتی ہوں کہ اسے بجائے کسی ہوٹل یا ریستوران میں مدعو کرنے کے ——— تمہارے سنگ مرمر کے شہ نشین میں رات کے کھانے پر مدعو کروں۔ وہ محبت کے خواب دیکھنے کی بہترین جگہ ہے۔ سرخ گلاب گردن اٹھا اٹھا کر نیلے آسمانوں کو دیکھتے رہتے ہیں۔ اور تاروں بھری رات کا سناٹا اس شہ نشین کے قریب دبے پاؤں گزر جاتا ہے۔"

جب آدمی محبت کرنے لگتا ہے تو نجانے اس کا لہجہ شاعرانہ کیوں ہو جاتا ہے اس کے احساسات شبنم کی بوند کی طرح صاف اور شفاف کیوں بن جاتے ہیں اور اس کی احساس کتری پر لگا کر کیسے اُڑ جاتی ہے۔

میں نے ایفو کی شاعری سُنی پھر بولی: "مجھے کوئی انکار نہیں ایفو۔ تم شوق سے میرے شہ نشین کو اپنی محبت کی جلوہ گاہ بناؤ۔"

اس نے جھک کر مجھے پیار کیا بولی: "لیکن کھانے پر تمہیں بھی موجود ہونا چاہیے روحی۔"

"شکریہ تمہارا۔ میں ضرور کھانے پر موجود ہوں گی۔ بلکہ شہ نشین کے عقب میں جو رات کی رانی کی جھاڑی لگی ہے اس میں ٹیپ ریکارڈر رکھ کر عشقیہ غزلیں بھی بجاؤں گی۔"

"کیا بات ہے تمہاری روحی۔ واقعی مجھے تو اس کا خیال بھی نہ آیا ہوتا۔ ٹیپ ریکارڈر۔ موسیقی محبت میں چار چاند لگا دیتی ہے خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ آئندہ مہینے ہماری شادی بھی ہو رہی ہے۔ تم آج رات اس کی رعنائی کی قائل ہو جاؤ گی۔"

"میں اب بھی قائل ہوں۔ تمہاری زبانی سُن چکی ہوں۔"

"لیکن دیکھنے کی اور بات ہوتی ہے روحی۔ تصویری پڑھنے اور عملاً کام کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ چھریرا جسم۔ آنکھوں میں مسکراہٹ میں بلا کی اظہاریت۔ جیسے مونالیزا کی مسکراہٹ؟"

"لیکن ایفو مجھے کلاسیکی مسکراہٹیں پسند ہیں گڑیا جیسے کونے کی سی مسکراہٹ؟"

"تم ہر وقت اعتراض کرتی رہتی ہو یہ عادت تمہاری بری ہے روحی۔ آج رات تم اس کی مسکراہٹوں کی قائل ہو جاؤ گی۔" وہ دیوار پر سے کود پڑی اور فرطِ جذبات سے بے چین ہو کر سے سیاہی بھرے زرد زرد سے تھیلے اور اس کے [illegible] کھینچ لی۔

مجھے ہنسی آئی وہ عجیب سا تھا۔ لیکن میں ضبط کر گئی۔ پھر کچھ یاد کر کے بولی: "چاہے آپ جیسے انہیں پسند ہوں مگر چند روز کی بات ہے۔"

وہ فرطِ مسرت سے مجھ سے چمٹ گئی۔ "کمال کر دی تم نے۔" ایسی عمدہ رائے ایک جاں نثار شوہر ہی دے سکتا ہے۔" میں بولا۔ "بات یہ ہے میں نے ابھی ابھی ہم گلستان کی چہار دیواری پہ ایک قوسِ قزح کا رنگ بکھرا ہوا دیکھا ہے۔ ایک آسمانی رنگ کی بیل اس میں بنت کی ہے۔ وہ پھول پہلے کاسنی جالی کے پٹ سے لگتے ہیں۔ چاہو تو تم اپنے لباس کے لیے اس قوسِ قزح میں سے چن سکتی ہو۔"

"وہ واقعی قابل ہے کہ اسے قوسِ قزح میں ٹھہرایا جائے۔" وہ شدتِ مسرت سے چیخ پڑی۔

رات کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ میں جلدی میں اپنے جستے دیں چھوڑ کر نئے پالش چمکتے میں جا کر کھڑی ہوئی۔ اور ہدایات دینے لگی۔ باورچی کو تاکید کی کہ بریانی کا گوشت بالکل مزہ دار ہو۔ یعنی اتنا نرم کہ چڑیا بھی کھا سکے۔ اور ہر سالن میں زعفران کی افراط ہو۔ میٹھے میں مٹھاس کی انتہا ہو۔ اور نمک مرچ بہت احتیاط سے استعمال کرے۔ میں نے کھانوں کی فہرست دیکھی تو میٹھے بیست چودہ تھے۔ دال کا پیل علیحدہ اور کباب میرے اس سے علیحدہ۔ اس کے بعد اعلیٰ درجے کے سگریٹ پیش کیے جائیں۔ ہم خدا کے سخت لوگ ہیں کہ کسی کو بیزار کیے جانے پر رکھنے کو بھی کہہ دیا تھا۔ پھر باغ کے دروازے میں بیٹھ کر کافی پینے کا علیحدہ انتظام تھا۔ کافی کے ساتھ لیمن بادام تھے۔

بڑھاپا اور بچے گھر کا سوچا میں مبتلا سر جھکائے ہوئے چلا گیا۔ جانے وہ کیا سوچ رہا تھا۔ ممکن ہے سوچ رہا ہو کہ میں شاہ زادیوں کی دعوت کر رہی ہوں۔

جہاز آٹھ بجے آنے والا تھا۔ سو ہم نے وہ دوپہر پھولوں سے لدی ہوئی باغ کی ایک روش پر بیٹھ کر شطرنج کھیلتے ہوئے بسر کر ڈالی۔ کیونکہ انتظار کی گھڑیاں صدیوں میں کٹتی ہیں۔ ہم دونوں ہی کھیل میں ہارتے رہے۔ کیونکہ کچھ پتہ نہیں لگتا تھا کہ کھیل رہے ہیں۔ گہرے گلابی رنگ کی ایشیائی دوپہر تھی اور آسمان پگھلے ہوئے نیلم کی طرح دمک رہا تھا۔ کاسنی شہنیوں پر سبز رنگ کے بیٹھے درِ محبت کے نغمے الاپ رہے تھے۔ وہ دوپہر ہم نے بڑے انتظار میں کاٹی۔

میں پہلے کہہ چکی ہوں جہاز آٹھ بجے آنے والا تھا۔ مگر بیوی شام کے چھ بجے ہی سے زرق برق لباس میں ملبوس کر تیار تھی۔ اس نے ایک ہلکے گلابی رنگ کی چادر جسم کے گرد لپیٹ رکھی تھی۔ حسن کا عطر لگا رکھا تھا اور حسین آدمیوں سے ملاقات کے لیے تیار تھی۔

"ایک مہینے بعد ہماری شادی ہو جائے گی روحی۔ میرے ابا نے پانچ مہینے پہلے وہی لباس کا آرڈر دے دیا تھا تا کہ شادی میں دیر کی وجہ سے خلل نہ پڑے۔"

"بڑے دور اندیش ہیں۔ بڑا اچھا کیا۔" میں نے تعریف کی پھر بولی۔ "تم نے اس سلسلے میں ہر بات اتنا کافی کر دی۔ کہ پھر بھی تم نے بہت کیا۔ کہ ہم ہی وہی لباس سلوا لیا چٹ منگنی پٹ بیاہ اسی کو کہتے ہیں۔ ایز۔"

"اور اور کیا کرتی؟ میں تم جیسی سست نہیں ہوں کہ ہر بات پر گھنٹوں سوچتی رہ جاؤں۔ اور ایک قصر پر سالوں ہو رہے ہوں۔" اس نے حسرت سے مری خامیاں گنوا دی تھیں۔

میں بولی: "میں تم سی تیزی کہاں سے لاؤں؟ اپنی اپنی فطرت ہے۔"

ایفو مسکرا کر کہنے لگی: "لیکن تم منیر کو دیکھو گی تو انگشت بدنداں رہ جاؤ گی اور میری تیزی پھرتی کا رونا دوبارہ نہ روؤ گی۔ چھریرا جسم۔ آنکھوں میں چمک۔ مسکراہٹ میں بلا کی اخاریت۔"

بہار کی اس ہوشربا حسین رات میں جب ہم منیر کو لینے ہوائی اڈے پر پہنچیں تو معطر ہوائیں ہمارے رخساروں کو مس کر رہی تھیں۔ ایفو بات بات پر بلاوجہ قہقہے لگا رہی تھی اور میں اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ایفو کہنے لگی۔ "میں نے تم کو بتایا نہیں۔ اب منیر فوج میں شریک ہو گیا ہے۔ پہلے محض شاعر تھا۔ اب فوجی باقاعدگی نے اسے اور دلکش بنا دیا ہوگا۔" وہ ہنسے جا رہی تھی۔

"فوجی باقاعدگی؟" میں نے کہا۔ "مگر اس سے تو انفرادیت ماری جاتی ہے۔"

"ماری جاتی ہے تو ماری جانے دو۔ بانکپن تو پیدا ہو جاتا ہے۔" ایفو نے چہک کر کہا

"ضرور۔" میں نے جواب دیا۔

وہ اپریل کی تاروں بھری رات تھی ——— اتنے میں اچانک تاروں کے نیچے ایک روشن دم دار تارہ ابھرا۔ وہ ہوائی جہاز تھا۔ پھر وہ زمین پر لڑکھڑایا یوں اترا کہ میں نے سمجھا کوئی شہاب ثاقب ٹوٹ کر گر پڑا ہے۔

مسافر اترنے لگے۔ ہم دونوں دور کھڑی ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھیں۔ زمین پر اتنی روشنی نہ تھی کہ ہم مسافروں کی شکلیں دیکھ سکتے۔ آخر بمشکل ہمیں ایک دراز قد آدمی ہاتھ میں بیگ لیے اپنی طرف آتا ہوا نظر آیا۔

ایفو چیخ پڑی۔ "وہ رہا ——— وہ ——— ہنس کی طرح چلتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ چلا آ رہا ہے ———"

میں بھی اشتیاق سے دیکھنے لگی۔

"منیر!" شدت جذبات سے پست آواز میں ایفو بولی۔

"ایفو!" منیر چلایا۔

جب ہم تینوں ٹرمینل کے اژدہام اور اندھیرے کے سبب سے باہر روشنی میں نکل آئے تو میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک [illegible] فربہ اندام آدمی جس کی آنکھوں میں وحشت تھی جس کی رنگت تقریباً سیاہ تھی جس کے بھدے پن نے اسے احمق سا بنا رکھا تھا ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ غور سے دیکھنے پر اس راز کا بھی انکشاف ہوا کہ اس کے ہونٹوں کے گرد مونچھوں کی کمان مڑی ہے۔

"ہائے ——— یہ؟" ایفو اچانک زور سے چیخ پڑی پھر سر اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ "ہائے ——— یہ یہ نہیں ہو سکتا۔"

مرد نے پلٹ کر دیکھا مسکرا کر بولا۔ "کیوں نہیں ہو سکتا؟ اسے ایفو پیاری۔ سال بھر میں تم مجھے بھول گئیں؟ میں منیر ہوں۔"

مجھے ہنسی سی آگئی جسے میں نے بڑی احتیاط سے روکنے کی کوشش کی۔ فوجی تربیت نے اس میں بانکپن پیدا کر دیا ہوگا۔

وہ وحشت سے مجھے چمٹ گئی۔ "کمال کرتے ہو۔ ایسی بھی کیا [illegible]
میں بولا۔ "بات یہ ہے جانی، میں نے ان کی کہانیاں [illegible] پہلی [illegible]
اس میں بحث کی ہے۔ وہ کہتے ہیں [illegible] اپنے [illegible]
سکتی ہو۔"

"وہ اسی قابل ہے کہ اسے قبر میں [illegible] دیا جائے۔" وہ شدت سے [illegible] پڑی۔

دعوت کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ میں جلدی ہی اپنے [illegible] میں [illegible] پانی [illegible]
دیتی تھی۔ [illegible] ایک [illegible] بالکل [illegible] ہے۔ یعنی اتنا نرم کر [illegible] کھا سکے۔ اور ہر [illegible]
افراد ہو۔ میٹھے میں [illegible] کی انتہا ہو۔ اور نمک مرچ بہت احتیاط سے استعمال کرے۔ میں نے کھانوں کی فہرست دیکھی تو [illegible]
بیست چودہ تھے۔ [illegible] علیحدہ اور [illegible] اس سے علیحدہ۔ اس کے بعد [illegible] کے [illegible]
[illegible] بھی [illegible] کر دیا تھا۔ پھر باغ کے دروازے میں [illegible]
[illegible] انتظام تھا۔ کافی کے ساتھ [illegible] بادام تھے۔

بڑھا اور پھر گہری سوچ میں [illegible] چلا گیا۔ جانے وہ کیا سوچ رہا تھا۔ ممکن ہے سوچ رہا ہو کہ میں شاہ [illegible]
کی دعوت کر رہا ہوں۔

جہاز آٹھ بجے آنے والا تھا۔ مگر ہم نے وہ دوپہر پھولوں سے مہکتی باغ کی ایک روش پر بیٹھ کر شطرنج کھیلتے ہو
بسر کر ڈالی۔ کیونکہ انتظار کی گھڑیاں صدیوں میں کٹتی ہیں۔ ہم دونوں ہی کھیل میں ہارتے رہے۔ کیونکہ کچھ پتہ نہیں لگ رہا تھا کہ
کھیل رہے ہیں۔ گہرے گلابی رنگ کی ایشیائی دوپہر [illegible] آسمان [illegible] جیسے نیلم کی طرح دمک رہا تھا۔ کاسنی شیشوں پر سبز رنگ کے
بیٹھے [illegible] محبت کے نغمے الاپ رہے تھے۔ وہ دوپہر ہم نے بڑے اضطراب میں کاٹی۔

میں پہلے کہہ چکی ہوں جہاز آٹھ بجے آنے والا تھا۔ لیکن [illegible] شام کے چھ بجے ہی سے زرق برق لباس میں [illegible] کر تیار تھی۔
نے ایک [illegible] گلابی رنگ کی چادر جسم کے گرد لپیٹ رکھی تھی۔ [illegible] رکھا تھا اور حسین آدمی [illegible] ملاقات کے لیے تیار تھی۔

"ایک مہینے بعد ہماری شادی ہو جانے کی [illegible]۔ [illegible] پانچ مہینے پہلے [illegible] لباس کا آرڈر دے دیا تھا [illegible]
میں درزی کی وجہ سے خلل نہ پڑے۔"

"بڑے دور اندیش ہیں۔ بڑا اچھا کیا۔" میں نے تعریف کی پھر بولی۔ "تم نے اس سلسلے میں ہر بات [illegible] کر دی۔
پھر میں تم نے بحث کی۔ [illegible] لباس [illegible] پٹ [illegible] کرتے ہیں ایسے۔"

"ورنہ اور کیا کرتی؟ میں تو بھی [illegible] نہیں ہوں کہ ایک بات پر گھنٹوں سوچتی رہ جاؤں۔ اور ایک [illegible]
ہوں۔" الفریڈ نے [illegible] میری خامیاں [illegible] جائیں۔

میں بولی: "میں تم کو تیزی کہاں سے لاؤں، یہی تو [illegible] فطرت ہے۔"

ایلفو مسکرا کر کہنے لگی: "لیکن تم منیر کو دیکھو گی تو انگشت بدنداں رہ جاؤ گی اور میری تیزی پھرتی کا رونا دوبارہ نہ روؤ گی۔ پھریرا جسم۔ آنکھوں میں چمک۔ مسکراہٹ میں بلا کی انفرادیت۔"

بہار کی اس ہوشربا حسین رات میں جب ہم منیر کو لینے ہوائی اڈے پر پہنچیں تو معطر ہوائیں ہمارے رخساروں کو مس کرنے لگیں۔ ایلفو بات بات پر بلاوجہ قہقہے لگا رہی تھی اور میں اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ایلفو کہنے لگی۔ "میں نے تم کو بتایا نہیں۔ اب منیر فوج میں شریک ہو گیا ہے۔ پہلے محض شاعر تھا۔ اب فوجی باقاعدگی نے اسے اور دلکش بنا دیا ہوگا۔" وہ ہنسے جا رہی تھی۔

"فوجی باقاعدگی؟" میں نے کہا۔ "مگر اس سے تو انفرادیت ماری جاتی ہے۔"

"ماری جاتی ہے تو ماری جانے دو۔ بانکپن تو پیدا ہو جاتا ہے۔" ایلفو نے جھلا کر کہا۔

"ضرور۔" میں نے جواب دیا۔

وہ اپریل کی تاروں بھری رات تھی ——— اتنے میں اچانک تاروں کے نیچے ایک دُمدار تارہ اُبھرا۔ وہ ہوائی جہاز تھا۔ پھر وہ زمین پر لڑکھڑایا یوں اترا کہ میں نے سمجھا کوئی شہابِ ثاقب ٹوٹ کر گر پڑا ہے۔

مسافر اترنے لگے۔ ہم دونوں دور کھڑی ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھیں۔ زمین پر اتنی روشنی نہ تھی کہ ہم مسافروں کی شکلیں دیکھ سکتے۔ آخر بمشکل ہمیں ایک دراز قد آدمی ہاتھ میں بیگ لیے اپنی طرف آتا ہوا نظر آیا۔

ایلفو چیخ پڑی۔ "وہ رہا ——— وہ ——— ہنس کی طرح چلتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ چلا آ رہا ہے ———"

میں بھی اشتیاق سے دیکھنے لگی۔

"منیر!" شدتِ جذبات سے پست آواز میں ایلفو چیخی۔

"ایلفو!" منیر چلایا۔

جب ہم تینوں مسافروں کے اژدہام اور اندھیرے کے سیلاب سے باہر روشنی میں نکل آئے تو میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک وہ فربہ اندام آدمی جس کی آنکھوں میں وحشت تھی جس کی رنگت تقریباً سیاہ تھی جس کے بھدے پن نے اسے احمق سا بنا دیا تھا ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ غور سے دیکھنے پر اس راز کا بھی انکشاف ہوا کہ اس کے ہونٹوں کے گرد مونچھوں کی کمان سی رکھی ہے۔

"ہائے ——— ہی" ایلفو اچانک زور سے چیخ پڑی پھر سر اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ "ہائے ——— یہ ——— یہ نہیں ہو سکتا۔"

مرد نے پلٹ کر دیکھا۔ مسکرا کر بولا۔ "کیوں نہیں ہو سکتا؟ اے ایلفو پیاری۔ سال بھر میں تم مجھے بھول گئیں؟ میں تمہارا منیر ہوں۔"

مجھے ہنسی سی آ گئی جسے میں نے بڑی احتیاط سے روکنے کی کوشش کی۔ فوجی تربیت نے اس میں بانکپن پیدا کر دیا ہوگا۔

ایلز کے [illegible] ذہن میں گونجنے لگے۔

ایلز جیسے پرچھائیاں اُتر رہی تھیں سوال کر رہی تھی۔ "تم؟"

"تمہیں تعجب ہے ایلز؟" کہنے والا انگلش انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"کاش کرشمہ ہوتا۔ یقین نہ ہوتا ——" ایلز بے حد پریشان ہو کر بولی۔ "خیر باہر تو نکلو۔ کار کھڑی ہے"

ہم تینوں کار میں جا بیٹھے۔ دو تین منٹ مدت کی سی خاموشی طاری رہی۔ چشم زدن میں کار تیزی سے نکلتے دیکھ کر میں خود حیران تھی۔ ایلز پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ دائیں بائیں میں اور ایلز تھیں۔ درمیان میں وہ اکیلا بیٹھا تھا۔ مجھے نہ جانے کیوں ہنسی آ رہی تھی۔ ا میں سر دبیچے سے باہر کے رومال سے اپنا منہ بند کر رہی تھی۔ جلد بازی اور عجلت کی ایسی ہیبت ناک سزا کسی کو پاتے ہوئے میں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔

ایلز بدحواس اور جھینپی ہوئی تھی۔ بیٹھے بیٹھے اس نے نذیر پر ایک سرسری نظر ڈال کر پوچھا۔ "آخر بتاؤ تم کو ہو کیا گیا۔ کیا افتاد پڑی؟ اتنے بدل کیسے گئے؟"

"میں بدل سکتا ہوں ایلز؟ وہی دل ہے وہی جذبات ہیں۔"

"مگر —— تم وہ نہیں رہے —— سال بھر میں درخت کی شکل نہیں بدلتے جتنے تم بدل گئے ہو؟"

"کس طریق پر بدلا ہوں؟" نعمان عزیز نے معصومیت سے سوال کیا۔

شاید اس کے لہجے کی معصومیت کا احساس ایلز کو بھی ہو گیا۔ "میرا مطلب ہے۔ بس۔ یہی —— کہ تم ا نہ رہے —— اچھا یہ دیکھو —— یہ آ گیا ہوٹل گلستان۔ تمہارے لیے سب سے اعلیٰ درجے کا کمرہ مخصوص کرا لیا ہے۔"

میں حیران ہو کر ایلز کو دیکھنے لگی بولی۔ "یہاں؟"

ایلز ذرا تلخی سے بولی۔ "ہاں ہاں یہاں۔ یہاں یہ زیادہ آرام سے رہیں گے۔" پھر وہ نذیر کی طرف مڑ کر بولی: "ا رات کراچی سے میں آج چلی گئی تو کل صبح تم سے ملاقات ہو سکے گی۔ خدا حافظ۔ فی امان اللہ ——"

نذیر خاموشی سے اتر کر اندر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب ہم اپنے گھر پہنچے تو باورچی خانے کی طرف سے گرم کافی کی معطر لپٹیں اور بریانی کے گوشت اشتہا انگیز خوشبو آ رہی تھی جو سارے میں پھیلی ہوئی تھی مگر ایلز کی اشتہا غائب تھی اور وہ گہری سوچ میں تھی اور میں بے احتیاطی عذ پر غور کر رہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ بولی: "زری۔ آج کی رات کراچی سے میں بڑی دور جا رہی ہوں۔ پھر کبھی تم سے ملاقات ہو گی۔"

وہ باغ کے نیچے سے ہو کے باہر نکل گئی۔

"ایک واقعہ ہے۔ مگر سچا۔ کاش آپ اسے کہانی سمجھیں۔"

کوڑیوں کے مول



تحریر: بمل مترا

ترجمہ: احمد سعدی

مختصر حالات زندگی

★

مصنف

میں ۱۸ مارچ ۱۹۲۱ء کو کلکتہ کے متوسط طبقے کے ایک بنگالی گھرانے میں پیدا ہوا۔ ۱۹۳۸ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے بنگالی زبان میں ایم۔اے کیا۔ پھر انڈین ریلوے میں ملازمت کر لی اور مختلف عہدوں پر کام کرتا رہا۔ ان میں سے ایک اینٹی کورپشن افسر کا عہدہ بھی تھا۔

دوران ملازمت مجھے پورے ہندوستان میں سفر کرنے کا موقعہ بھی ملا اور ملک میں بسنے والے مختلف طبقے اور مختلف مکتبۂ خیال کے لوگوں کے مسائل اور حالات جاننے کا بھی۔ ۱۹۵۶ء میں، میں نے ملازمت چھوڑ دی اور مستقل طور پر تحریر و تصنیف کو ذریعہ معاش بنا لیا۔

میں اب تک دو سو سے زائد افسانے اور سات ناول لکھ چکا ہوں، جن میں ''صاحب بی بی غلام'' سب سے زیادہ مقبول ہوا۔ لوگوں نے مجھے اسی ناول کے بعد جانا۔

میرے تین ناول ''صاحب بی بی غلام'' ''کوڑیوں کے مول'' اور ''اکائی دہائی سینکڑہ'' ۱۶۹۰ء (جب پہلی بار انگریز ہندوستان میں آئے تھے) سے لے کر ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۲ء (جب چین نے ہندوستان کے شمالی مشرقی حصہ پر حملہ کیا تھا) کے زمانہ کو احاطہ کر کے لکھے گئے ہیں۔

میرا تازہ ناول ''بیگم میری بسواس'' زیر تصنیف ہے جو کلکتہ کے ایک بنگالی ہفتہ وار ''دیش'' میں قسط وار چھپ رہا ہے۔

میری تصانیف کے بیشتر حصے کا تمام سوویت زبانوں و دیگر غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے۔

''کوڑیوں کے مول'' کا ترجمہ انگریزی اور ہندی میں ہو چکا ہے اور اب اردو اور ملیالم میں ہو رہا ہے۔

بمل مترا

پہلی قسط پیش کرتے وقت ہمیں مصنف کے حالات زندگی نہیں مل سکے تھے۔ (ادارہ)

کوڑیوں کے مول

دوسری قسط

بمل مترا

ترجمہ: احمد سعدی

لیکن دوسرے دن شام ہی کو دیپنکر ادھر پایا گیا۔

بہت سارے رسالے بہت سارے مضامین مطالعہ کرنے کے بعد دیپنکر کو احساس ہوا تھا کہ آخر یہ سب کچھ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ دوسرے لوگوں کی طرح دیپنکر بھی تو عام اور سادہ سی زندگی گزار سکتا تھا! جیسی زندگی اجیت، رام مورتی اور سوم گزار رہے تھے! وہ لوگ ملازمت کر رہے ہیں! ملازمت میں ترقی پائی ہے، شادی کی ہے، ان کے بچے ہیں، صبح کو دفتر جاتے ہیں اور شام کو گھر واپس آکر دنیاداری کرتے ہیں، سینما دیکھتے ہیں! ان لوگوں کو کوئی کمی نہیں ہے، پھر دیپنکر کے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ وہ بھی ایک ہی ریلوے میں بھرتی ہوا تھا! دوسرے پانچ آدمیوں کے ساتھ جو کچھ پیش نہیں آیا، اس کے ساتھ پیش آیا تھا، ملازمت میں خلاف توقع ترقی ہی تھی! لوگ سب سین صاحب کہتے تھے، لیکن سین صاحب بن کر بھی کیا ہوا! سین صاحب بننے کے بعد بھی بار بار اس کے دل میں یہ احساس جاگا تھا کہ خود اس کے وجود کے اندر جیسے اس کے وجود کی کوئی انتہا نہ تھی، پھر باہر کی روشنی اور ہوا کے ساتھ باہر کے دانہ اور پانی کے ساتھ ایسا گہرا رشتہ کیسے قائم ہو گیا! کیوں اس دن اس نے امڑا کے پیڑ کے نیچے کھڑے ہو کر کھڑکی میں جھانکا تھا؟ کیوں یہ کشش تھی؟ اتنی چھوٹی سی عمر میں اس کے اندر ایسی کوئی کشش تو نہیں رہنا چاہیے تھی!

واقعی، دوسرے ہی دن شام کو دیپنکر ادھر پایا گیا۔

کرن اس روز بھی اسکول آیا تھا، اسکول کے بعد دیپنکر نے پوچھا — "ارے آج اس سادھو کے پاس نہیں جاؤ گے؟"

"سادھو کے پاس تو شام کو جائیں گے" کرن نے جواب دیا — "چلو سیر کر آئیں، میٹنگ میں تقریر سن آئیں۔"

"کہاں؟"

"برٹش پارک میں۔"

برٹش پارک میں اس روز ایک بہت بڑی میٹنگ تھی، پولیس سے میدان بھرا ہوا تھا، دیپنکر کو پہلے پہل بہت خوف محسوس ہوا، پھر بھی بہت اچھا بھی لگا تھا۔

کرن اس طرف روزانہ جیسے آتا تھا، اسے کوئی خوف نہیں تھا۔

اس نے کہا — "آؤ، اندر آؤ۔"

اندر بہت سارے لوگ زمین پر بیٹھے تھے، کانگریس کی میٹنگ تھی، دو چھوٹی چھوٹی میزیں تھیں اور ایک گیس بتی رکھی تھی، اندھیرا ہونے پر جلائی جائے گی، دو معزز کرسی پر بیٹھے تھے، نصف پارک میں لوگ بھرے ہوئے تھے، قریب ہی دو تین کرسیاں اور بھی تھیں، اخبار کے رپورٹر اور پولیس کے آدمی کاغذ پنسل لیے ہوئے بیٹھے تھے۔

* دیپنکر کو یاد ہے، وہ کسی کا نام نہیں جانتا تھا، پتا کچھ بتانے کو تھا، "گیان نیوگی کون ہے — اور سبھاش

[illegible] تھا۔

[illegible] — سبھاش بوس کون ہیں؟

کسی نے [illegible] — سبھاش بوس نہیں جانتے ہیں؟ گیانجن نیوگی کہتے ہیں، دیکھا، یہی تقریریں کرنے کی وجہ سے

[illegible]

صرف تقریر ہی نہیں [illegible] کے ساتھ میجک لالٹین بھی ہوتا تھا۔ ایک سفید پردے پر عکس پڑنے لگا، جیسے جیسے تقریر بڑھتی بائیسکوپ پر عکس بدلتے تھے لیکن تقریر کا مطلب کچھ کسانوں کی سمجھ میں آجاتا تھا کہ انگریز بیوپاریوں نے آکر کس طرح ہندوستان پر قبضہ کیا، انگریزوں نے کس طرح صنعت گروں کی انگلیاں کاٹ ڈالیں، [illegible] مظالم، یہ کارروائیاں [illegible] مظالم، یہ سب بھی کچھ دکھایا جاتا تھا اور گیانجن نیوگی تقریر کرتے جاتے تھے۔ گیا تقریر [illegible] تمام لوگ خاموشی سے سن رہے تھے۔ جیسے بس [illegible] سوز مناظر دکھا کر انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کیا تھا، انگریز کتنے لالچی، بدمعاش اور ظالم تھے، عکسی تصویروں کے ذریعہ دکھایا جا رہا تھا۔

گیانجن نیوگی نے کہا — ہم لوگ انسان ہیں یا جانور؟ ہم لوگ درخت ہیں یا پتھر؟ ہم لوگ کیا ہیں؟ ہم لوگ انسان نہیں ہیں، جانور بھی نہیں ہیں، جانور ہوتے تو بھی بہادر [illegible] اعتبار کرتے، [illegible] ان لوگوں نے ہمیں کیڑوں سے ہلاک کیا ہے اور ہم لوگوں نے کیا کیا ہے؟ آپ لوگ بتائیے، ہم لوگوں نے کیا کیا ہے؟

ایک آدمی نے جواب دیا — ہم لوگوں نے ان کی خوشامد کی ہیں —

گیانجن نیوگی نے کہا — نہیں، ہم لوگوں نے انگریزوں کے پاؤں چاٹے ہیں۔

قریب بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے کہا — ٹھیک، ٹھیک —

گیانجن نیوگی کی تقریر جاری تھی — اس کا [illegible] تھا، [illegible] کے راستے سے مسٹر [illegible] جا رہے تھے۔ مسٹر [illegible] جنرل [illegible] تھے، ان کے قریب سے ایک [illegible] کا طالب علم چھتری سر پر تانے ہوئے چلا جا رہا تھا، یہ دیکھ کر صاحب کا غصہ [illegible] اور کھول اٹھا، اتنی ہمت، صاحب کے سامنے سر پر چھتری تان کر چلے گا! سیاہ نیٹو، اس کی یہ ہمت!

صاحب نے کہا — چھتری بند کرو،

لڑکے نے حیران ہو کر پوچھا — کیوں، چھتری کیوں بند کروں؟

صاحب نے کہا — میرا حکم —

لڑکے نے پوچھا — تم کون ہو جو تمہارا حکم مانوں؟

صاحب نے کہا — دیکھو گے میں کون ہوں؟ یہ دیکھو —

اتنا کہہ کر [illegible] پیٹنے لگا، لڑکا نیم جان ہو کر وہیں پڑا رہا اور صاحب چلا گیا۔

معاملہ عدالت تک پہنچا، مقدمہ چلا، فیصلہ ہوا اور جج نے فیصلہ دیتے ہوئے کہا — قصور لڑکے کا ہے۔

صاحب کو عشق ہو گیا تھا انگریز صاحب کا کوئی قصور نہیں! اس کے بعد اسپیشل صاحب خود تحقیقات کرنے آئے۔ انھوں نے اپنے بیٹھے ہیں کہ ـــــ انتہا ہو گئی ان بدمعاشوں کے تینوں ساتھیوں کو مجسٹریٹ کے سامنے لا کر پھانسی پر لٹکائے جائیں، دوستو! اگر ہم نہ ہوتے تو ان بیہودوں کے نشانات ہماری پیٹھ پر بھی پڑتے! ہم لوگ پتھر اور بے قدر ہیں، اسی لیے ان انگریزوں کے پاؤں چاٹتے ہیں اور لوگ جو میرے قریب بیٹھے ہوئے ایشیم دہ کے لیے دیپ ریشمی تیار کر رہے ہیں ـــــ ان لوگوں کو کیا نام دوں ـــــ

ہنکا کر انھوں نے جوتے سمیت اپنا پاؤں زمین پر دے مارا۔

یکایک پولیس باہر سے دوڑتی ہوئی آئی اور لاٹھی چلانے لگی، مجمع میں ہنگامہ پیدا ہو گیا اور جو لوگ اتنی دیر سے خاموش بیٹھے تقریر سن رہے تھے، اٹھ کر بھاگنے لگے۔

یکایک کرن نے کہا ـــــ بھاگ چلو دینو، جلدی بھاگ چلو ـــــ

اس کے بعد کہاں گیا کرن، کہاں گیا دینکر اور کہاں گیا برٹش پارک! ابھی تک اندھیرا نہیں ہوا تھا، گلی کے اندر ہی اندر وہ کہاں سے کہاں جا نکلا، اکبر ہاجرہ روڈ پر پہنچ گیا، وہاں سے چند ہی قدم کے فاصلے پر حاجی قاسم کا مکان تھا، بہت بڑی بلڈنگ تھی، وہاں سے گزر کر رام دھنی کی پان کی دکان کے قریب سے گزر کر وہ ایک دم حاجی قاسم کے بازار میں جا پہنچا، ٹیپو سلطان کی بلڈنگ کے سامنے ایک بہت بڑا برگد کا پیڑ تھا، وہاں سے برگد کے پیڑ کے پیچھے سے ہوتا ہوا وہ سیدھا آگن کاری کے تالاب کا چکر لگا کر ایشور گنگولی لین میں شیتلا کے قریب آ پہنچا، اس وقت تک دینکر کی حالت سکون سے سوچنے کے قابل ہو چکی تھی، اس طرف کوئی گھما گھمی نہیں تھی، یہاں پہنچ کر دینکر نے اچھی طرح نگاہ دوڑا کر دیکھا، آس پاس، دائیں بائیں، آگے پیچھے کہیں کوئی پولیس نہیں تھی، دوڑتے دوڑتے وہ بری طرح ہانپنے لگا تھا۔ اتنی دیر میں اب اس کی سانس درست ہوئی تھی، کرن کہاں گیا؟ اس کے ساتھ سادھو کے پاس جانے کی بات تھی، وہ بھی پوری نہیں ہوئی، دینکر آہستہ آہستہ ایشور گنگولی لین کی طرف چلنے لگا، بنکو کی دکان میں بیگنی اور آلو چاپ کے خریداروں کی بھیڑ لگنا شروع ہو گئی تھی اور دھوسو [illegible] میز پر اس وقت تک اڈہ جما ہوا تھا۔

کمرے میں داخل ہو کر اس نے پکارا ـــــ ”ماں“ ـــــ

ماں نے اسے دیکھتے ہی کہا ـــــ ”تم اتنی دیر تک کہاں تھے کرن! میں یہاں بیٹھی بیٹھی فکر میں گھل رہی تھی۔“

شام کو ماں مرمری رکھ دیا کرتی تھی، جیسے شام قسمت میں مرمری ہی لکھی تھی اور گرمی میں کسی کسی دن چٹا بجات۔ اس کے بعد وہ باہر نہیں نکلتا تھا، شام کے بعد ہی وہ پڑھنے بیٹھ جاتا، لیکن پڑھتے وقت بھی اس کا دھیان دوسری طرف رہتا، کرن اس وقت کیا کر رہا ہوگا، ممکن ہے پولیس کی لاٹھی کھا کر راستے میں پڑا ہو، ممکن ہے لوگ اسے ہسپتال لے گئے ہوں، ایسی ہی بہت ساری باتیں وہ سوچتا رہتا!

ماں کہتی ـــــ ”کتابیں سامنے رکھ کر بیٹھا بیٹھا کیا سوچ رہا ہے رے؟“

تھوڑی دیر بعد ہی ماں باورچی خانے میں چلی جاتی، چولھے پر ہانڈی چڑھاتی اور دھوئیں کے مرغولے دادو کے صندوق سے ٹیک لگا

نیچے لگتا۔

[illegible] نے بھی وہ چبوترا دیکھا ایک سے زیادہ [illegible]
[illegible] تھا۔ حیرت ہے انہوں نے سوچا [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] تو شرم نہیں آتی۔

دیپکر باورچی خانے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ ماں اس وقت بہت مصروف تھی، چولھے پر سالن کی کڑھائی چڑھا کر چاول صاف کر رہی تھی۔

"ماں!" اس نے پکارا۔

"ہاں بیٹا کیا ہے" بولی — "پڑھنا لکھنا چھوڑ کر تو یہاں کیسے آ گیا؟ تیرا پڑھنا لکھنا کیا چولھے میں گیا؟ اسی طرح تو [illegible] اسی طرح تو نام بیچے گا —"

نہ کچھ بھی کہہ سکا۔ اس نے سوچا تھا وہ ماں سے صاف کہے گا — وہ لوگ کیا برے شخص ہیں، وہ لوگ کہاں رہتے ہیں؟ وہ لوگ کیا ہم لوگوں سے مختلف ہیں؟ ہم جیسے نہیں ہیں؟ وہ لوگ ہماری ہی طرح بنگالی ہیں، ہماری ہی طرح کپڑے پہنتے ہیں، بھات کھاتے ہیں، پھر ہم لوگوں سے مختلف کیوں [illegible]؟ وہ لوگ تو مردوں کا کھانا نہیں چھوتے، ان لوگوں پر ڈر کوئی نہیں ہوتا۔

دیپکر کو یاد تھا، اس وقت پھوپھی نے کہا تھا کہ تمام گاؤں گوشت کے لوگ [illegible] ہیں اور اس کرایہ دار کی ذات دوسری ہے، اس لیے ان کے [illegible] کشش [illegible] تھی۔ آس پاس کے تمام لوگ جو اس محلے یا اس علاقے میں رہتے ہیں، وہ لوگ [illegible] سستے، اتنی محنت [illegible] ان لوگوں کے پاس تو نہیں ہے۔ کوئی بہت [illegible] جیسے [illegible] ایک بی اے [illegible] محلے میں آیا تھا، اس کا لڑکا چھوٹی [illegible] تھا، ان کا ملازم بھی [illegible] تھا، سر کے بال [illegible] تھا، یہ لوگ [illegible] میں بھی [illegible] پر شرافت کا [illegible] اسی طرف [illegible] تھا۔ لیکن یہ لوگ اس جگہ بستے ہوئے کیا ایک [illegible] کے [illegible] گئے۔ یہ جگہ کرن [illegible] کی تھی، یہ جگہ دیپکر [illegible] تھی، یہ جگہ [illegible] محمد سرور [illegible] کے لیے تھی [illegible] اور [illegible] کی دکان کے لیے [illegible] تھی۔

دیپکر کو محمد سرور سے [illegible]

محمد سرور نے [illegible] کہا تھا — "تمہارے مکان میں کون کرایہ دار آیا ہے رے دیپو؟"

دیپکر نے کہا تھا — "کیا معلوم، مجھے تو نہیں معلوم —"

محمد سرور نے کہا تھا — "ہاں رے، میں نے آتے وقت دیکھا، [illegible] بڑے جسم [illegible] اور [illegible] تمہارے گھر [illegible] آدمی سب [illegible] اتر رہے تھے —"

نئی غزلیں



قسمت اس کی، موہن سود نے پھر کہا تھا ——— "سبھی لوگ گئے ہیں؟ ایک دم میم صاحب لوگوں کی طرح ———
موہن سود کی وہ چیزیں پہچان کے بارے میں تبصرے ہوتے تھے۔
وہ بنگالی کا لڑکا تھا ——— "کون آیا ہے رے اگھور بھٹاچارجی کے مکان میں، نیا کرایہ دار معلوم ہوتا ہے؟"
موہن سود کے بڑے بھائی نے کہا تھا ——— "اس محلے میں ایسے لوگ آتے ہیں؟ معاملہ کیا ہے؟ یہ تو جیسے جنسوں کی ٹولی ہیں
! ایں ———

محلے بھر میں خبر پھیل گئی تھی۔ اس محلے میں تو ایسا کرایہ دار کبھی نہیں آیا تھا۔ اس محلے کے لوگ پرمیں ساگ کے خریدار تھے۔ تھوڑا سا پیاز
اگر مل جاتے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کسی مکان کے سامنے ٹیکسی آکر کھڑی ہوتی، تو یہ لوگ حیران رہ جاتے، پتہ لگاتے، کون آیا ہے،
کون آیا ہے۔ یہ لوگ دوسرے کی حوالی چلتے ہوئے دیکھ کر بات سے ٹٹول کر جانچتے ہیں اور اس کی قیمت کا اندازہ کرتے ہیں۔ یہ
یہ بھوانی پور نہیں ہے، شیام بازار نہیں ہے، یہ قدیم گنگا کے پرانے خاندان کا شہر ہے، باون مقدس مقامات میں سے ایک
مقام ہے۔ یہاں تو ایسے کرایہ دار کے آنے کی بات نہیں تھی۔ اس طرف برٹش کمبرج روڈ، اس طرف لینڈس ڈاؤن روڈ اور اس
طرف روڈ، کوئینس پارک اسٹریٹ ——— وہ سب متمول لوگوں کا علاقہ تھا۔ اگھور دادا کے سبھی مکان اسی طرف بستے تھے، اسی
شخص نے ایک ہی ... گنگولی لین میں آگیا تھا۔

اس نے پھر ایک بار آواز دی ——— "الو"———
کیسی پوچھتے پوچھتے بھی دیپنکر کچھ نہ پوچھ سکا، ہاں اس وقت وہاں گھومنے رہی تھی۔
دیپنکر ابھی پارک کے سونے کے کمرے میں آرہا تھا کہ اندر میں اسے گھر گھر کی آواز سنائی دی، دیپنکر کے قدم رک گئے! پھر
آہستہ آہستہ اندھیرے میں چلا گیا اور دروازے کے پٹ کے پیچھے کھڑا ہوکر تھوڑی دیر تک سوچتا رہا، بڑے آدمیوں کا چہرہ ہی مختلف ہوتا
ہے یہ لوگ اس محلے میں کیوں آگئے؟ ان کے گھر میں بھی اسی کا ہم عمر کوئی لڑکا ہوتا تو بہت اچھا ہوتا، اس کے ساتھ ایک ہی کلاس میں وہ
پڑھتا! یہ لوگ اس محلے میں کیوں آگئے؟
یکایک اسے محسوس ہوا جیسے گھنگھرو کی آواز رک گئی ہو۔
آواز کیوں رک گئی؟
دیپنکر اس کھڑکی کے قریب جاکر کھڑا ہوگیا، پھر اس نے کھڑکی کا پٹ کھولا اور اس کے بعد اندر جھانک کر دیکھا۔
"کون ہے؟ کون جھانک رہا ہے وہاں پر؟"
چونکہ وہ بھاگنا ہی چاہتا تھا کہ ایک آدمی نے آکر اس کا ہاتھ پکڑ لیا، دیپنکر نے اندھیرے میں بھی پہچان لیا، یہ وہی
نوکر تھا۔
ملازم اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کوٹھی کے دروازے سے اندر کمرے میں لے گیا، دیپنکر نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش
کی، جھٹکا ——— "مجھے تم نے کیوں پکڑ رکھا ہے؟ واہ رے! میں نے کیا کیا ہے؟"

خادم بولا ـــــ "چلو، پکڑو، روشن دان سے جھانک رہے تھے ـــــ"

دیپک نے کہا ـــــ "غلط ہے، میں کیا روشن دان سے دیکھ رہا تھا، میں تو گھر کی روشنی دیکھ رہا تھا ـــــ"

اندر سے کسی کی آواز سنائی دی ـــــ "ٹھیک، پکڑ کر لے آؤ۔" وہ اس کے قریب پہنچ گیا اور اس سے پہلے کہ وہ بھاگ پاتا،

دیپک کو بے حد خوف محسوس ہوا۔ اس نے خادم کا ہاتھ چھڑا کر بھاگنے کی کوشش کی، لیکن خادم کے جسم میں بلا کی طاقت تھی، اس نے دونوں ہاتھوں سے اسے پکڑ رکھا تھا۔

اس نے کہا ـــــ "روشن دان سے جھانک کر دیکھا جاتا ہے؟ یہ دیکھو دیدی، لڑکا یہاں نہیں جا رہا تھا۔"

اندر سے ایک لڑکی کی آواز آئی ـــــ "پکڑ کر میرے پاس لے آؤ۔"

خادم نے دیپک کا ہاتھ کھینچا۔ حسب میں جو بڑا سا صحن تھا اس کے بعد زینہ تھا۔ زینے کے بعد برآمدہ تھا اور پھر پیچھے کے بعد سامنے ہی کمرہ تھا۔ کمرے کے اندر تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایک قیمتی پردہ لٹکا ہوا تھا۔ کمرے میں چاروں طرف قیمتی پردے لٹک رہے تھے۔ ہاتھ پکڑے ہوئے خادم جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا۔ لڑکی نے کہا۔

"ارے، تم ہی ہو وہ، یہ تو بڑا خاص ہے ـــــ کہاں رہتے ہو؟ کیا نام ہے تمہارا؟"

دیپک کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے ـــــ "میں نے کچھ بھی نہیں کیا، مجھے خواہ مخواہ پکڑ کر لایا ہے۔"

دیپک نے جب اس لڑکی کو غور سے دیکھا، اس کی آنکھوں میں شاید کاجل کی دھاریاں تھیں۔ اس وقت لڑکی کے منہ سے سب نظر نہیں آیا تھا۔ نہانے کے بعد اس نے سلک کی ساڑی کو بے ترتیبی سے جسم کے گرد لپیٹ رکھا تھا اور دونوں کانوں میں دو چمک جگمگا رہے تھے۔

لڑکی اس کے اور بھی قریب آ گئی ـــــ "کیا نام ہے تمہارا؟"

دیپک نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور چہرے سے یہ اندازہ کرنا چاہا کہ اسے کیا سزا مل سکتی ہے۔ لیکن اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ اسے تسلی بھی نہیں ہو رہی تھی اور خوف بھی کم نہیں ہو رہا تھا۔

لڑکی نے پوچھا ـــــ "بتاؤ، تم اپنا نام بتاؤ، صرف نام بتاؤ؟"

دیپک نے کہا ـــــ "اگر تم میری ماں سے کہہ دو ـــــ"

لڑکی مسکرا دی۔ اس کے دانت کتنے خوبصورت تھے۔ اسے مسکراتے دیکھ کر کچھ تسلی ہوئی۔

"میری ماں کو معلوم ہو گا تو میری ماں بہت خفا ہو گی۔" دیپک نے کہا ـــــ "میں اب ایسا نہیں کروں گا، مجھے چھوڑ دو ـــــ"

"ہاں ہاں، تمہیں چھوڑ دیتی ہوں، مگر تم باہر جاؤ تو۔"

خادم باہر چلا گیا۔ اب کمرے میں لڑکی اور دیپک رہ گئے۔

لڑکی نے کہا ـــــ "بتاؤ، تمہاری ماں سے نہیں کہوں گی، تمہارا نام کیا ہے؟ کہاں رہتے ہو؟ جھانک کر کیا دیکھ رہے تھے؟"

دیکھنے [illegible] بولا — میں پاگل تھوڑی ہی ہوں تم کو دیکھ رہا تھا اور کسی کو نہیں دیکھ —
دی فقط [illegible] — وہ لوگ بھی [illegible] کا خواب ہے، بچہ دیکھ رہے تھے میرے اندر
دیکھو کیا بات ہے [illegible] میں پھر بہلا بہلا —"

دیکھنے کہا — میں نے خواب دیکھا تھا، اس لیے —"

"خواب ؟ کیسا خواب ؟ تم خواب دیکھ رہے تھے ؟"

دیکھ کر اسے کچھ یاد آیا، اس دن کی باتیں یاد کر کے اسے ہنسی آ گئی تھی۔ بچپن میں دیکھو واقعی بہت ہی دقیانوس تھا، اس کے علاوہ [illegible] میں [illegible] دیدی کی ایسی لڑکی تو اس وقت تک اس نے نہیں دیکھی تھی۔ ایشور گنگولی صاحب کے آس پاس جتنی لڑکیاں بھی رہتی تھیں ان میں سے ایک بھی [illegible] دیدی جیسی نہیں تھی۔ دوسری لڑکیاں جس طرح کپڑے پہنتی تھیں، [illegible] دیدی اس طرح کپڑے نہیں پہنتی تھی، وہ [illegible] سے گھٹنوں تک ساڑی کو جسم کے گرد لپیٹے رہتی تھی کہ نظر میں بہت بھلی لگتی تھی!

[illegible] دیدی نے پوچھا — تمہارا گھر کہاں ہے؟"

دیکھنے جواب دیا — میرا گھر رودادو کے مکان میں رہتا ہوں — پرسوں میں نے ایک خواب دیکھا تھا کہ کوئی پاؤں میں گھنگرو باندھ کر ناچ رہا ہے، اس کے بعد میں نے جھانک کر دیکھا تو ایک بھالو پاؤں میں گھنگرو باندھے ناچ رہا تھا —"

"سچ تم چیز ہی [illegible] ہو، تم نے بھالو کو خواب میں کیوں دیکھا؟ میں بھالو ہوں؟"

اتنا کہہ کر [illegible] دیدی ہنسنے لگی۔

دیکھنے کہا — "نہیں، پہلوان [illegible] نے کہا تھا، بڑے ہو کر جب تم لوگ کتابیں پڑھو گے تو سب کچھ تمہاری سمجھ میں آ جائے گا، خواب کے بھی بہت سے معنی ہوتے ہیں۔"

"پہلوان [illegible] کون ہیں؟"

دیکھنے کہا — ہمارے [illegible] ٹرسٹ ماڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں، انھوں نے کہا تھا، جو لوگ بڑے ہوتے ہیں، ان لوگوں کے خواب سچ ہوتے ہیں، میں بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ میرا خواب بھی سچا ہے یا نہیں۔"

اس کے بعد [illegible] کر بولا — مجھے چھوڑ دو، میں پھر کبھی ایسا نہیں کروں گا۔"

[illegible] دیدی نے کہا — میں تمہیں اتنی آسانی سے نہیں چھوڑوں گی —"

اس کے بعد آواز دی — "رگھو —"

رگھو کے آتے ہی [illegible] دیدی نے کہا — دیکھو تو رگھو، کاکا بابو دفتر سے آئے ہیں یا نہیں؟

کاکا بابو کون ہیں، کاکا بابو کیسے آدمی ہیں اس وقت دیکھو کو کچھ بھی معلوم نہیں تھا، لیکن اس وقت اسے ایسا لگا جیسے وہ ڈر سے [illegible] جاتا ہے۔

[illegible]

[illegible] ـــ [illegible]

لڑکی نے کہا ـــ چھوڑو، چھوڑو مجھے!

دیپیکا نے کہا ـــ میری امی آتی ہوں گی!

لڑکی نے کہا ـــ مجھ کو تو میرے ماں باپ سے ڈر لگتا ہے ـــ ابھی بلا لاتی ہوں!

اتنا کہہ کر اس کا ہاتھ کھینچتے ہوئے اندر کے دروازے سے ہو کر [illegible]

جاتا تھا۔ ہر کمرے کے سامنے ایک پردہ لٹکا ہوا تھا۔

لڑکی نے ایک دروازے سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ـــ کاکا بابو!

اندر سے آواز آئی ـــ کیا ہے منی ـــ کیا بات ہے؟

لڑکی نے کہا ـــ دیکھیے کاکا بابو، یہ کون آئی ہیں، دیکھیے ـــ

اتنا کہہ کر لڑکی دیپیکا کو کھینچ کر کمرے کے اندر لے گئی۔

بولی ـــ دیکھیے، ہم ہی بہت [illegible] دیکھیے ـــ

اتنا کہہ کر اس کو زبردستی گھسیٹ کر کاکا بابو کے سامنے لے گئی۔

دیپیکا نے دیکھا ـــ ایک صاحب میز کے سامنے بیٹھے چائے پی رہے تھے اور ان کے قریب ہی ایک خاتون بیٹھی ہوئی
تھیں۔

کاکا بابو نے کہا ـــ چھوڑ دو، چھوڑ دو منی ـــ آؤ، اس کو تکلیف ہوگی ـــ

منی دیدی نے چھوڑ دیا، بولی ـــ کتنا بدمعاش لڑکا ہے، جانتے ہیں کاکا بابو، مجھے بھگا کر لے جا رہا تھا۔

کاکا بابو نے کہا ـــ کیا، تم اسے بھگا کر لے جا رہے تھے؟ منی دیدی کو تم نے بھگایا ہے؟

خاتون بولیں ـــ اور اس کیا ہوگا، میں نے اسی وقت تم سے کہا تھا، اتنا بڑا شہر ہوتے ہوئے تم نے اس
محلے میں کیوں مکان لیا ـــ

کاکا بابو نے دیپیکا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ـــ تم نے منی کو بھگایا ہے؟

"میں نے بھگایا نہیں ہے۔" دیپیکا نے جواب دیا ـــ "میں نے کب تم کو بھگایا ہے، بتاؤ تو سہی!"

کاکا بابو نے کہا ـــ پھر تم بھاگ کر کیا دیکھ رہے تھے؟

اتنی دیر میں منی دیدی ایک کرسی پر جا کر بیٹھ گئی۔ دیپیکا نے چاروں طرف تعجب سے دیکھا، کتنی خوبصورتی سے
سجا ہوا تھا۔ اس سے پہلے جو کمرے دیکھے تھے، وہ کبھی اس طرح کمرے سجا کر نہیں رکھتے تھے!

منی دیدی نے کہا ـــ میں نے کل ہی گھر سے کہہ دیا تھا کاکا بابو کو، تم تو وہ بالکل تیار رہے ـــ اور میں نے

تک بس ساتھ ہے — اور پھر چلا گیا۔

کالا بابو چونک کر دیکھ کر قد سے تیز ہو گئی، وہ شدت سے ایک جھٹکا لگا ہی بیٹھے۔

کالا بابو کی بیوی کچھ بیٹھے پر رہا تھیں، ارمی — میں نے اس وقت کہہ دیا تھا، اس محلے میں شکایت کر —

ڈ نے زیر یا بیٹھ لیا —

ڈیکچر نے کہا — مجھے چھوڑ دیجیے، میں پھر کبھی ایسی حرکت نہیں کروں گا۔

کالا بابو نے کہا — واہ رے، میں تمھیں پیٹ رہا ہوں یا تمھیں پکڑ رکھا ہے جو تم اس طرح کہہ رہے ہو، تمھارا نام کیا ہے؟

میرا نام ڈیکچر سنگھ ہے۔ ڈیکچر نے جواب دیا — میں انگوٹھ داود کے اس مکان میں رہتا ہوں۔

او، انگوٹھ بیچارے صاحب، وہ تمھارے کون ہوتے ہیں؟

میرے کوئی نہیں لگتے، وہ ہمارے ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں، انھوں نے ہی مجھے اور میری ماں کو رہنے کے لیے اپنے گھر میں جگہ دی ہے، بجلی کا لیمپ کو چھوڑ دیتے ہیں، بچپن سے جانتے ہیں۔

کالا بابو نے کہا — بہت اچھی بات ہے، میں نے سنا تھا بہت کنجوس آدمی ہیں، خیر جو بھی ہو، تم ہر روز کیوں جھانک کر دیکھتے تھے؟

ڈیکچر نے کہا — میں نے پرسوں ایک خواب دیکھا تھا کہ میرے گھر کے پاس کوئی ناچ رہا ہے، چھم چھم چھم گھنگرو بج رہا ہے، اس کے بعد کل جب اسکول گیا تو پرانا ساتھی بابو، ہمارے پنڈت ماسٹر نے پوچھا، کس نے کون سا خواب دیکھا ہے، میں نے جو خواب دیکھا تھا وہ ان کو سنا دیا —

اس کے بعد، جھانک کیوں گئے، بولو؟

وہ خواب سناؤں گا تو آپ لوگ خفا ہوں گے۔

کالا بابو نے کہا — نہیں، خفا کیوں ہوں گا، بولو کیا خواب دیکھا تھا؟

ڈیکچر نے کہا — گھنگرو کی آواز سن کر میرا جی چاہا کہ جا کر دیکھوں کون ناچ رہا ہے، اس کے بعد میں گھر سے نکل کر گلی میں آیا، گلی پار کر کے آپ کے مکان کے سامنے آیا، وہاں آ کر دیکھا کہ بالائی منزل کے ایک کمرے سے گھنگرو کی آواز سنائی دے رہی ہے، میرا جی چاہا کہ جھانک کر دیکھوں، کون ناچ رہا ہے، اس کے بعد آہستہ آہستہ کھڑکی کا پٹ کھول کر اندر دیکھا —

بولو، جھانک کیوں گئے، پھر کیا دیکھا؟

ڈیکچر نے کہا — میں نے دیکھا کہ ایک بھالو —

بھالو؟ بھالو ناچ رہا ہے؟

[illegible] ـــــ جھک کے بیٹھتے۔ [illegible]

[illegible] ـــــ کیا کہتے ہو! ممّی تمہیں پڑھاتی ہیں؟"

ماتروں کی ہنستے ہنستے بولیں ـــــ ارمان ایسا ہوگا، ایسا خوبصورت چہرہ [illegible]

دیپکر نے کہا ـــــ وہ تو خواب تھا! خواب کیا سچ ہوتا ہے! خواب سچے ہوتے ہیں یا نہیں ہو سکتے کبھی، تو آج جاگ کر دیکھ رہا تھا، دیکھا کہ میرا خواب سچ نہیں تھا، یہاں کالا بابو نے کہا ہے ـــــ جو تعلیم یافتہ ہیں ان کے خواب سچے ہوتے ہیں تو غریب آدمی کا لڑکا ہوں، میرے خواب کس طرح سچے ہوں گے؟"

کالا بابو نے کہا ـــــ دل لگا کر پڑھو۔ تم اس مرتبہ کلاس میں کیا آئے تھے؟"

"میں ہر مرتبہ فرسٹ آتا ہوں۔" دیپکر نے جواب دیا۔

"واہ، ویری گڈ، کون پڑھاتا ہے تمہیں؟"

"میں خود پڑھتا ہوں۔" دیپکر نے جواب دیا ـــــ حساب کالا بابو بتا دیتے ہیں، کالا بابو بہت اچھا حساب جانتے ہیں ـــــ"

"تو تم مجھ سے حساب اور انگریزی پڑھ سکتے ہو ـــــ بلکہ ممّی تمہیں بہت اچھی انگریزی سکھا دے گی، ممّی بہت اچھی انگریزی جانتی ہے۔"

ممّی دیدی نے کہا ـــــ واہ رے، کالا بابو آپ بھی کیا اچھے آدمی ہیں، میرے پاس وقت کہاں ہے، مجھے تو خود اپنے پڑھنے کے لیے وقت نہیں ملتا، اس کے علاوہ سوشل ہے، رقص ہے ـــــ"

"کوئی بات نہیں،" کالا بابو نے کہا ـــــ "غریب لڑکا ہے، ذرا سا پڑھا دو گی تو کیا ہوگا۔"

دیپکر کی ہمت ایک بہت بڑھ گئی، اس نے کہا ـــــ گاؤں میں پہلے ہم لوگوں کی حالت بہت اچھی تھی، میرے باپ کو ڈاکوؤں نے قتل کر دیا تھا اسی وقت سے میری ماں مجھے لے کر کلکتہ چلی آئی تھی، ماں انگریز دادا کا کھانا پکاتی ہے، اگر انگریز دادا ہم لوگ کو پناہ نہ دیتے تو سب بھوکے مر گئے ہوتے۔"

کالا بابو نے کہا ـــــ ٹھیک ہے، تم آ جایا کرو، ممّی تمہیں پڑھا دیا کرے گی۔"

ممّی دیدی نے کہا ـــــ مگر میری اپنی پڑھائی نہیں ہو سکے گی کالا بابو۔"

انھوں نے کہا ـــــ سنی تو کلکتہ آ رہی ہے، سنی کے آنے کے بعد اسے بھی تو تمہیں پڑھانا ہوگا، اس کے ساتھ اسے بھی پڑھا دو گی ـــــ"

دیپکر نے کہا ـــــ انگریزی بڑی مشکل ہے، حساب میں کالا بابو سے سیکھ لوں گا۔"

انھوں نے کہا ـــــ انگریزی، حساب اور بنگالی سب کچھ تمہیں ممّی پڑھا دیا کرے گی، ممّی بہت اچھی طرح سب جانتی ہے، وہ تمہیں بھی پڑھا سکتی ہے ـــــ کیوں ممّی؟ اس کو اس مرتبہ دس روپیہ اسکالرشپ ملا ہے ـــــ تمہیں معلوم ہے ممّی،

تعلقات باقاعدہ ریاضت کی طرح شکر بے تکلف ہوئے ہیں ، بچپن سے کتابیں دوستی کر کے بھی یہیں بیچ رہے ہیں ، دونوں بہنیں ایک ساتھ ہی پڑھیں گی ۔"

گھر والوں نے کہا ——— "ایک ساتھ رہ کر جو پڑھائی ہو گی وہ میں جانتی ہوں ، ستی کو تو اپنے دیکھا نہیں ہے کاکا بابو ۔"

خالہ نے کہا ——— "مجھے یاد ہے ، میں نے ستی کو چھوٹی سی عمر میں دیکھا تھا ، تمہاری ہی طرح گوری تھی ، ہے نا ؟"

گھر والوں نے کہا ——— "وہ ہی ستی اب ایسی ہو گئی ہے کہ دیکھ کر آپ پہچان نہ سکیں گی کاکی ماں ——— اسی عمر میں میرے برابر ہو گئی ہے ۔"

اتنے میں ایک ملازم دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا ۔

کاکی ماں نے پوچھا ——— "کیا ہے ٹھاکر ؟ کیا کہنا چاہتے ہو ؟"

"کھانا تیار ہے ماں ؟" ٹھاکر نے جواب دیا ——— "نکال دوں ؟"

کاکی ماں نے کہا ——— "کیا کہتے ہو ٹھاکر ، ابھی تو چائے پی ہے ، ابھی کھاؤں گی ؟ تم تو دیکھتی ہوں بات ٹال کر کے رہائی حاصل کرنا چاہتے ہو ، تھوڑی دیر بعد تمہیں خبر دوں گی ۔"

دیپنکر نے کہا ——— "ماں کو فکر لگی ہو گی ، میں جاتا ہوں ۔"

کاکا بابو نے کہا ——— "جاؤ ، رات بڑھ رہی ہے ، پڑھو لکھو جا کر ———"

دیپنکر کو عجیب سا احساس ہوا ، یکایک احساسِ ممنونیت سے اُس کا دل بھر آیا ، اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے ایسا پیار ، ایسی محبت ، ایسی ہمدردی اُسے زندگی میں کبھی سے نہ ملی ہو ، اچانک وہ کاکا بابو کے قدموں میں جھک گیا اور اُن کے دونوں پاؤں کو چھو کر ان کے قدموں کی خاک سر پر رکھ لی ، پھر اُس نے کاکی ماں کو بھی پرنام کیا ۔

اتنے دنوں کے بعد اب جب کبھی اُسے بیتے دنوں کی یاد آتی ہے تو حیرت ہوتی ہے ، ان لوگوں کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ نہ تھا ، ان کے ساتھ کبھی کوئی سروکار بھی نہیں رہا تھا ، اس نے کبھی ان کو دیکھا بھی نہیں تھا ، لیکن پھر بھی اس روز وہ دیپنکر کو اپنوں جیسے لگے تھے ، دیپنکر کو بڑی مسرت محسوس ہوئی تھی ، وہ صرف اچھے ہی نہیں لگے تھے ، صرف پیار کی پناہ ہی نہیں دی تھی ، بلکہ اس دن اسی معمولی سے واقعہ کو مرکز بنا کر ان کے ساتھ وہ متعارف ہوا تھا جب دوسروں کے رحم و کرم پر اس کی زندگی کا دارومدار تھا ، اس وقت انھوں نے اس طرح بیا محبت کیوں جتائی تھی کون جانے ؟ لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا وہ اس طرح زندگی کا روپ دیکھ سکتا ؟ اس طرح دنیا کو سمجھ سکتا ؟ یا وہ اس طرح حقیقت معلوم کر سکتا کہ زندگی صرف زندگی ہی نہیں ہے ، دکھ صرف دکھ ہی نہیں ہے ، خوشی صرف خوشی نہیں ہے ، زندگی کے کچھ دوسرے معنی ہوتے ہیں ، دکھ کی بھی ایک الگ تشریح ہے اور خوشی کا بھی ایک دوسرا مقصد ہے !

اور بھی دیدی ؟

واقعی بھی دیدی آئی تھی اسی لیے تو ستی بھی آئی تھی !

اور ستی آئی تھی اسی لیے تو دیپنکر اس حقیقت کو جان سکا تھا کہ زندگی کے بھی دوسرے معنی ہوتے ہیں ، دکھ کی بھی ایک الگ

... بابو زور سے قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔ وہ خالہ کی طرف ایک ٹک دیکھ رہی۔

کاکا بابو نے کہا —— "کیا کہتے ہو؟ لکھی تمہیں بھاگو نظر آتی ہے؟"

خالہ بھی ہنستے ہنستے بولیں —— "ارمان، کیا ہو گا، ایسا خوبصورت چہرہ اللہ نے ... دیا ہے۔"

دیپک نے کہا —— "وہ تو خواب تھا! خواب کیا سچ ہوتا ہے! خواب سچے ہوتے ہیں! ... آ گئی سمجھ کر دیکھ رہا تھا، دیکھا کہ میرا خواب سچ نہیں تھا، یہاں تو کاکا بابو نے کہا ہے —— ہم تعلیم یافتہ ہیں ان کے خواب سچے ہوتے ہیں، تو غریب آدمی کا لڑکا ہوں، میرے خواب کس طرح سچے ہوں گے؟"

کاکا بابو نے کہا —— "دل لگا کر پڑھو۔ تمہارے اس مرتبہ کلاس میں کیا نمبر تھے؟"

"میں ہر مرتبہ فرسٹ ہوتا ہوں۔" دیپک نے جواب دیا۔

"واہ، ویری گڈ، کون پڑھاتا ہے تمہیں؟"

"میں خود پڑھتا ہوں۔" دیپک نے جواب دیا —— "حساب کرنے کے بابا سمجھا دیتے ہیں، کیونکہ بابا بہت اچھا حساب جانتے ہیں ——"

"وہ تم لکھی سے حساب اور انگریزی پڑھ سکتے ہو —— کیوں لکھی تمہیں بہت اچھی انگریزی سکھا دے گی، لکھی بہت اچھی انگریزی جانتی ہے۔"

لکھی دیدی نے کہا —— "واہ رے۔ کاکا بابو آپ بھی کیا اچھے آدمی ہیں، میرے پاس وقت کہاں ہے، مجھے تو خود اپنے پڑھنے کے لیے وقت نہیں ہوتا، اس کے علاوہ سوئی ہے، رقص ہے ——"

"کوئی بات نہیں،" کاکا بابو نے کہا —— "غریب لڑکا ہے، ذرا سا بتا دو گی تو کیا ہوا۔"

دیپک کی بے تابی ایک دم بڑھ گئی، اس نے کہا —— "گاؤں میں پہلے ہم لوگوں کی حالت بہت اچھی تھی، میرے بابا کو ڈاکوؤں نے قتل کر دیا تھا اسی وقت سے میری ماں مجھے لے کر کلکتہ چلی آئی تھی، ماں انگریز دادو کا کھانا پکاتی ہے، اگر انگریز دادو ہم لوگوں کو پناہ نہ دیتے تو سب بھوکے مر گئے ہوتے۔"

کاکا بابو نے کہا —— "ٹھیک ہے، تم آ جایا کرو لکھی تمہیں پڑھا دیا کرے گی۔"

لکھی دیدی نے کہا —— "مگر میری اپنی پڑھائی نہیں ہو سکے گی کاکا بابو۔"

انھوں نے کہا —— "سنتی تو کلکتہ آ ہی رہی ہے، سنتی کے آنے کے بعد اُسے بھی تو تمہیں پڑھانا ہو گا، اسی کے ساتھ اسے بھی پڑھا دو گی ——"

دیپک نے کہا —— "انگریزی ہی مشکل ہے، حساب میں گھر کے بابا سے سیکھ لوں گا۔"

انھوں نے کہا —— "انگریزی، حساب اور بنگالی سب کچھ تمہیں لکھی پڑھا دیا کرے گی، لکھی بہت اچھی طرح انگریزی جانتی ہے، وہ مجھے بھی پڑھا سکتی ہے —— کیوں لکھی؟ اس کو اس مرتبہ دس روپیہ اسکالرشپ ملا ہے —— تمہیں معلوم ہے مگر

تم سے بابا تمھارے رزلٹ کی خبر سُن کر بہت خوش ہوئے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے وہ ستی کو بھی یہیں بھیج رہے ہیں، دونوں بہنیں ایک ساتھ رہ پڑھیں گی۔"

ٹھکو دیدی نے کہا ——— "ایک ساتھ رہ کر جو پڑھائی ہو گی وہ میں جانتی ہوں، ستی کو تو آپ نے دیکھا نہیں ہے کاکا بابو۔"

خاتون نے کہا ——— "مجھے یاد ہے، میں نے ستی کو چھوٹی سی عمر میں دیکھا تھا، تمھاری ہی طرح گوری تھی، ہے نا؟"

ٹھکو دیدی نے کہا ——— "وہی ستی اب ایسی ہو گئی ہے نا کہ دیکھ کر آپ پہچان نہ سکیں گی کاکی ماں ——— اسی عمر میں میرے برابر ہو گئی ہے۔"

اتنے میں ایک ملازم دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔

کاکی ماں نے پوچھا ——— "کیا ہے ٹھاکر؟ کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"کھانا تیار ہے ماں!" ٹھاکر نے جواب دیا ——— "نکال دوں؟"

کاکی ماں نے کہا ——— "کیا کہتے ہو ٹھاکر، ابھی تو چائے پی ہے، ابھی کھاؤں گی؟ تم تو دیکھتی ہوں ہاتھ خالی کر کے رہائی حاصل کرنے ہو، تھوڑی دیر بعد تمھیں خبر دوں گی۔"

دیپنکر نے کہا ——— "ماں کو فکر لگی ہو گی، میں جاتا ہوں۔"

کاکا بابو نے کہا ——— "جاؤ، رات بڑھ رہی ہے، پڑھو لکھو جا کر ———"

دیپنکر کو عجیب سا احساس ہوا، یکایک احساسِ ممنونیت سے اُس کا دل بھر آیا، اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے ایسا پیار، ایسی محبت، ایسی ہمدردی اُسے زندگی میں کبھی سے نہ ملی ہو، اچانک وہ کاکا بابو کے قدموں میں جھک گیا اور اُن کے دونوں پاؤں کو چھو کر اور اُن کے قدموں کی خاک سر پر رکھ لی، پھر اُس نے کاکی ماں کو بھی پرنام کیا۔

اتنے دنوں کے بعد اب جب کبھی اُسے بیتے دنوں کی یاد آتی ہے تو حیرت ہوتی ہے، ان لوگوں کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ نہ تھا، ان کے ساتھ کبھی کوئی سروکار بھی نہیں رہا تھا، اس نے کبھی ان کو دیکھا بھی نہیں تھا، لیکن پھر بھی اس روز وہ دیپنکر کو اپنوں جیسے لگے تھے۔ دیپنکر کو بڑی مسرت محسوس ہوئی تھی، وہ صرف اچھے ہی نہیں لگے تھے، صرف پیار کی پناہ ہی نہیں دی تھی، بلکہ اس دن اسی معمولی سے واقعہ کو مرکز بنا کر ان کے ساتھ وہ متعارف ہوا تھا، جب دوسروں کے رحم و کرم پر اس کی زندگی کا دار و مدار تھا، اس وقت اُنھوں نے اس طرح بلا تحقیق کیوں چاہا تھا کون جانے، لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا وہ اس طرح زندگی کا رُوپ دیکھ سکتا، اس طرح دُنیا کو سمجھ سکتا، اور وہ اس طرح حقیقت معلوم کر سکتا کہ زندگی صرف زندگی ہی نہیں ہے، دُکھ صرف دُکھ ہی نہیں ہے، خوشی صرف خوشی نہیں ہے، زندگی کے بھی دوسرے معنی ہوتے ہیں، دُکھ کی بھی ایک الگ تشریح ہے اور خوشی کا بھی ایک دوسرا مقصد ہے!

اور ٹھکو دیدی؟

واقعی ٹھکو دیدی آئی تھی اسی لیے تو ستی بھی آئی تھی!

اور ستی آئی تھی اسی لیے تو دیپنکر اس حقیقت کو جان سکا تھا کہ زندگی کے بھی دوسرے معنی ہوتے ہیں، دُکھ کی بھی ایک الگ

۔۔۔ اور روشنی کا بھی ایک دوسرا حصہ ہے

کمرے سے نکل کر دیپکر زینے سے نیچے اُتر رہا تھا۔ یکایک پھر بنگلے کا پورا دروازہ آنے کے بعد دیپکر دیکھ رہا تھا کہ مکان کا نقشہ کیسا بدل گیا تھا۔ مدتوں تک ساری تبدیلیاں ہو گئی تھیں! برسوں کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ اس نے ایک چھت میں، کمرہ دالان کے علاوہ کو پورا کچھ بدل دیا تھا۔ پھر ان لوگوں نے بنگلے کے کنارے تک بیچ سے سجا دیا تھا۔ ہر دروازے پر ایک پردہ لٹکا ہوا تھا۔ کرسی، میز، کرسی، صوفہ، الماری اور آئینہ۔ کمرے میں کہیں کہیں پر جگہ روکی۔ دیپکر آہستہ آہستہ زینے سے نیچے اُتر گیا! ماں شاید پریشان ہو رہی ہوگی۔ شاید ڈھونڈ بھی رہی ہو کہ دیر کہاں چلا گیا۔

زینے سے نیچے اُترتے ہی کسی نے اُسے پکارا۔

"اے چھوکرا سن۔"

دیپکر نے پلٹ کر دیکھا، وہی لڑکی تھی ملکی!

اُس نے پوچھا ـــــ "مجھے بلا رہی ہو؟"

لڑکی زینہ پھلانگتی ہوئی تیزی سے نیچے آئی اور اُس کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔

دیپکر لڑکی کی آنکھیں دیکھ کر چونک اُٹھا، اتنی دیر تک اس کی آنکھوں کا رنگ ایسا تو نہ تھا۔

اُس نے پوچھا ـــــ "مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو؟"

لڑکی نے کہا ـــــ "اگر پھر کبھی تم میرے یہاں آئے تو تمہاری ٹانگ توڑ دوں گی۔"

"واہ رے! میں نے کیا کیا ہے؟"

یکایک لڑکی نے اس کا کان پکڑ کر کھینچا ـــــ "بحث کرتے ہو؟"

اُس نے خوب زور سے کان کھینچ دیا۔

دیپکر نے کہا ـــــ "میں بحث تو نہیں کرتا۔"

"پھر بحث، تم اس مکان میں نہیں آسکتے، میں نے کہہ دیا۔"

دیپکر نے کہا ـــــ "لیکن کاکا بابو نے جو آنے کو کہا ہے۔"

"کاکا بابو کو کہنے دو، میں کہتی ہوں تم نہیں آؤ گے۔"

دیپکر لڑکی کے تیور دیکھ کر ڈر گیا۔

اُس نے کہا ـــــ "اچھا، نہیں آؤں گا۔"

"ہاں، نہیں آنا!"

اتنا کہہ کر اُس نے دیپکر کو دھکیل دیا اور دیپکر دھکا کھا کر زینے کے نیچے گر پڑا۔ گرتے ہی اُسے سر میں چوٹ لگی اور وہ ڈر کر گم ہو گیا۔ دیکھا وہ لڑکی اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اس نے ڈانٹتے ہوئے کہا ——— "میں نہیں آؤں گا، میں وعدہ کرتا ہوں تمھی دیدی، پھر کبھی نہیں آؤں گا۔"
ڈاکٹر لیلا ایک دم ہنسنے لگی، پھر قریب آ کر اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگی۔
بولی ——— "پگلی ہے؟ ڈر سے کانپ گیا یار ہے؟"
دیپک نے کہا ——— "تم نے مجھے کیوں دھکیل دیا؟ میں نے تمھارا کیا کیا تھا جو تم نے مجھے دھکیل دیا؟"
ڈاکٹر نے جواب دیا ——— "یونہی! میں دیکھ رہی تھی کہ تم ڈرتے ہو یا نہیں۔"
دیپک نے کہا ——— "اب میں تمھارے یہاں نہیں آؤں گا، کاکا بھی کہیں گے تو بھی نہیں آؤں گا، مجھے چھوڑ دو۔"
ڈاکٹر لیلا ایک دم اسے پیار کرنے لگی، بولی ——— "نہیں دیپ، میں دیکھ رہی تھی، تم ڈرتے ہو یا نہیں، تو کل پھر آنا، سمجھے، ڈرگے تو، ضرور آنا۔"

اتنا کہہ کر وہ دیدی چلی گئی اور دیپک حیرت سے بڑی دیر تک خاموش کھڑا ٹکٹکی لگائے اسی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ کمرے کے دروازے کے راستے آنگن میں آ گیا۔ اس کا سر ابھی تک چکر کر رہا تھا۔

گرو نے پوچھا ——— "اس کے بعد کل تم کہاں چلے گئے تھے؟ میں دیر تک ڈھونڈتا رہا ———"

"میں حاجی قاسم کے بازار کی طرف بھاگ گیا تھا" ——— دیپک نے جواب دیا ——— "اس کے بعد آگن کاری تالاب کا چکر لگا کر مقبرہ کی عمارت کے قریب سے ہوتے ہوئے شیشہ تو کے راستے گھر چلا گیا تھا۔"

واقعی ان دنوں کا بالی گنج اب پہچانا نہیں جاتا۔ اس وقت اس بھاری ایونیو کے موڑ پر حاجی قاسم کا بازار تھا، اس کے بعد اسی ...نے جنوب مشرق کرنے پر ٹیپو سلطان کی قدیم عمارت تھی، اب قطار در قطار دکانیں ہو گئی ہیں۔ دن رات ٹرامیں اور بسیں بھاگتی دوڑتی رہتی ہیں لیکن اس وقت؟ اس وقت کالی گھاٹ ایسا نہیں تھا، بالی گنج بھی آج کے ایسا نہیں تھا۔ ٹیپو سلطان کی عظیم الشان عمارت اس موڑ سے ...گن کاری کا سب کچھ پھیلی ہوئی بھوتوں کے مسکن کی طرح دکھائی دیتی۔ عمارت کے سامنے ہی بڑے بڑے برگد کے پیڑ اُگ آئے تھے۔ ...سے دوپہر کے وقت بھی اجاڑ اجاڑ سی دکھائی دیتی۔ وہاں پر جاتے ہوئے بھی خوف محسوس ہوتا، بلکہ دوپہر کے وقت ہوا کے ...ٹ کھا کر ہلکے ہلکے جھوم اٹھتے اور چاروں طرف پُر اسرار سی آواز پھیل جاتی اور کبھی کبھی کوئی خطرناک سانپ زور زور سے پھنکارتا ... اس وقت سارے محلے میں ایک عجیب سا خوف طاری ہو جاتا۔ اس موڑ کے مغربی جنوبی کونے پر جو پڑا تھا، شکر بنانے والے ...تے ہی پہلے ... کے تختوں پر شکر سکھانے کے لیے رکھ دیتے۔ اس کے شمالی جانب آشتو اور کی سرسوں کے تیل کی دکان ... دوپہر کے وقت کتنی ہی بار اس نے اس دکان سے تیل خریدنے کے لیے اسے بھیجا تھا۔ دیپک وہاں جا کر کولھو پر بیٹھ جاتا تھا کولھو ...رہتا، کولھو میں جتے ہوئے بیل کی آنکھوں پر پٹی بندھی رہتی اور وہ دن رات مسلسل کولھو کے گرد چکر کاٹا کرتا۔ دیپک دو دو ...منٹ کولھو پر بیٹھا رہتا تھا۔ اس وقت تک اسے یاد بھی نہیں رہتا کہ اسے سرسوں کا تیل خریدنا ہے اور جب وہ تیل لے کر ... ماں کی کتنی ہی ڈانٹ کھانی پڑتی۔ اور اسی آشتو اور کی دکان کی شمالی جانب حاجی قاسم کی بڑی سی عمارت تھی اور اس عمارت

پیچھے ایک بہت بڑا باغ تھا، دیکر نے کتنی ہی بار باغ کے اندر جھانک کر دیکھا تھا۔ باغ میں بہت سارے سانپ [illegible] بہت سی چڑیاں تھیں۔ وہ سب کہاں چلے گئے، جب اس باغ کو کاٹ کر سپاٹ میدان بنا دیا گیا تو وہ باغ ختم ہو گیا۔ اس پاس [illegible] مکان بن گئے اور محلے کی حیثیت ہی بدل گئی۔ اس طرف [illegible] دھان کے کھیت [illegible] بچوں کے ساتھ ساتھ دھان کی بالیاں [illegible] رہتیں اور دیکر کو یہ احساس ہوا کہ وہ [illegible] بہت [illegible] ان بالیوں اور دلوں کیا صرف دھان کا کھیت ہی تھا، صرف [illegible] کی عادت ہو گئی تھی [illegible] صرف [illegible] اس وقت دیکر کی کتنی بڑی دنیا تھی۔ اب ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس کے جوان ہوتے ہوتے دنیا سمٹ کر چھوٹی ہو گئی ہو۔ اب وہ [illegible] باغ کہاں چلا گیا؟ کرم کے ساتھ کتنی ہی بار وہ اس باغ میں جا چکا تھا۔ وہ کس کا باغ تھا، اس کا کون مالک تھا، وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ اس باغ کے درمیان ایک تالاب تھا اور تالاب کے کنارے ایک پیڑ تھا، [illegible] سیندور کی طرح لال لال [illegible] اور گودے ایسا میٹھا ہوتا تھا۔ اس باغ کے بعد ہی ریلوے [illegible] باغ تھا۔ اس باغ میں ایک بیچ کا پیڑ تھا [illegible] بڑی بڑی [illegible] کتنی ہی بار اس نے بیچ کے پیڑ پر چڑھ کر بیچ کھاتے ہوئے دور [illegible] دیکھا تھا۔ [illegible] ریل گاڑی کی آواز سنائی دیتی ——— کو ——— او ——— او ——— چھک چھک چھک چھک! وہ آواز ابھری اور پھر کتنی میٹھی معلوم ہوتی تھی۔ بچپن [illegible] سے بھی زیادہ وہ آواز میٹھی معلوم ہوتی۔ اس وقت اسے کیا معلوم تھا کہ ایک روز اس کی زندگی بھی ریل ہی سے وابستہ ہو جائے گی اور اسی ریل کی ایک معمولی کلرک بن کر زندگی کی ریل گاڑی اس طرح [illegible] ہو جائے گی اور یہی ریل گاڑی ایک دن اس کی زندگی کے تمام مسائل کو حل کر دے گی ———

ایک روز دیکر کو ال گماٹ اسکول کے [illegible] کلاس میں بھرتی ہوا تھا۔

یہ اسکول میں اس کا پہلا داخلہ تھا، زندگی میں پہلی بار وہ اس اسکول میں گیا تھا اور ایک روز [illegible] کر وہ اس اسکول سے چلا آیا تھا [illegible] دوسرے اسکول میں چلا گیا تھا۔ اسے بہت دنوں تک یہ واقعہ یاد رہا تھا، وہ [illegible] سرکاری [illegible] وہاں [illegible] اور [illegible] دیکر [illegible] تھی تھا [illegible] ال گماٹ اسکول میں پڑھتے تھے، اس کے بعد [illegible] ٹرسٹ ماڈل اسکول [illegible] اسٹریٹ میں فائز ہو گیا۔

اس نے کہا ——— وہ اسکول بہت دور ہے، تجھے میں قریب کے اسکول میں داخل کرا دوں گی:

[illegible] ٹرسٹ ماڈل اسکول میں جانے [illegible] دیکر [illegible] نئے اسکول میں [illegible] تھا، [illegible] اسکول میں نہیں آیا تھا [illegible] محسوس ہوتا تھا [illegible] سر پر [illegible] دیا۔

کبھی ایسا ہوتا کہ دیکر راستے پر چلا جا رہا ہے [illegible] دکھائی دیتا۔

مکھن کی نگاہ سے بچنے کے لیے دینکر راستے کے بالکل کنارے کنارے چلنے لگا لیکن اتنی ہی دیر میں مکھن اس کے بالکل قریب پہنچ جاتا۔

"آتے ہی کہتا — کیا رے، کہاں جا رہا ہے؟"

اور کہتے کہتے اس کے سر پر ایک چپت رسید کر دیتا اور پھر آگے بڑھ جاتا۔

کبھی کبھی دینکر رو دیتا تھا۔ اپنے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ وہ اس کے سر پر چپت کیوں مارتا تھا؟ دینکر نے کیا کیا تھا؟ ہزار سوچنے کے باوجود اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا، وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ مکھن اس سے اتنا خفا کیوں تھا؟ کتنی ہی بار اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے لیکن وہ رو بھی نہیں سکتا تھا۔ اس سے دریافت کرے کہ اسے کس لیے مارا ہے، کیوں مارا ہے؟ تو دینکر کیا جواب دے اور کبھی کبھی اس کے جی میں آتا کہ شاید اس کے سر کے بال ترشے ہوئے نہیں ہیں اسی لیے مکھن اسے چپت مارتا ہے یا پھر میلے کپڑوں کی وجہ سے مارتا ہے لیکن نہیں، جب اس کے بال ترشے ہوئے ہوتے، جب بھی مکھن چپت مارتا، دھلے ہوئے صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوتا، جب بھی مکھن چپت لگاتا۔ بعد میں اس نے سوچا تھا شاید اس کے سر پر چپت مار کر مکھن کو خوشی ہوتی ہے، وہ کسی خطا یا قصور کی بنا پر اس کے سر پر چپت نہیں لگاتا۔ اس کے بعد وہ اسکول سے نکل کر کالج میں داخل ہوا تھا، کالج سے نکل کر ملازمت کی مگر پھر بھی اسے مکھن سے کبھی رہائی نہ مل سکی، جیسے ساری دنیا میں اس ایک شخص نے بہت سارے مکھن کا روپ دھار لیا ہو اور مختلف شکلوں میں پھیل گئے ہوں، جیسے مکھن کے ہاتھ سے انسان کو نجات حاصل کرنا مشکل تھا۔

اس روز خیال بسنت میلہ کے نکڑ پر آتے ہی دینکر نے دیکھا، مخالف سمت سے مکھن آ رہا تھا، سہ پہر ہو چکی تھی اور اس راستے پر نکلے سے پانی چھڑکا جا رہا تھا۔ مکھن کو دیکھتے ہی دینکر کا دل خوف سے دھڑکنے لگا، اگر آج بھی مکھن اس کو مارے۔

دینکر ایک طرف سرک گیا لیکن پتہ نہیں مکھن کو کیا شرارت سوجھی کہ وہ اس کے مقابل آگیا۔

سامنے آتے ہی مکھن نے کہا — "کیا رے، تو نے میرا اسکول کیوں چھوڑ دیا؟ میرے ڈر سے؟"

دینکر نے کوئی جواب نہیں دیا، سہمی سہمی نظروں سے مکھن کی آنکھوں کی طرف دیکھنے لگا۔

مکھن کا دھیان اسی طرف تھا، اس نے اپنی بات ختم کرتے ہی اس کے سر پر چپت رسید کر دی۔

روزانہ چپت کھا کھا کر دینکر قدرے ڈھیٹ ہو گیا تھا۔

اس نے کہا — "تو مجھے ہر روز کیوں مارتا ہے رے؟ تو مجھے ہر روز کیوں مارتا ہے؟ میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے، بول تو؟"

مکھن کو دینکر سے اس احتجاج کی توقع نہ تھی، وہ غصے سے تلملا اٹھا۔

بولا — "میں ماروں گا، میری خوشی، ماروں گا، یہ لو پھر مارتا ہوں، تو کیا کرے گا؟"

اتنا کہہ کر اس نے سچ مچ پھر ایک چپت جڑ دی، اس مرتبہ اس نے اور زور سے مارا۔

ڈیکر چرچ رو دے گیا۔ کلّو پھر پوری سخت جھنجھلائی۔ اسے دیکھ کے اس کا سر چکرا گیا تھا۔
جس نے کہا ——— "میں تجھ سے نہیں کہتا اسی لیے!"
کلّو اس کے اور بھی قریب آگیا ——— "دیکھتا ہے، کتنی ہمت ہو گئی ہے، بہت ہمت ہو گئی ہے نا ———"
اتنا کہہ کر اس نے پھر ایک چپت لگا دی اور اس کے بعد سر کے بال پکڑ کر جھٹکا دینے لگا۔
"ایک گھونسہ دوں گا تیری ناک توڑ دوں گا، ساری شیخی نکال دوں گا۔"
"ہائے رے! میں نے تیرے ساتھ کب شیخی کی ہے؟ چھوڑ دے نہ مجھے، بس اب بس!"
اب کلّو نے اس کے سر پر گھونسے برسانے شروع کر دیے۔
"پھر، پھر شیخی! پھر شیخی کرے گا؟ پھر؟"
کلّو ایک تجربہ بتا اور ایک گھونسہ تھا۔ ڈیکر کو سر اٹھانے کی بھی مہلت نہیں دے رہا تھا۔ دائیں، بائیں، سامنے، پیچھے ہر جگہ پر وہ متواتر مارے جا رہا تھا۔ ڈیکر کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اس کا سر چکرانے لگا۔
وہ مارتا جاتا تھا اور کہتا جاتا ——— "شیخی بگھارتے ہو تو؟ تجھے اس شیخی کا مزہ بھی چکھاتا ہوں۔"
اپنا سر بچانے کے لیے وہ جوں ہی پلٹا اس کا توازن بگڑ گیا اور وہ دھڑام سے سڑک پر گر پڑا۔ اب کلّو کو اور بھی آسانی ہو گئی۔ وہ ڈیکر کے گال پر، منہ پر، سر پر متواتر گھونسے، تھپڑ اور مکّے لگانے لگا۔ ڈیکر کو ایسا محسوس ہوا جیسے اب وہ زندہ نہیں بچے گا۔ جیسے کلّو اسے جان سے مار ڈالے گا۔ اس کی جان لے کر ہی چھوڑے گا اور اگر اس دن کلّو کے ہاتھ سے اس کی جان نکل جاتی تو دنیا کی بہت ساری باتیں وہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکتا۔ شاید اسے بہت سارے دوسرے قسم کے تجربات سے بھی نجات مل جاتی۔ بہت ساری تکلیفوں کے جھیلنے سے بچ جاتا۔ اگر ایسا ہوتا تو ستی کو کیسے دیکھ سکتا اور اگر ستی کو نہ دیکھ پاتا تو اس کی زندگی رائیگاں ہو جاتی!
کلّو کی مار کھاتے کھاتے جب ڈیکر بے دم ہو گیا تھا تو یکایک ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔
اسے محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا ہو۔
اس نے کسی طرح نظر اٹھا کر دیکھا، سامنے لکھی دیدی کھڑی تھی۔
اسکول کی گاڑی سے اتر کر لکھی دیدی گلی کے اندر جا رہی تھی کہ اس کی نظر ان دونوں پر پڑ گئی تھی۔ اس نے آتے ہی کلّو کے سر کے بال پکڑ کر ایک جھٹکا دیا اور اس کے ساتھ ہی بغیر کچھ کہے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر جڑ دیا تھا۔
کلّو ایک دم گھبرا گیا تھا۔ تھپڑ کھاتے ہی وہ زمین پر جھک گیا لیکن لکھی دیدی پھر بھی چھوڑنے والی نہیں تھی۔ وہ کلّو کے کان پر، سر پر، پیٹھ پر دھڑا دھڑ تھپڑ مارنے لگی۔
"اسے سٹوپڈ! تو نے اسے کیوں مارا تھا؟ تو نے اسے کیوں مارا؟"
اس کے بعد پھر تھپڑ اور گھونسے سے اس کی مرمت کرنے لگی۔ لکھی دیدی بڑی طاقتور تھی۔ اس نے اپنی کمت —

سڑک پر ڈال دیا اور اس کے بعد اچھی طرح کمّو کی مرمت کر دی۔ کمّو کی اس وقت عجیب حالت تھی، وہ نہ تو کمی دیدی کو مار سکتا تھا اور نہ رو سکتا تھا۔ خلافِ توقع مار کھا کر جیسے وہ بھونچکا رہ گیا تھا۔ اتنی دیر میں دینکر اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دُور سے اس حادثہ کو دیکھنے لگا۔ اُسے سوچا۔ ٹھیک ہوا، اچھا ہوا، اتنے دنوں کے بعد آج کمّو کی شکست ہوئی تھی، آج پہلی بار کمّو زیر ہوا تھا۔ جیسا اس کو مارتا تھا ویسا ہی سبق ملا ہے۔

دیر تک اس کی مرمت کرنے کے بعد کمی دیدی نے کہا ——— "اگر اب کبھی تُو نے اُسے مارا تو تیری آنکھ نکال لوں گی۔ بھاگ یہاں سے ——— جا۔"

اتنی دیر میں دینکر کی ہمت کافی بڑھ گئی۔

کمّو سہما سہما اُٹھا اور جسم پر پڑی ہوئی دھول جھاڑتا ہوا سیدھا مخالف سمت چلا گیا۔

اس کے بعد کمی دیدی نے راستے پر پڑی ہوئی اپنی کتابیں اُٹھا لیں۔

دینکر نے قریب جا کر کہا ——— "وہ مجھے ہر روز مارتا ہے کمی دیدی، روز مجھے اسی طرح مارتا ہے، میں اُس کا کچھ بھی نہیں بگاڑتا پھر بھی بلاوجہ مجھے مارتا ہے۔"

کمی دیدی کا چہرہ غصّہ سے تمتایا ہوا تھا۔

دینکر نے کہا ——— "کمی دیدی تم نے اچھا کیا جو اسے پیٹ دیا، مجھے بلاوجہ ہر روز مارتا ہے۔"

کمی دیدی نے یکایک اُس کا کان پکڑ کر اس کے سر پر کئی تھپڑ لگائے۔

"اسٹوپڈ کہیں کا، وہ تجھے ہر روز مارتا ہے اور تو چپکے سے مار کھا لیتا ہے؟ تو اُسے پیٹ نہیں سکتا؟ تیرے بدن میں طاقت نہیں؟ اسٹوپڈ گدھا کہیں کا، احمق کی طرح مجھ سے کہتا ہے کہ وہ مجھے روز مارتا ہے ——— میں تجھے بھی پیٹوں گی۔"

اتنا کہہ کر کمی دیدی نے اُسے پھر مارنا شروع کیا۔

دینکر کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو بہ نکلے۔ اتنی دیر تک کمّو سے مار کھا کر جو کچھ نہیں ہوا تھا کمی دیدی کے ہاتھ سے مار کھا کر دینکر کو اس سے زیادہ تکلیف ہوئی۔

دینکر نے دونوں ہاتھ سر پر رکھ کر کہا ——— "اب مت مارو کمی دیدی، اب ایسا نہیں کروں گا، اب ایسا نہیں کروں گا۔"

کمی دیدی اس وقت اپنے آپے میں نہیں تھی، وہ اور بھی زور زور سے اس کے سر پر مارنے لگی ——— "میں تمہارا سر توڑ دوں گی اسٹوپڈ کہیں کا، دوسروں کی مار کھا کر تمہیں صرف رونا آتا ہے، روتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی ——— ہم درہا ہے ———"

اس کے بعد مکان کے قریب آ کر کمی دیدی بولی ——— "جاؤ، گھر جاؤ، پھر کبھی نہیں روؤ گے بچے، ہم مرد ہو کس لیے ———"

اتنا کہہ کر اس نے دیپکر کو دھکیل دیا اور چکراتی ہوئی ابھرتی ہوئی گھر کے اندر چلی گئی۔

رات کے وقت جب وہ پڑھنے کے لیے بیٹھا تو اس کا دل پڑھائی میں بالکل ہی نہیں لگا۔ انگریز وادو کے تسلط سے ٹیک لگا کر تاریخ کی کتاب سامنے رکھے ہوئے وہ بڑی دیر تک پڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن اس کی دونوں آنکھیں چند لمحے بند ہوتی محسوس ہوئیں۔ اس نے سوچا: یہ لوگ اس محلے میں کیوں آگئے ہیں؟ یہ کرایہ دار یہاں کیوں آگئے؟ یہ لڑکی اُسے مار ڈالتی ہے۔ اس سے پہلے جو کرایہ دار تھے وہ تو اس کی طرف دیکھتے بھی نہیں تھے۔ چنزی اور دوسرے لوگوں کو گالی دیتی تھی، اچھا کرتی تھی، ان لوگوں کو بھی گالی دیتی تو اچھا ہوتا۔ یہ لوگ بھی اس مکان میں نہیں رہتے، یہاں سے کسی دوسری جگہ چلے جاتے۔ چلے ہی جانا تو چاہیے۔ بڑا ناچنے والی ہیں! اس طرح تو خود دیپکر بھی ناچ سکتا ہے۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس طرح ٹھمک ٹھمک کر کوئی بھی ناچ سکتا ہے۔ ہ کا خواب ہی ٹھیک تھا ——— ہمارا خواب ہی صحیح تھا۔ یہ بھی بھالو ہی کی طرح ناچتی ہے۔ پھر شہر میں بہت سے مداری بھالو ناچ دکھانے آتے ہیں، مداری ڈگڈگی بجاتا ہے اور بھالو ناچتا ہے۔ اور چہرہ؟ چہرہ بھی کون بہت اچھا ہے۔ بڑی خوبصورت ہے۔ اس سے کہیں زیادہ خوبصورت تو شنتی دیدی کا ہے۔ لیکن شنتی دیدی تو کبھی اس کو کچھ نہیں کہتی اور وہ پڑھنا لکھنا بھی کرتی آئی، دس روپیہ اسکالرشپ ملتی ہے۔ اگر یہ ماسٹر صاحب کے اسکول میں شنتی دیدی پڑھتی تو اُسے بھی اسکالرشپ ملتا۔

ماں کسی کام سے کمرے میں آئی تھی۔

دیپکر نے پوچھا ——— "ماں!"

ماں نے کہا ——— "کیا کہتے ہو؟ ———"

دیپکر بولا ——— "چنزی آج کل گالی کیوں نہیں بکتی ہے؟"

ماں شاید بہت مشغول تھی، اس کی بات سُن کر چڑچڑی ہو گئی۔ بولی ——— "تمہاری ساری باتیں واہیات ہوتی ہیں۔ وہ کیوں گالی بکنے لگی؟ کس کو گالی دے گی؟"

دیپکر نے کہا ——— "یہ جو نئے کرایہ دار آئے ہیں، چنزی ان کو گالی کیوں نہیں دیتی؟ گالی دیتی تو یہ لوگ یہاں سے چلے جاتے ———"

"میں تمہارے ساتھ بک بک نہیں کر سکتی بابو۔"

اتنا کہہ کر ماں چلی گئی۔ دیپکر پھر تاریخ کی کتاب پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کیسے ایک سکندر کیسے ایک راجہ کو گرفتار کر سکا تھا۔ اس کی کہانی پڑھنے سے کیا فائدہ ہوگا، کون جانے؟ اس دن کوئی بھی شتاکمبا بابو کی کلاس میں سبق نہ بتا سکا تھا۔ شتاکمبا بابو بڑی سنجیدہ طبیعت کے آدمی تھے۔ وہ پران متھ بابو جیسے نہیں تھے۔ دیپکر کا سب سے زیادہ متھ بابو کی کلاس میں دل لگتا۔

پران متھ بابو کلاس کرتے ہوئے بہت سی کہانیاں سنایا کرتے تھے۔

اس روز پران متھ بابو نے کلاس میں آتے ہی پوچھا ——— "آج تم لوگوں کو کہاں سے پڑھنا ہے؟"

مانیٹر دیکھ کر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "سکندر اور پورس سر" اس نے جواب دیا۔

پران متھو بابو نے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی، پوچھا ——— "پورس کون تھا؟"

بچوں نے جواب دیا ——— "ایک راجہ تھا سر۔"

پران متھو بابو نے کہا ——— "خوب، خوب، لیکن راجہ کے معنی کیا ہیں؟ تم بتا سکتے ہو؟"

انھوں نے کرن کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

"تم؟ تم؟ تم؟"

یکے بعد دیگرے انھوں نے کئی لڑکوں سے پوچھا مگر کوئی جواب نہ دے سکا۔ راجہ کے معنی راجہ! راجہ کے معنی اور کیا ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا کوئی بھی اس آسان سوال کا جواب نہ دے سکا، سبھی پران متھو بابو کی طرف منہ کھولے تکتے رہے۔

پران متھو بابو نے کہا ——— "راجہ کے معنی تم لوگ نہیں جانتے تو اس میں شرمانے کی ایسی کوئی بات نہیں، راجہ کے معنی بہت سے لوگ نہیں جانتے، بہت سے راجہ بھی نہیں جانتے ——— تو پھر سنو ——— "

اس کے بعد ڈبّہ سے پان نکال کر منہ میں رکھ لیا اور بولے ——— "ایک وقت ایسا تھا جب دنیا میں کوئی راجہ نہیں تھا راجہ بھی نہیں تھا، سزا بھی نہیں تھی، سزا دینے والے بھی نہیں تھے! جس کے معنی یہ ہوئے کہ سبھی لوگ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے! جب سبھی لوگ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہوں تو نہ سزا کی ضرورت رہتی ہے نہ سزا دینے والے کی، لیکن یہ حالت زیادہ دن تک قائم نہ رہی، آہستہ آہستہ کشمکش نے جنم لیا ——— یعنی آہستہ آہستہ مذہب دنیا سے غائب ہونے لگا، مذہب ایسے ہی ڈرانے والا تھا کہ دیوتاؤں کو خوف محسوس ہوا کہ کوئی پوجا نہیں کرے گا، یگیہ نہیں ہوں گے، اور یگیہ میں آہوتی نہیں دی جائے گی تو دیوتا کھائیں گے کیا! سبھی دیوتا برہما کے پاس گئے اور برہما کے پاس جا کر بولے کہ اب کون سی تدبیر کی جائے! تب برہما نے رشیوں سے کہہ کر ایک راجہ تیار کرایا، راجہ کا نام پرتھو پڑا اور یہ پرتھو ہی دنیا کے راجہ ہو گئے، وہ وشنو کے اوتار تھے، ان کے راجہ ہونے سے پھر پوجا ہونے لگی، یگیہ دیا جانے لگا اور مذہب پھر لوٹ آیا، وہ اپنی رعایا کو خوش رکھتے تھے اسی لیے چاروں طرف ان کی تعریف ہونے لگی، وہ رعایا کا رنجن کرتے یعنی خوش رکھتے تھے، اسی لیے لفظ رنجن سے راجہ کا نام تخلیق ہوا۔"

اس کے بعد سنبھل کر بیٹھتے ہوئے انھوں نے پوچھا ——— "اب تو سمجھ گئے، راجہ کس کو کہتے ہیں؟"

تمام لڑکے یک زبان ہو کر بولے ——— "سمجھ گئے سر۔"

"لیکن سبھی راجہ پرتھو راجہ کی طرح اچھے راجہ نہیں ہوتے، ایسے راجہ بھی ہیں جو رعایا کو خوش نہیں رکھتے، رعایا کو کھانے پہننے کی سہولتیں نہیں دیتے، ہمارے دیش کے شاعر اعظم رابندرناتھ ٹیگور کا نام تم لوگوں نے سنا ہے؟"

سبھی خاموشی سے پران متھو بابو کو تکتے رہے۔

کرن یکایک درمیان میں بول اٹھا ——— "سر، سی۔ آر۔ داس جب راجہ ہو جائیں گے تو بہت اچھے راجہ بہت ہوں گے۔"

"تب۔ تم۔۔ واپس ساتھ چلو گے؟"

پاروتی ماتا نے حیرت سے کرن کی طرف دیکھا۔

انھوں نے پوچھا —— "تم سے کس نے کہا؟"

کرن نے جواب دیا —— "ایک سادھو بابا نے سر۔"

"کون سادھو ہے؟"

"اصلی سادھو ہے سر، اصلی ہمالیہ کا سادھو، کہتا ہے کہ جب ملک آزاد ہوگا تو سب لوگ واپس راجدھانی چلے جائیں گے اور میرے بابا کی بیماری اچھی ہو جائے گی اور ہمارے ملک میں سبھوں کی حالت بہتر ہو جائے گی اور ہم لوگ عمدہ عمدہ چیز کھائیں گے، دہی، مٹھائی، سندیش، سب کچھ ہوگا۔"

پاروتی ماتا مسکرائیں، ان کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

انھوں نے کہا —— "ملک آزاد ہونے کے بعد ملک کے لوگوں کی حالت بہتر ہو جائے گی، یہ بات سادھو کے بتانے کی نہیں ہے، لیکن تم نے دیکھا ہے، رابندر ناتھ ٹیگور کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے "راجہ رانی"۔ تم بڑے ہونے کے بعد تم لوگ وہ کتاب ضرور پڑھو، رابندر ناتھ ٹیگور ہمارے ملک کے ایک بہت بڑے شاعر ہیں، تم لوگ دیکھو گے، ایک روز ان کی تصویر ہر گھر میں لگائی جائے گی، لیکن تم لوگوں نے تو ان کا نام بھی نہیں سنا ہے؟"

دیپک چٹاک سے کھڑا ہو گیا، بولا —— "میں نے ان کی تصویر دیکھی ہے سر۔"

"تم نے انھیں دیکھا ہے؟ کہاں دیکھا ہے؟"

دیپک نے جواب دیا —— "کالی مندر میں سر۔"

"کالی مندر میں؟"

"ہاں سر، مندر میں بکرے کی قربانی دیتے وقت ——"

اسے آج بھی یاد تھا، وہ ہر روز محلے کے بچوں کے ساتھ پھول توڑ کر مندر میں لے آتا تھا، کنڈ وہ پکڑ کے کنارے سے جاکر وہ کالی، شیو، جنیشور، گنیش اور دوسرے مندروں کے دیوتاؤں کے لیے پھول لے آتا تھا، کبھی کبھی ماں بھی اس کے ساتھ ہوتی، وہ پرنام کرتی، اس کو دیکھا دیکھی دیپک بھی پرنام کرتا، پرنام کرنے سے کیا فائدہ اور کیا نقصان ہوا، اسے یاد نہیں تھا لیکن ان دنوں پرنام کرنا اس کی عادت سی ہو گئی تھی۔

ایک روز ماں نے اس سے پوچھا تھا —— "وہ دیکھو، وہ کون ہیں، بتاؤ تو؟"

دیپک نے دیکھا تھا ایک سن رسیدہ شخص جن کی لمبی لمبی سفید داڑھی تھی، ماں کے مندر اور ناٹ مندر کے درمیان راستے پر کھڑے ہوئے بڑی لگن سے پرتیما کو دیکھ رہے تھے، انھوں نے اپنے سینے پر دونوں ہاتھ باندھ رکھے تھے، اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"وہ کون ہے ماں؟"

وہ گرو دیپش سے بے خبر کھڑے تھے، ان کے ساتھ چند لڑکے اور لڑکیاں تھیں، وہ سب بھی دیوتا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے کتنے خوبصورت تھے، ان کے لباس کتنے خوبصورت تھے، وہ سب مورتیوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔

ماں اسی طرف دیکھ رہی تھی۔

"وہ کون ہے ماں؟"

ماں نے جواب دیا ——— "ان کا نام روبی ٹھاکر ہے۔"

"روبی ٹھاکر کون ہے ماں؟"

"بہت اچھی اچھی نظمیں لکھتے ہیں۔"

صبح کا وقت تھا، اس وقت مندر میں بھیڑ نہیں تھی، اس روز رابندر ناتھ کو وہاں کسی نے بھی نہیں پہچانا تھا، لیکن ماں پہچان گئی... ماں بہت عقیدت مند تھی، اگر بابا سے نہ گئے ہوتے تو ماں اور بھی بہت کچھ جان سکتی۔ پھر ماں کو اگھور دادا کا کھانا پکانا پڑتا اور دیپ ماں کے ساتھ وہ بھی اسی طرف دیکھنے لگا تھا۔

"دیپو بابو!"

یکایک اپنا نام سن کر دیپنکر چونک اٹھا۔ تاریخ کی کتاب بند کر کے جب وہ کمرے سے باہر آیا تو حیران رہ گیا، رگھو، ستی دیدی کا ملازم رگھو کھڑا تھا!

رگھو نے کہا ——— "تمہیں کاکا بابو بلا رہے ہیں دیپو بابو۔"

دیپنکر کی آنکھوں کے حلقے حیرت سے پھیل گئے۔

اس نے پوچھا ——— "مجھے؟ مجھے کیوں بلا رہے ہیں؟"

رگھو نے جواب دیا ——— "کاکا بابو ابھی دفتر سے لوٹے ہیں، ستی دیدی لوہیں کے سامنے کے کمرے سے دیپو بابو کو بلا کر ———"

دیپنکر کچھ سوچنے لگا، اسے پھر سوچنا پڑا کہ ہے، پھر اسے کیا ہوا، اس نے کیا قصور کیا ہے؟ ستی دیدی ہی کا قصور ہے! ... دیدی نے تو اسے مارا ہے، کھلایا... وہ دن یاد ہے، پھر بھی دیپنکر کچھ نہیں بولا ہے اور نہ کبھی بولے گا، پورے دو سال تک دیپنکر ... بولے گا، کسی سے کچھ نہیں کہے گا، پورے دو سال تک اور پورے دو سال میں ایک سال تو گزر چکا ہے۔

پران متھ بابو نے کہا تھا ——— "اگر پورے دو سال تک تم چپ رہ سکے تو ایک دن تمہاری زبان سے جو بات بھی نکلے گی وہ سچ ہو گی، جو بولو گے وہی ہو گا ———"

دیپنکر نے پوچھا تھا ——— "سچ مچ میں جو کہوں گا، وہی ہو گا؟"

"وہی ہو گا۔" پران متھ بابو نے جواب دیا تھا ——— "ضرور ہی ہو گا، لیکن پورے دو سال تک مسلسل، متواتر، لگاتار چپ رہنا ہو گا۔"

...بات بھی جھوٹ نہیں بولو گے ـــــ

کرن نے پوچھا ـــــ مگر اگر میں کہوں کہ میرے پاس ایک پیاری سی بچی ہو جائے گی؟

"ہاں، وہی ہوگا۔"

"اگر میں کہوں کہ میں بہت بڑی دولت کا مالک بن جاؤں؟"

"وہی ہوگا، جو چاہو گے وہی ہوگا ـــــ"

اور اسی دن سے کرن اور دیپک نے طے کیا تھا کہ وہ دونوں چودہ سال تک سچ بولیں گے، ایک بات بھی جھوٹ نہیں بولیں گے [illegible] اپنے گھر۔ پھر تو دوستانہ تھا، انہوں نے بینک کے پیسے [illegible] ٹکٹ گھر کی دکان سے [illegible] اور [illegible] خرید کر کھایا تھا اور گھر پہنچ گیا تھا۔

دیکھ نے کہا ـــــ "چلو دیپو بابو ـــــ"

دیپک سوچ رہا تھا کہ وہ [illegible] سے پوچھے، آنگن سے ہوتے ہوئے وہ باورچی خانے کی طرف جاتے جاتے رک گیا [illegible] ٹھیک نہیں، ماں اسے بہت ساری باتیں پوچھنے لگے گی، اس سے بہتر ہے کہ وہ واپس آ کر ہی سب کچھ بتا دے گا۔

دیپک نے پوچھا ـــــ "کیوں، کیا بات ہے؟ تمہیں کچھ معلوم ہے؟"

دیکھ نے جواب دیا ـــــ "میں نہیں جانتا ـــــ"

آنگن سے کرکے باہر کے راستے سے ان کے مکان میں داخل ہونے کا دروازہ تھا۔ [illegible] آگے چل رہا تھا اور دیپک اس کے پیچھے تھا۔ ان لوگوں کے صحن کی سیڑھیاں چڑھتے ہی زینہ شروع ہو جاتا تھا۔ زینے سے اوپر چڑھتے ہی دائیں طرف بیٹھک [illegible] اس کمرے میں ایک [illegible] بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے قریب ہی [illegible] دیپک کی ماں بیٹھی تھیں۔

"کیوں دیپو بابو، آج راستے میں تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

دیپک نے ایک بار [illegible] کی طرف دیکھا، [illegible] مسکرا رہی تھی۔

"بیٹھو، پہلے اس کرسی پر بیٹھو، اب بتاؤ کیا ہوا تھا، سچ بولو گے، ایک بات بھی جھوٹ نہیں بولو گے۔"

دیپک نے بڑی [illegible] سے جواب دیا ـــــ "میں جھوٹ نہیں بولتا، ایک سال سے میں نے سچ کے سوا کبھی جھوٹ نہیں بولا ـــــ"

"ایک سال سے [illegible] جھوٹ بالکل ہی نہیں بولے؟"

"نہیں، میں اور بھی تیرہ سال تک مسلسل سچ بولوں گا۔"

اس کی بات سن کر [illegible] حیران ہو گئے، [illegible] نے ہنستے ہوئے [illegible] کی طرف دیکھا۔ [illegible] ـــــ "واہ، خوب لڑکا ہے۔"

[illegible] ـــــ بیٹھے [illegible] ـــــ

کاکا بابو نے لکھی دیدی کو منع کیا۔
"بس ـــــ تم چپ رہو لکھی۔ اب بتاؤ تو تیرہ سال تک کیوں سچ بولو گے؟"
وچکر نے جواب دیا ـــــ "میرے ہیڈ ماسٹر کہتے ہیں کہ اگر چودہ سال تک کوئی مسلسل سچ بولے تو اس کے بعد اس کی زبان
سے بات نکلے گی سچ ہو جائے گی۔"
اس کی بات سن کر کاکا بابو ہنسنے لگے۔ کاکا کی ماں ہنسنے لگیں اور لکھی دیدی بھی ہنس پڑی۔
کاکا بابو نے کہا ـــــ "اور تم نے اسے سچ سمجھ کر یقین کر لیا؟"
ان دنوں وہ کتنا نیک، کتنا سیدھا اور کتنا معصوم تھا، کبھی کبھی وچکر کو ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ زمانہ اچھا تھا۔ جو کوئی اس سے جو
کہتا وہ یقین کر لیتا تھا۔ اس نے یقین کر لیا تھا کہ اس کے بابا کی بیماری اچھی ہو جائے گی۔ یقین کر لیا تھا کہ کوڑی سے ہر چیز خریدی جا سکتی ہے۔
یقین کر لیا تھا کہ اس کی آمدنی اس ایک دن زیادہ ہوں گے اور اس نے یہ بھی یقین کر لیا تھا کہ اگر چودہ سال تک سچ بولا جائے تو جو بات بھی زبان
سے نکلے گی وہ سچ ہو جائے گی ـــــ اس کے علاوہ بھی بہت ساری باتیں تھیں جنہیں وچکر نے یقین کر لیا تھا۔ آج اتنے دنوں بعد اب
اسے محسوس ہوتا تھا کہ دنیا کا یقین کر لینا ہی بہتر ہے۔ تو کیا یقین کرکے آخر کار اسے کچھ بھی نہیں ملا؟ اور اس نے یقین کر لیا تھا اس
کے بدلے اس کا سب کچھ کھو گیا؟
کاکا بابو نے پوچھا ـــــ "راستے میں جو لڑکا تمہیں مارتا ہے، وہ کون ہے؟"
"وہ پہلے میرے ہی اسکول میں پڑھتا تھا۔" وچکر نے جواب دیا۔
"تمہیں کیوں مارتا ہے؟"
"میں نہیں جانتا۔ میرے ہاتھ میں جو کچھ ہوگا وہ چھین لے گا اور کچھ نہ لے تو بھی مارتا ہے۔"
"اسی لیے آج میں نے اسے خوب پیٹا ہے کاکا بابو۔" لکھی دیدی بولی ـــــ "یہ خاموشی سے مار کیوں کھاتے؟ یہ نہیں مار
سکتے، ان کے بدن میں طاقت نہیں ہے؟"
وچکر نے کہا ـــــ "ابھی وہ جتنا چاہے مجھے مار لے، ایک دن میں اس کا بدلہ چکا دوں گا کاکا بابو۔"
کاکا بابو نے پوچھا ـــــ "وہ کیسے؟"
"میں غریب ہوں اس لیے وہ مجھے مارتا ہے۔" وچکر نے جواب دیا ـــــ "میں جب بڑا آدمی بن جاؤں گا تو وہ نہیں مارے
گا۔ جب میرے پاس بہت سا روپیہ ہو جائے گا تو وہ مجھے نہیں مارے گا۔"
"کیوں؟"
وچکر نے کہا ـــــ "ماسٹر صاحب کہتے ہیں کہ روپے سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے۔ روپے سے ہر چیز خریدی
جا سکتی ہے۔"
لکھی نے کہا ـــــ "تم بہت عقلمند ہے۔"

دیکھتے رہے ——— انگریز دادا نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر میرے پاس روپیہ ہوتا تو ایک چھوٹی سی دکان کھول لیتا اور اس
وقت کسی کا محتاج نہ رہتا۔

کالا بابو تو ذرا بھی نہیں ہنسے، بولے ——— یہ سب غلط ہے ہوپ بابو! انگریز دادا نے تمہیں غلط کہا ہے، روپیہ
بہت ضروری نہیں ہوا کرتا، جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو سمجھ لو گے کہ دنیا میں روپیہ ہی بڑی چیز نہیں ہے۔

لیکن انگریز دادا نے جو کہا ہے، انگریز دادا تو بہت بڑے آدمی ہیں ———

کالا بابو نے کہا ——— ہاں تم نے سچ کہا، وہ بڑے آدمی ہیں! بہت سے لوگ ہیں جو یہاں پہنچ کر سمجھتے
تھے۔ انگریز دادا بھی شاید اسی قسم کے ہیں۔ ملازمت کرنے سے پہلے میرا بھی یہی خیال تھا کہ بھوشن بابو کی طرح ملازمت کروں گا!
پھر میں نے سمجھا کہ ایک روز وہ بڑا کام کر کے بہت سے پیسے کمائیں گے، جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں تھا، کوئی رشتہ
دار نہیں تھا اور گھر سے اپنی قسمت سنوارنے نکلے تھے ———

یہ کہانی بعد میں دیکھنے تفصیل سے سنی تھی۔

سنو، ایک روز بتایا تھا ——— ہمارے ضلع کے ایک دور افتادہ گاؤں کا ایک لڑکا، جس کا نام بھی بھوشن تھا اور جو اور
لڑکوں سے الگ تھا، اس کی تعلیم روپیہ کی کمی کی وجہ سے ادھوری رہ گئی تھی، ایک روز گھر سے فرار ہو گیا تھا، فرار ہو کر وہ کہاں چلا گیا، یہ کسی کو
معلوم نہ تھا، اس کے ہاتھ میں ایک پیسہ بھی نہ تھا، ایک لنگوٹی کے سوا کچھ نہ تھی، دو دن تک وہ بھوکا پیاسا بیٹھا رہا تھا، بیٹھے بیٹھے
کی تیز گاڑی میں کسی طرح سوار ہو کر وہ سیدھا چلا گیا تھا یعنی کلکتہ کی طرف پہنچا تھا۔

کالا بابو نے کہا ——— میں نے جب پہلی بار ملازمت شروع کی تھی، یہ دونوں جگہ بالکل نئی تھیں، میں زندگی میں کبھی یہاں نہیں آیا
تھا۔ کسی گاؤں کا گنوار لڑکا کلکتہ دیکھنے کو ترس گیا تھا، یہاں میری ملاقات بھوشن بابو سے ہو گئی ——— میں نے دیکھا، شہر کے سات
قدم چل میں ایک ملازم کا گودام تھا، بڑے بڑے ساہوکار بیٹھتے، ہر وقت کام ہوتا رہتا، بڑی تعداد میں رات کام میں لگے رہتے،
نہ سرمایہ کسی انگریز کی کمپنی ہوتی، انگریز نہ ہو تو کوئی پنجابی یا مارواڑی وغیرہ ہوتا، لیکن سامنے بورڈ پر نگاہ پڑتے ہی میں حیران رہ گیا،
لکھا تھا، جلی حرفوں میں لکھا تھا: بھوشن بابو ——— بنگال اور دوسری تجارت!

اس وقت تک بھوشن بابو سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی، بنگالی دیکھ کر ان سے ملاقات کرنے کی خواہش ہوئی۔
مجھے دیکھ کر انہیں بہت حیرت ہوئی اور انہیں دیکھ کر مجھے بھی!

بھوشن بابو نے کہا ——— شادی کر لیجئے جناب، اس عمر میں شادی کر لیں تو بہتر ہے، بڑی عمر کا کچھ فائدہ
نہیں ———

میں نے کہا ——— پندرہ روپیہ میری تنخواہ ہے، پانچ روپے اور دیں تو اس سے زیادہ ... ہے، اتنے روپیوں میں خرچ
کیسے چلے گا!

بھوشن بابو نے کہا ——— اس کے علاوہ رشوت کے روپے جوڑ دیجئے، دیکھئے کتنے آرام سے ہے

اس کے بعد میں تمھاری کاکی ماں کو بھی لے گیا۔

ممی دیدی نے پوچھا —— "میں اس وقت پیدا ہو چکی تھی کاکا بابو؟"

کاکا بابو نے جواب دیا —— "اس وقت تو ذرا سی بچی تھی، میں تمھیں گود میں لے کر گھومتا رہتا تھا ——"

"اور ستی؟"

"ستی اس وقت کہاں تھی اور تو ابھی اسی دن پیدا ہوئی تھی، برسات کا موسم تھا، رم جھم رم جھم بارش ہو رہی تھی، میں دفتر سے دیر سے گھر آیا تھا اور اس وقت رات کے تقریباً گیارہ بجے تھے، بتی گل کر کے سویا ہی تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی، ایک سوچ کرتے کرتے اس دن اتنی رات ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا، اتنی رات گئے کون ٹیلیفون کر سکتا ہے، ریسیور کان سے لگانے کے بعد معلوم ہوا، بھوبنیشور بابو تھے ——"

میں نے پوچھا —— "کیا معاملہ ہے، اچانک کیا ہوا دادا؟"

ادھر سے بھوبنیشور کی آواز آئی —— "تمھیں ایک خوش خبری سنانی ہے، میرے یہاں بچی پیدا ہوئی ہے۔"

میں تو جیسے اچھل پڑا، پوچھا —— "کب؟"

"ابھی ابھی ——!"

میں نے کہا —— "پھر سندیش کھلائیے دادا، ایک نہیں اب دو بچیاں ہو گئیں، اس کا نام ستی رکھیے، بڑی کا نام ممی جیسا ہے تو اس کا نام ستی ہے، دونوں مل کر ستی ممی بن کر رہیں گی۔"

کاکی ماں کو مخاطب کر کے کاکا بابو نے پوچھا —— "تمھیں بھی یاد ہیں وہ سب باتیں؟"

کاکی ماں نے جواب دیا —— "یاد کیسے نہ رہے گا بھلا؟ تم اتنی رات ہی کو پھر چلے گئے تھے۔"

کاکا بابو نے کہا —— "ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ملازمت کرنے سے پہلے میرا بھی یہی خیال تھا کہ روپے سے ہر چیز خریدی جا سکتی ہے، لیکن بھوبنیشور سے ملاقات ہونے کے بعد میرا یہ خیال بدل گیا۔ ان دنوں تمھاری کاکی ماں کو ساتھ لے کر گیا ہی تھا کہ ایک دن بیماری، وبا میں اس کی لپیٹ میں آ گیا، بڑی خطرناک بیماری تھی، گھر کے تمام نوکر چاکر بھاگ کھڑے ہوئے، ایک آدمی بھی وہاں ایسا نہ تھا، تمھاری کاکی ماں بھی بالکل اجنبی تھی، کسی کو پہچانتی تک نہ تھی، میں تنہا بے ہوشی کے عالم میں بے سدھ پڑا ہوا سانسیں گن رہا تھا، سوچا، زندگی کا سفر اسی غیر ملک کی زمین پر تمام ہو گا۔

لیکن نہ جانے کہاں سے رہنے والے بھوبنیشور بابو، جن سے سات پشت تک میری کوئی رشتہ داری نہ تھی، بلکہ وہ تو آدمی خبر پاتے ہی دوڑے ہوئے میرے پاس آئے اور اس کے بعد ڈاکٹر اور دوا کی فکر سے میں آزاد ہو گیا، جس دن وہ میرے یہاں آئے تھے اس دن سے لے کر اس وقت تک، جب تک میں بالکل صحت یاب نہ ہو گیا، وہ میرے ہی پاس رہے، وہ گھر بار اپنا تمام کام دھام چھوڑ کر صرف میری ہی تیمارداری کرتے رہے! ایسا کیوں کرتا ہے؟ مجھے صحت یاب کرنے میں ان کی کون سی غرض پوشیدہ تھی، ان سے میرا کون سا رشتہ تھا؟ میں ان کا کون تھا جس کے لیے انھوں نے اتنا کچھ کیا؟ اپنا روپیہ، اپنا وقت اور اپنے آدمی

سے کہا انھوں نے یہ حماقت یا بہکاوا ـــ انھوں نے جیا کیوں کیا؟"

اس کے بعد وکٹر کی طرف دیکھ کر بولے ـــ اسے بھروسہ ہے کہ دنیا میں بہت کچھ جھٹک سکے گا بھو جمشید بابو کی مختیارداری۔ وہ دیکھ بھال کیا روپے سے پرکھنے کی چیز ہے؟"

ممی ویدی نے بھی کوئی جواب نہ دیا۔ کاکی ماں بھی کچھ نہ بولیں۔ اور وکٹر بھی خاموش رہا۔

کاکا نے کہا ـــ اور جیا باپ جیسی ہی لڑکی بھی ہے۔ میں نے بھو جمشید بابو کو لکھا تھا کہ لیکن جو غیر تو کیا ہو۔ انھیں تو گھر ہی تعلیم دی جانے تو یہی لڑکیاں لڑکوں سے بہتر ثابت ہوں گی۔ بھو جمشید بابو نے لکھا ہے کہ ہیں۔ تمھارے رزلٹ سے بے حد خوش ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ کسی کو بھی یہیں بھیج دیں گے۔ وہاں اس کی تعلیم اچھی ہو رہی ہے۔

"اور ہاں، ایک بات کہنا میں بھول گیا تھا، خاکسار کل صبح سویرے ہی باہر جاؤں گا۔"

کاکی ماں نے پوچھا ـــ "کل صبح کیوں؟"

"فوری کام ہے، پریشان کر رکھا ہے۔ یہی دیکھو، جب تک یہاں تھا بڑے آرام سے تھا۔ مستانک تو اچانک ادھر سے تباہ ہو گیا ہے اور اتنی پرانی جگہ کو چھوڑ کر یہاں چلا آیا۔ ستم کو تحصیل کرنے کا نام پیدا کر ہے۔ اب نہ ہو تو پھر نوکری کیسے کر سکتے ہیں۔ یہ کسی روز حکومت چنے تباہ کر کے ختم کر دے۔"

وکٹر مسکرا رہا تھا۔

کاکا بابو مسکراتے ہوئے بولے ـــ میں نے جو کچھ کہا ہے نہیں یاد رہے گا وکی بلا وجہ اگر پھر کچھ تم ... اس دنیا میں انسان کی قیمت کوئی نہیں دیتا۔ اس دنیا خود داری کی قیمت کچھ نہیں دیتا ـــ

"نہیں وہ مجھ سے زیادہ جانتا ہے۔"

کاکا بابو نے کہا ـــ تم تجربے سے کر لوگے۔"

ممی ویدی نے کہا ـــ ... کی بات ... کاکا بابو میں نے اس لڑکے کی اچھی طرح تربیت کر دی ہے۔"

کاکا بابو نے کہا ـــ اچھا کیا ہے ـــ اس دنیا میں ... آدمی خواہ کچھ بھی بنے۔"

اس روز وکٹر زیادہ دیر وہاں نہیں رکا تھا۔ ممی نے اس سے ... پتہ نہیں کہاں کہاں چلا گیا۔ لیکن اس دن کاکا بابو کی بات سن کر وہ عجیب مخمصے میں پڑ گیا تھا ـــ کس کی بات صحیح ہے؟ ممی اور ڈیڈی کی یا کاکا بابو کی؟ ... کی زبان سے ہوئے۔ ... کس کی بات زیادہ صحیح ہے

... لیکن ہو جیسے کاکا بابو کی بات سچ ہی ہے! اس روز روپیہ ہوتے ہوئے بھی کاکا بابو طاعون کی بیماری میں مر رہے تھے ——— ... ہو جیتیورر ہا ہے کیوں انھیں بچایا، کیوں، کس طرح سے انھوں نے کاکا بابو کو صحت یاب بنا دیا! پھر اس نے سوچا، اگر ... ہوتا تو اب تک کر سکتا! ابھی صحت یاب ہو گئے ہوتے، بہت دنوں پہلے ہی صحت یاب ہو کر وہ پھر کسی اسکول میں بیاشو ... ماسٹر ہو گئے ہوتے! لیکن کاکا بابو کی عمر بھی تو اب زیادہ ہو چکی ہے، کاکا بابو نے بھی تو بہت کچھ دیکھا ہے! تو کیا کاکا بابو نے جو ... ت حاصل کیے ہیں جو کچھ دیکھا ہے وہ سب غلط ہے!

وہ ہر روز دیکھتا کہ کاکا بابو سوٹ پہن کر دفتر چلے جاتے تھے۔ ایشور گنگولی لین سے نکل کر وہ سیدھے کنڈ ویو تھر کی سمت چلے جاتے۔ وہاں سے بس یا ٹرام پر سوار ہو کر دفتر چلے جاتے۔ ایشور گنگولی لین کے بہت سارے لوگ دفتر جاتے تھے ——— سو ... ان کے دفتر جانے کا وقت ان سے علیحدہ تھا۔ ان کے جانے کا کوئی مقرر وقت نہیں تھا۔ کسی کسی روز وہ صبح سویرے ... چلے جاتے اور بڑی رات گئے واپس آتے تھے۔ اس وقت مکان کا صدر دروازہ بند ہو جاتا تھا۔ کیونکہ اندر کی طرف سے ... کی آواز اور بھی صاف سنائی دیتی تھی اور حاجی قاسم کے باغ کی پرلی طرف سے بہت سے گیدڑوں کے ایک ساتھ چیخنے کی ... رہتی۔ اس وقت سبھی لوگ سو جاتے تھے۔ کالی گھاٹ میں، منہ میں، پتھر گھٹی میں اور رنیال بھٹیار ... اسٹریٹ میں کوئی ... ہوا نہ ہوتا۔ شاید وہ بھی شاید اس وقت برتن اور گھڑوں کی ڈھیری کے قریب ہی کہیں پڑا تھک کر کچھ دیر کے لیے ... ہو جاتے تھے لیکن ان کے یہاں ——— اس کمی وجہ ہی کے مکان میں کبھی کبھی اس وقت تک روشنی ہوتی رہتی۔ اس وقت ... کر جاکر کی آواز سنائی دیتی۔ شاید اسی وقت کاکا بابو دفتر سے لوٹتے تھے۔ کیسا دفتر تھا! جہاں اتنی رات تک کام ہوتا تھا وہ ... تھا! کاکا بابو کس دفتر میں کام کرتے تھے، کیا کام تھا؟

لیکن یہ بھی حیرت کی بات تھی کہ جب سے وہ لوٹ آئے تھے جیونتی بھی جیسے بالکل خاموش ہو گئی تھی۔ وہ چیخنا چلانا اب ... لیکن اب اس کی آواز میں وہ تیزی نہیں رہی تھی۔ شاید اس کے یہاں جو اس نے مرا ہوا پیدا کیا تھا، ابھی اسی دن وہ کھانا ... ایک تھالی بھات لے کر آ رہی تھی ———

وہ آنگن میں آتے ہی یکایک اس نے شروع کر دیا تھا ——— "آہ، مر جا، تیرے منہ میں آگ، اس وقت بھی کھانے ... ہوں تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا ———"

دیپنکر نے اسے دیکھتے ہی پوچھا تھا ——— "کس کو گالی دے رہی ہو جیونتی؟"

"یہ دیکھو نا بیٹا، اس بلی کی حرکت دیکھو، ٹھیک سونگھ سونگھ کر چلی آتی ہے۔"

دیپنکر نے دیکھا، جیونتی کی وہ پالتو بلیاں تھیں جو سر اٹھائے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔

دیپنکر نے پوچھا ——— "تم ان لوگوں کو کھانا کیوں نہیں دیتیں جیونتی؟ یہ ہو سکے تو یہ دار آتے ہیں ... کر ... نہیں دے سکتیں؟ اس گھر کا ایک لڑکی مجھے بہت ستاتی ہے ———"

جیونتی نے جواب دیا ——— "آہ! بیٹا ان کی بچی ہے، اپ کو چھوڑ کر یہیں آ گئی ہے، اس کو کیسے گالی دے سکتی

جیون بیتا ! اس کو کالی دینے سے تو بچتے ہوئے گناہ نہ ہوگا ؟

اس وقت چترلی ایک تھال میں کچھ سے چھپائے ہوئے ایک چاول کا بھات لیے ہوئے تھی۔ پچھلی کے دکھ تھے اور دال ترکاری بھی تھی۔ چترلی اب پہلے جیسی چترلی نہیں تھی۔ ان لوگوں نے جیسے چترلی کو کوڑی دے کر خرید لیا ہو۔ چترلی بیچے ان کی طرح کی ہی باندی ہو گئی تھی۔ اگھور داود کی بات ہو چکی تھی! روپے سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے: روپے سے کسی کو بھی خریدا جا سکتا ہے۔ دیپکر کے پاس اگر روپیہ ہو جائے تو کسی کی بھی اسے نہیں مارے گا۔

اوپر سے اتر کر کلاری کے دروازے کے قریب آتے ہی اچانک پیچھے سے کسی نے اسے آواز دی۔

"اے سنو —"

دلی ہوئی آواز تھی۔ دیپکر پیچھے مڑ کر دیکھتے ہی متعجب ہو اٹھا۔

کھمی دیدی! وہ جھٹ آ گئی تھی۔ اندر کے چوڑے بالکل پیچھے ٹھیک کوٹھی کے دروازے کی چوکھٹ پر کھمی دیدی دیپکر کے جسم سے سٹ کر کھڑی ہو گئی۔

بولی — "چھوٹے بھائی دیپو! میرا ایک کام کرو گے؟"

دیپکر کی حیرانی کی انتہا نہ رہی۔ کھمی دیدی اس کے ساتھ اتنے پیار سے بات کر رہی تھی!

اس نے پوچھا — "کون سا کام؟"

"یہ خط ایک آدمی کو پہنچا دو گے؟"

کھمی دیدی کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔

دیپکر نے پوچھا — "کس کو؟"

"پیچھے جاؤ، ٹھیک دے آؤ گے؟"

"ٹھیک دے آؤں گا، دے کر دیکھو —"

"کسی سے کہو گے تو نہیں؟"

کھمی دیدی نے اس کے ساتھ کبھی اس طرح بات نہیں کی تھی۔ کھمی دیدی آنی ہی دیر میں پہلے سے نرم ہو گئی تھی۔

"نہیں، کسی سے نہیں کہوں گا۔ تم خط دے دو۔ دے کر دیکھو میں دیتا ہوں یا نہیں —"

"تو پھر ایک کام کرو —"

اتنا کہہ کر کھمی دیدی نے لفافہ اس کی جیب میں ڈال دیا۔

بولی — "کوئی دیکھے گا تو نہیں، تمہاری ماں تو نہیں دیکھے گی؟"

دیپکر نے کہا — "میں چھپا کر رکھوں گا۔ تم سے وعدہ کرتا ہوں کسی کو نہیں دکھاؤں گا — کس کو دینا ہوگا

بتاؤ؟"

ککھو دیدی نے دبی ہوئی آواز میں کہا ——— "کنڈ دو پوکھر کے کنارے ٹھیک مندر کے پچھم جو دروازہ ہے وہیں پر
ایک آدمی کھڑا ہوگا ——— اس کے ہات میں خط دینا ———"

"لیکن اس کی شکل کیسی ہے؟"

"سفید قمیص، سفید پتلون اور سفید جوتا ہوگا اور زرد رنگ کا کوٹ ہوگا اور کوٹ کے بٹن ہول میں ایک گلاب کا پھول ہوگا
ٹھیک پہچان لوگے نا؟"

"کتنے بجے؟"

ککھو دیدی نے کہا ——— "کل ٹھیک سات بجے صبح ———"

دیپک نے کہا ——— "ٹھیک ہے، اس وقت تو میں ہر روز مندر میں پھول دینے جاتا ہوں، تم کچھ فکر مت کرو، میں دے
دوں گا۔ پھر کچھ کہنا ہوگا؟"

ککھو دیدی نے کہا ——— "نہیں ———"

اس کے بعد دیپک چلا آرہا تھا، لیکن ککھو دیدی نے پھر آواز دی۔

"ہاں ——— سنو، ادھر آؤ ———"

دیپک کے قریب جاتے ہی ککھو دیدی نے کہا ——— "یہ لو، تم کھاؤ گے ———"

اندھیرے میں بھی دیپک نے دیکھ لیا، مٹھی بھر چاکلیٹ تھا۔ ککھو دیدی نے اس کے ہات میں چاکلیٹ ٹھونس دیا، چاکلیٹ
دے کر ککھو دیدی چلی گئی اور دیپک کھڑکی کا دروازہ بند کرکے آنگن میں آکر کھڑا ہوگیا۔ اس کے بعد اس نے ہات کی بند مٹھی کھول کر ایک بار
دیکھا۔ بہت سارے چاکلیٹ تھے، منساری کی دکان میں جیسے چاکلیٹ شیشے کے مرتبان میں رہتے تھے، یہ بھی ویسے ہی تھے بلکہ
اس سے بھی بہتر تھے، چمکی میں لپٹے ہوئے چوکور چوکور چاکلیٹ تھے۔ اس کا جی چاہا کہ ایک اسی وقت چکھ کر دیکھے، لیکن پھر اس
نے سوچا ——— بعد میں کھاؤں گا!

دوسرے دن اس وقت تک صبح کی روشنی نہیں پھیلی تھی۔ ماں نے اس سے پہلے ہی اسے جگا دیا تھا۔ دیپک نے اٹھ کر منہ پر پانی کے
چھینٹے دیے اور جھٹ پٹ کپڑے پہن کر تیار ہوگیا۔ اس کے بعد ککھو دیدی کا خط جیب میں ڈال لیا۔ اسے حاجی قاسم کے مکان کے پاس
باغ میں پیچھے کے سے جانا تھا۔ باغ کی دیوار ایک طرف سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ وہ اسی راستے سے اندر چلا جاتا تھا۔ اندر بہت سارے
پھول تھے، گیندا، جوہی، چمپا، گلاب، گل سوسن اور دوسری بہت سی اقسام کے پھول تھے، کبھی کبھی پیڑوں کی ٹوکری بھر لاتا۔
روز یہی پھول وہ مندروں میں جا کر دے آتا تھا۔ پہلے ماں کالی کے مندر میں، اس کے بعد مدھو سودن کے مندر میں، اس کے بعد
مندر میں گنیش، جگن ناتھ، شوشنکر، اس کے بعد سب سے آخر میں ڈوکیشور اور سونار کا ٹک کے مندر میں ——— اسے ہر مندر میں
تھوڑے تھوڑے پھول دینے پڑتے تھے اور سارے ہی دیپک کو پجاری پہچانتے تھے۔ اس کے جاتے ہی سبھی اس کی طرف ہات
بڑھاتے

گئے ——— وہ کہاں ہے ———
پھول دینے کے بعد وکٹر نے ایک بار پھر کہا تھا۔
اس نے سمجھا دیا تھا کہ پانچ کرتے وقت کہہ دے۔ ... میں جتنی تعلیم حاصل کروں، خوشی حاصل کروں اور ترقی کر
سکوں ———

اور بہت دنوں کے بعد جب وکٹر جیسے ہی بی۔ اے ہو گیا تھا تو ایک دن ... ایک ... سکھ ...
پھر جس نے اس کے قدموں پر سر رکھ کر اسی بات کو کہا تھا ———
"حضور آپ میرے ماں باپ ہیں۔ آپ کا بھلا ہو گا حضور۔ بھگوان آپ کو بہت دے گا حضور۔"
اس دن وکٹر کو ہنسی آئی تھی۔ بہت سے لوگ یوں ہی اس کو دعائیں دیتے تھے پہلے ... بھی ... خوشامد کرتے
تھے سبھی ایک زبان ہو کر اسے سیٹھ صاحب کہتے تھے۔ ان کی خوشامد کے وہ مزے ... [illegible]
... پر بیٹھا تھا ... زیادہ عزیز سمجھتا تھا ... اور ... جب کبھی
... سیٹھ صاحب ... کیا ہوا ... اس کا کیا فائدہ ہوا ... اور
... ایک قسم کی شرط تھی ... [illegible]
نے وکٹر کو خرید لینا چاہا تھا ... وکٹر کا منہ بند کر دینا چاہا تھا۔ لیکن اس سے کیا وہ بات چھپ سکی! وہ کیا چھپ رہنے
والی بات تھی!

"ارے ———"
وکٹر نے پیچھے مڑ کر دیکھا ... سویرے ... بستر سے اٹھ کر کمرے کے دروازہ میں آ کر کھڑی
ہو گئی تھی۔
"ارے ... آواز میں کہا ——— خود ہی بیٹھے ہو؟ بھوک لگی نہیں؟"
وکٹر نے کہا ——— نہیں یہ دیکھو! میری جیب میں ہے ———
"بیٹے وہ دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ تم نے ... ماں کو تو نہیں دکھایا؟"
"نہیں ———"
"کیسے لگتے ہو ———؟"
وکٹر نے کہا ——— میں ... نہیں ہوتا ... دو سال تک ... کا بھی نہیں۔
... نے پھر پوچھا ——— شکل ... ہے نا؟ سفید قمیص، سفید پتلون، سفید جوتا اور زرد رنگ کا کوٹ۔
کوٹ کے بٹن ہول میں گلاب کا ایک پھول ———؟"
"یاد ہے ———"

ہنا کر دیکھ پھولوں والی ٹوکری سیدھے ہوتے باہر چلا گیا۔

دھوبی والی گھاٹ میں جتنے لوگ تھے ان سب کا کاکا اور بالکل ہی مختلف تھے، دینکر نے کتنے ہی مکانات دیکھے تھے، بچپن میں مہاوروں کے ذہن محلے میں جا چکا تھا۔ مکان کا اندرونی حصہ دیکھ چکا تھا، کرن کا مکان بھی دیکھ چکا تھا، کسی کا مکان بھی وہ بیان، پھٹک اور اکمال بھیروں کے مکانات دیکھ چکا تھا، لیکن کاکا بابو کے مکان اور ان کے مکان میں کوئی مماثلت نہیں ان مکانوں میں ان دونوں کسی کے یہاں نوکر اور باورچی نہ تھے، کرن کے گھر کا خرچ تو بھیک کے پیسے ہی سے چلتا تھا، جیسے تو فروخت کے گھر میں چاول، دال اور آٹا تھا اور صرف یہی نہیں —————— مدھوسودن

جا کر اس نے دیکھا تھا، مدھوسودن کے تمام بھائی بہن مل کر بیٹھے بھات کھاتے ہوتے۔ ایک بڑی سی تھالی میں مدھوسودن کی ماں بھات اور دال نکال کر رکھ دیتی اور وہ تمام بھائی بہن دائرہ بنا کر تھالی کے گرد بیٹھ جاتے اور اکیلی مدھوسودن کی ماں کے لئے رکھ لیتی رہتی، پھٹک سیتہ علی کی گلی میں رہتا تھا، پھٹک کی ماں بوڑھی ہو گئی تھی اور بوڑھی ہو کر راستے کی دکانوں میں سے جو پیسے ملتے اس سے گھر کا خرچ چلتا تھا، بیشتر لوگوں سے جتنے ہوتے آنے جانے کے بعد وہ پیسوں میں اندر کا گھر تھا، سب آتے جاتے، بیمار ہو جاتا تو نمبر آتا، وہ ماں ہو جانے کو تھر پر ماں کے ساتھ اس کے گھر گیا تھا اس کو دیکھا تھا، اس گھر کی تو کل بھی ایسی نہ تھی اور انگھور داود، انگھور داود کے پاس بھی تو بہت سارا روپیہ تھا، داود کے پاس کتنا روپیہ تھا اس کی تعداد خود انگھور داود کو بھی معلوم نہ تھی، پھر بھی انگھور داود کا مکان بے رونق اور بدصورت تھا، داود کو دیکھ کر ہی جیتے جی کے بوڑھے کی تصویر اس کی آنکھوں میں پھر جاتی تھی، گھر پھر بھی صرف منی دیدی کی ایسی خوبصورت لگ جا سکتی تھی۔

ان پر بھی دیدی کی وجہ سے گھر میں سناٹا نہ رہتی۔

رتی —————— "یہ کیا کپڑا پہن رکھا ہے تم نے بیٹی، کوئی اچھی سی ساڑی پہن لو، آج سال کا پہلا دن ہے ——————

منی دیدی منہ چڑھا رہی تھی۔

رتی —————— "کیوں کپڑا نہیں ہے شاید؟ اتنی ساری لال کنارے کی ساڑی کیا ہوئی کیا سب بالدا کے خوانچے پر چلی گئے، تمہاری عقل کیسی ہے بروز؟"

منی دیدی خوف سے ڈر جاتی۔

—————— "تم دادو سے منع کر دینا، دادو دیکھیں گے تو میں نے ہی تم سے کہا ہے"

رتی —————— "تمہاری ہی محبت تو ہے بیٹی، ورنہ تمہاری قسمت میں ایسا تو ہو ہی نہیں جاتی؟"

روز انگھور داود کے رہتے ہی اس نے کہہ لیا۔

رتی —————— "بابا، آپ کی ایک بات سنی تھی ——————"

"روپیہ؟"

اکمل داد و کے ایک بات میں نے کہا یہی بیٹی ہو گی ایک پڑیشنی مستند سے ہاتھ میں دو نخواہ پیشانی پر ... سر پیچھے کے بغل کی دو چوڑیاں پڑی تھیں، پانی میں کمر تک ڈوبی تھا۔ پھر دیر چلے ہی رکشا والے سے کہا یہ کیسے جھگڑے چھڑ کر شرک ۔۔ داخل ہوتے ہی جیسے وہ اندر دونوں پیچھے بیٹھ گئے، یہاں بھی روپیہ!

بولے ——— روپیہ؟ منہ جلی لڑکی میرے پاس روپیہ کہاں سے آیا؟ تم نے کیا میرے پاس روپے کا پیڑ دیکھ ہے!"

ماں نے کہا ——— میں آپ سے روپے کی بات نہیں کرتی ہوں، آپ کا روپیہ آپ ہی کے پاس رہے گا لیکن اس کی شادی تو کریں گے ——— یا نہیں کریں گے؟"

اکمل داد و کو اتنی دیر بعد ذرا اطمینان ہوا

بولے ——— شادی! لیکن منہ جلی کی شادی میں بھی روپیہ خرچ ہوگا، روپیہ میں کہاں سے لاؤں گا، سنو تو سہی!"

"تو روپیہ خرچ ہوگا اس لیے آپ نہیں کریں گے؟ ایسے ناراض ہیں آپ؟ اتنا دھرم کرم کرتے ہیں یہ بھی تو دھرم کا کام ہے، حقیقت میں اس لیے تو آپ کو ثواب بھی پڑے گا اور اگر آپ سے یہ نہیں ہو سکتا تو اس کے گلے میں کلسی باندھ کر میں جا دیجیے، سارا جھگڑا ہی ختم ہو جائے۔"

اکمل داد و تھوڑی دیر تک سناٹے میں کھڑے رہے۔

ماں نے کہا ——— لڑکی کی طرف آپ تو بے چارے شاید کبھی نہیں دیکھتے، لڑکی کی عمر بڑھ رہی ہے، وقت آ پہنچا نہیں ہے، آپ نہیں دیکھیں گے تو کون دیکھے گا؟"

اب کے اکمل داد و چیخ اٹھے۔

بولے ——— میں؟ میں کیوں دیکھوں گا اس منہ جلی کو؟ میں کون ہوں؟ منہ جلی نے ماں کو کھایا، منہ جلی نے باپ کو کھایا ... اب منہ جلی مجھے کھانا چاہتی ہے؟ مجھ سے یہ سب نہیں ہوگا ———

"آپ سے نہیں ہوگا تو کس سے ہوگا؟"

"وہ میں کیا جانوں منہ جلی۔ میں اس کا کیا لگتا ہوں؟ میں کیا اس کا باپ ہوں؟ میں کیا اس کی ماں ہوں؟ میں کوئی نہیں ہوں۔"

اتنا کہہ کر اکمل داد و کھٹ پٹ کرتے ہوئے زینے کی طرف چلے گئے، اوپر جانے کے بعد ہوتے بڑبڑاتے رہے تو ... منہ جلی نے میرا روپیہ دیکھ لیا ہے، میرا روپیہ دیکھ لیا ہے منہ جلی نے، میں منہ جلی کو گھر سے نکال دوں گا منہ جلی، منہ جلی، نکل جا، چلی جا سب ..."

مگر دادو کی بک بک جھک جھک ختم ہو نہیں رہی تھی۔
مگر دادو کے جانے کے بعد شنتی دیدی اپنی جگہ سے باہر نکل آئی اور ماں کے قریب آ کر خوف سے تھر تھر کانپنے لگی۔

دیدی ——

ماں نے کہا —— تم ٹھیک تو ہو، اتنا فلسفے سے کام نہیں چلے گا، عورت بن کر پیدا ہوئی ہو تو برداشت کرنا ہی پڑے گا۔ برداشت نہیں کرو گی تو خود ہی ٹوٹ جاؤ گی، کوئی تمہارے لیے کچھ نہیں کرے گا —— تم ذرا ہمت سے کام لو ——

ماں کہتی گئی —— میں نے یہ سب بہت دیکھا ہے۔ ایک کپڑے میں ایک ماہ کے بچے کو لے کر میں گاؤں چھوڑ کر بھاگ آئی تھی۔ مجھے بھی رشتہ داروں نے کتنا خوف دلایا تھا لیکن تمہاری طرح میں نے کیا خوف کھایا تھا؟ خوف کرتی تو اس لڑکے کی پرورش کر سکتی ——

پتہ نہیں ماں کتنی مصیبتیں اٹھا کر اس کی پرورش کر رہی تھی۔ دوسرے کے گھر کا تمام کام کر کے بھی ماں چاروں طرف کتنا بھاگتی دوڑتی رہتی تھی۔ ماں نے ہی اسکول کے ہیڈ ماسٹر سے کہہ کر اسکول کی فیس معاف کروا دی تھی۔ ماں ہی تو اسے اپنے ساتھ چڑیا گھر لے گئی تھی۔ وہاں شیر، چیتا اور ہاتھی دکھایا تھا۔ بندر کو چنا کھلوایا تھا۔ ماں ہی نے تو اسے بہت سی باتیں سمجھائی تھیں۔ ماں ہی نے اسے کالی گھاٹ اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ آج اگر ماں زندہ ہوتی! وینکر کبھی کبھی سوچنے لگتا، اگر ماں زندہ ہوتی تو کیا اسے دیکھ کر خوش ہوتی؟ پہلی مرتبہ اس کا [illegible] دیکھ کر خوش ہوتی! ماں نے کیا اسے صرف بیرا صاحب بنانا چاہا تھا۔ ماں نے تو اپنے لڑکے کو انسان بنانا چاہا تھا! لیکن یہ انسان ہی مسئلہ کیا ہے؟ کس کو انسان بنا سکتے ہیں؟ یہ گورنمنٹ کی ترقی؟ یہ ڈی۔ ٹی۔ آئی؟ یہ ڈی۔ ٹی۔ ایس؟

[illegible] ایک مرتبہ ایک واقعہ ہوا تھا۔ اس وقت وہ کالی گھاٹ اسکول کا طالب علم تھا۔ کالی گھاٹ اسکول کا [illegible] ڈرامہ ہو رہا تھا۔ وینکر [illegible] تھا کہ اس کی دلچسپی کی وجہ ہوئی، وہ زیادہ رات گئے گھر لوٹنے کا۔ ڈرامہ کا نام "تیاگ" تھا۔ [illegible] اسکول کے لڑکوں کے ساتھ گیا۔ وینکر سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ [illegible] اس کے ساتھ تھا۔ اونچے درجوں میں پڑھنے والے لڑکے [illegible] ٹن سے گھنٹہ بجنے کے ساتھ ہی [illegible] پردہ اٹھ گیا۔ اف وہ بھی کیا دنیا تھی! دیکھتے ہی دیکھتے نہ جانے وہ کتنی دور پہنچ گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ وہاں موجود نہ ہو۔ اس روشنی سے، اس اجتماع سے، اس گھنٹے کی آواز سے، [illegible] سے بہت دور کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گیا ہو۔

کہاں وہ رو کر تالی بجا رہا تھا۔

لیکن وینکر کا خیال اس طرف نہیں تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے [illegible] کی دنیا کی [illegible] ایک وقت تھا جب دنیا میں کوئی راجہ نہیں تھا، ریاست بھی نہیں تھی، سزا بھی نہیں تھی، سزا دینے والے بھی نہیں تھے۔ لیکن [illegible] نے جبر یا [illegible] مذہب دنیا سے ختم ہونے لگا۔ تمام دیوتا ڈر گئے۔ سب برہما کے پاس دوڑ پڑے ——

وینکر کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ دور [illegible] جیسے [illegible] نے دنیا [illegible] شروع کر دیا ہو [illegible]

ناانصافی کرتا ہے، یہ راجہ معلوم کرتا ہے، یہ راجہ خود کرتا ہے [illegible] کا تدارک کون کرے گا؟ اس وقت اس کا تدارک کرنے والے کہاں ہیں؟ اس وقت دیوتا سب کہاں ہیں؟ برہما کے پاس کون جائے گا؟ پرماتما جس کی تخلیق کر سکتا ہے وہ وشنو کا اوتار کہاں ہے؟

دھیرے دھیرے دیکھتے دیکھتے دیکھ کر کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، مگر تھوڑے کے ساتھ دیکھ کر پھر رونے لگا ——

اس قدر نے غریبوں کی دولت چھین لی! راجہ اگر چوری کرے،
میں نے سنا ہے کہ دنیا کا بھی ایک راجہ ہے —— تم اگر چوری
کرو تو تمہارا انصاف کون کرے گا!

واقعی تمہارا انصاف کون کرے گا! راجہ اگر ظلم کرے، کس سے انصاف کی درخواست کی جائے؟ کہاں ہے وہ دنیا کا راجہ [illegible] کی شادی [illegible] اور دوسرے [illegible] تو [illegible] اگر [illegible] نہ ہو تو وہ کس سے اس کا تدارک کرنے کے گا؟ اس دنیا کا راجہ کہاں ہے؟ [illegible] وہ کس ریاست میں رہتا ہے؟

[illegible] اور صرف [illegible] ہی نہیں [illegible]

[illegible] دیکھ کر [illegible] [illegible] بہت [illegible] دیکھنے کے لیے [illegible]

[illegible] ٹوٹ گیا تھا۔

ایک ایک کر کے [illegible] [illegible]

[illegible] بیٹھے تھے۔

[illegible] بات [illegible]

[illegible] [illegible] گیا۔

[illegible]

[illegible] [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] جواب دیا تھا۔

"کیوں ——؟"

ماں نے کہا تھا —— "ان کی بھی تو جان ہوتی ہے، ان کو بھی تو تکلیف ہوتی ہے۔"

"لیکن ماں کالی جو بکرے کا خون پیتی ہے پھر وہ کیا کھائے گی؟"

ماں نے کہا تھا —— "ماں کالی تو دیوی ہیں، دیوی دیوتا بغیر کھائے پیئے بھی زندہ رہ سکتے ہیں ——"

ماں کو اس وقت معلوم نہیں تھا، وہ نہیں جانتی تھی کہ جو لوگ دیوتا کے نام پر کھٹتے ہیں وہ ضرورت پڑنے پر دیوتا کا نام بیچ بھی سکتے ہیں، جو لوگ ظلم کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں ان کو موقعے کی کمی نہیں ہوتی، اس کے علاوہ کوئی —— دیوتا کا نام لے کر انصاف کرتا ہے، کوئی راجہ کا نام لے کر انصاف کرتا ہے اور کوئی ملک کے نام پر ناانصافی کرتا ہے، بات ایک ہی ہے، دیوتا، راجہ ہو یا ملک، جو اصل میں یہ ایک بہانہ ہی ہوتا ہے، بکرا بے زبان جانور ہے اس لیے کچھ کہہ نہیں سکتا، لیکن کیا انسان بے زبان ہے؟ اگمر داود دیوتا کے نام پر جان کو کٹتے ہیں لیکن کسی جان نے بھی تو کبھی احتجاج نہیں کیا!

ایک روز ویلکر نے اگمر داود سے پوچھا تھا —— "اچھا، اگمر داود تم جو اپنے جانوروں کو کٹتے ہو تو وہ تمہیں کچھ نہیں کہتے؟"

اگمر داود کو شاید اس روز بہت زیادہ سلامی ملی تھی۔ اس روز وہ بہت خوش تھے۔

بولے —— "ڈور منہ جلا، کہیں گے کیا، وہ لوگ بھی تو دوسروں کو کٹتے ہیں!"

"وہ لوگ کس کو کٹتے ہیں، دیویوں کو؟"

"ڈور، ڈور، میرے وکیل جان موکل کو کٹتے ہیں، ڈاکٹر جان مریضوں کو کٹتے ہیں۔"

"اور موکل کس کو کٹتے ہیں؟ مریض کس کو کٹتے ہیں؟"

اگمر داود کی ذہانت دیکھ کر اس روز ویلکر حیران ہو گیا تھا، اگمر داود کو سب کچھ معلوم تھا، ان کی معلومات ماں سے بھی زیادہ تھیں، دادا بابو سے بھی زیادہ تھیں، شاید ان کی معلومات پران متو بابو سے بھی زیادہ تھیں۔ اگمر داود کی جتنی گزر اوقات بھی کر سکتے تھے، یہ حیرت ہے، ان کی معلومات کتنی زیادہ تھیں!

ویلکر نے پوچھا تھا —— "کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ دنیا میں سبھی ایک دوسرے کو کٹتے ہیں؟"

اگمر داود نے جواب دیا تھا —— "ہاں رے ہاں منہ جلا، سبھی ایک دوسرے کو کٹتے ہیں، میں بھی تو کٹتا ہوں، بھگت کو کٹتی ہے اور پھر پیچھے پیچھے میرا رشتہ ہے ——"

ویلکر نے کہا تھا —— "لیکن میں کسی کو فریب نہیں دوں گا، اگمر داود، دیکھ لینا ——"

اگمر داود نے کہا تھا —— "کیوں رے منہ جلا، تو اپنی ماں کو فریب دے گا اور تیری ماں مجھے فریب دے گی۔"

ویلکر نے جواب دیا تھا —— "نہیں اگمر داود، میں کبھی کسی کو فریب نہیں دوں گا۔ کبھی نہیں، تم دیکھ ——"

اگر وہ دو گھنٹے تھے، بیستے ——— تو پھر جا کر رو دیتے تھے۔ نہیں لگ سکتا تھا ... [illegible]

میرا ایک ... بہت ... ہوتے ہیں ——— [illegible]

لیکن حیرت ہے، ... [illegible] ... ثابت ہوگی، مگر ... [illegible]

چیز تھا۔ ... [illegible] ...

... [illegible] ... دنیا ... دیکھو اس دنیا میں ... [illegible]

... [illegible] ... تو وہاں ... [illegible] ... تھی۔

ایک دن سنی نے اس سے کہا تھا ——— "تم انسان نہیں ہو، ورنہ تم اگر انسان ہوتے ....."

دیکھنے جواب دیا تھا ——— "لیکن میں دیوتا بھی تو نہیں ہوں سنی ——"

سنی نے پوچھا تھا ——— "پھر تم کیا ہو؟"

دیکھنے جواب دیا تھا ——— "میں کیا جانوں، تم ہی بتا دو؟"

سنی نے کہا تھا ——— "تم جانور ہو، تم ایک جانور ہو ... تمہارا چہرہ دیکھنا بھی گناہ ہے، تم اس دنیا سے ... [illegible]

نہیں سے چلے جاؤ، نکل جاؤ۔"

اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی اور اس روز دیکھ کر سنی کو تسلی بھی نہ دے سکا تھا، اس کی ڈھارس بھی نہ بندھا سکا تھا، وہ سنی کو اسی حالت میں چھوڑ کر وہاں سے چلا آیا تھا۔

اور یہی سنی جب پہلی بار ... [illegible] ... آئی تھی تو اس کے ... [illegible] ... ہوئی تھی، ... [illegible]

وہ لڑکی ... [illegible] ... گھر ... [illegible] ... کے شمار۔

... [illegible] ...

... [illegible] ...

... [illegible] ...

سنی کا تمام ... [illegible] ...

مگر ... [illegible] ... تھا۔

... [illegible] ...

... [illegible] ...

... [illegible] ...

... [illegible] ...

دیکھ کر وہ ذرا قریب ہو گیا۔

لکھی دیدی نے کہا ـــــ "آؤ، اندر آؤ ـــــ"

جب سے چیکو لکھی دیدی نے دروازہ بند کر دیا تھا لکھی دیدی نے اس روز اپنے بالوں میں کوئی خوشبودار تیل لگایا تھا جس کی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ ڈیکچو نے لکھی دیدی کے چہرہ کی طرف دیکھا، اس سے کوئی خطا تو سرزد نہیں ہوئی ہے، آخر لکھی دیدی کا چہرہ اتنا یوں ہے!

لکھی دیدی نے پوچھا ـــــ "ارے، تو نے کل خط نہیں دیا تھا ـــــ"

"کیوں؟"

ڈیکچو کو حیرت ہوئی، نہیں دیا کیا مطلب؟ ٹھیک اسی آدمی کے بات میں تو وہ خط دے آیا تھا۔

اس نے کہا ـــــ "کیوں؟ ہر روز جس کو خط دے کر آتا ہوں، اسی کو تو دے آیا ہوں، اُسے نہیں ملا؟"

لکھی دیدی نے کہا ـــــ "پھر اسے میرا خط ملا کیوں نہیں، اس نے مجھے لکھا ہے!"

ڈیکچو نے کہا ـــــ "واہ رے، اتنے دنوں سے تمہارا ہر خط اس کو دے آتا ہوں اور کل کا خط کیوں نہیں دوں، بھی خوب ہو۔"

"پھر اُسے ملا کیوں نہیں، تو نے وہ خط کیا کیا، بول؟"

لکھی دیدی کی آنکھوں سے غصہ جھلکنے لگا، اس نے بہت دنوں سے لکھی دیدی کو اس طرح غصے ہوتے دیکھے نہیں تھا۔

"بتا، وہ خط تو نے کیا کیا؟ کس کو دے دیا ہے؟ کہاں رکھا ہے، بتا؟"

ڈیکچو نے کہا ـــــ "واہ رے، بیسترا اوپر تو فضول خفا ہو رہی ہو، میں تمہارا خط لے کر کیا کروں گا؟ اتنے سارے خط اس کو دے آیا ہوں پھر یہی خط کیوں نہ دیتا؟"

"تو اس نے کیا غلط لکھا ہے؟"

ڈیکچو نے کہا ـــــ "میں کیا جانوں؟"

"تو نہیں جانتے تو کون جانتا ہے؟ میں نے تو تمہارے ہی ہاتھ سے خط بھیجا تھا ـــــ"

"تو کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں تمہارا خط نگل گیا ہوں؟"

"تو نے کس کو خط دیا ہے، پہلے بتاؤ ـــــ"

لکھی دیدی یکایک اُسے پیار کرنے لگی۔

اُس نے کہا ـــــ "میں تجھے کچھ نہیں کہوں گی، ڈرو نہیں، مجھ سے ... بتاؤ، خط ... تو نے کیا کیا؟ ... ہو گیا ہے شاید؟"

"تم کیوں ہو گا؟ میں تو ہر روز جیب میں رکھ کر لے جاتا ہوں، کل بھی جیب ہی میں ... تو نے بتایا تھا ـــــ"

"لیکن خط کا جواب تو نہیں بھیجتے ہو! جانتے ہو، معلوم ہے اس خط میں کتنی باتیں لکھی تھیں، وہ لڑکی کے ہاتھ میں پہنچ جاتا تو ؟
دل اگر نہ چاہے؟"

وکٹر یکایک تن کر کھڑا ہو گیا اور سر جھکا کر بولا

"لیکن تم ہر روز اس آدمی کو خط کیوں لکھتی ہو ممی دیدی؟ وہ تمھارا کون ہے؟"

ممی دیدی یکایک جیسے گم سم ہو گئی۔

وکٹر نے کہا —— وہ ہر روز شام کے وقت تمھارے خط کے انتظار میں کھڑا رہتا ہے، وہ تمھارے گھر کیوں نہیں آتا؟ گھر میں تو سبھوں کے سامنے اس سے کہیں باتیں نہیں کر سکتیں؟ اور ایسی کون سی باتیں ہیں جو تم ہر روز اُسے خط لکھتی ہو؟"

ممی دیدی دیر تک خاموش رہی پھر بولی

"تم نے ضرور میرا خط پڑھ لیا ہے، کیوں؟"

وکٹر نے کہا —— میں خواہ مخواہ تمھارا خط کیوں پڑھوں گا۔ تمھارا خط پڑھنے کی مجھے کیا غرض پڑی ہے، مگر وہ آدمی تمھارے گھر نہیں آ سکتا؟"

ممی دیدی نے پوچھا —— سچ کہتے ہو؟ تم میرا خط نہیں پڑھتے؟"

"سچ کہتا ہوں ممی دیدی۔ میں نے تمھارا ایک خط بھی نہیں پڑھا ہے۔"

"سچ کہتے ہو؟"

"میں تو کہہ چکا ہوں کہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔"

"پھر وہ خط اُسے کیوں نہیں دیا؟"

ممی دیدی جیسے کسی فکر میں پڑ گئی —— جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ہو

یکایک اس نے کہا —— پرسوں شام کے وقت ایک اور خط دے آؤ گے؟"

وکٹر نے کہا —— کیوں نہیں دے آؤں گا۔"

"پھر جانے سے پہلے مجھ سے خط لے لو گے، کیوں؟"

وکٹر نے جواب دیا —— اچھا ——

اتنا کہہ کر وکٹر جا رہا تھا، یکایک ممی دیدی نے اُسے آواز دی

"سنو وکٹر ——"

وکٹر رک گیا۔

ممی دیدی نے کہا —— تم ٹھہرو، میں ابھی آتی ہوں ——"

اتنا کہہ کر وہ تیزی سے زینے چڑھ کر اوپر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد پھر اسی تیزی سے زینہ پھلانگتی ہوئی نیچے آ گئی۔ اس

...ہنسنے لگی تھی۔
بولا ——— "نہ لو۔"
سمی دیدی نے ہاتھ بڑھا کر دینکر کو مٹھی بھر چاکلیٹ دینا چاہا۔
دینکر نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔
"کیا ہے؟"
سمی دیدی نے کہا ——— "اس روز جو چیز دی تھی۔"
"تمہارا یہ چاکلیٹ میں نہیں لوں گا۔"
سمی دیدی چونک اٹھی۔
"کیوں؟ کیوں نہیں لوگے؟ تم چاکلیٹ نہیں کھاتے؟"
"کھاتا ہوں" دینکر نے جواب دیا ——— "لیکن تم سے نہیں لوں گا۔"
"کیوں؟ میں نے کیا قصور کیا ہے؟"
دینکر نے کہا ——— "اس دن بھی میں نے چاکلیٹ نہیں کھایا تھا۔ تم نے جس طرح دیا تھا اسی طرح رکھ دیا ہے۔ تم مجھے
...است۔ دبا کر وہ سمی دیدی ———
"کیوں؟ کیا ہوا؟"
دینکر نے کہا ——— "تم چاکلیٹ نہیں بھی دو گی تو میں تمہارا خط پہنچا دیا کروں گا۔ جب تک تم چاہو گی میں پہنچاتا رہوں گا
...ہو گی۔ میں کر دوں گا۔ لیکن تم مجھے چاکلیٹ نہ دیا کرو۔ میں تمہارے پاؤں پڑتا ہوں ———"
سمی دیدی نے پوچھا ——— "یہ کیا؟ کیوں، کیا ہوا؟ بتاؤ نا؟"
دینکر نے جواب دیا ——— "تم سمجھتی ہو کہ چاکلیٹ نہیں دو گی تو میں تمہارا خط نہیں لے جاؤں گا، کیوں؟"
سمی دیدی نے کہا ——— "تم خود سے آیا کرو نا۔ اچھا تو ہے۔ لیکن چاکلیٹ لینے میں کیا ہے؟"
"نہ دے کر دیکھو نا۔" دینکر نے کہا ——— "خط پہنچاتا ہوں یا نہیں!"
سمی دیدی ہنستی ہوئی اس کے قریب آگئی، دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام کر اسے پیار کرنے لگی ———
"کیوں رے؟ میرا کام کرنے سے تجھے اتنی دلچسپی کیوں ہے؟"
دینکر نے سر جھکا کر جواب دیا ——— "یونہی ———"
"سنو، میں تو تجھے برابر چھیڑتی رہتی ہوں، پھر بھی تجھے مجھ پر غصہ نہیں آتا؟"
دینکر نے کوئی جواب نہ دیا۔ سمی دیدی کے سینے میں منہ چھپا کر کھڑے رہنے میں کتنا آرام تھا۔ سمی دیدی کے جسم سے
...خوشبو پھوٹ رہی تھی۔

"اب میں تجھے کبھی نہیں دوں گی" بچے ——— کھمی دیدی نے کہا اور اس کے بعد چاکلیٹ

زبردستی ٹھونس دیا ———

"میں کتنی بھولی، چاکلیٹ تمہارے لیے لائی، میں صرف یہ بھول گئی ——— تھی!"

دیپکر نے چاکلیٹ لے لیا، اب کے اس نے انکار نہیں کیا۔

"پرسوں صبح کے وقت خدا حافظ کہنے آؤ گے نا؟" کھمی دیدی نے پوچھا۔

"ضرور آؤں گا۔" دیپکر نے جواب دیا۔

کھمی دیدی نے کہا ——— "اب تم جاؤ ———"

پھر تھوڑے توقف کے بعد بولی ——— "یاد رکھو گے، پرسوں صبح کے وقت ———"

اتنا کہہ کر کھمی دیدی چلی گئی تھی اور دیپکر کوٹھی کے دروازے سے باہر آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

آنکھوں میں تیز دھوپ چمک رہی تھی اور لُو اس وقت تک بہ دستور چل رہی تھی اور وہ اس وقت تک سر

تھی اور دیپکر املتاس کے پیڑ کے سائے میں دیر تک کھڑا رہا تھا۔

دیپکر دیر تک کھڑا رہا مگر اس کی دوپہر تھی سب دروازے بند کیے سو رہے تھے، اس روز انگو دادا بھی گھر سے باہر

نہیں نکلے تھے، چھنو بھی سویرے سویرے اپنا کام کاج ختم کر کے شاید دروازہ بند کیے سو رہی تھی۔ منی دیدی پہلی منزل پر اپنے کمرے

پتہ نہیں کیا کر رہی تھی، چھوٹے بھیا شاید کھیل کود کر اس وقت کہیں بیٹھے اونگھ رہے ہوں گے۔ شاید پیپر مٹ کی کسی

یا پھر ادھر بھی قندھاری بازار کی شمال جانب کسی کمپنی کے باغ میں بانس کے اندر بیٹھے ہوں گے۔ دوپہر کے وقت ایشور گنگولی کا مینا

الگ تھلگ تھا، اس کنارے سے اس کنارے تک پتہ کی چھت والے مکان تھے اور وہ دور بہت دور نیلے آسمان کی وسعتوں

چیلیں اڑ رہی تھیں۔ اور اس کے مکان کی چھت پر ایک بانس کے سرے پر ایک چیل آ بیٹھی کر پھڑپھڑا رہی تھی، راستے پر تھوڑی

دیر بعد ہی برتن بیچنے والے کی آواز سنائی دے گی جو جانے کہاں کہاں گزر جائے گی، اس کے بعد آئس کریم بیچنے والا آئے گا، اس کے بعد

پان بیچنے والی گاڑی آئے گی، اس کے بعد ماڈل اسکول میں چھٹی کا گھنٹہ بجے گا اور اس کے بعد

کال گھاٹ میں سہ پہر ہو جائے گی۔

لیکن دیپکر دیر تک املتاس کے پیڑ کے نیچے کھڑے رہنے کے بعد بھی یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔

کھمی دیدی نے اسے اتنا پیار کیوں کیا؟ آج اس نے اس کی ٹھوڑی اور چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر کتنا پیار کیا تھا۔ کھمی

کے جسم سے پھوٹتی ہوئی میٹھی میٹھی خوشبو اب بھی جیسے ہوا میں رچی ہوئی تھی۔ یکایک دیپکر کو ایسا محسوس ہوا جیسے آج کی دوپہر

نہیں تھی۔ آج کی دوپہر پہلے سے زیادہ حسین تھی۔ آج جیسے کتے کی آواز بھی اور دنوں کی طرح کرخت نہیں تھی، نیلے آسمان کی وسعتوں

جو چیلیں اڑ رہی تھیں، وہ چیلیں نہیں تھیں ——— دیپکر کی خواہشیں تھیں، جیسے آج دیپکر کی خواہشیں پنکھ نکال کر اڑ رہی تھیں۔

کر گرا کی یہ دوپہر بھی حسین اور بڑی پیاری پیاری سی لگی۔ ایسا تو کبھی محسوس نہیں ہوا، ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ املتاس کے پیڑ کے نیچے

...میں کھڑے رہنے میں ویچیکر جیسے بڑی تکلیف سی ہوئی اس کے بعد پیڑ پر نگاہ ڈالتے ہی اس نے دیکھا کہ پیڑ پر بیٹھا ہوا کوا ...ے غور سے دیکھ رہا ہے۔ اتنی دیر سے وہ مسلسل کائیں کائیں کر رہا تھا لیکن اب خاموش ہو گیا تھا اور اب اس کی طرف ...ے پہلی ہی بار میں کیا سوچ رہا تھا۔ وہ کوا بھی آج اس کی طرح اکیلا تھا۔

ے آ ــ آ ــ آ ــــ

ویچیکر بات سمجھ کر اُسے دیکھنے لگا۔

کوا پہلے ذرا چوکنا ہو گیا اور اڑنے کے لیے پر تولنے لگا۔ لیکن پھر نہ جانے کیا سوچ کر رک گیا اور پھر ویچیکر کی طرف غور سے ...ے

ویچیکر کو ایسا محسوس ہوا جیسے یہی کوا اس روز اس کی تھالی سے جھپٹ کر بھات لے بھاگا تھا۔ یہی کوا شاید انگوڑ واڈو کے گھر میں ...پڑے ہوئے چاول، کیلا اور سندیش ہر روز کھا جاتا ہے۔ حاجی قاسم کے باغ کے ایک کونے میں ناریل کے کچھ درخت ہیں، شاید یہ کوا ان درختوں پر رہتا ہے۔ اس روز یہی کوا کبوتر کے ڈربے سے انڈا لے کر بھاگ گیا تھا۔ یہ بہت بدمعاش کوا ہے۔ ویچیکر نے بہت ...دیکھا تھا کہ اس کوے کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ اس وقت تک اچھی طرح اس کے پر نہیں نکلے تھے اور وہ دیر تک منہ کھولے ...رہتا اور اتنے میں یہی کوا کہیں سے منہ میں کوئی چیز لاتا اور اس کے منہ میں ڈال دیتا۔ بچے کا منہ لال تھا شاید بہت چھوٹا ... اس کے بعد ایک روز جب وہ باغ میں پھول چننے گیا تو اس نے دیکھا کہ بہت سارے کوے ایک جگہ جمع ہو کر ایک ساتھ ...کائیں کرتے ہوئے ادھر سے اُدھر بھاگتے پھر رہے ہیں۔ تقریباً ایک سو، دو سو اور تین سو کوے جمع ہو گئے تھے۔ پہلے تو ویچیکر کو ...محسوس ہوا تھا اتنے سارے کووں نے صبح سویرے یہ کیسی محفل جما رکھی ہے۔ درختوں کی نچلی شاخوں پر بیٹھے بیٹھے بڑی بے چینی ...سے وہیں کر رہے تھے اور کبھی اڑ کر اس شاخ پر آ رہے تھے کبھی اس شاخ پر جا رہے تھے اور شور مچاتے ہوئے تھے۔

پہلے ویچیکر کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ اس کے بعد اس نے قریب جا کر دیکھا کہ ایک کوے کا بچہ کیچڑ میں چت مرا ہوا پڑا ہے ...ے پر چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں اور اس کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔ آہ! اس بچے کو کس نے مار دیا۔ باز پرندہ ...

اس کے بعد ویچیکر نے اس بچے کو کبھی نہیں دیکھا۔ اس کے بعد یہی کوا اکیلا امرود کے پیڑ کی شاخ پر آ کر بیٹھا رہتا اور کبھی ...کبھی انگوڑ واڈو کے گھر میں گھس کر چاول، کیلا اور سندیش جھپٹ کر لے جانے کی کوشش کرتا۔ ماں کے باورچی ...خانے ... برتن میں منہ ڈال دیتا۔ بھات کی تھالی اور مچھلی کے ٹکڑوں کی طرف آہستہ آہستہ کھسکتا رہتا اور ماں اسے دیکھتے ہی ... کر بھگا دیتی۔

ہش ہش ــــــ

لیکن کوا زیادہ دور نہیں بھاگتا۔ پھر امرود کے پیڑ کی شاخ پر آ کر بیٹھ جاتا اور ادھر اُدھر تانک جھانک کرنے لگتا اور کبھی کبھی ... کائیں کائیں کرنے لگتا۔

ویکی نے اسے پھر کہا

"ارے آ — آ — آ —"

مگر اس وقت مکمل مشکل تھا، وہ کلائی مروڑ کر کے دیکھنے لگا۔

ویکی نے تمام چاکلیٹ آنکھوں میں پھینک دیا —

"کھاؤ نا تو بھی سب کھائے، ہم نے مجھے پرنس سب دے دیا۔ سب تو ہی پیٹ بھر کر کھالے — اب مجھ دیو تمام چاکلیٹ بھی دے گی، مجھے دے دیا کرو نا — آ — آ —"

مگر اسے دیتے دیتے آنسو آنکھوں میں آگیا۔

"مجھے چاکلیٹ کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے دینی تو خود میں پرنس سے آیا کروں گا۔ چاکلیٹ بیٹے سے بھی لے آؤں گا۔ بیٹے سے بھی لے آؤں گا۔ مجھے دے دی ہے بڑی اچھی لگتی ہے۔ یہ سب تو کھانے، تو ہی کھالے یہ سب —"

تمہیں تو مجھے بھی ملنے کا — نئے سو بہت کیوں، بے بو آتی مت جاؤ۔"

"میں دوڑ کر وہ آؤں گا۔" ویکی نے جواب دیا — "میں کل تک اسے ایک ہی دوڑ میں جاکر واپس آؤں گا۔"

"نہیں نہیں طرح گھر کر بادل آسمان میں — اس نے کہا —" ابھی پانی برسنے لگے گا دیکھو رہے گے۔"

ویکی نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ایسا دھندلکا چھایا ہوا تھا کہ معلوم ہوتا تھا رات کے چار بجے ہیں۔ مندر میں گھنٹے بجنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ چندی بابا کے مندر میں پوجا شروع ہو چکی تھی۔ چندی بابا کے گھر میں دھاگے کی پوجا ہو رہی تھی۔ وہ موقع پر دلچسپی کی نہیں ہوتی تھی۔ صرف جنم اشٹمی کے موقع پر بڑی دھوم دھام ہوتی تھی اور ویکی کتنی ہی بار جنم اشٹمی کے دن جاکر ناشتہ کیا تھا۔ اس روز وہاں جو بھی جاتا تھا اسے بتاشہ پرشاد دیا جاتا تھا۔

جس روز وہ گھاٹ اسکول میں ڈرامہ دیکھ کر وہ گھر لوٹا تھا، رات زیادہ ہو چکی تھی۔ بڑی رات گئے ڈرامہ ہوا تھا اور ڈرامہ دیکھ کر جب وہ گھر لوٹ رہا تھا تو اس چندی بابا کے مندر کے پاس اس نے مورت دیکھا تھا۔

"ہائے رام اصلی زندہ مورت — —"

ویکی نے بڑے ہونے کے بعد دنیا میں بہت سے مورت دیکھے تھے لیکن اس روز جو مورت اس نے دیکھا تھا اس کی مثال نہیں۔

اس وقت ویکی کے کانوں میں ڈرامہ کے مکالمے گونج رہے تھے اور اسے پرانے ... کی سنائی ہوئی کہانی یاد آگئی تھی۔ ست جگ سے بھی آگے کا زمانہ تھا جب دنیا میں کوئی مذہب نہیں تھا۔ ... نہیں تھی۔ سبھی مذہب کی پناہ میں ایک دوسرے کی بھلائی کرتے تھے۔ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ اس کے بعد ایک ... نے جنم لیا ... اور ...

نیتی ہموئی اور اس کے ساتھ ہی رشتے اور تعلق کی بنیاد پڑی۔ لوگوں کی عام عقل چھن گئی، وید ناپید ہو گیا اور لوگوں نے پوجا دینا بند کر دیا۔ ان دنوں دیوتا پوجا کے نذرانے کھا کر زندہ تھے، وہ سب فاقے کرنے لگے۔

اس حالت کو دیکھ کر تمام دیوتاؤں نے برہما کے پاس جا کر دربار کیا۔

برہما نے کہا ——— تم لوگ وشنو کے پاس جاؤ، وہ اس کا تدارک کریں گے۔

آخر کار تمام دیوتا وشنو کے پاس گئے۔

بولے ——— دنیا کے لوگ اب پوجا نہیں کرتے، وید نہیں پڑھتے، اب ہم لوگ کیا کھا کر زندہ رہیں گے، آپ اس کا تدارک کیجیے۔

وشنو نے جواب دیا ——— تم لوگ اپنے گھر جاؤ، میں اس کا انتظام کرتا ہوں۔

آخر کار اس کا انتظام ہو گیا۔ کیا انتظام؟ وہ یہ کہ انھوں نے دنیا میں ایک راجہ کی تخلیق کی۔

بولے ——— اب اور کسی فکر و تردد کی ضرورت نہیں، اب یہی راجہ تمام لوگوں پر حکومت کرے گا، جو برہمن، فقیر، سادھو اور سنیاسی ہیں ان کی پرورش کرے گا۔

اس طرح پرتھو راجہ کی تخلیق ہوئی، دنیا میں امن لوٹ آیا، مسرت لوٹ آئی، مذہب لوٹ آیا، سب کچھ واپس آگیا اور دنیا والے پھر امن و سکون کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگے۔

تیس سال بعد پھر ایک وشٹی آیا۔

کرن بھی ڈرامہ دیکھ کر اس کے ساتھ ہی واپس آرہا تھا۔

اس نے کہا ——— جانتے ہو دیپو، انگریز ہی ہمارے سب سے بڑے دشمن ہیں، ان لوگوں کے جاتے ہی دیکھو گے ہم سب برابر ہو جائیں گے، اس وقت کوئی بھی چیز خریدنے کے لیے روپیہ کی ضرورت نہیں رہے گی، دیکھ لینا ———

دیپو نے کہا ——— "تم سے کس نے کہا؟"

"میں جلسے میں جا کر سن آیا ہوں۔" کرن نے جواب دیا ——— "اس جلسے میں ایک آدمی کہہ رہا تھا کہ ہمارے ملک میں بہت ... سب ہم لوگ اپنی محنت سے پانی سے نمک تیار کریں گے ——— اب نمک خریدنے کے لیے پیسہ نہیں دینا ہوگا۔"

دیپو نے پوچھا ——— "تمہیں اتنا نمک کیا ہوگا؟"

کرن نے جواب دیا ——— "اصل چیز تو نمک ہی ہے، کسی کسی دن میں صرف نمک بھات کھا کر ہی اسکول جاتا ہوں، صرف نمک بھات، جس دن نمک نہیں ہوتا ہے، میں بھات کھا ہی نہیں سکتا ———"

"تمہارے بابا اب تک اچھے نہیں ہوئے؟" دیپو نے پوچھا۔

کرن نے جواب دیا ——— "صبر کرو، اچھے سوراج ہو رہے، اب تو زیادہ دیر بھی نہیں ———"

سوراج کس طرح آئے گا یہ کرن کو بھی معلوم نہ تھا۔ وہ پارک میں جا کر تقریر سنتا اور جو کچھ سنتا آ کر دیپو سے کہہ دیتا۔ تقریر

...کی طرح شی آیا تھا اس کا خوف کم ہو گیا تھا اور دکان دار جو ... سادہ تھا اور اس کی طرف [illegible]
... سمجھتا تھا۔ اس کا رنگ گورا تھا لیکن میلے کچیلے کپڑوں میں اس کی رنگت ہمیشہ ڈھکی رہتی اور جب کبھی [illegible]
... ہوتا تھا تو بہت ہی بھلا دکھائی دیتا تھا۔

اس روز لیمو دیکھنے کے بعد ویکٹر بھی پہاڑ کے راستوں پر چلتے ہوئے دونوں گاؤں تک پہنچے تھے [illegible]
... گھروں فرسنگ میں تھا۔ یہاں سے کچھ دور سڑک جاتی تھی اور ویکٹر کو سیدھے گھر کی طرف آنا تھا [illegible]
... کہیں بھی کسی ایک آدمی کا بھی پتہ نہیں تھا۔

کھڑا رک گیا۔

"ہو ۔۔۔ اب تم یہاں سے چلے جاؤ گے؟"

"ہو جاؤں گا۔" ویکٹر نے جواب دیا۔

"ڈر نہیں لگے گا؟"

"نہیں۔ ڈر کیسا؟" ویکٹر نے جواب دیا۔

"اچھا تو اب میں گھر جاتا ہوں ۔۔۔"

کہہ کر وہ چلا گیا تھا۔ ویکٹر نے ایک بار سامنے کی طرف دیکھا۔ سامنے نخلستان پر گھیس بتی شمار ہو چکی تھی اور گھیس [illegible]
... تھا جیسے ایک ہی ریشہ گھلا ہو۔ یکایک اسے پھر ڈاکٹر کے مقالے یاد آ گئے۔ چند لمحوں کے بعد وہ بھی اس
دنیا میں پہنچ گیا۔ اس نے کہا ۔۔۔

اے تم نے غریبوں کی دولت چھین لی: راجہ اگر چوری کرے
میں نے سنا ہے اس دنیا کا بھی ایک راجہ ہے ۔۔۔ تمہاری
کہ وہ تمہارا انصاف کرے گا؟

ڈاکٹر کے مقالے اسے اچھی طرح یاد نہیں تھے۔ واقعی راجہ تو راجہ ہے۔ دنیا کا راجہ۔ وہ تمام مجرموں کا انصاف کرتا
ہے جو مجرم کو سزا دیتا ہے گناہوں کو معاف کرتا ہے: تو یہ دنیا کا راجہ اگر نا انصافی کرے ۔۔۔ اس کا انصاف کون
کرے گا؟

یکایک اسے ایسا محسوس ہوا جیسے چبوترے یا ایک مکان کے قریب! باغ میں کوئی چیز حرکت کر رہی ہو۔

کیا ہے؟ وہ کیا ہے؟

وہ جگہ بالکل تاریک تھی اور باغ کے قریب تاریکی اور بھی گہری اور بھی دبیز ہو گئی تھی: وہ اب ایک دھندلا سا [illegible]
سکتا تھا۔ لیکن ویکٹر کی حالت ایسی ہو گئی تھی جیسے اس کے دونوں پاؤں زمین میں دھنس گئے تھے اور اس کے [illegible]
کھڑے ہو گئے اور وہ سر سے پاؤں تک کانپنے لگا ۔۔۔

"کیا ہے وہاں پر وہ کیا ہے ؟"

"مجھے ایسا لگا جیسے ایک بھوت دانت نکالے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہا ہے اور سر جھکا جھکا کر ہنس رہا ہے اور اس کی خاموش ہنسی رات میں گونج رہی ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ وینکٹر کا سارا جسم برف کی طرح سرد ہو گیا۔ وہ اپنی پوری طاقت سے چیخنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی چیخ حلق میں اٹک گئی اور وہ سایہ تاریکی میں ڈوبا ہوا اور بھی زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔ ایسا لگا جیسے اس کی خاموش ہنسی کی صدائے بازگشت سے اینٹوں کی گلیوں میں چھایا ہوا دبیز تاریکی کا پردہ تار تار ہو گیا ہو۔

ماں جاگ رہی تھی۔ باہر قدموں کی چاپ سنتے ہی اس نے دروازہ کھول دیا۔

"کون، بکو کا تم آگئے ؟ اتنی رات ہو گئی ؟"

لیکن وینکٹر کا چہرہ دیکھ کر ماں کو بڑی حیرت ہوئی۔ وینکٹر کی زبان جیسے گنگ ہو گئی تھی اور اس کا سارا جسم پسینے میں تر تھا۔ گھر کے اندر داخل ہوتے ہی وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر ماں سے لپٹ گیا۔

"کیا ہوا، تمہیں کیا ہو گیا ؟"

وینکٹر نے کہا ـــــ "ماں، میں نے بھوت دیکھا ہے۔"

"بھوت !"

ماں کو بے حد تعجب ہوا۔ وینکٹر کو تخت پوش پر بٹھا کر پیچھے سے ہوا کرنے لگی۔ ڈرامہ دیکھنے گیا تھا یا کیا دیکھنے گیا ... ہوا !

"تم نے ڈرامہ دیکھا ؟" ماں نے پوچھا۔

وینکٹر نے ہانپتے ہوئے جواب دیا ـــــ "ڈرامہ دیکھ کر آ رہا تھا کہ بیچ میں چنڈی بابو کے مکان کے کونے میں کھڑا ہوا ایک بھوت دیکھ کر بھاگتا ہوا آیا ماں ـــــ"

ماں ہنسنے لگی۔

"پگلا ـــــ ڈر، پتہ نہیں تم نے کیا دیکھ کر کیا سمجھ لیا۔ بھوت وھوت کا کوئی وجود نہیں۔ کہاں ہے بھوت ؟ بھوت اصل ہوتی ہی نہیں، اتنی عمر ہو گئی پھر بھی بھوت سے ڈرتے ہو ؟"

وینکٹر نے کہا ـــــ "نہیں ماں، میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا ہوں۔ میری طرف دیکھ دیکھ کر بھوت ہنس رہا تھا۔ تم چلو تمہیں بھی دکھا دوں گا ـــــ"

"اچھا تو پھر چلو، تمہارا بھوت کہاں ہے میں بھی دیکھ لوں۔"

اس دن رات میں ماں وینکٹر کو ساتھ لے کر نکل پڑی تھی۔ اس وقت رات کے بارہ یا ایک بجے ہوں گے۔ سب لوگ کب کے سو چکے تھے اور چاروں طرف گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ راستے سنسان تھے۔ چنڈی بابو کے مکان کا تیس نمبر تھا۔ تیس نمبر ... گو ... کے اندر جو ... تھی وہ جنم اشٹمی کے موقع پر میلہ دیکھنے کے لیے کتنی ہی بار چنڈی بابو کے مکان میں جا چکا تھا۔ بہت

ت تھی لیکن باہر سے اتنی بڑی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ عمارت کے اندر گنبد کے دالان کے صحن میں ...
ں میں سرخ نیلے اور زرد تھے۔ آخر سیڑھیاں بنا کر کمرہ دریاں بچھی تھیں اس مندر کی کے اندر تل میں
ے کی دکان مکمل ہو گئی اور بھجن وغیرہ سے بھر جاتا اور صحن کے چاروں طرف کرشن لیلا کی مورتیاں سجا دی جاتیں۔ بہت سلیقہ
ں ہوتی اور مورتیوں کو دیکھنے جب تبرے کے پیچھے جا کر ابھر جاتا ایک الماری کے حجرے پر رادھا کرشن کی دو مورتیاں
ں ہوتیں اور پیسے بھی پھینکتے اور پھولوں کر دوں پر ایک ایک بتاشہ پرشاد تھا۔

گنبد کے دن چندری بابا کے مکان میں بڑی بھیڑ لگی رہتی اور اس کے بعد ساری بازی جما کر بیٹھ جاتا اس کے سب سنگم
ں بیٹھے تھے۔ سونے صحن میں اس مکان کے دو چار بچے اڑا اڑا کھیلتے رہتے ایک مرتبہ اسی چندری بابا نے اسے اپنے گھر

ال دیا تھا۔

اس وقت اس کی عمر اور بھی کم تھی اور وہ دھرم داس ... ہائی اسکول میں پڑھتا تھا۔ بہرائی پور میں ... ایک اتوار
اسے چھ بجے کا وقت تھا اور وہ کسی کے ساتھ ... پارک سے کچھ بہت دور نکل گیا تھا اور تقریباً پرانا بازار کے قریب چھ
اور وہاں پر ... بال پیچ ... وہاں سے ... دیکھ کر وہ واپس آ رہا تھا اس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے۔
ے ہیبت ناک ہو رہا تھا جیسے ... ہونے والا ہو۔

گئے اپنے مکان کا ... محسوس ہوا تھا اور ... راستے میں جتنے لوگ تھے وہ بھی ... تھے اور
بے تحاشہ ادھر ادھر بھاگنے لگے تھے۔

• بھاگو ... کر ... اور ... دوڑ پڑے۔
اور اس کے ساتھ ساتھ ... بھاگ کھڑا ہوا۔
راستے میں ہر طرف بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔

اس کے بعد پھر ایک دھماکہ ہوا اور اس نے دیکھا کہ ایک ... کا آدمی جو سائیکل پر جا رہا تھا سائیکل سے نیچے گر پڑا اس کے
پیچھے ایک اور آدمی سائیکل پر سوار تھا اس کے سینے میں ... گولی لگی اور وہ بھی زمین پر آ رہا اور ... کے قریب ہی ڈھیر ہو گیا اور
جب وہاں لوگوں کے ... سے ... لگے! یہ سب دیکھ کر دونوں بدحواس ہو گئے اور پھر بے تحاشہ بھاگنے لگے!
وہ ... پشت ... سے دوڑتے ہوئے ... کے ... پر ... دیر کے لیے رک گئے ... اس کا دم ... نے
اور وہ دونوں بری طرح ہانپنے لگے تھے۔ اور اس وقت ... بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔

ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا اور بولا
"بسنت چندری کو مار ڈالا گیا ——"
"کس نے مارا؟"
"سورماؤں نے!"

...دونوں اتنا ہی جانتے تھے۔ بسنت چیٹرجی کو مارا تھا اسے کس نے مارا؟ یہ سب کچھ وہ نہیں جان سکے۔ جس کو بعد میں بھی موقع ...تھا۔ بھاگ رہا تھا۔ وہ دونوں وہاں پر بھی ٹھٹک گئے۔ پھر بھاگ کھڑے ہوئے اور دوڑتے دوڑتے دھیشور گنگولی لین میں آ کر ...راستے میں ان دونوں نے دیکھا کہ مخالف سمت سے ایک آدمی سائیکل پر چلا آ رہا ہے۔ اسے دیکھ کر دونوں گھبرا گئے —

...وہ ہمیں پکڑ لے گا؟

کرن نے کہا — "بھاگ چلو رے —"

سامنے ہی چندی بابو کا مکان تھا۔ اس بلڈنگ کا بڑا گیٹ کھلا ہی تھا۔ کرن دوڑ کر اندر چلا گیا اور اس کے پیچھے پیچھے وجنکر ...گھس گیا۔ اتنی ہی دیر میں سارے کلکتہ میں یہ خبر پھیل چکی تھی کہ پولیس کے ڈپٹی کمشنر بسنت چیٹرجی کو سودیشیوں نے گولی مار کر ...

...چندی بابو بوڑھے آدمی تھے۔ وہ اس وقت ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے حقہ پی رہے تھے۔

انھوں نے چیخ کر کہا — "رام دھنی گیٹ بند کر دو۔"

رام دھنی کہیں دوسری طرف تھا۔ وہ دوڑتا ہوا آیا اور گیٹ بند کرنے ہی جا رہا تھا کہ یہ دونوں اندر گھس پڑے۔

چندی بابو ان دونوں کو دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر تنے اور بولے

"گیٹ آؤٹ — گیٹ آؤٹ — گیٹ آؤٹ —"

...مجھے آج بھی یاد ہے۔ اس روز چندی بابو کو دیکھ کر وجنکر اور کرن شام کے اندھیرے میں غیر محفوظ حالت میں ان کی پناہ ...میں مانگنے گئے تھے۔ دو معصوم بچوں کو اس روز چندی بابو نے پناہ نہیں دی تھی۔ شاید انھوں نے ان دونوں کو قسمت کے حوالے ...کر دینا اطمینان کر لیا تھا۔ لیکن ان کی قسمت کے حوالے والے نے آخر کار خود انھیں بھی زیادہ دنوں تک زندہ رہنے نہیں

لیکن یہ بہت دنوں بعد کا واقعہ ہے۔

اس روز بھی اسے اسی چندی بابو کے مکان پر جانا تھا۔ راستے بالکل سنسان ہو چکے تھے۔ دور دور تک ایک آدمی کا بھی پتہ ...وجنکر کو ساتھ لیے ہوئے تنگ گلیوں سے نکلی۔ شیتلا تلہ کے بعد ایک موڑ تھا اور اس کے بعد ہی چندی بابو کا مکان تھا۔ مکان کے ...سامنے ہی وہ باغ تھا۔ وجنکر کو چاروں طرف دیکھ دیکھ کر اس وقت بھی خوف محسوس ہو رہا تھا۔

میں نے کہا — "ڈرنے کی بات نہیں، میں تو تمھارے ساتھ ہوں۔ آؤ۔ کہاں ہے تمھارا بھوت کہاں ہے؟"

وجنکر نے جوں ہی سامنے نظر اٹھائی، کسی چیز پر نظر گئی۔ اس وقت وہاں پر اندھیرا تھا۔ اندھیرے میں وہ بھوت ابھی تک ...کھڑا ہنس رہا تھا۔ ٹھیک اسی طرح دانت نکالے ہوئے قہقہے لگا رہا تھا۔

وجنکر نے کہا — "وہ دیکھو، وہ رہا —"

میں نے بھی چند لمحوں تک غور سے دیکھا۔ اس کے بعد ادھر ادھر نگاہ دوڑا کر اچھی طرح جائزہ لیا۔

وجنکر نے کہا — "دیکھ لیا! میں نے کیا کہا تھا —"

"اچھا تم ہی چلی جاؤ" ——— اس نے جواب دیا۔
شاکر اس چبوترے سے اتر کر گیٹ کی سمت چل گئی۔ گیٹ کے بائیں جانب ایک کمرہ تھا جو کسی وقت اسٹور تھا۔ مگر گیٹ کے اوپر بتی جل رہی تھی۔ اس کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ سبھی لوگ گہری نیند میں تھے۔ اتنی رات گئے کون جا سکتا تھا۔

اس نے آواز دی ——— "سام دھنی! اے سام دھنی ——"

چند لمحوں کے بعد اس نے پھر آواز دی ——— "سام دھنی! ایک بار باہر آؤ تو ——"

سام دھنی باہر نکلا اور باہر آتے ہی اس نے پوچھا ———

"کون؟"

اس نے جواب دیا ——— "میں دیپو کی ماں ہوں۔ تم ذرا اپنے باغ کی بتی جلا دو تو۔ باغ کی بتی ایک بار جلاؤ گے بابا؟"

سام دھنی پرانا آدمی تھا۔ ماں بھی قدیم باشندہ تھی۔ سام دھنی نے اندھیرے میں بھی اس کو پہچان لیا۔

پوچھا ——— "کون؟ دیپو کی ماں؟ کیا چاہیے دیپو کی ماں؟"

"ذرا باغ کی بتی ایک بار جلاؤ گے سام دھنی؟" ماں نے جواب دیا ——— "ذرا بتی جلا دو تو ——"

سام دھنی نے سوچا اور باغ کی بتی جلا دی اور دوسرے ہی لمحہ اس طرف اجالا پھیل گیا۔ ماں نے دیکھا اور ساتھ ہی دیپو نے بھی دیکھا۔ باغ میں ایک چبوترے کے اوپر بانس کی ایک موٹی لکڑی کھڑی تھی اور اس کے اوپر ایک ہیٹ رکھا ہوا تھا اور ایک مٹی کی ہنڈیا بندھی ہوئی تھی اور دونوں میں ایک لباس پہنا دی گئی تھی۔ بندروں کو بھگانے کے لیے ایک آدمی کی مورتی بنا دی گئی تھی۔ ہوا میں آہستہ آہستہ جھٹ ڈول رہا تھا اور قمیص کے کپڑے میں ہوا بھری ہوئی تھی۔ واقعی کتنی حیرت کی بات تھی۔ دیپو اس راستے سے دن کے وقت کئی بار گزرا تھا لیکن اس نے اس پر دھیان ہی نہیں دیا تھا۔

ماں نے سام دھنی سے کہا ——— "اب تم بتی بجھا دو سام دھنی۔"

اس کے بعد دیپو سے بولی ——— "دیکھ لیا؟ یہ کیسا بھوت ہے دیکھ لیا؟"

اس روز آنکھیں ماں نے کھول دی تھیں۔ اس نے اس بات کا ذہن پر سے خوف دور کر دیا تھا کہ دنیا میں بھوت کا کوئی وجود نہیں ہے۔ انسان ہے جو ——— بھوت پریت، وہ اس کا اپنا وہم ہوتا ہے۔ لیکن دیپو جیسے جیسے بڑا ہوتا گیا اسے اس بات کا یقین ہو گیا کہ ان بھوتوں کے بارے میں ماں پوری واقفیت نہیں رکھتی۔ ممکن ہے کسی زمانے میں بھوت کا کوئی وجود نہ رہا ہو لیکن اس کے بعد بھوت وجود میں آ گیا تھا۔ شعور نے زمانے میں جنم لیا تھا اور اس کے بعد انسان کی دنیا میں ان گنت بھوت پیدا ہوتے رہے تھے۔ ان کا چہرہ، ان کا لباس، پوشاک سبھی کچھ انسانوں کی طرح تھا لیکن وہ اصل میں سب انسان نہیں تھے۔ وہ سب بھوت تھے اور ——— انسانوں کا روپ دھار کر انسانوں کے سماج میں گھومتے پھرتے رہتے تھے اور موقع ملنے پر انہیں ڈراتے رہتے تھے اور جب ضرورت پڑتی، انسانوں کا خاتمہ کر دیتے تھے۔ دیپو کے لیے یہ ایک حیرت انگیز تجربہ تھا۔

اس دن وہ شام کے باغ سے جلدی جلدی پھول چن کر وہ مندر کی طرف دوڑ پڑا تھا۔ پہلے ماں کے مندر میں گیا تھا۔ ماں کے مندر میں مہادیو کے بعد کو پھول دینے کے بعد سے سیتا، رادھا، گنیش، جگن ناتھ، شری کرشن اور اس کے بعد شیو کے مندر میں پھول دیا تھا۔

دیکھئے کا ——— پنڈت جی ذرا جلدی سے پھول لے لیجیے، بہت زور سے پانی آ رہا ہے۔"

واقعی آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ناگ مندر کی چھت کے اوپر سیاہ بادلوں کا اجتماع تھا۔ اس کے بعد چبوترے پر سے ٹھیک کر مندر کے گرد گھوم کر گلی کے اندر سے کنڈو پر گھر کے دروازہ تک جانے کا راستہ تھا۔ دوسری طرف جہاں کھلے رہتی تھی، پیڑے کی دکان تھی جس کے اندر پیڑے بنتے تھے۔ اس کے بعد پورب رخ کا دروازہ تھا۔

اس وقت تک مندر میں کافی بھیڑ جمع ہو گئی تھی۔ بڑی بڑی کاریں لگی ہوئی تھیں اور کاروں سے اتر کر گوری گوری زنانیاں اور بڑے چھوٹے مارواڑی مرد ننگے پاؤں مندر میں آ رہے تھے اور ان کے پیچھے پیچھے بھکاریوں کی ٹولی لگی ہوئی تھی۔ ان کا لباس صاف ستھرا اور قیمتی تھا اور سرخ و سپید چہرہ! ان کے اندر لڑکیاں بھی تھیں۔ وہ پنڈت کو بہت زیادہ دان دیتے تھے اور اسی سے پنڈت جی ان کی بڑی خاطر و مدارات کرتے۔ اس کے برعکس وہ دینکر کی کوئی خاطر نہیں کرتے تھے کیونکہ دینکر انہیں ایک پیسہ بھی سلامی نہ دیتا تھا، صرف پھول دینے سے بھی کہیں ان کا پیٹ بھرتا ہے؟

یکایک بارش کی دو چار بوندیں ٹپ ٹپ اس کے جسم پر گر پڑیں۔

دینکر برآمدے کے نیچے آ کر کھڑا ہو گیا۔ یہاں پر اس کا سر بھیگنے سے محفوظ رہے گا اور خود بھی نہیں بھیگے گا۔ ٹکٹکی دیدی کا ندھ اس کی سیدھ میں تھا۔ وہاں پر کھڑے ہو کر جہاں تک اس کی نگاہ جا سکتی تھی وہ متجسس نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ بارش ہو رہی تھی۔ شاید وہ بھلا آدمی بارش کی وجہ سے نہیں آ رہا ہے یا ممکن ہے کہ ابر آلود آسمان ہونے کی وجہ سے وقت کا صحیح اندازہ نہ ہو سکا ہو یا وہ خود آج وقت سے پہلے تو نہیں آ گیا؟ سات بج چکے ہیں کیا؟ اس طرف پیڑے کی دکان میں ایک دیوار گھڑی ہے اور بس وقت دیکھنے سے پتہ چل جاتا!

دینکر سر کو بھیگنے سے بچاتے ہوئے دکان کے مقابل آ کر کھڑا ہو گیا اور گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ سات بج کر بیس منٹ ہو گئے تھے۔ دوسرے دن کی نسبت آج دیر ہو گئی تھی۔ اب تک تو آ جانا چاہیے تھا۔ وہ بھلا آدمی اسی وقت تو آتا تھا۔ لیکن اس کا چہرہ بہت خوبصورت ہے۔

کبھی کبھی وہ بھلا آدمی پہلے ہی سے آ کر کھڑا رہتا تھا۔

دینکر کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی۔

"آ گئے کھوکا؟"

دینکر جیسے خوشحال ہو کے رہ جاتا۔

"لیجیے ———

کی بات سے متاثر ہو کر وہ پاکٹ سے خط نکالتا اور دیکھ کر اس کو پڑھنے لگتا ... شروع ہو گیا ایک سرے سے جاتا۔ اس کا رنگ صاف تھا اور وہ لمبے قد کا تھا۔ شیشے میں دیکھتا رہتا ... کو دیکھتا تھا خط پڑھتے پڑھتے جیسے سگریٹ کا پیکٹ نکالتا اس میں سے سگریٹ نکالتا اور ایک لمبا کش لے کر دھواں اگل دیتا۔ وہ ایک ہی خط کو بار بار پڑھتا۔ ایک بار پڑھ لینے کے بعد دوبارہ پڑھتا۔ دوبارہ پڑھ لینے کے بعد سہ بارہ پڑھنے لگتا۔ کبھی دیر تک اپنے خط میں کیا کچھ لکھا تھا کو دہراتے۔ کبھی کبھی جب دیر ہو جاتی تو وہ ٹیکسی پر سوار ہو کر آتا اور ٹیکسی سے اتر کر وہ ٹھہرتا۔ دینکر کے پاس آکر اس سے خط لے کر پڑھنے لگتا۔ وہ دیر تک خط کو بار بار پڑھتا رہتا اور دینکر بات میں ایک کو ذرہ جیسے بوسے بخت کی طرح گزارتا رہتا۔

آخری بار خط پڑھ کر وہ سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر کہتا ___

• گڈ بائے ___

اتنا کہہ کر وہ سیدھا تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چلا جاتا۔

اس کے بعد دینکر آہستہ آہستہ کنڈور گھر کے جنوبی سمت سے ہوتا ہوا خورشید لنگرالی کی طرف چل پڑتا۔ جب تک وہ خط پڑھتا رہتا، دینکر کو بہت اچھا لگتا۔ وہ دینکر کی طرح بنگالی نہیں بول سکتا تھا۔ پتہ نہیں کون ذات تھا۔ لیکن کچھ مختلف قسم کا تھا۔ اس کی شکل کسی سے بھی نہیں ملتی تھی۔ کالی گھاٹ میں ایک آدمی بھی ویسا نہ تھا۔ مرد سودوں کی دہلیز پر بیٹھ کر جو لوگ اڈہ مارتے تھے جیسے مسرسودوں کے نیچے بیٹھا اور دوفی کاکا وغیرہ وہ بھی اس جیسے نہیں تھے۔ مدھو داس ٹرسٹ ہائی اسکول کے پرنسپل بھی اور ویسے دیسے نہیں تھے۔ پھر برٹش پارک میں تقریر سننے کے موقعہ پر جن لوگوں کو دیکھا تھا وہ بھی ان لوگوں کی طرح بھی نہ تھا۔ وہ انگریزوں سے زیادہ خاص تھا۔ گلی کے پہلی طرف جو اُدھر کی سمت جو بڑے بڑے صاحبوں کی کوٹھیاں تھیں وہ ان ہی کی طرح تھا۔ چندو بابو بھی بڑے آدمی تھے۔ چندو بابو کے یہاں دربان تھا، منشی، موٹر اور گاڑی تھا۔ لیکن ان کے گھر کے لوگوں کا چہرہ بھی ویسا نہیں تھا۔ بھوانی پور میں کچھ لوگوں کا چہرہ ایسا ضرور تھا۔ دینکر نے بڑا بازار میں فٹ بال میچ دیکھتے وقت بھی لوگوں کو دیکھا تھا۔ جس روز پولیس کے ڈپٹی کمشنر بسنت ہیڈی کا خون ہوا تھا، اس روز دینکر نے اسی قسم کے چہرے والے آدمیوں کو دیکھا تھا۔ مگر وہ کرشن نگر پیڑے ہوئے نہیں تھے۔ ادھی کا کتا پہنے ہوئے تھے۔ ان کا رنگ بھی گورا تھا۔ وہی موٹی بھی اور ہاتھ میں سگریٹ تھا۔ اس کے بعد وہاں سے وہ ہو کے ہوتے ہی وہ دونوں وہاں کے قریب بھاگتے ہوئے اور ... کی بستی کی طرف چلے گئے تھے۔

دینکر کو یاد ہے

اس روز وہ شخص دیدی کا خط لے کر دوبارہ آ کر بیٹھ کر ان روز آتا ہوا اس کے پاس آیا اور پوچھتے ہوئے بولا ...

– غضب ہو گیا دینکر ___

یقیناً کرن کے بابا مر گئے ہیں۔ وینکر خاموشی سے کرن کا چہرہ تکنے لگا۔
"میں تمہارے ہی پاس جا رہا تھا۔" کرن نے کہا
"کیوں، کیا ہوا؟"
کرن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔
وینکر نے پوچھا ——— "تمہارے بابا مر گئے ہیں کیا؟ کب؟"
"نہیں۔" کرن نے جواب دیا ——— "اخبار میں خبر چھپی ہے بھائی۔ سی۔ آر۔ داس قضا کر گئے ——— اب کیا ہوگا؟"

سی۔ آر۔ داس قضا کر گئے۔ کیا ہوگا؟ کرن کو کتنی امیدیں تھیں، اسے امید تھی کہ سی۔ آر۔ داس راجہ بن جائیں گے! لیکن اب کیا ہوگا، کرن کا چہرہ کیسے مرجھا گیا تھا۔ کرن گونگے کی طرح وینکر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

کرن نے کہا ——— "سادھو نے تو کہا تھا کہ سی۔ آر۔ داس اس ملک کے راجہ ہوں گے۔"

وینکر کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا جواب دے۔ وہ بھی چپ چاپ کرن کا منہ تکنے لگا۔ کرن کی نگاہوں میں ساری دنیا بے نور ہو گئی تھی، اگر راجہ ہی مر جائے تو کرن کی حالت کیسے بہتر ہوگی۔ کرن کے بابا کی حالت کیسے سدھرے گی۔ تو کیا ... عام عمر جینا یہی ہوگا؟ تمام عمر بھیک مانگنا پڑے گی؟ پھر اس کا مکان کیسے بنے گا؟ پھر سوراج کیسے ہوگا؟ اس روز کرن ... مسائل کا کوئی حل نہ پا کر جیسے یکدم مایوس ہو گیا تھا۔

بہت دیر تک چپ بیٹھنے کے بعد وینکر نے پوچھا
"اسکول نہیں جاؤ گے؟"
"اسکول میں آج چھٹی ہے۔" کرن نے جواب دیا ——— "کل بھی چھٹی رہے گی ———"
اس کے بعد قدرے رک کر بولا ——— "کل کیوڑا تلا میں سی۔ آر۔ داس کو دفنائیں گے، تم دیکھنے جاؤ گے بھائی؟"
"جاؤں گا۔" وینکر نے کہا ——— "ہم دونوں ایک ساتھ چلیں گے ———"
کرن نے کہا ——— "ذرا سویرے ہی چلیں گے نہ بھئی، ورنہ کیوڑا تلا میں بڑی بھیڑ ہو جائے گی۔"

اس روز گھر لوٹتے ہی وہ سب سے پہلے کسی ریڈی کے پاس گیا تھا۔ خیال مشپارڈ اسٹریٹ کے موڑ پر مدراسیوں کی دکان پر بہت زیادہ بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ اخبار زمین پر پڑا ہوا تھا۔ سبھی پڑھ چکے تھے اور اب اس مسئلہ پر بحث کر رہے تھے۔

وینکر ایک منٹ کے لیے وہاں پر رک گیا۔ محلے کے لوگ وہاں پر جمع تھے جن میں دونی کاکا کی عمر سب سے زیادہ تھی۔ دونی کاکا کہہ رہے تھے ——— "مر گئے تو اچھا ہی ہوا۔ یہ سب پرخر دو خرافات کا کیا فائدہ ہوتا بھائی؟ یہ خرافات کرتا ... رہتا ہے؟ یا یہ خرافات کر کے ہر کوئی زندہ رہتا ہے؟ بولو مجھے سمجھاؤ۔"

مدراسیوں کے بڑے ... نے کہا ——— "گاندھی جی دیوانے ہو گئے۔ بچے دونی کاکا، گاندھی کی بات پر ... کرنے والا

اب کوئی نہیں رہا۔"

بچو دا کھڑے تھے، انھوں نے کہا ——

"یہ کاندی بچاندی کا دہ نہیں ہے بلکہ ایک بنگال تھا وہ بھی چلا گیا۔ ابھی آپ لوگ نہیں سمجھ سکتے یہ بات، لیکن آپ کو کبھی نہیں آئے گی، بعد میں سمجھیں گے —— دانت رہتے ہوئے تو لوگ اس کی قدر نہیں کرتے ——"

پچھلے دا بھی ایک طرف کھڑے تھے، انھوں نے کہا ——

"اب کیا ہے۔ ایم۔ سیمو گپتا ہی کا بھروسہ ہے۔ سب ہماری دولت وہی ہے ——"

بچو دا نے ان کی بات اچک لی، بولے ——

"اسے رہنے دو، رہنے دو، کس کے ساتھ کس کا موازنہ کر رہے ہو! وہ جو کچھ ہیں ٹھیک ٹھیک جانتے ہیں۔"

مدھو سودن کے چھوٹے بھیا نے ان کی بات کاٹ دی

"دیکھا جائے، باہر سوباش بوس کیا کرتا ہے ——"

دونوں کالا کی معلومات بہت وسیع تھیں، ان کے دلائل کے سامنے بڑے بڑوں کی منطق دھری کی دھری رہ جاتی۔ لیکن دونوں کالا نے دنیا کو اپنے دلائل سے مات دے دینے میں استاد تھے، وہ صرف پرستش گزرنے کے عادی تھے۔

انھوں نے کہا —— جس کا نام لی چیا اس کا نام کُشل، وہ تمہارے سوباش بوس جہاں بھی ہے، ایم۔ سیمو گپتا ایک گولی میں سب ختم ہو جائیں گے ——"

ان کی باتیں دیپنکر کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ اس قسم کے مباحثے تو بار بار ہوتے رہتے تھے۔ بیٹھے بیٹھے ہوتے رہتے ہیں سن سن کر... وہ یہ سوچنے لگا کہ ان کو کوئی بھی تو نہیں مار رہا تھا، پھر وہ کس طرح کوئی بھی تو ڈھال اور پریشان نہیں تھا! دیپنکر اسی لیے متعجب ہوا تھا!

دیپنکر وہاں سے چلا آ رہا تھا کہ اتنے میں بچو دا نے آواز دی

"اے دیپو، سنو تو، اس طرف آ کر سن جاؤ ——"

دیپنکر کے قریب جانے پر بچو دا نے پوچھا ——

"اے، تمہارے مکان میں کون کرایہ دار آیا ہے؟"

"لکھی دیدی وغیرہ۔" دیپنکر نے جواب دیا۔

"لکھی دیدی وغیرہ، جو لڑکی بس میں بیٹھ کر اسکول جاتی ہے، ہیڈ مسٹریس پڑھتی ہے؟ میں نے دیکھا ہے، وہ... ہے، اس کے باپ کیا کرتے ہیں، پیشہ کیا کرتے ہیں؟"

دیپنکر نے کہا —— "پیشہ بہ تو لکھی دیدی کے باپ نہیں ہیں، اس کے کاکا ہیں، اس کے باپ تو بہار میں کوئلہ کی کان ہیں۔ وہ لوگ بہت امیر آدمی ہیں۔"

"اچھا تو ان کے کاکا کیا کرتے ہیں، تم جانتے ہو؟"

"دفتر میں نوکری کرتے ہیں۔" دیپکر نے جواب دیا۔

پہلے والے نے پھر پوچھا——

"کس دفتر میں؟"

دیپکر نے جواب دیا—— "یہ تو مجھے نہیں معلوم۔"

دونی کاکا نے پہلے والے سے پوچھا——

"تمہیں ٹھیک معلوم ہے؟"

پہلے والے نے جواب دیا——

"میں نے دیکھا جو ہے، میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے دونی کاکا——"

اس کے بعد سب مل کر آپس میں کاکا بابو کے بارے میں کچھ باتیں کرنے لگے۔ دیپکر اُن کی باتیں سمجھ نہ سکا۔ اس وقت وہ صرف یہ سمجھ [illegible] سی۔ آر۔ داس کی موت پر کوئی بھی تو غمزدہ نہیں ہے، سبھی لوگ تو پہلے ہی کی طرح آج بھی مشغول جانے ہوئے تھے، کوئی تبدیلی بھی تو نہیں [illegible]

دیپکر رستے ہی میں گھمو دیدی کے مکان میں داخل ہو گیا۔ کاکا کی ماں اس وقت برآمدے میں بیٹھی ہوئی ترکاری کاٹ رہی تھیں۔ غسل [illegible] اور بھیگے ہوئے بالوں کو پیٹھ پر پھیلا دیا تھا۔

دیپکر نے جاتے ہی پوچھا—— "کاکا کی ماں، گھمو دیدی کہاں ہے؟"

"اوپر پڑھ رہی ہے۔" کاکا کی ماں نے جواب دیا—— "دیکھو جا کر۔"

"آپ نے سنا ہے کاکا کی ماں، سی۔ آر۔ داس مر گئے؟"

"کہاں؟" کاکا کی ماں نے کھوئے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"دارجلنگ میں۔" دیپکر نے جواب دیا—— "کل کیوڑا تلا میں بڑی بھیڑ ہو گی——"

کاکا کی ماں جس طرح بیٹھی ہوئی ترکاری کاٹ رہی تھیں، اسی طرح بیٹھی ہوئی ترکاری کاٹتی رہیں۔ دیپکر بہت ساری باتیں ان سے [illegible] مگر وہ بالکل چپ چاپ بیٹھی رہیں جیسے انھوں نے کچھ سنا ہی نہیں۔ پھر کاکا کی ماں اٹھ کر [illegible] کے متعلق جو بات [illegible] حیرت ہے یہ لوگ تو بالکل بھی یہ نہیں سوچ سکتے کہ بنگالیوں کا کتنا بڑا نقصان ہوا ہے۔ حیرت ہے! کتنی حیرت [illegible] دیپکر زینے کے سیدھا اوپر کی منزل پر چلا گیا۔ اوپر کرنے میں اپنے اسی کمرے میں کاکا بابو [illegible] پڑھ رہے [illegible] پڑھنے میں وہ اس قدر محو تھے کہ دیپکر کے قدموں کی چاپ بھی نہ سن سکے۔

دیپکر ان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا، پھر آواز دی

"کاکا بابو——"

کاکا بابو نے چونک کر دیکھا، بولے ——

"ہوں، دیکھ رہا ہوں ——"

اتنا کہہ کر وہ پھر اخبار پڑھنے لگے۔

دیپک نے کہا —— "سی۔ آر۔ داس مر گئے، اب کیا ہوگا کاکا بابو؟"

کاکا بابو اسی طرح اخبار پڑھتے ہوئے بولے ——

"کیا کہا؟"

"سی۔ آر۔ داس مر گئے۔" دیپک نے جواب دیا —— "اب کیا ہوگا کاکا بابو؟"

کاکا بابو نے اسی طرح اخبار پڑھتے ہوئے کہا ——

"ہوگا کیا، کچھ نہیں ہوگا ——"

"کچھ نہیں ہوگا؟"

کاکا بابو نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا، دیپک تھوڑی دیر تک وہاں پر کھڑا رہا، اس نے دیکھا جلی حرفوں میں اخبار میں چھپا تھا

DESHBANDHU PASSES

AWAY

A Bolt from the Blue

اور اس خبر کے چاروں طرف سیاہ لکیر کھنچی ہوئی تھی، درمیان میں دیش بندھو کی ایک تصویر تھی، دیپک دیر تک تصویر کو دیکھتا رہا، جسم پر ایک چادر پڑی ہوئی تھی، کھدر کی چادر تھی اور سر کے پاس تاگے سے کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ تعجب ہے کوئی کچھ نہیں بول رہا ہے! یہ لوگ کچھ بولتے کیوں نہیں؟ سی۔ آر۔ داس کے مر جانے سے کیا کچھ نہیں ہوگا؟ کسی کا کوئی نقصان نہ ہوگا، پھر پاپا بار بار سی۔ آر۔ داس کی باتیں کیوں کرتے ہیں اگر وہ پھر اس طرح کیوں روتا ہے! شاید کملی دیدی بھی اپنے کمرے میں بیٹھی رو رہی ہوگی۔

دیپک نے کملی دیدی کے کمرے میں جھانک کر دیکھا، وہ پڑھنے کی میز کے پاس بیٹھی ہوئی ایک تصویر دیکھ رہی تھی، دیپک کی طرف اس کی پشت تھی، وہ کملی دیدی کے کمرے میں چلا گیا اور آہستہ آہستہ دبے پاؤں اس کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا، پھر اس نے تصویر پر نگاہ ڈالی، حیرت ہے! وہ اسی آدمی کی تصویر تھی جس آدمی کے پاس وہ ہر روز خط لے کر جاتا تھا۔

دیپک کے قدموں کی آواز سن کر کملی دیدی چونک اٹھی اور تصویر کو جلدی سے اس نے ساڑی کی تہہ میں چھپا لیا۔ بولی

"کیوں دیپو! خط دے دیا تھا؟"

دیپک کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے، اس نے مسکرا کر کہا ——

"ممی ڈیڈی! تم نے سنا سی۔ آر۔ داس مر گئے؟"

ممی ڈیڈی نے حیرت سے وینکر کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد بولی ——

"میں سن چکی ہوں، لیکن تم نے خط دے دیا تھا نا؟"

"ہاں دے دیا تھا۔" وینکر نے جواب دیا۔

اس کے بعد تھوڑی دیر رک کر اس نے پوچھا

"اچھا ممی ڈیڈی، یہ جو سی۔ آر۔ داس مر گئے ہیں تو اس سے کچھ نہ ہوگا؟"

"کیا ہوگا؟"

وینکر نے کہا —— "اتنے بڑے آدمی مر گئے اور کچھ بھی نہ ہوگا؟"

ممی ڈیڈی نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا ——

"ہوگا کیا؟ ایک دن تو سبھی کو مرنا ہے۔"

یہ بات وینکر کو اچھی نہ لگی۔ سبھوں کے ساتھ سی۔ آر۔ داس کا مقابلہ! سی۔ آر۔ داس کیا دوسرے لوگوں کے برابر تھے؟ دوسری بات اسے اچھی نہیں لگی، کوئی کہہ رہا ہے کہ کتنا بڑا نقصان ہوا ہے! پنچاد [illegible] ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ دانت ہنستے ہوئے [illegible] قدر نہیں کرتے۔

وینکر وہاں سے چلا آ رہا تھا کہ یکایک اسے ایک بات یاد آ گئی۔

اس نے کہا —— "تمہارا ایک خط ہے ممی ڈیڈی۔"

"خط!" ممی ڈیڈی یکایک اچھل پڑی —— "خط ہے تو بتایا کیوں نہیں؟ لاؤ ——"

وینکر نے جیب سے خط نکال کر دے دیا۔

"میں ایک دم بھول گیا تھا ——"

خط لے کر ممی ڈیڈی اس کا ایک ایک سطر پاک کرکے پڑھنے لگی۔ خط پڑھتے وقت وہ بڑی خوبصورت لگ رہی تھی، جیسے ممی ڈیڈی بے حد حسین ہو گئی ہے۔ غسل کر کے اس نے ایک سرخ ساڑی پہن رکھی تھی اور گلے میں سونے کا ایک ہار چمک رہا تھا۔ وہ کھلا ہوا تھا اور اس کے گلے کا وہ کھلا ہوا حصہ بہت خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ جتنی دیر ممی ڈیڈی کا گلا اس طرح کھلا [illegible] وہ اسے گریبان میں چھپائے رہتی تھی، لیکن ممی ڈیڈی کھلے گلے کا بلاؤز پہنے ہوتی تھی۔ وہ بڑی دیر تک خط پڑھنے میں ڈوبی رہی۔ [illegible] میں کیا لکھا ہوتا ہے اور ممی ڈیڈی بھی ہر روز کیا کچھ لکھتی رہتی ہے اور وہ آدمی بھی سب کام چھوڑ کر ہر روز کیوں [illegible] خط کے انتظار میں کیوں لگا رہتا ہے اور خط پڑھتے وقت اس کا چہرہ اس طرح خوشی سے کیوں کھل اٹھتا ہے؟ اس [illegible] گال کیوں سرخ ہو جاتے ہیں اور وہ اتنا سگریٹ کیوں پیتا ہے اور سگریٹ پیتے ہوئے ایک ہی خط کو بار بار کیوں پڑھتا

تھوڑی دیر بعد یکایک لکھی دیدی آپ ہی آپ بولی ——
"کل تو میں نہیں جا سکوں گی۔"
ویکٹر نے پوچھا —— "کہاں نہیں جا سکو گی لکھی دیدی؟"
"نہیں، میں تم سے نہیں کہہ رہی ہوں۔"
اس کے بعد ویکٹر کی طرف دیکھ کر بولی ——
"دیکھو تو! مشکل آ پڑی ہے۔ کل تو میں نہیں جا سکوں گی۔"
"تمہیں کہیں جانے کے لیے کہا ہے لکھی دیدی؟" ویکٹر نے پوچھا۔
لکھی دیدی نے جواب دیا —— "وہ تم نہیں سمجھو گے، وہ ایک خاص جگہ ہے لیکن کل تو ستی آ رہی ہے۔"
"ستی! ستی آ رہی ہے؟"
لکھی دیدی نے کہا —— "اس کا ستی کو لانے کے لیے جانا ہوگا، کل ستی آ رہی ہے نا! بابا نے خط لکھا ہے کہ صبح پانچ بجے ستی کا جہاز یہاں پہنچے گا۔"

ستی! ستی کے بارے میں ویکٹر اتنی باتیں سن چکا تھا کہ اس کے بارے میں اسے پوری واقفیت ہو چکی تھی جیسے وہ ستی سے مل چکا ہو اور ستی کو دیکھنے کی اب کوئی ضرورت باقی نہ رہی ہو۔ بہت دنوں سے اس نے اپنے ذہن میں ستی کی ایک تصویر بنا رکھی تھی۔ وہ اب تک کلکتہ ہی میں رہی اور لکھی دیدی کی زبانی اتنی ساری باتیں سن چکا تھا کہ ستی اب اس کے لیے اجنبی نہیں رہی تھی۔ جیسے لکھی دیدی کی طرح ستی بھی اس کے دل میں گھر کر چکی تھی۔

ویکٹر نے پوچھا —— "ستی کل آ رہی ہے یہ بات تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتائی؟"
"آج ہی تو بابا کا ٹیلیگرام ملا ہے۔" لکھی دیدی نے جواب دیا۔
"مگر وہ کس کے ساتھ آئے گی؟ ستی اکیلی آ سکے گی؟"
لکھی دیدی نے کہا —— "بابا کے ایک دوست صاحب کلکتہ آ رہے ہیں، انہیں کے ساتھ بابا نے بھیج دیا ہے۔ وہاں اس کی تعلیم اچھی نہیں ہو رہی ہے اسی لیے —— وہ دیکھو نہیں، وہ بستر ستی کے لیے ہی کیا گیا ہے، ستی وہیں سوئے گی۔"

اس کے بعد ویکٹر کی نظر پڑی، کمرے کے ایک طرف لکھی دیدی کا بستر تھا اس کے دوسری طرف ایک دوسرا بستر لگا ہوا تھا۔

اس دن اپنے کمرے میں آنے کے بعد بھی وہ بڑی دیر تک ستی کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ ویکٹر نے اس وقت تک ستی کو نہیں دیکھا تھا لیکن اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اب اسے کھیلنے کے لیے گھر میں ہی ایک ساتھی مل گیا ہو۔ لکھی دیدی بڑی تھی، لکھی دیدی کی بڑی بہن تھی، چھوٹا سا بھی اس سے عمر میں بڑے تھے اس لیے وہ کسی کے ساتھ نہیں کھیل سکتا تھا۔ جب سے

...ی کی خواہش ہوئی تو چھپکر کرن کے گھر جانا پڑتا۔ اب ستی آ رہی ہے، ستی تو اس کی ہم عمر ہے۔ ستی تو عمر میں اس سے
...بڑی ہے ——
اُسے یاد ہے، اس روز رات کو وہ اچھی طرح سو نہ سکا تھا۔ اُسے یاد ہے وہ رات بھر بستر پر کروٹیں بدلتا

اُس نے دھیرے سے ماں کو پکارا تھا۔

"ماں ——"

"کیا ہے، تم ابھی تک نہیں سوئے؟"

دھیکر نے کہا —— "اگر کل سویرے مجھے اُٹھنے میں دیر ہو تو مجھے جگا دینا ماں۔"

وہ کیوں سویرے اُٹھنا چاہتا تھا، سچ پوچھیے تو اُسے خود بھی معلوم نہ تھا۔ پھر بھی اُسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے اگر اُسے ...نے میں دیر ہو گئی تو اس کا بہت نقصان ہو جائے گا۔

دوسرے دن دھیکر صبح صبح ہی جاگ گیا تھا۔ یکایک اُسے محسوس ہوا تھا جیسے وہ صبح بھی اور دنوں ہی کی طرح تھی۔ اُسے حیرت ...ہوئی۔ آخر یہ صبح بھی ویسی ہی کیوں ہے۔ کوئی بھی فرق تو نہیں۔ اسی طرح ہمیشہ سورج مشرق کی طرف سے طلوع ہوتا تھا اور اسی کے ...کی پیلی شعاعیں پڑتی تھیں۔ اس روز بھی اس کی شعاعیں ویسی ہی پڑ رہی تھیں اور چڑیاں بھی اور دنوں کی طرح آنگن میں جھاڑو دے ...ماں بھی اور کسی کو مخاطب کر کے گالیاں بک رہی تھی —— تجھ پر غضب نازل ہو، تجھے موت آ جائے، خون کی قے کر کے مرے، ...پڑ ڈال کر کیڑا تو ہیں رکھ آؤں، جتنی جیسوا ہیں سب جمع ہو گئی ہیں، تجھے میں بھینٹ چڑھا دوں، چھنال عورت، ...کے منہ میں ......"

آنگن کے ایک کنارے پر آہستہ آہستہ منہ دھوتے ہوئے دھیکر نے سوچا —— جنونی کو شاید معلوم نہیں ہے کہ ... وہ اس مر گئے ہیں۔

اُس نے پوچھا ——

"جنونی تمہیں معلوم ہے؟ تم نے سنا؟"

"کیا سنوں گی رے۔ مجھے ان لوگوں نے کیا سننے کے قابل رکھا ہے۔ ان جیسواؤں نے ہری ہری آنکھ جلا کر رکھ دی ہے۔ ...ریجاروں نے مجھے کچھ سننے کے قابل رکھا ہے رشکے۔ ان ابھاگنوں کے منہ میں ......"

وہ صبح پتہ نہیں کیسے گزر گئی تھی۔ بھات کھا کر گھر سے نکلتے ہی اُس نے دیکھا تھا، بہت سارے لوگ کیوڑا تلاؤ کی طرف ...ہے۔ کرن کے گھر پہنچ کر اُس نے باہر ہی سے آواز دی ——

"کرن، کرن ——"

اندر جانے کی ممانعت تھی۔ ماں نے منع کر دیا تھا۔ اس وقت تک پارک آدمیوں سے بھر گیا تھا۔ نیپال بھٹیا... دائش میں...

[illegible] میں جانے کے راستے میں بڑی بھیڑ لگ گئی تھی۔ انسانوں کے سروں سے بیگھ بھرا نظر آتا [illegible]
[illegible] کے لیے ریلوے اسٹیشن میں ٹرین پہنچنے کی بات تھی۔ اس کے بعد وہاں سے پیدل چلتے چلتے اجرو روڈ نکال [illegible]
نکالی گئی روڈ پر آ گئے۔ اس وقت تک تمام لوگ درخت پر چڑھ کر بیٹھ گئے تھے۔ بچے جہاں جس نے درخت کی شاخوں پر اپنی جگہ بنالی تھی۔

پھر بارہ بجے، ایک بجا۔ لیکن نندو تک کسی کا پتہ نہ تھا۔

اچانک اُسے بھیڑ میں کرن نظر آیا۔

"اے کرن! تم یہاں! میں نے تمہارے گھر جا کر بہت آواز دی تھی ۔۔۔"

کرن نے کہا ۔۔۔ "میں تمہارے انتظار میں بڑی دیر تک کھڑا رہا تھا۔ آخر چلا آیا۔ لیکن یہاں اگر کوئی بھی جائے تو یہاں سے صاف دکھائی دے گا ۔۔۔"

آخر کار ڈھائی بجے دن کو یکایک سامنے سے انسانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا دکھائی دیا اور اس سمندر کی موجوں کے بیچ میں تمام ملک کی امیدیں، آرزوئیں، خواہشیں اور حسرتیں جیسے ایک جگہ جمع ہو گئی تھیں۔ جیسے صدیوں کے اس عظیم سمندر نے نندو کی دھڑکن کو بھی تیز کر دیا ہو اور اس کے ساتھ ہی ساتھ تمام انتظار کی تکلیفیں ان چیزوں میں ڈھل کر رہ گئیں۔ جیسے یکایک شہر سنسان ہو گیا، جیسے کہیں بھی کوئی آدمی نہ ہو، کہیں سے بھی کوئی آواز سنائی نہ دے رہی ہو اور دیکھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے اُس سناٹے کی دیوار کو توڑ کر پھولوں کا ایک پہاڑ اس کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہو۔ ہر طرف پھول ہی پھول ہوں۔ اتنے پھول تھے۔ [illegible] نندو نے جیسے باپو کو دیکھنا چاہا۔ جیسے جی بھر کر دیکھنے سے اُسے تھوڑا سا سکون مل جائے گا۔ جیسے جی بھر دیکھنے سے اُسے تھوڑی سی تسکین مل جائے گی۔

پھولوں کا پہاڑ اس کے سامنے سے گزر گیا۔ لیکن اُسے پھر بھی ہوش نہ آیا۔

کرن نے کہا ۔۔۔ "وہ دیکھو، پان کھاتے باپو ۔۔۔"

نندو نے جیسے سنا ہی نہیں۔ بے ترتیب گھنے بالوں والے اس کے سب ہی ایک طرف کو جھکے ہوئے ہیں۔ وہ دیکھ رہا تھا جیسے وہ آج بھی یہاں موجود ہیں۔

کرن نے کہا ۔۔۔ "وہ دیکھو، مہاتما گاندھی ۔۔۔"

ایک ایک کر کے کرن نے سب کی پہچان کرا دی۔ کرن سب کو پہچانتا تھا۔ وہ سب کو پھولوں میں دیکھ چکا تھا۔

نندو نے کہا ۔۔۔ "وہ دیکھو، انگریز وائسرائے ۔۔۔"

انگریز وائسرائے بھی ایک کنارے کھڑے تھے۔ ان کی بینائی کمزور تھی۔ پھر بھی وہ دیکھنے آئے تھے۔ کرن جانے [illegible] کے رشتے کو بھی دیکھ لیا۔ اس کا اسکول چھوڑ کر جو سارا بچہ سوکر بھی چلا گیا تھا۔ آج وہ بھی آیا تھا اور ایک طرف [illegible] کھڑا تھا، وہ کھڑا کھڑا اُسے دیکھ رہا تھا اور اس کے قریب ہی اس کا دوست بھی کھڑا تھا۔ چونکہ وہ بھی آیا تھا، کسی کو پتہ نہ [illegible]

[illegible] سرکار، وہ بھی آج یہاں آیا ہوا تھا، مگر واپس جا کر اس نے سنا تھا کہ بنتی دیدی کو ساتھ لے کر ماں بھی آئی تھی، دونی کاکا [illegible] پہرے کرتے تھے، پھوپھی ما، دھو سروں کے بڑے بھیا اور چچا دا سبھی ٹولی بنا کر آئے تھے۔

دینکر نے کہا ـــــ "وہ دیکھو چھیتے بھی آیا ہے"

مگر دادو کا بیٹا ذرا سے چھیتے بھی آیا تھا اور سگریٹ کے کش لگا رہا تھا اور دھوتی کرتی بنا کر یہیں رکھا تھا، بڑی بھیڑ تھی ایک [illegible] بھی ایسا باقی نہ بچا تھا جو آیا نہ ہو، صرف کاکا بابو، کاکی ماں اور منی دیدی نہیں آئی تھی جیسے وہ لوگ دوسری جماعت کے لوگ ہوں جیسے وہ سب دوسروں سے علاحدہ ہوں۔

یکایک ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی۔

اور اس کے ساتھ ہی سرشی کے پیڑ کی ایک شاخ چڑ چڑاتی ہوئی زمین پر آ رہی اور اس کے ساتھ ہی انسانوں کا ایک جھنڈ [illegible] کہاں جو نیچے آگیا اور اس کے ساتھ ہی ایک ہنگامہ برپا ہوگیا، چاروں طرف شور غل مچ گیا، بولو ہری بولو ہری بول ـــ

صبح سے لے کر شام تک وہ دن سوگوار سا گزرا، جیسے سارے کلکتہ کے باشندے اپنے عزیز کی موت کا سوگ منا رہے ہیں۔ اب اس روز کی بات کسی کو یاد بھی نہیں، سبھی بھول چکے ہیں، تمام باتیں کیا انسان یاد رکھ سکتا ہے؟ دینکر تمام رات [illegible] سکا تھا، اس روز اس کا دل بہت خراب ہو گیا تھا، گھر لوٹنے کے بعد بھی اسے کچھ بھی اچھا نہ لگا تھا۔

کرن نے گھر لوٹتے ہوئے کہا تھا ـــــ

"پھر دیکھو، اس سادھو کے پاس چلیں، بیٹھے سے دریافت کریں ـــــ"

شمشان سے لوٹ کر وہ کرن کے ساتھ ساتھ سیدھا سونار کا رنگ کے گھاٹ پر سادھو کے پاس گیا تھا، ایسا کیوں ہوا؟ [illegible] واں اگر مرگئے ـــ تو اس سے کیا ہوگا؟ اس کا جواب دینکر بھی کوئی نہ دے سکا تھا، دونی کاکا، پھوپھی ما، چچا دا [illegible] کاکی ماں اور منی دیدی، کوئی بھی نہ دے سکا تھا، کسی کے دل میں ذرا بھی غم کا احساس نہیں تھا، حالانکہ نظر کے سامنے [illegible] حادثہ ہو چکا تھا، سب کچھ خاک ہو کر ختم ہو گیا تھا، چتا کے دھوئیں سے آسمان سیاہ ہو گیا تھا، پھر اتنے آدمیوں کا سوگ [illegible] سے مقصد تھا؟

دینکر نے پوچھا ـــ "سوجاش برس کیوں نہیں آتے سے کرن؟"

کرن نے کہا ـــــ "سوجاش برس زحل میں ہے، تمہیں نہیں معلوم؟"

دینکر نے پوچھا ـــــ "پھر کیا ہوگا بھائی ـــــ"

"چلو، سادھو سے جا کر دریافت کریں۔" کرن نے جواب دیا۔

پتھر پر چہرہ رکھ کے مندر کے آمنے سامنے سونار کا رنگ گھاٹ جانے کا راستہ تھا، دونوں طرف خوانچے کی دکان تھی، پنڈال [illegible] تھا، پتھر لگا ہوا راستہ تھا، کچھ دیر پہلے بارش ہو چکی تھی، کرن اسے کھینچتا ہوا مغرب کی سمت لے چلا، مغرب کی سمت [illegible] اور گنگا کنارے یہی سونار کا رنگ گھاٹ تھا، کرن ایک گلی کے اندر سے بائیں طرف مڑ گیا۔

کے ایک پہلو میں جانے کے راستے میں بڑی بھیڑ لگ گئی تھی۔ انسانوں کے سروں سے [illegible] دکھائی دے رہا تھا۔ [illegible] سے بھرے بیالے [illegible] میں [illegible] پہنچنے کی بات تھی۔ اس کے جسموں سے پسینہ چلتے [illegible] مکانی [illegible] کمال کی [illegible] پڑ گئے۔ اس وقت تک تمام [illegible] پر چڑھ کر جم گئے تھے۔ بچے جہاں [illegible] نے دھت کی شاخوں پر اپنی جگہ بنالی تھی۔

پھر [illegible] ایک [illegible] لیکن [illegible] کسی کا پتہ نہ تھا۔

[illegible] اسے بھیڑ میں [illegible] نظر آگیا۔

[illegible] تم یہاں! میں [illegible] تم کو بہت آواز دی تھی ———

[illegible] نے کہا ——— میں تمہارے انتظار میں [illegible] دیر تک کھڑا رہا تھا۔ آخر [illegible] یہاں [illegible] سے صاف دکھائی دے گا ———

[illegible] دکھائی دے [illegible] ایک سامنے سے انسانوں کا سمندر [illegible] دکھائی دیا اور اس سمندر کی [illegible] میں تمام [illegible] خوبصورت اور [illegible] ایک [illegible] جیسے [illegible] کے [illegible] نے [illegible] کر دیا ہو اور اس کے ساتھ ہی ساتھ تمام [illegible] چیزوں میں [illegible] کر رہ گئی۔ جیسے [illegible] ہو گیا۔ جیسے کہیں بھی کوئی آدمی [illegible] کہیں سے بھی [illegible] نہ رہی ہو اور [illegible] ایسا محسوس ہوا جیسے اس [illegible] ایک پہاڑ اس کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہو۔ ہر طرف پھول ہی پھول ہیں۔ اتنے پھول تھے [illegible] میں [illegible] نے جیسے [illegible] چاہا۔ جیسے [illegible] سے اسے تھوڑا سا سکون مل جائے گا۔ جیسے [illegible] کے [illegible] سکون مل جائے گی

[illegible] پہاڑ اس کے سامنے سے گزر گیا۔ لیکن اسے پھر بھی ہوش نہ آیا۔

[illegible] نے کہا ——— وہ دیکھو [illegible] ———

[illegible] جب [illegible] اس [illegible] سب تھے

[illegible] نے کہا ——— وہ دیکھو [illegible] ———

ایک ایک کر کے [illegible] نے [illegible] کی پہچان کرا دی۔ [illegible] وہ [illegible] میں دیکھ چکا تھا۔

[illegible] نے کہا ——— وہ دیکھو [illegible] ———

[illegible] ایک [illegible] سے [illegible] پھر بھی وہ دیکھنے آئے تھے [illegible] سے [illegible] کے [illegible] پر [illegible] آج وہ بھی آیا تھا [illegible] تھا اور [illegible] اس کے قریب [illegible] کھڑا تھا۔ [illegible] بھی آیا تھا [illegible]

سن چند سرکار، وہ بھی آدمی یہاں آیا ہوا تھا۔ مگر واپس جاکر اس نے سنا تھا کہ چنتی دیدی کو ساتھ لے کر ماں بھی آئی تھی، دونی لالا
مونو کو بھی کتے تھے، پھسنے دا، دھو سوروں کے بچے بھیا اور پچاؤ، سبھی ٹولی بنا کر آئے تھے۔

دیچند نے کہا ۔۔۔ وہ دیکھو چھیٹے بھی آیا ہے ۔

مگر دادو کا بیٹا ذرا سے پیچھے بھی آیا تھا اور سگریٹ کے کش لگا رہا تھا اور دھوتی کو لنگی بنا کر پہن رکھا تھا، بڑی بھیڑ تھی، ایک
...ن بھی بھیا باقی نہ بچا تھا جو آیا نہ ہو، صرف کالا بابو، کالی ماں اور ٹھمی دیدی نہیں آئی تھی جیسے وہ لوگ دوسری جماعت کے لوگ
ہیں جیسے وہ سب دوسروں سے علاحدہ ہوں۔

یکایک بجلی چمکی، بارش ہونے لگی۔

اور اس کے ساتھ ہی برگد کے پیڑ کی ایک شاخ چڑچڑاتی ہوئی زمین پر آ رہی اور اس کے ساتھ ہی انسانوں کا ایک جھنڈ
...کا کتا ہوا نیچے آ گیا اور اس کے ساتھ ہی ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، چاروں طرف شور و غل مچ گیا، بولو ہری ہری بول ۔۔۔

صبح سے لے کر شام تک وہ دن سوگوار سا گزرا، جیسے سارے کلکتہ کے باشندے اپنے عزیز کی موت کا سوگ منا رہے
ہوں۔ لیکن اب اس روز کی بات کسی کو یاد بھی نہیں، سبھی بھول چکے ہیں، تمام باتیں کیا انسان یاد رکھ سکتا ہے! دیچند تمام رات
... سو سکا تھا، اس روز اس کا دل بہت خراب ہو گیا تھا، گھر لوٹنے کے بعد بھی اسے کچھ بھی اچھا نہ لگا تھا۔

کرن نے گھر لوٹتے ہوئے کہا تھا ۔۔۔

"چلو دیچو، اس سادھو کے پاس چلیں، بیٹے سے دریافت کریں ۔۔۔"

شام سے لوٹ کر وہ کرن کے ساتھ ساتھ سیدھا سونار کا ٹولہ کے گھاٹ پر سادھو کے پاس گیا تھا، ایسا کیوں ہوا؟
کی... وہ اگر مر گئے ۔۔۔ تو اس سے کیا ہوگا؟ اس کا جواب دیچند بھی کوئی نہ دے سکا تھا، دونی لالا، پھسنے دا، پچاؤ،
دادو، کالی ماں اور ٹھمی دیدی، کوئی بھی نہ دے سکا تھا، کسی کے دل میں ذرا بھی غم کا احساس نہیں تھا، حالانکہ نظر کے سامنے
...حادثہ ہو چکا تھا، سب کچھ خاک ہو کر ختم ہو گیا تھا، چتا کے دھوئیں سے آسمان سیاہ ہو گیا تھا، پھر اتنے آدمیوں کا سوگ
...سے مقصد تھا؟

دیچند نے پوچھا ۔۔۔ "سوبھاش بوس کیوں نہیں آئے بسے کرن؟"

کرن نے کہا ۔۔۔ "سوبھاش بوس تو جیل میں ہے، تمہیں نہیں معلوم؟"

دیچند نے پوچھا ۔۔۔ "پھر کیا ہوگا بھائی ۔۔۔"

"چلو نا، سادھو سے جاکر دریافت کریں" کرن نے جواب دیا۔

پھر پنچ ہیرہ کر کے مندر کے آمنے سامنے سونار کا ٹولہ گھاٹ جانے کا راستہ تھا، دونوں طرف خوانچے کی دکان تھی، پنڈال
...دھرم شالہ تھا، پتھر بچھا ہوا راستہ تھا، کچھ دیر پہلے بارش ہو چکی تھی، کرن اسے کھینچتا ہوا مغرب کی سمت لے چلا، مدرسے کی سمت
...اور گنگا کنارے سونار کا ٹولہ گھاٹ تھا، کرن ایک گلی کے اندر سے بائیں طرف مڑ گیا۔

کرن نے کہا ـــــ سادھو کے پاس جا کر ہی سب تو دو لوگ گھر پر ام لگنے لگے۔"

"وہ کیوں؟"

"وہ کیوں؟ وہ اس لیے کہ سادھو خوش ہوگا، پرنام کرنے سے کوئی خوش نہیں ہوتا تو بھی آسان ہے، پرنام کرنے میں کیا نقصان ہے، اس میں تو پیسہ خرچ نہیں ہوتا۔"

اس کے بعد کرن نے تھوڑے توقف کے بعد کہا ـــــ

"پیسہ ہی اصل چیز ہے چاہے سادھو ہو یا سادھو نہ ہو ـــــ"

"لیکن میرے پاس تو پیسہ نہیں ہے۔"

کرن نے کہا ـــــ میرے پاس بھی پیسہ نہیں ہے، پیسہ دیا ہوتا تو سادھو کے پاس کیوں آتے، پیسہ نہیں دیا ہوگا اسی لیے تو سادھو کے پاس آتا ہوں ـــــ

"تو پھر، پھر وہ کھانے کیا ہیں، کیا کھا کر زندہ رہتے ہیں؟"

"پیسے دینے والے بہت سے لوگ ہیں" کرن نے جواب دیا ـــــ "وہ لوگ سادھو کو کھلاتے پلاتے رہتے ہیں اور وہ زندہ رہتے ہیں [illegible] سادھو دیا [illegible] ہے، [illegible] کا [illegible] ہے، یہ ہمارا سادھو ہے، اور کچھ نہیں کہتا ـــــ"

لیکن گھاٹ کے سامنے جانے کی کرن ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا اور چند لمحوں تک خاموش رہا، پھر بولا ـــــ "یہ دیکھو، سادھو جاتا ہے ہم یہیں سے واپس چلیں گے......"

"اب کیا ہوگا؟"

کرن نے کہا ـــــ "نہیں، ہم لوگوں کی قسمت ہی خراب ہے، ادھر کوئی [illegible] جاکر بیٹھ [illegible] ہوں [illegible] وہ بات نہیں [illegible] اور نہ پتہ چل جاتا۔"

پھر وہ دونوں [illegible] چپ چاپ ہونے ہونے واپس آ گئے، اس کے بعد کرن خیال [illegible] اسٹریٹ کے اندر [illegible] سیٹھ [illegible] کے گھر میں داخل ہوگیا۔ [illegible] کی بات تھی، [illegible] کی بات تھی، لکھی دیوی نے [illegible] تھا۔

[illegible] میں [illegible] رہا تھا [illegible] میں [illegible] تھا اور [illegible] میں [illegible] رہا تھا۔

[illegible] پر چڑھ گیا

کمرے میں [illegible] پلنگ پر [illegible] تھا۔ [illegible] لکھی دیوی [illegible] میں [illegible]۔

زینے کے سامنے ہی لکھی دیوی سے ملاقات ہوگئی۔

لکھی دیوی [illegible] تھی

"کرن [illegible]" [illegible] دیکھتے ہی لکھی دیوی نے پوچھا ـــــ "تمہارا چہرہ ایسا کیوں ہو گیا ہے؟"

"شانتی گھٹ گیا تھا۔" دیپکر نے جواب دیا ——— "جی۔ آ۔۔ واپس مڑ گئے ہیں نا۔"

"او، بہلی بھی تو ابھی آ رہے ہیں۔"

"کہاں سے؟"

"ستی کو ملنے گئی تھی۔" کھمی دیدی نے جواب دیا۔

دیپکر کا دل دھڑکنے لگا۔

"ستی آ گئی ہے کیا؟" اس نے پوچھا ——— "کہاں ہے دیکھوں؟ دیکھنے میں کیسی لگتی ہے؟"

کھمی دیدی مسکرانے لگی

"نہیں رے، نہیں آئی۔ وہاں سے جانے ہی سے پہلے، بڑے زور کا طوفان آ گیا تھا نا اسی لیے ———"

دیپکر مایوس ہو گیا۔

پھر بھی وہ تھوڑی دیر تک کھڑا رہا، جیسے وہ بڑی امید لیے کھڑا ہو، حالانکہ یہ امید بیکار تھی۔ کس بات کی امید لیے ... تھا، ستی اس کی کون تھی، ابھی تو اس کا ٹھیک پتہ نہیں تھا۔

کھمی دیدی زینے سے نیچے اترنے لگی، اس کے پیچھے پیچھے دیپکر بھی اترنے لگا۔

یکایک اس نے پیچھے سے آواز دی۔

"اچھا کھمی دیدی ———"

"کیا ہے، کہو؟"

دیپکر نے پوچھا ——— "ستی شاید دیکھنے میں تمہاری ہی طرح ہے؟"

کھمی دیدی مڑ کر کھڑی ہو گئی۔ بولی

"او ماں۔ تو شاید دن رات ستی ہی کے بارے میں سوچتے رہتے ہو؟"

دیپکر شرما سا گیا۔ اس نے اپنا سر جھکا کر کہا

"نہیں تو ———"

"تو پھر، تم ہر وقت ستی کے بارے میں کیوں پوچھتے رہتے ہو؟"

دیپکر کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ بار بار ستی کے بارے میں کیوں پوچھ رہا تھا، لیکن پھر بھی وہ سوچ رہا تھا، ستی خواہ کیسی ہو مگر وہ کھمی دیدی کی طرح چھپا چھپا کر کسی کو خط نہ لکھے۔ ستی خواہ جیسی بھی ہو مگر وہ کھمی دیدی کی طرح آئینہ کے سامنے ... رقص نہ کرے۔ ستی بھی کھمی دیدی کی طرح پڑھنے کی میز کے پاس بیٹھ کر کسی غیر مرد کی تصویر نہ دیکھے۔ ستی نیک اور بھولی ہو، دیدی کی طرح نہ ہو۔ وہ اس سے بھی زیادہ اچھی ہو تو بہتر ہے۔ ستی سچ مچ ستی ہی ہو۔

اس معذرت بہتے ہوئے پانی میں منہ سے دروازے پر کھڑے ہو کر بھی دیپکر نے یہی سوچا تھا، شاید ستی نہ آئے

کمرے میں یہاں تک اتنی دہشت آگیا تھا ہے؟ کہاں بیمار اور کہاں ملاوٹ کے تمام پیچیدہ باز بیرونی معترض سے وہ کو پھولے دکھ کو سنگیا تھی وہ دیکھتا رہ گئی، اگر آتے تو وہ اس کے نیچے اس طرح حد رہ گئے۔ وہ بھی ویکٹر کو ممی دیدی کا کمرے تک سے نہ اس طرح چھپانے کے لیے تھی کہ وقت نے بدقسمتی سے بگاڑ دیا ہے۔

اب وہ شخص رہا تھا، وہ کرسی پر بیٹھ رہا اور دیوار سے ٹیک لگائے کسی سوچ میں تھا۔

ایک عجیب سی طرح کشادہ کمرے کی طرف بڑھی ہی سکتی نہیں۔ وہ بیٹھی کھڑکی کے کنارے سے جھک گئی۔ جیسے ایک کھڑی ہو گئی۔

ویکٹر پھر ایک بار پیڑے کی دوکانوں میں جا کر گھڑی دیکھا۔ غضب ہو گیا آٹھ بج گئے۔ آج وہ پوچھا کب نکل جانے والا ہے مکان کا۔

بارش اور بھی تیز ہو گئی تھی۔ پانی کی بوندیں اور بھی تیزی سے پڑنے لگی تھیں۔

ویکٹر بارش کی پروا نہ کرتے ہوئے وہاں سے چل پڑا۔ اس کا مکان یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا، بہت تھوڑا فاصلہ تھا۔ اس کی قمیص بھیگ گئی اور پتلون بھیگ گئی اور وہ شدید سردی میں جب وہ ممی دیدی کے دروازے پر پہنچا تو پانی اس کے پاؤں تک بھیگ چکا تھا۔

دروازہ کھلا ہوا تھا

اسے ممی دیدی کا اس کا خیال بھی کرنا تھا اس سے کہ دیا ہو گا کہ وہ آدمی نہیں آیا۔ شاید ممی دیدی خفا ہو گئی ہوں۔

غصہ ہو رہی ہے۔ جیسے اس کا کیا قصور ہے، وہ آدمی نہ آئے تو وہ کر ہی کیا سکتا ہے۔

زینے کے نیچے بار بار چھپنے کی طرف سے کسی لڑکی کی آواز سنائی دی۔ مگر زینے کے نیچے بیٹھا ہوا ایک دھندلا تھا۔

ویکٹر زینے پر چڑھ کر اوپر چلا گیا۔ اوپر برآمدے میں کوئی نہیں تھا۔ دائیں طرف سونے اور بیٹھنے کے کمرے تھے۔

ویکٹر نے اندر جھانک کر دیکھا۔

"ممی دیدی!"

وہاں کسی کا بھی پتہ نہ تھا۔ دو تین کمرے تین میں ہی لیٹا تھا۔ بالائی منزل پر ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کوئی ایک آدمی بھی نہیں تھا۔ ویکٹر کچھ پریشان سا ہو گیا۔ اس کے جسم سے پسینہ چھوٹنے لگے۔ اس نے ہر کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ ممی دیدی کہاں گئیں؟ وہ اچانک کہاں چلی گئیں۔ وہ تو ہمیشہ یہیں برآمدے میں بیٹھی اخبار پڑھتی رہتی تھیں۔ جس روز اس کا انتظار ہوتا تھا، ہم دونوں بیٹھے اخبار پڑھا کرتے تھے۔ ممی دیدی کے کمرے میں بتی کا پلنگ بچھا ہوا تھا۔ دونوں طرف دیواروں سے لگے ہوئے پلنگ تھے۔ اور سامنے بستر لگے ہوئے تھے۔ صرف بیچ کی میز پر تین چار چائے کی پیالیاں پڑی رہ گئی تھیں۔

"تلسی دیدی!"

دنکر نے پھر پکارا۔

اس کے بعد وہ زینے پر چڑھ کر اوپر چھت پر چلا گیا۔ اوپر چھت پر صرف ایک کمرہ تھا۔ اس کمرے میں کاکا بابو رہتے تھے۔ اس کمرے سے پورا گاؤں کسی تصویر کی طرح نظر آتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے گھر، بستی، گھاس پھوس کی چھت، کالی کا مندر، دور ... مکان، چندی بابو کے بڑے مکانوں کی چھتیں، اور بھی بہت کچھ دکھائی دیتا تھا، اور اس طرف ٹیپو سلطان کی وہ عمارت جس میں مزدوروں کا مسکن تھا اور اس سے پرلی طرف آگے کھاری تالاب اور اس سے بھی پرے دھان کے کھیت دور تک پھیلے ہوئے تھے ... ان کے یہ کھیت جنوب کی سمت پھیل کر ریلوے لائن سے جا ملے تھے۔

اوپر جاتے ہی دنکر نے کاکا بابو کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور دن میں اس کمرے میں ... رہتا تھا۔ تلسی دیدی اس کمرے میں بھی نہیں تھی۔ دروازے کا پٹ پکڑ کر اس نے ایک بار پھر جھانک کر اندر دیکھا۔ پلنگ پر اخبار اٹھا ... جیسے کچھ دیر پہلے اس کمرے میں کوئی تھا۔ شیلف میں بہت ساری کتابیں بھی ہوئی تھیں اور بہت سارے کاغذات کا بنڈل ... ٹرنک تھا اور ٹرنک میں ایک چھوٹا سا تالا جھول رہا تھا۔ صبح کی دھوپ فرش پر، پلنگ کی چادر پر اور دیوار کے کنارے پسری تھی۔

تلسی دیدی کہاں چلی گئی!

نیچے جا کر کاکی ماں سے دریافت کرنا ہوگا۔ اتنے سویرے کاکا بابو بھی کہاں چلے گئے اور تلسی دیدی بھی کہاں چلی گئی۔

یکایک اس نے دیکھا۔ چھت کے شمال مشرقی کونے پر تلسی دیدی کھڑی تھی۔ دنکر کی طرف اس کی پشت تھی۔ کاکا بابو دوربین سے بہت دور کچھ دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے بھی دنکر کو نہیں دیکھا۔

آہستہ آہستہ دنکر ان کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔

اس وقت تلسی دیدی آنکھوں سے دوربین لگائے ہوئے کچھ دیکھ رہی تھی۔

دنکر نے آواز دی۔

"تلسی دیدی!"

تلسی دیدی چونک اٹھی۔ اس نے پلٹ کر دنکر کو حیرت سے دیکھا۔

"تم! تم کب آئے؟"

"میں بہت دیر سے آیا ہوا ہوں۔" دنکر نے جواب دیا ——— "میں تم کو ڈھونڈ رہا ہوں۔"

"ملا دے دیا تھا؟"

"نہیں، وہ نہیں آئے تھے؟"

"نہیں تم نے مجھے! کیا غضب! پھر آپ نے غلط کس کو دیا؟"

ممی کو بلیں دیکھنے۔ ونکو نے جواب دیا ۔۔۔۔ "یہ ہو۔"

ممی دیدی نے سنا نے کہ اس نے ایک سری نوکرانی اور اس کے بعد [illegible] کے [illegible]

"یہ دیکھو" ونکو نے کہا ۔۔۔۔ "غور سے کر میں آنکھیں بند کر کے انتظار کیا، پھر کھول کر میں نے کیا ۔۔۔"

"تم نے کچھ دیر اور انتظار کیوں نہ کیا؟ آنے کا انتظار تو بات کے کمال ہو۔"

"میں تو کچھ دیر تک کھڑا رہا۔ اس کے بعد اتنے زور کی بارش آئی کہ یہ دیکھو، بارش میں نہا گیا ہوں۔"

ممی دیدی نے ایک بار اس کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ بولی ۔۔۔۔

"بارش تو کتنی تیز ہو گئی تھی۔ کچھ دیر بعد ہی دھوپ نکل آئی تھی۔ کچھ دیر اور انتظار کر لیتے ۔۔۔"

"تم ایسے کہہ دو ممی دیدی" ونکو نے کہا ۔۔۔۔ "کہ وہ ٹھیک وقت پر آیا کرے۔ کھڑے کھڑے میرا پاؤں درد کرنے لگا ہے ۔۔۔"

"تو بہت زور سے ناراض ہے نا" ممی دیدی نے کہا ۔۔۔۔ "ابھی پہلے دیر ہو جاتی ہے، پھر اب دیر بہت ہو گئی، ہاں میں دوں گی۔"

ونکو نے خوشی سے کہا ۔۔۔۔

"یہ دور میں ہے، ممی دیدی؟"

"ہاں، انتظار کرو ۔۔۔"

"دکھائی دیتا ہے؟"

"دیکھ گئے؟"

اتنا کہہ کر ممی دیدی نے انگوٹھا ونکو کی آنکھوں سے لگا دیا۔ پھر پوچھا ۔۔۔۔

"دکھائی دیتا ہے؟"

ونکو نے دیکھا، دور بہت دور کی چیزیں بھی اس کے قریب دکھائی دیتی تھیں۔ اتنے قریب کہ وہ ہاتھ بڑھا کر انہیں چھو سکتا تھا، اپنی مٹھی میں بند کر سکتا تھا۔ اس کالی کا منہ، نیلا آسمان، شریف آدمی کے مکان کی ٹین کی چھت، پتھر، پیڑ، پنچھی کا مکان، اس کے دروازے، اس کا اسکول، اور بھی دوسری دور دور کی چیزیں اس کے بالکل قریب آ گئی تھیں۔

پھر ونکو نے دور بین کا رخ ممی دیدی کی طرف کر دیا۔ ممی دیدی کو اتنے دنوں سے وہ اپنی آنکھوں سے اپنے قریب دیکھتا رہا تھا۔ [illegible] دور بین سے دیکھنے میں وہ کیسی لگتی ہے، وہ یہی دیکھنا چاہتا تھا۔

"دیکھ رہے ہو؟"

ونکو کی آنکھوں کے سامنے دھند سی چھا گئی۔

"[illegible] دھندلی کیوں نظر آ رہی ہو ممی دیدی؟" اس نے پوچھا ۔۔۔۔ "کچھ دکھائی نہیں دیتا؟"

"میں اتنا سا قریب ہو گئی ہوں،" کلمی دیدی نے جواب دیا۔

"قریب کا آدمی دُھندلا کیوں دکھائی دیتا ہے؟ نہیں، میں تمہیں دُور بین سے نہیں دیکھوں گا۔"

اُس نے آنکھوں کے سامنے سے دُور بین ہٹا لی۔

"کیوں؟"

"نہیں، نہیں، تم بہت بُری دکھتی ہو، تم تو پہچان میں ہی نہیں آتیں۔"

"پہچان میں کیسے آؤں گی، دُور بین تو دُور سے دیکھنے کے لیے ہے، قریب کی چیز بھی کہیں دُور بین سے دیکھی جاتی ہے؟"

کلمی دیدی کی بات سُن کر اس چھوٹی سی عُمر میں اُسے بڑی حیرت ہوئی تھی، بات سچ تھی، کلمی دیدی تو اُس کے قریب ... اس کے بالکل قریب، اگر وہ اس کے اتنے قریب نہ ہوتی کیا کبھی اُس کے ذریعہ غلط ہو جاتی؟ اس پر اتنا ظلم وہ کرتی؟ اس ... قریب کے آدمی کو دُور بین سے دیکھنے میں سب کچھ اُلٹ پُلٹ ہو کر رہ جاتا ہے، قریب آتے ہی آنکھوں کے سامنے دُھند ... ہے جیسے دُور بہت دُور کی کوئی چیز ہو، حالانکہ جب کلمی دیدی دُور چلی گئی تھی ——— جب اُس کی دسترس سے باہر ... تو اُس وقت اُسے محسوس ہوا تھا جیسے کلمی دیدی اُس کے بالکل قریب آ گئی ہے جیسے کلمی دیدی کو اُس نے بہت قریب سے ... جیسے کلمی دیدی کے بارے میں وہ سب کچھ جانتا ہے!

دیپکر نے کلمی دیدی کو دُور بین واپس دیتے ہوئے کہا۔

"تم بھی ایک بار مجھے دُور بین سے دیکھو، کلمی دیدی۔"

"وہ کیوں؟" کلمی دیدی مُسکرائی۔

"میں بھی تمہیں دُھندلا دُھندلا دکھائی دوں گا۔"

"دُھندلا نظر آئے گا تو مجھے —— نظر آئے گا، تمہیں اس سے کیا ملے گا؟"

"نہیں، اس طرح تم مجھے پہچان نہ سکو گی!"

... کر وہ چلا آیا جیسے اس کے بعد ... کلمی دیدی کے سامنے کھڑے رہنے میں اُسے شرم محسوس ہو رہی ہو، وہ تیزی ... چلتا ہوا باہر راستے پر آکر کھڑا ہو گیا، اس کے بعد بغل کے دروازے سے وہ اپنے گھر میں داخل ہو جانا ہی چاہتا تھا کہ ... کے قدم رُک گئے۔

... گلی کے دہانے پر کسی کی ایک ٹیکسی آکر رُک گئی، اس گلی میں کس کے یہاں ٹیکسی آتی ہے، پھر کوئی بیمار ہے ... ٹیکسی کے اندر ایک لڑکی تھی اور پیچھے بہت سا سامان تھا سب بندھا ہوا تھا۔

ٹیکسی سے ایک آدمی اُتر کر مکانوں کا نمبر دیکھنے لگا۔ پھر دیپکر کے قریب آکر اُس نے پوچھا ———

"... یہ ... ایک بی ... سا مکان ہے نا؟"

"جی تو ہے۔ بکس رکھ سکتے ہیں؟"
"مجھے بکچھ ہی سامان چاہیے۔"
"ہاں، ہاں، یہیں سامان ہے ——"
وہ بکس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔
پچھلی سیٹ پر ایک لڑکی اور ایک عورت بیٹھی تھی۔ ونکر کی نگاہوں کے سامنے جیسے اچانک بجلی سی کوند گئی۔ یہ تو آ
میں!

"آپ ہم سے [illegible] یہ سامان لے کر گئے؟"
[illegible] وہ شخص [illegible] سامنے آنے لگا۔ وہ گرم سوٹ میں ملبوس تھا، اور کافی متین تھا۔
[illegible] جلدی ہو گی [illegible] چھوڑ [illegible] کہنے لگا ——
"آج [illegible] ہونے کا [illegible] سامان کا لے رکھا ہے، اور کہیں جگہ نہیں ملی تھی ——"
[illegible] ——
"[illegible] سامان پہچانتے ہو تو؟"
"جی ہاں ——" ونکر نے جواب دیا۔
"تمہارا [illegible] سامان [illegible] زیادہ بھاری نہیں ہے، ایک بستر اور ایک سوٹ کیس ہے ——"
[illegible] سے نیچے اتر آئی اور [illegible] آدمی سے مخاطب ہو کر بولی ——
"[illegible] سامان [illegible] مشکل تھا ——"
[illegible] کے بعد [illegible] نے [illegible] کو ٹھیک کر دیا۔ پھر وہ [illegible] ادھر ادھر [illegible]
[illegible] کی آنکھوں میں [illegible] حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔
"ہاں [illegible] رہتی ہے۔"
اس آدمی نے کہا [illegible] ہے، [illegible] —— اتنا بڑا [illegible] ——
اس کے بعد ونکر نے کہا —— [illegible] ادھر کی طرف [illegible] کیوں ہو؟ [illegible] زیادہ بھاری
ہے ——

اس کے بعد کوئی بات کیے بغیر اس نے بستر اٹھا کر ونکر کے کندھے پر ڈال دیا۔
"لے جا سکتے ہو؟"
ونکر نے کندھے پر بستر [illegible] ہاتھ میں سوٹ کیس لے کر جواب دیا۔
"ہاں، لے جاؤں گا۔"

"دیکھو ذرا سنبھال کے، بوڑھا گوشت ہی تو نہیں، کہیں پھسل نہ جائے ـــ"
تانگے سے ڈیکر، اس کے پیچھے وہ آدمی اور اس کے پیچھے وہ لڑکی چلنے لگی۔
ڈیکر کو عجیب سا احساس ہونے لگا۔ ایسا کیوں ہوا۔ ایسا کیسے ہو گیا۔ سب کچھ اتنی جلدی ہو گیا کہ اسے کچھ سوچنے اور کچھ کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔

کالا باؤ کے مکان کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

"یہی مکان ہے؟"

ڈیکر نے کندھے سے بستر اتار کر جواب دیا۔

"ہاں ـــ"

لڑکی نے پوچھا ـــ "کتنے پیسے دوں؟"

ڈیکر پریشان سا ہو گیا۔ اس نے ایک بار لڑکی کے چہرے کو دیکھا۔ اس کے بارے میں لکھی دیدی سے وہ سنتا تھا۔ کیا یہی ستی ہے؟ ایسا ہی چہرہ تو لکھی دیدی نے بتایا تھا۔ ایسی ہی سفید رنگت۔ ایسے ہی گھونگھریالے بال ـــ

اس آدمی نے کہا ـــ "اس کو ایک آنہ دے دو۔"

ڈیکر نے کہا ـــ "نہیں، پیسے دینے کی ضرورت نہیں۔"

اس آدمی نے کہا ـــ "کیوں؟ تھوڑا سا تو سامان ہے، وہ بھی بالکل ہلکا ہے۔ اس کے پیسے ایک آنہ سے کم ہے؟ مگر دن بھر محنت مزدوری کرنے سے کہیں چار پیسے ہاتھ آتے ہیں؟ بڑے نواب ہو گئے ہیں سب، یہ سامان تو میں خود اٹھا کر لا سکتا تھا ـــ"

لڑکی نے کہا ـــ "میں ایک آنہ سے زیادہ نہیں دوں گی، لے لو ـــ"

اور ہاتھ بڑھا کر اسے پیسے دینے چاہے۔

"نہیں۔" ڈیکر نے انکار کیا۔

اس آدمی نے کہا ـــ "اسی وجہ سے ہلکا ہوں کہ کچھ نہیں ہوتا۔ ہلکا سا سامان ہے اس کے پیسے تو نہ دینے ہوں گے، نہیں بیٹا تو مفت ہی لے آیا ہے ـــ"

لڑکی نے پھر پوچھا ـــ "تو لے لو؟"

"نہیں۔" ڈیکر نے جواب دیا۔

اس آدمی نے کہا ـــ "تم اور اس کی خوشامد مت کرو ستی، رہنے دو، میں بھی دیکھتا ہوں وہ چار پیسے چھوڑتا ہے ـــ"

دیکھ رہا ہو۔ آہٹ ہوئی تو چونکا۔ مس شہناز دوپہر کو دالان میں کھڑا ہوا تھا تو اس کی ملاقات پر یعنی اس سے ...
لیس کی بتیوں سے بچنا مشکل ہوا اور وہ مسکرائیں۔

علیمہ نے ہجوم سے کچھ آگے جا کر جھانکا۔ دیکھا تو گیند کے پیچھے تھے چار دس بچے اس کے پیچھے تھے اور بھاگ رہے تھے جیسے زمین پر ادھر ادھر پھیل گئے اور پھر کہیں پاس ہی تھے جیسے ایک ... تو کیا تم بھی دوسرے ملک کی طرح ... ابھی دیدہ نے بھی تو پلٹ دیا تھا، تو کیا تم ہی کہہ دیتی ہو ... دل نہیں: تو کیا دنیا میں ہم اکیلے رہ سکتے ہیں ——!

جوتے کا خطبہ

قاضی عبدالستار

[illegible] کے صدر کا مرکزی ہال قمقموں، پھولوں اور چہروں سے جھلک رہا تھا۔ ادیب، دانشور، پروفیسر، طالبات، طالب علم، معزز مہمان سب اس دروازے کو گھور رہے تھے جس کے دونوں طرف والنٹیرز مہمانِ خصوصی کے انتظار میں کھڑے رہے تھے۔ آخر وہ لمبی سیاہ موٹر آ گئی جس پر سوار ہو کر کوئی بھی سیاسی جنتری کو خرید سکتا ہے۔ میزبانوں کا ہجوم چیلوں کی طرح موٹر پر جھپٹا اور اس پر چھا گیا اور ہجوم مہمانِ خصوصی کے طلوع کا انتظار کرنے لگا۔ پھر لباس کا تجمل دیکھتے ہی [illegible] کھڑا ہو گیا۔ خاص مہمان کے کرسیٔ صدارت پر جلوہ افروز ہوتے ہی ادبی کانفرنس کے سیکریٹری (جو یونیورسٹی کے مشہور [illegible] تھے) انگریزوں پر تبصرے اور تعارف کے بہانے معزز مہمان کی شان میں منثور قصیدہ پڑھ دیا۔ معزز مہمان جو [illegible] کے ملک تھے اور سارے ملک میں "شو کنگ" کے نام سے مشہور تھے ہنسے، قاعدے، زیرِ لب مسکراتے رہے۔ آخر [illegible] نے گزارش کی کہ صدر محترم اپنے افتتاحیہ خطبے سے ادبی کانفرنس کا آغاز فرمائیں۔ صدر محترم مغل شہنشاہ کی طرح [illegible] سے ایک ایک قدم ایک سلطنت پر پڑ رہا ہو۔ مائک کے سامنے کھڑے ہوئے، کھنکارے، پیچھے میں دھنسے ہوئے [illegible] ہوا بھرے ہوئے ہال کو تمکنت سے دیکھا، جیب سے ایک کاغذ نکالا اور تڑاتڑ بولنے لگے۔ یعنی [illegible] لگے۔

معززینِ کرام!

[illegible] میں تھا جب [illegible] نے ٹیلی فون کے ذریعے مطلع کیا کہ آپ نے اس ادبی کانفرنس کی صدارت کے لیے میرا انتخاب کیا ہے۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ نے میرا انتخاب کر کے خوش مذاقی کا ثبوت دیا ہے اس کے لیے مبارکباد پیش کرتا ہوں [illegible] ادب [illegible] ہونے سے [illegible] دنیا میں کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا ہیں مگر [illegible] سے دیکھا جائے تو [illegible] سے الگ کر کے کہاں نہیں جا سکتا۔ میں نے آپ کی دعوت اس لیے قبول کر لی کہ مجھے آپ کی دلجوئی اور [illegible] کے [illegible] اور ادب دونوں کی خدمت منظور ہے۔

خواتین و حضرات!

جس طرح مختلف قوموں کے عروج و زوال کی داستان سنائی جاتی ہے اسی طرح جوتا بھی قوموں کی تاریخ اور تہذیب کو آئینہ دکھاتا [illegible] نے ہندوستان کے ماضی سے وراثت پائی ہے [illegible] عبارت [illegible] میں۔ ماضی بعید میں ہندوستانی جوتوں میں تخصیص تھا [illegible]

ہنر نے جو کمال حاصل کیا تھا اس کو حقارت سے دیکھا۔ اس کو ٹھکرا دیا اور جھٹ پٹ ترک کر دیا۔ اس طرح جو جتا تی
کی پرورش کی تھی اسے تم نے ملک کا شیرازہ بکھیر دیا۔ اور پارہ پارہ ہندوستان کو دشمنوں کا حصہ بنا کر اپنے پیروں میں
پھینک دیا۔

جب تک مسلمانوں جوتے کی اہمیت کو تسلیم کرتے رہے بادشاہی کرتے رہے لیکن جب خانہ جنگی کے ہاتھوں جوتے کی
صنعت ختم ہو گئی جیسے جیسے راجے اور نواب امیر اور وزیر بادشاہی دسترخوان کی چپاتیوں کی طرح سادہ جوتے
پہنتے تھے۔ ان کو اور جو لوگوں نے ان کے پیروں کو جوتے کی لذت اور زمین کی سختی سے بیگانہ کر دیا۔ اور وہ پالکیوں کی
زرکار پالکیوں کے زمین سے خوابوں پر اٹھنے لگے۔ اس طرح رفتہ رفتہ پوری کی پوری قوم کا سارا خواب ہو گیا۔ صحت تباہ ہو گئی اور
ایک عظیم الشان صنعت ختم ہو گئی پھر کیا ہوا انگریز ان کے پیروں میں چلی گئی۔

آپ لوگوں نے جو کتابیں اور لطیفے اور حکایتیں پڑھی ہوں گی کہ جب انگریز لکھنؤ پر قابض ہوئے اور جب جنرل ہیں
داخل ہونے تو دیکھا کہ واجد علی شاہ ایک پاؤں میں جوتا پہنے مسند پر بیٹھا ہے اور ہاتھ میں نگی تلوار چمک رہی ہے اور دوسرا
جوتا جو ادھر سامنے کے پاس پڑا ہے۔ انگریزوں کو دیکھ کر نواب نے حسرت سے کہا اگر میرے خدمتگار پاؤں میں بھی جوتا
پہنا دیتے تو تم لکھنؤ میں داخل نہ ہو سکتے۔ آپ اس کو محض ایک لطیفہ سمجھتے ہوں گے لیکن اس معمولی واقعے نے ہندوستان کی تاریخ پر
سیاہ پرت ڈال دی۔ ہم انگریزوں کے سو سال دور غلامی کی جوتے بازی کا شکار ہو گئے۔

جوتے اور معاشیات میں جو گہرا تعلق ہے اس کا سارا سلسلہ صدیوں سے۔ اب دو تین دن کی بات ہے دانت اور کیا مٹی کے ساتھ
برتا ہے۔ جیسے ہندوستان پر چڑھائی کی تو سیاستدانوں نے جو آپ اور ہم سب کی طرح کنگال ہو وہ کچھ ہوئے ہیں اعلان کر
دیا کہ چین پچھڑا ہوا ہے اور ہندوستان کو اپنا کر دنیا کا خواب دیکھ رہا ہے۔ یہ غلط ہے۔ اس غلطی کی صحت کا راز جوتے
کی معاشی اہمیت میں پوشیدہ ہے۔ آپ نے سنا ہو گا اور اگر بہت کم عمر ہیں تو ان کی طرح سے بھی نہیں سنا ہے تو اب سنیے۔ چین
اپنی عورتوں کے پاؤں کو لوہے کے جوتوں میں قید کر دیتے ہیں تاکہ ان کے پیر بڑے نہ ہوں۔ حسن کی طرح نہ ہوں۔ یہ حرکت
اس لئے ہے کہ وہ چلنے پھرنے سے عاجز ہیں کیونکہ اس طرح وہ اپنے پاؤں کے جوتوں کے مصارف سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ یہ
چینی جن کا کوئی سائنسی تجزیہ کرتا ہے خود جوتوں میں گزر کرتا ہے دوسرے ملکوں میں وہ بے شک کم جوتے کی
قیمت سے محفوظ کر لیتے ہیں۔ ماہر معاشیات نے جوتے کے اس نسخے کو اپنا کر جس پر عمل کرنے کا ثمرہ بتایا جیسے
ہندوستان اس کو بھگتا رہا ہے۔ اس لئے کہ ہندوستان میں جوتے کی صنعت سب دنیا سے زیادہ ترقی یافتہ ہے اور چین
سے فیض اٹھانا چاہتا ہے۔ اگر ہندوستان چین کو جیسی باتیں کرو تو جوتے ساز دینے پر رضامند ہو جائے تو چین راہ راست پر
آ جائے۔ اس سلسلے میں حکومت کا فرض ہے کہ وہ اس حقیقت کو جان کے جوتے کی صنعت کو فروغ دینے کے لئے کچھ
پالیسی بنائے۔

جوتے اور محبت کا ایک دوسرے سے گہرا واسطہ کیا جا سکتا ہے۔ یہی وہ قومی زر مبادلہ ہے جسے اگر

سے بدل دیا جائے تو گویا ساری دُنیا کے اور خصوصاً ہمارے مُلک کے اقتصادی مسائل حل ہو جائیں۔ ایک طرف چین [illegible] سرمایہ محفوظ ہو کر کام آنے لگے گا دوسری طرف دولت کی مساویانہ تقسیم عمل میں آجائے گی۔ یہ نازک بات ہے۔ اسے [illegible] نے آپ سے چوربازاری یا ذخیرہ اندوزی سے دس لاکھ روپیہ کمایا۔ اس کا سونا خرید لیا۔ زمین میں دفن کر دیا۔ یعنی [illegible] پیسہ جو قوم میں گردش کرکے ساری قوم کی قوت خرید میں اضافہ کرتا وہ بازار کے نقد لین دین سے نکل گیا۔ اب فرض کیجیے آپ نے [illegible] پیسے کے بجائے دس لاکھ جوتے کا بیش خریدتے تو ان کو کہاں رکھتے۔ [illegible] ... کس طرح چھپاتے۔ [illegible] یہ جتنے تو کرتے کیا؟ دوسرے الفاظ میں آپ اتنے ہی جوتے کمانے پر مجبور ہو جاتے جتنے کی آپ کو ضرورت [illegible] ساری دولت یعنی سارے جوتے بازار میں چلنے پر مجبور رہیں اور معاشی ترقی یقینی ہے۔

[illegible] نے اپنے جنسی فلسفے کی توضیح کے لیے بچے کی حرکات کا بڑی شدومد سے بیان کیا ہے۔ میں بھی اپنے [illegible] [illegible] تکنیک پر عمل کروں گا۔ جوتے کی محبت انسان کے خمیر میں شامل ہے۔ [illegible] طفولیت سے کہ [illegible] یا شعوری یا تحت شعوری پر جوتے سے چپکا رہتا ہے۔ مثلاً آپ اپنا جوتا اُتار دیں۔ بچہ فوراً اس کی طرف [illegible] [illegible] وہ کبھی دونوں کا ثبوت [illegible] [illegible] [illegible] کا تصور کیجیے جیسے [illegible] [illegible] بچے پر وہ کیفیت [illegible] ہوئی جو ایک معمولی جوتا پیدا کرے گا۔ پھر [illegible] سے ہٹانے کے لیے [illegible] اپنے آپ سے جدا کر [illegible] [illegible] [illegible] ثبوت ہے۔

[illegible] کے جوتوں کے ساتھ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اور اس نے اپنے پاؤں سے [illegible] اپنے [illegible] ساری دُنیا کے پیروں پر [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] پیروں [illegible]

[illegible] انسانیت میں [illegible] ہے علاوہ انسانیت کی تعریف میں بڑی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] انسان جوتا نہیں پہنے ہو تا وہ انسان سے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] روشنی ڈالنے کے لیے مثال دیتا ہوں۔ آپ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] تو آپ کی [illegible] ہو جائے گی اسی طرح آپ [illegible] [illegible] بڑے پیسے ہوں لیکن قیمتی جوتا آپ کی ذات [illegible] [illegible] وقار بحال رہے گا۔ [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] کی پیدائش ہوئی دُنیاؤں میں اب وہ [illegible] جہاں جوتا [illegible]

[illegible] واضح صاف۔ پوری آمد سے پہلی غزل گیا ایک گھر کے جوتوں کی الماری ہے جس میں غزل کے اشعار کی [illegible]
[illegible] اور نظموں کے جوتے جگمگاتے ہیں۔ نظم بھی اس شباہت کی صحت میں برابر کی شریک ہے۔ نظم کا ہر شعر ایک [illegible]
[illegible] ہوتا ہے اور پوری نظم [illegible] خیال کی وحدت میں پیش کرتی ہے جس طرح کسی ایک شخص کے جوتوں کی
[illegible] اس شخص کی [illegible] ذوق کا ایک ہی نظام میں پوری طرح دیتی ہے۔ [illegible] نظم پورے گھر کے افراد کی [illegible]
[illegible] مختلف شاعروں کی شاعری [illegible] ہوتی ہے۔

[illegible] تشبیہ شباہت [illegible] جس نے جوتے کے ساتھ [illegible] سلوک کیا ہے جو اشعار میں [illegible]
[illegible] شاعر نے محبوب کے رخسار کو چاند سے اتنی مرتبہ اور اتنے چیزوں سے تشبیہ دی [illegible]
[illegible] ہوکر رہ گیا [illegible] شاعر نے جوتے کی طرف توجہ دی [illegible] جنت کے [illegible]
اور محبوب کے رخسار دونوں سے بیک وقت تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ خدا نے بات باقی انسان نے [illegible] پیدا کر دیا۔
[illegible] انسان نے [illegible] بنایا۔ یعنی جو بات آسانی سے فطرت پر انسانی [illegible] کی علامت بن سکتا تھا [illegible]
[illegible] محبوب کے جو [illegible] اور جنت کی خوشبو سے [illegible] نسیم [illegible]
[illegible] جوتے کے پچھلے حصے سے [illegible] اور [illegible]
[illegible] شاعروں کو کیسا لگتا ہوتا ——— پہننے والے کی توہین نہ ہوتی ہو۔
جس طرح [illegible] زمانے کے ساتھ ساتھ نئی نئی شکلیں اختیار کرتا ہے اسی طرح [illegible] جوتوں میں [illegible]
[illegible] شاعر جوتوں نے غالب اور [illegible] کی شمع اور [illegible] ساز شاعر کو جنم دیا۔ [illegible] کی طرح [illegible]
[illegible] جوتوں نے [illegible] اور [illegible] کا استعمال عام کر دیا ہے۔ [illegible] رفتار کی [illegible] تربیت کرتے۔
[illegible] شاعروں کی قوت تخلیق پر [illegible] کرتے ہیں اور نیا ادب [illegible]۔

[illegible] ایسے جوتے [illegible] ہیں جو انفرادیت کے [illegible]
[illegible] جوتوں کو پہننے کے لیے [illegible] پیش کرنا پڑیں گے۔ [illegible]
[illegible] ایسی خاص تکلیف بھی نہ ہوگی۔ [illegible] کے بعد [illegible] انفرادیت سے
[illegible] ایسے ہے [illegible] پہنے جا سکیں گے [illegible] مذاق۔ [illegible]
[illegible] جوتوں سے متاثر ہو کر ایسی نظمیں [illegible] وجود میں [illegible] کے لیے [illegible]
خاص [illegible] کے لیے ساعت کی ضرورت [illegible] جوتوں کے [illegible]
[illegible] کرے گا۔

[illegible]

میں نہیں کہہ سکتا کہ ادب کا آخرت سے کیا تعلق ہے لیکن ہونے کا ہے۔ ہماری کمپنی کی مشرقی برانچ کے مسلمان بھرنے میں ہوتے وقت کہتے ہیں جنہیں پہن کر گزرنے پل مراد ہے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے بغیر دقت کے گزر سکیں گے۔ میرا مشورہ ہے کہ ادیب اس خاص ضمن میں بھی جوتے کی ترقی سے فیض اٹھانے کی کوشش کریں۔

ابھی کہنے کو تو بہت سی باتیں باقی رہ گئی ہیں میں نہیں کہہ سکتا کہ اس ادبی اجتماع میں مزید جوتے کا ذکر چلے۔ اس سے آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔ اور آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے پورے سکون اور خلوص کے ساتھ میرا خطبہ سنا۔

(ہال دیر تک تحسین آمیز تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے گونجتا رہا۔)

قاتل

اشفاق احمد

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کے ہمراہ سے چوکھٹ سے پکڑ لیا اور تین جھٹکے دے کر ایک دھپ اس زور کا اس کے کندھے پر مارا کہ اس کی آنکھوں کا ڈیلا سپنولیوں کی طرح باہر نکل کر سفید فرش سے اور خوشبودار گالوں پر ہو گیا۔

تیسرے دن محمد سلیم پر استغاثہ زیر دفعہ ۵۰۹/۲۹۴ ہو گیا۔ وارنٹ جاری ہوا تو بیوہ ماں بچھاڑ کھا کر گر پڑی۔ ماموں مسعود شاہ دوڑا آیا۔ بجرے کا دوست ڈاکٹر عزیز نے ضمانت بھری۔ کالے کوٹ والے شعبان خان نے عدالت سے استغاثے کی نقل حاصل کی تو محمد سلیم کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ مرقوم تھا:

جناب عالی! مستغیثہ حسب ذیل عرض پرداز ہے

مکان ہر دو فریقین ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں بلکہ ایک دیوار مشترکہ رکھتے ہیں۔ بوجہ موسم گرما فریقین اپنے اپنے کوٹھوں پر رات کو سوتے ہیں۔ مستغیثہ با عزت بیوہ ہے۔ ملزم ہر صبح اٹھ کر اپنے کوٹھے پر مستغیثہ کی جانب منہ کر کے بر روز بہ نیت توہین شرمساری مستغیثہ برہنہ ہو کر پیشاب کرتا ہے جس سے شرمساری کی توہین ہوتی ہے۔ چنانچہ کل صبح ملزم مذکور اسی طرح پیشاب کر رہا تھا۔ مستغیثہ کے منع کرنے پر فحش گالیاں بہ نیت توہین بالقصد دینی شروع کر دیں۔ لہذا استدعا ہے کہ ملزم کو سزا دی جائے۔

فدویہ: شاہو بیوہ ہیرا لال ریٹائرڈ ساکن کشن نگر گلیاں

پیر غازی روڈ اچھرہ۔ لاہور

جب محمد سلیم حاضر عدالت ہوا تو اس کا سارا وجود بید کی طرح کانپ رہا تھا اور اس کے حلق میں خشک مٹی کا ڈھیلا اٹکا ہوا تھا۔

لیکن اس سارے واقعے کا محمد سلیم کی کہانی سے کوئی تعلق نہیں۔ محمد سلیم کی اصل کہانی نہیں۔ یہ تو اس واقعے کا ذکر ہے جب اس نے پہلی بار عدالت کا منہ دیکھا۔

محمد سلیم صحت مند اور شریف نوجوان تھا اور متوسط درجے کی امیر بیوہ کا اکلوتا ہوتے ہوئے بھی اس کے صرف ایک عورت سے تعلقات تھے اور یہ تعلقات بے حد ذاتی نوعیت کے تھے۔ محمد سلیم کو تھوڑی سی آسودگی میسر آ جاتی اور دوسرے فریق کو تھوڑی سی مالی فراغت۔ اس بات کا علم اس کے گھر والوں کو تھا لیکن کسی نے اس معاملے پر خصوصی توجہ نہ دی تھی۔

ایک رات کوئی ڈیڑھ بجے کا عمل ہو گا کہ اچانک محمد سلیم کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے باہر بازو میں کچھ جیسے ... ہوا تھا۔ اس نے رات کی خاموشی میں پوری توجہ سے آواز کی طرف دھیان دیا ... اور پھر یہ آواز واضح ہو گئی۔ پھر اچانک ... جیسے کوئی تیز دھار آلہ ... محمد سلیم نے خوفزدہ ہو کر ... دو دفعہ ... اور پھر محمد سلیم ... گئی۔

سلیم نے کہا: میرے بازو میں درد ہو رہا ہے۔

لڑکی نے بازو کو ٹٹولا، جیسے بہت کچھ ڈھونڈ رہی ہو، پھر بولی: یہاں درد ہو رہا ہے؟

نہیں، وہ تو سلیم نے کہا: تم تو کوئی فرشتہ معلوم ہو۔ یہ لڑکی اور تم جیسا کوئی خوفناک ہوتے:

خوفناک شے کا نام سن کر لڑکی زور سے ہنسی اور اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب آواز سے کہا: مجھ کو!

ہے کیا؟

نہیں، لڑکی نے اسے اچھا سمجھتے ہوئے کہا: تم سو جاؤ۔

جب وہ سو گیا تو سلیم نے تھوڑی دیر بعد کہا کہ میرا ہاتھ بیکار ہو گیا تو میں کیا کروں گا؟

لڑکی پھر ہنسی اور کہنے لگی: دیکھا تیرے دماغ سے کوئی نہیں نکال، اس لیے تجھے بُرے بُرے خیال آتے ہیں۔ پھر اس نے کہا کہ سلیم کے بازو میں پھر سے ایک نئی دوا لگائی اور سلیم اس کا سر تھپتھپانے لگا۔

تھوڑی دیر بعد جب سلیم کے دماغ کی گرمی نکل گئی اور بات ذرا سمجھ میں آئی تو لڑکی نے پوچھا: بتاؤ اب بھی درد ہو رہا ہے؟

ہاں ہوں: سلیم نے سر ہلایا۔

پھر؟

پھر کیا: سلیم نے کہا: اس میں تمہارا ہی کمال ہے ورنہ تو بڑا برا حال ہو گیا۔

ہاں، یہ ہمارا کوئی کمال نہیں۔ لڑکی چپ ہو گئی اور پھر جیسے رو رو کر خاموش ہو گئی۔

صبح جب وہ تینوں چائے پی رہے تھے تو لڑکی نے کہا: اشرف پتہ ہے رات سلیم کے بازو میں کتنا درد تھا؟

اشرف نے آہ بھرتے ہوئے فکر میں سر ہلایا۔

وہ تو میں نے کوئی گھنٹہ بھر اس کی مالش کی ورنہ یہ تو کسی اور کو بھی پریشان کر دیتے۔

اشرف ہنسا اور بہت ہمدردی سے سلیم کو دیکھ کر بولا: بازوؤں میں درد ہونا تو ہوتا ہے اس میں وہم ہے، وہم کی کیا بات تھی؟

سلیم نے کہا: کچھ نہیں میں ہی کچھ خوف سا کھا گیا تھا۔

اور اب؟ لڑکی نے پوچھا: اب تو کوئی خوف نہیں کسی قسم کا؟

اب تو مجھے یاد بھی نہیں کہ میرے بازو میں درد تھا یا نہیں۔

وہ چائے پیتے رہے، کمرے میں گرمی بڑھتی رہی اور ایک ایک کر کے کپڑے بدلتے رہے۔ لڑکی نے اشرف کے بوٹ پالش کیے، سلیم نے اپنے بوٹوں پر برش پھیرا۔ لڑکی نے اپنے پاؤں کے ناخن کاٹنے شروع کیے۔

پھر اشرف دفتر چلا گیا اور سلیم اپنے گھر روانہ ہو گیا۔ اور لڑکی چولہے کا تیل دے کر سبزی بنانے لگی، چائے اور گوشت

عزیز نے کے چہرے کی شکن ملک سادہ ہو گئی۔

لیکن اس بات کا بھی سلیم کی طرف سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ تو صرف اس قدر کہ اس کے بازو میں پہلی مرتبہ درد اُٹھا تھا۔

ایک شام سلیم تیز سڑکوں کو چھوڑ کر مسجد میں عصر کی نماز پڑھ رہا تھا کہ پہلے سجدے سے اُٹھتے ہی سینے میں ذرا سی تکلیف محسوس ہوئی اور دوسرے سجدے پر وہ کوشش کے باوجود اُٹھ نہ سکا۔ ابھی سینے میں پھر جب تکلیف کی ٹیس اُٹھی اور وہ الٹ کر منہ کے بل صف پر لیٹ گیا۔

جب دل کی دھڑکن دوبارہ بحال ہوئی اور سینے پر زور کا ٹھنڈا پسینہ آیا تو سلیم نے آخری مرتبہ اُٹھنے کی کوشش کی۔ یہ کوشش کامیاب رہی اور وہ آہستہ آہستہ چل کر ستون کی دیوار کے ساتھ ٹیک کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اُس نے اپنے جسم کو ٹٹولا۔ سب ٹھیک تھا۔ اُس نے دو مرتبہ اپنی پسلیوں کو ٹٹولا اور چپل چھوڑ کر مسجد سے باہر نکل گیا۔

اس کے جگری دوست ڈاکٹر عزیز نے پھر کریدا اور اس کی ایک ٹیسٹ دُور دھیان کی اور ہدایات لکھ دیں۔ اس سے پورا کمزور رہا لیکن نہ اس قدر کہ بیماری کا خوف اس کے دل سے دور ہو جاتا۔

سلیم کو ہسپتال میں داخل ہوئے پورے پندرہ دن ہو چکے تھے اور اس کا ہر طرح کا ٹیسٹ ہو رہا تھا لیکن بازو میں درد کے بار آتے تھے۔ ایک شام جب تکلیف میں بے حد اضافہ ہو گیا اور ڈاکٹر سرجن نے درد کے لئے [illegible] کا ٹیکہ دیا تو وہ مُردوں کی طرح سفید تکیے پر سر رکھ کر گہری سو گیا۔ بازو سرجن بڑی دیر تک اس کی پائنتی پر بیٹھا اس کے تنفس کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کی چھاتی پانی کی طرح اوپر اُٹھتی تھی اور پھر اسی طرح نیچے بیٹھتی تھی۔ کوئی تیس سال سے تیس کا پھیلاؤ ہو گا۔ بازو سرجن کو اس شخص سے اس پر بہت ہی ترس آیا۔ وہ بڑی دیر تک اس کے چہرے کے خدوخال اور اس کی شکل و شباہت کو بغور دیکھتا رہا پھر اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھا۔ سلیم کے سرہانے گیا۔ اس کے بازو کو چھو کر اپنے آپ سے کہنے لگا یہ میں ہے یقیناً اسی کا ہے۔

دوسرے دن ڈاکٹر شفیع نے ڈاکٹر عزیز کو ہسپتال بلایا اور اپنے پیارے شاگرد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا: عزیز یہ تمہارا دوست ہے؟

عزیز کا چہرہ خوشی سے سرخ ہو گیا اور اس کی آواز حلق کے اندر ہی رہ گئی۔

”بیمار؟“ ڈاکٹر شفیع نے کہا: اسے کیا ہوا ہے اگر یہ تمہارا دوست نہ ہوتا تو بھی میری تشخیص یہی ہوتی۔“

عزیز نے کہا: ”سر ڈاور سپینٹ ......“

”[illegible]“ ڈاکٹر شفیع نے ہنستے ہوئے کہا اور مسکرانے لگا۔ اس کی مسکراہٹ میں ایک حقیقت کی تلخی چھپی ہوئی تھی ... سب تھے۔

ڈاکٹر عزیز نے کہا: تو پھر سر ... سیز بعث ... اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ تیمور اسے کیا ہوا ہے؟“

”یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے“ ڈاکٹر شفیع نے کہا۔ ”بس ہو گیا۔ اور جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب کوئی کر بھی کیا سکتا ہے۔ میرا

[illegible]

[illegible] ڈاکٹر عزیز نے [illegible] تمہارا [illegible] زندہ نہیں رہ سکتا؟

[illegible] ڈاکٹر شفیق [illegible] ... وہ [illegible] ہیں؟

ڈاکٹر عزیز نے کہا [illegible] ڈاکٹر صاحب ... [illegible] آپ

[illegible]

شکریہ ... شکریہ ... شکریہ، ڈاکٹر شفیق نے [illegible] جواب [illegible] ہاتھوں سے

گریبان پکڑ لیا ہو۔

آپ کیا ہے؟ ڈاکٹر عزیز نے پوچھا

[illegible] ... [illegible] ڈاکٹر شفیق نے کہا [illegible] اثر کم ہوتا

ہے تو ......

[illegible] اثر [illegible] ہو گیا تھا اور [illegible]

تھا ...

[illegible] تو اس نے اپنے [illegible] کس طرح

[illegible] اور جب میں نے اس کے [illegible]

[illegible]

[illegible] اور جب اس کے [illegible]

اگلی صبح جب [illegible] ... [illegible] تو میں نے آنکھیں کھول کر [illegible]

[illegible] ڈاکٹر عزیز [illegible] ڈاکٹر تھا وہ [illegible]

ڈاکٹروں کے [illegible] میں [illegible] تحقیق میں [illegible]

ایسی باتیں [illegible] نہیں۔

تو میں نے کہا: ڈاکٹر صاحب کاش آپ نے اس بارے میں کوئی تحقیق کی ہوتی [illegible] ایک [illegible]

[illegible] ہونے تک آپ کو اندازہ ہوتا؟

ڈاکٹر شفیق نے کہا: [illegible]

کیا آپ کے پاس اس کا کوئی علاج ہے؟ ڈاکٹر عزیز نے پوچھا

ہرگز نہیں، میں نے کہا: [illegible] اس کا کوئی علاج ابھی تک دریافت نہیں ہوا

پھر وہ [illegible] ڈاکٹر [illegible] اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر وہاں سے چلے گئے۔

دس سال تک پھر مسکراہٹ نے مشرف کی بیوی کو دیکھا جس نے اپنے بیگ سے ایک شیشی کانپتے ہوئے ہاتھ سے نکالی اور اُسے
سلیم کی طرف بڑھایا۔ اس نے چیل کی طرح وہ پیکٹ جھپٹا اور جیسے پیکنگ کرتا ہوا وہ شیشی لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔
اس کے بعد مشرف اور اس کی بیوی کا دورہ دوسری دفعہ شروع ہو گیا۔
سلیم کا باوجود یکہ وہیں گلا گھونٹ کے ادھار کے کھے جاتے تھے پیسہ ـــ اس کی تکلیف میں کمی نہ ہوتی تھی نہ اسے نیند آتی تھی۔
ہر وقت بیٹھا بیٹھا رہتا تھا۔ دوا کا کمال کا اثر ختم ہو گیا تھا۔ سر آہنی پٹیوں سے جکڑا کر لہو لہان رہتا تھا۔ اس پر بھی اُسے زندہ رکھا ضرور تھا
جو زندہ ہے کچھ بھلے آدمی کو مار دیا نہیں جا سکتا۔ وہ نہیں جانتا ہے۔ بیٹے کا خیال بھی نہیں کرنا چاہیے۔
ڈاکٹر دوستی نے آپریشن ٹیبل پر لٹا کر اس کے ماموں سے کہا: ڈاکٹر کا کام زندہ رکھنا ہے ڈاکٹر کی ہر حرکت اسی کوشش پر
مرکوز ہوتی ہے کہ زندگی چاہے زندگی کم تر ہو۔ ہم لوگوں کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں آگے اس کی مرضی۔"
"اس کی مرضی کا ہمیں تو پتہ بھی نہیں چلتا۔" ماموں نے کہا اور ڈاکٹر نے آپریشن تھیٹر کے دروازے بند کر لیے۔
کوئی ڈیڑھ کے قریب شام ہسپتال کی بالٹی میں محمد سلیم کا کٹا ہوا بازو اس کے ماموں اور اس کی ماں کے سامنے لایا گیا اور دونوں
ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر دھاڑیں مارنے لگے۔
ڈاکٹر محمود شاہ نے کہا: اگر آپ یہ بازو ہمیں مطالعہ اور دکھانے کے لیے دے دیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔"
"اور اگر آپ چاہیں" ڈاکٹر شفیع نے کہا: "تو آپ اسے باہر دفن بھی کر سکتے ہیں۔ یہ آپ کی ملکیت ہے۔"
محمد سلیم کی ماں نے روتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے کہا تم لے لو۔ تم رکھو۔ ہمیں کیا لینا ہے اس بازو سے۔ ہمارا
تو بستر ہی لیا ہے۔"
بازو کٹنے کے بعد سلیم کے چہرے پر سرخی دوڑنے لگی۔ درد غائب ہو گیا اور پندرہ دن بعد جب اس نے حجام کو بلوا
کر شیو کرائی تو نرس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔
پورے پینتیس دن بعد جب وہ ہسپتال سے نکلا تو ڈاکٹروں نے اسے گھیر کر کہا کیوں سلیم صاحب ڈاکٹر قاتل ہوتا ہے یا مسیحا؟
میرا سر شرم سے جھک گیا۔ ڈاکٹروں نے ایک دوسرے کو مبارکباد دی اور تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو کر دل ہی دل میں مسکرا کر
دیا۔

اس رات مشرف کی بیوی نے سلیم سے کہا: "تم ہی! تمہاری بچی تو پہلے سے بھی زیادہ سخت ہو گئی ہے۔"
سلیم نے کہا: "دیکھا پھر یوں ہوتے ہیں یاروں کے جٹ چچے۔" وہ لڑکی ہنسی اور اس کے گلے ہوئے منہ پر ہاتھ پھیرنے لگی۔
لیکن محمد سلیم کا اصل کا ذکر یہ نہیں۔ یوں اس کا ایک رشتہ ضرور اصل کا لے سے بندھا ہے۔
چھ ماہ بعد جب محمد سلیم نے سدی گیٹ کا ایک بیچ کر اسے پر لگا دیا تو اس کی ماں نے اپنے اکلوتے بیٹے کے خلاف ایک اشتہار
دے دیا کہ محمد سلیم اور عبدالکریم کا اس سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی متوفی عبدالکریم کی جائیداد پر کسی قسم کا حق نہیں اس لیے جو
اب محمد سلیم اور عبدالکریم سے لین دین کرے گا وہ نفع نقصان کا خود ذمہ دار ہو گا۔

[illegible] ۔

دیکھنے کے بعد ٹھیک دو بجے [illegible] ۔

ایک رات وہ اپنے کمرے میں بیٹھا تھا [illegible] ۔

[illegible] ۔

[illegible] ۔

[illegible] ۔

[illegible] ۔

نے پوچھا : یہاں کیا ہو رہا ہے ؟

جس سمت میں ابراہیم گیا تھا ادھر دیکھو ۔

سوال یہ ہے : کیا آدمی نے کیا ۔

ابراہیم نے [illegible] ۔

[illegible] دونوں [illegible] آنکھوں سے [illegible] ۔

[illegible] ۔

[illegible] ابراہیم [illegible] ۔

[illegible] ابراہیم اپنے [illegible] ۔

آہستہ آہستہ دونوں کی چیخیں نکل جانے لگیں ۔

[illegible] ۔

[illegible] ۔

ابراہیم [illegible] اس کے پیٹ میں مار کر [illegible]

[illegible]

پھر اس نے [illegible]

[illegible] پر لیٹ گیا ۔

دوسرے دن صبح جب اس نے [illegible] دیکھا ۔

[illegible] ابراہیم [illegible] ۔

اے روشنیوں کے شہر

[illegible] الٰہی

نگ بیز پہنت پر بیٹھے ہوئے تھے، عزیز و اقارب، دوست احباب اور سہیلیاں بارات بن گئی تھی، صرف دلہا کے تسنے
[illegible] یوں لگا آج شہر میں جگہ جگہ منقش شامیانے قناتیں لگی تھیں، برقی روشنی کے شادیانے بج رہے تھے، گلابی ہار سے تھے
[illegible] سے لوگوں نے شادیاں رچائی تھیں۔
سب معمول امارت سے طیارہ مقررہ وقت سے چند منٹ پہلے آگئی........ وہ طیارہ جسے فضا میں دیکھ کے
[illegible] جاتے تھے آج اس پر نظر پڑتے ہی کلیجہ منہ کو آرہا۔
جب جیٹ طیارہ ایک عجیب پرندے کی طرح چیختا ہوا، رن وے کی سطح کے متوازی ہو گیا تو دل سے بے اختیار نکلا
ساربان آہستہ راں کہ آرام جان در محمل است
عرصے کے بعد جب طیارے کراچی میں نانی اماں کے مکان پر سے پرواز کرتے تو وہ ہمیشہ کہہ اٹھتیں۔
"خدا کی خیر سب مسافروں کی خیر۔
جو گھروں میں تم جا رہے ہو ان کی خیر"
ان دنوں میں سادگی اور نیکی جھلکتی تھی۔ آج ایک طیارہ مشرقی پاکستان کے نامعلوم دیاروں پر سے اڑا تھا، اس کے سینے
[illegible] رہا تھا جو ان کے پیارے کا جسد خاکی وہ رہا تھا (شاید کی امانت، مٹی کو مٹی کے سپرد خاک کرنے کے لیے) بیوی کا اثاثہ، بچوں
[illegible] کا، بچوں کا خاموش باپ، وہ ایک بے حد شفیق باپ تھا۔ ایک فیاض اور بہت اچھا شوہر، ایک مخلص دوست، بچوں
[illegible] جانے والا، ان کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں برابر کا شریک، انھیں پلک پہ بٹھانے والا........ یہ اس کی
[illegible] کرتا اور نیکی جب اس کے بستر میں سو جاتیں تو رات گئے، سونے سے پہلے وہ خود انھیں اپنے اپنے بستروں میں لاتے
[illegible] جب وہ جینے کے لیے مرگئے تو میں نے صفیہ سے پوچھا تھا۔ سب اپنے ابا کو بہت [illegible] کرتی ہوگی، تو صفیہ
[illegible] شاید کچھ بھی پڑتی ہے۔ آج جو صاحب بھی ہے پاپا اب ہے تو اس سے کوئی جواب ہی نہیں ملتا۔ بیٹے تمھارے ابا کہیں
[illegible] کہ سب بچیاں تم انھیں کبھی نہ دیکھ پاؤ گے، وہ دور دیس چلے گئے، بہت دور، انسانی دسترس سے دور....
[illegible] کے لیے تو سفر ایک عام سے زیادہ نہ تھا، اس میں تکلیف تھی نہ کشمکش، چند لمحوں میں وہ زندگی کی حد سے آزاد ہو چکا
[illegible] کا حصہ تھا جو حیات ڈیلے ہوئے کام ختم ہو سکتے، بچوں کی تعلیم ہی ادھوری تھی، اس کے بڑی بچی
[illegible] ایسا بیمار تھا، اس میں دل لگے رہتے تھے، لیکن اس کی زندگی کا پروگرام ختم ہو چکا تھا۔ آفتاب نصف النہار پہ تھا کہ

[illegible] اور بہت [illegible] [illegible] SPECTRUM [illegible]

[illegible]

[illegible]

میرا راجا بیٹا چاند کا ٹکڑا ہے

وہ میرے سر کا تاج ہے

[illegible] —————— اپنا پیارا ——————

[illegible]

[illegible] .... [illegible]

[illegible] ....

میت کی منزل کی تیاری مکمل ہو چکی تھی، ہر کوئی بے نیاز ہو کر اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا تو کوئی دیوانہ وار اس کے منتظر ہو رہا تھا، دونوں کنارے بیٹھے بیٹھے تھے، سمندر کی لہریں کنارے سے ٹکرا ٹکرا جاتیں لیکن ان کا زور کم نہ ہوتا تھا، جب اسے اٹھا کر لے چلے تو ایک شور بپا ہو گیا، ایک اندوہناک گریہ و زاری کا۔

"یارو کیا غضب کر رہے ہو، اسے کہاں لیے جا رہے ہو؟" (اس فریاد میں انسان کی بے بسی کی داستان مضمر تھی۔ روزِ ازل سے یہ فریاد گنبدِ گردوں تک جاتی ہے اور صدائے بازگشت کی طرح خالی ہاتھ لوٹ آتی ہے) اسے وہاں لے جا رہے ہیں جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا، جس کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں، آنسوؤں کا سیل رُکنے میں نہیں آتا تھا۔

نہیں ٹھہرتا اُن کی رُخصت کا وقت
وہ رو رو کے جینا بلا ہو گیا

اس سنسان اندھیری رات میں آخری ساتھ دینے والے عزیز غم سے چُور خاموشی سے راستہ طے کر رہے تھے، ہر کوئی اپنے سوچ کی دنیا میں گم تھا تو کوئی کسی حیران غریب "درماندہ راہرو" کو سہارا دیے ہوئے تھا۔ قدموں کی مدھم چاپ اس خاموشی میں مخل ہو رہی ہو۔

ڈھاکہ سے غم زدہ بیٹیوں نے پُرسوز آواز کے ساتھ رُخصت کیا تھا۔ اب اپنوں نے دل پہ پتھر رکھ کے آخری رسم کی ادائیگی شروع کی، قبر تیار تھی اور اپنے مکین کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔ مضافات کی روشنیاں شمار ہو رہی تھیں، قبرستان میں صرف روشنی تھی، قدرے دور شہر کی بتیوں کی ضو۔ قدیم گھنے اشجار تھے اور پیڑوں سے دور سے نور ستے ہوئے، جیسے اندھیرے میں تار چمکے اور ایستادگی کی ختم شروع ہوئی تو عزیزوں نے اس پیکرِ اخلاص پہ آخری نظر ڈالی۔ اب چند لمحوں میں دروازہ بند ہوا چاہتا تھا، چند لمحوں میں آخری رشتہ منقطع ہوا چاہتا تھا۔ وہ ازلی تنہائی جو زندگی بھر انسان کا ساتھ دیتی ہے اب مجبوریوں کی حقیقت میں جلوہ گر تھی، کیفیتِ غیب و شہود سمجھنے کی ساعت آن پہنچی تھی۔

اے اجل! اے ساعتِ عشرت اثر یا
زندگی کی اے وفا نے آخر یہ
اپنا بیگانہ نہ ہوگا جب کہ پاس
رنگ جیسی کر رکھتے ہیں جلوے کی رات
میں کنول ہو کے کھلوں گی رات میں
اپنے آپ سے ملوں گی رات میں

قصہ مختصر، میرا ماموں زیرِ زمین چھپ گیا، وہ کھلتا ہوا شفیق چہرہ گل ہو گیا۔ وہ شمع جو مشرقی پنجاب میں طلوع ہوا تھا آدھی رات کے وقت مغربی پنجاب میں آ کر غروب ہوا۔ اگرچہ مشرقی پاکستان کی دعوتِ شیریں سے وہ کچھ گھڑی کو دلی خاموشاں کا سفر ہی میں کٹنے ہی سے ہو گیا تھا، مشرق سے مغرب تک کا سفر، زندگی سے موت تک کا سفر۔

ہم کہتے ہیں یا نہ ہم ہو سکے کے بعد [illegible] ہم [illegible] کی [illegible]

قتل ہونے سے چند دن پہلے [illegible] شعر [illegible] بھی تھے۔ یہ پیاں [illegible] ایک ساتھی کی [illegible]

اور [illegible] میں [illegible] زمین [illegible] دن [illegible] ہو گئی۔ [illegible] کے ہاتھ [illegible] کی [illegible] ہے

سے [illegible] کے [illegible] جنگ [illegible] اور [illegible] کو [illegible] نہ ہو۔ [illegible] کی [illegible]

[illegible] میں [illegible] ایک [illegible] کے سپرد کیجیے۔

یہ [illegible] نہیں ہوتے [illegible] کم نہیں ہوئی [illegible] ایک [illegible] زندگی [illegible]

[illegible] زندگی [illegible] پھر بھی رہتی ہے۔

.... جب میں نذیر بھائی کے متعلق سوچتا ہوں تو مجھے یاد آتا ہے کہ ان میں [illegible] کوئی خاص بات نہیں ہوتی تھی [illegible]

[illegible] وقت [illegible] ایک [illegible] چند [illegible] نے [illegible] دیکھا [illegible] سے [illegible]

[illegible] نہ [illegible] زندگی کے [illegible] کوئی فرق نہیں [illegible]

[illegible] یاد [illegible] سب [illegible] کرتے تھے [illegible] پھر [illegible] میں [illegible]

[illegible] کے [illegible] سب [illegible] ہو گئیں۔ [illegible] کے [illegible] کی [illegible]

[illegible] سے [illegible] ہو۔

ڈرتے ڈرتے [illegible] ہوتے [illegible] نذیر [illegible] کو [illegible] ہو گئے تھے۔ [illegible] سال [illegible]

[illegible] میں [illegible] سال گزر گئے [illegible] وقت

[illegible] نہیں [illegible] ایک [illegible] نذیر بھائی [illegible] آنکھ اور [illegible] سے

بے اختیار [illegible] محبت [illegible] بات کر کے [illegible] ہو گئیں۔ [illegible] کے

پہلے [illegible] سے [illegible] تھے اور [illegible] میں [illegible] ختم ہو گئی

[illegible] میں سوچتا ہوں جب [illegible] ہو جاتے ہیں [illegible] ہوتے ہیں [illegible] کی حفاظت کرنے

والے [illegible] ہوتی ہے [illegible] یادوں کے [illegible] میں [illegible] ہیں۔ [illegible]

[illegible] ہے۔

اور نیاز صاحب ایک [illegible] میں شادی کی تقریب تھی۔ خوب گہما گہمی تھی۔ خوشی کے شادیانے بج رہے تھے کہ ایک

دوست نے مجھ سے آکے کہا: تم نے سنا آپ کے نیاز [illegible] کے حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ [illegible] زندگی [illegible]

[illegible] پر [illegible] تھی۔ [illegible] کے [illegible] میں [illegible]

[illegible] ہے [illegible] سے [illegible] سے [illegible]

اس روز جب [illegible] سے [illegible] تھا۔ جب [illegible] کے [illegible] سفید [illegible] سے

رکھی تھی اور جیسے پہلے پڑاؤں سے ہی وہ آرزو کی تھی اُس روز نیاز احمد مرگئے۔ نیاز احمد جو مشاعروں کی جان تھا جسے ہزاروں منتخب شعر زبانی یاد تھے جس کے چلتے شعر کو زمین پر بیٹھ کر داد دیتے تھے جب ہم اُسے کبھی نہ دیکھ پائیں گے اور مجھے نیاز احمد کے وہ الفاظ یاد آگئے۔

"آخر ہمیں ایک روز اس جہان سے جانا ہے ورنہ ہمارے بچوں کے لیے جگہ کہاں

رہے گی۔"

مجھے کیا معلوم تھا کہ چند ہفتوں میں ٹرانسپورٹ اتھارٹی کے سربراہ کا جسم خاک و خون میں غلطیدہ چلتی سڑک کے کنارے پڑا ہوگا۔
بے یار و مددگار ——— منزلِ عشق پہ تنہا پہنچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی۔

باغ جناح کے اوپر پندرھویں رات کا چاند اپنا ازلی سفر طے کر رہا تھا۔ خنک ہوا سبز درختوں میں سرسرا رہی تھی اور وہ گنجینۂ شعر و حکایت منوں مٹی کے نیچے دفن ہو چکا تھا۔

خدا بخشے وہ عجیب آدمی تھے۔ چھوٹوں کے ساتھ شفقت اور بے تکلفی۔ دنیاوی معاملات میں حق گوئی اور بے باکی۔ انسان دوستی [illegible] حیدر آباد چھوڑے انھیں کئی سال ہو گئے تھے لیکن مجھے کئی بار فرمایا: "اِن دنوں حیدر آباد کے غریب لوگوں کے لیے کچھ کیا، میاں دیکھ [illegible] [illegible] کیسی ہے؟ حیدر آباد پبلک سکول کو کچھ امداد دی؟ وہاں بہت بیٹھ رہا ہے؟" یہ سکول انھوں نے حیدر آباد کی کمشنری کے زمانے میں بڑے شوق سے بنوایا تھا۔ اس بات کو کئی سال گزر گئے لیکن [illegible] کے باوجود اس علاقے سے [illegible] قائم تھا۔

دوستو! ہو سکتا ہے کہ آپ کو عمرِ رواں فرصت نہیں دیتی۔ یہ کمرہ بند ہے اوقات جو دروازے سے دبے پاؤں داخل ہوتی ہے وہ کام کیا کیا ہو کر آخرت کا کوئی حسرت نہ رہ جائے۔ اگر کوئی آدمی [illegible] کر کے پیشتر کر گئے ہیں۔ ہم فلاں فلاں نام اور بہت سے بے بسوں کے لیے وقف مقرر کرتے تھے۔ کسی دور افتادہ دوست کو پیار بھرا خط لکھنا تھا۔ کسی زخم پہ پھایا رکھنا تھا۔ تو آخر وہ سب کر لیجیے۔ عمرِ عزیز مہلت نہیں دیتی۔

کسی پارٹی میں ہم ایک ساتھ کھانے کے کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ نیاز صاحب نے میرا ہاتھ تھام کے کہا:

"اس شعر پہ غور کرو،

یہ عمرِ رواں کی مختصر ہے ....

باقی تمہاری زندگی میں یہ اچھا ہے [illegible] کا۔"

میں نے سوچا تھا نیاز صاحب اپنی لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی سے کئی مضمون لکھا کرتے رہیں گے۔ ان کے بیانات قلمبند کر لیے جائیں گے۔ یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ ہاں اور وہ بھی اردو ادب میں قبول ہو گیا تو ... جتنا کبھی ہو سکیں گے حقیقت اتنا راز قلب کا سب میں ہو جاتا ہے۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ نیاز احمد چلے گئے ہیں ....

اور اس جیسا ہی کے متعلق بھی ہم نے ذہنی کا شعور میں ہوگا۔ [illegible] ذہن مذاق کے لیے بہت جگہ بنے کے لیے

[illegible]

[illegible] ہوئی۔

[illegible]

خیال [illegible] زیادہ آرام [illegible]

[illegible]

[illegible] پشاور میں [illegible] قیام تھا [illegible]

[illegible]

"معاف کر دیا گیا ہے"

[illegible]

[illegible]

موت کی [illegible]

[illegible]

بنے والا شخص تھا۔ وہ یاروں دوستوں تعلقات اور شعر و ادب کی زندہ تصویر تھا۔ وہ کسی کی وفاداری نہیں کرتا تھا۔ طنز سے اجتناب۔ اُس
کے ہاں ہلکی پھلکی سی شائستہ ہنسی نہ ہوتا۔ نہ ہی اُس نے کبھی اپنی برتری ثابت کرنے کی کوشش کی۔ کوئی قریبی ہو یا غیر ہر ایک کی خدمت کے
لیے تیار۔ اُس کے عزیز اپنے عہدوں پر فائز تھے لیکن یہ اُس کے لیے فخر و مباہات کا موجب تھا اور نہ ہی رشتہ داروں کا چھوٹی جگہ
ہونا باعث ندامت۔ ہمیشہ شفقت کی نظر ہر کہ و مہ کے لیے۔

اس کی کوئی بڑی بھاری بھرکم شخصیت نہ تھی کہ پہلی نظر میں آنکھوں میں کھب جائے۔ اُس کی بھلی بھلی اور شرافت پیچھے سے ہم آہنگ
ہوتی تھی۔ وہ اپنا نے طور پر نئے گرد و پیش ہمدردی اور خیر سگالی کے اثرات بکھیر دیتا تھا اور آپ سوچتے تھے یہ شریف آدمی میرے
لیے کیوں پریشان ہو رہا ہے۔ یہ میرے لیے اتنا کچھ کیوں کرنا چاہتا ہے؟ اب وہ ہمارے درمیان نہیں دھڑکتے کا دل
ہے۔ لیے خاموش ہے۔ اُس کی یاد عزیز جاں ہے۔ جب ہم کوئی فاصلہ پہنچتے ہیں تو ہمیں یاروں کے چہرے ماضی کے دریچوں سے جھانک
کر پریشان کرتے رہتے ہیں چاہے وہ ایک بندہ ہے کی موت ہو یا ایک انسان کی .....

ہماری امیدیں، ہمارے خواب، ہمارے فیصلے ان کی کیا قیمت ہے۔ ایک مجبور اور بے بس انسان کی کیا قیمت ہے۔ وقت
ان سے آگے نکل جاتا ہے ......

میں سوچتا ہوں۔ نذیر اُس بے چھوٹے بھائی کی جان بچاتے ہوئے ڈوب گئے۔ جب انہیں ہسپتال لے جایا گیا تو اُس
وقت بھی چند سانسیں باقی تھے۔ اگر بروقت طبی امداد مل جاتی تو ...... نیاز احمد ڈار کے اندوہناک حادثے میں جان بحق ہو
گئے وہ ہوائی جہاز میں سفر کر رہے ہوتے تو شاید بچ جاتے؟ میں احمد بھائی کے متعلق میں کیا سوچوں؟ خود ڈاکٹر .... گھر میں مہمان
ہو۔ ادب و شعر کا شوق تھا۔ ہر بات میں اعتدال پسند اور اچانک ہی حرکت قلب بند ہو جانے سے جاں بحق ہوا!

احمد زندگی کا رس لے گئے۔ وہ ایک چراغ دے گئے۔ کیا ایک خاص عمر کے بعد انسان چوٹ کھانے کے لیے زندہ
رہتا ہے؟ کوئی کمال ہوتا رہتا ہے اور باوقت کے موت سے بھی کچھ نہ رہتا ہے۔

آج میں تنہا ہوں۔ عجیب ہے یہ چیزوں کا مجموعہ یہ ڈوبتے سورج کی ضیا اور چھپتی ہوئی شفق۔ یہ خوبصورت درخت
اور خاموشی۔ مدتوں سے میں زرد پتوں کی چادر بچھ گئی ہے۔ ان درختوں کی زندگی کی مسلسل میں دن بادل ... ان کا موسم
غروب آفتاب کے بعد میری نظر ایک ہلکی نظر ہی پڑ گئی تو دیکھتا ہوں آسمان کا ایک حصہ شفق میں ڈوبا ہے۔ پیچھے آگ سے
نکلتے دھوئیں سرد ہو رہے ہوں۔ پھیلتے آسمان میں دھواں ہے۔ یہ گرد و غبار ... آسمان کی طرف اٹھانے جتنا
... پتوں میں سے چاندنی کا گہرا نیلا نظر آ رہا ہے اور اس کے بیچ اوپر ایک روشن ستارہ ... آنکھ میں ... تر
... شرکت ... ہوا میں ... ایک ... بڑی ... ہوئی ... گزر گئی ... ہوا کے ... ہونے ... اب
... رات کی ... چاندنی ... دریچوں میں سے آتی ہے۔ ساری رات ... کر دینے والی سرد ہوا
بھی ہیں۔ دو مختصر سے ... ہوئے کر ... گئے ہیں

کتنی یادیں [illegible] زمانے کی [illegible] ہیں
کرتے پھرتے [illegible] خیال آتا ہے

[illegible]

[illegible] نہیں آئیں گے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ۱۲ [illegible] ۱۲ [illegible]

[illegible] کتاب [illegible] تھا۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

مٹی کا ادراک

جوگندر پال

نیچے بازار میں کھانا کھانے کے بعد ہم سب نے ہماچل کی پہاڑی کی جانب دیکھا۔

"پہلے ذرا سستا لیا جائے۔" رام ناتھ نے مشورہ دیا۔ "پھر اوپر جا کے گیسٹ ہاؤس دیکھیں گے۔"

"ہاں بھئی۔" ایرانی نے ڈکار لے کر کہا۔ "بھابی کا کھانا اتنا لذیذ تھا کہ کھا کھا کے اب پیٹ کا بوجھ ہی نہیں اٹھایا جاتا۔"

"آپ لوگ سستائیں۔" کیپٹن تیجا سنگھ کہنے لگا۔ "ڈاکٹر ملک، ہم اوپر چلیں۔" اس نے اپنی بیوی کو مخاطب کیا——"اور تم ——تم اور بھابی یہ سارے برتن دھو کر واپس موٹر میں رکھ دو——ڈاکٹر ملک؟"

ڈاکٹر ملک اپنے کپڑے جھاڑتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ "چلیے۔"

"چلو تم بھی اٹھو۔" رام ناتھ نے اپنی بیوی سے کہا۔ "اب زیادہ کرنے لگے کس کی پیش چلے گی؟"

میں نے ایرانی کے ساتھ ساتھ چلنا چاہا لیکن وہ قدم بڑھا کر مسز رام ناتھ کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ "بھابی، تمہارا کھانا——"

"ہمیں بھائی ایرانی۔" کیپٹن تیجا سنگھ نے گویا یکایک یاد آنے پر کہا۔ "آپ نے تو بڑا تھا کہ کوئی گائیڈ مل جائے گا۔"

"میں یہاں ہوں سرکار۔" ایک سفید ریش آدمی قریب ہی ایک بنچ سے اٹھ کر ہمارے پاس آ گیا۔

"تو چلو مولوی صاحب ہمیں پہنچا دو۔" کیپٹن تیجا سنگھ نے گویا اپنی فوج کا جھنڈا اسے سونپ کر آگے چلنے کا حکم دیا۔ "ڈاکٹر ملک—— ہونے لگے پیغمبر تو کیسا لگتا ہے بھائی ایرانی——"

"آپ پیچھے آ جاتے ہیں۔" اس نے اپنی [illegible] کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کیپٹن تیجا سنگھ کو جواب دیا۔

"اچھا اچھا، سمجھ گیا۔" وہ ہنسنے لگا۔ "بے کار بھائی۔۔۔ ۔۔۔ ڈاکٹر ملک۔"

ہم سب گائیڈ کے پیچھے پیچھے پہاڑی کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔

"یہ گیسٹ ہاؤس ایک انگریز نے دریافت کیا تھا۔" گائیڈ سمجھا رہا تھا جو اپنی بیوی کو پیچھے ایرانی کے ساتھ چھوڑ کر اس کے ساتھ چلا آیا تھا۔ "وہ یہیں کہیں شکار کے لیے آیا ہوا تھا۔ جب وہ اس پہاڑی پر پہنچا۔" وہ رک کر ایک پہاڑی کی چوٹی کی جانب اشارہ کرنے لگا۔ "تو اچانک ادھر دیکھ کر ٹھٹک گیا اور پھر——"

"کیوں ڈاکٹر ملک؟" کیپٹن تیجا سنگھ کی بیوی اپنی تیوریاں [illegible] کے لیے [illegible] تو اس کا شوہر [illegible] اس سے

اس نے بتایا۔ "ابھی [illegible] ہیں۔" "اسے علاج کی [illegible]" اس نے [illegible] : [illegible]
[illegible] اس نے اپنی بیوی کے پیٹ کی طرف دیکھ کر [illegible]
[illegible] ہو گا۔

اس کی بیوی نے پیٹ پر دوپٹہ ڈال لیا۔

"شرم نہیں آتی؟" (شرم نہیں آتی!)

بہادر [illegible] پوچھنے لگا۔ "کیا ہم [illegible] چل پڑیں گے؟"

"[illegible] ابھی تو [illegible] ہیں گے۔"

"نہیں [illegible] بات نہیں۔" اس نے کہا۔ "شام کو سات بجے [illegible] گاڑی [illegible] ہے۔"

[illegible] کے ساتھ [illegible] ہم سب کا انتظار کرنے لگا۔

"[illegible]" کیپٹن [illegible] کی طرف دیکھنے لگا۔ [illegible] اپنی کتاب پڑھ رہا تھا۔

"[illegible]"

کیپٹن [illegible] کی طرف [illegible] دیکھنے لگا۔ [illegible] کتاب [illegible] دیکھ [illegible]

"[illegible]"

"[illegible] ——— [illegible]"

"[illegible]"

"[illegible] ——— [illegible] اس نے اپنا [illegible]" [illegible]

[illegible]

[illegible] کے [illegible] گئے۔

[illegible]

"[illegible] زندہ ہیں؟"

"[illegible] ایک بات [illegible]"

[illegible] اپنے [illegible] گیا۔

کوئی ہندوستانی مسلا کسی مزے کی بات نہیں ہوتا کیا؟" رام ناتھ گرفت تنے لگا۔ "انگریزی حکومت کو پورے ستر برس ہو چکے ہیں اب بھی بات بات میں صرف انگریز کے بول ہی سننے میں آتے ہیں، پارلیمنٹ میں بھی۔" رام ناتھ پارلیمنٹ کا ممبر تھا۔" اور ... نیشنل کے باہر بھی۔"

"ہم ہندوستانی چپ چاپ میں ہی ساری باتیں کر جاتے ہیں۔" پروفیسر نے اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"او نے پروفیسرا!" کیپٹن تیاگی کھر بجنے لگا۔ "ان دوری صاحب —— آپ اپنی بات شروع کرو۔"

"میں کہہ رہا تھا جناب، یہ کوئی دعویٰ نہیں جو یہ مٹی کی مورتیں زندہ معلوم ہوتی ہیں، ہم بھی مٹی کی بنی مورتیں ہیں۔ ہماری زمین کی ... زندگی مٹی سے بنی ہے۔ اس لیے وہ صاحب بہادر —— رام ناتھ کی آنکھوں سے آنکھیں ملا جانے پر بڑا میاں ذرا اکڑ ... —— اس لیے میرا ایمان ہے کہ ان سب مورتوں میں بھی جان ہے۔ باور کیجیے —— وہ یہیں بائیں طرف غار کی ... کی جانب دیکھا میں کے پہلو میں ایک بستر سنگ پر کسی فرد کی مانند میں مہاتما بدھ کا بت دائیں کروٹ دراز تھا۔ "یہاں آیئے ... دیکھیے!"

یوں معلوم ہوا مہاتما بدھ ابھی مسکراتا ہوا خواب کی محویت کی کیفیت سے باہر آ کر اپنی آنکھیں کھول دے گا۔

"اور اب یہاں آیئے، دیکھتے ہیں!"

اور اب یوں لگا، مہاتما بدھ اپنے جسم میں نہیں ہے، اور چونکہ وہ ابھی ابھی اپنے جسم کے اندر ہی تھا، اس لیے کچھ ... کیفیت ہے گویا ابھی ابھی بتی گل ہوئی ہو، اندھیرا گویا روشنی کا سایہ بن کے نظر آ رہا ہو، صرف ایک لمحے کے لیے لیکن یہ لمحہ ... ہو گیا ہو!

ایک وقت نہ ہونے اور ہونے کا یہ احساس موت میں زندگی کی جھلک، مکرر میں موت!

"وا —— وا!" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

بڑا میاں میرے قریب سرک آیا۔ "کیوں جناب، مٹی میں جان ہے یا نہیں؟"

"ہاں!" میں نے شدت سے محسوس کیا۔ "زندگی کی ساری داستان گویا اسی سے عبارت ہے، یہیں زندگی کا سارا سرمایہ دفن ہے ... زندگی ہی ہے اور اسی کے مٹی سے سارے پیکر برآمد ہوتے ہیں۔ ہمارے بازو، ہماری کیفیت ہمارے کیسے ... زندگی ہے اور اپنے موت مردہ ہیں اور ہیں ... اور حق ہے —— —"

"یہ بھی سادی بولی میں کہا، دوری صاحب۔" کیپٹن تیاگی بڑے دھیان سے کہہ رہا تھا۔ "تو کیا سمجھا دیں گے آپ یہ یہاں ادھ کی ... بولتے ہو تو ہمارا ہی دل پر سیدھا پہنچتا ہے۔ پر پھر کیفیت ہے، اب تو شاید دل پر میری بات بھائی اپنی چاہتی چاہ ... سے بہت ہی فکر کرتے ہوں گے۔"

"معاف کیجیے مجھے اپنی زبان کا سلیس کر دوں گا۔"

"سلیس؟ —— تیاگی کھر بجنے لگا۔ "سلیس یا دھوتی؟ —— ... کوئی بات نہیں آگے بڑھو!"

"نہ دیکھے۔" بڈھے میاں نے کہا کے بعد کو ایک دیوار کی طرف اشارہ کیا ـــــ "یہ ڈیزائن ہیں ـــــ مجھے ان کا مطلب
پیدا ہی نہیں ہے۔ ملاحظہ کے اپنی طرف سمجھتے ہیں۔"

"یہ، ویری ویلی! مداری! "کیسی رہی۔" یہ تو بہت بنوائی۔ آؤ اندر چلیں۔"

پروفیسر اپنی بیوی کو ایک ملازمت کی تصویر کی طرف لے گیا۔ "تم مجھے دیکھ رہی ششی۔ کیسے ہیں؟"

ششی نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔

"تمہیں پسند ہیں؟"

ششی نے پھر مسکرا کر سر ہلا دیا۔

"تو کل شام میں ان کے پاس چلیں گے۔" پروفیسر نے اپنی بیوی کا ہاتھ تھام لیا۔ "خوب، ایسی ہی ڈیزائن کی ساڑی [illegible]
ان کی طرف دیکھتے ہوئے مجھے پروفیسر کے سامنے کا خیال آیا جو ایک طرف کھڑا نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔

میں اس کے قریب چلا آیا۔

"کیا سوچ رہے ہیں شکور صاحب؟"

"میں سوچ رہا ہوں کہ اپنے گھر اور مکان کو آرٹ کا ایک مسلمان کی بھاشا میں کیسے پڑھوں؟"

"اس میں کیا مشکل ہے سرور صاحب! میں نے تو کتابیں بھی انگریزی میں پڑھی ہیں۔"

"شکر ہے آپ نے اسے عربی یا فارسی میں نہیں پڑھا۔"

"پھر بھی کیا گیا ہو، یہی شکور صاحب۔" میں بحث میں الجھنے کے موڈ میں نہیں تھا مگر چپ نہ رہ سکا۔ "کوئی بڑا خیال کسی خاص زبان کے گرد [illegible] کا محتاج نہیں ہوتا۔ بڑا خیال کسی بھی زبان کا محتاج نہیں ہوتا۔ یہ تصویریں دیکھیے، ان میں بڑے خیال رہے ہیں جو ہندو کا بخت ہے اُس سے جدا نہیں اور جو میں سمجھتا ہوں اس سے بہتر ہیں۔"

"آئیے صاحبان، اب دوسرے غار میں چلیں۔" بڈھے میاں نے ہمیں دوسرے مخاطب کیا اور ہم سب دروازے کی طرف بڑھ گئے اور باہر چند قدم چلنے کے بعد جب ہم دوسرے غار میں داخل ہو رہے تھے تو مجھے خیال آیا کہ شکور انسان پہلے [illegible] کمرے میں چلتا چلا انہوں نے غاروں کی جانب رخ کیا ہے۔ اور وہ غار میں، پہاڑ کے بیچ بنا ہوا تو اندر سے [illegible] پہاڑ ہے کا اصل مقام ہی بلک ہے۔ یہی وہ قیمت چکانے میں شعور کی جڑیاں، چھ ہونی ہیں اور ـــــ اسی لیے اجنتا کے غار کیا یہ نہ دو منصوبوں صرف ہیں کچھ ہیں کیا یہ شیشے کسی نے ہلائے نہیں۔ بکھراؤ کے منتشر اجزا، عورت کی مملکت میں [illegible] اپنے آپ میں اپنی جگہ پر جز بہ جز کر سالم زندگی میں شامل کئے ہیں۔

"ان تصویروں کو بنانے والے کون تھے؟" رام ناتھ نے بڈھے میاں سے پوچھا۔

"ان غاروں کے متعلق یہی ایک سوال ہے۔" بڈھے میاں نے جواب دیا۔ "جو میری فہم سے باہر ہے۔ کیونکہ تاریخ کے ماہرین نے اپنا مطلب بیان کیا۔ میں تو بھلے سے معلوم نہیں۔"

اس سوال کا جواب نہیں میں نے سوچا۔ تاکہ بچوں کے ان باپ کا نام پوچھا جائے تو ٹھیک ہے لیکن جس شخص کے چہرے میں
پہ بر بجو، پیدا کر دیا اُس کی تصویر شخصیت دکھائی دیتی ہو، اُس کی اپنی ذات کا اُس کی اصل پہچان ہے، ابتدا کی تصویریں اپنے بالغ شعور
میں انھیں دیکھ کر ان کے خالق کا خیال نہیں آتا، بلکہ خود انھی کے خیال سے دل و دماغ محو ہو جاتے ہیں۔
میری نظر ایک خوبصورت عورت کی تصویر پر پڑی ہوئی تھی۔
"آپ یہاں سے نیم دائرے میں گھوم کر اس جگہ تک جائیے۔" بڑے میاں نے مجھ سے کہا۔ "اس عورت کی نگاہ آپ کے
ساتھ ساتھ وہاں تک گھومے گی۔"
لیکن اس میں تعجب کی کیا بات ہے، یہ زندہ تصویر محض دیکھنے میں زندہ نہیں لگتی بلکہ وہ واقعی زندہ ہوتی ہے، خود آپ اپنا آپ
ہوتی ہے۔ اس کا خالق اُسے بناتا نہیں، وہ خود بخود اس کے ذہن میں بنتی ہے اور پھر ہو بہو اسی شکل میں وہاں سے باہر آ جاتی ہے، اُسے یہ
معلوم نہیں کہ اس کے کسی نقش میں جسم کی تبدیلی یا وہ تیز ہو، اس کی اپنی فطرت سے اس کا چہرہ زندہ ہوتا ہے اور وہ اپنے اس چہرے کی
تمام جزئیات سے اپنی فطرت کا اظہار پیش کرتی ہے۔ اگر اس کا خالق زبردستی سے ان جزئیات کو بدلنا چاہے تو وہ معرضِ وجود میں آنے
سے پہلے ہی دم توڑ دیتی ہے۔
"یہ دیکھیے دو پیار کرنے والے!" بڑے میاں نے کیلنڈر اٹھا کر کہا۔
"آ! فار مگ!"
یہ دو جاذبِ نظر وجود ہیں، اس لیے ایک دوسرے میں سمائے ہوئے ہیں کہ یہ کیسے اپنے آپ اپنے خالق کے ذہن میں آ وارد
ہوئے۔ انھیں اپنے خالق کی موجودگی کا قطعاً احساس نہیں، ورنہ یہ دونوں ہڑبڑا کر سنبھل کر ایک دوسرے سے پرے جا کھڑے ہوتے اور
اپنے خالق کی طرف دیکھنے لگتے، لیکن انھیں اس کی خبر ہی نہیں، ان کے لیے اس کا وجود ہے ہی نہیں۔ زندہ تصویر کا کوئی خالق نہیں ہوتا، وہ
اپنے ہی وجود سے پیدا ہوتی ہے اور اس کی رگوں میں اپنا خون دوڑتا ہے۔
میں نے تصویر سے آنکھ ہٹا کر روحی اپنے آس پاس دیکھا۔
"ایرانی بھائی" رام ناتھ ایرانی سے کہہ رہا تھا جو اس کی بیوی کی طرف بڑی وارفتگی سے دیکھ رہا تھا، گویا وہ سینے سے چمٹا
ہوا گرم گوشت ہو اور ایرانی کی نظریں کہہ رہی ہوں کہ بھائی، یہ گوشت تمہارا نہیں ہے، باقی سب گوشت، کھاؤ اور کھاتے جاؤ، چھے
دو —— "ایرانی بھائی ایک بات کہوں؟" رام ناتھ ایرانی کا ہاتھ تھام کر فاصلہ ایک جانب سرکنے لگا۔
"ایک نہیں، سو کہو شری رام ناتھ جی۔ لیکن بھائی کا گوشت ایک بار پھر کھلا دیجیے!"
"ایک بار نہیں، سو بار سیٹھ جی!" رام ناتھ کی آواز دھیمی ہو گئی۔ "یہ بات سنو سیٹھ جی، الیکشن قریب آ رہا ہے، وہ
تم کے مسلمان بھائیوں کے ووٹ ہیں نا ——"
"گھبرائیے نہیں رام ناتھ جی" اُس سے بات کرتے ہوئے ایرانی نے پھر رام ناتھ کی پتنی کی جانب دیکھا۔ "لیکن ایک
بار ——"

"ہم نہیں جانتے صاحب!" بڑے میاں نے بے بسی سے کہا۔ "آپ کو ایک تماشا دکھاؤں؟"

پھر فقیر نے جھولی کو ٹٹول کر ایک اور تصویر دکھا دیا تھا۔

"مجھے کوئی سے کچھ نہیں چاہیے!"

"ذرا ٹھہرئیے مولوی صاحب! اندر کی دیوار۔" بیگم تیا مگر بڑے میاں کے ساتھ چلنے لگا۔ "مولوی صاحب تھانیدار

کہاں ہے! ——— آگے چل کر دیکھا ادھر۔ تم تو بہت ہی چالاک ہو گئے ہو......"

کہنے لگا

اور بڑے میاں کو کیپٹن کا کہنا مشکل ہو گیا۔ اپنی شکل دیکھ کر بلی سا لڑنے لگا۔

"بڑے میاں کو ذرا کم ہی پانچ روپے دیا ہے۔" میری پشت پر ہاتھ ماما نے ایک طرف سے مشورہ کیا۔

"نہیں وہی تو دیجیے۔" اپنا ہی لے کر دے دو۔

"دیں!" شوہر نے دبا کر اس کی پشت سے آگے بڑھ کر اعتراض کیا۔ "کس بات کے! میں تو اپنے حصے کو ایک پائی

بھی ادا نہیں کروں گا۔"

"پھر مولوی صاحب جلدی جلدی اپنا تماشا دکھاؤ۔" میں نے آگے کی طرف بیگم تیا مگر بڑے میاں سے کہا تھا۔ "اور

رات ہے!"

"اور کیا ہوتا، پہلے صاحب۔" بڑے میاں نے جواب دیا۔ "مگر ابھی دو روپے جو دکھاؤں، آپ کو ایک دیجیے۔"

دیکھیے گا۔

"ان روپ!" بیگم مگر چیخنے لگا۔ "مولوی مراد صاحب! آپ ذرا ادھر پیارے ہوئی سوئی پر کھے ہو ——— ذرا ایک

ان روپ! ——— پھر بیٹھ جائے، پردیس کا خیال آگیا۔" "اور نہ پردیس، آ بھائی۔ تم بھی ان کو روپ دیکھو،

"ٹھہریے،" بڑے میاں کہنے لگا۔ "ادھر بائیں طرف آ جائیے!"

ہم سب اس کے پیچھے پیچھے چل کر ایک جگہ ٹھہر گئے۔

اب سامنے دیکھیے!

ہماری نظر پہلے ایک کونے میں دور سے کے اندر بالکل سامنے ایک چمکدار پتھر سے جھانک رہی تھیں۔

اب کے ہم پر ایک پتھر کا دیوتا بت کے سامنے کھڑے تھے۔

جانتا ہوں ہمیں کیسے ساری دنیا میں بیٹھا تھا، پتھر کی بنی مورتی تھی۔ سب سے بڑا ہم طرف دیکھ کر نکلا۔ "تھا اب ہم سے

تھا اور سب جیسے ابھی اس کی آنکھوں میں روشنی جیسے ہماری طرف، یا ہم سمجھ لیں۔ روشنی کا ایک لکیر سی ہو گئی، ہر وہ سب سے

جانتا ہوں دونوں طرف کے پیچھے اپنی جگہ سے ہلنے کا ارادہ کر رہا ہو! ——— ہم ڈر سے کانپ رہے تھے۔ جیسے ہم کو کوئی شخص

دیکھ رہا ہو، ہم پر چڑھ کے بیٹھے ہوں اور وہ مجسمہ زندہ انسان ہو، جیسے ہم نہیں دیکھ رہے، بلکہ وہی دیکھ رہا ہے!

ید بیضا

کوثر چاندپوری

حمزہ خاں کھپریل کی چھت والے کچے اور تنگ مکان میں پڑا کھانس رہا تھا۔ اس کو قوت تحلیل ہوتی محسوس ہو رہی تھی اور بار بار کھانسی کے شدید جھٹکوں سے زیر و زبر ہو رہا تھا۔ پچھلے چار مہینے سے وہ پلنگ پر پڑا اسی طرح کھانس رہا تھا۔ اس کے جاڑے جان کا شروع ہو بیس بائیس سال سے بارہ بارہ گھنٹے تک چمکتا تھا اب گھسنے لگا تھا۔ پہلے ہر لوگ آتے جاتے خالی چوپال کو ہمدردی کے ساتھ گھور لیا کرتے تھے۔ اب چاق چوبند پٹھان بابا کے گھر کے سامنے سے گزر جاتے ہیں اور صرف کنکھیوں سے ادھر دیکھ لینے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ پٹھان بابا تین بیٹوں اور کئی درجن پوتوں کا باپ تھا لیکن یہ ساری اولاد دوغلی تھی۔ آدھی ہندوستانی اور آدھی ولایتی۔ پٹھان بابا سرحد کی طرف سے ہندوستان آیا تھا اور یہاں آکر اس نے ایک چمارن گھر میں ڈال لی تھی۔ اسی کے بطن سے یہ اولاد پیدا ہوئی تھی۔ پٹھان بابا کبھی کبھی اپنے بڑے بیٹے حمزہ خاں کی کسی غلطی پر خفا ہو کر کہہ دیا کرتا تھا۔

"وہ تیری تو وہی مثل ہے کہ ماں ڈھیمنی باپ کلنگ، پٹھانی کی کوکھ سے جنم لیا تو بچہ شیر کہلایا۔"

مگر حمزہ خاں کی ماں پٹھانی ہی کہلاتی تھی اور بہت بڑے گھیر کی شلوار پہنتی تھی وہ پشتو نہیں بول سکتی تھی لیکن پٹھانوں کے لہجہ میں باتیں کرنے لگی تھی۔ اور دانت صاف کرنے کے بجائے اخروٹ کی چھال چبایا کرتی تھی۔ پٹھان بابا کے تینوں بیٹے جوان ہو چکے تھے اور بدلے میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹانے لگے تھے لیکن کاروبار جب وہ اب نہ تھا جو خان بابا نے قائم کیا تھا۔ گاؤں کے جو کسان پٹھان بابا کے قرض دار رہتے وہ ان کی بیماری سے بہت خوش تھے۔ غازی کے بیٹے میں بھی ایک قسم کا سکون تھا۔ مہینوں سے پٹھان بابا کی گالیوں کی گرج ختم ہو گئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب کبھی نہ سنی جائے گی۔ وہ کتوں، بلیوں، مرغیوں اور بیلوں کو بھی گالیاں دیا کرتا تھا اور یہ گالیاں بالکل ویسی ہی ہوتی تھیں جو آدمیوں کو دی جاتی تھیں۔ وہ آدمیوں اور جانوروں میں کوئی فرق نہ کرتا تھا۔ دیہات میں اس کی یہ پالیسی بہت کامیاب تھی۔ جانور اس سے ڈرتے ہوں یا نہ ڈرتے ہوں انسان بلا مبالغہ کانپتے تھے۔ اور جس کی خود اپنی موت تھی وہ بہت زیادہ مرعوب رہتا تھا۔ کسانوں کے نزدیک غازی خاں کسی طرح شیر سے کم نہ تھا جو مرتے مرتے بھی ایک آدھ کو کھا جاتا ہے۔ سب کو یقین تھا کہ وہ پچھلے دو تین مہینے سے بیمار ہے پھر بھی وہ اور بعض قسم کے لوگ احتیاط کرتے تھے جیسے مردہ شیر کی موت کا اطمینان کرنے کی غرض سے دور ہی سے پتھر پھینکا جایا کرتے ہیں اسی طرح وہ غازی خاں کی موت کے منتظر رہ کر بھی ایک عرصے سے پتھر یقین نہیں کر رہے تھے اور شام کو کھیتوں سے لوٹتے وقت دور ہی سے پوچھ لیا کرتے تھے اور پٹھان بابا کیسے ہیں؟ تاہم نہیں تو یہ پہلے والے چوپال میں بیٹھا کرتے تھے اور اس کے ڈر سے غازی خاں کو کوئی طرح طرح کے سوالات کرنے لگے تھے۔ ان میں سے ہر سوال کی وہ حیثیت ہوتی تھی جو مردہ شیر کی جانب پھینکے جانے والے پتھر کی ہوا کرتی ہے۔

کیسے چچا ابا!

• کیا ڈاکٹر آیا تھا؟

• کیا اب کسی سے کسی کو نہیں ہوتا۔ یا اللہ [illegible] جیسے [illegible] کیا

• چچا ابا کو ہسپتال میں داخل کر دیا جائے

اتنی [illegible] اس منافع کے لیے کہاں وقت [illegible] کے [illegible]

کے چہرے سے [illegible] جو پہلے سے [illegible] میں [illegible]

جب خان [illegible] پچاس برس کا تھا اور اس کے [illegible] کے [illegible] کی [illegible]

[illegible] کی بیماری بہت [illegible] اگر [illegible] ایسا [illegible] جیسے [illegible] کسی [illegible]

جب خان [illegible] چچا ابا کے [illegible] سے زیادہ [illegible] اس کا [illegible] معلوم ہوا [illegible] کے [illegible]

[illegible] ایمان [illegible]

• چچا ابا کے [illegible] میں [illegible] ہے:

• [illegible] ———— [illegible] جیسے [illegible] سے [illegible]

[illegible]

[illegible] میں پہلے [illegible] کا اندازہ کرتا [illegible] میں [illegible]

[illegible] اپنے [illegible] کا اظہار کرنے [illegible] اس کے [illegible]

[illegible] کسی [illegible] میں [illegible]

[illegible] جب [illegible] میں [illegible] بہت [illegible]

[illegible] بات کا [illegible] اسے [illegible] کبھی کبھی [illegible] کا [illegible]

[illegible] سے [illegible] کے [illegible] کا [illegible] سے

[illegible] جب خان چچا ابا [illegible] کے [illegible] کا [illegible]

[illegible] تھا کہ چچا ابا [illegible] اپنے [illegible] تھا [illegible]

[illegible] جب [illegible] کو [illegible] تھا جب [illegible] ہندوستان [illegible]

[illegible] چچا ابا سے [illegible] نے [illegible] کر [illegible]

[illegible] کے [illegible] کا [illegible] میں

[illegible] کو [illegible] سے [illegible] تھا۔ جب خان [illegible] کی [illegible]

[illegible] کے [illegible] کی کوشش کرتا [illegible] چچا ابا کے [illegible] میں [illegible]

کر جاتی تھی۔ وہ اکثر برسات کی کالی راتوں میں چٹانوں کی دراڑوں سے حشرات نکلتے دیکھا کرتا تھا اور اپنے دادا جبال خان کی موت کا حال یاد کرتے وقت اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگتی تھیں۔ وہ آج بھی سیندوریوں کو موت کے گھاٹ اتار دینے کا آرزو مند تھا۔

جب خان کو معلوم تھا کہ غازی خان، چنگیز خان کا اکلوتا بیٹا، اپنا دیس چھوڑ کر بہت مالدار ہو گیا ہے، لیکن وہ اس سے دُور ہی رہنا چاہتا تھا۔ غازی گھیڑے میں جب جب خان کی آنکھیں کھل گئیں، پٹھان بابا کے قبضہ میں ہزاروں بیگھہ زمین تھی جس میں حنا سوں قد بیاجا اُگتا تھا، وہ سود پر روپیہ بھی چلاتا تھا اور کسانوں کو اناج بھی تقسیم کرتا تھا جو فصل پر دوگنا ہو کر لوٹ آتا تھا۔ اپنے علاقہ پر اس کا اثر تھا۔ تحصیل اور تھانہ کے اہل کار اور افسر وغیرہ سب اس کے یہاں حاضری کرتے تھے۔ وہ مجبوروں اور غریبوں سے ان کی تواضع کیا کرتا تھا۔ جب خان نے بہت چاہا کہ یہاں سے چلا جائے اور اپنے اس دشمن سے کچھ نہ مانگے، مگر پٹھان بابا نے اسے یہیں رہنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے جب خان کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

جب خان! ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں، دشمنی تمہارے باپ دادا سے تھی، وہ ان کے ساتھ چلی گئی۔ تم مزدور، بدل لیتا تم میرے مقابلے کے نہیں ہو، مگر چاہتا تو تم پر بدلہ کار کی جان سے بھی وہیں میدان میں کھڑا کر کے گولی سے اڑا دیتا اور پٹھان بابا کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا، لیکن ہم شیروں پر ہاتھ ڈالتے ہیں، گیدڑوں پر نہیں۔

جب خان بظاہر مطمئن ہو گیا مگر وہ پٹھانوں کے جذبۂ انتقام سے واقف تھا۔ بہرحال وہ غازی گھیڑے میں رہ پڑا اور کھیتی کرنے کا ارادہ کیا۔ ایک دفعہ اس نے تحصیل میں درخواست بھی دی مگر خان بابا نے اسے منظور نہ ہونے دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ جب خان . . . . . اس کا محتاج ہو کر رہے، جس طرح اور بہت سے نوکر ہیں وہ بھی اسی حیثیت سے رہے۔

پٹھان بابا نے تینوں لڑکوں سے کہہ دیا تھا کہ جب خان کو میں نے صرف اس لیے نوکر رکھ لیا ہے کہ زہر کی تھیلی ہی بند رہے، اور ہر وقت پیش نظر رہے۔ مگر تم اس کی طرف سے غافل نہ رہنا، تم لوگ بھی اس سے ہوشیار رہنا۔ سانپ کا بچہ سانپ ہی ہوتا ہے اور سینہ کا بیر اور ہماری اس سے پشتینی لاگ ڈانٹ ہے۔ لیکن اس کے بیٹوں نے جو خود پٹھان بابا کی نظر میں جنس تھے ان باتوں کو بالکل نیست و نابود کر کے دوسرے کانوں سے اڑا دیا۔ وہ اس زمانہ کی فضا میں پلے بڑھ کے پیدا ہوئے تھے، وہ پرانے مسائل سے کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے۔ پٹھان بابا اپنی جگہ ہر طرح سے ہوشیار تھا۔ وہ ایک منٹ کے لیے بھی غافل نہ تھا۔ اور جب خان کی نقل و حرکت پر کڑی نگرانی رکھتا تھا۔ اس کی بیٹیاں جب خان سے بہت گھبرایا کرتی تھیں، پھر بھی جب خان جانتا تھا کہ بڑی لڑکی مہر افشاں کی ایک آنکھ بچپن میں بیکار ہو چکی ہے، اس کے منہ پر گہرے گہرے نشان ہیں اور منجھلی فیروزہ زریں بہت حسین ہے، وہی اس غازی گھیڑے کی رونق اور ایک تاج ہے اور سب سے چھوٹی زرنگار نگین زینت ہے، مگر تیلی ہے۔

فیروزہ زریں سے اس کی صرف ایک مرتبہ ملاقات ہوئی تھی، وہ اپنے کچھ آدمیوں میں کاٹ کر لانے آئی تھی۔ واپسی میں ایک بہت لمبا سانپ مل گیا تھا۔ وہ سہم کر وہیں کھڑی ہو گئی تھی۔ سامنے سے جب خان آ گیا تھا اور فیروزہ زریں نے چیخ کر کہا تھا:

بچاؤ سانپ ہے:

[illegible] سے پہلے وہ منہ کی طرف دیکھتا تھا پھر لکھا۔
یہ [illegible] تھا اس میں بہت بڑا سانپ ہے۔
اور پھر اس نے سانپ کا سر کچل دیا تھا۔

جب خان نے ایک سال پہلے کی تاریخ پٹھان بابا [illegible] میں [illegible] آیا پھر کافی وقت [illegible] طاری ہو گیا اور کافی [illegible] پٹھان بابا کی [illegible] وہ بہت [illegible] اور جانتا تھا۔ اپنی بیٹی کے [illegible] سے واقف تھا۔ [illegible] خدمات کر دیا تھا کہ [illegible] ہو گئی ہے اور یہ [illegible] بیٹی کو [illegible] سال بعد [illegible] اس کی بہت تندرستی [illegible] پٹھان بابا [illegible] آدمی تھا وہ [illegible] گھر پر [illegible] اور وہ بیٹی کی شادی کے متعلق سوچتا تھا۔ ایک دن اس نے جب خان کو بلایا۔

جب خان جواب دے [illegible] نہیں [illegible] سے ملنا چاہتا ہوں۔
جی بابا! ۔۔۔۔۔ [illegible] جواب دیا اور [illegible] ذکر کرتا ہے کہ اب [illegible] پٹھان بابا نے [illegible] میں [illegible] دیکھا اس کے گال [illegible] جب خان کے رخساروں کی [illegible] یاد آئی۔ وہ [illegible] زمین پر ڈال دیا [illegible] پھر وہیں تڑپ تڑپ کر اس نے جان دے دی۔

جب خان! ۔۔۔۔۔ او جب خان!
جی بابا!
اب تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں دن رات ہمارے پاس رہا کرو۔
جی بابا ۔۔۔۔ جب خان نے پٹھان بابا کی بیٹی کے [illegible] دیکھ کر [illegible] میں کافی [illegible] زیادہ [illegible]۔

اور اس کے بعد وہ پٹھان بابا کے پاس [illegible] بہت خوش [illegible] جب خان [illegible] پٹھان بابا کی [illegible] جب خان [illegible] پٹھان بابا نے [illegible] جب خان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
[illegible] جب خان [illegible]۔

عجب خان بہت سٹپٹایا اس نے گلاس ہاتھ میں لیا اور ابھی ہونٹوں ہی سے لگایا تھا کہ اچانک اس کی نگاہ پردے
[illegible] جب اٹھ گئی، وہاں فیروزہ زریں کھڑی تھی اور زور سے انگلی ہلا کر دودھ پینے کو منع کر رہی تھی۔ عجب خان جلدی سے بولا۔

"ابھی جی نہیں چاہتا پھر پی لوں گا۔"

"خنزیر! ——— سؤر کا بچہ!! وہ بگڑ کر بولا۔ پرہیز کرتا ہے، ابھی پیا ہو گا جب سامنے!"

عجب خان لپکا اور پیالہ گلاس ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔ فیروزہ زریں گول گول سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھتی رہی، جیسے اس [illegible] دونوں کے بیچ میں سانپ آ گیا ہو۔

"عجب خان! ——— پٹھان بابا بولا، تیرا باپ سکندر خان سپینسری ایک غزے میں سینہ کھول کر ایک انگریزی رائفل کے [illegible] کھڑا ہو گیا تھا۔ گولی اس کے کان کے پاس سے سنسناتی نکل گئی تھی مگر اس نے سر تک نہ ہلایا تھا اور تو میرا بچہ، دودھ پینے ہی سے [illegible] ——— بچہ! کہیں کا، میرا بیٹا پائندہ خان وہ تھا، مگر زمین پر کھڑا ہو کر شیر مارتا ہے۔"

پٹھان بابا کا پیالہ ڈول ڈول تیزی سے کٹتا رہا۔ وہ دن رات میں سیروں منہ اگل دیتا جس میں چھٹانک دو چھٹانک [illegible] بھی ہوتا۔ عجب خان محض اس امید پر اس کے منہ لگا رہتا تھا کہ آخر وہ کب تک زندہ رہے گا، کسی دن اسی طرح ایڑیاں [illegible] رگڑتے دم توڑ دے گا۔

پٹھان بابا کبھی کبھی موڈ میں ہوتا تو اسے اپنی پٹی کے قریب بیٹھنے کو کہتا۔

"میرے ننھے شیر میرے پاس آ جا ——— دیکھ تیرا دادا رضا خان سپینسری بڑا بہادر تھا، وہ اکیلا رائفل کندھے پر [illegible] پہاڑوں میں گھومتا اور جب کوئی ہوائی جہاز آسمان میں اڑتا نظر آتا تو رضا خان تاک کر ایسی گولی چلاتا کہ جہاز جا زمین پر ڈھے رہتا۔ [illegible] نے کئی مہاجروں کا مقابلہ کیا ہے۔ رضا خان جتنا بہادر تھا اتنا ہی مکار بھی تھا۔ وہ چیتے کی طرح دشمن پر گھات لگاتا تھا۔ ایک [illegible] کی آڑ میں چھپ کر اس نے جاسوس دادا جہاں خان کے گولی ماری تھی اور وہ گولی کمر کو بھی پچاس گز تک چیر دے کر نکلی تھی۔"

[illegible] پٹھان بابا اس کے دادا رضا خان کو مکار کہتا تو عجب خان کا جی چاہتا اس کا گلا دبا دے۔ وہ بار بار مٹھی کھولتا اور بند کرتا۔ مگر اسی وقت [illegible] زریں کی آنکھوں کے وہ بال یاد آ جاتے جو اکثر اس کے منہ پر پڑے رہتے تھے اور پھر اس کی وہ گول گول آنکھیں یاد آ جاتیں [illegible] نیلی جھیلوں پر بادل سے چھا جاتے، جیسے آسمان میں برسنے کو ہوں۔ عجب خان کی آنکھیں نرم پڑ جاتیں۔ [illegible] پٹھان بابا پر ترس کھانے لگتا۔ پٹھان بابا کے تینوں لڑکے جوان تھے۔ حمزہ خان تو غیر معمولی تنومند اور ورزش کا شوقین تھا مگر [illegible] [illegible] بیٹے کی مانند ہو کے آنسے اور صرف تاک تھے، وہ ان میں سے کسی سے نہیں ڈرتا تھا۔ ڈرتا تھا صرف فیروزہ زریں [illegible] آنکھوں کے پیچھے اور یادوں ہی یادوں میں گلابی آنکھوں میں چمکتی ہوئی تیلیوں سے جو بھی کھڑی ہو [illegible] سے زیادہ نازک اور [illegible] پٹھان بابا بکواس کرتے کرتے کانپنے لگتا اور وہ کروٹ بدل کر پیالہ [illegible] عجب خان کو حکم دیتا۔

"عجب خان ہاتھ چھوڑ!"

عجب خان ہاتھ چھوڑ دیتا اور پٹھان بابا اس کی ہتھیلی پر تھوک دیتا [illegible] کی ہتھیلی تلاش کرنے لگتا، اور

گمراہ کرنا:

"عجب مہم:"

"سر کا بیٹا:"

جب خان بابر سے یہ بات کہنے کا تھا اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔ جیسے فیروزہ مفتون کا شوشہ اُٹھا اس کے گرد پھیلا میں بہت کچھ [illegible] ہو رہا تھا اور [illegible] مصیبت بن کر [illegible] گیا تھا۔ تو چلتا ہوا اس کی بیوی کا مزہ چکھا سکتا تھا اور [illegible] کو بار بار وہ اس کے لوگوں کی ترغیب سے [illegible] کر بال سکتا تھا۔ اب تو سب [illegible] کا مزہ بھی ہے کہ [illegible] پیدا ہو گیا تھا۔ جس کو [illegible] سے تعبیر کیا جا سکتا تھا۔ [illegible] اور [illegible] میں بڑا فرق ہے۔ [illegible] کا فرق۔ وہ [illegible] بہت جا۔ اس کی [illegible] بھی اس میں شدت کی جس ہونے لگی۔ وہ سرچا جس وقت [illegible] کی [illegible] اس وقت ہوئی تھی جب اس نے [illegible] ہاتھ میں [illegible] تھا۔ بہت بزدلی: جو [illegible] ہے ـــــ سے ایک جس اور ایک ذرہ سے [illegible] (کچھ) ہے۔ وہ [illegible] سر [illegible] میں [illegible] دیتا:

چشان بابا [illegible] کو [illegible] سے [illegible] کر رہے تھے [illegible]۔ [illegible] اس کی [illegible] سے [illegible] گیا تھا اور اس کی [illegible] مصیبت [illegible]، [illegible] جیسے قبر میں پڑی [illegible] بیٹھا [illegible] ہے۔ چشان بابا کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ موت کے بالکل قریب پہنچ گیا ہے۔ [illegible] سے [illegible] تھا کہ اس کا [illegible] جب خان بھی جلد ہی اس کے نقش قدم پر چلے گا۔ اس نے جب خان سے شدت انتقام [illegible]، وہ موت کی [illegible] سے بچا نہیں سکا۔ [illegible] پر [illegible] جاتا ہے وہ آگ ضرور ہے۔

ایک دن اس نے [illegible] لڑکی اور [illegible] کر [illegible] میں [illegible] خان کو مخاطب کر کے کہا:

"وہ ـــــ بہت [illegible] کر [illegible] میں سانپ [illegible] جا رہا ہوں۔ میں نے اس [illegible] کا سر کچلنا ہے کہ وہ [illegible] یا [illegible]۔ [illegible] نہیں ہوئی۔ جب خان کے [illegible] کی [illegible] کم ہونے لگی ہے۔ وہ [illegible] ہو گیا ہے۔ میں نے [illegible] کی [illegible] سے نہیں [illegible] اپنا [illegible] اور [illegible] ہے اور [illegible] مرتبہ اس کی ہتھیلی پر [illegible]۔"

اس روز سب لوگ چشان بابا کے پاس ہی بیٹھے رہے۔ جب خان کو وہاں رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ رات [illegible] بہت [illegible] ہو گیا۔ سب لوگ [illegible] ہو گئے تھے۔ [illegible] رات بہت تاریک اور [illegible] گہری تاریکی میں چھپا ہوا تھا اور آسمان پر چمکتا ہوا [illegible] کی [illegible] تھیں۔ [illegible] وہ بھی [illegible] لگیں۔ [illegible] سے [illegible] کی آواز سے [illegible] وقت جب خان [illegible] گیا۔ [illegible] کے قریب فیروزہ مفتون کی [illegible] سے بولا:

"جب خان ہاتھ پھیلاؤ:"

اور جب اس نے ہاتھ پھیلایا تو فیروزہ مفتون نے اپنے [illegible] اس کی ہتھیلی پر [illegible] جب خان کو [illegible] جیسے [illegible] نے [illegible] ہے اور وہ جبال خان کی [illegible] کے پار ہو گئی ہے۔ اس نے [illegible] سے [illegible] تھا کہ [illegible] تو جب [illegible] ہو جائے گی۔

راکھ

غلام الثقلین نقوی

ایک سیدھا سادا حادثہ تھا:

تیزاب کی بوتل اور [illegible] کی دوا الماری کے ایک ہی درازے میں پڑی تھیں۔ متوفیہ نے دوا کی بجائے تیزاب پی لیا اور نتیجے کے طور پر موت واقع ہو گئی۔ ڈاکٹر نے اس کی تصدیق کر دی تھی۔ جنازے میں محلے کے سبھی لوگ شامل تھے۔ ان میں اسرار احمد اسرار بھی تھے جو میونسپل کمیٹی میں ایک اچھے منصب پر فائز تھے اور جن کا محلے کے پڑھے لکھے سرپرآوردہ لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ وہ شاعر بھی تھے۔ بڑی اچھی غزل کہتے تھے، اور ان کی شہرت مقامی شاعروں سے کچھ زیادہ ہو گئی تھی

منصور متوفیہ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ قبر کے سرہانے کھڑا تھا۔ اس کی خشک آنکھوں میں ایک آنسو بھی نہ تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد [illegible] بہت آہستہ آہستہ پڑ رہی تھی اور جب [illegible] کہ متوفیہ کو منوں مٹی کے ڈھیر نے چھپا لیا اور منصور کے منہ سے ایک ٹھنڈی آہ نکل گئی۔ پاس کھڑے لوگوں نے محسوس کیا جیسے منصور کے دل سے کوئی بوجھ اتر کر اسی قبر میں دفن ہو گیا ہو!

محلے میں جب بیگم ارشاد شاکر کی وفات کی خبر پہنچی تو وہ چونک سے گئے تھے۔

ارشاد مرگئی! انہیں بے انتہا حیرت ہوئی۔ ارشاد مر نہیں سکتی۔ اسے مرنا نہیں چاہیے۔ ہو سکتا ہے ارشاد مرگئی ہو لیکن شادو کا [illegible] شادو جاوداں کی [illegible] کے ایک ایک شعر میں زندہ و سلامت تھی۔ [illegible] ان کی بیاض میں محفوظ تھیں۔ شادو نہیں مر سکتی کیونکہ اس نے اسرار احمد اسرار کے شعروں کا آب حیات پی لیا ہے

نہیں، شاد بیگم مرگئی تھی جو منصور کی ماں تھی:

"مجھے ارشاد شیریں سے کیا غرض۔ لوگ مرتے اور جیتے ہیں۔ [illegible] ازل سے مرتے چلے آئے ہیں۔ تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ [illegible] ہے۔۔۔۔ [illegible]۔۔۔۔ اقبال [illegible] عشق [illegible]۔۔۔۔ میں بھی تو پریشان حال ہوں۔۔۔۔ شاید اس لیے [illegible] اقبال کے کلام میں کھو گیا ہوں۔ تقدیر کے قاضی کا۔۔۔۔"

اور چند روز بعد وہ بھی اس جہان میں کوچ کر گئے جو متوفیہ، شاد شیریں کا [illegible] تھا!

تقدیر کی ستم ظریفی دیکھیے کہ ارشاد شیریں مرگئی [illegible] مرحوم ہو گئی تھی۔ [illegible] ایسا لگتا جیسے اس نے موت کا زہر خندہ پیشانی سے نوش کر لیا ہو!

ابھی چہلم کا [illegible] بھی نہیں ہوا تھا:

[illegible] کمرے میں [illegible] تھا۔ [illegible]

[illegible]

[illegible] ۔۔۔۔۔ [illegible]

[illegible] ۔۔۔۔۔ [illegible] ۔۔۔۔۔ [illegible] ۔۔۔۔۔ [illegible]

[illegible] ۔۔۔۔۔ اب [illegible] :

شانو بیگم واقعی مر چکی ہے۔

شانو ابھی زندہ ہے۔ [illegible] اور شانو کے گھر سے نکل آئے!

لیکن جب [illegible] شانو کے گھر سے نکلے تو گلی سونی اور سنسان تھی!

گلی میں کوئی متنفس موجود نہیں تھا۔ کسی گھر سے کوئی آواز نہ آ رہی تھی۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

[illegible] شانو سے محبت کرتے ہو؟

[illegible] شانو کے [illegible]

"اگر [illegible] ہے۔"

"میں ۔۔۔۔ نہیں تو ۔۔۔۔" [illegible]

"میں ۔۔۔۔ نہیں تو ۔۔۔۔" شانو نے اس کی طرف [illegible]

[illegible] روشنی [illegible]

ہو گئی۔

اس نے سوچا کہ گلی میں اچانک روشنی کیوں ہو گئی ہے؟ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

"میں جانتا ہوں۔ [illegible] یہ شانو ہے۔ [illegible]

[illegible]

بت بنتا ہے تو شیشے جیسے سمندر کے اندر میں۔ لڑکے پیسے کی کالی کتاب ہے تین زبان جیتا ہے جیسے ایک نقطے کے لیے ساری دنیا کا احاطہ
خود بے دام ہے۔ تب وہ مُٹھی بھر کپڑے دینے کے لیے بعد میں گھر دیا تو میں پہننے کے لیے آیا۔ میرے پاس کالا جانے کے لیے صاف
لباس نہیں تھا۔ لیکن وہ گھر پہ نہیں تھا۔ میں اٹھا تو ......"

"تم کپڑے پہننے آئے تھے؟" شاہدہ نے پوچھا

"ہیں .... ہاں ...."

"پھر یہیں ٹھہرو۔ میں جب تک واپس نہ آؤں یہیں ٹھہرے رہو۔"

وہ گلی میں سر جھکائے کھڑا رہا۔ آتے جاتے لوگ اس کے پاس سے گزرتے رہے۔ ایک دو نے اُسے حیران ہو کر دیکھا بھی اور اس
کے چہرے پر شرم کے پسینے آتے رہے اور وہ سوچتا رہا: میں ایک قدم آگے بڑھاتا تو جانے کیا ہو۔ جیسے پاؤں زمین کے ساتھ
جوڑ چپک گئے ہیں؟"

"تم یہیں کھڑے ہو؟" شاہدہ نے پوچھا۔

"ہیں .... نہیں تو ...."

شاہدہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"یہ لو اپنے کپڑے ..... میں .... نہیں تو ...."

اس نے جھکی جھکی آنکھوں کے ساتھ کپڑے لینے کے لیے ہاتھ بڑھائے۔

"نہیں .... ایک بار نظر اٹھاؤ تو کپڑے دوں۔"

وہ پسینے میں بھیگ گیا۔

"نہ جانے وہ شاہدہ!"

"جانا چاہتے ہو تو ایک بار دیکھ تو لو۔ جیسے آنکھ بھر کر نہیں دیکھتے میں اُن کا راستہ روک لیا کرتی ہوں۔"

اور وہ مسکرا کر جو پوشیدہ اور شرمیلا نوجوان تھا اس لڑکی کو آنکھ بھر کر دیکھ لینے پر مجبور ہو گیا۔

اُسے یوں لگا جیسے اُس نے اس لڑکی کو پہلی بار دیکھا ہو۔ یہ ایسی لڑکی جو بڑے دلنواز انداز میں مسکرا رہی تھی اور اس مسکراہٹ
میں چودھویں رات کے چاند کی زندہ چاندنی کی بارش ہو رہی تھی۔ چودھویں کا چاند جو گرمیوں کی ایک رات کو چمک رہا ہو اور اس
رات میں جس ہو اور ایک معطر پسینے کی خوشبو زمین کے بطن سے پھوٹ آتی ہے اور ابھی نہیں پاتی اور الگ الگ ہر سینے پھوٹ
سا ہے۔

وہ اس چہرے کو دیکھتا رہا اور اپنی جگہ سے نہ ہل سکا:

اور یکایک شاہدہ شرما گئی۔ اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ شریر چنچل آنکھیں اپنے آپ میں کھو گئیں۔ جیسے دماغ زرد زرد سا
ہو جائے۔ ابھی گرم گرم زندگی سے بھر پور تھا۔ یکدم اداس اداس سا ہو گیا۔ ہونٹوں کی آنچ میں اداس اداس شام میں زمین سے کی

موڑ

بھلی ؟ تو کی گڑیا [illegible]

اس [illegible] ہے جو چلتے چلتے یوں ہی رک گئی تھی جیسے اس کو ایک ٹھوکر سی لگی ہو [illegible]
موڑ پر [illegible] گھر کی طرف [illegible] ایک قدم پر سوکے [illegible] جاتے تھے:

اس لڑکی نے خوب جلدی پکڑ کے اس کے ہاتھ میں تھما دیا ہے!

شاہد گھر کی طرف چل پڑا۔

اس نے اس لڑکی سے سوال کر کے پوچھا: "سنتے، تمہارے گلی کے موڑ پر شاہد سے کیا کیا باتیں ہوئی ہیں؟"

"کچھ بھی نہیں۔" اس نے بعد [illegible] کے عالم میں کہا اور پاس سے گزر گیا۔

"وہ بھی سائیں ہے؛ کیا تم پانی میں [illegible] آپ سے؟"

شاہد نے جواب نہ دیا [illegible] سائیکل سے اتار کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

سائیکل لے کر چلا [illegible] وہ سائیکل پر نہیں تھا۔ [illegible] اس موڑ پر کھڑا تھا جہاں شاہد نے [illegible]

تھا [illegible] گزر گیا۔

اس موڑ پر رک کے وہ شاہد چلا گیا

پھر [illegible] اس پر [illegible]

موڑ پر [illegible] اس نے سوچا [illegible] یہ شعر [illegible] بھی [illegible] شعر [illegible]

[illegible] نہیں [illegible] موڑ [illegible] نہیں سکتا

یہ شعر [illegible] سامنے [illegible] نہیں [illegible] سکتا!

شاہد نے یہ شعر [illegible] موڑ پر [illegible]

[illegible] شاہد [illegible] اس کے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اس نے سوچا [illegible] ہو سکتا ہے [illegible] شاعر نہیں ہو سکتا [illegible] شاہد [illegible]

[illegible] ہے۔ [illegible] ہے۔

وہ پھر گلی کے موڑ پر آ کھڑا ہوا۔

"تم سفید کار کے پیچھے بھاگنے والے ہو؟"

"ہاں!"

"پھر سے ایسی غلطی نہ کرنا۔ آج تو وہ صرف کھٹ پٹ کر گئے ہیں۔ آج شام تک وہ تمہیں لے... پھر میں انہیں خود اپنے ہاتھوں سے سزا دوں گی۔ دیکھو ایک صاحب ایسی شے ہے... چہرے کو ایسی کریہہ... کہ ہفتہ بھر تک خراب نہ ہو۔ پھر تم کیوں پیچھے بھاگ کر اس گلی میں سے گزرے تھے؟"

"کیا... نہیں تو..."

"میں... نہیں تو..." اس نے سوال کا منہ چڑاتے ہوئے کہا۔

وہ ہاں سے گزر رہا تھا تو فیصل... ایک کلینک... کے سامنے ایک... کے پیچھے رک گیا۔ فیصل... کلینک کا مالک ایک... شخص تھا۔ وہ اس کی... پر خضاب... تھا اور وہ مونچھوں کی نوکیں سنوار رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں... تھے۔ چہرے پر... استرا... کر سکی تھی۔ جھریوں کا جال۔ جال کہ ایک... جال تھا۔ شاہدہ بھی... طرح اس جال میں پھنس کر پھڑپھڑا رہی ہو گی۔

"شاہدہ... شاہدہ..." وہ تڑپ کر پکارا۔

مونچھوں کی نوکیں چڑھ گئیں۔

"تم کس شاہدہ کو پکار رہے تھے؟"

"اس کا مجھے پتا ہے کہ شاہدہ بھی ایسی ہی کسی جال میں پھنس کر رہ گئی ہے۔"

"نہیں، اس نے بتایا: شاہدہ... میں نے کسی شاہدہ کو نہیں پکارا۔"

"پہلے معلوم ہوتے ہو۔ کس محلے میں رہتے ہو؟"

"شاہ گنج میں..."

"اس شہر کا کوئی محلہ شاہ گنج کے نام سے مشہور نہیں۔ دماغ ٹھیک ہے؟"

"کیا بات ہے کہتے ہو؟"

"اس بار کر دیکھو... کوئی پاگل ہے بیچارہ۔ کوئی محلہ شاہ گنج بھی ہے ہمارے شہر میں؟"

"نہیں تو۔"

"یہ بابو کہتا ہے میں اس محلے کا رہنے والا ہوں... یہ کسی شاہدہ کو پکار رہا تھا۔"

"شاہدہ والی بات ٹھیک کہی اس نے۔"

"تو... شاہدہ... جاؤ بابو... کوئی کوٹ... ڈاکٹر کلینک... نشے میں... کسی کا نام لیا۔ شاہدہ... دماغ کو آرام..."

[illegible] کے ملنے کے سلسلہ [illegible] تھا؟

[illegible] اس سلسلے میں شک ہو تو شاہدہ سے پوچھ لو۔

[illegible] ہو؟

"ہاں!"

"تمہیں [illegible] ہی [illegible] کیوں [illegible] [illegible] ہے۔ [illegible] ہو گا۔"

شاہدہ خاموش رہی۔

"تمہارا شوہر منظور ہے؟"

"جی ..... نہیں تو ..... دیکھیے! مجھے آپ کی بات سے [illegible] ہے۔"

شاہدہ نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔ [illegible] اس نے [illegible]

[illegible]

[illegible] شوہر منظور ہے۔"

"نہیں .... [illegible]

"نہیں ..... شاہدہ نے [illegible] [illegible]

[illegible]

"[illegible] سب کچھ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

"مجھے [illegible]"

[illegible] شاہدہ [illegible]

شاہدہ [illegible]

[illegible]

وہ [illegible] میں [illegible] تھا!

"مجھے [illegible] شوہر منظور ہے شاہدہ!"

[illegible] شاہدہ کے ہاتھوں [illegible] کی گلی سے گزر گیا۔ شاہدہ

اپنے [illegible]

شادو کو ایک نوجوان نے شعاع آل سے اطلاع کا ساری ہمک پہنا دیا ہے۔

فیضی کی لائی کوٹھی کے سامنے اس نے سائیکل کو بریک کیا۔ حمید ایک کرسی پر بیٹھا توند پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ اسرار کو دیکھ کر شیا مسکرایا: "حمید! ادھر کا سلسلہ ہو گزرا ہے۔"

"جانے دے: ذرا ٹھہر جا۔ اس سے ایک بات پوچھیں۔"

"اچھا!" شیدے نے اسے چھوا۔ اس نے سائیکل روک لیا۔

"تم کس محلے میں رہتے ہو؟" حمیدے نے پوچھا۔

"پیچھے پڑوس میں۔"

"تم شادو کو جانتے ہو؟"

"ہاں......"

"پر اس دن تو کہتے تھے تم شادو گلی میں رہتے ہو۔"

"شادو کے محلے کا نام شادو گلی ہے۔ تم جس شادو کو پوچھ رہے ہو وہ دیدہ و صولی کی بیٹی ہے نا؟"

"ہاں.... ہاں.... تم اسے جانتے ہو؟"

"ہاں.... نہیں ...." اسرار نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا: "پر تم کیوں پوچھ رہے ہو اس کے متعلق؟"

"وہ بیٹھک کو جانے والی ہے۔ بہت جلد حمید اسے سہرا باندھ کر تمہارے محلے میں آئے گا۔"

حمید اور دوسرے جنا اور اسرار کے سر پر تجوڑ سے چھتے رہے۔

"شادو بیٹھک کو جانے والی ہے۔ حمید اور فیضی دراز کینٹ میدہ وغیرہ ہیں اس کا مالک ہے جس کی مرچیں مختلف ممالک میں جاتی ہیں جس سے شادی ہو تو چوکی بیاہ زادی ہے اور شادو.... جس کا جسم کھنکتی رانوں کا عطر ہے۔ جس کی آنکھوں میں ستارے جھلملاتے ہیں اور جس کی سانسوں میں گلاب کی خوشبو ہے۔"

بیٹا ایسا سٹرے نے ایسا لگا جیسے بجلی کا مساس کیا ہو جیسے حمید اسہرا باندھ کر اس کے محلے میں آیا ہے اور اس نے شادو کو اس بازو وں میں ڈال دیا ہے اور پھر اس نے ڈولی اُڑا کر کہار کو دیا ہے تاکہ شادو اس کے محلے کی لڑکی ہے

نہیں.... نہیں....

"سائیکل چھوڑ رہے ہو یا اس کا پرزہ۔" ایک راہگیر نے کہا۔

اس نے لڑکھڑاتے ہوئے سائیکل کو سنبھال لیا۔

سائیکل سنبھل گیا لیکن وہ اپنے آپ کو نہ سنبھال سکا۔

وہ فرش سے گرا اور پاتال میں دھنس گیا!

کوٹھے سے دیکھ پر وہ شادو کے محلے کے سامنے سے گزرا۔

شاہدہ [illegible]۔ اس نے [illegible] شہادت سے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کے
[illegible] [illegible]۔ [illegible] اور [illegible] تھی۔

"[illegible] اصل [illegible] ؟ میں [illegible] دیکھ رہی تھی۔"

"اشتیاق : میں نے اسے دیکھا۔"

"پھر شاہدہ کو کر [illegible] سے [illegible] بتاؤ تم نے کیسے دیکھا ؟"

"[illegible] سر سے [illegible] [illegible] [illegible] ہاتھوں سے [illegible] ڈال دیں

[illegible] ۔" شاہدہ کے [illegible] چہرے پر [illegible] ... چہرہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

"[illegible] سر سے [illegible] [illegible] اصل [illegible] [illegible] ۔" شاہدہ نے [illegible]
انداز میں کہا۔

"شاہدہ : [illegible] [illegible] کر کہا۔"

"[illegible] :"

"میں تیرے [illegible] نہیں۔ تیرے پیار میں [illegible] [illegible] میں [illegible] [illegible] ۔"

"[illegible] : شاہدہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ہیں۔"

"نہیں :"

"[illegible] : [illegible] تیرے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] آگ [illegible] ۔"

"نہیں :"

"[illegible] : شاہدہ کی [illegible] آگ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ۔ [illegible] ۔"

[illegible] شاہدہ کی [illegible] [illegible] ۔ [illegible] [illegible] آگ [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] ۔ [illegible] [illegible] ۔ [illegible] تھی :

اس نے پوچھا : [illegible] : [illegible] شاہدہ سے [illegible] ۔ [illegible]۔"

"کچھ نہیں۔"

"[illegible] شاہدہ نے [illegible] [illegible] [illegible] ۔"

"[illegible] [illegible] پیار [illegible] ۔ [illegible] [illegible] ۔"

"[illegible] [illegible] ۔ شاہدہ سے [illegible] پیار [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] ۔"

"جانتے ہو لوگ کیا کہتے ہیں؟"

"ہاں! تم قریشی ہو اور شاہدہ دھوبن ہے۔ تم بیاہ کیا چاہتے تھے!"

"ہاں ہے ..... لوگ میرے خاندان کی پشت پر شرافت کا پشتارا ہے۔ میں جل بھی جاؤں تو یہ پشتارا نہیں جل سکتا۔"

"سدرے! اگر تم دل سے تم پیار کا نباہ کیا جائے۔ شاہدہ نے اپنے اسی پیار کا ایک پاکیزہ قطرہ بھی بخش دے تو میں اُسے لے کر زیست بھر جیا جاؤں گا۔ تم تو آگ سے پہلے جل گئی!"

نعیم کی آواز آئی۔ بلبلے کی طرح تیرتے ہوئے نکلے اور کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"ابھی تیرا پیار زندہ ہے سدرے! پر جب تیرا پیار خودکشی کی موت مر جائے تو میرا سندیسہ شاہدہ تک ضرور پہنچا دینا۔"

ابھی شاہدہ کی گلی سُونی اور سنسان ہوئی ہی تھی کہ اس کے پیار نے خودکشی کر لی۔

ابھی چند ماہ ایک غزل بھی نہ آئی تھی۔ نہ اس نے شاہدہ کے جانے کے بعد کہہ دیا تھا کہ اس نے شکست قبول کر لی تھی: گلی اُس شام ہی بکھر گئی تھی کیونکہ اس شام کو گھر سے کل جو شور اٹھا تھا۔ وہ اسی شام ہی بکھر گیا تھا اور رات کے اندھیروں میں سناٹے سب سے اور قہر خراب ہے لئے اور اسے تو اپنی بیٹھک میں بیٹھا تھا۔ ابھی تک اُس نے لیمپ روشن نہیں کیا تھا۔ لیمپ روشن ہو بھی جاتا تو اُس کے دل کی گلی تاریک ہی تھی!

اس کی بیٹھک کا دروازہ کھلا تھا اور کھڑکی دروازے میں سے گلی کا اندھیرا اندر آرہا تھا!

"سدرے! اندھیرے میں بیٹھک کر رکھی؟" "میں ڈرتی ہوں۔"

"تم کیسے آگئیں شاہدہ؟ میں تو جی کر بھی چپ بیٹھا ہوں۔ جاؤ! میں تیرا ساتھ نہیں دے سکتا۔"

"سدرے پیار کرنے والے جھکتے رہتے ہیں۔ بھاگتے نہیں۔ میرے پیار کو مرا نہ دے۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لو اور لے چلو۔ میں نے سنا ہے شہر کی دُنیا بہت کھلی ہے۔"

"شاہدہ! میں کیسے چلوں۔ جاؤ! گلی پیچھے سے ڈولی میں بیٹھ جاؤ۔ میں آؤں گا نہ جانے والوں کا۔"

"سدرے! اگر تم بہت بزدل تھے۔ بے وفا! اگر میرے ساتھ اتنے قدم کیوں چلے۔ مجھے اب شور ... یا میں سمجھ کر کہاں جا رہے ہو؟"

"کہیں بھی نہیں۔ میں ہوں گلی میں، جہاں شاہدہ! پر میں تیرا ساتھ نہیں دے سکتا۔"

اندھیرے میں نفرت کی آگ بھڑکی اور اسے پیچھے ہی سنایا۔

وہ ایک قدم نہ چلی۔ اسے تو نیستی نے پیچھے سے لگا۔ وہ بزدل تھی۔ اپنا پیچھا چھوڑ دیا۔ پھر دیوار نے اس کا راستہ روک لیا۔ شاہدہ نے چیخ تو شہر پہنچا دی۔ اندھیرے شاہدہ کی نعش میں مٹی ملا دی اس نے خوشی میں ... بچا لیا تھا۔ پھر ... پیار کی خوشبو رہ گئی تھی۔ ایک بکھرا اور وہ اپنے ہوش اڑا بیٹھا۔ اُسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ تو پیار کا نقیب ہے۔

ان کے ساتھ مل کے اُن کا جیسا ہو گیا تھا.

وہ شعبدہ میں ہی تھا اور اسے یوں لگا کہ اس کے [illegible] کا ایک خنجر ہی ہوتی تھی!

مر مر مر گیا.

کی مدد کی. شعبدہ [illegible] نے [illegible] بیٹا [illegible] ایک [illegible] آباد [illegible]

لے آیا.

ذو سب دن کی اُجڑی :

مجھ جیسا کچھ نہ کی اب تو شادی کی [illegible] تھی. وہ پیسے کی [illegible] ایک قطرہ [illegible] سکتا تھا اور اگلی سرخی

سنسان تھی [illegible] شادی نے [illegible] کی عزت کا جنازہ نکال دیا تھا...... اس کا نام خاک میں ملا

گیا ہے...... اس کو پھانسی کی ناک کاٹ دی..... ختم ہو گئی...... تمام عمر سنبھال نہ سکی..... وہ

جو بنیا ہو تو کہے کہ نام آجا کیسا ہے.....

جیسے کے ذہن سے شادی کا سورج ڈھل گیا.

اتنی کمی دنیا میں انہیں بچے کی [illegible] تھی. جیسے نے [illegible] بیٹا [illegible] شادی کر ساتھ گیا.

[illegible] اپنے کندھوں پر شادی کی ذہنی کا بوجھ اٹھا لیا.

اس دن سے [illegible] کے شام ہو چکے تھے!

اور تو شادی مر چکی تھی!

اس نے [illegible] تیزاب کا ایک گھونٹ پی لیا تھا اس کے بیٹے [illegible] نے ایک [illegible] تھی جیسے اس کے [illegible]

ایک [illegible] گیا ہو!

تیزاب کا ایک گھونٹ..... شادی کو تیزاب کے ایک گھونٹ نے قتل کر دیا تھا... نہیں... [illegible]

[illegible] دروازہ بند کر دیا گیا [illegible] دروازے سے ایک جھٹکا دینے والی [illegible] راستہ [illegible] تھی

شادی تو اسی دن مر چکی تھی جس دن وہ [illegible] کے محل میں آئی تھی :

شاید........

لیکن اس کا [illegible] تھا. [illegible] کی طرف آہستہ آہستہ [illegible] چاند [illegible] دیکھتے دیکھتے [illegible]

[illegible]

شیر تھیں یا ایک ٹھیلے کی طرح پھٹ گیا۔ آمدنی کا بٹوارہ تقسیم ہوئی تو شادو اپنے آبائی مکان میں اُٹھ آئی۔ فینسی ڈرائی کلیننگ اینڈ ڈائنگ ورکس کی دکان بند ہو گئی۔ شادو اپنے باپ کا ہاتھ بٹانے لگی۔ اسرار احمد اسرار سوشل سیکورٹی میں ملازم ہو گئے اور ان کی ایک نہایت شریف گھرانے میں شادی ہو گئی۔ اب وہ شادو کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے۔ پر جانے کیوں جب کبھی وہ کسی مشتبہ شخص کی فکر میں ہوتے تو شادو ان کے سامنے ستار لیے آ کھڑی ہوتی اور انہیں اپنے الفاظ تازہ سے شادو کے گداز جسم کی تیز خوشبو آنے لگتی اور وہ چکرا کر رہ جاتے!

منصور سکول میں داخل تھا۔

شادو کو بچوں کے سوا کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔

بڈھا باپ دیر تک بھی اس کا ساتھ چھوڑ گیا اور اب شادو کو محسوس ہوا کہ وہ اکیلی رہ گئی ہے۔ اس نے یہ خلا حبیب کے دست شیدے کے ساتھ نکاح کر کے پورا کر دیا۔ شیدا ابھی صرف چند سال ساتھ نبا سکا اور ایک لڑکے کا تحفہ دے کر غائب ہو گیا۔ شیدے کے بعد اس نے کسی سے نکاح نہ کیا۔ وہ ایک امیر گھرانے میں برتن مانجھنے پر ملازم ہو گئی۔ ایک دن گھر کے مالک نے کسی تقریب کے بہانے ایک دس کا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ نوٹوں کا یہ سلسلہ تقاضا ہی ہو گیا اور منصور پڑھتا رہا۔ اس کے بہن بھائی پلتے رہے۔ اگلے سال گھر کی مالکہ نے شادو کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیا!

شادو نے گھر کے دروازے چوپٹ کھول دیے۔

محلے والوں کی آنکھیں ذرا دیر سے کھلیں۔ دبی زبان میں باتیں ہوئیں اور باتوں کا شور بلند ہوا تو کمیٹیوں کی بھنبھناہٹ شادو کے گھر تک جا پہنچی۔

"دیکھو شادو! اب جو تم نے کام شروع کر دیا ہے اس سے محلے کی رہی سہی عزت بھی جاتی رہے گی۔ پہلے بھی تم نے اپنے گھر سے بھاگ کر ہماری ناک کاٹ ڈالی تھی۔"

شادو خاموش ہو گئی!

اس نے محلے والوں سے توبہ کیا اور پھر دروازہ کھول دیا۔

پھر محلے والوں نے ایک کانفرنس کی۔ اس میں اسرار احمد اسرار بھی شامل تھے۔ طے پایا کہ شادو کے گھر جا کر اسے متنبہ کرنا چاہیے۔ شادو نے دروازے پر ان کا استقبال کیا۔ اس نے منہ سے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ اس نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ایک ایک کا جائزہ لیا۔ ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں اسرار کے چہرے پر ٹھٹک گئیں۔

ان آنکھوں نے کہا: تم بھی!

اسرار احمد اسرار نے نظریں جھکا لیں لیکن ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں پھر بھی برستی رہیں۔ اسرار کو یوں لگا جیسے کوئی بند ٹوٹ گیا ہو۔ سیلاب آئے گا اور سارا محلہ ڈوب جائے گا۔ یہ لوگ ڈوب جائیں گے اور ان میں سے کوئی بھی اس سمندر میں سے ابھر نہ سکے گا۔ کیونکہ ان سب کی پشتوں پر شرافت کا بوجھ ہے۔

منصور نے بھی چپ سادھ لی اور دھندا چمکا لیا!

اس نے منصور کو کام پر لگایا۔ وہ کالج آخری سے آگے نہ پڑھ سکا۔ پھر شادو کو منصور سے کیا کیا امیدیں تھیں: منصور کی پسند سے ہوا۔ شادو دستر خوان پر کتنی۔ کچھ پتا نہ۔ منصور جب جوان ہوا اس نے رنگ سازی کی دکان کھول لی۔ اس کام میں اپنے ایک اپنے وقت کا سر دھوم مچا دیا۔ منصور کی دکان نے خوب ترقی کی اور سب اسے شادو کا لڑکا کہنے لگے۔ جس نے کسی شریف دھرم کے ساتھ رشتہ نہیں لیا تھا؛

اور منصور کو بھی اس پر فخر تھا۔ اس میں سے اس کی عزت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا تھا۔ وہ یہ کبھی برداشت نہ کر سکتا کا بیٹا منصور اپنی ماں شادو سے کچھ کہنا چاہتا تھا پھر وہ بات ہونٹوں پر آ کر رک جاتی تھی اور آخر اس کا دم رک گیا؛

اور اس دن شادو نے دیکھا کہ منصور کے ہاتھ میں دو بوتلیں تھیں۔ دونوں میں ایک ہی رنگ کا پانی بھرا تھا۔ اس نے حیرت سے پوچھا: "یہ دونوں بوتلیں کس کام میں آتی ہیں۔ ان کے بیچ دوائی لایا ہوں۔"

"دونوں بوتلوں کا رنگ ایک ہی ہے۔"

"دوسری میں تیزاب ہے۔ بازار سے آتے ہوئے لے آیا۔ کل صبح دکان پر لے جاؤں گا۔"

"تیزاب کس کام آتا ہے؟"

"ڈائی کی رنگائی میں ... کیا رکھتے ہیں ...."

"اور ہاں ایک بات کہے دیتی ہوں۔ میاں منصور ان بوتلوں کو علیحدہ علیحدہ رکھنا۔"

اور اس رات شادو نے غلطی سے تیزاب کا گھونٹ پی لیا!

صبح ہونے سے پہلے پہلے وہ مر چکی تھی۔

ایک سیدھا سادا حادثہ تھا!

تیزاب کا ایک گھونٹ ایک ساٹھ برس کی عورت کو قتل کر گیا تھا!

شادو کا قاتل تیزاب کا ایک گھونٹ تھا!

منصور نے تو غلطی کی کہ ایک رنگ کی پانی کی دونوں بوتلوں کو علیحدہ کر دیا!

قاتل منصور تھا جس نے احتیاط نہ کی!

نہیں ...

ہو سکتا ہے شادو نے خود اپنے آپ کو قتل کر لیا ہو۔

وہ منصور کے سینے سے ہٹ جانا چاہتی تھی جیسے اُس کے گناہوں نے ماضی کی وجہ سے کوئی شریف رشتہ نہیں مل رہا تھا !
شاہدہ کی قاتل شاہدہ تھی . . . .
نہیں . . . . .
پھر قاتل کون تھا . . . . ایک گھونٹ . . . . ایک حادثہ . . . . ایک لمحہ . . . .
نہیں . . . .
اب یہ لمحہ قبر کی آغوش میں منوں مٹی کے نیچے دفن ہو گیا تھا !
اسرار قبر سے ہٹ کر دو قدم دور چلے گئے .
یہاں ایک بوڑھا اداس کھڑا تھا اور اُس کی جھاڑیوں سے ایک ماتمی نغمہ بکھر رہا تھا مسلسل . . نغمۂ موت . . .
ببول اور بیری کی سوگوار جھاڑیوں پر صدیوں کی دھول جمی تھی !
اور لوگ قبرستان سے جا چکے تھے . صرف منصور کھڑا تھا .
پھر دھیرے سے منصور بھی چلا گیا .
تو قبرستان کا اسرار چاروں کھونٹ سے لپک کر آیا .
جھاڑیوں سے پائل کی جھنکار اُٹھی .
قبرستان کے آنگن میں موت رقص کرنے لگی . اُس کے پائل کی جھنکار میں آواز نہیں تھی .
" تم کون ہو ؟ "
پائل کی جھنکار مترنم ہو گئی . اُس کے حسین چہرے پر موت کی زردی تھی .
" میں ہوں شاہدہ ! "
" تم ! "
اُس کا رنگ زرد پڑ گیا . وہ کانپ گیا . وہ ڈر کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا .
" ابھی ابھی تم پوچھ رہے تھے شاہدہ کو کس نے قتل کیا ؟ "
" ہاں ! "
" جاننا چاہتے ہو اُس کا قاتل کون ہے ؟ "
" نہیں ! "
" سنو تو ، وہ قاتل تم ہو . "
" نہیں ! "
اُس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی چیخ کا گلا گھونٹ دیا .

اللہ کا حکم

احمد سعید

اس کو جب ہاتھ خرچ کے پیسے ملتے وہ ان سے بہت سے (ننھے) پرندے جو پنجروں میں بند ہوتے زیادہ سے زیادہ تعداد میں خرید کر چھوڑ دیتا۔ انہیں پنجرے کی ایک ایک سلاخوں سے باہر نکالنے کے لیے وہ ہر دم بے چین رہتا۔ ننھے ننھے سفید اور چھوٹی چھوٹی چونچ والی جب پنجرے سے باہر فضا کی وسعتوں میں ایک ہالے کی مانند نیم دائرہ بناتے ہوئے اڑ جاتیں تو اس کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو ڈبڈبا آتے۔ اسے بچپن ہی سے یہ شوق پیدا ہو گیا تھا جو آہستہ آہستہ جنون کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اگر اس کے پاس پرندے انہیں رہا کرنے کے لیے پیسے نہ ہوتے تو وہ [illegible] لوگوں کے منہ [illegible] اور پھر ان کا ہاتھ [illegible] پیچھے [illegible] سے ہٹتا۔ پرندے یہ بات دیکھ کر حیرت ہوتی کہ وہ پھر اپنے مالک کے پاس آ جاتے۔ اس لیے کہ اس کے ہاں ان کا پیٹ پلتا تھا اور وہ پنجرے سے مانوس رہتے تھے۔ جبھی تو لوگ، اس نے سوچا، محبت کرتے ہیں مگر اس کے باپ کی طرح غیر فطری سمجھتے ہیں۔ لیکن قدرت کی ہر چیز کتنی آزاد ہے اور آزاد رہ کر ہی زندہ رہتی ہے۔ اس کی سوچ کی سادگی [illegible] پرندے اور جانور پنجروں میں بند رہنا پسند نہیں کرتے۔ اس لیے اس نے ان کو رہا کرنے میں اپنا بیشتر وقت ضائع کر دیا ہے جو دوسرے بچے اور نوجوان تعلیم حاصل کرنے میں صرف کرتے تاکہ اس سے فارغ ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو جائیں۔

"جب بڑا ہو گا تو آزاد رہنے کا مزہ چکھے گا۔ [illegible] کے پیسے [illegible] انہیں پرندے چھڑانے کی نذر کر [illegible] ہو گئی ہیں!"

اس کو [illegible] اپنے سالہا سال سے [illegible] خوش کرنے کے لیے ایک روز فیصلہ کیا اور [illegible] میں اس کی ماں کے سامنے دعا [illegible] اس کے جواب میں [illegible] اپنے بیٹے پر اور اپنی پھوٹی قسمت پر آنسو بہایا کرتی۔ لیکن [illegible] اس کی زندگی میں ایک موڑ [illegible] انسانی وحشت [illegible] پیدا ہونے کی بجائے اس پر ایک ناگفتہ بہ جلال اور سرشاری کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اور جب اس کی ماں نے بھی اسے ایک بیکار ہستی ٹھہرایا اور اس نے شدید بیزاری ظاہر کی اور یہ کہا "کاش تم پیدا ہی نہ ہوتے" اور ایسا [illegible] لوگ [illegible] تو اس نے جواب دیا
"[illegible] خوشی ہو [illegible] رات حکم دیا ہے [illegible] . . . ."

"دنیا کے سارے بند پرندوں کو آزاد کرا دو ۔"

اس کے جواب میں بیٹے کی آنکھیں [illegible] اٹھیں اور اس نے کہا۔ "ہاں تم نے ادھوری بات کہی . . . ."

"میں نے [illegible] جواب ہے۔ اگر میں تیرے دل کا [illegible] تو اور کون [illegible] . . . . . میری نظروں کے سامنے

دو ہوا؟"

"میرے پیغمبر پر دنیا پچھتایا کرتی ہے ماں۔"

"توبہ کر توبہ۔ مردود۔ تیری یہ مجال!"

"ہاں میں نے رات خواب دیکھا ہے۔ اس میں اللہ میاں نے مجھے ———"

لڑکے کا فقرہ اس کے گال پر ماں کا زور سے ایک تھپڑ لگنے نے مکمل کر دیا۔ وہ خود خوف سے کانپنے لگی کہ اس لڑکے کو کیا ہو گیا ہے۔ اس کا دماغ تو کہیں نہیں چل گیا۔ ویسے شیر جیسے جوان پر یوں بھی ہاتھ اٹھاتے کون نہ گھبراتا۔ لیکن لڑکے نے اس کے جواب میں خاموشی سے سر جھکا دیا اور اپنے کمرے میں جا کر چارپائی پر پتھر کی مانند گر پڑا اور دیکھتے دیکھتے یوں سو گیا جیسے اُسے بڑی نیند آئی ہو۔

اس کے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگانے پر کھانا کھانے کے لیے اٹھا۔ نیم خوابی کی سی حالت میں دو چار نوالے لیے اور پھر سو رہا۔ باپ رات باہر سے واپس آنے پر اس کی طرف دیکھنا تک گوارا نہ کیا لیکن ماں نے چپکے سے اُس کے سرہانے بیس روپے کے نوٹ رکھ دیے حسبِ عادت وہ جب بھی اس پر خفا ہوتی تو اس کے سرہانے سوتے وقت کچھ پیسے چھوڑ جایا کرتی . . . .

اس نے رات ایک خواب دیکھا تھا کہ پنجرے میں بند جانور بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ اسے اپنے کانوں میں اللہ کا یہ حکم صادر ہوتا سنائی دیا۔ "اے میرے پیغمبر۔ جا اور سارے جانوروں کو آزاد کرا!"

جب لڑکے کا ہاتھ نادانستہ کسی سرسراتی شے سے لگا تو اسے وہاں بیس روپے کے نوٹ پڑے دکھائی دیے جنھیں اس نے فال کے طور پر تعبیر کیا۔

اس سفر بس کے ذریعے بارہ گھنٹے کی مسافت طے کر کے وہ وہاں پہنچا جہاں اس نے اپنا مشن پورا کرنا تھا۔ دور ہی سے اسے ... کی طرف جا رہی تھی پہنچا پڑا اسے پڑا مگر کھلنے سے پہلے ڈیڑھ گھنٹے اس کے باہر انتظار کرنا پڑا۔ اس کا دروازہ کھلتے ہی وہ ... جانور کے پنجرے کی طرف لپکا۔

شیر پنجرے کے اندر بڑی طمانیت سے پڑا ہوا تھا۔ نوجوان نے پنجرے کے قریب پہنچ کر اس سے ... میں بڑی یہی ... میں آگیا ہوں تجھے۔ اب فکر نہ کر" کہتے ہوئے اس نے اپنے دونوں بازو اس کی طرف یوں پھیلا دیے جیسے اسے اپنے سینے سے لگانا چاہتا ہو۔ وہ ساتھ ساتھ منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا جیسے کوئی منتر پڑھ رہا ہو۔ جب شیر اس کی جانب آتا تو نوجوان کی آنکھیں حیرت اور خوشی سے اندازے میں پھیل جاتیں اور وہ اسے اشارے ... دکھائی دیتا ... تماشائی ... ہوگیا تھا۔ نوجوان اس کی موجودگی سے بے خبر تھا حتیٰ کہ شیر خود ... وفی پنجرے میں چلا گیا۔ اس کے بعد نوجوان ... ہو کر پنجرے کا طواف کرنے لگا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ تماشائی بڑے ... قدرت ... انداز میں ... تھے ... وہ تو شیر کے اندر چلا گیا تھا جہاں قدم رکھنا ممنوع تھا۔ ... پنجرے کی سلاخوں میں سے ہاتھ اندر

ڈال کر شیر کو باہر نکلنے [illegible] تھے ہیں۔ [illegible] کی آواز آئی۔ [illegible] کر شیرنی جب [illegible] باہر گیا [illegible]
[illegible] دیا۔

"[illegible] پاگل [illegible]" [illegible] چنانچہ [illegible]
[illegible] شیرنی [illegible] کہ اس [illegible]
کر شیرنی [illegible] دیکھا [illegible] میں [illegible]

"ہاں [illegible]" خان بابا نے [illegible] کر دیا۔ اس کے
[illegible]۔

"[illegible]"

خان بابا [illegible] چنانچہ وہ
[illegible] شیر اور شیرنی [illegible]
[illegible] تھا۔

[illegible] خان بابا نے [illegible]
[illegible] طرح پیار کیا۔ . . . . . شیرنی [illegible]
[illegible] تھا۔ خان [illegible] دیا۔

[illegible] ہو گیا۔

"خان [illegible] بند کر دو۔"

"[illegible]"

[illegible] خان بابا [illegible]
[illegible] وقت
[illegible] پیار کرتے [illegible]
[illegible] خان بابا [illegible]
[illegible]

"خان بابا [illegible] ہو [illegible] مگر وہ [illegible]
تو [illegible]"

سات آٹھ دن میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ چوکیداروں کی خاطر تواضع پر سب پیسے خرچ کر ڈالے تو انھوں نے اس سے منہ موڑ لیا۔ اس کے ...ہ کر انھوں نے کہا: "پہلے پاگل سے پالا پڑا ہے۔ کہیں کٹ کر بیٹھا تو نوکری سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ ورنہ کہیں صاحب ... انٹنڈنٹ صاحب سے شکایت نہ کر دے۔ اگر جانوروں سے اتنا پیار ہے تو چڑیا گھر میں نوکری کیوں نہیں کر لیتا۔"

ایک رات جب سب چوکیدار سو رہے تھے اور کبھی کبھار گیدڑ اور اُلو بولنے کے سوا چڑیا گھر پر سکوت مسلط تھا تو ایک سایہ ...ا دیوار پھاند کر اس کے اندر داخل ہوا اور چھپتا چھپاتا شیرنی کے پنجرے کی جانب لپکا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں کچھ پکڑ ...ا تھا۔ ایک چوڑی اور چپٹی ہوئی چیز، دوسری لمبوتری۔ کچھ منٹوں کے بعد شیرنی کے پنجرے کے تالے پر زور سے ایک ضرب کی آواز آئی۔ جب تالہ ٹوٹا تو ایک اور چوٹ لگی۔ یہ بھی کارگر ثابت نہ ہوئی۔ اس پر سایہ بجلی کی مانند پنجرے کی دوسری جانب بڑھا۔ ...ے ...سے جانور اپنے اپنے پنجروں کی طرف جاتے تھے۔ اب تالے پر ہتھوڑے سے چند وار ہونے اور پنجرے کے اندر سے شیرنی کے کسمسانے اور ...نے کی آواز آئی۔ سناٹے میں جیسے کا سا عالم ہوا۔ چوکیدار جاگ اٹھا شاید چوری ہو رہی تھی۔ لیکن سایہ اطمینان سے ...ا۔ آخر کار وہ تالا ...ے میں کامیاب ہو گیا۔ تالا گر پڑا۔ سایے نے پنجرے کا دروازہ اندر دھکیلا ——— ایک دراز قامت انسان اسے پوری طاقت ...سے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ اسے آدھا ہی کھول سکا۔ اسی دوران میں چوکیدار اور پنجروں کی طرف چلے جدھر سے آواز آئی ...ب سایے نے ایک لاٹھی پنجرے کے دروازے کے پاس رکھ دی اور خود آگے بڑھ کر بیٹھ گیا کہ اس کے پاؤں باہر نکل گئے۔ ... ...ی میں دو شعلے بار آنکھیں اِدھر اُدھر گھومیں اور سایے کو اپنے قریب شیرنی کی موجودگی کا احساس ہوا اور گرم گرم قریب سے قریب تر آتی محسوس ہوئی حتیٰ ...ں کا سانس اس کے کندھے اور گردن کو چھونے لگا۔

"آؤ۔ آؤ۔ میں تمھیں آزاد کرنے آیا ہوں۔" سایہ بولا۔

شیرنی نے پہلے تو سر اٹھایا ... پھر اس کے بعد ... جو ...ا اس کے ہاتھ ساتھ تھے کندھے میں کھب گئے ... ...ے آواز آئی اور اسے پاؤں کے ... اوپر آ گرے ... اس نے ... جیسے کسی ... زور سے شیرنی پر اس کے پہلے ہاتھ ڈالا ... وہ اسے ... سے ... کر گئی۔

"خان بابا۔ بندوق!"

"نہیں نہیں۔ خان کو ضرورت نہیں ... پاگل ... پاگل ... شیرنی کا بچہ ... نے حفاظت کرو۔" خان بابا چلاتا ہوا ...ے کی جانب لپکا۔

"گولی مار!" وہ پنجرے کے قریب پہنچ کر دھاڑا۔ ... نے دیکھا ... نیم وا ... ... جہاں اس کے ... پاؤں باہر تھے۔

"یا ر!" خان بابا کی آواز سنتے ہی وہ سپاہی پیچھے ہٹ گیا ... بابا کے بڑھے ہاتھ ... ...منے اس وقت ... ... پاگل تھا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کرسی

ستیش بترا

مسٹر ایڈرسن اپنے ایر کنڈیشنڈ کیبن میں بیٹھے ڈاک پر دستخط کر رہے تھے۔ یہ اُن کا دفتر میں آخری دن تھا۔ اُن سے ذرا پیچھے نہایت ادب سے کھڑی اُن کی سیکرٹری مس ڈاڈیا باری باری ٹائپ شدہ خط پیش کرتی اور ایڈرسن دستخط کرتے جاتے۔ کبھی کوئی سوال پوچھ لیتے تو وہ نہایت انکساری سے مطلوبہ معلومات فراہم کر دیتی۔ مسٹر ایڈرسن کو مس ڈاڈیا کی فرمانبرداری، اُس کی کاروباری [illegible] رکھنے کی [illegible] اور ٹیپ ریکارڈ سی یادداشت نے ہمیشہ متاثر کیا تھا۔ وہ اکثر فرم کے ڈائریکٹروں اور دوسرے افسروں سے کہا کرتے "مس ڈاڈیا تو اس فرم کی چلتی پھرتی انسائیکلوپیڈیا ہے!"

جب مسٹر ایڈرسن آخری خط پر دستخط کر چکے تو اُنہوں نے اپنی سنہری عینک اُتار کر میز پر رکھ دی۔ اور اپنی آنکھوں کو ہتھیلیوں کی پُشت سے ملتے ہوئے مس ڈاڈیا کی طرف دیکھا اور پھر اُن کا مہربان بزرگانہ چہرہ مسکرا دیا۔

"مس ڈاڈیا! تیس سال کے لمبے عرصے کے بعد میں آج اپنی تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو رہا ہوں۔ آج اس فرم کو شروع ہوئے بھی اتنا ہی عرصہ ہو گیا ہے۔ لیکن پچھلے پندرہ برسوں میں جس رفتار سے فرم کا کام بڑھا ہے اور جس طرح سے ان بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں کو نبھانے میں جو مدد تم نے مجھے دی ہے میں اُس کے لیے بے حد شکرگزار ہوں!" اور وہ کرسی سے ہاتھ ملانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

مس ڈاڈیا کا دل جیسے ایک لمحے کے لیے رک گیا۔ اُسے مسٹر ایڈرسن کے ساتھ کام کرنے میں جو لطف آیا تھا وہ اُسے کبھی بھی نہ بھلا سکے گی۔ اُس کا گلا شدتِ جذبات سے بھر آیا۔

"میں آپ کی مہربانیوں کو کبھی نہیں بھلا سکتی سر! ہم سب فرم کے سب لوگ آپ کو ہمیشہ مِس کریں گے!" اُس نے آگے بڑھ کر مسٹر ایڈرسن کا ہاتھ تھام لیا۔

مسٹر ایڈرسن شفقت بھری نگاہوں سے اُس کی طرف چند لمحے دیکھتے رہے اور پھر سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے "مس ڈاڈیا! میں تمہاری بے مثال خدمات کے لیے ایک نہایت معمولی سا تحفہ پیش کرنا چاہتا ہوں!" اُنہوں نے میز کی دراز کھولی اور ایک سونے کی گھڑی نکال کر اُس کے ہاتھ میں رکھ دی۔

"مسٹر ایڈرسن!" وہ اتنا قیمتی تحفہ دیکھ کر چونک پڑی اور پھر اُس نے شدتِ جذبات سے مسٹر ایڈرسن کی ہتھیلی کی پُشت کا بوسہ لے لیا۔ اُس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

مسٹر ہیشد ہو نے [illegible] دیکھو ، دیکھو [illegible]

[illegible]

[illegible] ہم [illegible] ہوں گے ؟

• دنیا کا [illegible] ہو نے فلسفیانہ انداز میں [illegible]

[illegible]

[illegible]

• [illegible] اور [illegible]

باہر چلی گئی ۔

[illegible]

[illegible] ایک [illegible] تھا ۔

مسٹر ہیشد ہو [illegible] ایک [illegible]

[illegible] کوئی دلچسپی تھی ۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

:دنیا اور انہیں اس ہاتھ میں پکڑانے لگے۔

دروازے پر ایک جانی پہچانی دستک ہوئی۔
"کم ان جیکی!" ان کی آواز میں ایک گھبراہٹ ابھر آیا۔ ان کا قیاس بالکل درست تھا۔ وہ جیک گراہم ہی تھا!
"ایڈی! تم تو ہم سے الگ ہو رہے ہو۔ میں نے سوچا ایک ریٹائر ہونے والے ڈائریکٹر کے حضور میں اپنا سلام کر آؤں!"

"اور ڈونٹ بی سلی جیکی!" ایڈیسن نے اٹھ کر گراہم کو کندھوں پر دباؤ ڈال کر کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں فرم سے علیحدہ ہو رہا ہوں۔ تم سے تو نہیں! میں ویسے بھی اب فرم کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں رہا۔ فرم کو جوان خون کی ضرورت ہے!"

"اور تجربے کی بھی!"

"وہ تجربہ تو تمہارے جیسے منجھے ہوئے ہیں!" ایڈیسن نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ تمہارے نئے [illegible] بیلی کا جوش اور [illegible] تمہارا جاندار تجربہ اس فرم کو اور آگے لے جائیں گے! میرے لیے کیا اتنا فخر کم ہے اس فرم کے نام کے ساتھ میرا حقیر نام بھی منسلک ہے!" اور پھر وہ ہنس دیئے۔

"یاد ہے وہ دن جب تم نے اس فرم کو شروع کرنے کا پروپوزل میرے سامنے رکھا تھا! میں تو کچھ دیر کے لیے کانپ گیا تھا!"

"ایڈی! تم تو خود جانتے ہو کہ اس فرم کو چلانے میں [illegible] کے کتنے [illegible] آئے اور جب بھی [illegible] ہمیشہ تمہاری ثابت قدمی اور خود اعتمادی نے مجھے سہارا دیا۔ یاد ہے وہ [illegible] جب [illegible] نے اپنی [illegible] ہمارے سامنے [illegible] تھیں اور تم نے ان [illegible] کاغذ کے ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہوئے کیسی [illegible] کہا تھا!" ایڈیسن اور گراہم کی فرم [illegible] کام کرتے [illegible] ہوئی تھی۔ ایڈیسن اور گراہم کے [illegible] اور [illegible] میں اب بھی اتنی ہمت اور طاقت ہے کہ وہ [illegible] پھر [illegible]!"

مسٹر ایڈیسن مسکرا دیئے۔

اتنے میں دروازے پر [illegible] دستک ہوئی اور [illegible] دروازے میں سے [illegible] کے [illegible] اس [illegible] جا گیا۔

"تم [illegible] کی [illegible] میں [illegible] کر آئی تھی!" مسٹر ایڈیسن نے اپنی پرجوش آواز میں [illegible] کہا۔

"مسٹر ایڈیسن [illegible] کو [illegible] تھا!" اس نے اپنا ہاتھ [illegible] بڑھا دیا۔

کہا تھا۔ "مجھے یقین ہے کہ آپ یہاں [illegible] اور یہاں کا تجربہ [illegible] ثابت ہو گا۔"

[illegible]

[illegible]

[illegible] — میں اب آپ سے رخصت چاہوں گا۔ [illegible] Wish you the very Best [illegible]

ہو گیا۔

"[illegible]" [illegible] نے کہا۔

"[illegible] بات ہو سکتی ہے۔" [illegible] نے کہا۔

"[illegible] پہلے [illegible]!"

"[illegible] تمہارے کیا ارادے ہیں؟ تم [illegible] گیا؟"

"[illegible] — میں [illegible] اور [illegible] دوں گا۔"

"[illegible] اپنے [illegible]

[illegible] ہو گی؟"

"نہیں [illegible] تم [illegible]"

"[illegible]"

"نہیں [illegible] میں نے [illegible] ارادہ کیا ہے [illegible]

ٹھیک ہے [illegible] مجھے تمہارے [illegible] کا احترام ہے۔ [illegible] چلتا ہوں۔"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ہوا ــــــ لیکن اس وقت تو یہاں بالکل سناٹا تھا۔ اس دنیا میں اونچی کرسیاں اور میز بالکل خالی نظر آ رہے تھے حتیٰ کہ میز دروازے کے قریب بیٹھے ہوئے ... صاف دکھائی دے رہی تھی۔ یہ تمام میز کرسیاں، الماریاں ایک ایک کر کے اُن کی نظروں کے سامنے یہاں آ گئیں یہ ... تعداد ایک ہو گئی، کیونکر ہو گئی؟ پانچ آدمیوں سے تین ہزار! تین ہزار خاندان اس فرم کی بدولت اپنی زندگی بسر کرتے تھے! اس شاندار ترقی میں ان کا کتنا بڑا ہاتھ تھا! وہ رکتے، جھکتے، گنگناتے، دھیرے دھیرے چلتے، دروازے کے قریب پہنچ گئے۔ دربان نے نہایت ادب سے دروازہ کھول دیا۔

"اچھا جوزف بائی بائی!" اور دربان نے نہایت چستی سے سیلوٹ مارا۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے جھکے سے سر ہلا دیا۔

"آج سیلوٹ نہیں!" اور انھوں نے اپنا ہاتھ دربان کی طرف بڑھا دیا۔ جوزف ایک لمحہ بھونچکا سا رہ گیا! اور پھر اس نے جلدی سے مسٹر ایڈورسن کا ہاتھ تھام لیا اور اُسے آنکھوں سے لگایا۔ جب اس نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں نم تھیں۔ مسٹر ایڈورسن نے اس کے کاندھوں کو تھپتھپایا اور بلڈنگ سے باہر آ گئے۔

سیڑھیوں کے دائیں طرف ... میں ... شوفر نے نہایت ادب سے آگے بڑھ کر دلکش چمکیلی سیاہ پونٹیک کار کا دروازہ کھول دیا۔ ... سے ... مسٹر ایڈورسن کار میں بیٹھ گئے۔

اگلے روز صبح سوا نو بجے دفتر میں معمول کی طرح چہل پہل تھی۔ چند لوگ گروہوں میں بٹے کسی ڈیسک کے گرد دو منٹوں سے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ کچھ لوگ باری باری دفتر میں چلے آ رہے تھے۔ ہر آنے والے کے ساتھ "ہیلو"، "گڈ مارننگ" کا شور اٹھتا اور پھر وہ دفتر کی بڑھتی ہوئی آبادی میں اپنے منتشر شدہ ... میں جذب ہو جاتا۔ اس شور میں نسوانی آوازیں اور قہقہے نہایت صاف طور پر سنائی دیتے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ہو جاتا۔

[illegible] [illegible] [illegible]

کسی انشورنس کی تمام ... ہو گئے۔ وہ جنہوں نے نہیں اور جو بچ گئے تو لوٹ لیں۔ مدعا ضمنی پہلو سے لگا کر شعلہ ایک دو تمہیں اس سلسلہ میں ... کے بنیاد ڈالی تھی ڈاکٹر مسٹر ایشمیڈ سن ــــ ... کو کال تک ... تعریف تو اس نے کیا کہ ان کے ہاتھ میں کسی کے کھچڑی آٹو میک کی بجائے صرف نمبر ... ۔۔۔ اور وہ اخبار کو ... سے ملنے دینے سے پہلے گڑ ... رنگ کہتے، پھر کبھی کی طرف بڑھ گئے۔

مسٹر لیچک کا ہاتھ ہی دیا ہوا ... شوہر کی آنکھیں کہہ رہے تھے اور انھوں نے ڈیوٹی ... کہتے ہوئے ... کو تسلی دی اور پیک دی۔ خدا کہیں انہیں ... مسٹر شیفیلڈ نے اپنی بیٹھک سے غائب ہوتے ہوئے کہا: "... مسٹر ایشمیڈ سن کو مار ... اور مجھ پر نہ ہمت ہو گئی۔" مس گرے ... کا اقتباس ... ڈاکٹروں سے ... کر رہے تھے ... ہو گیا۔ ناظمین نکلتی ہوئی ... نے ... کو ... کہتے ہوئے کہا: "... ہاں!" اور پھر ... نے ایک ... ایک انگلی اپنے گلگر ... سے ... گھوڑ ... جیسے ... مس واڈیا ... تھا ... کے دماغ کا کوئی پرزہ ڈھیلا ہو گیا ہے۔

مس واڈیا بھی ... کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید مسٹر ایشمیڈ سن کوئی ضروری کاغذ بھول گئے تھے جس کی وجہ سے انہیں آنا پڑ گیا۔ ... تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ مسٹر ایشمیڈ سن اپنے کام کاج میں ہمیشہ ... سے دلچسپی لیتے تھے۔ شاید یہ کام ... تھا ... ذاتی کام سے تمام ... پہلے بنے ... اپنے بنگلے پر ... جا چکے تھے۔ اب تو ان کے ... کوئی کام نہ تھا۔ ... مسٹر ایشمیڈ سن ... کسی کام کے دفتر میں آنا پسند نہ تھا۔ وہ ضرور ... کرنے کے قائل تھے۔ ... کام ... com ... کرنے لگی۔

ایک گھنٹے سے زیادہ گزر گیا لیکن مس واڈیا کے لیے مسٹر ایشمیڈ سن کی طرف سے کوئی بلاوا نہیں آیا۔ دفتر میں ... بڑھ ... اس لیے وہ ... کے لیے بے حد بے چین ہو رہا تھا۔ وہ ... جانے کے بجائے مسٹر ایشمیڈ سن کے کمرے کے سامنے سے گزری اور ... سے ... ہوئے ... شیشے میں سے جھانک کر ... مس واڈیا کی طرف بڑھی۔

"مس واڈیا! مس واڈیا!" ان کی آواز میں ایک عجیب گھبراہٹ اور حیرت کا عنصر تھا گویا وہ کوئی انوکھی چیز دیکھ کر آئی ہو۔

مس حیرت اور ... ہوئی ... اپنا کام ... چھوڑ کر مس واڈیا کی میز کے پاس پہنچ گئیں۔

"مس واڈیا، آپ کا ... ہو ... بھر ... آنکھیں چڑھا ... سکڑا ... وحشیانہ ... اخبار پڑھ رہے: مسٹر ایشمیڈ سن ... معلوم ہوتا تھا ... کر ... لیں۔"

... مس واڈیا بھی ... کر چھپا نہ سکی۔

... اخبار پڑھتا تھا اور ... کا ... تھا: "... شرمندہ ... اور ... سو ... جیسے ..."

ڈرکشا نے جلدی سے اپنے میز پر ٹائپ کرنے میں مشغول ہو گئی۔ سب لڑکیاں اپنی اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئیں۔

مس ڈولا ایڈمس پرسنل سیکرٹری ہونے کی وجہ سے اپنے باس کو شکل سے زیادہ پہچانتی تھی۔ جیسے ہی مسٹر ایڈیسن نے ریٹائر ہونے کے بعد دفتر میں کام کو سنبھالا تھا، اس نے کچھ سوچ کر مسٹر ایڈیسن کے کیبن میں جانے کا فیصلہ کر لیا۔

مسٹر ایڈیسن کے کیبن کے قریب پہنچ کر اس نے پہلے بیضوی شیشے میں سے ایک سرسری نگاہ پرسکون انداز سے اندر جھانکا۔ مس ڈولا نے محسوس کیا کہ ان پچھلے چند سالوں میں مسٹر ایڈیسن کو کبھی اس انداز میں بیٹھے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے نہایت ادب سے شیشے کا دروازہ مسٹر ایڈیسن کی جانی پہچانی آواز سنائی دی۔

"کم ان!"

اس نے نہایت نفاست سے دروازہ کھولا اور مسکراتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔

"میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں سر!"

مسٹر ایڈیسن نے اخبار بند کرتے ہوئے میز سے ٹانگیں ہٹا لیں۔

"مس ڈولا! تم نہیں اس کمرے میں کوئی فرق محسوس ہو رہا ہے؟ دیکھو اس کمرے میں کتنی شانتی ہے۔ کتنا سکون! بالکل ٹیلیفون کی گھنٹیاں مسلسل بجتی رہتی تھیں۔ ہر کوئی ہر لمحہ اپنا مسئلہ حل کرنے یا میری رائے لینے گھسا آتا تھا۔ میں ان سب سے پریشان ہو گیا تھا۔ جیسے حال میں بڑی خواہش تھی کہ میں ایک بار اس کیبن میں ایسی ہی خاموشی اور شانتی کو محسوس کر سکوں۔ زندگی کی مصروفیات اور پریشانیاں تک مصروفیات میری زندگی کو دیمک کی طرح چاٹ رہی تھیں۔ آج میں ان پر حاوی ہوں۔ زندگی میرے اشارے پر ناچ سکتی ہے۔ میں جب چاہوں اسی وقت دفتر سے اٹھ کر جا سکتا ہوں۔ کل تک میں دنیا کی سیر کرنے کے لیے ترس گیا تھا۔ یہ کرسی میرے پاؤں میں زنجیر بن گئی تھی۔ آج ——— میں آزاد ہوں۔ خود مختار ہوں۔ جو چاہوں کر سکتا ہوں۔" اور انہوں نے تیزی سے میز کے قریب رکھا ہوا ٹیلیفون کھینچ کر سامنے رکھ دیا۔

اتنے میں ایک جانی پہچانی دستک سنائی دی اور پل بھر میں گراہم نے اندر جھانکا۔ وہ جیسے ہی ایڈیسن کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گیا۔ اور پھر وہ مسکراتا ہوا بولا: "ایڈیسن! تم ابھی یہیں ہو؟" اور پھر اس نے گھورتے ہوئے ٹیلیفون کی طرف دیکھا۔

"ارے اپنے کمرے میں ہو ایڈیسن!"

"ہاں بھئی۔ میں محسوس کرنا چاہتا تھا کہ ذمہ داریوں کا کانٹا نکالنے کے بعد انسان اپنے آپ کو کتنا ہلکا محسوس کرتا ہے۔ اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں اس کیبن کو ابھی چند روز استعمال کروں گا۔"

"ارے واہ! ایڈیسن! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ تم جب تک چاہو اس کیبن کا استعمال کرو۔" گراہم نے کہا۔ "مس ڈولا! یہ ایڈیسن کے بیٹھنے کا کمرہ رہے گا۔ میں نے آج سے بلڈنگ کے دوسرے حصے میں بیٹھنے کا ارادہ کیا ہے۔ انہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔ اور ایڈیسن اگر چاہو تو مس ڈولا بطور سیکرٹری اب بھی تمہارے ساتھ کام کر سکتی ہے۔"

"شکریہ۔ میں اب کام کے بارے میں نہیں سوچنا چاہتا۔ مس ڈولا کو اب کوئی اور کام دیا جا سکتا ہے۔"

"مجھے [illegible] مس ہولایا کہ ان کا کیا حال بتانا ہے؟"
"نہایت اچھا خیال ہے۔ مس ہولایا ہے۔ یہ تو بہت مدد کر سکتی ہے؟"
جس حد تک تعریف میں کر سکتی ہوں اسے وہ مطلب کی بات کا اچھا تک کر باہر چلی گئی۔

چونکہ مسٹر ایلیٹ سن کے کام کو بیشتر دفتر والوں نے شیلی کے سونپ رکھا تھا جس سے ہولایا کو بھی توقع تھی کہ وہ جلد ہی مسٹر شیلی کی سیکرٹری بنا دی جائے گی لیکن ایک ہفتہ گزر جانے پر بھی کوئی ایسے آثار نہیں ہوئے۔ وہ چند دنوں تک مسٹر ایلیٹ سن کے کیبن میں ہی کام کرتی رہی لیکن آہستہ آہستہ اس کی مصروفیات ختم ہو گئیں۔ وہ مس ایلیٹ سے باتیں کرنے کی کوشش کرتی لیکن اس کے پاس فرصت کہاں تھی۔ جب وہ [illegible] بہانہ بنا کر [illegible] اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے رومانی ناول پڑھنے میں مشغول رہتی۔ نہ جانے کیوں احساس ہونے لگا تھا کہ وہ مسٹر ایلیٹ سن کے ساتھ ساتھ [illegible] ہو گئی ہو۔

[illegible] دفتر آنے لگے [illegible] ایک گھنٹے کے بعد وہ اپنے کیبن سے نکل کر چلے گئے [illegible] پھر [illegible] کے بعد [illegible] اپنے پر قابض ہو گئے۔ دفتر کے سبھی لوگ ان کا احترام کرتے لیکن [illegible] شیلی کے دل میں ان کا احترام [illegible] تھا۔

ایک روز جب ہولایا دفتر آئی [illegible] ہیں اس کے [illegible] معلوم ہو گئے۔ وہ اب مسٹر مستری کی سیکرٹری بنا دی گئی تھی۔ مسٹر مستری [illegible] کے بعد وہ اس [illegible] سے بالکل پیار [illegible] اس کی آنکھیں [illegible] ہو گئیں [illegible] اپنی پچھلی [illegible] مسٹر ایلیٹ سن اور مسٹر [illegible] ہوئے [illegible] جیسے [illegible]۔ ابھی وہ سنبھل بھی نہ پائی تھی کہ ایک نہایت خوبصورت [illegible] لڑکی [illegible] اس کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ [illegible] کی [illegible] گئی تھی۔

"مس ہولایا، یہ مس [illegible] شیلی کی نئی سیکرٹری ہیں۔ آپ [illegible] مستری کے کیبن میں جا رہی ہیں۔ مسٹر شیلی نے [illegible] یہ بہت اچھے سے کیا ہے؟"

مس ہولایا کو جیسے ایک چکر سا آگیا۔ وہ نہایت مشکل سے سنبھلی۔ اس نے اپنی سیٹ خالی کر دی اور اس پر [illegible] [illegible] [illegible] سیکرٹری بنا کر چلا گیا ——— مس ہولایا کو ایسے معلوم ہوا جیسے کسی [illegible] زندگی [illegible] [illegible] کر کے باہر نکال دیا ہو۔

وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو ضبط کر کے مسٹر ایلیٹ سن کے کیبن کی طرف بڑھی اور دستک کے جواب کا انتظار کیے بغیر داخل ہو گئی۔

مسٹر پیچارڈسن نے آج ہی میں استعفیٰ دینے کا فیصلہ کیا ہے؟"

"ایسے کیوں؟ مس وارڈلے!" مسٹر اینڈرسن چونک پڑے۔ "تم۔ تم یہ فرم چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہو؟"

"مسٹر پٹیل نے اپنے لیے ایک نئی سیکرٹری appoint کی ہے اور مجھے مسٹر مہتہ کے ساتھ کام کرنے کے لیے

آرڈر دیے گئے ہیں؟"

"مسٹر مہتہ کے ساتھ؟ پٹیل نے نئی سیکرٹری رکھ لی! کیا وہ فرم میں پہلے سے نہیں تھی؟"

"نہیں! وہ ابھی کے لیے۔" مسٹر اینڈرسن پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا ہو۔

"یہ فرم کی پالیسی کے بالکل خلاف ہے! یہ کیسے ہو سکتا ہے! کیا ہے یہ! ایسا بھی نہیں کرتا!" اور انھوں نے ٹیلیفون اٹھا کر مسٹر

پٹیل سے بات کرنے کے لیے کہا۔ "میرے ہوتے ہوئے ایسا کبھی نہیں ہو سکتا!"

"ہیلو! پٹیل! میں اینڈرسن بول رہا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ تم نے اپنے لیے فرم سے باہر کی کوئی سیکرٹری اپائنٹ کر لی ہے؟" اُدھر

کی آواز میں سکون کی جگہ خود اعتمادی تھی۔ وہی آواز جو سالہا سال فرم کی پالیسی کے بارے میں اپنے فیصلے دیتی آئی تھی۔

ٹیلیفون کے دوسرے سرے سے ایک نہایت مختصر سی آواز آئی۔

"لیکن کیوں؟" مسٹر اینڈرسن کی آواز میں جھنجھلاہٹ تھی۔ "یہ فرم کی بنیادی پالیسی کے خلاف ہے!"

دوسرے سرے سے ایک جملے نے موڈ بدل کر سنا دیا۔ اینڈرسن کے چہرے کی جھریاں ہر لمحہ نمایاں ہوتی جا رہی تھیں اور ان کی آواز

میں جیسے ایک تھکن سی چھا گئی ہو جیسے سالہا سال حکومت کرنے والا بادشاہ آج محتاج ہو گیا ہو۔

"ہاں ہاں ٹھیک ہی کہتے ہو۔ مجھے فرم کی پالیسی کے بارے میں اب کچھ بھی کہنے کا حق نہیں پہنچتا۔" اور انھوں نے دھیرے

سے کانپتے ہاتھوں سے مس وارڈلے سے نظریں ملائے بغیر ٹیلیفون کا چونگا واپس رکھ دیا۔ انھوں نے میز سے اخبار اٹھایا اور لڑکھڑاتے

ہوئے کیبن کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔

مس وارڈلے دیر تک ٹکٹکی باندھے مسٹر اینڈرسن کی خالی جھولتی ہوئی کرسی کی طرف دیکھتی رہی۔

"مگر یہ بتایئے کہ یہ مس واڈیا کو کس کا سیکرٹری بنا دیا گیا ہے؟"

"نہایت اچھا کیا ہے۔ مس واڈیا ہے۔ یہ آپ کو بہت مدد کر سکتی ہے!"

مس واڈیا اپنی تعریف سن کر شرمگیں اور مسکراتی ہوئی باتیں کرتی ہوئی چلی گئی۔

چونکہ مسٹر رشید سے کام کی زیادہ تر ذمہ داری مسٹر پٹیل کو سونپ دی گئی تھی مس واڈیا کو یہ توقع تھی کہ وہ جلد ہی مسٹر پٹیل کی سیکرٹری بنا دی جائے گی لیکن ایک ہفتہ گزر جانے پر بھی کوئی ایسے آرڈر نہیں آئے۔ وہ چند دن تک مسٹر رشید سے کوئی کام ہونے کا انتظار کرتی رہی لیکن آہستہ آہستہ اس کی مصروفیات ختم ہو گئیں۔ وہ مس بیرشٹے سے باتیں کرنے کی کوشش کرتی لیکن اس کے پاس فرصت کہاں تھی۔ سب وہ کچھ اس کا اتنا پیار دیکھ کر اب اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے جاسوسی ناول پڑھنے میں مشغول رہتی۔ نہ جانے کیوں اسے احساس ہونے لگا تھا کہ وہ مسٹر رشید کے ساتھ ساتھ بیکار ہو گئی ہو۔

ایک طرف اس دوران میں باقاعدہ دفتر آتے رہے مگر دو گھنٹے کے بعد وہ چپکے سے اپنے کیبن سے نکل کر چلے جاتے گویا دفتر ان کے لیے پہلے سے میں بند رہنے کے بعد فضا میں تازہ ہوا لینے کے لیے آتے ہوں۔ دفتر کے سبھی لوگ ان کا احترام کرتے لیکن وہ مرتبہ ان کے پاس پہلے کے دوسرے پر رہا۔ بعد کچھ دنوں سے یہ محسوس ہونے لگا تھا جیسے نئے ڈائریکٹر پٹیل کے دل میں ان کا احترام جاتا رہا ہو۔

ایک دن جب مس واڈیا دفتر آئی تو ایک خط ملا جس میں اس کے لیے نئے احکام رکھے تھے۔ وہ اب مسٹر مہتہ کی سیکرٹری بنا دی گئی تھی۔ مسٹر مہتہ فرم کے سینئر منیجر تھے اور فرم کے اعلیٰ افسروں میں سمجھے جاتے تھے لیکن ایک ڈائریکٹر کی سیکرٹری رہنے کے بعد وہ اس زوال کے لیے بالکل تیار نہ تھی۔ اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ اسے اپنی پچھلی ملازمت سار مردوں سے یاد آئی اور مسٹر رشید کے جملے یاد آنے لگے۔ ابھی وہ سنبھل بھی نہ پائی تھی کہ ایک نہایت خوبصورت نوجوان سندھی لڑکی چست کپڑوں میں ملبوس اس کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ دفتر کی پیشنٹ گرل تھی۔

"مس واڈیا، یہ ہیں مس سانی۔ مسٹر پٹیل کی نئی سیکرٹری۔ آپ چونکہ مسٹر مہتہ کے کیبن میں جا رہی ہیں مسٹر پٹیل نے اس سیٹ پر بیٹھنے کے لیے کہا ہے۔"

مس واڈیا کو جیسے ایک چکر سا آ گیا۔ وہ نہایت مشکل سے سنبھلی۔ اس نے اپنی سیٹ خالی کر دی اور اس پر ایک نہایت دلربا سے مس سانی بیٹھ کر کے جلا گئی —— مس واڈیا کو ایسے معلوم ہوا جیسے کسی نے اسے اٹھا کر گھر سے باہر نکال دیا ہو۔

وہ بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کر کے مسٹر رشید کے کیبن کی طرف بڑھی اور دستک کے جواب کا انتظار کیے بغیر

مسز پائپ آپ کو بہت ستاتی ہیں۔ میں نے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"اسے کیوں مس وارڈ!" مسٹر ایڈرسن چونک پڑے۔ "تم۔ تم یہ فرم چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہو؟"

"مسٹر پیل نے اپنے لیے ایک نئی سیکرٹری appoint کر لی ہے اور مجھے مسٹر ہسٹ کے ساتھ کام کرنے کے لیے کہا ہے۔ میں کیسے رہ سکتی ہوں؟"

"مسٹر ہسٹ کے ساتھ جب پہلے نئی سیکرٹری کام کر رہی تھی! کیا وہ فرم میں پہلے سے نہیں تھی؟"

"نہیں۔۔۔ وہ ایک لڑکی ہے" مسٹر ایڈرسن پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا ہو۔

"یہ فرم کی پالیسی کے بالکل خلاف ہے! یہ کیسے ہو سکتا ہے!! کیا یہ اتنا بھی نہیں سمجھتا؟" اور انھوں نے ٹیلیفون اٹھا کر مسٹر پیل سے ملانے کے لیے کہا۔ "میرے ہوتے ہوئے یہ کبھی نہیں ہو سکتا!"

"جے۔ بی میں ایڈرسن بول رہا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ تم نے اپنے لیے فرم سے باہر کی کوئی سیکرٹری اپوائنٹ کر لی ہے؟" ان کی آواز میں معمول کی طرح خود اعتمادی تھی۔ وہی آواز جو سالہا سال فرم کی پالیسی کے بارے میں اپنے فیصلے دیتی آئی تھی۔

ٹیلیفون کے دوسرے سرے سے ایک نہایت مختصر سی آواز آئی۔

"لیکن کیوں؟" مسٹر ایڈرسن کی آواز میں غصہ بھی تھا۔ "یہ فرم کی بنیادی پالیسی کے خلاف ہے!"

دوسرے سرے سے ایک ہلکا سا قہقہہ سنائی دیا۔ ایڈرسن کے چہرے کی جھریاں ہر لمحہ نمایاں ہوتی جا رہی تھیں اور ان کی آواز میں جیسے ایک تھکن سی چھا گئی ہو جیسے سالوں سال حکومت کرنے والا بادشاہ آج محتاج ہو گیا ہو۔

"ہاں ہاں تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ مجھے فرم کی پالیسی کے بارے میں اب کچھ بھی کہنے کا حق نہیں پہنچتا۔" اور انھوں نے دوسرے ہاتھ سے مس وارڈ کی طرف دیکھے بغیر ٹیلیفون کا چونگا واپس رکھ دیا۔ انھوں نے میز سے اخبار اٹھایا اور لڑکھڑاتے ہوئے کیبن کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔

مس وارڈ بڑی دیر تک بیٹھی مسٹر ایڈرسن کی خالی گھومتی ہوئی کرسی کی طرف دیکھتی رہی۔

قرآن حکیم کا سب سے پہلا اردو ترجمہ

حکیم محمد [illegible] پانی پتی

حضرت شاہ عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فرزند [illegible] تھے، نہایت عالم و فاضل اور عابد و زاہد بزرگ تھے۔ آپ ہی کے قلم سے وہ چیز ظہور پذیر ہوئی جس کو "موضح القرآن" کے نام سے جانتے ہیں یعنی آپ کا وہ [illegible] اور مختصر تفسیر جو آپ نے [illegible] میں ختم کی۔ یہ سب سے پہلے قرآن کریم کا ترجمہ اس وقت کی مروجہ اردو میں کیا۔ یہ ترجمہ (جس کا نام خود حضرت مترجم نے موضح القرآن [illegible] رکھا) [illegible] شائع ہوا [illegible] اس ترجمہ کو [illegible] کے ساتھ [illegible] تھا [illegible] اس کی شہرت اور عظمت [illegible] ہے۔

اس تاریخی ترجمہ کے مترجم حضرت شاہ عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ [illegible] مطابق [illegible] میں بمقام دہلی پیدا ہوئے اور ساری عمر ذکر الٰہی اور خدمت خلق کرتے رہے اور قرآن و حدیث کا درس دیتے رہے۔ [illegible] مطابق [illegible] میں وفات پائی۔ دہلی میں دہلی دروازہ کے باہر [illegible] ان کا مزار زیارت گاہ خاص و عام ہے (تذکرہ [illegible] کی [illegible] وفات [illegible] لکھا ہے [illegible])

اس نادر و نایاب ترجمہ کا ایک قلمی نسخہ حضرت حکیم [illegible] صاحب [illegible] کے کتب خانہ میں تھا۔ [illegible] میں ان کا انتقال ہوگیا۔ جس کے بعد ان کی تمام عربی و فارسی کتب اور ہزاروں قلمی نوادرات کا بے مثل ذخیرہ ان کے ورثا نے [illegible] کے حوالے کر دیا۔ اس بیش بہا کتابوں سے [illegible] لائبریری [illegible] میں [illegible] زیادہ عربی و فارسی کی قلمی اور مطبوعہ کتابیں ہیں۔ میں جب [illegible] میں اس [illegible] کتب خانہ [illegible] لائبریری [illegible] تو میں نے وہاں [illegible] دیگر نایاب مخطوطات کے حضرت شاہ صاحب کا یہ ترجمہ بھی دیکھا۔ میں نے اسی وقت اس کے دیباچہ کی نقل [illegible] تھی اور [illegible] کا ترجمہ بھی [illegible] ساتھ [illegible] تھا جسے [illegible]

سے بعد میں دوستی محمد طفیل صاحب مدیر نقوش کی فرمائش پر قارئین کرام کی خدمت میں بطور تبرک
پیش کر رہا ہوں۔

یہ دیباچہ آج سے پونے دو صدی پہلے کی اردو کا بہترین نمونہ ہے۔ اس وقت جو رسم الخط رائج تھا اس کے مطابق یہ ترجمہ لکھا گیا ہے۔ اور میں نے بہت ہی احتیاط کے ساتھ حرف بحرف اور لفظ بلفظ بالکل مطابق اصل نقل کیا ہے۔ جس سے آپ کو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ ۔۔ سال پیشتر کس قسم کی اردو بولی جاتی تھی اور وہ کس طریقے سے لکھی جاتی تھی۔ تاریخ ادب اردو کے مورخین کے لیے یہ دیباچہ بہت دلچسپ اور دلکش چیز ہے۔ جو قدیم اردو کی عبارت اور طرز تحریر کو ہمارے سامنے پیش کر رہا ہے ——— جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے یہ دیباچہ پہلے ایڈیشنوں میں چھپا ہو تو چھپا ہو بعد کے ایڈیشنوں میں میری نظر سے تو نہیں گزرا۔
وہ یہ ہے۔

رام گلی نمبر ۳، لاہور
خاکسار، محمد اسماعیل پانی پتی

دیباچہ موضح القرآن

حمد شکر تیری اے صاحب ہمارے اور کون کس زبان سے کرے ہماری زبان کو یہ کہاں کہ تیرا نام لے اور دلوں کو روشنی دی اپنی کلام کر اور رحمت بھیجیو اپنے رسول مقبول محمد اشرف دنیا اور عقبیٰ پر جن کی شفاعت سے امید وار ہیں ہم کہ پاویں دو جہان کی نعمت اور اس کی منت اٹھا کر اپنی امت کو اس سے ہدایت اور نصیب کر جو حد نہ کسی طرح کی اور اپنی عنایت اس پر ہمیشہ افزوں رکھ دنیا و آخرت میں اور اس کی آل اولاد پر اور اصحاب کبار پر اور ان کی سنت کی چال پر چلنے والوں پر اور دنیا کے ۔۔۔ اور عزیز اور ۔۔۔ پر سب پر آمین یا رب العالمین۔ بعد اس کے ۔۔۔ مسلمان کرے یہ کہ اپنے رب کو پہچانے اور اس کی صفات جانے اور اس کے حکم معلوم کرے اور مرضی و نامرضی تحقیق کرے کہ بغیر اس کے بندے نہیں اور جو بندگی بجا نہ لاوے وہ بندہ نہیں اور اللہ سبحانہ کی پہچان آدمی اپنی عقل سے ۔۔۔ آدمی پیدا ہوتا ہے ناقص اور اس سب چیز سیکھتا ہے سکھانے سے اور سکھانے والے ہر چند تقریر کریں اس برابر نہیں جو اللہ نے آپ بتایا اور اس کی کلام میں جو ہدایت ہے وہ سے کچھ نہیں پر کلام پاک اس کا عربی زبان ہے اور ہندوستانی کو اس کا دریافت محال اس واسطے اس بندہ عاجز عبدالقادر کو خیال آیا کہ جس طرح ہمارے والد بزرگوار حضرت شیخ ولی اللہ بن عبدالرحیم محدث دہلوی ترجمہ فارسی کر گئے ہیں سہل و آسان اب ہندی زبان میں قرآن شریف کو ترجمہ کیجئے الحمد للہ کہ سنہ بارہ سو پانچ میں میسر ہوا۔ اب کئی باتیں معلوم رکھنی اول یہ کہ اس جگہ ترجمہ لفظ بلفظ ضرور نہیں کیونکہ ترکیب ہندی ترکیب عربی سے بہت بعید ہے اگر بعینہ وہ ترکیب رہے تو معنی مفہوم نہ ہوں دوسرے یہ کہ اس میں زبان ریختہ نہیں بولی بلکہ ہندی متعارف تا عوام کو بے تکلیف دریافت ہو تیسرے یہ کہ ہر چند ہندوستانی کو معنی قرآن اس سے آسان ہوئے لیکن ۔۔۔ استاد سے سند کرنا لازم ہے اول معنی قرآن بغیر سند معتبر نہیں دوسرے ربط کلام کا ماقبل و مابعد سے پہچاننا اور قطع کلام سے بچنا بغیر استاد نہیں آتا چنانچہ قرآن

[illegible]

سورة الفاتحة مكية ... وهي سبع آيات

سورة فاتحہ ... مکی ... سات آیات ہیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بنام خدای بخشاینده مهربان ... شروع ... اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا۔

الحمد للہ رب العالمین [illegible] الرحمن الرحیم [illegible] مالک یوم الدین [illegible] ایاک نعبد و ایاک نستعین [illegible] اھدنا الصراط المستقیم [illegible] صراط الذین انعمت علیہم [illegible] غیر المغضوب علیہم ولا الضالین [illegible]

[illegible]

بصیر عالم

مغربی مصنف جس علاقے کو "مشرق قریب" کہتے ہیں وہ ایک پاکستانی مصنف کے لیے "مغرب قریب" ہے۔ اسی طرح "مشرق وسطیٰ" پاکستانیوں کے لیے "مغرب وسطیٰ" ہونا چاہیے۔ دراصل ایسی تمام اصطلاحات جن سے سمت ظاہر کی جاتی ہے اضافی ہوتی ہیں۔ تمام سمتوں کا مرکز اس شخص کا محل وقوع ہوتا ہے جو سمت متعین کر رہا ہے۔ اگر یہ مرکز بدل جائے تو سمتوں کی تبدیلی بھی لازمی ہے۔ مغربی مصنفین نے جس علاقے کو "مشرق قریب" یا "مشرق وسطیٰ" کہا ہے وہ ان کے محل وقوع کے اعتبار سے درست ہے لیکن اہل مشرق کے لیے درست نہیں ہے۔ بایں ہمہ اہل مشرق اپنی تحریروں میں متذکرہ علاقہ کو وہی نام دیتے ہیں جو مغربی مصنفین نے دیا ہے۔ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ اہل مغرب کی تقلید مشرق کی عادت ثانیہ ہو گئی ہے۔ گو مغرب کا سیاسی غلبہ ختم ہو گیا ہے لیکن اقتصادی اور کہیں کہیں تمدنی غلبہ ہنوز باقی ہے۔ خصوصاً جدید علوم اہل مشرق نے مغرب سے سیکھے ہیں اس لیے مغرب کی علمی اصطلاحیں خواہ وہ صحیح ہوں یا غلط رواج پا گئی ہیں۔ مشرقی تقاضوں اور ضرورتوں کے مطابق مغرب کی رائج کردہ علمی اصطلاحات کی ترمیم و تنسیخ کے لیے ایک عرصہ درکار ہوگا۔ تاہم اس ضمن میں اگر اب بھی ابتداء نہ کی گئی تو یہ عرصہ اور بھی طویل ہو جائے گا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد تک مذکورہ بالا علاقہ کا مقبول ترین نام "مشرق وسطیٰ" تھا۔ آج کل اکثر مغربی مصنفین "مشرق قریب" کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ یا مشرق بعید کی علاقائی حدود کیا ہیں اور ان میں کون سے ممالک شامل ہیں؟ یہ ابتدائی باتیں سب سے مشتبہ ہو سکتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر مصنف اس علاقے کی حدود اپنی مرضی سے متعین کرتا ہے۔ جس علاقے کو روایتی طور پر مشرق وسطیٰ کہا جاتا ہے وہ ایشیا، افریقہ اور یورپ کے سنگم کا ایک چھوٹا علاقہ ہے اور اس میں زرخیز ہلال Fertile Crescent کے ممالک یعنی عراق، شام، لبنان، فلسطین اور اردن، جزیرہ نمائے عرب شامل ہیں۔ لیکن بعد میں مشرق وسطیٰ کی حدود وسیع سے وسیع تر ہوتی گئیں۔ بعض مصنفین نے تمام عرب ممالک کو مشرق وسطیٰ میں شامل کر دیا اور بعض نے ترکی، ایران، افغانستان حتیٰ کہ روس کی مسلم ریاستوں اور پاکستان کو بھی شامل کر لیا ہے۔ علاقے کی اس بڑھتی ہوئی وسعت کے پیش نظر بعض مصنفین نے "مشرق قریب" کی اصطلاح کو رواج دیا لیکن مشرق وسطیٰ کی طرح مشرق قریب کی حدود بھی غیر متعین ہیں۔ علاقائی حدود کا اس طرح [illegible] کی [illegible] کے منافی ہے۔ دراصل [illegible] علاقہ [illegible] ہے۔ آج کل جس علاقے کو مشرق وسطیٰ یا مشرق قریب کہا جاتا ہے وہ ایک تمدنی علاقہ ہے [illegible]

کا جزو ہے۔ دنیائے عرب کا مصری حصہ براعظم افریقہ میں ہے اور باقی ایشیا میں۔ ایشیا میں شام اور فلسطین کے ساحل سے لے کر جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی ساحل تک اور افریقہ میں افریقہ کے شمالی ساحل سے لے کر سوڈان تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس لیے دنیائے عرب میں حسب ذیل ملک شامل ہیں:

مراکش، الجیریا، تیونس، لیبیا، مصر، سوڈان، فلسطین، شام، لبنان، عراق، کویت، بحرین، قطر، سعودی عرب، یمن، مسقط و عمان، عدن، وصلح شاہی کی چھوٹی ریاستیں۔

طبعی حالات اور آبادی

دنیائے عرب کا رقبہ ۰۰۰،۹۵،۱۰، مربع کلومیٹر ہے۔ مگر اس علاقہ کے بیشتر حصے سمندر سے پانچ سو میل دور ہیں لیکن اکثر ساحلوں پر چند پہاڑ ہیں جن کی وجہ سے ساحلی علاقوں میں زیادہ بارش ہوتی ہے اور اندرونی حصوں میں بہت کم۔ اکثر اندرونی علاقے ریگستانی ہیں لیکن دو خطے ایسے ہیں جو دریاؤں کے پانی کے باعث نہایت شاداب اور زرخیز ہیں۔ یہ ہیں مصر میں نیل اور عراق میں دجلہ و فرات کی وادی۔ ساحلی علاقوں اور دریاؤں کی وادیوں کو چھوڑ کر بقیہ علاقے میں بڑے بڑے ریگستان ہیں یا نیم ریگستانی خطے ہیں۔ جن میں بارش کے نمایاں تفاوت کے باعث ایک ہی خطے میں آب و ہوا کا شدید فرق اور بعض جگہ تضاد پایا جاتا ہے۔

اس وقت دنیائے عرب کے کل رقبہ کا صرف پانچ فیصد زیر کاشت ہے۔ خصوصاً سوڈان، مصر اور عراق میں زیر کاشت رقبہ کی وسعت کے امکانات ہیں جن میں آب پاشی بہتر ہو کر زیر کاشت علاقوں میں اضافہ کر سکتی ہے۔ عظیم اسوان بند کی تکمیل کے بعد مصر کے زیر کاشت علاقہ میں ۲/۱ کا اضافہ ہوگا۔

سوائے تیل کے معدنیات کمیاب ہیں۔ فاسفیٹ، کرومیم، تانبا اور مینگنیز شمالی افریقہ میں پائے جاتے ہیں۔ پوٹاش بحر مردار کے قرب و جوار میں ملتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی چیز اس مقدار میں نہیں ہوتی کہ اس کی بنیاد پر بھاری صنعتیں قائم ہو سکیں۔ اگر قدرت نے کوئی چیز دی ہے تو وہ ہے پٹرول۔ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ دنیائے عرب میں ساری دنیا کے ۶۰ فیصد سے زیادہ تیل کے ذخیرے ہیں۔ یہ تیل زیادہ تر خلیج فارس کے آس پاس تقریباً ۶۰۰ میل کے نصف قطر میں پھیلا ہوا ہے۔ شمالی صحرائے اعظم میں تیل کے ذخیرے موجود ہیں لیکن ابھی ان کے متعلق پوری معلومات حاصل نہیں ہوئی ہیں۔ دنیائے عرب کے جن ذخیروں سے اس وقت تیل نکالا جا رہا ہے وہ زیادہ سے زیادہ استعمال اور استحصال کے باوجود سو سال تک چل سکتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں اسی رفتار سے تیل نکالا جائے تو ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ذخیرے صرف بارہ سال میں ختم ہو جائیں گے۔ اس لیے دنیائے عرب کے پٹرولیم میں یورپ اور امریکہ کے صنعتی ممالک کی دلچسپی بہ آسانی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ اس دلچسپی کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ دنیائے عرب میں پٹرولیم نکالنے اور صاف کرنے پر لاگت اس قدر کم آتی ہے کہ یہاں کام کرنے والی کمپنیاں امریکہ اور یورپ میں تیل نکالنے والی کمپنیوں سے کھلے بازار میں مقابلہ کر سکتی ہیں۔ جب سے مقامی حکومتوں اور بدیسی کمپنیوں کے درمیان نصف نصف منافع کے معاہدے ہوئے ہیں سعودی عرب اور دیگر تیل

پیدا کرنے والی ریاستوں کا تقریباً سارا مالیہ تیل کی آمدنی سے حاصل ہوتا ہے۔ گزشتہ سالوں میں اس علاقہ کی حکومتوں کو تیل سے [illegible] ارب ڈالر سالانہ آمدنی ہوئی ہے۔ تیل کی بڑھتی ہوئی قیمت کے پیش نظر آئندہ دس سال میں یہ آمدنی ڈیڑھ سو ارب ڈالر تک بڑھ سکتی ہے۔ لیکن پٹرول اور اس سے حاصل شدہ ڈالر کھانے کی اشیا اور پانی کا نعم البدل نہیں ہو سکتے۔ تیل سے حاصل ہونے والی دولت اور زراعتی افلاس کے درمیان جو تضاد ہے اس کی واضح مثال کویت میں نظر آتی ہے۔ کویت کا رقبہ صرف ۶،۰۰۰ مربع میل ہے۔ اس چھوٹی سی ریاست میں ایک شیخ کی حکومت ہے۔ تیل سے شیخ کو تین کروڑ سے لے کر چالیس کروڑ ڈالر سالانہ آمدنی ہوتی ہے۔ کویت کی آبادی صرف دو لاکھ ہے۔ گو کویت کا شیخ اپنی دولت کو منصفانہ تقسیم دیتا ہے اور عوام کی آسائش کا ہر طرح سے خیال رکھتا ہے پھر بھی انگلینڈ کے بینک میں اس کی جمع شدہ دولت سب سے زیادہ ہے۔ لیکن کویت کے پاس پینے کے لیے پانی تک نہیں ہے۔ سمندر کے پانی کو منتقل کر کے پینے کے قابل بنایا جاتا ہے اور اس مقصد کے لیے تین کارخانے بنائے گئے ہیں۔ تیل پیدا کرنے والے ملکوں میں صرف عراق ایسا ہے جس کی آبادی کافی ہے، پانی بھی میسر ہے اور زمین بھی زرخیز ہے۔ اس لیے صرف یہی ایک ایسا ملک ہے جو تیل سے حاصل شدہ آمدنی کو دیگر شعبوں میں ترقی کے لیے خرچ کر سکتا ہے۔ دیگر دوسرے ملک مصر، شام، لبنان اور سوڈان میں بدقسمتی سے ان کے پاس تیل کے ذخیرے نہیں ہیں۔ ان میں سے چند ملکوں کو ان کے علاقے سے گزرنے والی پائپ لائنوں سے ضرور کچھ آمدنی ہو جاتی ہے۔

دنیائے عرب کی کل آبادی ۸ کروڑ پچاس لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ ان میں سے تقریباً ۷ کروڑ لوگ عربی بولتے ہیں۔ ہر ملک کی آبادی، لسانی اور نسلی تقسیم مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ مراکو: کل آبادی: ۱۰۰ لاکھ ۰۰ ہزار

لسانی تقسیم: بربر ۱۰ فیصد، عربی ۳۰ فیصد، فرنچ ۵ فیصد، دیگر ۲ فیصد

مذہبی تقسیم: مسلمان ۹۳ فیصد، عیسائی ۵ فیصد، دیگر ۱ فیصد

۲۔ الجیریا: کل آبادی: ۱۰۰ لاکھ ۵۰ ہزار

لسانی تقسیم: عربی ۷۵ فیصد، بربر ۲۰ فیصد، فرنچ ۴ فیصد (۱۹۶۱ء میں)

مذہبی تقسیم: مسلمان ۹۵ فیصد، عیسائی ۵ فیصد (۱۹۶۱ء میں)

۳۔ تیونس: کل آبادی: ۴۰ لاکھ ۰۰ ہزار

لسانی تقسیم: عربی اور بربر ۹۲ فیصد، فرنچ ۵ فیصد

مذہبی تقسیم: مسلمان ۹۱ فیصد، عیسائی ۵ فیصد، دیگر ۲ فیصد

۴۔ لیبیا: کل آبادی: ۱۱ لاکھ ۵۰ ہزار

لسانی تقسیم: عربی ۹۴ فیصد، [illegible] ۶ فیصد

مذہبی تقسیم: مسلمان ۹۳ فیصد، عیسائی ۷ فیصد

۵. سوڈان: کل آبادی: ایک کروڑ ۲۰ لاکھ

لسانی تقسیم: عربی ۶۰ فیصد، کالا حبشی قبائل کی زبانیں ۴۰ فیصد

مذہبی تقسیم: مسلمان ۷۰ فیصد، وحشی مذاہب ۳۰ فیصد

۶. متحدہ عرب جمہوریہ:

مصر: کل آبادی: ۲ کروڑ ۶۰ لاکھ ۹۰ ہزار۔

لسانی تقسیم: صد فی صد عربی۔

مذہبی تقسیم: مسلمان ۹۱ فیصد۔ عیسائی ۹ فیصد

شام: کل آبادی: ۴۴ لاکھ ۰۰ ہزار

لسانی تقسیم: صد فی صد عربی

مذہبی تقسیم: ۸۸ فیصد مسلمان، ۱۲ فیصد عیسائی

۷. اسرائیل: کل آبادی: ۲۰ لاکھ ۰۰ ہزار

لسانی تقسیم: عبرانی ۹۰ فیصد، عربی ۷ فیصد، دیگر ۳ فیصد

مذہبی تقسیم: یہودی ۹۰ فیصد، مسلمان ۸ فیصد، عیسائی ۲ فیصد

۸. غزہ: کل آبادی: ۳ لاکھ

لسانی تقسیم: صد فی صد عربی

مذہبی تقسیم: صد فی صد مسلمان

۹. لبنان: کل آبادی: ۱۵ لاکھ ۳۰ ہزار

لسانی تقسیم: صد فی صد عربی

مذہبی تقسیم: مسلمان ۴۷ فیصد، نصرانی عیسائی ۵۰ فیصد، دیگر ۳ فیصد

۱۰. اردن: کل آبادی: ۱۵ لاکھ ۳۰ ہزار

لسانی تقسیم: صد فی صد عربی

مذہبی تقسیم: مسلمان ۹۴ فیصد، عیسائی ۶ فیصد

۱۱. عراق: کل آبادی: ۶۵ لاکھ ۴۰ ہزار

لسانی تقسیم: عربی ۸۰ فیصد، کردی ۱۵ فیصد، دیگر ۵ فیصد

مذہبی تقسیم: صد فی صد مسلمان

۱۲۔ سعودی عرب : کل آبادی : ۷۰ لاکھ
لسانی تقسیم : ۱۰۰ فی صد عربی
مذہبی تقسیم : ۱۰۰ فی صد مسلمان

۱۳۔ یمن : کل آبادی : ۴۸ لاکھ ۵۰ ہزار
لسانی تقسیم : ۱۰۰ فی صد عربی
مذہبی تقسیم : ۱۰۰ فی صد مسلمان

۱۴۔ برطانیہ کے تحت ریاستیں : کل آبادی : ۱۰ لاکھ ۳۰ ہزار
لسانی تقسیم : ۱۰۰ فی صد عربی
مذہبی تقسیم : ۱۰۰ فی صد مسلمان

روایتی تمدن | دنیائے عرب کے جدید تمدن کا خاص منبع اسلام ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں اس علاقے کے کچھ لوگ مہذب کچھ نیم مہذب اور بعض بالکل وحشی تھے۔ اسلام نے نہ صرف ایک مشترک مذہب کے رشتہ میں لوگوں کو منسلک کر دیا بلکہ انھیں ایک سیاسی اور لسانی وحدت بھی بنا دیا۔ عربی معاشرہ خانہ بدوش قبائل، گاؤں اور شہروں میں تقسیم ہے۔ ان تینوں میں تقسیم کار یہ ہے کہ گاؤں کے باشندے اناج پیدا کرتے ہیں، خانہ بدوش قبائل مویشی پالتے ہیں اور شہری لوگ صنعت و حرفت اور تجارت کرتے ہیں۔ ان تینوں طبقوں کے درمیان تعلق اقتصادی تقاضوں اور ضرورت سے آگے نہیں بڑھا تھا لیکن اسلام نے ان کو ایک ثقافتی اور سیاسی وحدت بنا دیا۔ گو اسلام نے مختلف نسلوں اور ثقافتوں کے لوگوں کو ایک رشتہ میں منسلک کر دیا لیکن یہودیوں اور عیسائیوں کے علیحدہ وجود کو بھی برقرار رہنے دیا۔ ان کے سماجی اور مذہبی معاملات میں کوئی دخل اندازی نہیں کی اور معاشرت و ازدواج سے متعلق ان کے قوانین ہوں کے توں رہنے دیے۔ دوسرے اسلام نے دیگر مذاہب کے برعکس مسلم معاشرہ کو مذہبی طبقوں میں تقسیم نہیں کیا۔ گو آلِ رسول اور علما کی عزت کی جاتی ہے لیکن انھیں طبقاتی طور پر کوئی مراعات حاصل نہیں رہیں۔ حضرت عمرؓ کے زمانے تک مفتوحہ ملکوں کی اراضیات ریاست کی ملکیت تھیں اور مزارع براہِ راست ریاست کو مالیہ ادا کرتے تھے۔ لیکن امیر معاویہ نے حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں صرف خاص کے لیے شام کی زرخیز اراضیات حاصل کرلیں اور اس طرح مسلمانوں کے معاشرہ میں جاگیردارانہ نظام کی اقتصادی بنیاد پڑی جو بعد میں ملوکیت کا باعث ثابت ہوئی۔ ملوکیت کے اس دور میں حکومت کا اقتدار اعلیٰ عسکریت اور خاندانی برتری پر منحصر تھا۔ حکومت کا تسلط زیادہ تر شہروں میں، اس سے کم گاؤں میں اور سب سے کم قبائلی علاقوں میں محسوس ہوتا تھا۔ شہروں پر فوجی صوبہ دار یا موروثی جاگیردار حکومت کرتے تھے۔ مذہبی معاملات میں مرکز کی طرف سے بہت کم دخل اندازی ہوتی تھی۔ خانہ بدوش قبیلے عموماً حکومت کے اثر اور اقتدار سے آزاد رہتے تھے۔ شہروں کی حیثیت اہلِ حرفہ، صنعت کاروں اور تاجروں کی آزاد جماعتوں سے

دی جاتی تھی۔ جبکہ [illegible] معاشی اور سیاسی مفادات کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اسلام کا [illegible] مذہب تھا۔ اسلامی اصول اور اسلام دور اول کی حکومت تو [illegible] پر مبنی تھے۔ دنیا کے عظیم مذہبی پیشواؤں میں پیغمبر اسلام ہی ایک ایسی ہستی تھے جو نہ صرف مذہبی پیشوا بلکہ ایک کامیاب سیاسی رہنما بھی تھے۔ اسی لیے دو مختلف دور میں بلکہ بعد میں بھی سیاست کو مذہب سے جدا نہیں ہونے دیا۔ پیغمبر اسلام کے بعد خلفاء حکمران بھی تھے اور مذہبی پیشوا بھی۔

سیاست اور دین کے باہمی ربط سے جو اثرات مرتب ہوئے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱. علماء اور مذہبی رہنما پارٹی علیحدہ گروہ نہیں بنا سکے اور سیاسی حکمرانوں کے تابع رہے۔ عیسائی مذہب یا ہندومت کی طرح اسلام میں پادریوں یا برہمنوں کا کوئی علیحدہ ادارہ ترقی نہیں کر سکا۔ مذہبی رہنماؤں کو خدا اور انسان کے درمیان ایک واسطے کی حیثیت بھی حاصل نہ ہو سکی۔ قاضی، مفتی اور قاضی حکومت سے علیحدہ نہیں بلکہ حکومت کا ایک حصہ سمجھے جاتے تھے۔

۲. چونکہ دین اور سیاست ایک دوسرے سے جدا نہیں تھے اس لیے اکثر ایسا ہوا کہ سیاسی اختلافات نے مذہبی فرقوں کی شکل اختیار کر لی۔

۳. اسلام کے سیاسی نظریات میں حکمرانوں کی ذاتی صفات اور خصوصیات پر زور دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سیاسی حکمران مذہبی پیشوا بھی ہوتا تھا۔

۴. بین الاقوامی تعلقات میں اخلاقی اقدار کے احترام پر زور دیا گیا۔

۵. جنگ یا جہاد کی صورت میں بھی اخلاقی اقدار اور مذہبی احکام کی پابندی لازمی قرار دی گئی

خلفائے راشدین کے دور میں مندرجہ بالا اصولوں پر سختی سے عمل کیا گیا۔ لیکن جاگیردارانہ نظام اور ملوکیت کے دور میں سیاسی اصول آہستہ آہستہ نظر انداز کیے جانے لگے۔ گو سیاست سے متعلق مذہبی احکام اور اصولوں کی تردید کھلے بندوں نہیں کی گئی۔ اسلامی اقدار لوگوں کے دلوں سے اٹھ گئیں لیکن حکمرانوں اور اہل سیاست نے عملاً ان تمام برائیوں اور مکاریوں کو روا رکھا جو جاگیرداری نظام اور ملوکیت کا لازمی نتیجہ تھیں۔ تاہم اسلامی دنیا میں ملوکیت کا دور عیسائی دنیا کی طرح تاریک نہ تھا۔ اسلام میں [illegible] اور فراخدلی پائی جاتی ہے اس کے باعث ملوکیت کے دور میں بھی علوم و فنون کی ترقی ہوئی۔ اس دور میں عربوں نے دوسروں سے سیکھا بھی اور دوسروں کو سکھایا بھی۔ ابتدائی دور میں عرب حکمرانوں نے ایرانی، شامی، عیسائی اور یہودی سائنس دانوں، حکیموں اور انجینئروں کو ملازم رکھا اور ان سے علم و فن کی قدر افزائی کی۔ عباسیوں کے دور میں علوم و فنون کو بے حد ترقی ہوئی۔ یونانی حکماء اور فلاسفہ کی کتابیں عربی میں ترجمہ کی گئیں۔ خلیفہ مامون الرشید نے (۸۱۳۔۸۳۳ء) سائنس اور حکمت کی کتابوں کے ترجمے کرائے اور سب سے پہلے یونیورسٹی کی طرز کا تعلیمی ادارہ قائم کیا۔ اہل علم و فن کی سرپرستی خلفاء اور حاکموں کے فرائض میں شمار ہونے لگی۔ ایران سے لے کر سپین تک ہر سلطان کے دربار میں ممتاز اہل علم و فن کی قدر افزائی ہوتی تھی۔ مسلمانوں نے یونان، ایران اور ہندوستان کی علمی و فنی روایات

و تجربات کو یکجا کر دیا اور ان روایات کی بنیاد پر جدید علوم و فنون کی عمارت تعمیر کی۔ مسلمانوں کی یہ خدمت دُنیا کی موجودہ اقوام نہیں نہ جھٹلا سکتی ہیں اور نہ فراموش کر سکتی ہیں۔

تاریخی پس منظر

گو دُنیائے عرب قدیم ترین تہذیبوں کا گہوارہ ہے تاہم یہ امر تعجب خیز ہے کہ بظاہر جدید تہذیب و تمدن میں قدیم تہذیبوں کے نشانات نہیں پائے جاتے۔ مگر آثارِ قدیمہ دریافت نہ ہوتے تو تاریخ کی دُنیا کو یہ علم نہ ہوتا کہ اس سرزمین میں بابلی، آسیری اور مصری تہذیبوں نے جنم بھی لیا تھا یا نہیں۔ یہ اسلام کی برکات تھیں یا معجزہ کہ جس نے اس دُنیا کے قدیم تہذیب و تمدن کو ایک بھولی بسری داستان بنا دیا اور یہاں کے لوگوں کو جدید تہذیب، ترقی یافتہ تمدن اور نئی زبان بخشی۔ اکثر تو یہ احساس ہوتا ہے کہ دُنیائے عرب کے تمدن کی تاریخ ہی اسلام اور عربی زبان سے شروع ہوتی ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ مگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو اسلام بھی دُنیائے عرب کی قدیم تہذیب و تمدن کے تاریخی سلسلہ کی ہی ایک اہم اور مستقل کڑی ہے۔ خود پیغمبرِ اسلامؐ نے یہ فرمایا ہے کہ قرآن گزشتہ آسمانی صحیفوں میں انسانی تحریفات کی تصحیح کرتا ہے اور اسلام خدا کا دیا ہوا وہی پرانا مذہب ہے جس کی شکل کفار اور منافقوں کے ہاتھوں مسخ ہو گئی تھی۔

دُنیائے عرب میں اگر ایک طرف بحر اور ویران ریگستان ہیں تو دوسری طرف دریاؤں کی زرخیز وادیاں ہیں۔ ابتدا میں خانہ بدوش قبائل اپنے مویشی کے لیے چارہ کی تلاش میں دریائی وادیوں تک پہنچے ہوں گے اور پھر یہاں مستقل آباد ہو گئے ہوں گے۔ اس طرح انھوں نے خانہ بدوشی چھوڑ کر زراعتی زندگی اختیار کی ہو گی۔ اس علاقہ کے جغرافیائی حالات ہی ایسے ہیں کہ جس سے معاشی تضاد پیدا ہوا ہو گا اور اس تضاد کی وجہ سے خانہ بدوش قبائل اور زراعتی قبائل کے درمیان ایک مستقل کشمکش اور جنگ و جدال کا بازار گرم رہتا ہو گا۔ اس پر مستزاد یہ کہ دُنیائے عرب کا علاقہ ایشیا، افریقہ اور یورپ کا سنگم ہے۔ یہاں تو دُنیا کے ہر حصے سے خانہ بدوش قبائل آتے ہوں گے اور آپس میں لڑتے ہوں گے۔ جب دو قبیلے یا دو قومیں ایک دوسرے سے ملتے ہیں (خواہ وہ میدانِ جنگ ہی میں یا بازار میں) تو ترقی ہوتی ہے۔ جنگ کے دوران ایک فریق دوسرے فریق کے طریقِ جنگ اور ہتھیاروں سے واقف ہو جاتی تھی۔ جنگ کے بعد فاتح قوم مفتوح کو اپنا غلام بنا لیتی تھی اور اس طرح وہ ایک دوسرے کے رہن سہن، سوچنے اور کرنے کے طریقوں سے واقف ہو جاتے تھے اور کچھ عرصے بعد ان کی زبان، تہذیب اور تمدن ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے تھے۔ بین الاقوامی میلوں اور منڈیوں میں دُور دراز قبائل کے تاجر ایک دوسرے سے ملتے تھے اور نہ صرف اجناس و مصنوعات بلکہ زبان و خیالات کا تبادلہ بھی کرتے تھے۔ الغرض یہ علاقہ مختلف قبیلوں اور قوموں کے لیے میدانِ کارزار بھی تھا اور مشترک بازار بھی۔ اس لیے یہ امر تعجب خیز نہیں کہ دُنیا کی اوّلین تہذیبوں کے بیج اسی علاقہ کی وادیوں میں بوئے گئے۔ دجلہ و فرات اور نیل کی وادیوں میں سمیری، آسیری اور مصری تہذیبوں نے جنم لیا اور ان کی شاخیں دُور دُور تک پہنچی تھیں۔ دجلہ و فرات اور نیل کی وادیوں کے درمیان فونیشیا (موجودہ فلسطین) کا ساحل واقع ہے۔ مغرب و مشرق کے بادشاہوں اور شہنشاہوں کی فوجیں اس علاقہ میں ایک دوسرے سے نبردآزما

منتقل ہو گئی۔

جب تیرھویں صدی قبل مسیح میں شمال سے آنے والے وحشی قبائل نے ایجیئن کریٹ کی تہذیب کو تباہ کر دیا، یہاں اور حبشہ کی بغاوتوں کے باعث مصر کی بھی بساط الٹ گئی اور بعد ازاں جب آشوری سلطنت ختم ہو گئی تو زیشیا کے کنعانیوں پر سمندر کی جانب سے فلسطینی حملہ آور ہوئے اور جنوب کی طرف سے سامی نسل کے عبرانی اسرائیلی گھس آئے۔ بعد میں کنعانیوں اور فلسطینیوں کو یہ سرزمین چھوڑنی پڑی اور وہ کارتھیج میں جا کر آباد ہو گئے۔ وہاں انھوں نے تہذیب کی شمعیں روشن کیں۔ جو اسرائیلیوں کے یہاں اسرائیل اور یہودہ کی دو سلطنتیں قائم کیں۔ حضرت سلیمان (۱۰۰۵ - ۹۲۵ قبل مسیح) کے زمانے میں بنی اسرائیل کو عروج حاصل ہوا۔ ۵۸۶ قبل مسیح میں بابل نے بنی اسرائیل پر حملہ کیا اور ان کی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس کے بعد سے بنی اسرائیل کبھی کسی فاتح کے زیر نگیں رہے۔ مگر انھوں نے کبھی بھی غیر ملکی تسلط کو دل سے قبول نہ کیا۔ غیر ملکی حاکموں کے مظالم اور غیر محفوظ حالات نے ان میں تمام عقائد اور کہانیاں پیدا کر دیں جو ایک مظلوم معاشرے کے لوگوں میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ انھوں نے خدا کی ذات کے متعلق سوچا اور اپنی مصیبتوں کا مداوا دوسری دنیا میں تلاش کیا۔ چنانچہ بنی اسرائیل نے دنیا کو یہودیت، عیسائیت کے مذاہب دیے۔ اسلام بھی انھیں مذاہب کے ارتقا کا سلسلہ ہے۔ چونکہ وہ فاتح حاکموں سے ہمیشہ الگ رہے اس لیے انھوں نے تجارت کا آزاد پیشہ اختیار کیا اور دور دراز کے ملکوں سے نہ صرف تجارت کی بلکہ وہاں جا کر بسے بنے رہے۔ یہ کچھ تعجب کی بات ہے کہ ان کے مذہب اور معاشرت میں کوئی فرق نہ آیا۔ تجارتی تقاضوں اور غیر محفوظ و غیر یقینی حالات نے ان کے دلوں میں دولت کی محبت پیدا کی۔ انھوں نے سود لینے کی عادت ڈالی جو بڑھ کر بخل کی صورت اختیار کر گئی۔ زندگی و معاشرت ... سے وہ تنگ نظر ہو گئے۔ وہ کبھی دوسروں سے خلوص نہ کر سکے انھوں نے سب ہی کو دھوکا دیا اور اکثر اپنے پیغمبروں، رہنماؤں اور اپنے آپ کو بھی دھوکا دینے سے باز نہ آئے۔

ایجیئن، مصر اور ایشیائے کوچک کی سلطنتوں کے بعد ایرانیوں کا زمانہ آیا۔ ۵۵۰ قبل مسیح میں سائرس اعظم نے ایرانی فتوحات کا سلسلہ شروع کیا اور دارائے اول نے ایرانی سلطنت کی حدود دریائے ڈینیوب سے دریائے سندھ تک اور بحیرۂ اسود اور کوہ قاف سے مصر کے بالائی حصے تک پھیلا دیں۔ ایران اور یونان میں ایک مدت تک جنگیں ہوتی رہیں۔ آخر کار سکندر اعظم کی قیادت میں یونانیوں نے ایران اور مصر پر فتح حاصل کر لی۔ یونانیوں کے بعد روما کا زمانہ آیا۔ وہ ایک مدت تک شمالی افریقہ میں کارتھیج (جو فلسطین سے جلا وطن ہونے والے فونیشین کنعانیوں کی سلطنت تھی) سے برسر پیکار رہے اور آخر اس پر غلبہ پا لیا۔ انھوں نے سارے فلسطین پر بھی قبضہ کر لیا۔ رومیوں کی سلطنت برطانیہ سے فارس تک اور مراکش سے آرمینیا تک پھیلی ہوئی تھی۔ شمال کے وحشی قبائل اور ... نے روم کی سلطنت کو ختم کر دیا۔ مشرقی روم کی سلطنت مسلمانوں کے ہاتھوں ختم ہوئی۔ غرض تہذیب کی ابتدا سے روم کی سلطنت

یہ کہ دنیائے عرب جب بھی کوئی طاقت ایشیا، افریقہ یا یورپ سے ابھری اس نے موجودہ دنیائے عرب کے علاقوں کو فتح کرنا اپنا اوّلین فرض سمجھا۔ خاص طور پر شام، لبنان، فلسطین اور مصر کے ساحلی علاقے محلِ وقوع کے اعتبار سے اس قدر اہم تھے کہ ہر سلطنت ان کو اپنے قبضے میں رکھنا دفاع کے لیے ضروری سمجھتی تھی۔

دنیائے عرب کی جدید تاریخ ظہورِ اسلام سے شروع ہوتی ہے۔ پیغمبرِ اسلامؐ نے اپنی زندگی ہی میں حجاز کو متحد کر کے جزیرہ نمائے عرب کے اتحاد کی بنیاد رکھ دی تھی۔ ۶۳۲ء میں پیغمبرِ اسلامؐ کی رحلت کے بعد عرب مسلمانوں نے ایران اور بازنطینی سلطنتوں کو فتح کر لیا۔ اسلامی فوجیں ایران سے وسط ایشیا اور ہندوستان تک پہنچ گئیں۔ شام، مصر، شمالی افریقہ اور اسپین پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا اور آخر کار وہ فرانس تک پہنچ گئے۔ ۶۳۲ء سے ۶۶۱ء تک پہلے چار خلفا کی حکومت رہی۔ ۶۶۱ء میں امیر معاویہ نے خلافت حاصل کر لی اور بنو امیہ نے شام کے شہر دمشق سے ۷۵۰ء تک حکومت کی۔ بنو امیہ کا تختہ بنو عباس نے الٹ دیا۔ انھوں نے عراق میں بغداد کا شہر آباد کیا اور اس دار الحکومت سے ۷۵۰ء سے ۱۲۵۸ء تک حکومت کرتے رہے۔ عباسیوں کا دور امن اور فارغ البالی کا زمانہ کہلاتا ہے۔ ان کے زمانے میں ایرانیوں کو دربار اور حکومت میں بہت کچھ دخل ہو گیا۔ ۸۵۰ء کے بعد صوبائی حکمران تقریباً خود مختار ہو گئے اور عملاً خلیفہ کا اقتدار ختم ہونے لگا۔ گیارھویں صدی کے وسط میں سلجوق ترکوں نے ایران پر قبضہ کر لیا۔ وہ ۱۰۵۵ء میں بغداد پر بھی قابض ہو گئے اور ان کی سلطنت ہندوستان سے بحیرۂ روم تک پھیل گئی۔ دسویں صدی میں خلافت دو خاندانوں میں بٹ گئی۔ مصر میں فاطمی خلیفہ تھے جن کا سکہ شمالی افریقہ اور کبھی کبھی شام تک چلتا تھا۔ اُدھر اسپین میں بنو امیہ کی خلافت تھی جو ۱۰۳۱ء تک قائم رہی۔ اسپین میں مسلمانوں نے تقریباً ۸۰۰ سال تک حکومت کی اور ان کے دور میں یہ ملک یورپ کا سب سے زیادہ مہذب ملک سمجھا جاتا تھا۔

۱۲۵۸ء میں ہلاکو خاں نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس کے بعد عباسی خلافت کا نام بھی باقی نہ رہا۔ اس کے ساتھ ہی سلجوق ترکوں کی سرداری بھی ختم ہو گئی۔ جب عثمانی ترکوں نے ایشیائے کوچک میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ جلد ہی انھوں نے بلقانی ریاستوں پر غلبہ حاصل کر لیا۔ ۱۴۵۳ء میں جب عثمانی ترکوں نے قسطنطنیہ کو فتح کر لیا تو مشرقی بازنطینی رومی سلطنت کا آخری چراغ بھی گل ہو گیا۔ عثمانی ترکوں نے شام، فلسطین اور مصر کی مملوک سلطنت پر بھی قبضہ کر لیا۔ وہ دو سو سال تک ایران کی صفوی حکومت سے نبرد آزما رہے اور آخر کار عراق پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا۔

یورپ کے عیسائیوں نے ترکوں کے زمانے میں صلیبی جنگوں کا آغاز کیا۔ گو یہ جنگیں مذہب کے نام پر لڑی گئیں لیکن ان کا اصل مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو دنیائے عرب سے بے دخل کر کے ہندوستان اور مشرقِ بعید سے ہونے والی تجارت کا راستہ صاف کر لیا جائے۔ گو یورپ کے عیسائیوں کو اپنے اس مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوئی اور فلسطین میں آخر کار صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں انھیں شکست ہوئی لیکن اسپین اور سسلی مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ آخر کار ایک

منفعت بھی یا گر عثمانی سلطنت کمزور ہو گیا اور جیسے جیسے وہ زوال پذیر ہوتی گئی یورپی طاقتیں ترکی سے مراعات حاصل کرتی رہیں۔ خصوصاً انگریز تاجر یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح وہ براہ راست ہندوستان اور دیگر مشرقی ممالک سے تجارت کر سکیں اور مسلمان تاجروں کا درمیانی واسطہ ختم ہو جائے۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے لیے یورپ نے صلیبی جنگیں کی تھیں۔ لیکن جہاں متحدہ صلیبی فوجیں اور مذہبی رہنما ناکام رہے وہاں انگریز تاجروں نے کامیاب ہو کر دکھایا۔ [illegible] میں انگریزوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی بنائی اور ترکی سلطان سے تجارت کی مراعات حاصل کر لیں۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی گئی۔ خلیج فارس میں پرتگالیوں نے ہرمز کے جزیرے پر قبضہ کر لیا۔ شاہ ایران نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے مدد کی درخواست کی اور انگریزوں کو ایک نادر موقع ہاتھ آیا۔ انھوں نے ہرمز سے پرتگالیوں کو بے دخل کر دیا اور ولندیزیوں اور فرانسیسیوں کو بھی اس علاقے سے نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ ہندوستان کے دفاع کے لیے اور تجارتی و جنگی حیثیت سے انگریزوں کی نظر میں خلیج فارس بہت اہم تھی۔ جب نپولین مصر پر قابض ہو گیا تو [illegible] میں انگریزوں نے مسقط کے عربوں اور دیگر ساحلی باشندوں سے معاہدے کر کے انھیں اپنی حفاظت میں لے لیا۔ [illegible] میں انھوں نے عدن پر قبضہ کر کے وہاں بحری اڈہ قائم کر لیا۔

سلطنت عثمانیہ زوال پذیر تھی۔ [illegible] میں فرانس نے مصر پر قبضہ کر لیا۔ سولھویں صدی میں آسٹریا دباؤ بھی بڑھنے لگا۔ اس کے ایک صدی بعد روس نے بھی پاؤں پھیلانے شروع کر دیے۔ مصر کے پاشا محمد علی نے بغاوت کی اور اس کی فوجیں استنبول تک پہنچ گئیں۔ روس نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور ایک معاہدہ کی رو سے سلطنت کے دفاع میں مدد کے بدلے ترکی کے بعض اندرونی معاملات میں دخل دینے اور بوقت ضرورت دروانیال بند کرنے کے حقوق حاصل کر لیے۔ اس معاہدے سے برطانیہ روس کو شبہ کی نظر سے دیکھنے لگا۔ جب دوسری بار محمد علی نے استنبول پر حملہ کیا تو برطانیہ اور دوسری مغربی طاقتوں نے دخل اندازی کی اور تنازعہ کا پر امن تصفیہ کرا دیا جس کے نتیجہ میں مصر خود مختار ہو گیا۔ [illegible] میں برطانیہ، فرانس اور روس نے مل کر سلطنت عثمانیہ کے بحریہ کو تباہ کر دیا جس کا براہ راست نتیجہ یہ ہوا کہ یونان سلطنت کے قبضہ سے نکل گیا۔ [illegible] تک بلقان کی تمام عیسائی ریاستیں اور جزیرہ کریٹ سلطنت عثمانیہ کے قبضہ سے نکل گئے اور طرابلس (لیبیا) پر اٹلی نے قبضہ کر لیا۔

انیسویں صدی میں برطانیہ کی پالیسی یہ تھی کہ سلطنت عثمانیہ کو کسی نہ کسی طرح قائم رکھا جائے۔ انگریزوں کو ڈر تھا کہ سلطنت عثمانیہ کی تباہی سے جو خلا پیدا ہو گا وہ روس پر کرے گا۔ چنانچہ کریمیا کی جنگ میں برطانیہ اور فرانس نے روس کے خلاف سلطنت عثمانیہ کی مدد کی اور برطانیہ نے اس کے معاوضہ میں سائپرس کا جزیرہ حاصل کر لیا۔ [illegible] میں برطانیہ مصر پر قابض ہو گیا۔ ترکی کا سلطان اب بالکل مجبور اور بے بس تھا۔ انیسویں صدی کے آخر تک کریمیا اور کوہ قاف کے کچھ حصے روس کے قبضے میں چلے گئے۔ الجزائر اور تیونس پر فرانس قابض ہو گیا۔ بوسنیا اور ہرزیگووینا کو آسٹریا نے دبا لیا۔ جرمنی ہی ایک ایسا ملک تھا جس نے سلطنت عثمانیہ کے کسی علاقے پر قبضہ نہیں کیا تھا اور قیصر جرمنی ترکی کے سلطان کی دوستی

کا دعویٰ کیا تھا۔ ان دوستانہ تعلقات کا اندازہ اس وقت ظاہر ہوا جب جرمنی نے ترکی کی وساطت سے برلن سے بغداد تک ریل چلانے کی سکیم عمل میں لانے کا فیصلہ کیا اور ترکی فوج کو تربیت دینے کی ذمہ داری قبول کر لی۔ اس صورتِ حال کا توڑ برطانیہ نے یوں کیا کہ اپنے پُرانے دشمن روس سے دوستی کا معاہدہ کر لیا۔

پہلی جنگِ عظیم

۴ اگست ۱۹۱۴ء کو پہلی جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔ سلطنتِ عثمانیہ نے جرمنی کا ساتھ دیا۔ انگریزوں نے شریف مکہ اور شاہ سعود سے خفیہ معاہدے کر کے عربوں کو ترکوں کے خلاف بغاوت پر تیار کر لیا۔ یہ بغاوت جون ۱۹۱۶ء کو شروع ہوئی۔ جنگ کے دوران عربوں کی یہ بغاوت ترکوں کی شکست کا پیغام تھی۔ ترکوں کو بیک وقت انگریزی فوجوں اور لارنس کی قیادت میں لڑنے والے عرب گوریلوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ سلطنتِ عثمانیہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ جنگ کے بعد عربوں کو توقع تھی کہ انگریز اپنے وعدے پورے کریں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ انگریزوں نے عرب ریاستوں اور فلسطین کی آزادی کا وعدہ کیا تھا لیکن دوسری طرف ۱۹۱۶ء میں برطانیہ، فرانس اور رُوس نے خفیہ معاہدے کر کے دُنیائے عرب کو آپس میں بانٹ لینے کی سکیم بھی بنالی تھی۔ یہ علاقے بجائے آزاد ہونے کے تولیتی نظام کے ماتحت ہونے تھے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ ہوا کہ انگریزوں نے ۲ نومبر ۱۹۱۷ء کو بالفور اعلان کے ذریعہ یہودیوں سے یہ وعدہ کیا کہ فلسطین میں ان کی قومی ریاست قائم کی جائے گی۔

شام میں ترکوں کی شکست کے بعد انگریزوں نے سارے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ ۳۰ جنوری ۱۹۱۹ء کو امن کانفرنس میں طے کیا گیا کہ عرب علاقوں کو ترکی سے علیحدہ کر لیا جائے اور فاتح ملکوں کو ان کا متولی بنا دیا جائے۔ برطانیہ اور فرانس تولیتی علاقوں کی سرحدوں کے سوال پر متفق نہ ہو سکے۔ چنانچہ دو امریکیوں کو یہ کام سپرد کیا گیا کہ وہ لوگوں کی خواہشات معلوم کریں اور اپنی تحقیقاتی رپورٹ امریکی صدر کی خدمت میں پیش کریں۔ اس رپورٹ کی سفارشات برطانیہ اور فرانس نے قبول نہیں کیں کیونکہ کنگ اور کرین نے اپنی رپورٹ میں شام پر فرانسیسی نگرانی کی مخالفت کی تھی اور بالفور اعلان کو بھی غیر دانشمندانہ قرار دیا تھا۔

ستمبر ۱۹۱۹ء میں برطانیہ اور فرانس میں ایک معاہدہ ہو گیا جس کی رُو سے انھوں نے عرب علاقوں کے حصے بخرے کیے۔ ۸ مارچ ۱۹۲۰ء کو شام کے سربرآوردہ لوگوں کی کانگریس نے امیر فیصل کو شام اور فلسطین کا تاج پیش کیا لیکن برطانیہ اور فرانس نے اس فیصلے کو نہیں مانا۔ ۲۴ اپریل ۱۹۲۰ء کی سان ریمو کانفرنس نے شام اور لبنان کو فرانس کی نگرانی میں اور فلسطین اور عراق کو برطانوی تولیت میں دے دیا اور اس کے ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کی کہ بالفور اعلان کی پالیسی پر عمل کیا جائے۔ لیگ آف نیشنز نے سان ریمو کانفرنس کے فیصلوں کی توثیق کر دی۔

فرانس نے امیر فیصل کو شام سے نکال دیا اور انگریزوں نے انھیں عراق کا بادشاہ بنا دیا۔ شرق اردن ان کے بھائی امیر عبداللہ کی سرداری میں دے دیا۔ اس طرح سلطنتِ عثمانیہ کے خاتمے کے ساتھ نئی طاقتوں کا تسلط قائم ہو گیا۔ عرب قومیت جس نے آزادی کی توقع میں ترکوں کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیا تھا اب غیر ملکی طاقتوں کے پنجے میں ...

[illegible]

اقتصادی [illegible]

[illegible] ترکی میں [illegible] قائم تھی [illegible]

بعد فرنگیوں نے خلیفہ کا لقب [illegible] جب جنگ کے [illegible]

قوت سے دست بردار ہو گئے [illegible] اس کے بعد سے [illegible]

گئی۔ مغربی تسلط کے [illegible] آزادی [illegible] عرب قومیت اور عرب [illegible]

عمل۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد [illegible] جنگ عظیم کے [illegible] عرب قومیت کی تشکیل و تنظیم کا سبب

دوسری جنگ عظیم کے بعد سے مختلف [illegible] عرب قومیت کی سیاسی اور [illegible] جدوجہد کا دور شروع ہوتا ہے جو ہنوز

جاری ہے۔ اس سے قبل کہ ہم اس جدوجہد کا تاریخی جائزہ لیں یہ کہنا [illegible] عرب پر مغربی اثرات کا [illegible]

(باقی آئندہ)

اختر صاحب

محمد طفیل

"اپنے ہیرو کے قریب نہ جاؤ۔ اس کی عظمت
مداحوں کے قرب کو برداشت نہیں کر سکتی!"

مذہب ــــــ [illegible] ــــــ دوران :

انہی دو حقیقتوں میں اختر صاحب گم ہیں۔ آپ انہیں ڈھونڈ نکالیں۔

ویسے تو وہ پروفیسر ہیں اور نامور پروفیسر، اور میں ادب کا طالب علم ہوں اور غیر معروف طالب علم۔ اس لیے میں ایک ایسی ہستی کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں جسے پڑھنے کے لیے لڑکی کئی سیڑھیاں طے کرنی پڑیں ـــ اور پڑھانے کے لیے! ـــ اس کے لیے تو اس سے بھی زیادہ ڈگریاں چاہییں۔ شخصیت پر کوئی ڈگریاں! ـــ وہ کہتے ہیں کہ کتابیں نہیں پڑھ سکتے تو انسانی چہرے پڑھو۔ میں کتابوں کتابیں پڑھنے کے باوجود انسانی چہرے نہیں پڑھ پاتے جانے

مجھے اختر صاحب سے تحقیق یا کالج [illegible] بیٹھنے کا موقع نہیں ملا، [illegible] میں انہیں استاد مانتا ہوں۔ اور اتنا [illegible] استاد کے معاملے میں [illegible] معاملے میں!

بات طالب علم اور استاد کی چل نکلی ہے۔ اس لیے میں بھی اختر صاحب کو طالب علمی کے زمانے سے پہچاننے کی کوشش کروں گا۔ صرف کوشش! جو ناکام بھی ہو سکتی ہے اور ناکام بھی!

تصور کیجیے۔ اس وقت ایک محقق کی گردن مجھ میں [illegible] ہے اور وہ پورے [illegible] کے ساتھ بول رہی ہے:

ابتدائی تعلیم زیادہ تر [illegible] ۱۹۲۹ء میں [illegible] میں پاس کیا۔ [illegible] ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۶ء تک سائنس کالج پٹنہ میں رہے۔ [illegible] ۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۸ء تک [illegible] ۱۹۳۳ء میں [illegible] ۱۹۳۵ء

میں کیا۔

یہاں محقق کی [illegible] سے [illegible] ہم [illegible] سکتے ہیں۔

[illegible] واقعات میں [illegible] اور واقعات کا اضافہ کر دیا جائے [illegible] ۱۹۱۱ء

سے ۱۹۱۵ء تک [illegible] میں رہے اور [illegible] ۱۹۳۵ء [illegible]

[illegible] وقت [illegible] پہلے [illegible] کھانے [illegible]
[illegible] مثلاً [illegible] چاہتے ہیں [illegible]
[illegible] شامل [illegible] ہیں [illegible] دوسروں پر [illegible]
[illegible] ہیں [illegible] درمیان اپنے [illegible] لیتے ہیں۔ [illegible]
یہ ذکر ہیں اور احباب ہوئے خوش:

کھانے میں: [illegible] ان کو اپنے گھر میں کس قسم کی ضیافت ہوتی ہے۔

کھانے میں ——— نہاری، [illegible] بریانی، کباب، [illegible] روٹی، [illegible] مرغ [illegible]

[illegible] ——— [illegible] ——— صاف ستھرا سفید کپڑے، [illegible] ——— آرام کرسی ———

صاف ستھرا کمرہ [illegible] ایشیائی [illegible]!

دیکھیے میں نے چند ہی سطروں میں کتنی [illegible] حالات لکھ دیئے، پسندیدہ اور مرغوب

چیزوں کے بارے میں لکھ دیا۔ ہو گیا مضمون مکمل!

جیسے ذہنی [illegible] لکھی جا سکتی ہے:

[illegible] معلومات [illegible] ہیں۔ [illegible]

[illegible] مثلاً [illegible] ہیں [illegible]

[illegible]

[illegible]

ان باتوں کا [illegible] ——— مضمون مکمل ہو گیا! ——— [illegible]

میں [illegible] واقعاتی باتوں [illegible] چاہتا تھا [illegible]

[illegible] ——— امانت ہے؟

[illegible] بات [illegible] صاحب [illegible] ہیں [illegible]

[illegible] ——— [illegible] کمال [illegible] ہو۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کالج میں پہنچے تو اور لڑکوں کی طرح ہلا گلا جو ہر ان کالج کا روزمرہ تھا۔ یہ عمر وہ ہوتی ہے جب آدمی اپنے آپ میں نہیں ہوتا۔ ہر چونکانے والی بات کی دھن، مرکز نگاہ بننے کی آرزو، ہر شرارت پر طبیعت آمادہ، ہر ذمہ داری سے آزاد، یہ دور بھی یادطلب ہوتا ہے جس میں مسرتوں کا واسطہ بے راہ روی سے وابستہ ہوتا ہے۔

انھوں نے بھی متعدد دفعہ ہنگامہ بپا کرنے کی کوشش کی۔ بوٹنگ کرتے رہتے تھے۔ لڑکیوں کی طرف سے مطمئن تھے کہ کالج کے پیریڈ بھی کم تر ہیں۔ اس خوش فہمی کے بعد سپرنٹنڈنٹ کے خلاف فارسی اور عربی میں نظمیں لکھیں شاہ جہاں مال کریں اور پیروڈی میں انھیں گالیاں دیں۔ اس سے کردار سے تار [illegible] تھے ——

ان کے ایک یار کالج میں تھے جو ان کی تصویریں بنایا کرتے تھے اور وہ لڑکوں اور لڑکیوں میں تقسیم کر دی جاتی تھیں جس پر شاخسانے بھی ہوتے تھے۔ گالیاں بھی پڑتی تھیں۔

نوجوان جو آزاد عشق فرماتے تھے وہ سب کے سب ان کے پاس جا کر [illegible] بیان کیا کرتے تھے۔ ان کی شیروانیاں [illegible] کرتے تھے، [illegible] کیا کرتے تھے جب [illegible] ہم خود کیسے [illegible] اپنے معاشقوں کی داستانیں سناتے [illegible] [illegible] اپنے معاشقے [illegible] [illegible] معاشقوں کی بھی [illegible] [illegible] وہ سب [illegible] [illegible] [illegible] صاحب کا شاگرد ہوتا ہے۔ [illegible] صاحب [illegible] اپنے [illegible] استاد کے شاگرد ہوتے [illegible] [illegible] شرارت [illegible] نہیں آتی

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ان دنوں ایک واقعہ سنا دوں:

[illegible] پڑھتے تھے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] زیادہ [illegible] شرارت میں بھی مجھ سے زیادہ [illegible] ہوں گے

[illegible] [illegible] [illegible] نظم لکھی، جو فارسی کی پیروڈی تھی ــ

[illegible]

[illegible] خوب چلی۔ لڑکوں کی زبانوں سے [illegible] [illegible] ——— [illegible] ———

بیچے [illegible] [illegible] [illegible]

ان کی شادی کی سوچی۔ یہ ارادہ ایسا تھا کہ وہ دہلی سے بھاگ نکلے۔ ۱۹۴۲ء میں ان کی شادی کر دی گئی تاکہ برخوردار [illegible] دامن کی بادہ کاری میں اضافہ نہ کرے۔

باتوں باتوں میں اختر صاحب نے بتایا کہ انہیں ایک نہایت متقی بیوی کی تلاش تھی۔ اس کے ساتھ رومانیت کے خواب بھی دیکھتے تھے۔ ان کے نزدیک مذہب میں بھی ایک طرح کی رومانیت ہے۔

زندگی میں ہمیشہ وہ دو دھاری [illegible] سے کھیلتے رہے۔ وہ خود بھی مذہب کی [illegible] کا شکار ہے کہ انہیں بیوی مذہبی [illegible] کی لذت [illegible] سے پہلے کے رومان تھے۔

باتوں ہی باتوں میں ایسے موڑ بھی آتا رہا جب میں نے اختر صاحب سے پوچھا ـــــ کیا آپ نے کسی قسم کا نشہ بھی کیا ہے؟

[illegible]

[illegible] ـــــ [illegible] گنجائش ہوتی تو بات نے نکل گئی ـــــ [illegible] میں مشہور ہے کہ کم [illegible] تھا کیا یہ سچ ہے؟

[illegible] ـــــ [illegible] سے عقیدت ہے۔ [illegible] سے محبت [illegible] ہوں کہ [illegible] ہیں۔ [illegible] رہا۔ وہ حقیقی [illegible] ہے۔

وہ بولے آپ نے صاف [illegible] کیے۔ [illegible] کی وجہ تھی کہ کرنا پڑا ـــــ [illegible] قائل ہو گیا۔

[illegible] تھے ـــ [illegible] انہیں بہری [illegible] ہونے والی بات سے [illegible] کرنا پڑ ـــــ [illegible]

[illegible] ـــــ [illegible] گیارہ سال کی عمر میں [illegible] صاحب [illegible] رہتا تھی [illegible] کبھی [illegible] تھے [illegible] گئے تھے [illegible] ـــــ [illegible] چلا گیا [illegible] ـــــ [illegible] کے ـــــ [illegible] رہے اور محبت کا [illegible]

[illegible]

[illegible] کیا کہ اختر صاحب [illegible] کے قائل نہیں۔ اپنی خامیوں پر بھی [illegible]

۱۔ [illegible] جاتے ہیں ان کے گلے میں لٹک گیا۔

ہ ذہین سے بھی آگاہ ہیں۔

دیکھیے ایک دور وہ ہوتا ہے جب انسان اپنے مجوزہ معاشقوں کا حال بیان کرتا ہے اور ایک یہ وقت آتا ہے رنگین باتوں پر بھی زبان نہیں کھلتی۔

ویسے اتنا مزہ ہے کہ یہ بات بات پر تڑپ سکتے ہیں۔ بات بات پر اٹک سکتے ہیں — ذرا تڑپنے اور اٹکنے والی بات کی وضاحت کر دوں تاکہ معاملہ قابو میں رہے

تڑپنے والی بات تو یہ ہے کہ سارے جہان کا درد ہمارے جگر میں ہے۔ دنیا میں کہیں کوئی ظلم ہوا ہو۔ درد کی ٹیس ان کے جگر میں اٹھے گی۔ اٹکنے والی بات یہ ہے کہ بس ذرا جواہر لعل کی طرح اچکن میں پھول اٹکا لینے کے عادی ہیں۔ اس کے علاوہ ویسا زبردست اچھا ہے۔

لیجیے! بچپن کے دن اور جوانی کی راتوں کے قصے ختم ہوئے!

ساری دنیا اختر اورینوی کے رشتے سے شکیلہ اختر کو جانتی ہے۔ مگر میں نے اختر صاحب کو شکیلہ کے رشتے سے جانا۔

ادبی حلقوں میں اختر صاحب کی دھاک ربع صدی سے ہے۔ میں بھی ان کے نام سے واقف تھا۔ خط و کتابت بھی تھی۔ مگر جب ۱۹۶۰ء میں شکیلہ بہن سے ملی تو اختر صاحب سے باقاعدہ ملاقات ہوئی۔ [illegible] خطوں سے باتوں [illegible] اختر صاحب کی تصویر [illegible]

۱۹۶۱ء میں میرا ادھر جانا ہوا تو شکیلہ کے گھر پٹنہ بھی جانا پڑا۔ ابھی میں پٹنہ سے ایک دو اسٹیشن ادھر ہی تھی کہ [illegible] کے اسٹیشن پر ایک صاحب ملے۔

جالی صاحب، السلام علیکم۔

جی!

میں شکیلہ کی بہن [illegible] ہوں۔

اچھا اچھا!!

مجھے شکیلہ نے لکھا تھا کہ جالی آ رہے ہیں۔ [illegible]

آپ نے کیسے پہچان لیا؟ [illegible]

واہ جالی کو پہچاننا بھی کوئی مشکل بات ہوتی ہے۔

یہ صاحب ابھی [illegible] تھا کہ شکیلہ کے [illegible] صاحب کو بھی دیکھا۔

حمید نے کہا۔ آپ بہت خوش قسمت ہیں کہ آپ کے استقبال کے لیے اختر صاحب خود آئے ہیں۔ ورنہ تو کسی کے لیے نہیں آتے۔" پہلے ہی مرحلے پر اختر صاحب کی عنایت اور قربت کا احساس دلا دیا گیا۔ [illegible] سفید کپڑے پہنے قد کے خوب صورت آدمی جو لفظاً ادیب نہیں لگتے تھے۔ بلکہ کوئی آئی سی ایس افسر معلوم ہوتے تھے۔ [illegible] چہرہ، گندمی جیسی رنگت جو ہمارے یہاں بہت کم لوگوں کو نصیب ہے اور ایسے لوگوں کی بات ذرا دیر کی ہے) [illegible] ہم کلمہ زبان [illegible]

یہ صاحب [illegible] تھے جو ادب کی تعمیر کر رہے تھے۔ مگر میں ہی کیا، اگر انسان جنون کی حد تک کسی سے بھی مرعوب نہیں ہوتا خواہ [illegible] داغ کی کتاب ہے۔ جو:

اب میرے سامنے اختر صاحب ہی اور میں تھا ——— اختر صاحب کا گھر ادبی محفل کی ایک کیفیت ہے۔ گھر سے متعلق [illegible] صاحب [illegible] دنیا بنایا جائے۔

یہ ادیب لوگ ہوتے ہیں۔ بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔ یہ کسی دنیا میں رہتے ہیں کہ نہیں مگر سے کوئی تعلق نہیں ہوتی۔ [illegible] جیسے گھر کا کوئی [illegible] بہت [illegible] سیٹ کر دیا۔

اختر صاحب [illegible] سیٹ کرتے ہیں [illegible] تو [illegible] مشہور افسانہ نگار ہیں۔ ان دونوں کے [illegible] کیا اثرات ہوں گے۔ [illegible] کہ دونوں [illegible] لکھتے ہیں۔

[illegible] ادب پر، سیاست پر، مذہب پر [illegible] روانی کی طرح [illegible] گئے ہیں [illegible] دیکھے ہیں۔ [illegible] کی طرف ہوا ہے۔

اختر صاحب کی [illegible] ساتھ، جو پتا ہے [illegible] ایک خوبی کی ——— [illegible] ان خوبی کی تشہیر [illegible] تو ملیں گے۔

[illegible] اختر صاحب [illegible] تھا۔ ان دونوں پہلے تو [illegible] اپنے [illegible] لے گئے اور اپنے شاگرد [illegible] بازار [illegible] دیکھنے کی آپ کو بھی تمنا تھی۔

اختر صاحب [illegible] کرانے۔ [illegible] مگر مجھے علم ہوا کہ اختر صاحب میرے [illegible] میرے ساتھ [illegible] انھوں نے [illegible] تھا۔ [illegible] چلو۔ میں [illegible] جانے سے [illegible] کر [illegible] ——— یہ میں ہوں!

ستمبر پچیس کو ساڑھے چار بجے شام کا۔" چلیں گے؟"

"کہاں؟"

"انجمن تماشائے ادب نے آپ کے اعزاز میں دعوت کی ہے۔"

"نہیں جناب میں نہیں جاتا۔"

"صرف چلنے کی دعوت ہے۔ وہاں کوئی مقالہ وغیرہ نہیں پڑھنا ہوگا۔ بعد میں حال اگر کوئی سوال پوچھے تو جواب دے دینا۔"

"اس دعوت کو کل کیجیے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے بھی وعدہ کیا ہوا ہے اور شکیل نے بھی وعدہ کیا ہوا ہے۔"

جی چاہا کہ ابھی اپنا سوٹ کیس اٹھاؤں اور واپس چل دوں۔ اس لیے کہ میں ہنگاموں سے گھبراتا ہوں۔ وہ اور لوگ ہوتے ہیں جو زیادہ رہتے ہیں۔

ناچار ساتھ ہو لیا۔ کچھ اس طرح میں کہ یہ کپڑے وغیرہ پہنے ہوئے تھے۔ میں نے دو چار سطریں لکھنے کی کوشش کی کہ اگر سر پہ پڑ گئی تو کچھ کہہ بھی سکوں۔

جلسے کے جاتے وقت سب سے پہلے مجھے رشید احمد صدیقی کا وہ فقرہ یاد آیا جو انھوں نے ایک جلسے میں کہا تھا ـــ "گھر سے جو کچھ یاد کر کے آیا تھا۔ وہ یہاں آ کر بھول گیا ہوں۔"

اس کے بعد جو کچھ کہا۔ وہ دیگر یادداشتوں کے ساتھ محفوظ رہا۔ اُسے نقل کیے دیتا ہوں۔

وہ تحریر:

قبلہ اختر اورینوی صاحب مجھ کے بارے میں آپ کا خیال ہوگا کہ نہایت معقول آدمی ہیں۔ انھوں نے میرے ساتھ کسی قسم کی معقولیت کا ثبوت نہیں دیا۔ انھوں نے ابھی ابھی مجھے یہ خبر سنا کر دو ہاتھ [illegible] تماشائے ادب کے جلسے میں جانا ہے۔ میں نے ہاتھ جوڑے اور کہا۔ خدا کے لیے مجھے نہ لے جائیں۔ اس لیے کہ میں ان جلسوں کی روح سے واقف ہوں۔ دوسرے یہ کہ زندگی کا فلسفہ اور تقریر کی حیثیت میں کورا ہے۔ لہٰذا مجھے معاف رکھا جائے۔ مگر یہ نہیں مانے اور یوں یہ سب خرافات آپ حضرات کے سامنے آ رہی ہیں۔

بات یہ ہے کہ کچھ پڑھنا اور پڑھانا [illegible] ادب کے ذریعے [illegible] نقوش [illegible] میری کوشش [illegible] اشاعت [illegible] ایک اچھا رسالہ ہے [illegible]

میں نے اختر صاحب سے پوچھا [illegible] تماشائے ادب [illegible] انھوں نے کہا تھا۔ وہ لوگ کچھ سوال پوچھیں گے۔ جواب دے دینا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ [illegible] جواب [illegible] نہیں [illegible]

[illegible] ب بنانا پسند نہیں کرتا۔

دیکھئے، اختر صاحب نے یہی بتایا تھا کہ ہمیں اردو کے مستقبل پر بات چیت کرنی ہوگی۔ بہرحال یہ سوال معصوم سا معلوم ہوتا ہے۔ کم سے کم اتنا جواب ہونا کچھ مشکل نہیں۔ اس لیے کہ ہم پاکستانیوں نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ اردو کیسے بچ سکتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے اردو کی پوزیشن کچھ ایسی ہو گئی ہو کہ جیسے کوئی ہندی لڑکی اپنے ماں باپ کے گھر سے بھاگ گئی ہو۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اردو کو نہ ہندوستان والے سمجھتے ہیں اور نہ پاکستان والے۔ یعنی ہماری سرکاری زبان اردو ہی ہے۔ مگر ہمیں جب [illegible] انگریزی کی [illegible] نہیں [illegible]۔ یہی وجہ ہے کہ [illegible] پاکستان میں بیٹھا [illegible] اردو دیکھ آؤں تو وہ انگریزی [illegible] ہے [illegible] مگر ابھی پاکستان میں ایسے [illegible] ہیں جو اسے اپنی ماں سمجھتے ہیں۔

مجھے زیادہ وقت نہیں ملا [illegible] پڑھنے کے لیے تیار ہو کر آتا [illegible] اختر صاحب کا شکریہ ادا [illegible] آپ کی [illegible] بیٹھا [illegible]۔ [illegible]

[illegible] اختر صاحب پر مضمون [illegible]۔ [illegible] شعر یاد [illegible] وقت سے [illegible]۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

انھوں نے ابتدائی تعلیم قادیان میں حاصل کی۔ اُردو فارسی، انگریزی اور قرآن حکیم اپنے والد سید وزارت حسین صاحب سے پڑھا۔ قرآن شریف با ترجمہ اور تفسیر اور دُوسری مذہبی کتابیں اپنے چچا سید ارادت حسین صاحب اور حکیم خلیل احمد صاحب سے پڑھیں۔

اس کے علاوہ کچھ اور اُستادوں کے نام بھی بتلائے تھے۔ چند ایک نام لکھتا ہوں۔ مثلاً زلی سادھو خاں، چارلس ریڈ، چودھری حمید اللہ خاں، پروفیسر بے ایل۔ پی، فضل الرحمٰن اور ڈاکٹر گیان چند[1] —— بقول ان کے یہ سب ایسے مشفق استاد تھے کہ جنھوں نے ہمیشہ شفقت سے سراہا! —— ویسے اتنا اندازہ تو میں نے بھی لگایا کہ انھوں نے اپنے استادوں کا ذکر خصوصاً اور نہایت عقیدت کے ساتھ کیا تھا۔

میں نے ان سے یہ بھی پوچھا تھا کہ آپ کن کن کتابوں سے متاثر ہوئے۔ کہنے لگے۔ قرآن حکیم، احمدیت اور حقیقی اسلام (جناب میرزا بشیر الدین محمود احمد)، اسلام کا اقتصادی نظام اور نظامِ نو (جناب میرزا بشیر الدین محمود احمد)، اینا کرینا (ٹالسٹائی)، اسلام کا احیا (برگ)، ووٹس اینڈ فور (ورس)، فار ہوم دی بیل ٹولز (ہیمنگوے)، مومنٹ ان پیکنگ (لن یوتانگ)، بانگ درا، بالِ جبریل (اقبال)، نگارستان، جمالستان (نیاز فتحپوری)، الفاروق (شبلی)، اقبال کی ساری فارسی کتابیں، مثنوی مولانا روم، جوش کی انقلابی نظمیں، اختر شیرانی کی رومانی نظمیں۔

دیکھا آپ نے متاثر ہونے والی کتابوں میں پہلا نام تو انھوں نے قرآن حکیم کا لیا اور آخری —— جوش اور اختر شیرانی کی رومانی نظموں کا —— دراصل اختر صاحب انہی دو جذبوں کے اندر بند ہیں اور ان جذبوں میں جو کشش ہے وہ بھی ڈھکا چھپا نہیں۔ ایک طرف خدا سے رشتہ ہے، دُوسری طرف اس کے خاص بندوں سے۔ انہی دو انتہائی جذبوں کی کمک اور لپک کے سہارے یہ اپنی زندگی کو سنوارتے رہے ہیں۔

انھوں سے یہ پوچھا جائے کہ آپ کن لوگوں سے متاثر ہوئے تو یہ فوراً جواب دیتے ہیں: مردوں میں حضرت محمد صلعم، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ، میرزا غلام احمد، بدھ، کرشن، سعدی، اقبال، شیکسپیئر، ابراہم لنکن، محمد بن قاسم، مہاراجہ رنجیت سنگھ، ٹیپو سلطان، شاہ ولی اللہ، پنڈت جواہر لال نہرو، محمد علی جناح۔

خواتین میں —— میرزا بشیر الدین محمود احمد، اماں جان اہلیہ، فلورنس نائٹنگیل، پروفیسر ...، مسز ... ہمارے احباب سعیدہ اختر[2] اور رازِ دل[3]۔

اور تو سب باتیں ٹھیک ہوئیں۔ مگر پہلے یہ تو اپنی بیوی سے بھی متاثر نکلے۔ یہ عجب اچھی بات ہے جو ذرا کم ہی نظر آتی ہے۔ خواتین تو اسے زوجیت کا حق سمجھتی ہیں کہ میں اپنے شوہر سے متاثر ہوں۔ —— مگر ان کی زن پرستی کا عالم

۱۔ یہ گیان چند وہ نہیں جنھوں نے اُردو کی نثری داستانیں لکھ کر شہرت حاصل کی۔
۲۔ رازِ دل سعیدہ اختر کا مجموعہ ہے۔ مگر اختر صاحب اسے ایک شخصیت ہی سمجھتے ہیں۔
۳۔ اس وقت عمر کل نو تھی۔

بیگم [illegible] صاحب!

میرا خیال ہے یہ مزاحیہ ہیں۔ اس لیے اس سلسلے (انٹرویو) میں یہ پوچھا جائے کہ آپ کن کن واقعات سے متاثر ہوئے
اس سوال کے جواب ہم اسے کچھ ذرا پوچھیں گے۔ مت پوچھیں گے۔ ان کو جواب وہ واقعات بتائیں گے۔ جن سے آپ
متاثر ہوئے!

شعوری یا غیر شعوری حیثیت سے [illegible] سوال کہ ہے۔ میں متاثر ہوا ہوں۔ جنگ بدر، جنگ حنین، جنگ قادسیہ، جنگ یرموک، واقعہ
کربلا، فتح سندھ، جنگ پانی پت، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، تقسیم ہند ۱۹۴۷ء، انقلاب [illegible] اپنی والدہ کی موت (جب اختر
[illegible] سال کے تھے)، چچا کی موت، اپنے بچے [illegible] کی وفات ـــــــ اور اپنی شادی سے!

بیگم صاحب ہم [illegible] سنجیدہ [illegible] سے حل [illegible] جو محض ریاضی کے سوال تھے۔ انشاء اللہ [illegible] ہو چکا ہے کہ یہاں [illegible]
آپ [illegible] تاکہ [illegible]۔

یہاں ایک دلچسپ قصہ سنیے تاکہ ذہن کو ذرا سی آسودگی ملے۔ عام طور پر ان کی زندگی بڑی دلچسپ گزری۔ اور ایسے
حالات دنیا میں بہت [illegible] سے [illegible] اور [illegible] تیز [illegible] روز [illegible] قصہ یوں
ہوا کہ [illegible] ـــــ

بزرگوں اور [illegible] ایک [illegible] جنات [illegible] ہے۔ چند سے اختر صاحب [illegible]
[illegible] تشریف [illegible] اور غائب ہو گئے [illegible]
[illegible] اختر صاحب متاثر ہوئے۔ مگر [illegible]
[illegible]

[illegible] ہو گیا۔ [illegible] ہوتے ہوئے [illegible]
[illegible] اختر نے اپنی مذہب سے فائدہ اٹھایا۔ اور ایک [illegible] جنات کو عربی اور فارسی کے [illegible]
[illegible] اور [illegible] اسلام [illegible]۔

پھر [illegible] کے بعد [illegible]۔ بعد کو پتہ چلا کہ [illegible] تھا۔ [illegible]
[illegible] سنایا۔ جنوں کا سایہ تھا۔ [illegible] نے
[illegible]۔

[illegible] فضل اللہ تعالیٰ کی [illegible] خاص [illegible] ہے۔ [illegible] فیض اٹھایا ہوگا۔ مگر [illegible]
[illegible] نہیں۔ [illegible] سوچنے کا انداز اور ہے۔ [illegible] خوش نہیں۔ [illegible] چاہتے [illegible]
[illegible] اسلام [illegible]

یہ اپنے جیسوں میں اس بیٹھک دیتے ہیں کہ نہیں نہیں۔ یہ منصب بھی میری آرزو ں کے مطابق ہے۔

ان تمام مشاغل کے علاوہ ان کی ایک شغل اور بھی ہے وہ یہ کہ چپ چاپ بستر پر بیٹھے رہیں اور کوئی بھی انہیں پریشان نہ کرے —— ہمارے زیادہ تر لوگوں کو واقع ہوئی ہے۔ جو اپنے من کی بات دوسروں سے نہ کر سکتے ہوں اور یوں وہ تنہائی میں خیالوں کی مجلسیں منعقد کرتے ہیں اور خود کلامی میں لذت پاتے ہیں۔

جہاں تک میں نے انہیں پڑھنے کی کوشش کی پتہ یہی چلا کہ یہ کسی طرح بھی مطمئن نہ ہوتے۔ اب جب کہ یہ اپنی یونیورسٹی میں اپنے شعبے کے ہیڈ ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ اگر میں ڈاکٹر بنتا اور آزادانہ پریکٹس کرتا تو اچھا ہوتا۔ اگر یہ واقعی ڈاکٹر ہوتے تو یہ کہتے۔ میں کہاں آ پھنسا یہ آپریشن، یہ گلی سڑی بیماریوں کی تشخیص اپنے بس کا روگ نہیں۔

ایک وقت میں یہ کھلے طور پر اپنی صدر شعبہ سے الجھ بھی ہے۔ یہ بڑی ایثار پسند اور وفا شعار ہیں۔ لیکن مزاج میں تیزی کا او نت قسم کی انفرادیت ہے جو اکثر ہوتی ہے۔ یہ ذہن ممکن ان کی شادی اگر جلدی سے نہ ہوئی ہوتی تو اب تک یہ سنیاس لے چکے ہوتے۔

یہ اپنے معمولات میں بڑے باضابطہ ہیں۔ زندگی مقررہ سانچوں میں ڈھلی ہوئی ہے۔ بیماریوں نے اور بھی زیادہ بااصول بنا دیا۔ پروگرام میں ذرا بھی تبدیلی ہو جانے تو چڑچڑا جاتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی بے ضابطہ بھی ہو جاتے ہیں۔ مگر صرف احباب کے ساتھ۔ اور نہ وہ شوق، مطالعہ و بحث ہی کا ہے۔

صحبت میں سادہ مزاجی، سنجیدگی اور بات بات کے ساتھ خوش مزاجی اور ظرافت کی بھی چاشنی ہے۔ ہر وقت ابوالکلام بنے نہیں بیٹھے رہتے —— 'حلقۂ یاراں' کی تو جان ہیں!

گو سابقہ عنوانات میں ان کی زندگی کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑی ہوگی۔ لیکن ان کے مذہبی خیالات اور رجحانات پر ابھی کچھ مزید کہنے کی ضرورت ہے۔

اگر یہ مذہب کے بارے میں ان کے خیالات جاننا چاہیں گے تو اس سلسلے میں آپ کو بڑی صفائی کے ساتھ بتائیں گے۔ تمام مذاہب میں اسلام کو سب سے زیادہ ترقی یافتہ مذہب سمجھتا ہوں۔ زندگی گزارنے اور آفاقی تعمیر انسانیت کے لئے مذہب کو ضروری سمجھتا ہوں۔ اخلاق کا اعلیٰ معیار پیدا کرنے بغیر مذہب کے ناممکن ہے۔ معمولی سطح پر بغیر مذہب کے بھی قیام ممکن ہے لیکن رفعت و لطافت اخلاق جس کو روحانیت کہا گیا ہے، صرف خدا تعالیٰ کی ذات کے ساتھ تعلق سے حاصل ہو سکتی ہے۔

یہ غیر مذہب کے لوگوں سے بھی رواداری اور تعصب نہیں برتتے کیونکہ ان کا خیال ہے کہ اسلام تعصب سے منع کرتا ہے۔ لا اکراہ فی الدین اور لا اکراہ فی الفقہ ان کا عقیدہ ہے۔ رشتہ داروں اور احباب میں شیعہ، سنی، وہابی، حنفی، دہریہ، اشتراکی، اشتمالی، ہندو، عیسائی سبھی ہیں اور سبھی سے اچھے تعلقات ہیں۔ عقیدتاً بھی دوسرے مذاہب کے لوگوں کو اصلاً جہنمی نہیں کہتے۔ نجات کا انحصار صرف خدا اور بندے کا معاملہ سمجھتے ہیں۔

سیاسی اعتبار سے یہ اسلامی جمہوریت اور خلافت کے قائل ہیں۔ اسلامی اقتصادی نظام جس میں اشتراکیت کی خوبیاں اور

حصول دولت کی سہولتیں موجود ہوں، اس لیے نوجوان بہ آسانی انحطاط کا شکار ہو سکتے ہیں۔ شب و روز کے مسائل ہوں کہ سماجی
سمجھتے ہیں۔ قومیت کے بارے میں اقبال کا یہ شعر کتنا سچا ہے۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

عورت وقت کی ضرورت بھی ہو سکتی ہے۔ مگر عقیدہ اور تربیت ضمیر کے ساتھ :

میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے اس غیر معمولی قسم کے آدمی کے بارے میں میری ناچیز رائے طلب کی کو برداشت
کی ہے یہ جانتا ہوں کہ آپ ... صاحب ... کے ادبی نظریات اور پسند کے بارے میں بات چیت
ہو سکتی ہے ... جانا شاید ضروری نہ ہو۔ گروہ اپنے آپ کو کتنی اہمیت دیتا ہے ... مگر ایک نسل ... کے بارے میں
... ہے۔ اس سوال کی روشنی میں اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو یہ اپنے آپ کو کسی بھی قسم کی اہمیت دیتے ہیں۔ ... نہیں ہے
کا خیال ہے کہ تنقید ہی کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی تخلیقات کا بھی کم قیمت کیا جائے اور یہ کہ جس نے خود کو بیچا اور اپنی حقیقت کو
جس ... بھی نہیں کر سکتا۔

وہ پہلے پرستو ہیں کہ ان کے پسندیدہ ادیب یہ ہیں: دیکھئے، ٹیگور، اشینو بک، خلیل جبران، منشی منشی،
نظیر اکبر آبادی، انیس، غالب، اقبال، شاد عظیم آبادی، راسخ عظیم آبادی، جگر مراد آبادی، پریم چند، کرشن چندر، ... شبلی نعمانی، ...
منٹو اور اختر شیرانی ——— اور ——— جوش ملیح آبادی، نیاز فتح پوری، آل احمد سرور، احتشام حسین، کلیم الدین احمد، کرشن
ماجد ...، قرۃ العین حیدر، عبادت ...، ... صدیقی اور احمد ندیم قاسمی ہیں۔

جو سوال یادداشتیں وہ ہیں جو میں ان سے ... تھا۔ انہیں ختم کرنے کے لیے مسلسل ملاقاتوں کی ضرورت
اس کے بعد جو کچھ لکھا جاتا وہ زیادہ کارآمد ہوتا۔ مگر میں کیا کروں۔ اختر اورینوی کی خبر میری ان ملاقاتوں کے لیے رک نہیں سکتی
اس خبر میں میری شرکت ضروری تھی۔ ... کے سلسلے میں ... کی
کوشش آ گئی تھی۔

یہ مضمون ... کے ... سے لیا گیا تھا۔ ان کی اجازت سے یہاں درج کیا جا رہا ہے۔

۵۵۵

مہندر ناتھ

کھڑکی میں بیٹھے ہوئے زملا نے گزرے ہوئے برسوں کی طرف نگاہ ڈالی۔ پندرہ سال پہلے اُس کی عمر صرف پندرہ برس کی تھی اور وہ لاہوری دروازے کے اندر ایک چھوٹے سے مکان میں اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ اُس کا باپ بچپن میں مر گیا تھا۔ صرف ماں زندہ تھی۔ ماں نے اُسے کیسے پالا پوسا تھا، اُس کے متعلق اُسے کوئی خاص علم نہ تھا اور زملا نے یہ جاننے کی کوئی خاص کوشش بھی نہ کی۔ پانچویں جماعت تک ماں نے زملا کو پڑھایا تھا۔ اُس کے بعد وہ ناچ سیکھنے لگی تھی۔ چند برسوں میں وہ نرت سے اچھی خاصی واقف ہو گئی۔ جب کبھی وہ کوئی دُھن کا اشارہ سنتی تو خود بخود اُس کے پاؤں ناچ کی دُھن پر تھرکنے لگتے۔ نہ جانے اُسے ناچ سے اتنا عشق کیوں ہو گیا تھا۔ گھر میں کوئی نہ ناچتا تھا۔ نہ باپ کو اس قسم کے آرٹ سے شغف تھا اور نہ ہی ماں کو۔ اور دور دور تک جو رشتے دار آتے جاتے انہیں تو اس پیشے یا آرٹ سے سخت نفرت تھی۔ صرف اُس کی ماں ہی تھی جس نے اُسے ناچنے کے فن میں دلچسپی لینے کی ترغیب دی۔ یوں زملا کا قد خاصا لمبا تھا۔ سرو قد کہنے میں کوئی مبالغہ نہ ہو گا۔

لمبی لمبی مخروطی انگلیاں مضبوط اور توانا بانہیں۔ چہرے کا رنگ گندمی نہ تھا بلکہ گندمی رنگ سے زیادہ صاف اور شفاف۔ اچھا چہرہ۔ بال گہرے سیاہ۔ آنکھیں موٹی موٹی۔ چہرہ قدرے لمبوترا اور پاؤں بے حد حسین تھے۔ اگر کوئی آدمی پہلے زملا کے پاؤں دیکھ لیتا تو شاید اُس کے چہرے کی طرف نگاہ نہ ڈالتا۔ یوں تو بچپن خاصی دُبلی پتلی لڑکی تھی۔ جسم کی ہڈیاں اُبھری تھیں۔ وہ نازک اندام سی لڑکی نہ تھی بلکہ چھری کی طرح ... کی طرح چست ہو جاتی۔ جب سامنے کھڑی ہو جاتی تو ایک باوقار لڑکی لگتی۔ کبھی کبھار تو یوں احساس ہوتا کہ کسی جاٹ کی لڑکی ہے جس کے باپ نے کھیتوں میں ہل چلایا ہو گا۔ کبھی تو جسم سے ایک توانائی اور مضبوطی کا احساس ہوتا تھا جو بہت کم لڑکیوں کے جسموں سے جھلکتا ہے۔

زملا کا مستقبل اتنا روشن نہ تھا۔ ماں کی عمر اُس وقت پینتالیس برس سے اوپر ہو چکی تھی اور اُس کا سہارا نہ ہوتا تو صرف زملا تھی۔ مگر زملا کی پرورش متوسط طبقے میں نہ ہوتی تو زملا کبھی کی اس پیشے کی نذر ہو جاتی۔ زملا کی ماں نے اچھے دن دیکھے تھے۔ اسی لئے دور ... کھایا تھا اور ... اُس کی رگوں میں جوش آتا تھا اور اُس نے اپنی جوانی ... کے شفاف پانی میں ڈبو ڈالی تھی ... کے درختوں کے تلے بیٹھ کر ... زملا کی ماں آسانی سے اس راہ کی طرف راغب نہ ہو سکی اور نہ ہی زملا کو اس راہ پر چلا سکی۔

جب زملا کو پہلی بار ... جوان ہوئی ماں بوڑھی ہو ... گھر کے اندر گھنگرو چھنکتے ہوں تو خود بخود ... دن ...

ہے زیوروں کی [illegible] ضرورت نہیں تھی۔ زیورات آسانی سے کسی کو گروی رکھ کر بہت سے چندہ [illegible] کر سکتے ہیں اور
بیچ بھی سکتے [illegible] نہ رکھتے۔ بہرحال اس نے ایک پاشا مدیا تو بیسے [illegible] کا مجموعہ حاصل کیا تھا
کہ یہ اس گھر [illegible] کے لیے کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جو بے حد چالاک اور سمجھدار ہو۔ جو بات یوں لگے
معلوم ہو کہ محض دوستی اور ہمدردی کا خوف اور جذبہ کہ اس نے ادھر رخ کیا ہے۔ اس کے ذہن پر ریشمی زلفوں کا گہرا
بوجھ آنا چاہیے۔ اس کا زرا سا حسینہ کے پاؤں کی جھنکار اس کے دل و دماغ پر کوئی اثر نہ ڈال سکے۔ وہ جو دل ہی دل میں سوچ کر
ان پیمانے کا شغف رکھے تو بات بن سکتی ہے۔

سیٹھ جواد علی اسی محلے میں رہتا تھا جس نے فیشنوں کے بزنس میں کافی روپیہ کمایا تھا۔ ابھی تیس پینتیس برس کی عمر تھی۔
صرف ایک شادی کی تھی۔ تین اور شادیاں کرنے کا ارادہ تھا۔ بے حد بانکی رنگت کالی۔ مگر دل کا بڑا شوقین مزاج تھا۔ خوبصورت
لڑکی دیکھتا تو کہیں اسے ہی زیادہ حوا ہو جاتا۔ سیٹھ اور پھنسنے کے بیوپار میں اس کا کمائی ہوتا۔ [illegible] لگنے کے علاوہ
پیسہ کا سامان تیار کرا کے سیٹھ جھونا لگا دیتا۔ مگر تماشہ یہ کہ شروع شروع کے پیسے کھوں سے زیادہ تھی۔ بکنت اگر ذرا بھی خوش شکل
ہوتا تو ڈاکٹر بلڈ کی طرح ایک کام آ کر دیتا۔

اسی لیے جب کبھی زہرہ اس کے قریب سے گزرتی تو اس کا دل مچلنے لگتا۔ سارے جسم میں ایک جھرجھری سی آ جاتی۔ وہ
یا اتنا نہ رہتے۔ اس کے لیے ممنوع تھی اور اس کی پہنچ سے باہر تھی۔ مگر انسان اس ناشاد دل سے کیا کرے۔ زہرہ کو دیکھ کر اس
کا دل بھی [illegible] سے لگتا ہے۔ وہ لڑکی کیسے [illegible] کیسے سکے۔ اس سے پانی سے، اپنے بدصورت چہرے
اور [illegible] میں سکتے جیسے اور زہرہ کی خوبصورتی کا اندازہ کرتے ہوئے یہی مناسب تھا کہ پہلے اس سے راہ و رسم بڑھائی جائے
جیسے وہ وہ شالی کا ایک خوبصورت ہاتھ لے کر زہرہ کے گھر وارد ہوا۔ سلام دعا کے بعد اس نے اپنا تعارف کرایا اور
بولے "میرا نام یہ ہے۔ میں آپ کے محلے میں رہتا ہوں۔ نیا جیسے ہے۔ اس لیے سوچا اسی سے ملنے چلوں۔" زہرہ کو اس نے
چادر پیش کر دیا۔ جو بہت خوبصورت اور عمدہ تھا۔ دیکھو یہ خوبصورت لایا تھا۔ اس کی باتوں میں چاشنی اور لطافت تھی۔ بات بات میں
اس میں بہت کچھ رہتا۔ جیسے زہرہ سے اسے دلچسپی نہیں۔ مگر جھوٹی خوشامد زیادہ نمایاں تھا اور خوشامد سے تو خدا بھی
راضی ہو جاتا ہے۔ زہرہ کی اس تو محض ایک صورت تھی جو جواد علی کا نام سن چکی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ جواد علی ایک امیر آدمی
ہے۔ اسی لیے زہرہ کی ماں نے خوشی سے شالی کا ہاتھ لے لیا۔ جواد علی نے ادھر ادھر دیکھا مگر وہ۔ مگر اسے زہرہ نظر نہ
آئی۔ بس دل ہی دل میں اس کا ارادہ حسینہ کے حسن کی داد دے کر اور ماں جی کو آداب کہہ کر باہر چلا آیا۔

زہرہ گھر پہنچی تو ماں نے جواد علی کا ذکر کیا اور ساتھ ہی شالی کا ہاتھ دکھایا۔
زہرہ نے جواد علی کا نام سن رکھا تھا مگر اس کی شکل و صورت نہ دیکھی تھی۔

"ماں کیسی صورت ہے اس کی؟"

"بس بیٹی کچھ پوچھ نہیں۔ دیکھنے سے بس سمجھ لے۔ کالا کلوٹا۔ مگر باتیں شہد کی طرح میٹھی اور رسیلی کرتا ہے۔"

"ماں جی ایسے انسانوں کے پاس خوشی کیسے آتی ہے؟"

"شاید خوشی بھی رنگ روپ نہیں دیکھتی۔ اُنہی کے پاس زیادہ آتی ہے جن کے پاس پہلے ہی خوشی ہوتی ہے۔"

"کیا کہنے آیا تھا؟"

"بس یہ ڈبہ دیا اور چلا گیا ——" ماں یہ کہہ کر خاموش ہو گئیں۔

پھر جواد علی نے ایک نظر میں بھانپ لیا کہ پتھر پگھلایا جا سکتا ہے۔ ماں اتنی تنگ نظر نہ تھی کہ وہ اُس حدود سے دائرے میں سما نہ سکتا۔ زہرہ کی ماں کو اُس کا آنا بُرا لگتا تو وہ مٹھائی کا ڈبہ واپس کرتی۔ اگر ماں نے اُس کے آنے جانے پر کوئی روک تھام نہ لگائی تو بیٹی کو رام کرنا مشکل نہیں۔ جواد علی نے زہرہ کے گھر آنا جانا شروع کیا۔ اکثر ماں سے ملاقات ہوتی۔ جب کبھی جواد علی آتا کوئی نہ کوئی چیز ساتھ لاتا۔

بڑے ادب اور سلیقے سے بیٹھتا۔ باتیں ماں سے کرتا اور نگاہیں زہرہ کو ڈھونڈتیں۔

"بس ماں جی۔ تازہ خربوزوں کا ٹوکرا کیا آیا کہ میں نے سوچا کہ پہلے ماں جی کے پاس چلوں۔ اُمید ہے اس غریب کا تحفہ قبول کریں گی۔"

"کیوں شرمندہ کرتے ہو بیٹا۔ ارے تم اس علاقے کی ناک ہو۔"

"نہیں ماں جی میں آپ کی جوتیوں کی خاک ہوں۔ بس آپ کے صدقے چلا آتا ہوں۔ آپ کی نظرِ عنایت چاہیے ماں جی۔ دولت نے کس کا ساتھ دیا جو میرا ساتھ دے گی۔ بس مجھے تو صرف اللہ پر بھروسہ ہے۔ خدا عزت سے رزق دیتا رہے یہی میری دلی تمنا ہے۔ اچھا ماں جی۔ مجھے اجازت دیجیے گا۔"

"بیٹا کچھ چائے پانی؟"

"پھر کبھی ماں جی۔"

یہ کہہ کر جواد علی چلا جاتا۔ یہ عجیب و غریب سی بات تھی کہ جب کبھی جواد علی آتا تو زہرہ گھر میں نہ ہوتی اور ماں بھی زہرہ سے جواد علی کے خلوص، ایثار، انسانی دوستی اور بھائی چارے کا ذکر کرتی۔

"بڑا خوش خلق اور ملنسار آدمی ہے زہرہ۔"

"مگر بخت کی صورت بڑی بدصورت ہے ماں۔"

"سیرت کا جواب نہیں۔"

"سیرت کس نے دیکھی ماں۔ ظاہری صورت سے کیا پتہ چلتا ہے ماں کہ انسان کے اندر کیا ہے؟"

"اندر کی بات تو پیا تم ہی جانے بیٹی۔"

جواد علی نے ماں کو تحفے دے دے کر اس پر جادو سا کر دیا۔ سنجیدہ انداز میں باتیں کر کے اپنی شرافت کا سکہ جما لیا۔ جواد علی اب موقعے کی تاک میں تھا کہ وہ زہرہ سے بات چیت کا سلسلہ شروع کرے۔ اور پھر دیکھے کہ وہ اُس پر اپنی جال [illegible]

سے کیا اثر لیا۔ آہستہ آہستہ جواد علی نے یہ محسوس کر لیا کہ اُن میں تبدیلی نہیں آئی۔ کبھی کبھار جب جواد علی ... کرنے لگتا تو وہ سیدھی ... کمرے میں چلی جاتی اور جب تک وہ باتیں کرتا رہتا وہ کمرے سے باہر نہ نکلتی۔ جواد علی نے اس نفرت کو محسوس کر لیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اگر کسی کی بات کی تو منہ کی کھانی پڑے گی۔ ایک شادی کے بعد دوسری شادی ... تھی۔ وہ مسلمان تھا اور نہ ہندو۔ وہ بدصورت تھا اور نہ خوبصورت۔ وہ زہرہ سے عمر میں بھی بڑا تھا۔

بس ایک بات میں وہ زہرہ سے بہتر تھا کہ وہ امیر تھا۔ ماں اور بیٹی کی زندگی مشکل سے گزر رہی تھی اور جواد علی کو اس بات کا احساس تھا۔ روپیہ بہت کچھ کر سکتا ہے۔ وہ سمجھتے کہ گھر بار ... ہے اور پیٹ کو ... ان مشکلوں کے آگے ... نے گھٹنے ٹیک دیے۔ یہ تو محض دو عورتیں تھیں۔ اکیلی۔ بے سہارا۔ بے بس۔

پھر بھی سوچ سمجھ کر قدم رکھنا چاہیے۔ محض روپیوں کی نمائش کر کے ان کا دل نہیں خریدے جا سکتے۔ کچھ سلیقہ، کچھ طور طریقہ وقت اور حالات کو دیکھ کر آگے بڑھنا چاہیے۔ پہلے زہرہ کی ماں سے بات کی جائے۔ بڑھیا کے دل میں ڈوب کر اس ... کو کریدے سے باہر نکالا جائے۔ بس اسی اُمید پر جواد علی خود زہرہ ... اور جب ... تو ہاتھ میں ... تھا: ... ایک فقیر کی طرح دونوں ہاتھ خالی تھے۔

ماں نے صاف کہہ دیا۔ "میں آپ کو اتنی گئی گزری حیثیت کا انسان نہ سمجھتی تھی۔ سوچ سمجھ کر تو بات کرتے۔ ہم ٹھہرے ہندو، آپ مسلمان۔ پھر آپ کی شادی ہو چکی ہے۔ عمر میں زہرہ سے ڈبل ہیں آپ۔ کسی طرح بھی یہ بات ٹھیک نظر نہیں آتی۔ دوبارہ ایسی بات منہ سے نکالیے نہیں تو میں بہت بُری طرح پیش آؤں گی ——"

جواد علی اپنا سا منہ لے کر چلا گیا۔ جب سے زہرہ سے ایسا سلوک ہوا کہ دل کی بستی پر کسی نے شب خون مارا تھا اور سارا مال متاع لے کر چلا گیا۔ جواد علی کا شمار بے وقوف عاشقوں میں نہ ہوتا تھا کہ گریبان چاک کر کے کسی ویرانے کی طرف منہ کرتے —— وہ تو بیسویں صدی کا عاشق تھا۔ سیمنٹ اور چونے کا بیوپاری۔ جس نے گھروں کو تعمیر کرنا سیکھا تھا، اُجاڑنا نہیں۔ ناکامی کے بعد اپنے آپ کو ختم کرنا جاہلوں کا کام ہے۔ لیکن وہ ایک بات سے بیگانہ ... سکے۔ زہرہ کی تصویر اُن کے دل دماغ پر ایسی اُبھری کہ جواد علی نے اُسے مٹانے کی بہت کوشش کی مگر تصویر ایسی اُبھری کہ ... نقوش ... گئے اور ایک ایسی مستقل شکل ... تصویر ... ہمیشہ آنکھوں کے سامنے ... ہوئی۔

پانچ برس اور گزر گئے۔ زہرہ اور اس کی ماں نے وطن چھوڑ کر بمبئی کا رخ کیا۔ بمبئی تو روشنیوں کا شہر تھا۔ چاندی کے سکوں سے جگمگاتا ہوا شہر جہاں حسین لڑکیوں کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ جہاں روپیوں کی کمی نہیں اور حسن کے پجاریوں کی بھرمار ہے۔ بس لڑکی حسین، خوبصورت اور پُرکشش ہونی چاہیے۔ بڑھیا صرف دو دن ... تب بھی ... اور شہر میں ... لی۔ ... وہ ... آواز میں کھنک اور جادو ہو ... پریشان ہو۔ چال البیلی اور مستانی ہو۔ آنکھیں نیلی نیلی کسی گہری جھیل کے پانیوں کی طرح، اور جب سیاہ زلفیں فضا میں لہرائیں تو آسمان پر کالی گھٹا چھا جائے تو کچھ اور ... کا چراغ آپ کے پاس ہے اور اس سے فائدہ نہ اُٹھانا۔

ت ہے۔

زہرہ نے اس شہر میں وارد ہوتے ہی طوفان مچا دیا۔ فلمی جوہریوں نے اس موتی کو پرکھ کر اپنے دل کا رول دیا۔ زہرہ کے پاؤں ایسے تھرکے کہ ہر قدم پر نعرۂ تحسین بلند ہونے لگا۔ دو برس میں زہرہ آئی۔ مجھ بہت سے مل کر ایک اچھے خاصے فلیٹ میں وارد ہو گئی۔ اس کے بعد زہرہ کے پرستاروں کی تعداد بڑھنے لگی۔ حسن کے پجاریوں نے آگے بڑھ کر زہرہ کا ہاتھ تھامنے کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا۔ ماں نے سوچا ابھی تو کشتی کی ابتدا ہوئی ہے۔ ان حالات میں زہرہ کا [illegible] ایک عاشق کے ساتھ وابستہ ہو جانا ایک بہت بڑی غلطی ہو گی اور زہرہ بھی تو اپنی ماں کی بیٹی تھی جذبات کی رو میں بہنا بیوقوفی ہے۔ [illegible] ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں، روپے کی جھنکار نے عقل پر تالا لگا دیا۔ ایک نئے عاشق جانباز نے کہا [illegible] اپنا کل جسم میرے لیے وقف کر دو اور میرے سوا کسی اور کو نہ دیکھو۔ یہ نیا عاشق لقے پر تالا لگاتا تھا اور [illegible] موتی چنتا تھا۔ مرغ اور مچھلی کھاتا مگر زہرہ [illegible] کے پیچھے ایسے بھاگتا جیسے گھوڑا ریس میں بھاگتا ہے۔ اور [illegible] آنے کی کوشش کرتا۔ مگر [illegible] ہر چند عمر رسیدہ تھے۔ سر کے بال تھے یا سفید ہو چکے تھے۔ خضاب لگا کر عہد شباب کو برقرار رکھتے اور بڑھاپے میں جوانوں سے سبقت لینے کی کوشش کرتے۔ جب کسی لڑکی کو دل دے بیٹھتے تو روپے پیسے کی پروا نہ کرتے۔ جس کو تجربہ کہ دیا اس کی مرہم کو پورا کرنا اپنا فرض اولین سمجھتے۔ زہرہ کو دیکھتے ہی [illegible] بولے کہ [illegible] کا اگر تم باقی عاشقوں سے آنکھیں پھیر لو۔ زہرہ اور اس کی ماں مان گئی۔ حسن کے پجاری نے اپنی [illegible] ایک فلیٹ خانے میں لا دی۔ ماں باپ بیوی بچوں کی پروا [illegible] کا کیا ہو گا۔ [illegible] سب اپنی خواہش سے آگے۔ باقی سب [illegible] اس دنیا میں انسان [illegible] آتا ہے۔ [illegible] گنگا بہانے [illegible] ——— [illegible] نے [illegible] کے بعد [illegible] خواب دیکھتے [illegible] ان خوابوں کو چکنا چور ہوتے دیکھا۔ [illegible] بیچ [illegible] ناچے تھے دوستوں اور رشتے داروں نے سخت ملامت کی [illegible] سے [illegible] کی طرف رخ کرنے۔ زہرہ اسے [illegible] سے دیکھتی اور [illegible] دکھا کر [illegible] جاتی۔ [illegible] پیشہ کا [illegible] تھا۔ [illegible] بے وفا [illegible] کا [illegible] عدم ہوا۔

[illegible] چار برس میں زہرہ کی [illegible] تب [illegible] کچھ تبدیلیاں [illegible] ہیں۔ انسان [illegible] جسم پر ضرور پڑتا ہے۔ وہ معصومیت اور پاکیزگی جو اس کے چہرے سے عیاں تھی رفتہ رفتہ کم ہونے لگی۔ حسن اور شباب کا [illegible] غائب ہو گیا۔ اور اس کی جگہ چہرے پر ایک رنگینی سی [illegible] جسم پر گوشت کی ایک [illegible] اضافہ ہو گیا۔ [illegible] میں وہ [illegible] [illegible] نہ رہی۔ پھر بھی تیور [illegible] تھے۔ [illegible] جس میں بیوقوفی [illegible] نہیں۔ [illegible] ڈھونڈ [illegible] ہیں۔ زہرہ بھی [illegible] کی کوشش کرتی۔ کوئی ایسا [illegible] مل جائے جو دامن بھی لے اور [illegible] بھی۔ [illegible] عاشق آئے وہ [illegible] گئے [illegible] کے تحفے دیتے۔ [illegible] جانے [illegible] وہ [illegible]

آسودہ تھیں اور گستاخیں جو ابھی تک پیدا نہ ہوئی تھیں، ابھی تک نگاہوں کے سامنے آ رہی تھیں۔

انھیں دنوں جواد علی پھر آ دھمکا۔ یہ کمبخت کہاں سے آن ٹپکا۔ جواد علی کا رنگ اور سیاہ ہو گیا تھا۔ جسم قدرے جھک گیا سا۔ اس نے بتایا کہ اس کا ابا مر گیا اور ماں نے اُن کے چلے جانے کے بعد بھی کاروبار کیا۔ میاں کی کمائی سے خوب مال کمایا۔ وہی اینٹ اور چونے کا بیوپار۔ "اماں جی ایسا رنگ چڑھا ہے کہ روپیوں کا انبار لگ گیا۔ آپ کی دعا سے دو اور شادیاں کر لی ہیں۔ یعنی اب کل تین عدد بیبیاں ہیں اور بیٹے آٹھ عدد ہیں۔ سب بیبیوں کو الگ الگ مکان دے دیے ہیں۔" مزے سے کہا "آجکل کاروبار پھیلا رہا ہوں اور بنک بیلنس دن بدن بڑھ رہا ہے۔ آپ کی دعا سے پہلے بھی کسی بات کی کمی نہ تھی اور اب بھی نہیں۔" جواد علی نے کمرے میں نگاہ ڈال کر کہا ——— "زہرہ کہاں ہے اماں جی؟"

"طبیعت خراب ہے۔ ڈاکٹر سے ملنے گئی ہے۔" زہرہ کی ماں نے جواب دیا۔

شاید زہرہ کی کمی تھی جسے جواد علی نے شدید طور پر محسوس کیا تھا۔ پھر جواد علی نے اٹھتے ہوئے کہا ——— "اماں جی کسی چیز کی ضرورت ہو تو کہیے گا۔ میں اپنا پتہ لکھ کر دیے جاتا ہوں۔ اگر آپ کی خدمت کر سکوں تو منت ہے اپنی کمائی پر۔"

زہرہ کی ماں نے محسوس کیا کہ چند برسوں میں بیٹا جواد علی کافی ڈھیٹ اور منہ پھٹ ہو گیا تھا۔ روپے کی فراوانی نے اُسے کافی بد اخلاق اور بے شرم بنا دیا۔ شاید یہ شہر ہی ایسا ہے۔ جو یہاں آتا ہے بڑی جلدی بے شرم اور بے غیرت ہو جاتا ہے۔۔۔ وہ خود بھی تو۔۔۔۔۔۔ یہ سوچ کر رہ گئی۔

اتنے میں زہرہ آ گئی اور ماں نے بیٹا جواد علی کا ذکر کیا۔

"اماں اس کا رنگ کیسا ہے؟"

"اس کا رنگ زیادہ خوب چڑھا ہے بیٹی! دھاریں گھومتا ہے۔ زہرہ مردوں کی نخوت کو دیکھتی ہے اور اس بک بک دیکھا جاتا ہے۔"

"سچ کہتی ہو ماں، پھر بھی مجھے اس شخص سے نہ جانے اتنی نفرت کیوں ہے؟ ایک بار تم نے صاف جواب دے دیا تو اب پھر۔۔۔۔۔"

"بیٹی وہ آیا تو تم سے پوچھنے کے لیے نہیں آیا۔" پھر ماں نے زہرہ کی طرف دیکھا۔ زہرہ کی نفرت کو دیکھ کر وہ خاموش سی ہو گئی۔ جواد علی کافی منہ زور تھا۔ وہ کبھی کبھار چکر ضرور مارتا اور اُن کی مالی حالت کا پتہ چلا رہا ہے۔ ابھی تک مالی حالت اتنی خراب نہیں کہ جواد علی اپنے دل کی بات کر سکتا۔ اب وہ دل کی بات اس وقت کرے گا جب اُسے یقین ہو کہ خاندان ہار جائے گا۔ میرا شکستہ خواب دیکھنا ہی کہاں کی عقلمندی ہے۔

اسی طرح پانچ سال اور گزر گئے۔ زہرہ کی اقتصادی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ [illegible] ایک بی تھی۔ زیادہ تر [illegible] نکال دو۔ [illegible] بنانے کی [illegible] کافی تھیں۔ [illegible] ایک کر اور چاہیے

پی کر چلے جاتے۔

بڑھاپے میں کی خواہش تھی کہ کرکی کا نوکا پورا اور حل کا انتقال جائے تو مستقبل سنور جائے۔ اسی دوران میں یرن کا ایک عنصر بعد شراب پی کر زہرہ کے گھر پڑا رہتا۔ شراب، کھانے پینے کے اخراجات، باہر کی تفریح، سینما، کپڑے، سب کے لیے روپے دیتا مگر ان روپوں سے زندگی تو نہیں بنتی۔ جب زہرہ نے تنگ آ کر شادی کے لیے کہا تو نیوی کا افسر الگ ہو کر دور ہو گیا اور پھر زہرہ سے ملنے نہ آیا۔

پھر اسی قسم کے چکروں میں زہرہ نے اپنا حسن و شباب کھو دیا۔ حسن کو بڑی فراخدلی سے لٹایا جس چیز کی بڑی قیمت اور رکھتے ہیں اسے سنبھال کر نہ رکھا۔ وہ محرابوں اور قوسوں کا تاج محل ایک کھنڈر کی صورت اختیار کر گیا۔ اب بھولے بھٹکے مسافر آتے اور کھنڈر کو دیکھ کر کہتے۔ عمارت ضرور عظیم ہو گی۔

یہ وہی لمحات تھے جب زہرہ نے اپنے دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر سوچا کہ زندہ رہنے کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے؟ اب تو سہارے کی ضرورت تھی۔ اسی دوران میں جواد علی پھر وارد ہوا۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو بھانپ لیا کہ اب سب کچھ لُٹ گئے ہیں۔ شمع حسن بھی بجھی بجھی سی ہے۔ جس نخوت اور رعب داب سے زہرہ بات کرتی تھی اس کی جگہ نرمی اور انکسار نے لے لی۔ جواد علی نے اپنا رویہ نہ بدلا۔ وہی خوشامدانہ انداز گفتگو رہا۔ دل بے تاب کی دھڑکنوں کو اپنے قابو میں رکھا۔ یہ پرانا عاشق تھا جس کی بلندی اور خودسر تھا۔ ظاہری نرمی تھی ——— استقامت، مضبوطی اور توانائی کی تھی۔ وہ دل کی بات کہہ کر دوبارہ رسوا ہونا چاہتا تھا۔ بس ہاں جی سے کہتا ——— اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بندہ حاضر ہے۔ اللہ کی مہربانی سے میرا کاروبار خوب چلتا ہے۔ اگر میں آپ کے کام آ سکوں تو مجھے بڑی خوشی ہو گی۔ چلیے آج آپ کو باہر گھما دوں۔

بس وہ زہرہ اور اس کی ماں کار میں بیٹھ کر باہر چلی گئیں۔ واپسی پر جواد علی نے زہرہ کو کچھ چیزیں خرید دیں اور جب زہرہ گھر میں داخل ہوئی تو اس کے ہاتھ میں جواد علی کی خریدی ہوئی چیزیں تھیں۔ یہ جواد علی کی پہلی فتح تھی۔

اب ہر دوسرے تیسرے دن جواد علی اپنی ماں سے کر جاتا۔ زہرہ کی ماں جو فرمائش کرتی جواد علی پوری کرتا۔ زہرہ دل ہی دل میں کڑھتی رہتی۔ پھر ماں کے کہنے پر بیٹی جواد علی کے ساتھ سینما دیکھنے چلی جاتی۔ دونوں گھومتے پھرتے۔ سیر کرنے نکل جاتے۔ میری ماں تو ہر بار کہہ دیتی کہ تیرے برتے ہوئے نکل جاتی۔ زہرہ نے اس تمام عرصے میں زہرہ ہی یہ اچانک تبدیلی بیٹے کی کرتے جواد علی اچھا لگنے لگا۔ جس کو دیکھ کر وہ منہ پھیر لیتی تھی وہی کا دل ہے سے جا رہا تھا۔ کیا یہ روپے کا جادو تھا یا جواد علی کے خوشامدانہ طرز گفتگو کا اثر یا آنے والی زندگی سے بچنے کے لیے اس نے یہ راہ اختیار کی تھی۔ اب زندگی کو سنوارنا ہے تو سنوارو۔ ادھر جواد علی پر یہ بات ظاہر ہو چکی تھی کہ رات کی رانی راہ راست پر آ چکی ہے جواد علی نے جوش و خروش سے موقع سے اپنی زندگی مضبوط کرکے روپیہ صرف کیا اور ساتھ ساتھ زہرہ کو اس کے مستقبل کے متعلق اشارے کرتا رہا۔

اور میں تو تیرہ (۱۳) شادیاں کر چکا ہوں۔ [illegible] میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا تو اُس وقت صرف ایک شادی کی تھی۔ گذشتہ دس شادیاں اس کے بعد کی ہیں تمہیں پانے کے جذبے نے پاگل کر دیا۔ میں وہ مجنوں نہیں کہ گریبان پھاڑ کر صحرا صحرا جنگل جنگل گھوموں۔ تمہیں پانے کا یہ طریقہ ہے۔ اور جب تک زندہ رہوں گا تمہیں پانے کے لیے میرا دل تڑپتا رہے گا۔ اس معاملے میں بہت ـــــ سے دور [illegible] کرتا ہوں۔ اپنی بیویاں [illegible] کرتا ہوں۔ اپنے بچوں کو پیار کرتا ہوں اور ان کی مدد کرتا ہوں۔ غریبوں میں اپنے [illegible] تقسیم کرتا ہوں۔ [illegible] ہے۔ تم میری بیوی بنو گی اور میری آخری بیوی ہو گی۔ سیٹھ [illegible] تمہاری قسمت کا [illegible] ہوں۔ تم مجھ سے شادی کرو۔ زندگی [illegible] گی۔ [illegible] سکتا ہوں۔ اب زیادہ نہ تڑپاؤ۔ اگر کہو تو سب سے پہلے نیا فلیٹ خرید کر دوں گا۔ [illegible] سب [illegible] کر لیں۔ ان دو کمروں کے چھوٹے سے فلیٹ سے باہر نکلو اور ایک خوشگوار اور باوقار زندگی گزارنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

اور [illegible] دس سال پہلے سیٹھ کی صورت دیکھنا پسند نہ کرتی تھی آج اس کی باتیں بڑے غور سے سن رہی تھی۔ سوچ رہی تھی وہ کیا ہوا پہلے۔ آج سے دس سال پہلے اس کے [illegible] کا ایک قطرہ بھی اس شخص سے ہم کلام ہونے کے لیے تیار نہ تھا مگر آج قسمت اُلٹا فیصلہ کر رہی تھی۔ اور وہ [illegible] کیوں کر [illegible] کے اُن تمام فقروں کو [illegible] نے [illegible] نہ کی۔ ذہن نے بغاوت نہ کی۔ [illegible] تھا۔ شاید درست ہو رہا تھا۔ اس عرصے میں [illegible] سیٹھ سے کی [illegible] کی گرفت [illegible] ہوتی گئی۔ وہ [illegible] تھے۔ وہ سب کچھ کرے گی۔ وہ [illegible] جاتی ہے کہ [illegible] گی۔ [illegible] کے لیے وہ [illegible] جو کچھ سیٹھ کہے گا کرے گی۔ [illegible] چاہتی۔ وہ ان دو کمروں میں [illegible] چاہتی۔ دونوں [illegible] نہیں چاہتی۔ اب [illegible] گیا [illegible] اور سیٹھ کے نئے فلیٹ میں [illegible] سیٹھ نے واقعی اس مکان [illegible] خوب کی تھی۔ [illegible] فلیٹ [illegible] کے ساتھ رہنے لگا [illegible] خوب گزرنے لگی۔ [illegible] کے بعد [illegible] ہو گئی۔ [illegible] سیٹھ [illegible] ہے۔ [illegible] نہیں۔ اس کے [illegible] بیوی کی ہے۔ [illegible] دوسری بیویوں کے پاس۔ [illegible] کر کے دیکھ لیا۔ [illegible] کر کے دیکھ لیا۔ [illegible] کر کے دیکھ لیا مگر سیٹھ [illegible] میں کوئی فرق نہ آیا بلکہ سیٹھ نے ایک دن صاف صاف کہہ دیا۔ " [illegible] ہو گا۔ تمہاری [illegible] نہیں [illegible] پتہ چل گیا کہ یہ شخص [illegible] نہیں رہ سکتا۔ یہ شخص آوارہ

...بدمعاش ہے۔ اس نے اپنے من کی خوشی کے لیے مجھ سے شادی کی تھی تاکہ اپنی برسوں پرانی خواہش کو عملی جامہ پہنا سکے اور جب اس خواہش کی تکمیل ہو گئی تو سیٹھ نے اصلی روپ دکھا دیا۔

اب وہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ کس سے گلہ کرے؟ کس سے شکایت کرے؟ یہ کوئی میاں اور بیوی کی زندگی نہ تھی۔ محض آقا اور غلام کا رشتہ تھا۔ وہ دن بھر انتظار کرے، کیوں انتظار کرے؟ محض دو وقت کھانا کھانے کے لیے۔ نوکروں کو ایک جانب فیشن دکھانے کے لیے۔ اور سیٹھ جواد علی کا جہاں جی چاہتا ہے چلا جاتا ہے۔ کئی دن گھر سے غائب رہتا۔ [illegible] اس وقت نئی بیوی کے پاس ہوگا۔ یہ سوچ کر اس کا خون جوش مارنے لگتا اور وہ بڑبڑانے لگتی۔ اس بار تو سیٹھ پانچ دن کے وقفے کے بعد گھر واپس آیا تھا۔ [illegible] نے سیٹھ کو گریبان سے پکڑ لیا۔ سیٹھ نے جوابی حملہ کیا اور دو تین تھپڑ رسید کیے۔ وہ چیخی چلائی۔ اس نے [illegible] مچا دی۔ اُس دن تو مار برداشت کر گئی اس کے بعد تو تقریباً جب کبھی اس نے کوئی شکایت کی جواد علی فوراً دو چار گندی گالیاں دیتا۔ اور ایک دو تھپڑ رسید کرتا اور ساتھ ہی کہتا ــــــ عورت کے مزاج کو ٹھیک کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اُسے روز پیٹا جائے۔ نہ جانے اس جواد علی کو کیا ہو گیا۔ بیاہ سے پہلے اس نے کبھی جھڑکا تک نہ تھا۔ چاپلوسی کرتے کرتے اس کی زبان تھک جاتی تھی۔ اب تو ایک منٹ بھی سننے کو تیار نہیں۔ اس شخص نے اس کی [illegible] اٹھا لی تھیں۔ وہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ اس گھر میں رہی تو وہ پاگل ہو جائے گی۔ یہ مار پیٹ، یہ گندی گالیاں، یہ وحشیانہ سلوک برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ شخص اپنے آپ کو بدل نہیں سکتا۔ ان حالات میں وہ اس کے پاس نہیں رہ سکتی۔ دراصل ان دونوں کا مزاج نہیں ملتا۔ دونوں کی سوچ کی راہیں مختلف ہیں۔ یہاں رہنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ اگر چند دن اور ٹھہری تو پاگل ہو جائے گی اور پھر ایک روز فیصلہ کر کے وہ اپنی ماں کے پاس واپس چلی آئی کہ دوبارہ جواد علی کے گھر نہ جائے گی۔

وہ اپنی پرانی کوٹھڑی میں بیٹھی ہوئی تھی اور ماضی اس کی نگاہوں کے سامنے گزرنے لگا۔ پرانی یادیں [illegible] جب وہ صرف چند برس کی تھی تو جواد علی [illegible] تھا۔ پانچ سال گزرنے کے بعد وہ [illegible] سیٹھ جواد علی پھر آیا اب حالات بدل چکے تھے۔ سیٹھ کے ساتھ شادی کی۔ شادی کے بعد نفرت بڑھی اور علیحدگی۔ کوٹھڑی میں بیٹھے بیٹھے وہ [illegible] اس کی نگاہوں کے سامنے [illegible] کیونکہ اس کی زندگی [illegible] پانچ برس کے بعد ایک [illegible] تبدیلی ہوئی تھی اور تب وہ اس جگہ پہنچ گئی تھی جہاں سے اس نے سفر کا آغاز کیا تھا۔

ڈاک گھر کی شہزادی

کشمیری لال ذاکر

اس کا گھر ڈاک گھر کے عین سامنے تھا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کسی خاص قسم کے آدمی کا انتظار دیکھنے سے ہمیشہ بچتا تھا۔ جب کبھی شور و غوغا یا اس کے ماتھے تک تمکنت اس کا دن برا کٹتا تھا۔

صبح سویرے اٹھ کر وہ پال غیر دار کی حویلی، شرما کے گھر، محلے کے کنویں اور پھر ڈاک گھر کی پرانی عمارت پر نظر ڈالنا کیدار کا معمول بن چکا تھا۔ یہ اس کے روزمرہ کے پروگرام کا ایک جزو تھا۔ ویسے تو ڈاک گھر کی ساری عمارت ہی اسے کالی کوٹھڑی سی نظر آتی تھی لیکن اس کا سڑک کی طرف کھلتا ہوا برآمدہ اسے اور بھی اکھرتا تھا۔ لوہے کی سلاخوں والی کھڑکیوں کے پیچھے میزوں پر جھکے ہوئے پوسٹل کلرک اسے ان قیدیوں کی طرح نظر آتے جنہیں عمر بھر کی قید ملی ہو اور جنہیں دیکھنے کے لیے تماشائی برآمدے میں کھڑے ہوں اور ان کا منہ چڑا رہے ہوں۔ اسے ان کلرکوں پر بڑا ترس آتا اور ان تماشائیوں پر بے حد غصہ۔ کون ہے جو قیدی نہیں؟ وہ سوچتا۔ کون ہے جو آزاد ہے؟ کس نے کوئی جرم نہیں کیا؟ کس کے سر کسی کا خون نہیں؟ پھر کون کس کو مجرم ٹھہرا سکتا ہے؟

اور اس کے ان سوالوں کا جواب اسے چمپا نے دیا تھا جسے وہ دو سال سے دیکھتا رہا تھا۔

چمپا کا اصل نام کیدار کو معلوم نہیں تھا۔ شاید چمپا بھی اسے نام ملا تھا۔ وہ کہاں سے اور کیسے یہاں آئی تھی۔ اس نے یہاں آنا اور کیوں پسند کیا تھا، ان سب باتوں کا کیدار کو علم نہیں تھا۔ اسے تو صرف اتنا معلوم تھا کہ ایک صبح جب وہ گھر سے باہر نکلا تو ایک جوان، خوبصورت، گورے رنگ کی عورت نے اس کا راستہ روک لیا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور کپڑے بہت میلے پرانے تھے۔ اس نے کسی اجنبی زبان میں کچھ کہا تھا اور اس نے پیچھے کو بھی نہ پلٹا۔ اسے تعجب ہوا پنجابی، ہندی اور اردو کے علاوہ کوئی اور زبان بھی اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ وہ اس کی بات نہ سمجھ سکا تھا لیکن اس کے وحشیانہ حسن سے متاثر ہوا تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے اس عورت کی بات سمجھنے کی کوشش کی لیکن نہ سمجھ سکا اور جب وہ آگے بڑھنے لگا تو اس عورت نے اس کا بازو پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ کی دو انگلیاں جوڑ کر ہونٹوں کے ساتھ لگاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ تب کیدار جان پایا کہ اسے سگریٹ کی حاجت تھی۔ اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ سگریٹ نکال کر اس نے اپنے ہونٹوں میں دبا لیا اور پھر چپ چاپ اس کا ...

بہت دنوں تک یہ معمول چلتا رہا۔ کیدار نے اب اسے ایک بڑی صفائی سے پڑھا اور جانا(؟) ... اس کا نام چمپا رکھ دیا تھا۔ بازار میں اس پاس کے دکان دار اسے چمپا کہہ کر پکارتے تھے اور اس سے چھیڑ خانی کرتے تھے۔ ... کی زبان سے ناواقف ہونے کے باوجود کچھ نہ کچھ سمجھ لیتی تھی ... وہ سب اس کی طرف دیکھتے رہتے ... اس قسم کی چیزیں دیتے جنہیں وہ خوشی سے قبول کر لیتی تھی ... جب وہ خفا ہوتی تو اچھے بھلے ... اس کے حسن و جمال ... ہوتا تھا ... وہ اپنی بہ ظاہر ...

گھر تھی اور بیزاری جیتی رہتی۔ [illegible] ٹھک ٹھک کرکے برآمدے میں ایک طرف پڑا رہتا۔ رات کو وہ بس رضائی لپیٹ کر سو جاتی اور صبح [illegible] [illegible] اس شخص کا خیر بھی نہ تھی [illegible] پہلے [illegible] سگریٹ دیا تھا [illegible] جب [illegible] جھک کر [illegible] کرنے میں لگی رہتی [illegible] کو [illegible] سگریٹ [illegible] کا شکریہ ادا نہیں کیا۔ اس کی مسکراہٹ میں [illegible] تھی۔

[illegible] جیسے پہاڑ جس میں وہ [illegible] تھا نا ممکن تھا۔ [illegible] یہ سب [illegible] کہانی کے حصے تھے [illegible] تھی اور جس دن سے بھیا آئی تھی [illegible] ہو گئی تھی۔ [illegible] جیسے جیتا جاگتا، سانس لیتا ہوا [illegible] گیا تھا۔

[illegible] ایک [illegible] اور وہ صبح ٹھک ٹھک کرکے برآمدے میں بیٹھ کر [illegible] کرتی تھی۔ [illegible] تھا۔ [illegible] ایک [illegible] تھی [illegible] ایک بھی [illegible] تھا۔ [illegible] سے [illegible] جاتے تھے۔

[illegible] کمرے کی کھڑکی [illegible] کرتا تھا۔

" [illegible] "

[illegible]

" [illegible] ٹرک پر [illegible] اور پھر [illegible] "

[illegible] کمرے [illegible] برآمدے کے سامنے [illegible] گیا۔ [illegible] کی محبت ہے۔ "

[illegible] اس کے [illegible] تھا۔

[illegible] کی حفاظت کر رہا تھا۔

[illegible] اب کھیل [illegible] کر رہا تھا۔ [illegible]

[illegible] جس میں [illegible] تھا۔ [illegible] چاندنی [illegible]

[illegible] ٹھک ٹھک کرکے [illegible] میں [illegible] پڑی رہتی تھی [illegible]

نہ سگرٹ دیتا تھا اور کبھی کبھی تو وہ گری پڑی سوتی ہوتی تھی اور کیدار سگرٹ اس کے تکیے پر رکھ کر باہر نکل جاتا تھا۔

پھر ایک روز کیدار کو یہ جان کر بے حد صدمہ ہوا کہ چمپا پیٹ سے تھی اور حالات خاصی نازک صورت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ اسے صرف یہ پتا نہیں تھا کہ اس کا نصف کے کارن اس کی جان ٹوٹ گئی تھی۔ وہ دن اس کا بڑا تلخ گزرا۔ اسے یقین تھا کہ اس گناہ کا مرتکب بازار کا ہر کیدار ہو سکتا تھا۔ لیکن اس کے پاس اس بات کا کیا ثبوت تھا اور اگر ہوتا بھی تو وہ اس کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ یہ سوچ سوچ کر کر چمپا کا کیا حشر ہو گا کیدار پریشان ہو جاتا اور آنے والے حالات کا انتظار کرتا رہا۔ بازار کے دلال اور چمپا کو چھیڑنے والے اسے ستاتے اور تنگ کرتے۔ وہ اس کے طعنے سن کر کھلکھلا کر ہنستے اور قہقہے لگاتے۔ کیدار دیکھتا تو وہ انہیں ڈانٹ بھی دیتا۔ لیکن وہ ہر گھڑی وہاں تھوڑی موجود رہتا تھا۔ لوگ جب بھی موقع پاتا چمپا کو پریشان کرتے اور وہ بے چاری ایک اچھا خاصا مذاق بن کر رہ گئی۔ لیکن اس کے بالوں کی گھٹا میں اب بھی کالی تھیں۔ اس کے ماتھوں کے موتی اب بھی چمکتے تھے اور اس کے حسن کی جاذبیت اب بھی قائم تھی۔

آدھی رات کے قریب کیدار نے چمپا کی چیخوں کی آواز سنی۔ اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر نیچے دیکھا۔ ذرا کھڑکی شہزادی برآمدے میں پڑی بری طرح چیخ رہی تھی۔ کیدار سیڑھیاں اتر کر فوراً اس کے پاس پہنچا۔ اسے سگرٹ دیا لیکن اس نے سگرٹ نہیں لیا صرف سینے پیٹ پر ہاتھ مارتی رہی۔ کیدار نے پاس کے بس سٹینڈ سے ایک رکشا والے کو بلایا۔ چمپا کو بڑی مشکل سے اس میں ڈالا اور راستے فوراً ہسپتال لے گیا۔ وہ تمام رستے چیختی اور چلاتی رہی۔ ایمرجنسی وارڈ میں داخل کرا کر اس نے چمپا کو ڈاکٹر کے سپرد کیا اور خود ہسپتال کے احاطے میں دوسری طرف کے درخت کے نیچے بیٹھا سگرٹ پھونکنے لگا۔ اس نے بیٹھے درخت کے تنے سے ٹیک لگائی اور سوچنے لگا کہ بچہ پیدا ہوا تو اسے سینے سے لگائے گی؟ چمپا کو اتنا ہوش کہاں ہو گا کہ وہ اس کی دیکھ بھال کرے۔ اسے علم تھا کہ کیدار نے اس بے کسی اور لاچار عورت پر جیسے یہ ستم بھی تھا کہ ان سے کہاں لے جاؤں گا۔ اس نے ایک حرامی کو کسی عورت کے دروازے پر دیکھا اس عورت کا کمرہ تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے ہوئے کیدار کے پیچھے چیختی گئی اور اس نے اسے پاگل خانوں جیسی سے ایک دو مار وہ کا دے کر پیچھے چیختی ہوئی چمپا کی نی میں گرا دیا اور اب اس کی ہڈیاں ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئی تھیں اور اس کے جسم کا ایک ایک انگ کٹ گیا تھا۔ کیدار اسی فکر کی باہیں ہو رہا تھا اور سگرٹ پھونکتا رہا اور رات بیتتا وقت دوموں سے گزرتی رہی اور چمپا ایک ننھی منی جان کی خاطر موت سے لڑتی رہی۔ اور پھر پہ جانت کا اجالا کسمسایا اور ایک پریشان تھیز سے باہر نکلتی ہوئی نرس نے بتایا کہ بچہ مردہ پیدا ہوا تھا اور کیدار اپنی آنکھوں سے نرس کے چہرے کو دیکھتا رہا اور اس کی انگلیوں میں تھی سگرٹ سلگتی رہی۔ اور پھر وہ دھیرے دھیرے ہسپتال کے احاطے سے گیٹ کی طرف بڑھا۔ اس کے دل و دماغ پر ایک بوجھ سا تھا اور اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس پاگل اور بے سہارا عورت سے اس کا کوئی گہرا واسطہ اور اس کا رشتہ تھا۔ ایک ایسا تعلق جس کی وہ تشریح نہیں کر سکتا تھا۔ ایک ایسا رشتہ جس کی تفصیل نہ دی جا سکتی تھی جس کا کوئی مذہب نہیں تھا۔ لیکن جو ایک گہرے انسانی جذبے پر مبنی تھا۔ ایک ایسا جذبہ جو انسانوں کو مذہب، وطن، ملک اور نسل کی حدود سے نکال کر ایک دوسرے کے قریب لے آتا ہے۔

چمپا کئی روز ہسپتال میں رہی۔ کیدار صبح شام اسے دیکھنے جاتا۔ جب تک اس کے جسم میں طاقت نہ آئی وہ ان بیتی باتوں میں ہی رہی وہ بستر پر پڑی رہی اور جب اس کے نڈھال جسم میں طاقت آ گئی تو وہ ایک شام ہسپتال سے بھاگ آئی اور ٹھکری طرح دیوانی برآمدے میں پھر سے

[illegible] بچے سے کھانا لگاتے ہوئے باتیں کر رہی تھی۔ جیسے وہ پہلے سے بیٹے کی باتیں سن رہی
ہو۔ [illegible] بہت ساری باتیں ٹھیک طرح سے [illegible]۔ وہ بہت بڑی ہو چکی ہے [illegible] بچے کو اس نے چھوڑا
[illegible] سے کھڑے، ہوا دھر [illegible] وہ خود بھی [illegible]
[illegible] سے پھر ہلکے ہلکے [illegible] اور اس کی آنکھوں میں [illegible]
[illegible] کی آنکھوں میں آنسو [illegible] اس کی چھاتی سے لگ جاتا۔

کیدار اب بھی سگریٹ دیتا۔ دوسرے تیسرے دن ٹھنک کے کھڑے میں دو دو ڈال دیتا اور کبھی کبھی اس کی جھولی میں پھل بھی ڈال دیتا۔ لیکن اب وہ مسکراتی نہیں تھی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہتی اور ایک لفظ تک نہ بولتی۔ جیسے اس کی بولی گم ہو گئی ہو۔ جیسے وہ سکتے میں آ گئی ہو۔
اور دن گزرتے گئے۔

اور پھر ایک صبح کیدار نے دیکھا ایک نوجوان مرد اپنے جسم پر ایک پھٹا ہوا کمبل لپیٹے، بیڑی پیتے ہوئے بازار میں سے گزرتے ہوئے آیا اور ٹھنک ٹھمک کے بتوں سے [illegible] دیوار کے ساتھ پیٹھ ٹیک کر بیٹھ گیا۔ کیدار نے جان لیا کہ پرستش کرنے والوں کی بستی میں ایک اور دیوانہ [illegible] ٹھنک ٹھمک کے بتوں سے [illegible] اور اس کی توجہ کا مرکز بننے کے لئے ایک اور کردار آ گیا تھا۔ اور چپا، جب وہ ٹھنک ٹھمک کی [illegible] کا کرتا تھا، اپنے جنون کی دھجیاں سا سمیٹے جا رہی تھی۔

وہ نیا دیوانہ بڑا بے نیاز قسم کا تھا۔ اس نے کبھی کسی سے کوئی چیز نہ مانگی۔ کبھی کسی دکان کے سامنے کھڑا نہ ہوا۔ کسی دوسرے [illegible]۔ بس اپنے حال میں مست۔ چل رہا ہے تو چلا ہی جا رہا ہے۔ بیٹھا ہے تو گھنٹوں دیوار کے ساتھ پیٹھ ٹیکے بیٹھا رہے گا۔ بیڑی پی رہا ہے تو مسلسل پیتے جا رہا ہے، جب تک کہ بنڈل کا بنڈل ختم نہیں ہو جاتا۔ شہر میں دیوانے تو اور بھی تھے لیکن یہ تو دیوانوں کا بادشاہ تھا۔ بالکل ہی الگ اور انوکھا۔ جس کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اس نے چپا کی طرف بھی دھیان نہ دیا۔ جیسے ٹھنک ٹھمک کے [illegible] سامنے اس کے کسی اور کا دھیان ہی نہ تھا۔ پر جانے کیوں کیدار نے [illegible] دوسرے [illegible] اور اب ایک اور کیدار آ گیا تھا، جو اس سے زیادہ تھا، جو حکم دیتا تھا۔

اور ایک دن کیدار نے صبح سویرے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو چپا اپنے گھٹنوں کو سینے سے چمٹائے سو رہی تھی اور دیوانہ [illegible] کا سامان [illegible] اور [illegible] چپا کو ایک ٹک گھورے چلا جا رہا تھا۔ چپا کا گدرایا ہوا جسم اس کی پھٹی ہوئی قمیض سے باہر جھانک رہا تھا۔ جیسے جھاڑ جھنکاڑ میں چاندنی کی کرنوں [illegible] جھانک رہا ہو۔ دیوانے کی نظریں ان گولائیوں پر گڑی ہوئی تھیں [illegible]۔ جانے کیوں کیدار کو یہ سب اچھا لگا۔ ایک پرستش کرنے والا انسان دوسرے پرستش کرنے والے انسان میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ [illegible] محسوس کرنے لگا تھا۔ ایک مذہب کی [illegible] بننے لگی تھی۔ ایک تعلق کی بنیاد پڑنے جا رہی تھی۔ کیدار کی زندگی کا یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ اس کے جنون کی ایک نئی [illegible] تھی۔ اسے محسوس ہوا جیسے ٹھنک ٹھمک [illegible] اس کے اندر [illegible] کی طرح [illegible] سب زندگی میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ زندگی اپنی خوبصورتیوں، دھجیوں اور صداقتوں سے [illegible] تھی اور [illegible] بھر بھر کر [illegible] رہی تھی۔ پرستش کرتے ہوئے [illegible] پرستش کی نئی صورت

ے گئے ہوتے تھے جو انہیں زندگی کی خوبصورتیوں سے محروم رکھتی ہیں اور ان بیماریوں میں داخل ہو رہے تھے جہاں سے بچپن کے شگفتہ میل
شروع ہوتے ہیں جہاں تتلیوں کی پگڈنڈیاں نکلتی ہیں اور ارمانوں کے شگوفے پھوٹتے ہیں اور تمناؤں کی کلیاں چٹکتی ہیں اور کلپنا کی کہکشاں
جگمگ ہوتی چمک کر شفق سے کرتی ہے اور رات اپنے گیسو کھولے جیسے کے دریچے سے جنتوں سے آتی ہوئی معطر ہواؤں کا
استقبال کرتی ہے۔

اور پھر کیدار کچھ دنوں کے لئے باہر چلا گیا۔

ڈاک گھر کے سامنے کھلتی ہوئی کھڑکی بند ہو گئی۔

اور سامنے کے مکان میں رہنے والی نیاتی کی چیخ دار آواز اور بھی اونچی ہوتی گئی۔

اور جب دس روز کے بعد کیدار واپس لوٹا تو اسٹیشن سے باہر نکلتے ہی اسے چمپا کا خیال آ گیا۔ اور اس کے ساتھ اس
پرانے کا بھی جو ایک بیچ چمپا کو بڑی محبت سے گھور رہا تھا۔ یوں تو گاڑی ٹھیک چار بجے پہنچتی تھی لیکن لیٹ ہونے کے کارن آج
بجے پہنچی تھی۔ کیدار قلی سے سامان اٹھوا کر رکشا میں بیٹھا اور رکشا والے کے پوچھنے پر کہ اسے کس جگہ جانا تھا۔
اس نے جواب دیا۔

"ڈاک گھر کے سامنے۔"

یہ الفاظ کہتے ہی اسے چمپا کا دھیان آیا اور اس کے بھرے بھرے جسم کا اور اس کی وحشی آنکھوں کا اور اس کے ہونٹوں
کا اور اس کے تیکھے ناک کا جسے وہ ہر لمحہ پسینے سے چمکاتے رکھتی تھی۔

رکشا کے پہیے گھوم رہے تھے اور کیدار نئے پرانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جانے کیا کر رہا ہوگا۔ اس وقت وہ سو رہا
رہا ہوگا۔ نہیں، اب تو رات جاگ رہی ہے۔ سویرا ہونے والا تھا۔ نہیں وہ جاگ رہا ہوگا۔ اور بیڑی پی رہا ہوگا اور پرانے کے ساتھ
بیٹھے چمپا کے گدرائے ہوئے بدن کو گھور رہا ہوگا۔ جو اس کی چھوٹی ہوئی قمیص کے دریچوں سے باہر جھانکتے رہتے تھے۔ کیدار نے
جیب سے سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔ وہ روز صبح سویرے سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ پہلا سگریٹ وہ اس وقت پیتا تھا جب چائے کی گرم
پیالی اس کے ہونٹوں کو چھوتی تھی۔ لیکن جب اس کا دماغ سوچ کی بھول بھلیوں میں ہوتا تو وقت کی کوئی تخصیص نہ رہتی۔ سگریٹ
دبی ہونٹ تک تھا۔ چاہے آدھی رات ہو یا صبح کا اجالا۔ اور اب صبح کے ملگجے اجالے میں سگریٹ کا دھواں فضا میں
تحلیل ہو رہا تھا اور رکشا کے پہیے تارکول کی سڑک پر گھوم رہے تھے۔

رکشا رک گئی تھی۔

ڈاک گھر آ گیا تھا۔

کیدار نے رکشا والے کو کرایہ دیا اور اپنا اٹیچی کیس اٹھا کر گلی کی طرف بڑھا۔ [illegible]
[illegible] تھا۔ گلیوں کی چھت پر بھی [illegible] سامنے حرکت کر رہے تھے۔ گلی [illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

چہرے پہ جو غبار سا چڑھا تھا کیونکہ کہ ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ کھیل گئی تھی۔

نئے گھر کی شہزادی ملکہ بن گئی تھی۔

کیا ادا کی ہی جانے کرتا۔ وہ کسی چیز کی طرف کھینچے ہوئے اپنے کیبن میں چلی گئی تھی۔ اس نے دیکھا یہ تو وہ ملکہ تھی جسے چھپا پھرتے اپنے ساتھ چپکائے رکھتی تھی کہ جانے کب [illegible] تھے اس کی [illegible] ادھر ادھر بکھر رہے تھے اور پیار کرتی جیسے اس کی نظر ہی نہ تھی۔ ایک ننھی گڑیا اور پرانا سا تکیہ ہی تو تھا آخر!

ایک ملکہ کا ایسی حقیر چیزوں سے کیا واسطہ!

وہ پل بھر رکتی رہی ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے دیکھتا رہا اور پھر اپنے مکان کی طرف بڑھ گیا۔

ادبی روایت اور ذہنی استعداد

مصنف ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ، ترجمہ: سید افضال حسین نقوی

انگریزی ادب میں ہم شاذ و نادر ہی روایت کے متعلق گفتگو کرتے ہیں۔ گو ہم کبھی کبھی اس نام کا استعمال ضرور کر لیتے ہیں تاکہ اس کی عدم حیثیت پر بحث کر سکیں۔ ہم کسی "خاص ادبی روایت" یا کسی "عام ادبی روایت" کی طرف اشارہ نہیں کرتے۔ زیادہ سے زیادہ ہم اس لفظ کو صفت کی صورت میں کسی شاعر سے منسوب کر کے یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ فلاں شاعر کا کلام "روایتی" ہے اور فلاں شاعر کا کلام "انتہائی روایتی"۔ بہر حال مشکل ہی سے یہ لفظ کبھی استعمال ہو سکتا ہے تاوقتیکہ اسے تحسین معذرت کی صورت میں استعمال نہ کیا جائے اور نہ دوسری کسی صورت میں اس کا استعمال مشکل ہی سے مستحسن قرار پا سکتا ہے کیونکہ یہ اپنے اشارات کے لحاظ سے جس کاوش کو بہتر گردانتا ہے وہ فنی تعمیر کی نئی اور عمدہ تراش خراش سے متعلق ہوتی ہے۔ غرض آپ مشکل ہی سے اس لفظ کو انگریز سامعین سے مانوس کر سکیں گے تاوقتیکہ آپ کی واقعی مستند فنی تعمیر کی طرف دلچسپ رجوع کرانا ہو۔

یقیناً اس لفظ کا تنقیدی حیثیت سے کسی زندہ یا مردہ اہل قلم کے متعلق مستعمل ہونے کا بظاہر امکان نہیں کیونکہ ہر قوم اور ہر نسل کا نہ صرف اپنا تخلیقی دماغ ہوتا ہے بلکہ اس کا اپنا الگ ایک تنقیدی مذاق بھی ہوتا ہے اور یہ دماغ اپنی تخلیقی استعداد کے مقابل اپنی تنقیدی جبلت کی کوتاہیوں اور قیود سے بے خبر رہتا ہے۔ ہم فرانس کے ضخیم تنقیدی سرمایہ سے جس سے اس کی زبان پر ہے اس کے تنقیدی انداز اور جبلت کا پتہ پاتے ہیں اور ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہماری بے کسی مسلم ہے اور فرانسیسی ہمارے مقابلے میں زیادہ "تنقیدی" مذاق رکھتے ہیں۔ حالانکہ کبھی کبھی ہم پر یہ حقیقت بھی منکشف ہوتی ہے کہ فرانسیسی ہمارے مقابلے میں کم ہی اصل ہیں۔ ممکن ہے فرانسیسی ایسے ہی ہوں لیکن ہمیں اپنے آپ کو یہ ضرور یاد دلانا چاہیے کہ تنقید اتنی ہی ضروری اور بدیہی چیز ہے جتنا کہ کسی ذی روح کے لیے سانس کی آمد و شد۔ چنانچہ ہمیں کسی چیز کے پڑھتے وقت اس کے محسوسات اور ادراک کے اور جذباتیت سے متاثر ہونے میں قباحت نہیں محسوس ہونی چاہیے کیونکہ [illegible] ہیں ہم اپنے قلب و ذہن کو کسی تنقیدی کاوش پر مزید تنقید کرنے کے قابل بناتے ہیں۔ اس انداز فکر کی روشنی میں جو حقائق ہمارے سامنے ظہور میں آتے ہیں ان میں ایک یہ بات پائی جاتی ہے کہ [illegible] کسی شاعر کی تعریف کرتے ہیں اور اس کی شاعری کا امتیاز نمایاں کرتے ہیں جس کی رو سے شاعر کے [illegible] یقیناً ایسے ہی [illegible] کا اظہار ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں جبکہ [illegible] کسی شاعر یا مصنف کے کسی خاص انداز یا رنگ کی طرف [illegible] کرتے ہیں کہ معلوم کریں کہ اس میں کیا انفرادیت [illegible]

... کسی شاعر کی اپنے ان حصوں کی تعریف کرتے ہیں جن میں وہ دوسروں سے مختلف ...
... اس کا شاعرانہ کردار بہت مختلف ہے۔ ہم اس بات سے بڑا خوش ہوتے ہیں کہ کسی شاعر میں کوئی ایسی چیز تلاش کر لیں جو الگ
... ہو سکے۔ مگر ہم اس طرح بلا تعصب کے سے کسی شاعر پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف
... حصے شاید بہترین ہیں بلکہ وہ حصے بھی جن میں اس کے اجداد شعرا ... ہیں ...
... منفرد مقامات پر جانے ... حاصل کر چکے ہیں۔ میری کا اس نظریے سے مراد کسی نو عمر ... پختگی کے دور سے نہیں بلکہ اس دور سے
... ہو چکی ہو۔

تاہم اگر ادبی روایت صرف گزری ہوئی نسلوں کی کامیابیوں کی اندھی تقلید یا کورانہ پاسداری کا نام ہے تو یقیناً ایسی روایت
... کی حوصلہ شکنی کی جانی چاہیے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ روایت کے ایسے دھارے بہت جلد ریت میں جذب ہو کر گم ہو گئے۔ چنانچہ جدت
... ایک تواتر سے کہیں بہتر ہوتی ہے۔ ادبی روایت ایک بڑی اہمیت کی چیز ہے۔ یہ وراثتاً حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کے
حصول میں بڑی کاوش کرنی پڑتی ہے۔ ادبی روایت کے ضمن میں تاریخی شعور سب سے پہلے ابھرتا ہے جس سے تقریباً ہر
اس شخص کے لیے لازمی ہے جسے پچیس سال کی عمر سے زیادہ بحیثیت شاعر اپنا وجود منوانا ہو۔ یہ تاریخی شعور ایک ایسی حس
کا نام ہے جو ... صرف ماضی کی ماضیت ہی نہیں بلکہ اس کی موجودگی پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ یہ تاریخی شعور ایک آدمی کو نہ صرف
اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ محض اپنی نسل کے متعلق لکھے جو اس کی ہڈیوں میں رچی بسی ہے بلکہ اس احساس کے ساتھ لکھے کہ
یورپ کا پورا ادب جو ہومر (Homer) سے شروع ہوتا ہے جس میں خود اس کے اپنے ملک کا ادب ایک متوازی
حیثیت رکھتا ہے ایک ہی مسلسل ضابطہ ہے۔ یہ تاریخی شعور جو لازمانی بھی ہے اور وقتی بھی نیز یہ شعور جو دونوں کی یکجا
باہمی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ یہی شعور ایک شاعر کو روایتی بنا دیتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایک اہل قلم کو اس کے اپنے دور
اور اپنے مقام سے متعلق ... صاحب شعور اور ذکی الحس بناتا ہے۔

کسی شاعر یا کسی فنکار کی کوئی علیحدہ مکمل حیثیت اور معنی نہیں ہوتے۔ اس کی اہمیت اور اچھائی دراصل اس کے پیش
رو ... کی پسندیدگی میں مضمر ہے جو اسے اپنے مرحوم شاعروں اور فنکاروں سے ہوتی ہے۔ آپ اسے اس کی واحد حیثیت
کی بنا پر نہیں دیکھتے۔ آپ کو اس کی انفرادی حیثیت واضح کرنی پڑتی ہے اگر آپ اس کا تقابل پچھلے لوگوں سے کر سکیں۔
یہ میری رائے میں تاریخی اصول تنقید ہی نہیں بلکہ جمالیاتی اصول تنقید بھی ہے۔ جو ایسے کسی نئی کاوش کے جنم لینے میں جب دیگر
... فن پاروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جیسے انہیں پریشانیوں سے پچھلی تصنیفوں اور کاوشوں کو بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ موجودہ
... نے فن پارے خود ایک آئیڈیل ضابطہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان میں نئی کاوشوں سے رد و بدل کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ ضابطہ
اس وقت تک مکمل رہتا ہے جب تک کہ کوئی نئی تصنیف وجود میں نہیں آتی کیونکہ کسی نئی اور ... چیز کی آمد پر پورا نظام
... بے قرار ... مشکل ہو جاتا ہے ... اس کا تجربہ ... کہ اس ... میں تبدیلی رد و بدل اور ایک دوسرے سے ...
... میں ہم آہنگی ... آتی ہے۔ یہی وہ قربت ہے جو نئے اور پرانے نظام میں پائی جاتی ہے۔ جو شخص بھی اس نظام ...

رہتا ہے اور انگریزی یا یورپی ادب کو بھی اسی طرز پر مسلسل قرار دیتا ہے وہ اس امر کو ضروری خیال کرتا ہے کہ ماضی کو حال سے بدل دیا جائے لیکن یہ تبدیلی اسی حد تک ہونی چاہیے جس حد تک ماضی نے حال کو متاثر کیا ہے۔ جو شاعر اس حقیقت سے آشنا ہے وہ یقیناً بہت سے مصائب اور بہت سی ذمہ داریوں سے بھی کما حقہٗ واقفیت رکھتا ہے۔

ایک مخصوص خیال کے مطابق اس کی اس امر سے بھی آگاہی ضروری ہے کہ اسے ماضی کے معیاروں پر جانچا اور پرکھا جانا چاہیے۔ میں نے اپنے مدعا کے اظہار کے لیے جانچنے اور پرکھنے کا لفظ استعمال کیا ہے نہ کہ ایسا لفظ جس سے توڑ پھوڑ کے معنی مستفاد کیے جا سکیں۔ تاہم اول تو یہ تنقید اتنی اچھی یا اتنی بری نہیں ہونی چاہیے کہ ہر دو شقیں کیفیت کا شکار ہو کر رہ جائیں اور دوم یہ تنقید حتمی طور سے پہلے ہی نقادوں کے معیاروں پر نہیں ہونی چاہیے۔ یہ فیصلہ بھی ہے اور تقابل بھی جس سے دو چیزوں کو ناپا جا سکتا ہے۔ محض مطابقت کے معنی نئی تصنیف کے لیے یہ ہوں گے کہ مطلق حق مطابقت ادا نہیں ہوا، اور یہ کاوش نئی ہرگز نہ متصور ہوگی اور ادب کا شہ پارہ نہ قرار پا سکے گی۔ ہم پوری طرح نہیں کہہ سکتے کہ نئی تصنیف فقط اس لیے بہتر ہے کہ حالات سے مطابقت کرتی ہے اگرچہ مطابقت اس کی اہمیت کے لیے امتحان ضرور ہے۔ یہ امتحان حقیقتاً تبدیلی اور سوچ بچار کر کے کرنا چاہیے کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی شخص مطابقت کے لیے ایسے حکم کی حیثیت نہیں رکھتا جس سے غلطی سرزد ہونے کا امکان نہ ہو یا جسے ہم معصوم کہہ سکیں۔ ہم کہنے کو تو کہہ سکتے ہیں کہ کوئی کاوش بظاہر حالات سے مطابقت کرتی ہے یا منفرد ہے یا بظاہر منفرد نظر آتی ہے اور اس کا امکان رکھتی ہے کہ مطابقت کرے لیکن ہم بمشکل ہی طور سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس کے متعلق ہم کچھ کہہ رہے ہیں وہ حقیقتاً وہی ہے کوئی اور دوسری چیز نہیں۔

مزید ذہنی خواص کے لیے اگر کچھ بڑھا جائے تو اس بات کو ضرور خاطر رکھنا ہوگا کہ ایک شاعر کا اس کے ماضی سے کیا تعلق ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ نہ تو وہ اپنے ماضی کو ایک بے مصرف ڈھیر سمجھتا ہے اور نہ ہی اپنے ماضی کو ہر روگ کے لیے تریاق سمجھتا ہے۔ نہ وہ ایک آدھ ذاتی اور انفرادی تعریف سے اپنے آپ کو کلی طور سے ہم آہنگ کر لیتا ہے اور نہ ہی وہ کسی خاص دور سے اپنے آپ کو کلی طور سے متعلق کرتا ہے۔ پہلا طریقہ کار نامناسب ہے دوسرا شباب کا تجربہ ہے اور تیسرا ایک عمدہ اور پسندیدہ ضمیمہ ہے۔ شاعر کو ادب کے خاص دھاروں اور رجحانات کا علم ہونا چاہیے لیکن یہ لازمی طور پر رجحانات کا ضروری نہیں کہ شہرت ہی صحیح و مبدا ہو۔ اسے سمجھنا چاہیے کہ ادب کا معیار کبھی بلند نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ادب کا مواد کبھی ایک سا نہیں رہتا۔ اس کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یورپ کا دماغ یا اس کے اپنے ملک کا دماغ یا ایسا دماغ جس کے متعلق معلوم ہو کہ وہ ذاتی اور انفرادی ذہانت سے بالا ہے، تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ یہ تبدیلی ترقی کے مترادف ہے لیکن یہ ترقی درمیانی چیزوں کو کالعدم قرار نہیں دیتی شیکسپیئر (Shakespeare) یا ہومر (Homer) یا مگڈالینین خاکوں (Magdalenian draughtsmen) کو کوئی چیز منسوخ نہیں کر سکتی۔ یہ ترقی یہ تھا۔ یا ایک معنوں میں ذہنی الجھاؤ کسی فنکار کے نقطۂ نظر سے ترقی کے مساوی نہیں اور نہ ہمارے معیار کے مطابق یہ ترقی کہلانے کی مستحق ہے شاید ماہر نفسیات ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ترقی مشینوں اور اقتصادی الجھاؤ کا نتیجہ ہے۔ ماضی اور حال کا یہ فرق ہمارا احساس

اندر بیدار ہوتی ہے [illegible]۔ یہ بات اس حد تک صحیح ہے کہ اس کو کتابوں یا دفتروں کا اہل نہیں بنایا جا سکتا۔
کسی شخص کا قول ہے۔

"مردہ قلم کار ہم سے بہت پیچھے ہیں کیونکہ ہم ان سے بہت زیادہ جانتے ہیں۔"

ٹھیک ہے، وہ ماضی کے شعرا ہی ہیں جن کو ہم جانتے ہیں۔

میں اس عام اعتراض سے واقف ہوں جو میرے اس حصے پر وارد ہوتا ہے جو فن شاعری کے متعلق ہے اور یہ ہے کہ علم کا بوجھ ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ یہ نظریہ ہے کہ شاعر کو بے اندازہ تبحر علم کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جو ہر دور کے شاعروں کی حیات کی روشنی میں رد کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بہت زیادہ علم کی بہتات شاعری کو ختم کر دیتی ہے۔ تاہم اس یقین پر ہم جمے ہیں کہ ایک شاعر کو کم از کم اس حد تک ضرور جاننا چاہیے جو اس کی ضروریات شعر میں آڑے نہ آئے اور مناسب کسب میں حد سے تجاوز نہ ہو اور ذہنی کاہلی کا شکار نہ ہونے دے۔ یہ مناسب نہیں ہے کہ علم کو اس حد تک محدود کر دیا جائے کہ وہ صرف فائدہ مند شکلوں ہی میں تبدیل کیا جا سکے۔ مثال کے طور پر جس کا امتحان لیا جا سکے یا جسے ڈرائنگ روم کی زینت بنایا جا سکے یا جسے خود تشہیر کا ذریعہ بنایا جا سکے۔ بہت سے لوگ علم کو جذب و کسب کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ بہت سے جاہل علم کے لیے پسینہ پسینہ ہو جاتے ہیں۔ شیکسپیئر ([illegible]) نے پلوٹارک ([illegible]) سے اُن لوگوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ضروری تاریخی مواد حاصل کیا ہے جنھوں نے پوری برٹش میوزیم سے استفادہ کرنے کی کوشش کی ہے — اب یہاں جس چیز پر زور دینے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ شاعر اس امر کی صلاحیت رکھتا ہو جس سے وہ ماضی کی آگاہی حاصل کر سکے اور ماضی کو کما حقہٗ تفصیل سے پیش کر سکے۔ یہ صلاحیت اس کی اپنی پوری ادبی زندگی میں جاری و ساری رہنی چاہیے۔

ہوتا یہ ہے کہ ایک فنکار کو اپنی ذات مسلسل طور سے اعلیٰ قدروں کے حوالے کرنی پڑتی ہے۔ ایک فنکار کی کامیابی اور ترقی کا انحصار اس کی اپنی مسلسل قربانی اور شخصیت کی موت پر منحصر ہے۔

اب باقی یہ رہ جاتا ہے کہ اس عمل کی تعریف کی جائے جس کی رو سے شخصیت کی نفی حاصل ہو سکے اور اس عدم شخصیت کا ادبی روایت کے تصور سے تعلق بتایا جا سکے۔ اسی عدم شخصیت کی رو سے ادب اور فن سائنس کے درجے تک پہنچ جاتا ہے۔ میں اس سلسلہ میں دعوت فکر دیتا ہوں کہ ذیل کی مثال کی روشنی میں آپ غور فرمائیں اور کسی نتیجہ پر پہنچیں کہ آیا اس کیمیائی عمل کا کیا ردعمل ہوگا جب ہم ایک پلاٹینم کے عمدہ تار کو ایک ایسے خانے سے گزاریں جس میں آکسیجن اور سلفر ڈائی آکسائیڈ دونوں موجود ہوں۔

(۲)

حقیقی دیانت دارانہ تنقید اور تعریف کا رخ شاعری کی طرف ہوتا ہے نہ کہ شاعر۔ اگر ہم اخباری نقادوں کے بے ہنگم شور اور عوامی خیالات کے پہلے شور میں عام تواتر پر غور کرتے ہیں تو ہمیں شاعروں کے بھاری تعداد میں نام ملتے ہیں جیسے

مریم جب (یہ) مینیکی مرکز کی اشاعت پر ہم دو سکتے ہیں کہ شاعری سے حظ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہم شکل ہی سے [illegible]
گئے ہیں جس کا یہیں ذکر ہے۔ میں نے اس امر کی کوشش کی ہے کہ اس چیز کو بیان کیا جائے کہ ایک نظم کا دوسرے مختلف
مادوں کی تکون سے کیا رشتہ اور تعلق ہے نیز شاعری کا ایسا تصور پیش کیا ہے کہ وہ مثالی تمام شاعری کو جو کبھی بھی لکھی گئی ہو
اصل میں ایک زندہ کل ہے۔ دوسرا رخ اس نظریہ غیر شخصی شاعری کا ہے یعنی نظم کا اس کے مصنف شاعر سے کیا تعلق ہے۔
ہے ایک تمثیل کی مدد سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ پختہ دماغ شاعر غیر پختہ دماغ شاعر سے نہ صرف شخصی حیثیت سے
مختلف ہوتا ہے جو کسی بے حاصل کو چہ سپند ہو نہ ہو بلکہ اپنی کمل مصنف کی حیثیت میں منفرد ہوتا ہے جو ہر قسم کے احساسات
و خیالات کو نئے انداز میں ترجمانی کر سکے۔ یہ تمثیل ترکیب کیمیاوی ہے کہ اس تجربے سے ظاہر ہے جب کہ متذکرہ بالا گیسیں ایکسپلاٹینم
کی موجودگی میں ملتی ہیں تو تیزابِ سلفیورس کی تشکیل ہو جاتی ہے۔ یہ مرکب اسی وقت ظہور میں آتا ہے جب
پلاٹینم موجود ہو تاہم یہ نیا تیزاب پلاٹینم کا کوئی جزو نہیں رکھتا اور نہ ہی بظاہر اس عمل سے پلاٹینم متاثر ہوتا ہے۔
درحقیقت پلاٹینم ساکن، غیر متعلق اور ناقابلِ تبدیل رہتا ہے۔ شاعر کا دماغ پلاٹینم کے ٹکڑے سے مشابہ ہے۔ یہ جزوی یا خصوصی طور
سے کسی شخص کے اپنے تجربہ پر منحصر ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ جتنا زیادہ پختہ فن کار ہوگا اتنا ہی اس میں زیادہ شدت سے الگ الگ
اس کے اندر کا انسان جو کام کر رہا ہے اور اس کا اپنا دماغ ہوگا جو تخلیق کرتا ہے۔ غرض اسی شدت سے اس کا عمل دماغ جذبات
و احساسات جو اس کے علاوہ ہیں تحلیل بھی کر سکے گا اور ان کی ترسیل بھی کر سکے گا۔ اسی تجربے کی روشنی میں آپ دیکھیں گے کہ غیر متوقع تبدیلی
لانے والی شے (شاعر کا دماغ) کی موجودگی میں جو دو عناصر داخل ہوتے ہیں وہ اصل میں جذبات اور احساسات ہیں۔ کوئی
شخص جو کسی ادبی یا فنی تخلیق کو دیکھ کر حظ حاصل کرتا ہے وہ اس تاثر سے بالکل مختلف ہوتا ہے جو وہ غیر ادبی شے سے ہر ممکن صورت
میں حاصل کر سکتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کسی واحد جذبہ کا اثر ہو یا مختلف جذبات کا حاصل ہو۔ یہ مختلف احساسات جو کسی مصنف کو خاص
الفاظ یا محاوروں یا پیرایوں کی صورت میں شاعر ادا کرتے ہیں دراصل کسی تخلیق کو کمال تک پہنچانے میں ممد و معاون
ثابت ہوتے ہیں۔ بہتر سے بہتر شاعری بغیر جذبات کے استعمال کیے ہوئے صرف احساسات کی مدد سے ظہور میں آ سکتی ہے۔
مثلاً ([illegible]) کے پندرھویں کینٹو (بروٹیو لاٹینی) میں جذبات ثانوی کا عمل دخل ہے جیسا کہ اس کی ہم آہنگی
ظاہر ہوتی ہے۔ اس کا اثر گو کہ تنہا اور واضح ہے جیسا کہ کسی دوسرے ادبی شاہکار کا ہو سکتا ہے۔ حقیقت میں ہیئت کامل کی
ہوئی تفصیل کا نتیجہ ہے۔ آخری بند ایک ایسا تصور پیش کرتا ہے جو نہ صرف خود بخود ظہور میں آتا ہے اور کچھ متعلقات کی مدد سے
کے بڑھتا ہے بلکہ شاعر کے دماغ میں غیر یقینی صورت میں بیٹھا رہتا ہے جب تک کہ ایک مناسب ترکیب اضافہ کے لیے
داخل نہیں ہو جاتا۔ . . . . شاعر کا دماغ
دراصل بے شمار احساسات، محاورات اور تصورات کے لیے اکتساب اور ترسیل کا ایک ذخیرہ ہے جہاں یہ اس وقت تک جمع رہتے

---

* Brunetto Latini

ہیں تاوقتیکہ وہ تمام ذرات جو مل کر ایک نیا مرکب بنا سکتے ہیں ایک جگہ جمع نہ ہو جائیں۔
اگر آپ بڑی اعلیٰ شاعری کے مختلف اقتباسات کا ایک دوسرے سے موازنہ کریں تو آپ دیکھیں گے
کہ شاعری کس قدر وسیع اور مختلف قسم کے امتزاجات کا مجموعہ ہے اور کہ نیم اخلاقی معیار اس نقطہ نظر سے کس حد تک بھٹکنے
سے کام رہ جاتا ہے کیونکہ "بڑائی" جذبات کی شدت سے نہیں بلکہ فنی عمل اور اعلیٰ دباؤ کی شدت کا تجربہ ہے جو تحلیل شدہ
دماغ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ پاؤلو (Paolo) اور فرانسسکا (Francesca)
کا قصہ ایک خاص جذبہ کی عکاسی کرتا ہے لیکن شاعری میں شدت اصل میں ایک چیز ہوتی ہے اور اس تجربے سے قطعاً
الگ ہے جو کسی شے سے متاثر ہو کر حاصل کیا جاتا ہے اور اس کی شدت اس درجہ نہیں ہے جتنی کہ کینٹو چھبیس
(یولیسس کے سفر) میں ہے جس میں جذبات کو براہ راست مرکزیت حاصل نہیں ہے۔ جذبات کی مختلف شکلیں
بننے کے بعد شاعری میں مختلف تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ اگامیمنن (Agamemnon) کا قتل یا اوتھیلو (Othello)
کی پریشانی ایک ایسا فنی اثر پیدا کرتے ہیں جو بظاہر ممکنہ اصل سے اچھا پن پیش کرتے ہیں جو کہ ڈانٹے (Dante)
کے اقتباسات زیادہ جذبات کے حامل ہیں۔ اگامیمنن میں فنی جذبہ اور کا اثر حقیقی تماشائی کے لیے جذبے کا قریب ترین ہے۔ اوتھیلو میں
یہ جذبہ خود ہیرو کے جذبات کی حد تک ہوتا ہے۔ آرٹ اور واقعہ کا فرق ہمیشہ لازمی ہے۔ اگامیمنن کے قتل میں ایسا اجتماع اتنا ہی پیچیدہ ہے جتنا کہ یولیسس
کے سفر میں ہے اور دونوں صورتوں میں عناصر کا پگھلنے والا ایک عمل ہے۔ کیٹس (Keats) کی
اوڈ ٹو نائٹنگیل بہت سے قسم کے احساسات کا مرقع ہے جن کا عنادل کی ذات سے کوئی تعلق نہیں لیکن جو غالباً ایک
حد تک اس کے نام کی کشش کی وجہ سے اور کسی حد تک اپنی شہرت کے باعث اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ
یکجا ہو سکیں۔

میں جس نظریہ پر حملہ کرنا چاہتا ہوں وہ دراصل روح کی اکائی کا مابعد الطبیعاتی نظریہ ہے۔ میرا مقصد یہ
کہ شاعر کے پاس اظہار کے لیے اپنی "شخصیت" نہیں بلکہ ایک خاص ذریعہ (میڈیم) ہے جو کہ فقط ذریعہ ہوتا ہے شخصیت
نہیں جس میں تجربات اور تاثرات انوکھے طور سے متحد ہو جاتے ہیں۔ تاثرات اور تجربات جو انسان کے لیے اہم حیثیت
رکھتے ہیں شاعری میں ان کا کوئی مقام نہیں ہوتا اور جو تاثرات شاعری میں کچھ اہمیت حاصل کر لیتے ہیں وہ انسان اور انسانی
شخصیت کے لیے غیر اہم ہو سکتے ہیں۔

میں ایک نظم کا اقتباس پیش کرتا ہوں جو اس کے لیے غیر مانوس ہے تاکہ ان مندرجہ بالا خیالات کی روشنی
میں نئی توجیہہ حاصل ہو سکے: ―

میں سوچتا ہوں کیوں نہ اپنی ذات کو ملامت کروں
کہ ہائے اس کے حسن کا پرستار رہا
جس کی موت کے متعلق ہم سوچتے ہیں کہ اس کا شدید انتقام لیا جائے گا

کیا یہ ریشم کا کیڑا تیری خاطر اپنی سنہری محنت طویل کرتا ہے؟
کیا مرغ تیرے لیے وہ موت کے منہ میں جانا پسند کرتا ہے؟
کیا صاحبِ مقدرت اپنی بیگمات کی پل بھر کی خوشی کے لیے اپنے گنج لٹاتے ہیں؟
کیوں وہ شخص صراطِ مستقیم سے بھٹکتا ہے،
اور اپنی زندگی قاضی کے تجسس سب کے حوالے کرتا ہے،
(کیا اس لیے کہ وہ) اپنے نظریات کو جلا دے سکے،
اور نوبت و نقارہ رکھ کر اپنی بہادری کا ڈھنڈورا پیٹ سکے۔

یہ اقتباس (جیسا کہ سیاق و سباق سے ظاہر ہے) منفی اور مثبت جذبات کا مجموعہ ہے جس میں ایک طرف تو حسن کے لیے ایک شدید اور مجبور قسم کی کشش ہے اور دوسری طرف اتنی شدت سے دوسروں کی طرف رغبت بھی ہے جو پہلے کا اثر نہ صرف متضاد ہے بلکہ پہلے کا اثر ضائع بھی کر دیتی ہے۔ یہی متضاد جذبات کا بیلنس ڈرامائی پوزیشن کی جان ہے جس کے لیے زبان خاص اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن صرف پوزیشن ہی اس کے لیے کافی نہیں۔ یہ دراصل ایک ترتیبی اور ترکیبی جذبہ ہے جسے زبان مہیا کرتی ہے۔ لیکن یہ کلی تاثر اور مکمل لہجہ بے شمار تبدیل در محسوسات کا تجربہ ہے جو ایسے جذبات سے یک گونہ مناسبت رکھتا ہے جو بظاہر نظر نہیں آتا لیکن دراصل یہی جذبہ دوسرے اجزا سے مل ملا کر ایک نئے "ادبی جذبہ" کی تخلیق کرتا ہے۔

کوئی شاعر اپنے ذاتی جذبات یا اپنی زندگی کے خاص واقعات کی وجہ سے ممتاز اور پسندیدہ شاعر نہیں کیا جاتا [illegible] خاص جذبات سادے سادے خام اور سپاٹ ہو سکتے ہیں۔ لیکن شاعری میں یہی جذبہ انتہائی پیچیدہ اور الجھے ہوئے [illegible] بات یہ ہے کہ اس [illegible] جذبہ پیچیدہ بھی نہیں جیسے عام لوگ اپنی زندگی میں غیر معمولی اور الجھے ہوئے جذبات رکھتے ہیں [illegible] ایک شاعرانہ مذاق اور غلطی ہے کہ شاعری میں نئے انسانی جذبات کی تلاش کی راہیں ڈھونڈ نکالیں اور پھر طرہ یہ ہے کہ [illegible] پر اس جدت کی تلاش کی جائے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تمام فن کے اظہار پر ختم ہوتا ہے۔ شاعر کا کام یہ نہیں ہے کہ نئے جذبات [illegible] بلکہ اس کا کام عام جذبات کی شاعری اور ان کا استعمال ہے۔ انہیں محسوسات کا اظہار کرنا ہے جو حقیقی جذبات [illegible] رکھتا [illegible] ایسے ہی جذبات کا شاعرانہ استعمال کرتا ہے جن کا اسے بذاتِ خود تجربہ نہ ہو۔ [illegible] مقصد [illegible] کا قوی امکان ہے۔ چنانچہ ہمیں بار بار کہا گیا ہے کہ جذبات کا سکون کی حالت میں [illegible] کی صورت [illegible] شعری [illegible] ہوتی باتیں [illegible] ہے جب تک سوز کی صورت اور ہیئت میں تبدیلی نہ کی جائے [illegible] کیفیت [illegible] کیفیت [illegible] اس کے تجربہ کے [illegible] روشنی میں [illegible] ہیں جیسے ایک ہوشیار اور باعمل انسان تجربات کا درجہ نہیں دیتا۔ [illegible] نہیں ہوتی [illegible]

ان تجربات [illegible] جن کی بات کی جا سکتی ہے [illegible] تجربات کا [illegible]
[illegible] کا حال ہے۔ [illegible]
[illegible] ہے۔ حقیقت میں خوب شاعری وہی ہے جہاں [illegible] جذبہ [illegible]
اس میں [illegible] کا ثبوت [illegible] جہاں اس سے پہلے جذبہ زیادہ [illegible] ہے۔ دونوں خیال اس کے [illegible] شخصی
[illegible] شاعری [illegible] جذبات [illegible] ہے۔ یہ شخصیت کے اظہار
نہیں [illegible] ہے۔ [illegible] شخصیت اور جذبات دونوں کے [illegible]
ہیں کہ [illegible] دونوں چیزوں سے گریز [illegible] ممکن ہے۔

(۳)

دماغ ایسا عکس ہے [illegible] کا حامل ہے اور اپنی جگہ ایک غیر متاثر حیثیت رکھتا
ہے: (ارسطو۔ ڈی۔ اینما۔ باب چہارم)*

اس [illegible] قریب ہو کر جانا چاہیے۔ اس [illegible]
چاہیے [illegible] شاعری میں [illegible] شاعر [illegible] شاعری کی طرف [illegible]
قابل [illegible] ہے کیونکہ یہ [illegible] اس کی ماہیت [illegible] اور [illegible] حقیقی شاعری [illegible]
[illegible] ہیں جو نظم میں پُرخلوص اظہار [illegible] سے دیکھتے ہیں۔ کم ایسے ہیں جو فنی مہارت کو
[illegible] جذبہ [illegible] اظہار [illegible] جس کی حیات کے نشان
[illegible] شاعر [illegible] نہیں [illegible]۔ شاعر اپنی شخصیت کی اس وقت تک [illegible] حاصل نہیں
کر سکتا [illegible] کو [illegible] اور نہ ہی اس وقت تک
[illegible] اپنے دور میں [illegible] کو بھی [illegible] کے
[illegible] باتوں کا [illegible] نہیں [illegible] حقیقتوں کا [illegible] ہے۔

---

* Aristotle, De Anima, Chap III

چہار شنبہ مبارک

(ابتدائیہ)

شاعر: ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ مترجم: سید فیضی

میں باتوں کی طرف لوٹ کے جانے کی مجھے،
اب نہیں خواہش کوئی!
اب کوئی امید نہیں
اب نہیں خواہش کوئی!
اب یہ خواہش بھی نہیں ہے
کہ کسی کا مجھے الطافِ فراواں مل جائے،
یہ تمنا بھی نہیں ہے کہ مجھے
غیر کی قدرِ فراواں مل جائے
میں اب ان چیزوں کی خاطر
کسی کوشش کے لیے بھی تو نہیں ہوں کوشاں
سال خوردہ پر جو شاہیں
تو پرواز کو پر کس کے لیے پھیلائے!
عہدِ رفتہ کی گئی تاب و تواں
ماتمی کیوں مجھے اپنا سمجھائے

(۲)

میرا اب ساعتِ رفتہ کے فنا یاب قبل سے
نہ ملنا ہوگا!

اور وہ میرے خیالوں میں بھی اب
بار نہیں پا سکتی
اور میں جان گیا ہوں
کہ یہ بس رفتہ تجلی کی نمائش کو اب
پھر سے نہ جانوں گا کبھی،
اب میں سایۂ گل میں اب جو
بہرہ کش زیست نہیں ہو سکتا

(۳)

اور میں جان گیا ہوں کہ
زماں تو ہے سدا سے قائم!
اور میں جان گیا ہوں کہ
تعلق جنھیں کہتے ہیں وہ اک خاص زماں
خاص مکاں کے ہیں فقط زندانی!
سو میں اس سے ہی خوش ہوں
کہ یہ مادی اشیاء تو یہی ہے اگر جو ہے!!
اب کسی چہرۂ شاداب
شگفتہ ہوئی آواز:

سے کیا ہے
اسی ادا کے سے میں خوش ہوں
کہ میں اپنی خوشی کے لیے
بنیاد اٹھا سکتا ہوں
اور ــــ اللہ سے دعا کرتا ہوں
کہتا ہوں ــــ کہ
اے میرے خدا
مجھ کو ہر چیز بھلا دینے کی توفیق عطا کر دے
کہ میں ــــ
خود سے،
ہر اک بحث کے الجھاوے سے،
ہر اک بات کی تفصیل سے
آزاد رہوں؛
وہ ــ کہ جو ہو چکا
اب پھر تو نہیں ہو سکتا!
واپس رفتہ کی طرف
میرا پلٹنا بھی نہیں ہو سکتا!!
یہ دعا ہے ــــ
کہ ترا وصل ہمیں
تیری عنایت ہی سے دوچار کرے
یہ پر و بال کہاں ــــ
اب پر پرواز نہیں،

یہ پر و بال ــــ
بھلا ہی کر سکتے ہیں!
یہ تھکا ماندہ ہوا
خشک ہوا!!
میرے دل سے بھی تنگ آیا ہوا،
خشک ہوا!!

اے خدا!
ہم کو یہ توفیق عطا کر دے
کہ ہم فکر کریں،
غم نہ کریں،
اور سکون اور تسلی کے پیکر بن جائیں!

ہم گنہگاروں کی خاطر،
کر دو کچھ اب بھی دعا!
اور
دمِ آخر بھی دعا!!
ہم گنہگاروں کی خاطر کر دو،
کچھ اب بھی دعا!
اور ــــ
دمِ آخر بھی دعا!

آگ اور اندھیرا

عذرا بخاری

زندگی گویا ضمانت کا ایک ایسا مستقل طوق بن کر گلے میں لٹک گئی تھی جیسے اس کی رہائی کہیں ممکن ہو۔ نہ اتارے بنے نہ رہنے بنے۔ عجب مصیبت تھی۔

کمرے کی فضا سخت بیزار کن اور بوجھل ہوگئی تھی۔ فرخندہ اکثر کھڑکی کے قریب کہنیاں ٹکائے اس کے بند کواڑوں کو گھورتی رہتی۔ اور جب اسے شعوری طور پر یقین ہو جاتا کہ کھڑکی بند اور مقفل ہے تو اسے اچانک کمرہ پہلے سے زیادہ تنگ اور گھٹا گھٹا محسوس ہونے لگتا۔ تب اس کا جی چاہتا کہ بند کواڑ اور تنگ ہوتی دیواروں کے ساتھ سر پھوڑ کر مر جائے۔ مگر اسی وقت اسے محسوس ہوتا کہ آپا اپنی سرخ آنکھوں سے گھورنے کے ساتھ ساتھ اندر جھانک رہی ہیں۔ سردی کی ایک لہر اس کی رگوں میں دوڑ جاتی۔ وہ پھر مڑ مڑ کر دروازے کی طرف دیکھتی رہتی۔ اور جب اسے یقین ہو جاتا کہ دروازے میں کوئی شخص موجود نہیں۔ تو وہ ایک گھورتی سی نظر کمرے کے چاروں طرف ڈالتی۔

بشریٰ کی چارپائی اب بھی کھڑکی کے قریب جوں کی توں پڑی تھی۔ اسے یاد تھا سب سے پہلے پہل وہ اس گھر میں آکر رہے تھے تو بشریٰ نے کیسے جبر سے اس سے یہ جگہ چھینی تھی۔ لیکن اب بشریٰ کے چلے جانے کے بعد بھی وہ بشریٰ کی چارپائی کو وہاں سے ہٹا دینے کی ہمت نہیں کر سکی تھی۔ وہ خوفزدہ تھی کہیں کوئی اسے بشریٰ جیسا نہ سمجھنے لگے۔ وہ بشریٰ نہیں تھی۔ فرخندہ تھی۔ سر سے پیر تک فرخندہ اپنی اس ہلکی پھلکی شخصیت کو سنبھالنے پہ بضد۔ سردی کی ٹھٹھری اور برسات کی حبس راتوں میں بھی وہ پچھلے اس کونے میں سوتی، جہاں ہوا اور روشنی کا گزر تک نہ تھا اور بشریٰ کی چارپائی اسی اکڑ اور ڈھٹائی کے ساتھ وہاں پڑی تھی۔ ابا اماں کو بھی اسے وہاں سے ہٹا دینے کا خیال نہیں آیا تھا۔ بستر کی چادر پڑے پڑے میلی ہوگئی تھی۔ کئی بار اس کا جی چاہا کہ وہ اسے [illegible] مگر کیوں نہیں جاتا۔ لیکن پھر وہ چپ رہی۔ اور بھی تو بہت سی ایسی باتیں تھیں جن کے بارے میں وہ چپ تھی۔

مسز بشریٰ کی وہ تصویر جو ایک پرانی فریم کے فریم میں جڑی میز پر رکھی تھی۔ [illegible] خیالات کی عکاس تھی۔ کمرے کی واحد میز کہ اس نے صرف اپنی تصویر رکھنے کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ حالانکہ اس میز پر فرخندہ کا بھی بشریٰ جتنا ہی حق تھا۔ لیکن اب بشریٰ کے جانے کے بعد بھی اس کی تصویر میز پر پہلے کی طرح قبضہ جمائے تھی۔ [illegible] صرف اتنا تھا کہ ایک دن [illegible] کمرے کا جائزہ لیا سوچ کر بیٹھے ہوئے اس تصویر کو الٹ کر دیا تھا اور بس۔ فرخندہ کو تصویر میں بشریٰ کے بے نیاز چہرے پر پھیلی ہوئی استہزائیہ مسکراہٹ نفرت دلاتی تھی۔ اس تصویر کے علاوہ ایک [illegible] بھی بشریٰ کی ملکیت میں تھا۔ اس چھت میں [illegible] نہایت [illegible]

حکایتیں اور [illegible] رسالے خریدا کرتی تھیں جن میں سے [illegible]
کہانیاں اور [illegible] بشریٰ نے وہ بڑی ہی نہایت چاؤ ہی سے اٹھایا تھا۔ سو جب وہ ایک سستے [illegible]
سلسلے میں منہ بنا رہے تھے خریدتے ہی تھے۔ حکایات اور خاص طور پر قسم کی کتابوں کے ساتھ وہ رسالے بھی تھے۔ سامنے آ [illegible]
اشتہار ہوتے تھے جو ان رسالوں میں۔ اماں کو جتنی چڑ تھی ایسی کتابوں اور رسالوں سے، اتنا ہی بشریٰ انہیں ٹھونس ٹھونس کر ایک بیگ میں رکھتی
صندوقچے سے لگ کر رکھتی۔ اماں کو سب معلوم تھا، مگر بشریٰ کا پیار جیسے قفل بن کر اس کے ہونٹوں پر لگ گیا تھا۔

بس وہ کبھی کبھی ابا سے دبی زبان میں ذکر کر دیتیں۔

"یہ بشریٰ کتابیں خریدنے کو اتنے پیسے کہاں سے لیتی ہے؟"

"میں کیا جانوں۔ جیب خرچ سے ہی لیتی ہوگی۔" اماں بچاری ابا کے بے جا لاڈ پیار سے ہی جلتی تھی۔

"کچھ خود سر ہو گئی ہے۔" ابا کا لہجہ اور دھیما ہو جاتا۔

"پیار میں بگڑتی ہی ہے۔ ضرورت ہی کبھی سنا دیکھا۔" اماں جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے جاتیں۔

"آپ ہی ٹھیک ہو جائے گی۔ ابھی بچپنا ہے نا۔" ابا بات کے سنجیدہ پہلو کو بچانے کی کوشش کرتے تو اماں تڑخ کر جواب دیتیں

"بچپنا تو اس کا ساری عمر جائے گا۔ بیسویں لگتی ہیں۔ ابا گھر سے گھر بیٹھے۔ بڑی بڑھاپے ہو گئے۔ مگر آپ کو فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"بس ہٹو۔ بیوقوف۔ جاہل۔ کچھ سوچتی ہی نہیں بکے چلی جاتی ہے۔" ابا کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو جاتیں۔ ان کی کڑک کے آگے اماں کی کیا ہستی۔ مگر وہ پھر بھی خاموش نہ ہوتیں۔

"تو ہے جانے ہو آج کل شادی کے نام سے اتنی چڑ اور نفرت کیوں ہے۔ لڑکیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں۔ یہ کوئی گھر رکھنے کی چیز تھوڑی ہیں۔"

"اب تم جان کو آ جاتی ہو۔ تو جاؤ کیا ہو۔ کسی دیوار سے اپنا سر پھوڑ کر مر جاؤں کہ لڑکی کو کسی کنویں میں دھکیل دوں۔ کچھ مل بیٹھے کوئی مناسب رشتہ ہو تو بات بھی کروں۔"

ابا جیسے تھک ہار کر جواب دیتے۔

"رشتہ تو ڈھونڈنے ہی سے ملے گا۔" اماں کہتیں۔

"خود بخود کون آ جاتا ہے۔ سب پیسے کے پیر ہیں۔ ہم غریبوں کو تو خدا بھی ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔"

"تو پھر تم اپنے جیسا گھر ڈھونڈ ڈالو، پڑھا لکھا ہو۔ بات پکی کر چھوڑیں، اگلے سال شادی ہو جائے۔"

"اوہ، تم سے تو بات کرنا مصیبت مول لینا ہے۔ ایک دفعہ کہہ دیا، ہو جائے گا سب کچھ۔ اب کچھ نہ بولنا۔" ابا کے سر پر بچہ دیکھ کر اماں کا جوش بھی ٹھنڈا پڑ جاتا۔ دونوں خاموش ہو جاتے۔

اور فرزانہ سوچتی رہ جاتی۔ واقعی ابا کو شادی کے نام سے اتنی چڑ کیوں ہے۔ دو سال بیت گئے۔ اماں کی ہر کوشش ناکام

کی سردمہری کے آگے پانی کا بلبلہ ثابت ہوئیں۔ بشریٰ ایک دفعہ بی اے میں فیل ہو کر پھر اس کی تیاری میں مشغول تھی۔ اب اس نے ماں کی ان کوششوں میں دلچسپی لینا بالکل چھوڑ دیا تھا۔

اب اس سلسلے میں کوئی عورت ان کے ہاں آتی اور اماں اسے اندر جانے کو کہتیں تو وہ فوراً رکھائی سے جواب دیتی۔

"فرخندہ کو دکھا دیجئے۔ میں نہیں جاؤں گی۔"

"کیوں؟" اماں تیکھی ہو کر پوچھتیں۔

"میں فی الحال شادی نہیں کرنا چاہتی۔" بشریٰ فیصلہ کن لہجے میں جواب دیتی۔ "بی اے کر کے میرا ارادہ سروس کرنے کا ہے۔"

اماں بے چاری عجب مصیبت میں پھنس گئی تھی۔ ایک طرف ابا اس کے کاموں میں روڑے اٹکا رہے تھے۔ دوسری طرف صاحبزادی اکڑ بیٹھی تھیں۔

ابا بشریٰ کی باتیں سنتے اور چپ رہتے۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ ابا کو بشریٰ پہلے سے زیادہ عزیز ہو گئی تھی۔ بشریٰ بشریٰ کرتے ان کا منہ سوکھتا۔ باہر سے جب بھی آتے بشریٰ کے لئے ضرور کچھ لاتے۔ یوں لگتا تھا جیسے بشریٰ کے ارادوں سے ابا خوش تھے۔

لیکن یہ تو صرف فرخندہ کو معلوم تھا کہ بشریٰ کے ارادے کیا تھے۔ دو سال کے اس ناٹک نے جواب اور اماں اس کی شادی کے بارے میں کھیلتے رہے آخر اب اس کے اندر کوئی نئے جذبے کو بیدار کر دیا تھا۔ اور اب وہ کیوں اس بات میں دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔

وہ بشریٰ کی رازداں نہ ہوتے ہوئے بھی اس کی رازداں تھی۔ دوسرے حالات کی طرح بشریٰ نے یہاں بھی دانشمندی سے کام لیا تھا اور صرف ایک فیصلے کا اس کی خواہش اور رائے کا خیال کئے بغیر اپنے طور پر طے کیا تھا۔

راستہ چلتے ہوئے جب وہ اچانک اس سے کہتی "فرخندہ آج میں گھر دیر سے آؤں گی اماں سے کہہ دینا۔ ذرا ان کلاس کا کوئی فنکشن ہے۔" تو فرخندہ کچھ جواب نہ دیتی لیکن گھر پہنچ کر اماں کے استفسار پر چپکے سے بشریٰ کے الفاظ دہرا دیتی۔

اماں سن کر چپ کی چپ رہ جاتیں۔ ابا کے آنے سے پہلے ہی ایک نئے پیلے اور شیلا ہو جاتا۔ جلن ہے وہ سنبھل کر کہتے "اور میں یہی تو مصیبت ہے۔ آئے دن کوئی نہ کوئی فنکشن۔ پڑھائی کم اور فنکشن زیادہ۔ تم بھی فرخندہ اس کے ساتھ رک جاتیں۔ اب وہ کیلی آئے گی۔ اچھا میں جا کر لے آؤں گا۔" اور فرخندہ ایک دم گھبرا کے کہتی "وہ عرفانہ والی سب ہی لڑکیاں ہیں۔ وہ ان کے ساتھ آ جائے گی ان کے ساتھ۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔"

ابا کے گرتے وجود کو جیسے سہارا مل جاتا۔

"کسی دن سر پہ ہاتھ رکھ کر روؤ گے۔" اماں کڑھتے ہوئے کہتیں۔

"تم تو ذرا بھی کچھ نہیں ہو۔" ابا کو اس بات سے بڑی چڑ تھی کہ ان کی بیوی ہر بات میں بدگمانی سے کام لیتی ہے۔ تم تو خواہ مخواہ بیٹی پر شک کرتی ہو۔ بشریٰ نے آج تک کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اپنا راز داں بنا لیا ہے۔

تب وہ اپنے چھوٹے سے کمرے میں آ جاتی۔ یہ کمرہ اس کا اور بشریٰ کا مشترکہ تھا۔ پچھلے کئی سال سے دونوں بہنیں یہیں رہتی تھیں۔

کھلا کر وہ بیٹھے بیٹھے میں جاگتی۔ یہی گردن مانند بگلوں کی ایک قطار پہ پھر پھر آئی اور کا کر [illegible] میں اتر جاتی۔ وہ سوچتی
اس وقت بشریٰ اخلاق کے ساتھ کسی سینما ہاؤس میں بیٹھی فلم دیکھ رہی ہوگی۔ اخلاق سے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ حالانکہ اس نے اسے دور
سے دیکھا تھا اور وہ بھی چند ایک بار۔ لیکن اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اس کے بارے میں سب کچھ جان چکی ہے۔

اسے افسوس تھا کہ بشریٰ اخلاق کو نہیں پرکھ سکی تھی۔ لیکن وہ خود اکثر سوچتی رہتی۔ بشریٰ کے پاس جو اونچے اور خوبصورت خواب
ہیں اخلاق ان کی تعبیر نہیں بن سکتا۔ بشریٰ اس چھوٹے سے گھٹے ہوئے ماحول سے نکل کر کھلی فضا میں پرواز کرنا چاہتی ہے۔ اسے [illegible]
سے بھرپور [illegible] زندگی چاہیے۔ اسے اجالوں سے محبت ہے۔ اس کے خواب بہت خوبصورت اور بہت قیمتی ہیں
اخلاق انہیں پورا نہیں کر سکتا۔ کئی بار اس کا جی چاہتا کہ بشریٰ کو سمجھائے۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ بشریٰ ایک تحقیر آمیز تبسم کے ساتھ اسے
خاموش کر دے گی۔ بشریٰ بہت زیادہ جذباتی تھی اور اخلاق کے بارے میں تو وہ انتہائی شدت پسند ثابت ہو رہی تھی۔ وہ
خاموش رہی اور اسی خاموشی میں وہ [illegible] جیسا کہ بات ذکر نہ [illegible] اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔

[illegible] گھڑی نے چھوٹے سے [illegible] بج رہے تھے۔ اور وہ [illegible] کا چھوٹا سا [illegible]
سے [illegible] جا رہی تھی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ سامنے سیڑھیوں کا کمرہ
[illegible] کے ایک [illegible] نظر آ رہا تھا۔ اور ابھی ابھی بشریٰ [illegible] جانے والے واقعوں کی قطاروں کے
درمیان [illegible] ایک [illegible] پرچھائیں [illegible] تھی۔ بشریٰ کو تو اجالوں سے پیار تھا۔ پھر وہ کیوں
[illegible] تاریکی میں اتر گئی تھی [illegible] پا سکے [illegible] وہ کانپ کر رہ گئے جا رہی تھی اور اس جیسی
ہستی میں [illegible] کے ساتھ [illegible] بشریٰ نے اس کی مرضی کے خلاف اس پر اعتماد کر کے اسے ایک بڑی الجھن میں ڈال
دیا تھا۔ وہ [illegible] آپ کو ایک مجرم [illegible] رہی تھی۔ [illegible] سب کچھ اس سے چھپ کر کیوں نہیں کیا۔ ایک بار دل [illegible]
وہ بشریٰ [illegible] سے۔ اور [illegible] کی کوشش کرے۔ مگر پھر اس کی [illegible] آ گئی [illegible]
کھڑی رہی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کے بستر [illegible]

[illegible]

بشریٰ آ گئی۔ [illegible]

[illegible]

[illegible] رہی۔

صبح ماں نے اسے آواز دی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ ایک پراسرار سی افسردگی طاری تھی اور دل و دماغ بوجھل ہو رہے تھے۔ ماں نے ابا کو جگانے اور بشریٰ کو اوپر سے بلانے کا کہہ کر کچن میں چلی گئی تھی۔ اور وہ حیرت میں ڈوبی اپنی چارپائی پر بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ ابا کو تو وہ جگا دے گی مگر بشریٰ کو وہ کہاں سے لائے گی۔ بشریٰ تو وہم کی طرح ہر جگہ تھی بھی اور نہیں بھی تھی۔ ماں کی دوسری آواز پر وہ مجبوراً اٹھی اور کوٹھے کی سیڑھیوں پر زور سے پاؤں مارتی اوپر گئی اور سیڑھیاں طے کرتے ہوئے اس نے بڑی مشکل سے دعا مانگی: "اے خدا بشریٰ اوپر ہو۔" لیکن بشریٰ اوپر نہیں تھی۔ وہ آہستگی سے نیچے اتری۔

"بشریٰ اوپر نہیں ہے۔" ماں کو یہ اطلاع دیتے وقت اسے آواز کو حلق سے کھینچ کر نکالنا پڑا۔

"اوپر نہیں ہے؟" ماں کے ہاتھ سے کیتلی چھوٹ کر زمین پر آ رہی۔

"غسل خانے میں دیکھو۔" اور پھر اسے غسل خانے کے علاوہ گھر کا کونہ کونہ دیکھنا پڑا۔ لیکن [illegible] کو وہ گھر کے کسی کونے سے نہ پکڑ سکی۔ تب ماں سر میں خاک ڈالتی [illegible] صحن میں [illegible] زمین پر کٹے ہوئے درخت کی طرح گر پڑی۔ ابا اچانک سوتے سے جاگ پڑے۔ انہوں نے [illegible] آنکھوں سے ماں کی طرف دیکھا [illegible] پھر گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔

"یہ ہیں کیا ہوا تمہیں؟" پھر انہوں نے روتی ہوئی فرخندہ کی طرف دیکھا پھر [illegible] کر سوال کیا "بشریٰ کہاں ہے؟" یہ سوال اس طرح کیا گیا تھا۔ جیسے خطرے کی اس گھنٹی وہ بہت پہلے کی دیکھ چکے ہوں۔

بشریٰ کے جانے کے بعد گھر کی فضا یکسر بدل گئی تھی۔ گھر پر ہر وقت ایک سوگوار سا چھایا رہتا [illegible] گھر میں سایوں کی طرح چلتے پھرتے [illegible] اور خاموش [illegible] کسی معاملے میں ایک دوسرے سے متفق [illegible] آنکھوں میں [illegible] دور کے نقشے پڑھنے لگے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ایک دوسرے کو کوئی [illegible] دینا چاہتے ہیں [illegible] مگر پھر وہ خاموشی کے غار میں رہ جاتے ہیں۔ اور فرخندہ سوچتی [illegible] جڑیں نکل جائیں تو گھر کی گرد فضا میں شاید کوئی خوشگوار تبدیلی آ جائے [illegible]

ایک دن فرخندہ کو کالج سے آنے میں دیر ہو گئی۔ جب وہ گھر لوٹی تو ابا اور [illegible] بیٹھے ہی تابڑ توڑ لہجے میں پوچھا "اتنی دیر کہاں رہی؟"

"بس بگڑ گئی تھی۔" یہ مختصر سا جواب دے کر وہ جلدی سے کمرے میں آ گئی [illegible] تھا۔ اور سب سے زیادہ تو اسے یہ بات ناگوار گزر رہی تھی [illegible] غائب ہو گئی تھیں [illegible] کی نمایاں ظاہر کر رہی تھی کہ وہ کس طرح اس معاشرے میں [illegible]

تھوڑی ہی دیر بعد ابا کمرے میں آ گئے۔ انہوں نے [illegible]

"[illegible] گھٹ کر رہ گیا۔ [illegible]

[illegible]

بعد وہ مہروں بیٹھی رہا کرتی تھی [illegible]

ذرا دیر کر کے کہ ایک دم ہی کی آنکھیں [illegible] مطلب کے [illegible] درمیان [illegible] ہو جاتے [illegible]

پھولوں کو ڈال کر اس کے پاس بیٹھنا شروع کر دیا۔ وہ گھبرا کر [illegible] یا کسی [illegible] پوچھ جاتی تو [illegible] کسی بہانے وہاں سے

ٹل جاتی [illegible] وہ بشریٰ نہیں تھی، پھر بھی [illegible] بشریٰ کہا جا رہا [illegible] محسوس کرتی تھی۔ بعض

مقامات پر یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی اسے بشریٰ ہو جانے پر اکسا رہا ہے [illegible] بشریٰ بن جانے [illegible] پھر وہ ان خیالات کو

اپنے ذہن سے جھٹک دیتی، بھلا کیسے ہو سکتا ہے [illegible] اور بشریٰ [illegible] زمین آسمان کا فرق ہے [illegible] تب

[illegible] کو دیکھ کر [illegible] بشریٰ کے لئے نفرت محسوس کرتی۔ [illegible]

[illegible] کئی بار اسے بشریٰ پر غصہ بھی آتا [illegible] اس کے کئے کی [illegible] بھگت رہی تھی [illegible]

[illegible] کے چاروں [illegible] اس پر [illegible] تھے۔

بابا سائیکل پر [illegible] چھوڑنے جاتے، پھر سائیکل پر ہی [illegible] سے واپس آتی [illegible]

اس سے غیر مطمئن رہتے ہیں اور وہ ان کا [illegible] دیکھ کر [illegible] جا رہی تھی۔ اور اس کی [illegible] ہوتی جا رہی تھی۔

کبھی کبھی [illegible] وقت کوئی راہ [illegible] سائیکل کے نیچے [illegible] گھور گھور کر [illegible] دیکھتے

تو اس کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگتے۔ [illegible] یوں لگتا جیسے [illegible] قریب [illegible] کا تصور [illegible] ہیں۔ [illegible]

ہو جاتے تو وہ بالکل [illegible] ہو جاتی۔ بعض اوقات تو اسے محسوس ہوتا جیسے اسے [illegible] کیا جا رہا ہے۔ [illegible] کہا جا رہا ہے کہ وہ

بھی بشریٰ ہے اور اسے اپنے جرم کا اقرار کر لینا چاہئے۔ بعض اوقات تو یہ احساس اتنا شدید ہوتا کہ اسے یوں لگتا جیسے کوئی طاقت

[illegible] صاف صاف کہہ دے گی [illegible] نفرت ہے [illegible]

[illegible] کے ساتھ بھاگ جانے کا [illegible] ارادہ کر لیا ہے۔ [illegible] کام آتی اور وہ یکدم ہڑبڑا کر

[illegible] سنبھال لیتی۔

شروع شروع میں [illegible] اس کے ذہنی توازن کو [illegible] مفلوج بنائے دے رہے [illegible] لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ ان حالات

[illegible] ہو گئی۔ جب کبھی وہ ملنے والوں سے کوئی فرمائش کرتی [illegible] سے جواب ہی دیتیں۔ بس [illegible] فرمائش پوری کرنے کا [illegible]

[illegible] ایک کے بعد [illegible] کر کے دیکھ لیا۔ [illegible] باتیں اسے ناگوار گزرتیں۔ [illegible]

بشریٰ کے برابر کھڑا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

[illegible] سستی [illegible] دن رات گزرنے لگے۔ [illegible] ایک [illegible] بعد اس [illegible] خاموش [illegible] فضا [illegible]

[illegible] محسوس کی۔

اس دن [illegible] تھیں اور بابا [illegible] سائیکل [illegible] کہیں غائب ہو گئے تھے۔ ———— شام کو جب

وہ ٹسٹ کراتے کرتے اماں غصے کے گھونٹ پیتے ہوئے ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ کھانا نکالتے نکالتے وہ یکدم برس پڑیں۔

"کہاں چلے گئے تھے آپ؟" انہوں نے کیا بیر کی طرح پوچھا۔

"کیوں کیا کوئی ضروری کام تھا؟" ابا نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"کہا جو تقاضے کر کر کے تھک گئی ہوں، آپ کہیں نہ جائیں" اماں نے جل کر جواب دیا۔

"عورتوں سے میرا کیا کام؟" ابا بھولے بن رہے تھے۔

"عقلمند کے لئے اشارہ کافی ہوتا ہے اور بے وقوف منہ کے بل گر کر بھی ہوشیار نہیں ہوتا۔" اماں نے استعارہ استعمال کیا۔ ابا یکدم بھڑک اٹھے "پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہو۔ سیدھی طرح بتاؤ کیا کہنا چاہتی ہو۔"

"میں کیا کہوں گی۔ دنیا کہتی ہے کہ اس آدمی نے آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے۔ لیکن اتنا یاد رکھو زخندہ کو میں اس کنوئیں میں گرنے دوں گی۔ اور تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔"

"اپنی اولاد کا برا کون چاہتا ہے۔ تم سے زیادہ مجھے فکر ہے۔ مگر پیسہ کہاں سے آئے گا؟" "رشتے ہو جاتے تو پیسے کا بھی انتظام کر لیں گے۔ ہماری کون سی دس اولادیں بیٹھی ہیں۔ ایک اکیلی لڑکی کو بھی بیاہ نہیں سکتے۔" ابا خاموش ہو رہے لیکن اس کے بعد ابا اماں کے درمیان اکثر جھگڑے ہونے لگیں اور وہ سمجھ گئی۔ آج سے دو سال پہلے کا ناٹک دہرایا جا رہا ہے۔ وہ اپنے اسی چھوٹے سے بند کھڑکی والے کمرے میں بیٹھی سب کچھ دیکھتی اور سنتی رہی۔ نئے نئے لوگ آتے اور اسے [illegible] کی طرح دکھایا جاتا۔ پھر بھاؤ تاؤ ہوتا اور آخر میں تان ابا پر ٹوٹتی جو ایسے موقعوں پر کہیں غائب ہو جاتے۔ اسے نہ ابا پر غصہ تھا نہ اماں سے شکایت۔ وہ بشریٰ نہیں تھی زخندہ تھی۔ ایک خاموش تماشائی۔

اور پھر ایسا ہوا کہ اماں کی دو سال کی کوششیں رنگ لائیں۔ اس کی منگنی ہو گئی۔ [illegible] خوب صورت جوان تھا جس کی گھر میں ذاتی کوٹھی تھی اور شاندار نوکری تھی۔ زخندہ کی قسمت پر ہر کسی کو رشک آ رہا تھا [illegible] ہی چاہیے۔ ابا جو اب تک سرد مہری کا اظہار کرنے والے ہوتے تھے، شادی کے دن کو قریب آتا دیکھ کر وہ بھی [illegible] ہونے۔ چیزوں کی خرید و فروخت میں جو صبح گھر سے نکلتے تو شام ہی کو واپس آتے۔ اماں نے سو [illegible] اپنی بساط سے بڑھ کر جہیز تیار کر لیا تھا۔ صبح سے شام تک [illegible] کی گرد میں کھو جاتی۔ تھک کر بیٹھتے [illegible] ہانپنے لگتے یا پھر جیسے پڑے ہی ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگتے۔ ان دو چار مہینوں میں جیسے وہ [illegible] ہو گئے تھے۔ چہرے کے بال سفید ہو گئے تھے، اور سر کے بال چندیا کے کناروں پر تھے وہ بھی سفید ہو گئے تھے۔ [illegible] کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ گردن کا گوشت ڈھلک گیا تھا۔ جیسے کسی نے [illegible]

ابا کیا کیا [illegible] زخندہ جب بھی کچھ سوچتی اسے بشریٰ یاد آتی اور وہ [illegible] خود محسوس کرتی۔ پانچ سال سے اس گھر نے کسی سے [illegible] تھا۔ [illegible] محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی تک اس گھر پر بشریٰ کا تسلط قائم ہے۔ وہ جا کر بھی [illegible] پانچ سال سے [illegible]

بالکل ہی وہ ... کمرے میں ماں سے بات بیٹھ کی تھی اور کوئی بھی بات ان کے کمرے میں ہوتی رہتی تھی۔
اماں جب ان کے بیڈ کی چادر تبدیل کرتیں تو ان کے چہرے سے خاموشی اور پھیکا پن ہوتا۔ یہ سب باتیں زخشندہ کے لئے بھی عجیب تھیں۔ وہ اس گھر میں تنہا جیتے ہوئے بھی اپنے آپ کو بشریٰ کے سامنے بے بس اور مجبور محسوس کرتی۔ شادی کے اس عرصے میں ابھی تک اس کا کوئی ذکر نہیں آیا تھا۔ پھر ایک دن ماں نے یہ بات چھیڑ ہی دی۔

"شادی یا بشریٰ کو نہیں بلاؤ گے؟" ماں نے چاولوں کا چھان پھٹک کرتے ہوئے بات چھیڑی۔

بابا نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے سے پل بھر کے لئے چمک سی آئی۔ لیکن پھر فوراً ہی ان کا چہرہ کسی چیز کی طرح بے جان اور بے حس ہو گیا۔ وہ فوراً وہاں سے اٹھ کر کمرے کے اندر چلے گئے۔

زخشندہ کچن میں کھانا تیار کر رہی تھی۔ کام چھوڑ کر وہ بہانے سے کمرے کے سامنے سے گزری۔ بابا سوکھا ڈھانچہ کرسی پر ڈھیر تھا اور وہ سامنے کی دیوار کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی انگلیوں میں پھنسا ہوا سگریٹ دھوئیں کے ساتھ سلگ رہا تھا۔

ملازمت سے سبکدوش ہو جانے کے بعد بابا کے روزمرہ کے معمولات میں بڑی یکسانیت آگئی تھی۔ صبح سویرے اٹھنا، بازار سے ضروری اشیاء مثلاً دودھ دہی، سبزی گوشت وغیرہ لانا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر لمبی تان کر سو جانا۔ یا اپنا پرانا کرتا پاجامہ پہن کر سائیکل لے کر باہر نکل جانا۔ شام کو کسی دکان پر جا بیٹھنا اور رات گئے تک بیٹھے گپ شپ میں مشغول رہنا اور رات کا کھانا کھا کر سو جانا۔

جب سے بشریٰ گئی تھی وہ زیادہ سے زیادہ اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتے۔ جیسے وہ بشریٰ کے خیال سے ڈر گئے ہوں۔ اور یہ حقیقت تھی کہ انہوں نے کبھی بشریٰ کے متعلق سوچا نہ تھا۔ بشریٰ ان کے دل کے بند کواڑوں کے پاس پانچ سال سے کھڑی سسک رہی تھی۔

ماں نے ذکر چھیڑا تو اچانک انہیں محسوس ہوا جیسے بند کواڑ خود بخود کھل گئے ہیں اور بشریٰ بے دھڑک اندر آگئی ہے۔ اب جب وہ اپنی سوچوں سے چونکتے انہیں یہ جان کر صدمہ سا ہوتا کہ ان کی سوچ کا مرکز سوائے بشریٰ کے اور کچھ نہ تھا۔ بشریٰ ان کی سوچوں میں جیسے دھنستی جا رہی تھی۔ کسی اژدہے کی طرح یا پتھر کے بت کی طرح جو ہونے نہ ہونے کے بیچ نکالے نہ نکلے۔

یہ نہیں کہ ایسا ہوتا جا رہا تھا۔ ان کا وہ غرور، وہ شان وہ اونچی ناک کہیں خاک میں ملتی جا رہی تھی۔ لیکن بشریٰ کو ذہن سے نکال دینا ان کے اختیار میں نہ رہا تھا۔ ان کے دل پر پڑی مضبوط گرہیں خود بخود کھلتی جا رہی تھیں۔

بازار میں یا پارک میں کھیلتے ہوئے ننھے بچوں کو دیکھتے تو انہیں اچانک محسوس ہوتا، جیسے ان کے دائیں ہاتھ کی گرفت میں کسی نرم نرم اور جیتی جاگتی چیز ہی ہے۔ چلتے چلتے وہ بے دھیانی میں رک جاتے۔ اور جب وہ چونکتے تو کسی بھی دوست یا شناسا کی دکان پر کھڑے ہوتے۔

"کیا چاہیئے بھائی صاحب؟" دکاندار کا سوال انہیں چونکا دیتا۔ وہ جھک کر اپنے دائیں بائیں یوں دیکھتے جیسے ان کا کچھ کھو گیا ہو۔ ٹھیک اسی وقت کوئی ان کے کان کے پاس تالی بجا کر دور بھاگ جاتا، چھپ جاتا، کہیں گم ہو جاتا۔

"صاحب کا کچھ کھو گیا ہے؟" دکاندار کی دوسری تمسخر آمیز آواز انہیں بالکل پریشان کر دیتی۔

"تم — ہاں — ہاں — نہیں نہیں کچھ نہیں کھویا، کچھ بھی تو نہیں کھویا" وہ تیز قدموں سے چلتے ہوئے جاتے بالکل نزدیک پہنچ کر وہ پھر ٹھٹک جاتے۔ فٹ پاتھ پر اب بھی فوٹو گرافر اپنا اڈہ جمائے تھے۔ پس منظر کے لئے کالے نقشین پردے تان کر کرسیاں بچھاتے۔ کیمرے رکھے وہ گاہکوں کے انتظار میں سگرٹ پھونکتے رہتے

"یہاں بیٹھ جاؤ بشریٰ!" کندھوں سے اچکا کر وہ بشریٰ کو کرسی پر بٹھا دیتے۔

"تم بھی پھر ہو جاؤ نیرون فوٹو" وہ کیمرہ مین سے کہتے۔

"ایسی تصویر اتارو کہ جناب کی طبیعت خوش ہو جائے" کیمرہ مین پیچھے پیچھے دانت نکوسے کیمرہ فٹ کرنے لگتا۔

"صاحب تصویر کھنچوائیں گے" وہ چونک پڑتے [illegible] کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ فوٹو گرافر کو کیا جواب دیں۔ پھر وہ احمقانہ انداز میں سر کو جھٹکتے "نہیں بھئی اب کون سی عمر رہ گئی ہے تصویر کھنچوانے کی۔ بس یوں ہی ذرا دیکھنے کو ادھر آگیا تھا۔"

"کوئی بات نہیں" فوٹو گرافر سڑک کے کنارے کھڑا ہو کر سگرٹ پھونکتا [illegible] وہ کبھی مڑ کر [illegible] ایک بار کو دیکھتے ہوئے یوں چلتے جیسے پیچھے سے انہیں کوئی دھکیل رہا ہو۔

گھر میں بھی عجب مصیبت ہو گئی تھی۔ بہت سی چیزوں نے ایکدم سامنے آ آ کر انہیں ستانا شروع کر دیا تھا۔ بشریٰ کی الٹی پڑی ہوئی تصویر، کتابوں اور رسالوں سے لبالب بھرا ہوا بکس اور بہت سی چیزیں جنہیں دیکھ کر انہیں بشریٰ یاد آ جاتی۔

بشریٰ کا خیال انہیں آتا رہا اور وہ بشریٰ کے اس اقدام کے اسباب و نتائج پر غور کرتے رہے اور اس کے بعد اپنے اور بشریٰ کے تعلق کا موازنہ کرتے رہے۔ ان کا قصور کیا تھا۔ لیکن ان کا تو قصور کچھ نہ تھا بشریٰ ہی [illegible] وہ اس کے لئے بہت کچھ کرنا چاہتے تھے مگر وہ جلد باز تھی۔ وہ نفسیات کی چند کتابیں پڑھ کر اپنے آپ کو [illegible] سمجھنے لگی تھی

ایک دن دوپہر کو کمرہ بند کر کے انہوں نے [illegible] تھی۔ کسی نام کسی القاب کے بغیر لکھا تھا۔

"آج جب مجھے اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ میں اس گھر میں کبھی [illegible] مجھے ہمیشہ [illegible] ہے۔ میں اپنے باپ کی [illegible] محبت کی۔ لیکن مجھے افسوس ہے [illegible] ہو گئی۔ وہ میری زندگی [illegible] جا رہی ہوں۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]



لاتعلقات بنے ہاتھ میں ... کی طرح وہ گھنٹوں ایک ہی جگہ پر بیٹھے رہتے تھے۔ ملاقات کے کمرے میں کسی کے سوچنے سمجھنے یا حرکت کرنے کی تمام قوتوں کو سلب کر لیا تھا۔ اور جب بچے اور مشرق کی گھنٹی میں ملپ ... آئی تو انہوں نے پہلی بار یہ محسوس کیا کہ ان کے دل میں بشریٰ کے لئے نفرت اور غصے کے سوا کچھ نہیں رہا۔

لیکن اس دن جب انہوں نے وہ پرچہ نکال کر پڑھا تو انہیں بشریٰ پر ذرہ برابر بھی غصہ آیا نہ صدمہ پہنچا۔ انہیں بشریٰ چھوٹی سی معصوم سی اور بھولی بچی نظر آئی جس نے محض اپنی ضد اور خود سری میں اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا اور اب وہ پچھتا رہی تھی۔ ان سے ناراض ہو کر اور صد ... کرنے میں شرم دلاتے چند لفظوں سے ان کا اعتقاد کر سکی تھی کہ ... آئی اور اس کو ستا لیں ... ان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

"پگلی نہیں تو وہ آ ہی جائے گی۔"

مگر جب یہی بات انہوں نے ماں سے کہنے کی کوشش کی تو منہ کا حلق خشک ہو گیا۔ اور ہونٹ سکڑ گئے۔ اور انہوں نے اپنی اونچی خاندانی ناک میں ایک جھنجھلاہٹ محسوس کی۔ بھلا وہ یہ بات اس طرح کھلم کھلا کس طرح کر سکتے ہیں۔ وہ انتظار میں رہے شاید ماں خود یہ ذکر چھیڑیں تو وہ مسرور ہو کر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیں۔ لیکن ماں خاموش تھیں۔

تو یہی سلسلے وار گھر میں جمع ہوتے رہے تھے۔ اور فرخندہ خاموشی سے گھر میں چلتے پھرتے یا بند کھڑکی والے کمرے میں چپ چاپ بیٹھے حیرت سے ان کی طرف دیکھتی رہتی۔ تایا ابا کو دیکھتی ہوئی ویران اور خالی آنکھوں میں اچانک کسی کا انتظار آ بسا تھا۔ وہ اجاڑ ... سی آنکھیں گھر کے کونے کونے میں کسی کو تلاش کرتی رہتی تھیں۔ لیکن ماں خاموش تھیں۔ ... رشتہ داروں میں سے بھی کسی نے بشریٰ کے متعلق کوئی بات نہیں کی تھی۔ تایا ابا اداس اور منتظر تھے اور فرخندہ حیران تھی۔

شادی میں دو ایک دن ہی رہ گئے تھے کہ ایک دن ماں نے فرخندہ سے کہا۔

"اے بیٹی یہ اپنے کمرے کو ذرا ٹھیک تو کر لے۔ جو بھی کاٹھ کباڑ اندر ٹھنسا ہے۔ باہر نکال دے۔ بیٹھنے کو کوئی ستھری جگہ تو ہو۔" ماں کی بات سن کر ایک لمحے کے لئے فرخندہ ٹھٹک گئی۔ اسے بشریٰ کی چیزوں کو وہاں سے ہٹاتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ دیر کشمکش و پیچ میں رہنے کے بعد آخر کار اس نے کمرہ صاف کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سب سے پہلے اس نے ریک کو صاف کیا۔ فلمی رسالے اور سستے ناول نکال کر اس نے باہر صحن میں پھینک دیئے اور اس کی جگہ انگلش اور اردو کے چند معیاری ناول سجا دیئے۔ بشریٰ کی اپنی رکھی ہوئی تصویر ہٹا کر نیا میز پوش بچھایا۔ اور اس پر ایک خوبصورت سا چھوٹا ٹیبل لیمپ رکھ دیا۔ نیلی چادر والا بستر چارپائی بھی وہاں سے ہٹا دی اور کھڑکی کے قریب بڑا پلنگ بچھا کر اس پر نیا بستر لگایا۔ نیا تکیہ۔ نئی کاڑھی ہوئی چادر۔ دیواروں پر سے بشریٰ کے ہاتھ سے لگائے ہوئے کیلنڈر اور تصویریں اتار کر نئی تصویریں اور کیلنڈر لگائے۔ صرف ایک تصویر کو ہٹانے کی وہ ہمت نہ کر سکی۔ یہ ایک گول مٹول ننھے ... کپڑوں میں ملبوس ... بچے کی تصویر تھی۔ موٹے موٹے سیب کی طرح سرخ سفید رخسار۔ جیسے پانیوں جیسی نیلی ... اور گہری آنکھیں۔ بڑا خوبصورت بچہ تھا۔ اس تصویر کو دیکھ کر اسے اچانک بشریٰ کے بچے کا خیال آیا۔ کیا اس کا بچہ بھی ایسا ہی صحت مند ہوگا۔ فرخندہ کا دل انجانے بچے کی محبت سے بھر گیا۔ تبھی اسے خیال آیا کہ اس نے سنا تھا کہ بشریٰ کا بیٹا ہوا ہے۔

اس نے زمین پر گری ہوئی بشریٰ کی تصویر کو اٹھا کر دیکھا۔ بشریٰ مسکرا رہی تھی۔ فرخندہ کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

اس نے دوپٹے کے پلّو سے تصویر کو صاف کیا اور پھر چپکے سے اُسے اپنے بکس میں چھپا دیا۔

فرخندہ اس نئے کمرے میں کرسیوں کی ترتیب کو ٹھیک کر رہی تھی کہ آبا اچانک اخبار پوچھتے ہوئے اندر آ گئے۔ فرخندہ کو یوں لگا کہ جیسے وہ محض بہانے سے اندر آئے ہیں۔ فرخندہ نظریں نیچی کئے کسی مجرم کی طرح کرسیاں اِدھر سے اُدھر کرتی رہی۔ نہ جانے آبا سے کیوں شرمندگی سی محسوس ہو رہی تھی۔

"اخبار — آج کا اخبار کہاں ہے۔" اُن کی آواز تھرتھرا رہی تھی۔ انہوں نے گھومتی سی ایک نظر کمرے میں ڈالی۔ جھک کر میز پر لیمپ کے قریب پڑی ہوئی تصویر اٹھائی۔

"اوہ!" تصویر انہوں نے فوراً نیچے رکھ دی۔ یہ بشیر کی تھی۔

فرخندہ نے دزدیدہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

آبا کی پھیکی۔ ویران اور بے رونق آنکھوں میں نمی سی تیر رہی تھی۔ انہوں نے باری باری جھک کر پلنگ اور ڈیسک کو دیکھا۔ بشریٰ کی تمام نشانیوں اور یادوں کو مٹا دیا گیا تھا۔ اب وہاں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے دیکھ کر بشریٰ بے اختیار یاد آ جائے۔

"اخبار نہیں ہے یہاں؟" انہوں نے جیسے وہاں بے مقصد ٹھہرنے کی وضاحت پیش کی۔ پھر باہر جانے کو مڑتے ہوئے اچانک ان کی نظر بند کھڑکی پر پڑی۔ ایک لمحے کے لئے وہ ٹھٹھک گئے۔ انہیں وہ وقت یاد آیا جب اس کھڑکی کے پاس بشریٰ بڑے ٹھسے سے بیٹھی الم غلم رسالے پڑھا کرتی تھی اور وہ خود صحن میں نیم کے نیچے بیٹھ کر اس کی ان خود سریوں پر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھایا کرتے تھے۔ بشریٰ انہیں اس کھڑکی کے بہت نزدیک بہت قریب محسوس ہوئی۔ انہوں نے مڑ کر فرخندہ کی طرف دیکھا پھر ان کے تھرتھراتے ہونٹوں کو جنبش ہوئی:

"اماں سے چابی لے کر یہ کھڑکی کھول دو۔"

کھلے خط

طفیل صاحب تسلیم

میں نقوش کے شمارے میں [illegible] [illegible] آپ کی [illegible] [illegible] ہے [illegible] [illegible] [illegible] آپ کے
لکھنے کی [illegible] [illegible] نقوش کی [illegible] اشاعت میں ڈاکٹر [illegible] [illegible] [illegible] کا مقالہ "غالب [illegible] [illegible]" شائع ہوا ہے۔

ڈاکٹر [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
کی [illegible] اور [illegible] کے [illegible] [illegible] [illegible] کا اندازہ ہوتا ہے۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کے متعلق [illegible]۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] کی [illegible] [illegible] مکاتیب غالب [illegible] [illegible] [illegible]۔ [illegible] کے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] غالب
کی [illegible] کے [illegible] [illegible] [illegible] دیا گیا ہے:

"مرزا غالب کی قید کا [illegible] [illegible] [illegible] غالب [illegible] غالب [illegible]۔ غالب [illegible]
غالب [illegible] میں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ضروری ہے کہ [illegible] [illegible]
پیش آیا تھا جو [illegible] [illegible] ۱۸۴۷ء کے متعلق ہے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ۱۸۴۷ء
[illegible] کسی طرح درست نہیں [illegible] [illegible] [illegible] شاید یہ ہے کہ ۱۸۴۷ء کی [illegible]
(۲) [illegible] ۱۸۴۷ء کو تھی اور [illegible] [illegible] [illegible] ۱۸۴۷ء کو ہوئی کیونکہ ۱۸۴۷ء کی [illegible]
(۳) [illegible] ۱۸۴۷ء کو [illegible] تھی اور ۱۸۴۷ء میں جو [illegible] [illegible] [illegible] ۱۸۴۷ء [illegible] تھی
[illegible] [illegible] کے مطابق تھی۔"

مہر صاحب نے بیان میں ایک تاریخ اور بھی [illegible] کا خیال ہے کہ مرزا صاحب کو ۲۵
جون ۱۸۴۷ء یا اس کے چند روز قبل گرفتار کیا گیا۔ اس خیال کی بنیاد خود ان ہی کے بیان
کے مطابق "احسن الاخبار" بمبئی کی ۲۵ جون کی اشاعت میں اس خبر کا شائع ہونا ہے۔ اول
تو یہی [illegible] [illegible] ہے کہ آج سے تقریباً سو برس پہلے [illegible] جلدوں [illegible] [illegible]
مکانات سے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]۔ [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] مالک رام صاحب نے

اسد مطالبہ اقتباس ہو یا بے معنی ۔ ۲ ذی القعدہ جمادی الثانی سے شروع ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ [illegible] جو اس خبر دہلی سے ۱۵ جمادی الثانی کو بھیجی گئی تھی ظاہر ہے کہ اس خبر سے متعلق واقعہ اسی تاریخ کا یا اس سے قبل کا ہوگا ۔ بعد کا کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ جمادی الثانی ۱۲۶۳ھ کی پندرہ تاریخ ۳۱ مئی ۱۸۴۷ء کے مطابق ہے لہذا مرزا صاحب کی گرفتاری ۳۱ مئی سے پہلے ہونی چاہیے۔ اخبار فوائد الناظرین جلد ۲ نمبر ۱۰ مورخہ ۳۱ مئی ۱۸۴۷ء میں دہلی کی خبروں کے تحت یہ عبارت درج ہے ۔ ۲۵ مئی کو بیچ مکان مرزا نوشہ اسد اللہ خان صاحب کے قمار بازی کا ہو رہی تھی چنانچہ کوتوال صاحب یہ خبر پاکر وہاں گئے اور جلیسہ مرزا صاحب کو مع اور قمار بازوں کے گرفتار کرکے کوتوالی میں لے آئے اب دیکھنا چاہیے کہ صاحب مجسٹریٹ اُن کے حق میں کیا حکم دیتے ہیں۔ یہ واضح ثبوت ہے اس امر کا کہ مرزا صاحب کی گرفتاری ۲۵ مئی ۱۸۴۷ء مطابق ۹ جمادی الثانی ۱۲۶۳ھ کو عمل میں آئی تھی۔ دوسرا ثبوت یہ ہے کہ شاہ نصیر کے ایک شاگرد گھنشام لال عاصی دہلوی (متوفی بقول مرتب دیوان ۱۲۹۶ھ وبقول مخانہ جلد ۵ صفحہ ۳۴۳ [illegible]) نے اس واقعے کے متعلق ایک قطعۂ تاریخ کہا ہے اور قطعے کے ساتھ نثر میں واقعے کی [illegible] پر روشنی ڈالی ہے اس کے مادۂ تاریخ سے بھی ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء نکلتے ہیں جس کی عبارت یہ ہے

مرزا نوشہ شاعر بے بدل دہلی [illegible] متخلص [illegible] صاحب سے فیض الرحمن کو توال دہلی کو ناحق عداوت ہو گئی اور اس نے بعلت قمار بازی ان کو قید [illegible] کیا جس کی تاریخ مندرجہ ذیل نکالی گئی۔

سرو [illegible] سے [illegible] میں تو سب [illegible] خان [illegible]
اور [illegible] سے [illegible] میں [illegible] سال سے

[illegible] ۲۶۳
دہلی [illegible] ان [illegible] سے [illegible]

[illegible] روز [illegible] سے [illegible] نوشہ [illegible]
[illegible] خان سے

۱۰۰۲
سر [illegible] تحت [illegible] سے [illegible]
اسد [illegible] سے [illegible] ہے
۱۲۶۳ فصلی

[illegible] گرفتار [illegible]

[illegible] گئے تھے [illegible]

کالے تھے گوروں کے اندر بہت [illegible] بچ گئے۔ گرفتار کر کے قید کر لیا

بہت سے رئیس اور شرفا اس حرکت سے ناراض ہوئے اور عدالت میں برأت کے ساتھ چھوٹے

مجرم قید ہو گئے۔

ایک روز مسٹر راس صاحب سول سرجن دہلی۔ قیدیوں کو جیل کو معائنہ کرتے کرتے حضرت کے پاس

پہنچ گئے اور حال دریافت کیا آپ نے فی البدیہہ یہ فرمایا ؎

جیتا ہے کہ ہم خرقۂ زنیسہ پا ہیں   کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

اسی وقت ڈاکٹر صاحب نے گورنمنٹ کو چٹھی لکھ کر رہا کرا دیا (کلام غالب ۲۱۲ صفحہ)

اس بیان سے یہ امور بالتصریح واضح ہو جاتے ہیں (۱) گرفتاری کا نام (۲) گرفتاری کی تدبیر (۳) مرزا صاحب

اور ان کے رفقا کے ساتھ پولیس کا غیر شریفانہ سلوک (۴) رہائی کی سفارش کرنے والے کا نام (۵) اور

جس سے سفارش کی گئی تھی اس کا تعین (۶) مرزا صاحب کے ایک شہری و ہم جنس اور چونکہ یہ معاصرانہ

بیان ہے ہم اس سے خود مرزا صاحب کے بعض بیانوں کی تائید اور بعض کی تصحیح کر سکتے ہیں۔"

یہ حاشیہ ہے جو محترم عرشی صاحب نے اپنی کتاب مکاتیب غالب میں غالب کی حراست کے واقعہ پر لکھا اس وقت میرے سامنے

مکاتیب غالب کی تیسری اشاعت ہے جو ۱۹۴۳ء میں ہوئی۔ دوسری اشاعت ۱۹۴۲ء میں ہوئی ہے اس میں یہ حاشیہ کچھ مجمل ہے۔ پر جو بھی ہو

بہر حال اگر ہم ۱۹۴۳ء کے تفصیلی حاشیہ کو پیش نظر رکھیں تو بھی ڈاکٹر نارنگ کا یہ کہنا محل نظر ہے کہ غالب کی حراست کے سلسلہ میں قاضی واقعہ

آج پہلی مرتبہ پیش نہیں کیا گیا کیونکہ پندرہ برس پہلے اس کی شہرت تو مکاتیب غالب کی تیسری اشاعت نے کر دی ہے۔

سب سے غالب کی حراست کے متعلق ڈاکٹر نارنگ کے اخذ کردہ نتائج تو وہ بھی تقریباً وہی ہیں جو مکاتیب کی اس اشاعت میں پیش

کر دیے گئے ہیں۔ یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ ڈاکٹر نارنگ جیسے کتاب خواں کی نظر سے یہ کتاب نہ گزری ہو۔ بہر حال میں اس سلسلہ میں اس

سے زیادہ کیا کہہ سکتا ہوں کہ نقوش کے محترم قارئین کو غلط فہمی سے بچانے اور ڈاکٹر نارنگ کی اصلاح کے لیے آپ مناسب طریقہ

اختیار کریں۔

میرے اپنے خیال میں حالی نے قید کے ساتھ مرزا کے اپنے اشعار کی تفہیم کے لیے لکھی ہے کیونکہ جب تک کوتوال کو رقم میں ادا

کر جانا اور جوئیں چلنے وغیرہ کا واقعہ معلوم ہو کہ کوتوال کا "دشمن" ہو کر جانا اور اسد کو بیڑیوں سے گھیر کر زنداں میں ڈالنا" یہ

سب مطلب چیستاں رہ جاتے ہیں۔

توقع ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام۔

مورخہ ۲۵ اگست ۱۹۶۱ء

ماذ یزدانی

نقوش کا تازہ شمارہ موصول ہوا اور اس میں "فراق کا تغزل" نامی مضمون پڑھ کر حیرت ہوئی۔ ڈاکٹر عبدالمغنی[1] نے ایک ساتھ بہت ساری باتیں چھیڑ دی ہیں اور جا بجا ایسی کلامی بھی نہیں سمجھ پائے۔ فراق کی شاعری کے بارے میں جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ خود ان کے مضمون پر صادق آرہا ہے اور وہ بھی کچھ اس طرح پر ——— "مضمون کا مطالعہ کرتے وقت صاف سے صاف ہر شخص کے ذہن کو یہ شبہ ہو سکتے ہیں اور ذوق و شعور کو متوازن رکھنا آسان نہیں رہ جاتا۔ اسے پڑھ کر حیرت کچھ اس وجہ سے بھی ہوتی ہے کہ مضمون کی معقولیت پر بھی شک ہونے لگتا ہے۔" یہاں پر مضمون نگار نے خود اپنے طور پر بہت سے مفروضے تیار کر لیے اور اس کی بنیاد پر فراق کے تغزل کی کاٹ چھانٹ شروع کر دی۔ وہ شاید یہ بھول گئے کہ فراق نے بیسویں صدی میں شاعری کی ہے بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں نہیں۔ غالب کا دور ایک الگ دور تھا اور فراق کا دور ایک الگ دور ہے۔ غالب کے دور پر فارسی اور عربی کی چھاپ تھی اور ان دونوں زبانوں کے پیچھے عرب کا ایران کا کلچر تھا۔ چنانچہ اس وقت کی شاعری میں اس کلچر کی خوبیاں اور خامیاں دونوں موجود ہیں

مغل شہنشاہ کے ہاتھوں سے فرمانروائی گئی اور انگریزوں کے سر پر تاج سروری آیا۔ اب اُردو پر انگریزی زبان اور انگریزی کلچر کی چھاپ پڑنے لگی۔ ہندوستان پر انگریزوں کے اقتدار کے بعد ہی اقبال جیسی شخصیت نے جنم لیا۔ انھوں نے اُردو شاعری پر نگاہ ڈالی اور اپنی فکر کو تولا۔ اب ان کے سامنے سوائے بغاوت کے اور کوئی راستہ نہ تھا۔ بغاوت کو انھوں نے اپنا کر اُردو کو نئے نئے موضوعات دیے۔ ان موضوعات میں نظمیں اگر وہ غالب کے سے تو شاید غالب بن جاتے [illegible] جیسے ڈاکٹر مغنی نے فراق کی شاعری سے منہ بگاڑا ہے۔

انگریز گئے اور ملک کو آزادی ملی۔ اُردو شاعری اب نئے موڑ پر تھی۔ انگریزی زبان کے ساتھ ساتھ اسے ہندی زبان کا بھی اثر قبول کرنا تھا۔ اس بات کو تو سب ہی لوگ مانتے ہیں کہ فراق نے انگریزی زبان کے ساتھ ساتھ ہندی اور سنسکرت زبانوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ان زبانوں سے فائدہ اٹھائے گا اس کی شاعری پر ان دونوں زبانوں کے [illegible] اور [illegible] کے رنگ برنگے پھولوں کا بھی اثر پڑے گا۔ فراق کا لکھا ہوا "سراپا" [illegible] پڑھ جانا چاہیے۔ جو "سراپا" [illegible] انھوں نے پدماوتی [illegible] (ملک محمد جائسی کی آنکھ بچپن میں چیچک کی وجہ سے جاتی رہی تھی) [illegible] پدماوتی کا جو "سراپا" لکھا۔ وہ ان کی پانچ سو برس پہلے کی چھپی ہوئی کتاب کے [illegible] سدی سے ترجمہ کر کے [illegible] رہا ہوں:

بال

"اس کے بال مشکِ عنبر سے کے ہیں اور وہ مشک [illegible] ہے

---

[1] عبدالمغنی صاحب پٹنہ یونیورسٹی میں انگریزی کے شعبہ میں [illegible]

[illegible] جیسے [illegible] ہیں
جب منہ کھول کر بات کرتی ہے تو ———
نہایت عمدہ چمک سے منہ بھر جاتا ہے:

ناک

اس کی ناک ایسی ہے جیسے چاندی کی دھار پر نور
کی آب جیسے چوٹی پر رکھ دیا گیا ہو
اور اس ناک میں جو موتی پڑے ہوئے ہیں
وہ ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے جنت میں گنگا۔

بھوں

سیاہ بھویں مثل کمان کے کھنچی ہیں
جس وقت کھنچتی ہیں ریزہ ریزہ کر دیتی ہیں۔

پلک

پلکوں کا کیا بیان کروں ———
گویا دو فوجیں آپس میں تیر اندازی کر رہی ہیں
گویا رام اور راون کی فوج جنگ کے لیے تیار ہے
دونوں پتلیاں بیچ میں سمندر کی طرح لہرا رہی ہیں۔

ہونٹ

اس کے منہ نے جھوٹ کر دیکھ کر آب حیات سے بھرے ہیں
گنگا نے چھلکنا بند کر دیا ——— ۔
گویا دو ہیرے کی طرح ان ہونٹوں کا رنگ سرخ ہے
وہ جب باتیں کرتی ہے تو پھول جھڑتے ہیں۔

دانت

دانتوں کا نقشہ [illegible] ہیں
دانت [illegible] ———
جیسے [illegible] کے نیچے [illegible] ۔

سینہ

اس کا سینہ مثل تھالی کے ہے جس میں دو مٹکے ہیں
جیسے سونے کے کٹورے الٹ کر رکھ دیئے گئے ہوں
جیسے بھونرا اپنا نشیمن کلی پر چھوڑتا ہے.
جس طرح اس کی کلیاں [illegible] سے کھلا چاہتی ہیں۔

پیٹ

اس کے پیٹ کی شکنیں مثل صندل کے ہیں
جو رنگ اور خوشبو میں مثل زعفران کے ہیں
پیٹ کے رونگٹے مثل کالے ناگ کے ہیں
جو ناف سے نکل کر سینے کی طرف مائل ہیں۔

ناف

اس کی ناف مثل گرداب بھنور کے ہے
اس کا سامنا وہ کرے جس کی قسمت اچھی ہو۔

ران

اس کی دونوں رانیں اس طرح ہیں ———
جیسے کیلے کے دو سڈول پیڑ۔

———

شعر، وہ اس کے بیان میں تو [illegible] تمام رات [illegible] کے چشم دیدہ گواہ ہو جاتے ہیں:
آنکھ کھل گئی اور منہ سے [illegible] بھر گئے
[illegible] ریزہ ریزہ ہو گئی اور بند ٹوٹ گئے
چوڑیاں بالیاں اور کنگھی سب ٹوٹ گئے
بدن کا صندل آگ کی تپش [illegible] قصہ ختم ہو گیا۔ (جینت کشٹ، [illegible] واقعات [illegible] ترجمہ [illegible])

مثال کے طور پر یہی مضمون سنسکرت میں دیکھیے:

بارش کے وہ قطرے پاروتی کی پلکوں سے بہ کر آنکھوں پر آئے اور آنکھوں سے نکل کر اس کے نا چیدہ ہونٹوں تک پہنچے۔ گلاب جیسے ہونٹوں کو چوم کر وہ قطرے چھاتی تک پہنچے اور پھر کچھ اور نیچے ٹپک کر ــــــ نہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔

(کمار سمبھو۔ کالیداس)

[illegible] دیکھیے:

زیر و بم سینہ میں وہ موسیقیِ بے صوت — یہ پنکھڑی ہونٹوں کی یہ گلزار دہاں

قامت ہے کہ کہسار پہ لہراتا ہوا [illegible] — چہرہ ہے کہ ہے چشمۂ خورشید میں طوفاں

ہر جنبشِ اعضا میں چھلکتے ہیں صد جام — ہر گردشِ دیدہ میں کئی گردشِ دوراں

پہلی دونوں مثالیں ہندی اور سنسکرت ادب کی روایتیں ہیں اور وہ بھی بہت پرانی سی اور [illegible]۔ ڈاکٹر [illegible] "عورت کے سراپا کی بیان غیر تصویری" کہا ہے۔ اب دیکھیے جوش نے سراپا کیا کہتے ہیں:

ہمارے یہاں کے شعری شاعروں نے کہ "سراپا" جیسے مضمون جانے کیوں وہ سادہ اور گوشت پوست کی عورت کو دیکھ کر سمجھ [illegible] شکر تسلیم کا لیا ہے کہ انھوں نے پردے کے اندر والی "عورت" کو دیکھا اور اس عورت کا روشن دن کی پانے میں شاپنگ کرتی ہے۔ کلب میں رقص کرتی ہے۔ فیکٹری میں کام کرتی ہے۔ ہسپتال میں تیمار داری کرتی ہے اور عدالتوں میں وکالت کرتی ہے۔ اب آپ ہی فیصلہ کیجیے کہ فراق کے "سراپا" میں جس [illegible] کی متحرک عورت کی تصویر ہوگی یا وہ نسیم والی عورت کی۔ [illegible] "آؤٹ ڈیٹڈ" ہے۔ ۱۹۸۰ء کے بعد کی عورت [illegible] اس کا بھی [illegible] کریں گے اور اس شاعر کو بھی [illegible]۔ فراق کے "سراپا" والی عورت تو [illegible] والی عورت سے [illegible] ہے۔ اس [illegible] کو دیکھ [illegible] ڈاکٹر [illegible] نے [illegible] ہے۔ جوش [illegible] فراق نے [illegible] شاعرانہ حقیقت [illegible]۔

حبیب اللہ حبیب

نقوش

کے سابقہ نمبر

			صفحات
۱	غزل نمبر	اُردو غزل کی پونے دو سو سالہ تاریخ	۷۵۲
۲	افسانہ نمبر	اُردو افسانے کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ	۱۰۹۰
۳	مکاتیب نمبر	اُردو خطوط کی ـــ سو سالہ تاریخ	۱۰۴۸
۴	شخصیات نمبر	مشاہیرِ ادب کی سو سالہ شخصی تاریخ	۱۵۱۴
۵	طنز و مزاح نمبر	طنزیہ و مزاحیہ ادب کی سوا سو سالہ تاریخ	۹۲۸
۶	لاہور نمبر	لاہور کی نو سو سالہ مستند مگر جامع تاریخ	۱۲۰۴
۷	ادبِ عالیہ نمبر	نقوش کی دس سالہ تخلیقات کا انتخاب	۱۲۷۲
۸	آپ بیتی نمبر	خود نوشت حالات؛ چار سو سالہ شخصی تاریخ	۱۹۶۴
۹	پطرس نمبر	: پطرس کے سارے ہی مضامین کے ساتھ فن اور شخصیت پر مکمل کام	۶۴۰
۱۰	منٹو نمبر	: منٹو کے منتخب افسانوں کے ساتھ فن اور شخصیت پر بھرپور کام	۳۸۴
۱۱	شوکت نمبر	: شوکت کی اہم مزاحیہ تخلیقات کے ساتھ فن اور شخصیت پر دلچسپ کام	۶۲۴

اور ان کے علاوہ :-

آزادی نمبر ناولٹ نمبر پنج سالہ نمبر

دس سالہ نمبر خاص نمبر ۱۹۵۵ سالنامے

نقوش

کے سابقہ نمبر

		صفحات
۱ - غزل نمبر	اردو غزل کی پونے دو سو سالہ تاریخ	۷۵۲
۲ - افسانہ نمبر	اردو افسانے کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ	۱۰۹۰
۳ - مکاتیب نمبر	اردو خطوط کی سو سالہ تاریخ	۱۰۴۸
۴ - شخصیات نمبر	مشاہیر ادب کی سو سالہ شخصی تاریخ	۱۵۱۴
۵ - طنز و مزاح نمبر	طنزیہ و مزاحیہ ادب کی سوا سو سالہ تاریخ	۹۲۸
۶ - لاہور نمبر	لاہور کی نو سو سالہ مستند مگر جامع تاریخ	۱۲۰۴
۷ - ادب عالیہ نمبر	نقوش کی دس سالہ تخلیقات کا انتخاب	۱۲۷۲
۸ - آپ بیتی نمبر	خود نوشت حالات، چار سو سالہ شخصی تاریخ	۱۹۶۴
۹ - پطرس نمبر	: پطرس کے سارے ہی مضامین کے ساتھ فن اور شخصیت پر مکمل کام	۶۴۰
۱۰ - منٹو نمبر	: منٹو کے منتخب افسانوں کے ساتھ فن اور شخصیت پر بھرپور کام	۳۸۴
۱۱ - شوکت نمبر	: شوکت کی اہم مزاحیہ تخلیقات کے ساتھ فن اور شخصیت پر دلچسپ کام	۶۲۴

اور ان کے علاوہ :-

آزادی نمبر — ناولٹ نمبر — پنج سالہ نمبر

دس سالہ نمبر — خاص نمبر اور — سالنامے

نقوش کے یہ نمبر دوبارہ چھپ رہے ہیں اگر ان میں سے
کسی نمبر کی ضرورت ہو تو آج ہی آرڈر بک کرا دیں۔